علمِ حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی کی مختصر و مکمل شرح

فی جمع الافادات

عن الاستاذین

امام المجاہدین فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی نظامِ الدین شامزئی صاحب رحمہ اللہ

فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا محمد زیب صاحب دامت برکاتہم العالیہ

حافظ محمد فیصل

ناشر

بنوری ٹاؤن کتب مارکیٹ کراتشي، فون ۰۳۳۳-۳۴۲۲۷۰۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَجْمَعُ الْبَحْرَیْن

فی جمع الافادات

عن الاستاذین

افادات

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی دامت برکاتہم

استاذ محترم حضرت مولانا محمد زیب صاحب دامت برکاتہم

مرتب

محمد فیصل

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

ناشر

مکتبہ الحبیب

جامعہ عربیہ اسلامیہ

اسکاؤٹ کالونی

اسکیم 33 کراچی

کتاب	مجمع البحرین
افادات	مفتی نظام الدین شامزئی
مرتب	محمد فیصل
ناشر	مکتبۃ الحبیب 0333-3422703
کمپوزنگ	آربو گرافکس ARBO Graphics

ادارۃ الانور — 021-4914596

مکتبہ عمر فاروق — 021-4594144

طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز — 0300-9233714 / 0321-9233714

فهرست جلد اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمدلله الذی اوحیٰ الی عبده ما اوحیٰ والصلوٰة والسلام علی من لاینطق عن الهویٰ ان هو الاوحی یوحیٰ وعلی اله وصحبه الذین وعوا وحیه وهتدوا بهدیه وادوه کماسمعه. امابعد:

آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ رب العزت نے کئی سارے انبیاء کرام علیہم السلام کو انسانیت کیلئے سامان رشد وہدایت دیکر بھیجا اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ نے ہر دور کے حالات اور ضروریات کے مطابق قوانین واحکام صحیفوں اور کتابوں کی صورت میں عطا فرمائے۔ لیکن کسی بھی کتاب یا صحیفے کی ذمہ داری اللہ رب العزت نے بذات خود نہیں لی، اسی وجہ سے کوئی نبی جب دنیا سے رخصت ہو جاتا تو ان کی قوم اپنی کتاب یا صحیفے میں اپنی مرضی کے مطابق ردو بدل کر دیتے اور یوں وہ کتاب یا صحیفہ تحریف کا شکار ہو جاتا اور گمراہی وضلالت کے دروازے کھل جاتے۔

جب گمراہی اور جہالت اپنی انتہاء کو پہنچتی اور جہالت کی گھٹا ٹوپ اندھیریاں عالم انسانیت کو ڈھانپ لیتی تو اللہ تبارک وتعالیٰ پھر کسی برگزیدہ بندے کو شمع نبوت دیکر رشد وہدایت اور علم وعرفان کی روشنیاں عام فرمادیتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری آئی تو اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین رحمتہ اللعالمین بنا کر مبعوث فرمایا کہ اب آپکے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ اور الٰہی قانون کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود لے لیا اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو کتاب اللہ کی شرح کی حیثیت حاصل ہے بناء بریں اس میں بھی باطل فرقوں نے دن رات محنت کر کے کمی وبیشی کی کوشش کی لیکن ہر دور میں علماء اور محدثین نے اس کی حفاظت ودفاع کا حسین کردار ادا کیا اور باطل کے مذموم عزائم خاک میں ملا دیے اور الحمدللہ آج ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال پر مشتمل ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ اور احادیث نبویہ کی شروح وتراجم طویل طویل فہرستوں پر مشتمل ہے مگر صاحب جوامع الکلم کی کلمات کی تفہیم وتشریح کیلئے ہر دور میں نئے انداز، نئے اسلوب اور نئے پیرائے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے آج کا ہمارا یہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں جہد ومشقت سے ناآشنا دور ہے مزاج سہولت پسند ہو چکے ہیں، طبیعت کسل زدہ ہو چکی ہیں طلباء علمی میدان میں مطولات کی بجائے مختصرات کے درپے ہو چکے ہیں، شروحات کی بجائے اساتذہ کے ان افادات پر اکتفاء کرنے کو منتہی کاوش خیال کرتے ہیں جو دوران درس جمع کر لئے جاتے ہیں مجمع البحرین بھی ان افادات کا مجموعہ ہے جو سنن ترمذی شریف کے درس کے دوران اپنے اساتذہ کرام سے جمع کئے گئے ہیں اس میں ترمذی جلد اول حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب دامت برکاتہم اور جلد ثانی استاذ محترم حضرت مولانا محمد زیب صاحب کے افادات کا مجموعہ ہے۔ قبل ازیں یہ افادات فوٹو کاپی کی صورت میں طلباء تک پہنچتی تھی اب کوشش کی گئی ہے کہ اب ان دونوں کو یکجا طور پر حسن کتابت سے تحقیق وترتیب کے ساتھ

طلباء کے سامنے پیش کیا جائے۔

لہٰذا علماء کرام وطلباء عظام اس بات کو ملحوظ نظر رکھیں کہ یہ شرح دوران درس تقریر کو قلم کی رفتار سے تحریر کی صورت میں لایا گیا۔اور پھراس کاپی کو''مجمع البحرین'' کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے،اس لئے اس کتاب میں کوئی غلطی ہوتو اس کی نسبت رفتار قلم اور بندہ عاجز کی طرف ہی کی جائے۔

بندہ نے بذات خود معارف السنن ودیگر سے اس میں بھرپور کوشش کی ہے کہ کوئی غلطی نہ رہے لیکن پھر بھی اگر غلطی ہوتو بندہ ناچیز کو اس کی نشاندہی کرائی جائے تاکہ تصحیح کا عمل ممکن ہوسکے اور یہ آپ کا میری طرح طلباء برادری پر احسان عظیم ہوگا اس شرح میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے تاکہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو اور کتاب کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ امتحان کیلئے بروقت اور بھرپور تیاری ممکن ہو۔

اللہ ہمارا حامی وناصر ہو

وماتوفیقی الاباللہ

فیصل خان

خریج

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام ترمذی کے احوال

❶ نام محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک۔

❷ سند میں ناموں کے ساتھ تعارف کیلئے کبھی نسبتیں ذکر کی جاتی ہیں تا کہ دوسرے ہم نام راوی سے ممتاز ہو جائے امام ترمذی کی تین نسبتیں ذکر کی جاتی ہیں۔ ① البوغی ② السلمی ③ الترمذی۔

❸ پہلی نسبت ''البوغی'' یہ البوغ کی طرف منسوب ہے جو کہ جیحون کے کنارے واقع ایک گاؤں کا نام ہے اس قریہ کی طرف امام کی نسبت اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ امام ترمذی کا مدفن ہے۔ دوسری نسبت ''السلمی'' ہے کیونکہ قبیلہ بنوسلیم کی طرف منسوب تھے اس لئے ان کو سلمی کہتے ہیں۔ تیسری نسبت ''الترمذی'' ہے یہ گاؤں کی طرف منسوب ہے جو کہ امام صاحب کا مولد تھا۔

❹ سلمی کی جو نسبت ہے اس کے متعلق دو قول ہیں ① امام ترمذی اس قبیلہ بنوسلیم کے فرد تھے ② امام ترمذی عجمی النسل تھے لیکن بنوسلیم کی طرف مولیٰ ہونے کی بنیاد پر ہے۔

نوٹ: قبائل کی طرف نسبت کی چار صورتیں ہیں ① انسان کا تعلق اس قبیلے سے ہو اور وہ اس قبیلے کا فرد ہو ② انسان قبیلے کی طرف منسوب ہوتا ہے ولاء کی بناء پر پھر ولاء کی تین قسمیں ہیں ① ولاء عتاقہ مثلاً کوئی آدمی بنی تمیم کے کسی فرد کا غلام تھا اور اس نے اس کو آزاد کر دیا تو یہ آزاد کردہ تمیمی کہلائے گا ولائے عتاقہ کی وجہ سے ② ولاء اسلام مثلاً کوئی آدمی قریشی کی ہاتھ پر اسلام قبول کرے اب اس آدمی کو قریشی کہیں گے ولاء اسلام کی وجہ سے ③ ولائے موالات مثلاً کوئی آدمی اپنے قبیلے سے الگ ہوا اور دوسرے علاقے میں چلا گیا اور وہاں کسی قبیلے کے کسی فرد سے دوستی قائم کر دی تا کہ دوسروں کے ظلم سے بچ سکے اس ولاء کی وجہ سے یہ اس قبیلے کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔

اب اگر کہا جائے کہ ''**فلان تميمي من أنفسهم**'' تو معلوم ہوگا کہ یہ ان کا فرد ہے اور اگر کہا جائے ''**فلان تميمي مولئ لهم**'' تو معلوم ہوگا کہ یہ ان کا مولی ہے لیکن آگے شبہ ہوگا کہ یہ ولاء کونسی ہے ولائے عتاقہ ہے یا ولائے اسلام۔

❺ عرب میں عام طور سے نسبت الی القبائل ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عرب کے انساب محفوظ تھے اور ہیں اور عجم میں عام طور پر نسبت الی الامکنہ ہوتی ہے کیونکہ عجم کے انساب محفوظ نہیں رہے اور متاخرین کے زمانے میں نسبت کی ایک تیسری قسم بھی شروع ہوگئی وہ یہ کہ آراء اور مذاہب کی طرف نسبت ہو جیسے حنفی شافعی اور اس زمانے میں مزید توسیع ہوئی کہ اداروں کی طرف نسبت کرتے ہیں جیسے ندوی قاسمی وغیرہ۔

❻ ترمذی کو محدثین تین طرح پڑھتے ہیں: ①۔ تِرمِذی (تا اور میم کے کسرے کے ساتھ) ②۔ تَرمِذی (تاء کے فتحہ اور میم کے کسرے کے ساتھ) اور یہ مشہور علی الالسنۃ ③۔ تُرمُذی (تاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ)۔

❼ امام ترمذی کے ولادت کے بارے میں دو قول ہیں ①۔ مشہور یہ ہے کہ ۲۰۹ میں ہوئی لیکن بعض نے کہا کہ ۲۰۵ میں ہوئی۔

❽ تاریخ وفات میں تین قول ہیں: ① مشہور تو ۲۷۹ھ ہے ② ۲۷۵ھ ③ ۲۸۰ھ کے بعد ہوا اور یہ قول مبہم ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری نے امام ترمذی کے تاریخ وفات اور مدت عمر کے بارے میں یہ شعر کہا۔

الترمذی محمد ذو زین عطر وفات وعمرہ فی عین

امام ترمذی کی کنیت ابوعیسیٰ ہے مصنف بھی جہاں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو ''قال ابوعیسیٰ'' کہتے ہیں۔

اشکال: حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''نهی رسول الله ﷺ أن یکنی بأبی عیسیٰ فان عیسیٰ لا أب له'' اب امام ترمذی نے نہی کے باوجود اپنی کنیت ابوعیسیٰ کیوں رکھی؟

جواب: ابوعیسیٰ کی کنیت کے بارے میں آپ ﷺ کے اقوال مختلف ہیں ابوداؤد نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے فرمایا ''کنی رسول الله ﷺ بأبی عیسیٰ'' تو بظاہر تعارض لگ رہا ہے۔ محدثین نے ان احادیث کو جمع کیا ہے اور تطبیق میں متعدد اقوال ہیں:

قول نمبر ❶: نبی کریم ﷺ نے ابتداء میں ممانعت کی تھی اس عقیدے کو راسخ کرنے کیلئے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے ان کا باپ نہ تھا جب یہ عقیدہ راسخ ہوگیا تو اشتباہ والی علت باقی نہ رہی اس لئے نہی بھی نہیں رہی کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس علت پر حکم مرتب ہو وہ علت ہو تو حکم بھی باقی رہے گا علت نہ ہو تو حکم ختم ہو جائے گی حاصل کلام یہ ہے کہ نہی کی حدیث منسوخ اور جواز والی حدیث ناسخ ہے۔

قول نمبر ❷: نہی کی روایت خلاف اولیٰ پر محمول ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ یہ کنیت نہ رکھی جائے ابوداؤد کی روایت جواز پر محمول ہے اور خلاف اولیٰ اور جواز دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

امام ترمذی کا مسلک:

احکام کے اعتبار سے امام ترمذی کا مسلک کیا ہے؟ کیا وہ مجتہد تھے یا مقلد اگر مقلد تھے تو کس مسلک کے مقلد تھے؟ اس میں بعض حضرات جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ وہ مقلد نہیں بلکہ مجتہد تھے۔ دوسرا قول جو مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ فقہی احکام کے اعتبار سے وہ امام شافعی کے مقلد تھے۔

اعتراض: ابواب الصلاۃ کی ابتداء میں مواقیت کی بحث کے اندر امام ترمذی نے باب باندھا ہے ''باب تاخیر الظهر فی شدة الحر'' جبکہ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ تعجیل مطلقاً افضل ہے جبکہ امام ترمذی نے سخت گرمی میں تاخیر ظہر کو افضل قرار دیا ہے اور امام شافعی کی تردید کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام شافعی کی مقلد نہ تھے۔

جواب: شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ذکر کیا ہے کہ محدثین کی تقلید اس طرح نہ تھی کہ ہر جزئی میں امام کے مقلد ہوں بلکہ ان کی تقلید ان مسائل میں تھی جو غیر منصوصی تھے لیکن منصوصی مسائل میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے اس لئے ہوسکتا ہے کہ ترمذی شافعی المسلک ہوں اور اس منصوصی مسئلے میں ان کے خلاف قول اختیار کرلیا جس طرح وکیع بن جراح محدث تھے احمد کے استاذ تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حنفی تھے لیکن ترمذی میں ابواب الحج میں ہدی کے جانور کا مسئلہ آئے گا کہ جس جانور کو حاجی لے جاتا ہے اس کی کوہان کو زخمی کردے حدیث میں اس کا حکم ہے مگر امام صاحب کا قول اس کے خلاف ہے وکیع نے یہ حدیث بیان کی کسی نے سوال کیا کہ امام صاحب منع کرتے تھے تو وکیع نے فرمایا حدیث کو لو اور اصحاب رائے کا قول چھوڑ دو۔ سائل نے دلیل پیش کی تو وکیع

نے کہا کہ تم جیل میں ڈالنے کے قابل ہو اس وقت تک کہ تم اس قول سے توبہ نہ کرلو اسی طرح یحی بن سعید القطان بھی حنفی تھے لیکن غیر منصوصی مسائل ہیں۔

امام ترمذی کے شیوخ:

امام ترمذی کے شیوخ کی تعداد ۲۲۰ ہے۔ ان میں سے ۴۱ وہ ہیں جو بخاری و مسلم کے مشترکہ اساتذہ میں سے ہیں ۲۹ مشائخ امام مسلم اور ۲۷ میں امام بخاری کے ساتھ شامل ہیں۔

جامع ترمذی کی خصوصیات

خصوصیت نمبر ❶: یہ کتاب جامع ہے۔ حافظ ابن حجر نے امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے کہ:

"صنفت هذا الكتاب فعرضته على علماء الحجاز والعراق والخراسان فرضوا به من كان في بيته هذا الكتاب فكأنما في بيته نبي يتكلم.

اس عبارت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع کتاب ہے جامع کا لفظی معنی ہے جس میں ہر چیز جمع ہو محدثین کی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جو اصناف ثمانیہ پر مشتمل ہو۔

سیر و آداب و تفسیر و عقائد فتن احکام و اشراط و مناقب

اور ترمذی کی یہ کتاب بھی ان اصناف ثمانیہ پر مشتمل ہے اس کتاب کو سنن بھی کہا جاتا ہے محدثین کے نزدیک سنن اس کتاب کو کہتے ہیں جو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر ہو اور اس کتاب میں بھی فقہی ترتیب ہے اس طرح اس کتاب کو صحیح بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں اکثر و اغلب حدیثیں صحیح ہیں۔

خصوصیت نمبر ❷: امام ترمذی کتاب العلل میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں جتنی احادیث ہیں وہ سب معمول بہا ہیں یعنی امت کے کسی نہ کسی طبقے کا اس پر عمل ہے سوائے دو احادیث کے

❶ جمع رسول الله ﷺ بين الظهر والعصر وبين المغرب والعشاء بالمدينة من غير خوف ولا مطر ولا سفر

اب یہ دنیا میں کسی کا بھی مذہب نہیں کہ جمع حقیقی بغیر عذر کے کیا جائے جو لوگ جمع حقیقی کے قائل ہیں ان کے ہاں بھی شرائط ہیں۔

❷ ابواب الحدود میں حد شارب خمر کے بارے میں ہے کہ جو شراب پیئے اور پکڑا جائے اس کو اسی کوڑے مارو فان عاد فاضربوا فان عاد فاضربوا فان عاد فاضربوا فان عاد فاقتلوا یہ بھی کسی کا مذہب نہیں۔

انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ ان دو احادیث پر بھی عمل ہوسکتا ہے وہ اس طرح کہ پہلی حدیث کو جمع صوری پر محمول کیا جائے اور دوسری حدیث میں قتل کا حکم تعزیراً ہو اور احناف اور مالکیہ کے نزدیک تعزیراً قتل جائز ہے۔

خصوصیت نمبر ❸: اس کتاب میں ترمذی نے بخاری، مسلم، ابوداؤد کے طریقوں اور مقاصد کو جمع کیا ہے بخاری کا مقصد استخراج المسائل ہے امام مسلم کا مقصد احادیث کے مختلف طریق پر جمع کرنا ہے ابوداؤد کا مقصد مستدلات الفقہاء کو جمع کرنا ہے امام ترمذی نے تینوں چیزوں کو جمع کیا ہے۔

خصوصیت نمبر ④: سنن ترمذی اسہل الحصول ہے اس میں حدیث تلاش کرنا آسان ہے جبکہ صحیح بخاری وغیرہ میں حدیث تلاش کرنا مشکل ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ درود ابراہیمی احناف کے الفاظ کے ساتھ بخاری میں نہیں، یہ غلطی ان کو اسلئے لگی کیونکہ اس کو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب الصلاۃ کے بجائے ابواب المناقب میں ذکر کیا ہے۔

خصوصیت نمبر ⑤: امام ترمذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابواب قائم کرکے احادیث نقل کی ہیں، پھر ان احادیث سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں اور فقہاء نے جو مسائل نکالے ہیں، امام ترمذی ان مسائل اور فقہاء کے اقوال کو ذکر کرتے ہیں کہ یہ فلاں کا قول ہے۔ ائمہ اربعہ اور دوسرے مشہور ائمہ کے اقوال کے ساتھ ساتھ ان ائمہ کے اقوال بھی ذکر کرتے ہیں۔ جن کی کتب اور ماننے والے اب موجود نہیں رہے جیسے سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ (امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے استاد اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد و معاصر تھے) اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے پہلے مدینہ کے فقہاء سبعہ کے اقوال بھی ذکر کرتے ہیں۔

خصوصیت نمبر ⑥: امام ترمذی حدیث نقل کرنے کے بعد اس کا مرتبہ بتادیتے ہیں، کہ صحیح ہے یا حسن یا غریب جبکہ دوسرے محدثین مثلاً بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ انہوں نے شرط لگائی ہے کہ وہ صحیح حدیث نقل کریں گے۔ لیکن وہ حدیث نقل کرنے کے بعد مرتبہ نہیں بتاتے، اسی طرح امام مسلم بھی مرتبہ نہیں بتاتے۔

خصوصیت نمبر ⑦: سند کے راویوں میں اگر کوئی ضعیف راوی آجائے تو امام ترمذی اس کے بارے میں محدثین کے اقوال بتادیتے ہیں کہ ثقہ ہے یا ضعیف، اگر اس کے بارے میں اختلاف ہو تو پھر بھی بتادیتے ہیں کہ فلاں نے ثقہ کہا ہے فلاں نے ضعیف، جبکہ یہ چیزیں باقی محدثین بہت کم ذکر کرتے ہیں۔

خصوصیت نمبر ⑧: امام ترمذی نے اپنی کتاب میں اختصار اپنایا ہے۔ یعنی ترجمۃ الباب کو ذکر کریں تو اس کے اثبات کے لئے بطور دلیل کے ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ اور اگر اس باب کے متعلق دوسری احادیث ہوں تو مختصراً کہتے ہیں "وفی الباب عن فلان وعن فلان" دوبارہ مکمل حدیث نقل نہیں کرتے۔

نوٹ نمبر ①: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ جہاں فرمائیں "وفی الباب عن فلان وعن فلان" بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس قول سے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ جو حدیث ذکر کردی، فلاں فلاں سے بھی یہی متن ضروری ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے بلکہ وفی الباب سے جن صحابہ کی روایت کی طرف اشارہ کریں اس کے لئے ضروری نہیں کہ الفاظ بھی بعینہ وہی ہوں۔ مگر کبھی معنی تو ایک ہوتا ہے مگر الفاظ مختلف۔

نوٹ نمبر ②: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو وفی الباب عن فلان لکھا ہے بعض حضرات نے اس پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں اور ان احادیث کی تخریج بھی کی ہے۔

خصوصیت نمبر ⑨: حدیث کی سند میں جو راوی ہوتے ہیں ان کا ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تعارف بھی کرایا ہے یعنی جو راوی معروف نہ ہوں ان کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔ کہ اس کا نام یہ ہے لقب اور کنیت یہ ہے اور کبھی اس کے اساتذہ یا شاگرد بھی ذکر کردیتے ہیں۔

حدیث میں سند کی اہمیت

حدیث میں سند کا بڑا اعتبار ہوتا ہے مقدمہ مسلم میں عبداللہ بن مبارک کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ **"الاسناد من الدین لولا الاسناد لقال من شاء ماشاء"** اس لئے سند بڑی لازمی چیز ہے اگر کوئی کہے کہ یہ حدیث ہے تو اس سے سند کا مطالبہ کیا جائے گا

پھر سند پر غور کیا جائے گا کہ صحیح ہے یا ضعیف۔

دو قسم کے دور گذرے ہیں: ① ۔تدوین حدیث سے پہلے کا دور۔ ②۔تدوین حدیث کے بعد کا دور۔تدوین حدیث سے پہلے کا جو دور تھا اس میں سند انتہائی ضروری تھی بغیر سند کے کسی کی بات نہ مانی جاتی تھی لیکن جب دوسرا دور آیا کتابیں مدون ہوئیں جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد......الخ تو ان حضرات نے سند کو حضور اکرم ﷺ تک پہنچایا ہے سند کے بارے میں اصول حدیث کا مسئلہ ہے کہ سند تدوین حدیث سے پہلے کی طرح اب بھی ضروری ہے اگر استاد سے نہ پڑھا ہو مثلاً بخاری کی روایت سنائے تو یہ صرف وجادہ کے درجے میں ہوگا اور غیر مقبول ہوگا اس لئے ہر آدمی کیلئے سند بخاری یا مسلم یا ترمذی تک پہنچانا ضروری ہے تا کہ وہ حدیث وجادہ سے نکل جائے۔

ہماری سند کے تین حصے ہیں ① قال الشیخ المکرّم محمد اسحاق سے لیکر امام ترمذی تک ② دوسرا حدثنا قتیبۃ سے لیکر نبی کریم ﷺ ③ وہ ہے جو ہم سے شاہ محمد اسحاق تک جاتا ہے وہ یہ ہے

المفتی نظام الدین بن حبیب الرحمٰن عن فیض علی شاہ عن شیخ الاسلام السید حسین احمد مدنی عن الشیخ الھند محمود حسن الدیوبندی عن رشید احمد الگنگوہی وقاسم نانوتوی عن الشاہ عبدالغنی عن الشاہ محمد اسحاق۔

پہلی بات: سند شروع کرتے وقت پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ "وبه قال حدثنا قتيبه بن سعيد" یہ طریقہ حضرت مدنی سے منقول ہے "به" کا معنی "بالسند المتصل منی الی الامام الترمذی" قال کی ضمیر امام ترمذی کی طرف راجع ہوگی تو گویا ہر حدیث میں سلسلہ حضور اکرم ﷺ تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسری بات: بطور تمہید: حدیث میں دو چیزیں ہیں ① تحمل حدیث ② ادا کرنا۔تحمل حدیث یہ ہے کہ استاد سے حدیث سنی پھر لکھ لی یا اس کو یاد کر کے محفوظ کر لیا دوسری چیز اداء ہے کہ یہ حدیث جو لکھی یا یاد کی اس کو اسی سند کے ساتھ شاگردوں کو سنا دی اب تحمل حدیث پھر اس کو ادا کرنے کیلئے مختلف صیغے استعمال ہوتے ہیں: ① حدثنا ② اَخبرنا فلان اس میں اَخبر ماضی کا صیغہ ہے نا اس کا مفعول ہے اس کے بعد نام اس کا فاعل ہوگا۔حدثنا کی بھی یہی ترکیب ہے ③ انبأنا فلان اس کی بھی یہی ترکیب ہے۔ ④ عن ⑤ قال مثلاً "اخبرنا زيد قال قال عمرو"۔ ⑥ اَن فلان قال جیسے "اخبرنا زيد قال ان عمراً قال" یہ عام طور پر صیغ ادا کہلاتے ہیں۔

تیسری بات: محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حدثنا اتصال پر دال ہے۔اخبرنا بھی اسی طرح ہے اور انبأنا بھی اتصال پر دلالت کرتا ہے اتصال کہتے ہیں کہ دونوں کی ملاقات بھی ہو چکی ہو اور شاگرد نے استاد سے روایت سنی بھی اور سنی بھی بلا واسطہ ہو عن قال ان فلان قال یہ اتصال پر دلالت نہیں کرتے ان سے صراحت ثابت نہیں ہوتی کہ راوی کا مروی عنہ سے لقاء ثابت ہے یا سماع ثابت بلکہ ان میں لقاء سماع اور عدم لقاء وسماع سب کا احتمال ہے اب یہ معلوم کرنا ہے کہ جب راوی عن سے روایت نقل کرے یا قال سے یا اَن فلان قال سے نقل کرے اس میں سماع اور لقاء معلوم کرنا خارجی امور سے ہوگا مقدمہ مسلم میں آئے گا کہ حدیث معنعن سند متصل پر دلالت کرتی ہے یا نہیں اس میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں معاصرت ہو دوسرا امکان لقاء ہو تو سند معنعن اتصال پر محمول ہوگی الا یہ کہ صراحتاً عدم اتصال ثابت ہو جائے لیکن امام بخاری کے نزدیک معنعن کو اتصال پر تب محمول کریں گے جب لقاء مرۃً ثابت ہو صرف امکان کافی نہیں ہے۔

چوتھی بات: پہلے زمانہ میں احادیث کو شاگرد سن کر لکھتے تھے پھر اٹھا کر دوسرے جگہ لے جاتے تھے اس میں کافی مشکلات تھیں اس

لئے محدثین نے سند کے لکھنے میں اختصار کا طریقہ اختیار کیا اس لئے ''نا'' یہ حدثنا کا مخفف ہے اسی طرح أنا یہ أخبرنا کا مخفف ہے اب یہ تخفیف صرف لکھنے میں ہے قرأت میں نہیں مثلاً ہے **حدثنا قتيبة بن سعيد. أنا** ۔اس کو أخبرنا پڑھیں گے اور اس سے قبل قال بھی محذوف ہوگا۔

لفظ ابن کا قاعدہ:

سند میں ابن کا لفظ آتا ہے تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اسمائے متناسلہ متناسقہ کہ درمیان میں نام ساقط نہ ہو تو اس کے ساتھ الف نہ لکھا جائے گا ہاں دو مقامات پر الف لکھا جائے گا ① اسم متناسق و مسلسل نہ ہوں وہاں ابن لکھیں گے ② سطر کی ابتداء میں آجائے۔ غیر متناسق کی مثال عبداللہ بن عمرو بن ام مکتوب اب ام مکتوم عمر کی والدہ کا لقب ہے اس کا والد نہیں اسی طرح محمد بن علی ابن الحنیفۃ۔

لفظ ابن کا اعراب: یہ اسمائے متناسلہ کے درمیان جو بن کا لفظ آتا ہے اعراب میں اسم اول کے تابع ہوتا ہے جیسے حدثنا قتیبۃ بن سعید بعض اسماء کے آخر میں نسبتیں آتی ہیں مثلاً حدثنا فلان ابن فلان التمیمی اب یہ نسبتیں قبیلہ کی طرف ہو یا نسبت الی البلدان ہو یہ اسم اول کی صفت واقع ہوتی ہے اور اعراب میں بھی اسم اول کے تابع ہوگی جیسے حدثنا ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ الترمذی، تو ترمذی کا تعلق محمد سے ہوگا۔

پھر تحمل حدیث کی دو صورتیں ہیں استاد پڑھے شاگرد سنے یہ قرأۃ الشیخ ہے یہ بعض محدثین کے ہاں افضل ہے اب شاگرد جب نقل کرے تو اگر اکیلا ہو تو کہے گا حدثنی اور اگر شاگرد زیادہ ہوں تو کہے حدثنا لیکن اگر اخبرنا أنبأ نا کہے تو یہ بھی جائز ہے۔

تحمل کی دوسری صورت ہے قرأۃ علی الشیخ کہ شاگرد پڑھے اور استاد سنے فقہاء کے نزدیک یہ طریقہ افضل ہے اب اگر اسمیں شاگرد اکیلا ہو تو جب وہ سنائے گا تو کہے گا أخبرنی فلان اور اگر شاگرد کئی ہوں ان میں سے ایک پڑھے باقی ساتھی اور استاد سنیں تو عام طور پر استعمال اخبرنا کا ہوتا ہے اور کبھی کہا جاتا ہے ''حدثنا فلان قرأۃ علیہ وأنا أسمع'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی پڑھے استاد سنے اور دوسرے ساتھ بیٹھ جائیں تو جب وہ خود پڑھائیں گے تو یہ الفاظ کہیں گے یہ معاملہ ترمذی کے ساتھ ہوا ان کے استاد نے نکال دیا تھا تو جب دوسرا آدمی پڑھتا تھا تو یہ صرف سنتے تھے تو پڑھاتے وقت امام ترمذی کہتے ہیں ''**حدثنا حارث بن مسكين قرأة عليه وأنا اسمع**''۔

تحویل سند: تحویل سند کی صورت یہ ہے کہ سند کے دو جانب ہیں ایک جانب جو نبی کریم ﷺ سے شروع ہو کر ہم تک پہنچے دوسرا یہ کہ ہم سے شروع ہو کر حضور اکرم ﷺ تک جا پہنچے، یہ جانب اسفل ہے اور جو حضور ﷺ سے شروع ہوتا ہے وہ جانب اعلیٰ ہے کبھی صورت یہ ہوتی ہے کہ جانب اعلی سے دو یا تین سندیں آئیں درمیان میں ایک آدمی پر وہ سندیں جمع ہو جائیں وہاں سے سند ایک ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسفل میں دو سندیں ہیں درمیان میں ایک آدمی پر جمع ہو جاتی ہیں وہاں سے آگے اوپر تک سند ایک ہو جاتی ہے۔ اب اوپر یا نیچے جہاں سے آدمی پر سندیں جمع ہوں اس کو مدار سند کہتے ہیں۔ تحویل سند کی کبھی علامت ہوتی ہے کبھی علامت نہیں ہوتی صرف حرف عطف ہوتا ہے کوئی اصطلاحی علامت تحویل کی نہیں ہوتی۔

اور کبھی اصطلاحی علامت ہوتی جیسے عن سماک بن حرب ح تحویل سند کی علامت کو کس طرح پڑھیں گے؟ اس میں محدثین کے دو طریقے ہیں ① مغربی محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو تحویل کا مخفف قرار دیتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ تحویل پڑھیں گے اگرچہ لکھتے وقت ح لکھیں گے۔ ② مشرقی محدثین اس کو پڑھتے بھی تخفیف کے ساتھ ہیں جس طرح لکھی جاتی ہے اس قول کو جمہور

محدثین نے اختیار کیا ہے مشرقی محدثین کے پھر دو قول ہیں ① ممدودہ پڑھیں گے ''حاء''، ② مقصورہ پڑھیں گے ''ح''۔
مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تفسیر کشاف میں خلیل کے حوالے سے قاعدہ لکھا ہے کہ اس نے شاگردوں سے سوال کیا کہ ''لکَ'' میں لام کو کس طرح پڑھتے ہو تو انہوں نے کہا کہ لام پڑھتے ہیں۔ خلیل نے کہا کہ یہ تو اس کا نام ہے حرف کا تکلم نہیں تو معلوم ہوا کہ حروف مفردہ جب مفرد آئیں تو ان کو ممدود پڑھتے ہیں اس لئے ممدودہ پڑھنا بہتر ہے۔
اب ابوالفتح کا پہلی سند میں استاد قاضی زاہد تھا دوسری سند میں اس کا استاد ابونصر عبدالعزیز ہے تو دو استاد ہو گئے۔ تیسرا استاد ہے الشیخ ابوبکر، قالوا أخبرنا ابومحمد عبدالجبار۔ قالوا کا فاعل تینوں استاد ہیں، ان تینوں کا استاد عبدالجبار ہے، اور عبدالمجید کا استاد ابوعباس محمد بن احمد ہے۔

فاقربه الشيخ الثقة الأمين الخ معارف السنن میں شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ذکر ہے، کہ یہ جملہ سنن ترمذی کے معتبر نسخوں میں نہیں ہے لیکن جن نسخوں میں ہے وہاں دو باتیں قابل فہم ہیں ① اس جملے کا قائل کون ہے۔ ① اقر کا فاعل اور الثقۃ الامین کا مصداق کون ہے؟ ان باتوں میں اختلاف ہے۔
قول ❶: عبدالرحمٰن مبارک پوری کہتے ہیں کہ اس جملے کا مصداق ابومحمد عبدالجبار بن محمد ہے ''اقر'' کا فاعل بھی یہی ہے باقی اس جملے کا قائل کون ہے کیونکہ اس کے تین شاگرد ہیں۔ قاضی زاہد، ابونصر عبدالعزیز اور ابوبکر ان میں کس کا جملہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ تعین کے ساتھ قائل معلوم نہیں البتہ ان تینوں میں سے کوئی ایک ہے۔
قول ❷: انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق عبدالجبار کا استاد ابوعباس محمد بن احمدؒ ہیں۔ اور اقر کا فاعل بھی یہی ہے اور اس جملے کا قائل ابومحمد عبدالجبار ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اسانید کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں ثقۃ الامین ابوالعباس کے لقب کے طور پر ذکر ہے۔
اب اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ پہلے زمانے میں دو طریقے ہوتے تھے ① استاد احادیث شاگردوں کو سناتا اور شاگرد لکھتے۔ ② شاگرد استاد کے پاس آئے اور اس کی کتاب مانگ لے پھر اس کو لکھ لے پھر اصل کے ساتھ تقابل کرے پھر استاد کو سنائے، جب مجلس ختم ہو جائے تو استاد کہتا جس طرح تم نے سنایا، میری مرویات اسی طرح ہیں یہ مطلب ہے ''**فاقربه الثقة الامين**'' کا۔
اب شاگرد استاد کو پڑھ کر سنائے اور مجلس کے اخیر میں اس سے اقرار نہ کرائے اس کے بارے میں دو قول ہیں:
ا: ابواسحٰق شیرازی کہتے ہیں کہ استاد سے اگر اقرار نہ لے تو ان احادیث کا اعتبار نہ ہوگا۔
۲: جمہور محدثین کہتے ہیں کہ استاد بیٹھا اپنی کتاب کھول دی شاگردوں کو آنے کی اجازت دی۔ اور شاگردوں سے سن رہا ہے، تو یہ اجازت کی علامت ہے اگر اجازت نہ ہوتی تو غلطی نکالتا ٹوک دیتا اس لئے دوبارہ اقرار ضروری نہیں۔

ابواب الطهارة

محدثین وفقہاء کا طریقہ یہ ہے کہ مسائل ایک جنس کے ہوں اگرچہ نوع مختلف ہوں، ان کو کتاب کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں بعض محدثین کتاب کے معنی میں ابواب کو استعمال کرتے ہیں تو ابواب الطہارت بمعنی کتاب الطہارت کے ہے۔ امام ترمذی ہر جگہ ابواب کو بمعنی کتاب کے لیتے ہیں اور اگر متحد الانواع مسائل ہوں اس کو باب سے ذکر کرتے ہیں۔ عن رسول اللہ ﷺ اس کو امام ترمذی ہر کتاب میں ذکر کرتے ہیں یہ قید اس لئے لاتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہوتا ہے کہ ان ابواب میں اکثر واغلب احادیث مرفوعہ ہیں۔

متقدمین کا طریقہ تھا جس طرح امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب الاثار یا موطائین میں وہ مرفوع احادیث آثار صحابہ، آثار تابعین بلکہ آگے اپنے اجتہادات بھی ذکر کردیتے ہیں اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس لئے متقدین کی کتب میں صرف مرفوع احادیث نہ ذکر فرماتے تھے۔احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعد یا مسدد بن مسرہد کے بعد کے لوگوں نے صرف احادیث مرفوعہ ہی کو ذکر کیا ہے یا زیادہ سے زیادہ کسی صحابی کا اثر نقل کردیتے ہیں اس لئے متاخرین عن رسول اللہ ﷺ کی قید لگاتے ہیں۔

باب ماجاء لاتقبل صلاة بغير طهور

کوئی نماز بغیر طہارت کے قبول نہیں ہوتی،اس پر عبداللہ بن عمر سے حدیث نقل کی ہے"**لاتقبل صلاة بغير طهور ولا صدقةمن غلول**" یہ حدیث دو جملوں پر مشتمل ہے ① **لاتقبل صلاة بغير طهور** ② **ولا صدقة من غلول.**

امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو ترجمۃ الباب قائم کیا ہے یہ ترجمۃ الباب بمنزلہ دعویٰ کے ہوتا ہے اس کے تحت حدیث بمنزلہ دلیل کے ہوتی ہے۔محدثین عموماً ترجمۃ الباب ان الفاظ سے اخذ کر کے قائم کرتے ہیں جو الفاظ حضور اکرم ﷺ سے منقول ہوں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ الباب حدیث کے الفاظ سے قائم کیا ہے اب ترجمۃ الباب میں امام ترمذی کی غرض کیا ہے؟ وہ غرض یہ ہے کہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ عمل جس پر شرعاً صلاۃ کا اطلاق ہوتا ہے وہ عمل بغیر طہور کے قابل قبول نہیں۔

لاتقبل صلاة بغير طهور:

تقبل قبول سے ہے۔ق،ب،ل،مادہ ہے۔معارف السنن میں ہے کہ قبول کے مادے کا مفہوم ہے"ترتب الغرض المطلوب من الشئ علی الشئ"، کہ کسی چیز کا غرض مطلوب ثابت ہوجائے بعض نے اس کا معنی کیا ہے رضا مثلاً نماز کوئی پڑھے اس سے مقصود اللہ کی رضا ہے اب غرض (رضا) یہ نماز پر مرتب ہوجائے تو نماز قبول ہوجائے گی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے بڑے علماء نے ذکر کیا ہے کہ قبولیت دو قسم پر ہے۔

۱: قبولیت مطلق (فتح الملہم) اس کے معنے ہے"کون الشئ مستجمعاً للارکان والشرائط" اس معنٰے کے اعتبار سے قبول صحت کا مترادف ہے،جس طرح حدیث میں ہے"**لايقبل الله صلاة الحائض الابخمار**" یہاں لایقبل بمعنی لایصح کے ہے۔

۲: قبول کی دوسری قسم جس کو شبیر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ قبول حسن سے مسمیٰ کرتے ہیں یہ معنٰے پہلے والے معنے سے اخص ہے قبول حسن کا معنی ہے"**كون الشئ من يترتب عليه من وقوعه عندالله تبارك وتعالىٰ موقع الرضا ويترتب عليه الثواب والدرجات**" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں کسی چیز کا اس مقام پر ہونا کہ اس چیز سے اللہ کی رضا مل جائے جس طرح قرآن میں ہے ﴿**انما يتقبل الله من المتقين**﴾ یہاں بھی قبول حسن مراد ہے۔اب کوئی مغصوبہ زمین میں نماز پڑھے تو فرض ادا ہوگیا،مگر اس کو قبول نہ کریں گے قبول نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ثواب نہ ملے گا کیونکہ انتفاء اخص انتفائے اعم کو مستلزم نہیں۔اب دوسرا معنی اخص ہے یہ نہ پایا جائے تو مطلق قبول جو معنے اعم ہے یہ منتفی نہیں ہوگا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قبول معنی ثانی کے اعتبار سے یہ معنے حقیقی ہے قبول مطلق والا معنی (معنی اعم صحت کا مترادف) یہ مجازی معنی ہے شبیر احمد عثمانی کا قول اس کے برعکس ہے وہ اعم معنی کو حقیقی اور اخص معنی کو مجازی کہتے ہیں۔معارف السنن میں ہے کہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ راجح ہے۔

لاتقبل صلاة:

میں صلاۃ نکرہ ہے اور تحت النفی واقع ہے تو یہ عموم کا فائدہ دے گا جیسے "لا رجل فی الدار" کہ گھر میں کوئی مرد بھی نہیں، تو حدیث کا معنی بھی ہوگا بغیر طہارت کے اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی نماز بھی قبول نہیں کرتے۔ طہور بمعنی فعل طہارت یہ غسل، وضوء، تیمم، سب کو شامل ہے۔ یہاں حدیث میں بھی بضم الطاء (طُہور) ہے مگر مراد صرف وضوء ہے دلیل دوسری روایت ہے جس میں حتیٰ یتوضأ کے الفاظ ہیں یہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، طہور بمعنی آلہ طہارت پانی ہو یا مٹی یہ جمہور کے نزدیک فرق ہے۔ خلیل، سیبویہ، ابو حاتم، اصمعی یہ چاروں کہتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں بفتح الطاء ہے، فعل طہارت معنی کرو یا آلہ طہارت، اب طہور کا کونسا معنی مراد ہے اس میں سیاق وسباق کو دیکھیں گے۔

مسئلہ: شریعت کی اصطلاح میں جس کو صلاۃ کہتے ہیں وہ عمل بغیر طہارت کے قبول نہیں، اب یہاں دو باتوں میں اختلاف ہے، سجدہ تلاوت وصلاۃ جنازہ میں، جمہور، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سجدہ تلاوت اور جنازے کی نماز دونوں بغیر طہارت کے جائز نہیں، کیونکہ قرآن نے جنازے کی نماز کو صلاۃ کہا ہے "ولا تصل علیھم" اس لئے لاتقبل صلاۃ الخ میں یہ بھی شامل ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن علیۃ، ابن جریر طبری رحمہ اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ نماز جنازہ اور سجدہ تلاوہ بغیر طہارت کے جائز ہیں کیونکہ نماز جنازہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دعا ہے اور سجدہ تلاوت صلاۃ نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ نماز جنازہ تو بغیر طہور کے جائز نہیں مگر سجدہ تلاوت جائز ہے۔ دلیل ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل نقل کیا ہے کہ "کان یسجد علی غیر وضوء" مگر جمہور کہتے ہیں کہ سجدہ نماز کا جزو اعظم ہے اس لئے بغیر طہارت کے جائز نہیں ہوگا۔

فاقد الطہورین کا مسئلہ:

ایک آدمی وضوء وتیمم پر قادر نہیں تو یہ آدمی کیا کرے گا؟ اس میں اختلاف ہے کہ فاقد الطہورین کا کیا حکم ہے؟ ① امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جدید اور ایک روایت میں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بھی ہے کہ "لا یصلی بل یقضی" ② امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول قاضی ابو بکر مالکی نے ذکر کیا ہے "لا یصلی ولا یقضی" کیونکہ عدم قدرت کی وجہ سے مکلف ہی نہیں۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول "یصلی ویقضی وجوباً" ④ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک روایت میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تیسرا قول یہ ہے کہ "یصلی ولا یقضی" کیونکہ ﴿لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا﴾ ⑤ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول ہے کہ "یصلی استحبابا ویقضی وجوبًا ⑥ صاحبین فرماتے ہیں کہ نماز کے وقت میں تشبہ بالمصلین کرے گا کہ افعال تو نماز کے کرے مگر نیت نہ کرے، بعد میں قضاء واجب ہوگی، امام صاحب کا رجوع بھی اس قول کی طرف ثابت ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صاحبین کا قول مفتی بہ اور اصح ہے، شریعت کے دو اجماع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

❶ ایک اجماع صوم کے متعلق ہے کہ عورت کو رمضان میں دو پہر کو حیض آیا تو روزہ ختم ہو گیا لیکن اب یہ کھائے گی نہیں بلکہ صائمین کے ساتھ تشبہ اختیار کرے گی۔ اسی طرح بچہ دو پہر کو رمضان میں بالغ ہو گیا یا عورت حیض سے پاک ہو جائے سب تشبہ کریں گے۔

② کوئی آدمی حج کر رہا ہے کسی وجہ سے حج فاسد ہو گیا اب آئندہ اس پر قضاء واجب ہے لیکن اس سال حج کے ارکان آخر تک ادا کرتا رہے گا۔ تشبہ بالحجاج کے طور پر۔ اسی طرح فاقد الطہورین بھی تشبہ بالمصلین اختیار کرے گا۔

ولا صدقة من غلول ''کوئی صدقہ قبول نہ کیا جائے گا غلول سے''۔

پہلی بات: صدقہ کا لفظ صدقہ قبول واجبہ اور صدقہ نفلیہ دونوں کو شامل ہے۔

دوسری بات: غلول نصر سے ہے اس کا معنے ہے مال غنیمت یا مال فیٔ سے چوری کرنا، بعد میں اس کے معنی میں وسعت ہوئی اور ہر مال حرام پر اس کا اطلاق ہونے لگا، یہاں بھی اس عام معنی میں مستعمل ہے۔

تیسری بات: مال حرام کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ مال حرام سے کوئی صدقہ کرے ثواب کی نیت سے تو کافر ہو جائے گا۔ دوسرا مسئلہ کتاب الغصب میں ہے کہ کسی کے پاس حرام مال آ جائے مثلاً ہزار روپے غصب کیئے پھر اس سے ہزار اور کما لئے تو اس میں دو قول ہیں۔ ① مالک کو دے دے ② فقراء کو صدقہ کر دے اگر مالک معلوم نہ ہو۔ تو بظاہر تعارض ہے، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تطبیق یوں دی ہے کہ پہلا مسئلہ محمول ہے اس پر کہ صدقہ وثواب دونوں کی نیت کرے دوسرے مسئلے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ کرے مگر صدقے کے ثواب کی نیت نہ کرے باقی ممکن ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب دیدے۔ امام صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ تصدق علی الفقراء کو مال حرام کا مصرف کس طرح بنا دیا، انہوں نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ میں نے ایک روایت سے مستنبط کیا ہے وہ عاصم بن کلیب کی حدیث ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ ایک جنازے میں شریک تھے واپسی پر ایک عورت کے داعی نے کھانے کی دعوت دی وہاں گئے کھانے لگے گوشت چبایا تو پھینک دیا۔ عورت سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے آدمی بھیجا مگر بکری نہ مل سکی، دعوت دے چکی تھی، پڑوس میں ایک بکری تھی آدمی بھیجا شوہر موجود نہ تھا بیوی نے فروخت کر دی آپ ﷺ نے فرمایا مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کی ہے اس لئے ہم نہیں کھاتے قیدیوں کو کھلا دو۔

دونوں جملوں میں مناسبت:

① وضوء طہارت بدن ہے صدقہ طہارت مال ہے اس لئے طہارتین (طہارۃ بدن ومال) کو جمع کر دیا۔ ② دونوں مقیس مقیس علیہ ہیں کہ جس طرح مال حرام سے صدقہ قبول نہیں اسی طرح نماز بغیر طہور کے قبول نہیں۔ ہذا الحدیث اَصح شی کا مطلب یہ ہے کہ اس باب میں جو احادیث ہیں ان سے یہ واضح ہے لیکن فی نفسہ بھی صحیح ہے یا نہیں یہ خارج سے معلوم کیا جائے گا۔

باب ماجاء فی فضل الطهور

اس باب کے ضمن میں حدیث نقل کی ہے کہ جب عبد مؤمن یا فرمایا عبد مسلم وضوء کرے اور چہرہ دھولے تو پانی کے ساتھ وہ گناہ گر جاتے ہیں جو آنکھوں سے دیکھے اور جب دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو وہ تمام گناہ دھل جاتے ہیں جو اس کے ہاتھوں نے پکڑ کر کئے تھے، یہاں تک کہ گناہوں سے فارغ ہو کر پاک ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد کیا ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ اس سے وضوء کی فضیلت ثابت کرنا ہے کہ وضوء تمام اعمال کی طرح باعث فضیلت عمل ہے۔

دوسری بات: ''اذا توضأ العبد المسلم او المؤمن'' او کا لفظ کبھی تنویع کبھی تخییر اور کبھی تردد اور شک کے لئے استعمال ہوتا ہے رواۃ حدیث جب روایت نقل کرتے ہیں تو الفاظ میں ان کو شبہ ہوتا ہے کہ کونسا لفظ کہا تو وہ دونوں لفظ ذکر کر دیتے ہیں، اور درمیان میں

اَوْ لے آتے ہیں یہ تردد کے لئے ہوتا ہے اور محدثین اَوْ کے بعد قال کا لفظ مقدر مانتے ہیں، اور پڑھتے وقت اس کا تلفظ کرتے ہیں۔

تیسری بات ''او'' تردیدیہ اور ''او'' تنویعیہ میں فرق کس طرح کریں گے؟ معارف السنن میں ہے کہ اس کی علامت نہیں بلکہ پڑھنے والا سیاق وسباق اور اپنے ذوق سے معلوم کرے گا۔

چوتھی بات: خرجت کل خطیئة اس عبارت میں ایک بات یہ ہے کہ چہرہ، ناک، آنکھ، اور منہ کے علاوہ بھی اجزاء پر مشتمل ہے لیکن حدیث میں عینین کی تخصیص کیوں کی؟ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ دوسرے اعضاء کے لئے غسل کا عمل مقرر ہے مثلاً منہ میں الگ پانی ڈالتے ہیں، ناک میں الگ پانی ڈالتے ہیں، تو چہرے کے دھوئے بغیر بھی ان کو مستقل دھویا جاتا ہے مگر آنکھ کے دھونے کا مستقل عمل نہیں ہے۔ بلکہ چہرے ہی کے ساتھ دھویا جاتا ہے۔ اس لئے آنکھوں کی تخصیص کی ہے، یا اس وجہ سے تخصیص کی کہ منہ اور ناک کے مقابلے میں آنکھوں سے گناہ زیادہ ہوتے ہیں۔

پانچویں بات: یہاں حدیث میں اختصار ہے، سنن نسائی میں تمام اعضاء وضوء کا ذکر ہے۔

چھٹی بات: وضوء گناہوں کے لئے کفارہ بنتا ہے تو ان گناہوں سے کونسے گناہ مراد ہیں؟ محدثین کا اس میں اختلاف ہے، فقط صغائر معاف ہوتے ہیں لیکن اس سے وہ گناہ مراد ہیں جو حقوق اللہ میں کوتاہی سے ہوں۔ لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوتے صرف صغائر معاف ہونے کی دلیل ہے۔ ﴿ان تجتنبوا کبائر ماتنھون عنه نكفر عنكم سيأتكم ﴾ حدیث میں بھی قید مذکور ہے کہ اعمال کفارہ بنتے ہیں ''ما اجتنب الکبائر'' ثابت ہوا کہ اعمال صغائر کے لئے کفارہ ہوں گے۔

اشکال: جس کے صغائر نہ ہوں صرف کبائر ہوں اس کا کیا ہوگا اس میں دو قول ہیں۔

❶ کبائر معاف نہیں ہوں گے۔

❷ کبائر میں تخفیف پیدا ہو جاتی ہے اس طرح کی وہ صغائر بن جاتے ہیں اور پھر دوسرے عمل سے معاف ہو جاتے ہیں۔

❷ یہاں حدیث میں مطلق آیا ہے کہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ دونوں اعمال سے معاف ہو جاتے ہیں۔

❸ بعض کہتے ہیں صغائر کے لئے اعمال مکفر ہیں اور کبائر کے لئے بھی مکفر ہیں مگر مع التوبہ۔

❹ علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں صغائر ہوں یا کبائر اس میں جانے کی ضرورت نہیں حدیث کے لفظ کے لغوی معنی کو دیکھا جائے، کیونکہ گناہ مختلف مراتب کے ہیں، ذنب ادنیٰ مرتبہ ہے، پھر خطیئہ کا درجہ ہے، تیسرا مرتبہ سیئۃ کا ہے، چوتھا مرتبہ معصیت کا ہے، اب حدیث میں کونسا لفظ ہے تو بعض میں ذنب کا لفظ موجود ہے، بعض میں خطیئۃ کا لفظ ہے، تو جن الفاظ کا ذکر ہے اسی درجہ کے گناہ کے لئے کفارہ بنیں گے۔

ساتویں بات: اعتراض:۔ حدیث میں فرمایا ''خرجت من وجہہ'' عفو کے لئے خرج کا لفظ آیا جبکہ خروج کا لفظ ذی جرم کے لئے آتا ہے، لیکن گناہ تو معانی کے قبیل سے ہیں؟

جواب نمبر ❶ بعض محدثین کہتے ہیں کہ خروج کو لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ خروج کا لفظ استعارہ ہے عفو الذنب سے۔

جواب نمبر ❷ امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ خروج حقیقۃً استعمال ہوا ہے اور گناہ کا ارتکاب جرمٌ ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے ''اذا اذنب الرجل نقطت فی قلبه نقطة سوداء'' اب کالا رنگ ذی جرم اشیاء میں سے ہے اس لئے خروج کا لفظ استعمال کیا۔

جواب نمبر ❸ علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عالم کا اختلاف ہے ایک عالم مشاہدہ ہے یہاں بعض اشیاء نظر آتی ہیں

بعض نظر نہیں آتی اس کو معانی کہتے ہیں، ایک عالم مثال ہے جو چیز یہاں معانی کے قبیل سے ہوں وہ عالم مثال میں اجسام بن جاتے ہیں۔ حدیث میں خروج کا لفظ عالم مشاہدہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ عالم مثال کے اعتبار سے فرمایا: ؎

غیب را ابرے و آب دیگر است آسمان و آفتاب دیگر است

هذا حديث حسن صحيح:

یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہاں پر حسن اور صحیح دونوں کو جمع کر دیا، حالانکہ تعریف دونوں کی الگ الگ ہے، صحیح کہتے ہیں ہر اس حدیث کو جو سند متصل کے ساتھ منقول ہو۔ اور اس کے راوی عادل ہوں۔ ثقہ ہوں، اور تام الضبط ہوں اور اس روایت میں علت نہ ہو وہ روایت منکر یا شاذ نہ ہو۔ جبکہ حسن کے راویوں میں ضبط و اتقان کی کمی ہوتی ہے صحیح کے ضبط اور اتقان کی نسبت سے اور آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر دیا۔

جواب نمبر ❶ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اس میں یہ ہے کہ محدث کو تردد ہوتا ہے کہ ضبط و اتقان اعلیٰ درجہ کا ہے یا نہیں اس لئے وہ حسن بھی کہہ دیتے ہیں صحیح بھی۔

اشکال: پھر "او" کہنا چاہیئے تھا؟

جواب: حذف کر دیا ہے، محدثین نے ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات کی تردید کی ہے ایک وجہ یہ ہے کہ او تردید یہ کلام عرب میں حذف نہیں ہوتا، دوسرا یہ کہ کیا ترمذی کو ہر حدیث میں تردد ہی رہا۔

جواب نمبر ❷ ابن کثیر نے جواب دیا ہے کہ یہ حسن صحیح مستقل مرتبہ ہے۔ ان کے درمیان ایک حسن مجرد ہے ایک درجہ صحیح کا ہے درمیان میں حسن صحیح کا مستقل مرتبہ ہے۔

مگر محدثین نے اس کو بھی رد کیا ہے، رد نمبر ① یہ بات کسی نے نہیں کی ہے کہ تیسرا مرتبہ بھی ہے ② بعض احادیث بخاری و مسلم کی ہیں اور صحت کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ ترمذی نے ان کو درمیانی مرتبے پر کس طرح رکھا۔

جواب نمبر ❸ یہ جواب ابن دقیق العید نے دیا ہے کہ قبولیت کی جو صفات ہیں یہ جس میں اعلیٰ درجے کے ہوں تو اس کے ضمن میں ادنیٰ مرتبہ خود بخود موجود ہوتا ہے، اب محدث اعلیٰ درجہ پر نظر رکھ کر صحیح کہتا ہے کہ چونکہ اس ضمن میں ادنیٰ درجہ بھی ہے اس لئے حسن بھی کہہ دیتا ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔

ابو ہریرہ:

۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ ۵۲۷۴ احادیث ان سے منقول ہیں ۵۸ یا ۵۹ میں فوت ہوئے ان کے نام کے متعلق تیس اقوال ہیں۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ جاہلیت میں عبد الشمس نام تھا اور زمانہ اسلام میں عبد اللہ یا عبد الرحمٰن نام تھا۔

الصنابحی:

یہ منسوب ہے صنابح کی طرف جو قبیلہ مراد کی شاخ ہے، یہ کون ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس نام کے تین آدمی ہیں، ایک وہ صنابحی جس سے فضل الطهور کی روایت ہے ان کا نام عبد اللہ ہے یہ صحابی ہیں۔ دوسرا عبد الرحمٰن بن عسیلہ ہے اس کی کنیت ابو عبد اللہ ہے یہ تابعی ہے اور تیسرا صنابح بن الاعسر یہ بھی صحابی ہیں ان سے دوسری روایت منقول ہے۔

باب ماجاء ان مفتاح الصلاۃ الطهور

اس باب میں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تین جملوں پر مشتمل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ ① مفتاح الصلاۃ الطهور ② وتحریمها التکبیر ③ وتحلیلها التسلیم. یہ تینوں جملے الگ الگ حکم پر مشتمل ہیں۔

مفتاح الصلاۃ الطهور:

ترجمۃ الباب قائم کیا اور یہ حدیث کا پہلا جملہ بھی ہے۔ مصنف کا غرض یہ ہے کہ نماز کی چابی طہارت ہے اس میں استعارہ ہے حضور ﷺ نے نماز کو تشبیہ دی اس چیز کے ساتھ جس کو بند کر کے تالا لگایا جائے اب تالا کھلے بغیر کوئی وہاں جا نہیں سکتا اور تالا چابی کے بغیر کھل نہیں سکتا تو نماز محبوس چیز کی طرح ہے۔ حدث کی حالت کو تالے سے تشبیہ دی اور وضوء کی حالت کو چابی سے تشبیہ دی۔

دوسری بات: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ بغیر طہارت کے نماز جائز نہیں۔

تیسری بات: اس حدیث میں تین جملوں کے سمجھنے کے لئے تمہید کا سمجھنا ضروری ہے۔

مبتدا اور خبر میں سے جب ایک معرف بلام الجنس ہو تو وہ جملہ قصر کا فائدہ دیتا ہے۔ اب یہاں قصر المسند الیہ علی المسند ہے، یا قصر المسند علی المسند الیہ ہے اس میں اختلاف ہے جو اپنی جگہ آئے گا۔ اب ایسے جملے کا مفید للقصر ہونا قاعدہ کلیہ نہیں۔ شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں جس سے کوئی فرد خارج نہ ہو۔ ایسے قاعدے ممکن نہیں اس لئے یہ قواعد اندھے کی لاٹھی کی طرح ہیں۔

تمہید کے بعد پہلا جملہ ہے "مفتاح الصلاۃ الطهور" یہاں الطهور معرف بلام الجنس ہے یہاں قصر ہوگی کہ نماز کی کنجی صرف طہارت ہے، اس کے علاوہ کوئی چابی نہیں اب وہ طہارت غسل کی صورت میں ہو یا وضوء یا تیمم کی صورت میں ہو۔ لیکن کنجی صرف طہارت ہے مطلب یہ ہوا کہ نماز بغیر طہارت کے جائز نہیں یہ بالاتفاق ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

چوتھی بات: دوسرا جملہ وتحریمها التکبیر یہ ترکیب میں پہلے جملے کی طرح ہے۔ تو جب پہلا جملہ مفید للقصر ہوگا تو دوسرا جملہ بھی مفید للقصر ہوگا۔ تو معنی ہوا نماز کی تحریم صرف تکبیر سے ہوتی ہے اب یہاں دو باتیں ہیں۔

❶ اس جملے میں مسئلہ کیا بیان کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ وہ افعال، اعمال، اقوال جو تکبیر تحریمہ سے پہلے جائز تھے، وہ تمام اب حرام ہو گئے یعنی تکبیر کے بعد۔

❷ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جملہ جب مفید للقصر ہوا تو معاملہ مشکل ہوا۔ کیونکہ اختلافی مسئلہ ہے کہ نماز صرف اللہ اکبر سے شروع ہوگی یا کچھ اور بھی جائز ہے، ائمہ ثلاثہ کا مسلک یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے علاوہ جائز نہیں۔ اس لئے اگر کسی اور لفظ سے شروع کیا تو نماز شروع نہ ہوگی صرف آگے فرق کرتے ہیں۔

❶ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ الاکبر کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ ② مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اللہ اکبر جائز ہے۔

❸ ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو الفاظ اور بھی ہیں اللہ اکبر، اللہ الاکبر، اللہ کبیر، اللہ الکبیر۔ ④ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر وہ اسم جو مشعر بتعظیم اللہ ہو اس سے تکبیر تحریمہ پڑھنا جائز ہے جیسے اللہ اجل، اللہ اعظم وغیرہ۔

اب جو لوگ صرف اللہ اکبر کے قائل ہیں جیسے امام مالک و احمد اور جو کہتے ہیں کہ اللہ الاکبر بھی جائز ہے جیسے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ

اور ابو یوسف جن کے ہاں چار الفاظ جائز ہیں۔ یہ لوگ جملے کی حدیث کی حصر سے استدلال کرتے ہیں کہ صرف تکبیر ہی سے ابتدا کر سکتے ہیں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ واحمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ الاکبر، کبیر اور الکبیر بھی تکبیر ہے، مگر حضور ﷺ نے یہ الفاظ نہیں کہے مگر شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اکبر کا مادہ چاروں جملوں میں مذکور ہے، یعنی موجود ہے۔

امام اعظم فرماتے ہیں کہ ہر وہ لفظ جو مشعر بتعظیم اللہ ہو اس کا استعمال جائز ہے۔ دلیل ① ﴿وذكر اسم ربه فصلى﴾ یہاں رب کا ذکر ہے کہ رب کا نام لیا اور نماز پڑھی یہاں تکبیر کا خصوصی ذکر نہیں۔ دلیل ② وربک فکبر ای وربک فعظم ترجمہ مفسرین کرتے ہیں اس لئے ہر وہ لفظ جو تعظیم پر مشتمل ہو وہ جائز ہے۔ دلیل ③ فلما رأينه، اكبر نه اى اعظمنه ۔

دلیل ④ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابو عالیہ تابعی کا اثر ہے "سئل ابو العالية باى شيئ الأنبياء يفتتحون الصلاه" انہوں نے جواب دیا۔ بالتوحيد والتسبيح والتكبير اور ہمارے لئے حکم ہے "فبهدا هم اقتده" دلیل ⑤ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ "اذا سبح او كبر او هلل اجزأ فى الافتتاح" دلیل ⑥ شعبی فرماتے ہیں کہ "باى شئ من اسماء الله تعالىٰ افتتحت الصلاة اجزاك اس لئے امام صاحب کہتے ہیں اللہ اکبر سے نماز شروع کرنا فرض نہیں۔ بلکہ (مشہور قول کے مطابق) واجب اور (غیر مشہور قول کے مابق) سنت ہے۔ احناف کے ہاں باب والی روایت کا جواب کیا ہے اس کے لئے چند مسائل ہیں۔

ا: پہلا مسئلہ مفہوم کا ہے۔ مفہوم کہتے ہیں "ماسیق الکلام لاجلہ" دوسرا ہے "منطوق کلام" جس پر کلام صراحۃً دال ہو۔ پھر مفہوم کی دو قسمیں ہیں ① مفہوم موافقہ ② مفہوم مخالفہ جو ظاہر کلام کے مخالف ہو۔ مفہوم مخالف کی کئی اقسام ہیں، اب مفہوم موافقہ بالاتفاق معتبر ہے مفہوم مخالف کے اعتبار کرنے میں اختلاف ہے، کلام الناس اور عبارات الفقہاء میں بالاتفاق مفہوم مخالف معتبر ہے۔

البتہ نصوص میں مفہوم مخالف معتبر ہے یا نہیں احناف کہتے ہیں کہ معتبر نہیں یعنی اس سے حکم ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ قرآن واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض جگہ مفہوم مخالف مراد لینا جائز ہی نہیں جیسے ﴿ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء ان اردن تحصنا﴾ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ تحصن نہ چاہیں تو مجبور کرو۔ دوسرا نصوص کے معنے متعین کرنے میں احتیاط ضروری ہے اس لئے منطوق سے تو حکم ثابت ہوگا لیکن مفہوم مخالف یقینی نہیں ہوتا اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔

اب حدیث کا جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ حدیث میں ہے نماز کی تحریم تکبیر ہے اب اگر امام صاحب کہتے کہ اللہ اکبر سے نماز کی تحریم نہیں پھر کہتے کہ امام صاحب نے مخالفت کی لیکن حدیث کہتی ہے کہ اللہ اکبر سے تحریم ہے امام صاحب بھی اس کے قائل ہیں البتہ مفہوم مخالف کہ اللہ اکبر کے علاوہ تحریم نہیں ہو سکتی اس کے بارے میں احناف کہتے ہیں کہ یہ مسکوت کے درجے میں ہے اب حدیث کا مطلب ہے تحریم نماز کی تکبیر سے ہوتی ہے اس کے قائل ہم بھی ہیں اب اور کسی سے ہو سکتی ہے یا نہیں تو گذشتہ چھ دلائل سے ثابت ہوا کہ جائز ہے۔

دوسرا اصولی مسئلہ: اخبار احاد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے یا نہیں۔ احناف کے ہاں جائز نہیں باقیوں کے ہاں جائز ہے، مگر معارف السنن میں ہے کہ یہ عنوان صحیح نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ احناف کہتے ہیں کہ کتاب اللہ قطعی ہے اور اخبار آحاد ظنی ہیں اس لئے قطعی سے جو ثابت ہے وہ فرض ہے اور خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ پر خبر واحد سے فرض میں زیادتی جائز نہیں، تو اب اگر خبر واحد سے بھی فرض ثابت ہو تو قطعی اور ظنی برابر ہو جائیں گے اس لئے قطعی سے فرض ثابت ہوگا اور ظنی سے واجب وغیرہ۔ اب آیت ہے ﴿وذكر اسم ربه فصلى﴾ یہ قطعی الثبوت والدلالۃ ہے اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی ابتداء میں کوئی نام ذکر کرے جائز ہے اور فرض ہے لیکن تخصیص کے ساتھ اللہ اکبر جو خبر واحد سے ثابت ہے یہ بھی فرض ہو تو قطعی الثبوت والدلالۃ اور ظنی چیز میں کیا فرق رہے گا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اللہ اکبر واجب ہے اور مطلق اللہ کا نام فرض ہے۔

تیسرا مسئلہ: احناف کہتے ہیں کہ نصوص وادلہ مختلف المراتب ہیں اب جب مراتب الگ ہیں تو ان سے ثابت شدہ احکام کے مراتب بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ اب ادلہ کل چار ہیں۔ ① قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ ② قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ ③ ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ ④ ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ۔ احکام بھی چار قسم کے ہیں ① فرض وحرام ② مکروہ ③ واجب ④ سنت۔

اب قطعی الثبوت والدلالۃ میں جانب عمل میں فرض اور جانب نہی سے حرام ثابت ہوگی۔ دوسری تیسری دلیل سے وجوب اور کراہت ثابت ہوگا۔ اور چوتھے درجے کی دلیل سے سنت ومستحب اور جانب نہی میں خلاف اولیٰ ثابت ہوگا۔ اب چاروں کو ایک درجے مین لانا صحیح نہیں۔ اب باب کی حدیث میں مفہوم مخالف بھی مراد لے لوتو اس کا مرتبہ دیکھوتو وہ ظنی الثبوت ہے اس لئے اس سے فرضیت کس طرح ثابت ہوگی، زیادہ سے زیادہ وجوب ثابت ہوگا۔

چوتھا مسئلہ: یہ پہلے تین اصولوں سے مستنبط ہے۔ احناف کا جمہور کے ساتھ مراتب الاحکام میں سے مرتبہ وجوب میں اختلاف ہے۔ احناف کے ہاں وجوب فرض اور سنت کے درمیان مستقل درجہ ہے جمہور کے ہاں مستقل درجہ نہیں بلکہ فرض کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ احناف یہ کہتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہے کہ دلائل ایک مرتبے کی نہیں بلکہ مختلف المراتب ہیں جیسا کہ مراتب اربعہ گزر گئے، اب جب دلائل مختلف المراتب ہیں تو دلائل سے جو احکام ثابت ہوں گے وہ بھی مختلف المراتب ہوں گے کیونکہ فقہاء حکم کی تعریف کرتے ہیں ''ماثبت بالخطاب'' اب دلائل کے مراتب میں تو حکم کا مرتبہ مختلف ہوگا، اور حکم صرف سنت اور فرض نہیں، اس کے درمیان واجب مستقل ہے، اب احناف کہتے ہیں کہ فرض دوقسم پر ہے ① فرض اعتقادی ② فرض عملی۔

اب اللہ اکبر کے ساتھ تکبیر پڑھنا حدیث سے فرض ثابت ہوتو یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ یہ فرض ہے مگر فرض عملی ہے جو احناف کے ہاں واجب کا درجہ ہے تو صرف اصطلاح کا فرق ہے اس سے حکم میں فرق نہیں ہوتا، تو احناف کے ہاں فرض عملی ہے۔ جمہور بھی فرض عملی کے قائل ہیں مگر مطلق فرض کا اطلاق کرتے ہیں۔

پانچواں مسئلہ: مناط کا ہے۔ علت معلوم کرنے کے عمل کو مناط کہتے ہیں۔ یہ مناط تین قسم پر ہے۔

تحقیق مناط: مثلاً شریعت نے حکم ثابت کیا پھر اس کی علت بتادی۔ اب مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ تلاش کرے کہ یہ علت اور بھی کسی جگہ ہے یا نہیں۔ تو جہاں بھی علت ہو وہ اس حکم کو وہاں متعدی کر دیتا ہے، اگر علت جہاں نہ ہو تو حکم متعدی نہیں کرتا جیسے ﴿السارق والسارقة فاقطعوا أيديهما﴾ اب علت سرقہ ہے اور حکم قطع ید ہے یہ بالاتفاق ہے اب یہ سرقہ والی علت طرار اور نباش میں بھی ہے یا نہیں جو لوگ وہاں علت مانتے ہیں وہ قطع ید کا حکم لگاتے ہیں جو ان میں علت نہیں مانتے وہ قطع ید کا حکم نہیں لگاتے۔

اسی طرح دو گواہ عادل ہونے چاہئیں۔ یہ بالاتفاق ہے اب مثلاً زید، عمرو میں عدل کی صفت تلاش کرنا قاضی کا کام ہے۔ اور قاضی اجتہاد کر کے عدالت ثابت کرے تو گواہی مانے گا، عدالت ثابت نہ ہو تو گواہی نہ مانے گا، یہ عمل تحقیق مناط ہے۔

تخریج مناط: نص نے حکم بتادیا لیکن علت کی صراحت نہیں کی، اب کئی اوصاف میں ہر وصف علت بن سکتی ہے۔ اب مجتہد علت تلاش کرتا ہے تو وہ مجتہد کسی ایک علت کو ترجیح دیتا ہے جیسے ربوا کا حکم شریعت نے اشیاء ستہ پر لگایا۔ اب یہاں اوصاف متعدد ہیں۔ ① قدر وجنس ② طعم وثمنیت ③ قوت وادخار یہ تینوں صفات علت بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اب مجتہد کا کام ہے وہ دیکھے کہ اس میں راجح کونسی ہے تو امام صاحب نے اجتہاد سے قدر وجنس لیا شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے طعم وثمنیت کو لیا۔ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اجتہاد سے قوت وادخار لیا۔ اس عمل کو تخریج مناط کہتے ہیں۔

تنقیح مناط: اصولیوں کے ہاں اس کی تعریف: مثلاً شارع نے حکم بتایا مگر علت ذکر نہیں کی، اب مجتہد علت تلاش کرتا ہے، اب وہاں کئی اوصاف ہیں بعض میں علت بننے کی صلاحیت تھی بعض میں نہیں تھی جیسے نبی کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا "**هلكت**" فرمایا کیا ہوا اس نے کہا "**وقعت علی امرأتی نهار رمضان**" آپ ﷺ نے فرمایا تم پر کفارہ ہے۔ تو شریعت نے حکم بتایا کہ جو عمداً یہ کرے اس پر کفارہ ہے۔ اب حکم کی علت کیا ہے مجتہد تلاش کرے گا۔ ایک وصف ملی رمضان میں جماع کرنا دوسری وصف تھی منافی صوم کا ارتکاب تیسری وصف یہ کہ یہ اعرابی کا فعل تھا۔ چوتھی صفت ملی بیوی سے فعل کرنا، اعرابی کا فعل، بیوی سے فعل کرنا صفت ہے مگر یہ علت نہیں بن سکتے۔ دوسرے دو صفت علت بن سکتے ہیں تو امام شافعی واحمد نے جماع کو علت بنایا اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے منافی صوم فعل کے ارتکاب کو علت بنایا، اب منافی صوم اکل ہو شرب ہو یا جماع ہو اس پر کفارے کا حکم لگے گا۔ اب اس علت کو تلاش کرنا تنقیح مناط کہلاتے ہیں۔

احناف کہتے ہیں کہ یہاں حدیث آئی ہے کہ تحریمہا التکبیر کا حکم ہے اس میں شریعت نے حکم تو بتا دیا لیکن اس حکم کی علت کیا ہے تو امام صاحب نے تخریج مناط کا عمل کیا تو دیکھا کہ اللہ اکبر کہنے سے نماز شروع ہوتی ہے اس کی علت یہ ہے کہ یہ ذکر مشعر بتعظیم اللہ ہے، تو انہوں نے اس حکم کو متعدی کیا۔ کہ جہاں بھی ایسا ذکر ہو جو مشعر بتعظیم اللہ ہو، اس میں یہ حکم جاری ہوگا۔ دوسرے ائمہ نے نص کا حکم دیکھا مگر جس علت پر حکم کی بنا تھی اس کو انہوں نے نہیں دیکھا۔

وتحليلها التسليم: اس میں بھی یہی بات ہے۔ باقیوں کے ہاں لفظ سلام سے نماز سے نکلنا فرض ہے، احناف کے ہاں ایک قول میں واجب اور دوسرے قول میں سنت ہے باقی فرض نہیں مانتے، کیونکہ دوسری حدیث میں آیا ہے "اذا قلت ہذا او فعلت ہذا فقد تمت صلاتک" تو اتنی مقدار بیٹھا تو فرض کا مقام ختم ہوگیا۔ اب صرف سلام باقی رہا تو وہ فرض نہ ہوگا کیونکہ قطعی الدلالۃ مان بھی لیں تو یہ قطعی الثبوت نہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ واجب ہوگا۔ احناف کا مشہور قول یہ ہے کہ تکبیر واجب ہے سلام سنت

اعتراض دونوں جملے برابر ہیں یا دونوں کو سنت کہو یا دونوں کو واجب کہو؟

جواب نمبر ❶: دونوں واجب ہیں یا ہم کہتے ہیں دونوں سنت ہیں تو ہمارے ہاں دونوں کے حکم میں فرق نہیں۔

جواب نمبر ❷: قاعدہ ہے کہ قرآن فی الذکر قران فی الحکیم پر دلالت نہیں کرتا، جیسے حنابلہ کے ہاں قول ہے کہ ایک طرف سلام فرض ہے دوسری طرف فرض نہیں۔ اب جن روایات میں تسلیمتین کا ذکر ہے تو ذکر میں تو دونوں برابر ہیں مگر حکم الگ الگ ہے اسی طرح یہاں بھی ہے۔

وکیع عن سفیان: یہاں سے تحویل سند ہے، مدار سند سفیان ہے، اب کونسا سفیان مراد ہے؟ سفیان ثوری یا سفیان بن عیینہ کیونکہ دونوں کے شاگرد اور استاد مشترک ہیں۔ اب دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے کیونکہ اساتذہ اور تلامذہ مشترک ہیں اور نسبت بھی نہیں۔ علامہ انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے کافی عرصہ تلاش کیا آخر میں نصب الرایہ میں معجم طبرانی کے حوالے سے یہ روایت ملی اس میں سفیان ثوری لکھا ہے تو یہاں بھی سفیان ثوری مراد ہیں۔

هو مقارب الحدیث: مقارب الحدیث کے الفاظ توثیق کے الفاظ میں سے ہیں الفاظ جرح میں سے نہیں جن شارحین نے اس کو الفاظ جرح میں بتایا ہے وہ غلطی پر ہیں، امام نووی کے نزدیک یہ الفاظ توثیق میں تیسرے درجے کے الفاظ ہیں۔ باقیوں کے ہاں پانچویں درجے کا لفظ ہے۔ اس کو مقارب الحدیث بھی پڑھنا جائز ہے بمعنی "**یقارب حدیثه حدیث غیره**" اور مقارب الحدیث بھی بمعنی "**یقارب حدیث غیره حدیثه**"۔

باب مایقول اذا دخل الخلاء

یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ بیت الخلاء جاتے تو یہ دعا پڑھتے ''اللّٰھم انی اعوذبک'' تو کبھی خطاب کے صیغے کے ساتھ پڑھتے اور کبھی اسم ظاہر لاتے اور پڑھتے ''انی اعوذ باللّٰہ.....الخ''

پہلی بات: یہاں سے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ آداب الخلاء کے ابواب شروع کررہے ہیں کچھ آداب مصنف نے ذکر کئے اور کچھ فقہاء نے احادیث سے مستنبط کر کے ذکر کئے ہیں جو مصنف نے ذکر کئے ہیں۔

دوسری بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے اس میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے۔ معارف السنن میں ہے کہ ''اذا دخل الخلاء'' بمعنی ''ارادان یدخل الخلاء'' کے ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''أراد'' کا لفظ صراحۃً ذکر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نحوی حضرات کا قاعدہ ہے کہ اذا جب فعل پر داخل ہوتو معمولی بہ کی تین صورتیں ہیں۔ فقہ اللغات میں ہے کہ پہلی صورت یہ ہے کہ اذا فعل پر داخل ہوتو معمول بہ فعل سے مقدم ہوتا ہے جیسے ﴿اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسلوا وجوھکم﴾ اذا کا معمول بہ فاغسلوا ہے جو قمتم سے مقدم ہے۔ ایسی جگہ میں اراد کا لفظ مقدر مانا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب اذا فعل پر داخل ہوتو معمول بہ فعل کے بعد ہوتا ہے جیسے ﴿حللتم فاصطادوا﴾ یہاں فاصطادوا معمول بہ ہے جو حللتم سے مؤخر ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ معمول بہ فعل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے ''اذا قرأت فرسل'' یہاں حدیث پہلی صورت کے قبیل سے ہے اس لئے اراد کا لفظ مقدر ہوگا تو حدیث کا مفہوم ہوگا ''اذا أراد أن یدخل الخلاء''

تیسری بات: یہ دعا کب پڑھنی چاہیئے فتح الباری میں ہے کہ اصل وقت یہ ہے کہ اگر گھر کے اندر بنا ہوا بیت الخلاء ہوتو دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پڑھے، اگر کوئی اس وقت بھول جائے تو اب داخل ہونے کے بعد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو قول ذکر کئے ہے۔

❶ جمہور کہتے ہیں کہ اب استعاذہ بالقلب کرے گا استعاذہ باللسان نہ کرے گا۔ یہ اللہ کے نام کے احترام کا منافی ہے۔ ❷ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر بھول جائے اور داخل ہوجائے تو استعاذہ باللسان جائز ہے۔ لیکن اگر بنا ہوا بیت الخلاء نہ ہو جنگل یا کھیت یا برتن ہوتو جمہور کہتے ہیں اس وقت بھی دعا مستحب ہے مگر ستر کھولنے سے پہلے دعا پڑھے گا ستر کھولنے کے بعد استعاذہ بالقلب کرے گا۔

چوتھی صورت: معارف السنن میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ شیطانی اثرات سے محفوظ تھے، پھر شیطان سے حفاظت کی دعا کیوں پڑھتے تھے؟ کیونکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نقصان پہنچاتا ہے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قضاء حاجت کے وقت شہید کر کے شیاطین نے یہ شعر پڑھا۔

قتلنا رئیس الخزرج سعد بن عبادۃ رمیناہ بسھمین فلم نخط فؤادہ

دوسرا یہ کہ یہ مقاعد بنی آدم سے کھیلتے ہیں۔ مگر حضور ﷺ اس سے محفوظ تھے۔

جواب نمبر ❶ حضور ﷺ نے تعلیماً للامۃ یہ دعا پڑھی۔

جواب نمبر ❷ نبی اکرم ﷺ شیطان سے محفوظ تھے، مگر بشرط الاستعاذہ۔ اس لئے حضور ﷺ استعاذہ پڑھتے تھے۔ احادیث اسریٰ میں ہے کہ شیطان نے وہاں پر اثر ڈالنے کی کوشش کی اسی طرح مشکوٰۃ میں ہے کہ آپ ﷺ نماز میں آگے بڑھے پیچھے ہٹے،

نماز کے بعد وجہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ شیطان مجھے جلانے کے لئے آگ کا شعلہ لے کر آیا، میں نے پکڑنے کی کوشش کی مگر سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کی دعا یاد آئی اس لئے چھوڑ دیا معلوم ہوا کہ حضور ﷺ شیطان کے شر سے محفوظ تھے بشرط استعاذہ۔

پانچویں بات: "من الخبث والخبیث" کے الفاظ بھی حدیث میں ذکر ہیں۔ خبث مصدر ہے اور فعل خبیث مراد ہے یا خبث مخفف ہے خُبُث سے۔ اب خبیث کا معنی ہے مکروہ، کلام میں خبیث سب وشتم اور جھوٹ ہے۔ طعام میں خبیث حرام ہے، عقیدے میں خبیث شرک وکفر ہے دوسری روایت میں ہے من الخبث والخبائث۔

معارف السنن میں ہے کہ با کے سکون کے ساتھ غلط ہے مگر ابن العربی اور نووی نے کہا ہے کہ با کے سکون کے ساتھ بھی صحیح ہے۔ خبث جمع ہے خبیث کی۔ خبائث جمع ہے خبیثۃ کی بمعنی مؤنث شیطان۔

چھٹی بات: بیت الخلاء میں آنے جانے کی دعا اسی طرح باقی دعائیں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ صورۃً دعائیں ہیں مگر حقیقۃً یہ اذکار ہیں۔ وہ ان کو اذکار متواردہ کے نام سے مسمّی کرتے ہیں کہ انسان ایک حالت میں سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو یہ ایک نعمت ہے اس نعمت کے شکرانے کے لئے اذکار متواردہ شریعت نے بتائے، اس لئے ان میں ہاتھ نہیں اٹھائے جاتے۔ اگر دعاء ہوتی تو دعا کے آداب میں سے رفع الید ہے۔

ساتویں بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وفی الباب عن زید بن ارقم اس کے بارے میں ترمذی فرماتے ہیں اس روایت میں اضطراب ہے۔

❶ اضطراب کسے کہتے ہیں؟ کسی حدیث کے چند راویوں کا نقل کرنے میں اختلاف ہو ایک ایک طرح نقل کرتا ہے اور دوسرا دوسری طرح نقل کرے پھر کبھی اضطراب متن میں ہوتا ہے کبھی سند میں۔ متن کا اضطراب حل کرنا فقہاء کا کام ہے، سند کا اضطراب حل کرنا محدثین کا کام ہے، حدیث مضطرب حدیث ضعیف کی قسم میں سے ہے۔ اضطراب تب ہوتا ہے کہ جن راویوں کا اختلاف ہو رہا ہے وہ مرتبے میں سب برابر ہوں۔ اضطراب میں جب وجہ ترجیح سے ایک وجہ راجح ہو جائے تو اضطراب ختم ہو جاتا ہے۔ اب زید بن ارقم کی حدیث کا اضطراب یہ ہے۔

سند ❶ هشام عن قتادة عن زيد بن ارقم.

سند ❷ سعيد عن قتادة عن القاسم بن عوف الشيباني عن زيد بن أرقم.

سند ❸ شعبه عن قتادة عن النضر بن أنس عن زيد بن أرقم.

سند ❹ معمر عن قتادة عن النضر بن أنس عن أبيه أنس.

زید کی حدیث قتادہ سے منقول ہے قتادہ کے چار شاگرد ہیں۔ ① ہشام یہ قتادہ سے قتادہ زید سے نقل کرتے ہیں۔ تو قتادہ اور زید کے درمیان واسطہ نہیں۔ دوسری سند میں سعید شاگرد ہے قتادہ کا قتادہ قاسم اور قاسم زید سے نقل کرتے ہیں تو یہاں قتادہ اور زید کے درمیان واسطہ آگیا یہ پہلی اضطراب ہے۔

تیسری سند میں شعبہ شاگرد ہے قتادہ کا قتادہ نقل کرتے ہیں نضر بن انس سے اور نضر نقل کرتے ہیں زید سے۔ اس میں بھی دوسری کی طرح قتادہ زید میں واسطہ ہے مگر واسطے میں اختلاف ہے۔ ایک میں نضر کا واسطہ ہے دوسرے میں قاسم کا یہ دوسرا اضطراب ہے۔ چوتھا شاگرد معمر ہے عن قتادہ عن نضر بن اُنس عن اُبیہ اُنس۔ یہاں زید بن ارقم کی جگہ اُنس آگئے یہ تیسرا اضطراب ہے۔

اضطراب ختم کرنے کی صورت:

قتادہ کی ملاقات انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی سے ثابت نہیں۔ زید بن ارقم سے بغیر واسطے کے نقل کرنا غلط ہے معلوم ہوا واسطے والی اسانید صحیح ہیں اب واسطے والی اسانید دو قسم کی ہیں۔ دوسری میں واسطہ قاسم کا تھا، تیسرے اور چوتھے میں نضر بن انس واسطہ آ گیا۔ تو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ممکن ہے قتادہ نے دونوں سے سنا ہو قاسم سے بھی اور نضر سے بھی، تو یہ اضطراب اب ختم ہوا۔ اب تیسرا اضطراب یہ ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے یا زید بن ارقم سے، تو صحیح یہ ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ تو یہ اضطراب بھی حل ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ امام بخاری نے کہا کہ ممکن ہے قتادہ نے یہ روایت زید بن ارقم اور نضر بن انس دونوں سے نقل کی ہو تو وہ عنہما کی ضمیر زید اور نضر کی طرف لوٹاتے ہیں یہ غلط ہے صحیح یہ ہے کہ یہ ضمیر نضر اور قاسم کی طرف راجع ہے اس اضطراب کو ختم کرنے کے لئے مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل اشعار ذکر کئے ہیں۔

هشام عن قتاده ثم زيد	سعيد عن قتاده فابن عوف
وشعبة معمر عنه عن النضر	عن أنس وعن زيد بخلف
قال البيهقي أنس خطأ	وعن زيد قتادة غير صرف

ثم زید میں ثم تراخی کے لئے ہے تو بتایا کہ قتادہ کی ملاقات زید سے نہیں ہوئی۔ فابن عوف فا تعقیب کے لئے آتا ہے معلوم ہوا یہ سند متصل ہے، عن انس وعن زید بخلف اب زید سے نقل ہے یا انس سے اس میں اختلاف ہے بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرنا صحیح نہیں، بلکہ صحیح یہ تھا کہ زید بن ارقم سے سنا تھا۔

باب مایقول اذا خرج من الخلاء

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلاء سے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے "غفرانک"۔

پہلی بات: ان ابواب کا تعلق بیت الخلاء کے آداب کے ساتھ ہے تو ترجمۃ الباب کا مقصد بیت الخلاء کا ایک ادب اور امر مستحب بیان کرنا ہے۔

دوسری بات: سند کے شروع میں ہے۔ حدثنا محمد بن حمید بن اسماعیل عن مالک بن اسماعیل الخ

اس سند پر اعتراض ہے کہ مصنف کے شیوخ جو کتب الرجال میں مذکور ہیں ان میں محمد بن حمید بن اسماعیل نامی کوئی شیخ مذکور نہیں۔ دوسری سند جو ابن العربی نے ترمذی کی شرح میں ذکر کی ہے وہ اس طرح ہے حدثنا محمد بن اسماعیل قال حدثنا حمید قال حدثنا مالک بن اسماعیل۔ تو محمد بن اسماعیل سے امام بخاری مراد ہو سکتے ہیں اور وہ ترمذی کے استاذ ہیں۔ مگر اس پر اشکال ہے کہ یہاں بخاری کا استاد حمید مذکور ہے۔ جبکہ اس نام کا بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا کوئی استاذ نہیں، بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض نسخوں میں اس طرح ہے۔ حدثنا احمد بن محمد بن اسماعیل قال حدثنا مالک بن اسماعیل۔ مگر یہ سند بھی غلط ہے کیونکہ ترمذی کے مشائخ بخاری کے مشائخ بلکہ ان کے مشائخ کے پورے طبقے میں احمد بن اسماعیل نام کا کوئی بھی نہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ صحیح تر یہ ہے کہ حدثنا محمد بن اسماعیل (بخاری) عن مالک بن اسماعیل النہدی عن اسرائیل عن یوسف ابی بردۃ۔ تو مالک بن اسماعیل بخاری کا استاد ہے اس لئے یہ سند صحیح ہے۔

تیسری بات: غفرانک کے متعلق دو قول ہیں۔ ① فعل مقدر کا مفعول بہ ہے ای اسئل غفرانک۔ ② یہ مفعول مطلق ہے فعل مقدر کا ای اغفر غفرانک۔ کافیہ میں ہے کہ فعل کو حذف کیا جاتا ہے جب کوئی قرینہ ہو۔ معارف السنن میں ہے کہ سبحانک یا غفرانک کے

مصادر وغیرہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کبھی فاعل اور کبھی مفعول ہوتے ہیں کبھی فاعل اور مفعول حرف جار کے واسطے سے ہوتے ہیں اور ان کے عامل کو حذف کیا جاتا ہے یہ حذف عند البعض سماعی ہے رضی کے نزدیک قیاسی ہے۔

چوتھی بات: غفرانک پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ مقام حمد وشکر ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کھانے پھر ہضم کرنے کی توفیق دی۔ پھر مقوی اجزاء بدن کا جزء بن گئے فضلہ کو نکالنے کا راستہ آسان کر دیا۔ اس لئے اس مقام پر "غفرانک پڑھنا مقام کے مناسب نہیں۔

جواب نمبر ❶: اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں تھیں کہ کھانا ملا پھر ہضم ہوا توان نعمتوں کا شکر پورا ادا نہیں کر سکتے تو اس میں جو تقصیر ہوئی اس پر طلب مغفرت کی جارہی ہے۔

جواب نمبر ❷: معارف السنن میں ہے کہ اس مقام پر مغفرت طلب کرنا اور وجہ سے ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ ہر وقت اللہ کے مشاہدے اور مراقبے میں رہتے تھے۔ اور وہ مراقبہ اس حالت میں بھی جاری رہتا ہے جبکہ اس حالت میں جاری نہیں رہنا چاہیئے تھا یہ تقصیر تھی اس کے ازالے کے لئے دعا کی۔

جواب نمبر ❸: سیبویہ کہتا ہے کہ اس جملے کو عرب شکر کے مقام پر استعمال کرتے ہیں اور کفران کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں کہتے ہیں "غفرانک لا کفرانک" تو گویا یہ لفظ اس میں مغفرت طلب نہیں کی جارہی بلکہ شکر یہ ادا کیا جارہا ہے۔

پانچویں بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہذا حدیث حسن غریب۔ اعتراض ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کی سندیں مختلف اور متعدد ہوں اور غریب وہ ہے کہ جس کے نقل کرنے میں راوی متفرد ہو تو بظاہر تضاد ہے۔

جواب نمبر ❶: جہاں ترمذی صرف حسن کہیں اور صفت ساتھ نہ لگائیں وہاں ترمذی کی مراد وہ حسن ہوتی ہے جس کے طرق متعدد ہوں۔ لیکن جہاں حسن کے ساتھ دوسری صفت لگائیں مثلاً حسن غریب تو پھر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ جمہور کی تعریف مراد لیتے ہیں اور جمہور حسن کی تعریف میں تعدد طرق کو ضروری سمجھتے ہیں۔

جواب نمبر ❷: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ جب غریب اور حسن کو جمع کریں تو حسن سے اصطلاحی حسن مراد نہیں ہوتا بلکہ لغوی مراد ہوتا ہے لیکن جہاں فقط حسن کہیں وہاں حسن اصطلاحی مراد ہوتا ہے۔

جواب نمبر ❸: معارف السنن میں شاہ صاحب کا قول ہے کہ امام ترمذی نے کتاب العلل میں ذکر کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غریب تین قسم پر ہے ① جمہور والی تعریف جس کے نقل کرنے میں راوی متفرد ہو۔ ② اگرچہ طرق متعدد ہوں مگر کسی لفظ کی وجہ سے غرابت ہو یعنی کوئی لفظ ایسا ہو جس کو باقی نقل نہیں کرتے ایک ہی کرتا ہے۔ ③ متعدد طرق ہوں مگر کسی سند میں کچھ زیادتی ہو جو باقی اسانید میں نہیں۔ اس کی وجہ سے محدث حدیث کو غریب کہہ دیتا ہے۔ اب امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ جہاں حسن اور غریب کو جمع کر دیں وہ معنی ثانی یا ثالث کے اعتبار سے جمع کرتے ہیں۔

لایعرف فی هذا الباب الاحدیث عائشه رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ دعویٰ صحیح نہیں بلکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق کہا ہے ورنہ اس باب کے متعلق دوسرے صحابہ سے بھی روایات منقول ہیں۔

باب فی النهی عن استقبال القبلة بغائط او بول

اس باب میں ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی قضائے

حاجت کے لئے جائے تو قبلے کی طرف استقبال واستدبار نہ کرے بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے۔ ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے شام میں بیت الخلاء دیکھے وہ قبلہ رخ تھے، ہم ان سے انحراف کرتے تھے اور استغفار پڑھتے تھے۔

دوسری حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے چھت پر چڑھ گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت میں تھے مستقبل الشام مستدبر الکعبہ تھے۔

پہلی بات: ان ابواب میں قضائے حاجت کے آداب میں سے ایک ادب بیان کرتے ہیں اب ادب میں روایات متعارض ہیں اس وجہ سے ائمہ میں بھی اختلاف ہوا۔ اس تعارض کو ختم کرنے کے لئے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو باب قائم کئے۔

دوسری بات: ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے "اذا أتیتم الغائط" معارف السنن میں ہے کہ غائط کہتے ہیں الأرض المطمئنہ کو یعنی پست زمین کو کہ جب وہاں آدمی بیٹھے تو دوسروں کو نظر نہ آئے پھر یہ لفظ قضائے حاجت کے لئے استعمال ہونے لگا پھر جو گندگی نکلتی ہے اس پر بھی غائط کا اطلاق ہونے لگا اور فعل حدث پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

تیسری بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ استقبال قبلہ واستدبار قبلہ مت کرو بلکہ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرو۔ شرقوا اور غربوا کا حکم اہل مدینہ اور ان کے لئے ہے جو مدینہ کی جانب میں ہیں۔ لیکن ہم لوگ ایسی جہت میں ہیں کہ ہمارا قبلہ جہت مغرب میں ہے یا وہ لوگ جن کا قبلہ مشرق میں ہے ان کے لئے شمال اور جنوب کا حکم ہوگا۔

چوتھی بات: مسئلہ یہ ہے کہ بوقت بول وغائط استقبال واستدبار قبلہ جائز ہے یا نہیں اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کل آٹھ اقوال ہیں۔

قول نمبر ۱: بوقت بول وغائط استقبال واستدبار دونوں ناجائز ہیں مطلقاً یہ قول ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جمہور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ، مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک روایت میں سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابوثور کا ہے۔

قول نمبر ۲: استقبال واستدبار مطلقاً جائز ہیں، یہ قول عروہ بن زبیر تابعی، ربیعہ بن عبدالرحمٰن (مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے استاد) داؤد ظاہری سے منقول ہے۔

قول نمبر ۳: استقبال مطلقاً ممنوع ہے یعنی صحراء ہو یا آبادی اور استدبار دونوں میں مطلقاً جائز ہے یہ قول ایک روایت میں امام صاحب اور ایک روایت میں احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔

قول نمبر ۴: استقبال واستدبار بنیان میں دونوں جائز ہیں اور صحراء میں دونوں ناجائز ہے، یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ مالک رحمۃ اللہ اور ایک روایت میں احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔

قول نمبر ۵: استدبار فقط بنیان میں جائز ہے اور استقبال صحراء اور بنیان دونوں میں ناجائز ہے، استقبال بنیان میں ناجائز ہے، یہ امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔

قول نمبر ۶: استقبال واستدبار بیت المقدس وکعبہ دونوں کا ناجائز ہے یہ قول محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابراہیم نخعی سے منقول ہے۔

قول نمبر ۷: دونوں صورتوں کی حرمت خاص ہے اہل مدینہ کیلئے یہ قول ابوعوانہ کا ہے۔

قول نمبر ۸: امام صاحب کا ایک قول یہ ہے کہ استقبال واستدبار مکروہ ہیں کراہت تنزیہی کے ساتھ ان اقوال میں اول، ثالث، رابع مشہور ہیں۔

ائمہ میں یہ اختلاف روایات کے اختلاف کی وجہ سے ہوا اور روایات تین قسم کے ہیں ① ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں مطلقاً ممانعت ہے۔ ② جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں استقبال کا جواز ملتا ہے ③ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدبار کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۱: ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جو ابوداؤد نے نقل کی ہے کہ وہ سواری پر تھے سواری بٹھائی اس کی طرف رخ کر کے پیشاب کیا سائل نے پوچھا یہ تو ممنوع ہے تو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ حضور ﷺ نے اجازت دی ہے جب کوئی چیز حائل ہو۔

۲: ابن ماجہ میں ہے کہ جس کو عراک عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے سنا کہ لوگ استقبال قبلہ کو برا سمجھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "او قد فعلوھا" پھر حکم دیا اپنے قضائے حاجت کی جگہ کے بارے میں اس کو قبلہ رخ بنایا جائے۔

احناف اور جمہور کا قول ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پر مبنی ہے، احناف اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں وجوہ ترجیح مختلف ہیں۔

① ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث امت کے لئے قانون عام ہے اور دوسری احادیث قانون عام نہیں بلکہ افعال ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ قانون عام والی روایت کو واقعات جزئیہ والی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ② ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث قولی ہے اور دوسری احادیث افعال پر مشتمل ہیں۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جب قول اور فعل میں تضاد آجائے تو قول کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ فعل میں تخصیص کا احتمال ہوتا ہے۔ ③ بعض روایات میں جو جواز حضور ﷺ کے عمل سے ثابت ہے یہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی حقیقت کعبہ شریف کی حقیقت سے اعلیٰ ہے۔ ④ ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بالاتفاق صحیح ہے اس کی صحت پر اجماع ہے بخلاف جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے کہ اس کی سند پر کلام ہے۔ عراک عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث منکر و منقطع بھی ہے۔ اسی طرح دوسری احادیث پر بھی کلام ہے۔ ⑤ ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی تخریج سب احادیث کی کتب نے کی ہے جبکہ دوسری احادیث کی صحیحین نے تخریج نہیں کی ہے سوائے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روایت کے، اب عراک عن عائشہ کی روایت کو لوگوں نے منکر اور ساتھ ساتھ منقطع بھی کہا ہے، اور دوسرے باب میں پہلی حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس کی سند پر کلام ہے۔ ابن عمر کی روایت جو ابوداؤد میں ہے اس پر بھی کلام ہے، صحیح صرف ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے اس کا جواب احناف دیتے ہیں کہ اس میں احتمالات ہیں۔ ① ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو دیکھا تھا یہ صرف نظر پڑی تھی، کیونکہ حیادار آدمی دیکھ کر فوراً مڑ جاتا ہے اس لئے انہوں نے پوری حقیقت نہیں دیکھی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ عضوء کا رخ دوسری طرف ہو۔ ② اس میں آپ ﷺ کی خصوصیت بھی ہوسکتی ہے۔

پانچویں بات: استقبال اور استدبار کی ممانعت کی علت کیا ہے؟ احناف اور جمہور کے ہاں علت احترام قبلہ ہے۔ شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس کی علت احترام المصلین ہے کہ جنات اور فرشتے زمین پر نماز پڑھتے ہیں اب صحراء میں اگر آدمی بول کرے تو فرشتوں اور جنوں کو شرمگاہ نظر آئے گا۔ لیکن بنیان میں حائل موجود ہوتا ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ یہ بے کار فضول بات ہے حدیث میں احترام کی طرف اشارہ ہے کہ قبلہ ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اب آپ کی جو علت ہے اس کی طرف اشارہ نہیں دوسرا عقلاً صحراء اور بنیان میں فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ صحراء میں تو بڑے بڑے پہاڑ آڑے ہوتے ہیں۔

چھٹی بات: "فننحرف عنھا" اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہم ہٹ جاتے ہیں ان بیت الخلاؤں کو استعمال نہ کرتے۔ پھر نستغفر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے استغفار کرتے جو ان کو استقبال کرتے ہوں گے، یا بنانے والوں کے لئے استغفار کرتے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ استعمال کرتے اور قبلہ کی طرف سے انحراف کرتے لیکن وہ انحراف کا حل نہ ہوتا اس لئے استغفار کرتے۔

رقیت یومًا علی بیت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا: یہ الفاظ ترمذی میں ہیں یہاں نسبت کی اضافت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف اسناد حقیقی ہے۔ درسری جگہ الفاظ ہیں "علی بیت لنا یا علی بیتنا" اس میں بیت کی نسبت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی طرف کی ہے یہ اسناد مجازی ہے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "علی بیت اختی حفصة" اس میں اسناد مجازی کی وجہ مذکور ہے کہ میں نے اپنا گھر اس لئے کہا کہ وہ میری بہن حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر تھا۔

ابن لهيعة ضعيف عند اهل الحديث: ان کا نام عبداللہ لھیعہ ہے بڑے بزرگ تھے ضعیف اس لئے کہا کہ کیونکہ کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں ان کو اختلاط ہو جاتا تھا، بعض کہتے کہ ان کا کتب خانہ جل گیا تھا، یہ یاد سے احادیث سناتے تھے اس لئے کہ بڑھاپے میں ان کو اختلاط ہوتا تھا، بعض کہتے ہیں کہ گدھے سے گر کر سر میں چوٹ لگی اس لئے دماغ پر اثر پڑ گیا، لیکن اختلاط سے پہلے کی روایات قوی ہونے چاہئیں۔ لیکن یہاں معلوم نہیں کن شاگردوں نے اختلاط سے پہلے پڑھا ہے اور کن نے بعد میں اس لئے مجموعی روایات کو ضعیف کہا گیا۔

باب النهي عن البول قائمًا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جو آدمی تمہیں بتائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے تو اس کی تصدیق نہ کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب نہیں کرتے تھے، مگر بیٹھ کر۔ دوسرے باب میں حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔

پہلی بات: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احادیث میں تعارض ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا، جبکہ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ثبوت ملتا ہے تو اب اس تعارض کو دفع کرنے کے لئے محدثین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔

توجیہ ❶: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث محمول ہے اپنے علم پر کہ ان کے سامنے قائماً نہیں ہوا اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث محمول ہے اپنے علم پر کہ انہوں نے خود دیکھا۔

توجیہ ❷: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں عادت کا ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت بیٹھ کر پیشاب کرنے کی تھی ایک یا دو دفعہ عذر کی وجہ سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اس عادت کے منافی نہیں۔

توجیہ ❸: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث گھر کے احوال پر محمول ہے کیونکہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھر کے احوال پر زیادہ واقف تھیں۔ گھر سے باہر کے احوال پر زیادہ واقف نہ تھیں۔ اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر سے باہر کے احوال پر زیادہ واقف تھے۔ جیسا کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے مسح علی الخفین کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اسفار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔

توجیہ ❹: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں عام حالات میں نفی ہے۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ثبوت عذری حالت پر محمول ہے۔

توجیہ ❺: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت بیٹھ کر بول کرنے کی تھی، مگر ایک دفعہ بیان جواز کے لئے کھڑے ہوئے، یہ توجیہ وہ

کرتے ہیں جو بول قائماً کے ثبوت کے قائل ہیں۔

دوسری بات: بول قائماً کا کیا حکم ہے۔ شاہ صاحب کا قول معارف السنن میں ہے کہ بول قائماً کا اصل حکم مکروہ تھا بمعنی خلاف اولیٰ، کیونکہ یہ خلاف مروت ہے لیکن بعد میں یہ غیر مسلمین فساق وفجار کا شعار بن گیا اس لئے اب اس کا حکم حرمت کا ہوگا۔

تیسری بات: نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہوکر بول کیوں کیا؟ اس میں محدثین کے کئی اقوال ہیں۔

قول نمبر ❶ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے روایت نقل کی ہے اگر چہ ان کے نزدیک ضعیف ہے لیکن بیان نکتہ کے لئے کافی ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہوکر بول اس پھوڑے کی وجہ سے کیا جو گھٹنے کے نیچے کی جانب تھا اس لئے یہ عذر تھا۔

قول نمبر ❷ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ واحمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے بول قائماً کیا طلب شفاء کے لئے کیونکہ عرب میں مشہور تھا کہ کمر میں ایک مرض سے درد ہو تو کھڑے ہوکر بول کرنے سے شفا ہو جاتی ہے اس لئے ایسا کیا۔

قول نمبر ❸ نبی کریم ﷺ نے یہ عمل بیان جواز کے لئے کیا، اگر چہ عادت یہ نہ تھی۔

قول نمبر ❹ امام نووی فرماتے ہیں کہ بیٹھ کر پیشاب کرو تو خروج ریح کا خطرہ ہوتا ہے اب ساتھ آدمی بیٹھے ہوئے ہوں تو حیاء کی وجہ سے پیشاب کرنا مشکل ہے، اس لئے خروج ریح کے خطرے کی وجہ سے کھڑے رہے۔

قول نمبر ❺ وہاں بیٹھنے کی مناسب جگہ نہیں تھی گندگی کی جگہ تھی اس لئے کھڑے رہے کہ کپڑے خراب نہ ہوں۔

قول نمبر ❻ پیشاب کے چھینٹے پڑ جانے کا خطرہ تھا اس لئے کھڑے رہے لیکن علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کھڑے ہوکر چھینٹے لگنے کا زیادہ احتمال ہے، اس لئے یہ ضعیف ہے۔

قول نمبر ❼ وہ جگہ ایسی تھی کہ پیشاب واپس آتا تھا اس لئے کھڑے رہے اور اگر دوسری طرف منہ کرتے تو عورت نظر آتا۔

قول نمبر ❽ عرب کے عادت کے مطابق کھڑے ہوکر پیشاب کیا پھر یہ منسوخ ہوگیا۔

چوتھی بات: نبی کریم ﷺ کی عادت دور جا کر پیشاب کرنے کی تھی، لیکن اس موقع پر آبادی کے اندر کوڑے کی جگہ پر کیوں پیشاب کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ لوگوں کے فیصلوں میں مشغول تھے حاجت شدید تھی دور جانے کا موقع نہ تھا اس لئے قریب فارغ ہوئے تاکہ دوبارہ واپس آکر فیصلوں میں مشغول ہو جائیں۔

پانچویں بات: سباط کی اضافت قوم کی طرف ملک کے لئے ہو تو مطلب ہوگا کہ کسی کی ملکیت میں ہوگا پھر اس پر کلام ہے کہ ملک غیر میں بول کرنا جائز ہے یا نہیں بغیر اجازت کے۔

جواب نمبر ❶ یہاں پر اضافت ملک کے لئے نہیں بلکہ یہ سب کی مشترکہ جگہ تھی سب استعمال کرتے تھے

جواب نمبر ❷ اس قسم کی جگہ اگر کسی کی ملکیت بھی ہو لیکن عام لوگ کچرا ڈالتے ہوں پیشاب کرتے ہوں وہاں عرفاً اجازت ہوتی ہے صراحۃً اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

انما روی من حدیث عبدالکریم الخ: ایک عبدالکریم جزری یہ ثقہ ہے دوسرا عبدالکریم بن ابی مخارق یہ ضعیف ہے اگر چہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ومسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کے اساتذہ میں سے ہے۔

باب فی الاستتار عندالحاجة

ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ قضائے حاجت کے وقت پردہ کرنا، اور اس پر بطور دلیل حدیث پیش کی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے منقول ہے کہ حضور ﷺ جب قضائے حاجت کا ارادہ فرماتے تو کپڑا نہ ہٹاتے تھے جب تک زمین کے قریب نہ ہو جاتے۔ دوسری روایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے لیکن مضمون دونوں کا ایک ہے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ جہاں کپڑا بدن سے ہٹانے کی ضرورت ہو جیسے قضائے حاجت کے وقت تو اس وقت تک مستور جگہ سے کپڑا نہ ہٹاؤ یہاں تک کہ حاجت پیش نہ آئے۔

دوسری بات: ان احادیث سے ثابت ہوا کہ مرد کے بدن کا وہ حصہ جو کہ ستر ہے یا عورت کا پورا جسم جو کہ ستر ہے اس کو چھپانا ضروری اور فرض ہے، لیکن بعض احوال میں ستر کھولے بغیر آدمی عمل نہیں کرسکتا، اپنی طبعی ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔ تو اس طبعی یا شرعی ضرورت کے وقت ستر کھولنے کی اجازت دیدی جس طرح قضائے حاجت طبعی ضرورت ہے اس کو بغیر ستر کھولے آدمی پورا نہیں کرسکتا، اسی طرح جماع کی حالت ہے یا انسان بیمار ہے اور ستر کی جگہ بیماری ہے لیکن ڈاکٹر کے سامنے تکلیف رفع کرنے کے لئے اس ستر کھولنے کا طبعی طور پر مجبور ہے۔ تو شریعت نے ستر عورت فرض قرار دیدیا مگر انسان کی طبعی ضروریات کی بھی رعایت کی۔

تیسری بات: اصل حکم ستر عورت کی فرضیت کا تھا لیکن طبعی ضروریات کی بناء پر مستثنیٰ کردیا معلوم ہوا کہ شریعت نے عورت کھولنے کی اجازت ضرورت کی بنا پر دی ہے اور ''الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ'' اب ضرورت سے زائد جائز نہیں، اب ستر عورت لے لو کہ یہ فرض ہے مگر ضرورۃ قضائے حاجت کے وقت اجازت دی۔ تو ضرورت پورا ہونے پر عورت کا کھولنا جائز نہ ہوگا تو ''الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ'' کا قاعدہ فقہاء نے یہاں سے مستنبط کیا ہے۔

چوتھی بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اعمش نے دو طرح نقل کیا ہے ایک انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسرا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ دونوں سندیں مرسل ہیں۔ محدثین کے ہاں مرسل کہتے ہیں کہ تابعی صحابی کے واسطے کو حذف کرکے خود نبی اکرم ﷺ کا قول نقل کرے مثلاً تابعی کہے ''قال رسول اللہ ﷺ کذا'' جبکہ یہاں ایسی صورت نہیں بلکہ دونوں سندوں میں صحابی کا واسطہ موجود ہے حذف نہیں کیا ہے تو ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرسل کیوں کہا؟

جواب: مرسل کی اصطلاح میں عموم ہے، ایک تعریف گزر گئی اور دوسرا کبھی منقطع پر بھی مرسل کا اطلاق ہوتا ہے، اب اعمش کی روایت کو مرسل کہا یہ منقطع کے معنے میں ہے اور دونوں سندوں میں حدیث منقطع ہے۔ کیونکہ اعمش کا سماع ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت نہیں۔ اعمش نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف نماز پڑھتے دیکھا ہے اس سے روایت نہیں سنی، تو رؤیۃً تابعی ہے۔ روایۃً تابعی نہیں، جب روایۃً تابعی نہیں تو ان کے اور صحابی کے درمیان واسطہ ضرور ہوگا اور اس واسطے کو اعمش نے ذکر نہیں کیا اس لئے یہ روایات منقطع ہیں۔

پانچویں بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اعمش کا نام ذکر کیا اعمش اس کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں میں عیب ہو ترمذی نے فرمایا ان کا نام سلیمان بن مہران ہے۔ کنیت ابو محمد نسبت کاہلی ہے۔ یہ نسبت اس لئے نہیں کہ یہ ان کا فرد ہے بلکہ کاہل کی طرف نسبت ولائے عتاقہ کی وجہ سے ہے اعمش کہتے ہیں میرے والد سلمان حمیل تھے اور مسروق نے ان کو وارث قرار دیا۔ حمیل اس بچے کو کہتے ہیں جو ماں کے ساتھ دار الحرب سے گرفتار ہو جائے۔ اب حمیل ماں کا وارث بن سکتا ہے یا نہیں اس کی تین صورتیں ہیں۔ ① حمیل کا کسی مرد نے دعویٰ کیا اور بچے نے تصدیق بھی کردی تو بالاتفاق بچہ باپ کا وارث بنے گا۔ ② مدعیہ عورت تھی بچہ اسی کے پاس تھا عورت نے کہا کہ میرا بیٹا ہے اور بچے نے بھی تصدیق کرلی اور عورت نے گواہ بھی قائم کردیئے تو بالاتفاق بچہ ماں کا وارث ہوگا۔ ③ عورت نے بچے کا دعویٰ کیا کہ یہ میرا بچہ ہے بچے نے بھی تصدیق کردی لیکن عورت کے پاس گواہ نہ تھا اس صورت میں اختلاف

ہے۔ائمہ ثلاثہ کے ہاں وارث بنے گا،احناف کے ہاں وارث نہیں بن سکتا۔ائمہ ثلاثہ کی دلیل مسروق کا فیصلہ ہے کہ مسروق قاضی تھے صحابہ کے سامنے فیصلہ کیا اس لئے بچہ وارث بنے گا۔احناف کہتے ہیں وارث نہ بنے گا موطا میں حدیث ہے جس کا ترجمہ ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار کیا عجم سے لائے ہوئے بچے کے وارث بننے سے ''الا ماولد فی العرب'' احناف مسروق کے فیصلے کے بارے میں کہتے ہیں یہاں ہے کہ مسروق نے وارث قرار دیا یا اب کس کا وارث بنایا اگر والد کا بنایا تو ہمارے خلاف نہیں اور اگر ماں کا بنایا ہو اور ماں نے گواہ پیش کئے ہوں پھر بھی ہمارے خلاف نہیں۔ان دوصورتوں میں ہمارے ہاں بھی وارث بنے گا، لیکن تیسری صورت یہ ہے کہ بغیر گواہوں کے ہو اور عورت کا وارث بنایا پھر بھی حجت نہیں کیونکہ صحابی (عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا فیصلہ زیادہ قوی ہے مسروق (تابعی) کے فیصلے سے،اور امام صاحب بھی تابعی ہیں اور تابعی کا عمل دوسرے تابعی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ جبکہ احناف نے مستدل صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو بھی بنایا ہے۔

چھٹی بات: یہاں اعمش کے نام سے ذکر کیا ہے اب ایسے القاب سے قرآن نے منع فرمایا ہے ﴿ولا تنابزوا بالالقاب﴾ محدثین پھر اعمش یا اعرج کے نام سے کیوں ذکر کرتے ہیں؟

جواب: امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ نقص پر دلالت کرنے والے القاب ان کو محدثین نے بطور تعارف کے ذکر کیا ہے کیونکہ یہ القاب مشہور تھے نام غیر مشہور تھے تو شہرت کی بنا پر ان القاب کو لائے تنقیص مقصود نہ تھی باقی اگر کوئی دل میں تنقیص کی نیت کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

باب كراهية الاستنجاء باليمين

یہ باب ہے اس بارے میں کہ دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا مکروہ ہے۔اس پر ابوقتادہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے اس بات سے کہ انسان اپنے عضو کو دائیں ہاتھ سے مس کرے۔

اشکال: ترجمۃ الباب بمنزلہ دعویٰ کے ہے۔یہاں دعویٰ [illegible] مطابقت نہیں دلیل عام ہے۔دعویٰ خاص ہے اور دلیل عام سے دعویٰ خاص ثابت نہیں ہوتا۔

جواب: ابن حجر نے ابن دقیق العید کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگرچہ قانون یہی ہے کہ مقید تقیید پر اور مطلق اطلاق پر جاری ہوتا ہے لیکن ابوقتادہ کی حدیث کئی اسناد سے منقول ہے بعض جگہ حدیث مطلق ہے اور بعض جگہ مقید ہے۔کہیں ہے ''نهى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ان يمس الرجل ذكره بيمينه وهو يبول'' اور مخرج مطلق اور مقید کا ایک ہو تو مطلق کو مقید پر اور مقید کو مطلق پر حمل کرنا درست ہے تو یہاں بھی مخرج ایک ہے اس لئے محدثین دعویٰ خاص اور دلیل عام ذکر کرتے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ یہاں مطلق اور مقید کا مخرج ایک ہے اس لئے ایک دوسرے پر محمول ہوسکتے ہیں یہ اشکال تب ہوگا جب مطلق اور مقید کا مخرج الگ الگ ہو۔

دوسری بات: استنجاء بالیمین کا فقہی حکم کیا ہے؟ اس میں دو قول ہیں، جمہور کہتے ہیں کہ استنجاء بالیمین مکروہ تنزیہی ہے مگر ظاہریہ بعض شوافع اور ایک قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ یہ مکروہ تحریمی ہے، بلکہ حنابلہ کا ایک قول یہ ہے کہ اگر کسی نے دائیں ہاتھ سے استنجاء کیا تو وہ شرعاً معتبر ہی نہیں ہے۔جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ باب میں نہی ہے اور نہی تنزیہی تحریمی دونوں کے لئے ہوسکتی ہے لیکن چونکہ خبر واحد ہے اس لئے حرمت ثابت نہ ہوگی۔بلکہ مکروہ تنزیہی ہوگی دوسرا یہ آداب کے قبیل سے ہے۔

تیسری بات: استنجاء بالیمین کی کراہت کی علت کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدھا ہاتھ طعام یا اس جیسے امور کے لئے ہوتا تھا، اور الٹا ہاتھ طہارت اور اس جیسے امور کے لئے ہوتا تھا۔ دوسرا سیدھے ہاتھ سے استنجاء کرے پھر جب کھائے گا تو طبعیت میں نفرت پیدا ہوگی، تو شریعت نے طبعیت کا لحاظ رکھا اور حکم دیا کہ دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کرو۔

چوتھی بات: مس ذکر کی ممانعت استنجاء کے ساتھ خاص ہے یا دوسرے اوقات میں بھی ہے بعض کے ہاں حدیث مقید بھی آئی ہے اس لئے یہ صرف وقت استنجاء کے ساتھ خاص ہے مگر صحیح تر بات یہ ہے کہ دوسرے اوقات میں بھی نہی ہے کیونکہ جب نہی ضرورت کے وقت ہے تو بغیر ضرورت کے کہاں اجازت ہوگی، اس لئے تمام اوقات میں مس ذکر بالیمین مکروہ ہے۔

۳۰۰ھ سے پہلے کے لوگ متقدمین میں شمار ہیں ۳۰۰ھ کے بعد کے لوگ متاخرین میں شمار ہیں اور مصنف متقدمین میں سے ہیں اور متقدمین کے نزدیک کراہت کا لفظ حرمت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

باب الاستنجاء بالحجارة

اس باب میں عبدالرحمٰن بن یزید کی روایت نقل کی ہے کہ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا گیا کہ تمہارے نبی تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں یہاں تک کہ قضائے حاجت کے لئے بیٹھنے کا طریقہ بھی سکھلاتے ہیں۔ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہاں ہمیں غائط اور بول کے وقت استقبال قبلہ اور استنجاء بالیمین سے منع کیا اور اس سے بھی منع کیا کہ ہم میں سے کوئی تین پتھروں سے کم پر استنجاء کرے یا ہڈی سے استنجاء کرے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد کیا ہے تو اس کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ اس کا مقصد استنجاء بالحجارہ کا ثبوت ہے کہ پتھر کے ساتھ استنجاء کفایت کر جاتا ہے نماز پڑھے تو ہو جائے گی، اور دوبارہ پانی کی ضرورت نہیں پڑتی، بعض لوگ جن میں ابن حبیب مالکی، زیدیہ اور شیعہ ہیں کہتے ہیں کہ استنجاء بالحجارہ جائز نہیں اگر کرلیا تو پانی استعمال کئے بغیر استنجاء نہ ہوگا۔ اس وجہ سے مصنف نے ثبوت استنجاء بالحجارہ کو ذکر کیا تا کہ ان کا قول رد ہو جائے۔

دوسری بات: استنجاء بالحجارہ جائز تو ہے لیکن نجاست اگر قدر درہم سے زیادہ پھیل جائے تو پھر استنجاء بالحجارہ کافی نہ ہوگا جب تک کہ دھو نہ لیا جائے۔

تیسری بات: حجر سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق دو قول ہیں ① داؤد ظاہری کہتا ہے کہ صرف حجر (پتھر) سے استنجاء جائز ہے باقی اشیاء سے جائز نہیں۔ ② جمہور کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو خود طاہر ہو، محترم نہ ہو، قالع للنجاسۃ ہو، ایذا رساں نہ ہو، انسانوں یا جنوں کے کھانے سے نہ ہو، استنجاء سے اس کی منفعت ختم نہ ہوتی ہو۔ ایسی صفات والی اشیاء سے استنجاء جائز ہے۔

پہلی شرط تھی کہ طاہر ہو کیونکہ خود پاک نہ ہو تو دوسرے کو کس طرح پاک کرے گی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوبر سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا۔

دوسری شرط تھی کہ شئی محترم نہ ہو کیونکہ قابل احترام چیز سے استنجاء جائز نہیں جیسے لکھا ہوا کاغذ۔

تیسری شرط تھی کہ وہ چیز قالع للنجاسۃ ہو کیونکہ نجاست کو زائل نہ کرے تو استنجاء کا جو فائدہ ہے وہ حاصل نہ ہوگا جیسے چکنی چیز اس سے ازالہ نجاست نہیں ہوسکتا۔

چوتھی شرط تھی ایذا رساں نہ ہو جیسے شیشے کا ٹکڑا ایک تو قالع نہیں دوسرا کٹ جانے کا خطرہ ہے۔

پانچویں شرط تھی کہ انسانوں یا جنوں کی خوراک نہ ہو، انسان کی خوراک قابل احترام اشیاء میں داخل ہے جنات کی خوراک میں ہڈی داخل ہے، یا حیوانات کی خوراک نہ ہو جیسے گھاس وغیرہ۔

چھٹی شرط تھی کہ اس چیز کا مقصد منفعت استنجاء سے فوت نہ ہو جیسے روٹی روئی یا نیا کپڑا جو کسی کام میں آسکتا ہو لیکن چھوٹا ٹکڑا بے کار ہو یا پرانا ہو فائدہ ختم ہو گیا ہو اسے استنجاء میں استعمال کرنا جائز ہے۔ تو جمہور کے ہاں استنجاء صرف حجر کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جس چیز میں یہ چھ صفات موجود ہوں وہ حجر کے قائم مقام ہوگا۔

چوتھی بات: قيل لسلمان بعض روایات میں ہے قال المشركون معلوم ہوتا ہے معترض مشرک تھا، اس کا مقصد استفہام (یعنی سمجھ کے لئے سوال کرنا) نہ تھا بلکہ استہزاء مقصد تھا۔ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "أجل" اجل نعم کی طرح حرف جواب ہے دونوں ہم معنی ہیں مگر کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ سوال کے جواب میں اُجل ہو اور خبر کے جواب میں نعم ہو۔ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آداب بتائیں ہیں۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ سلمان کا جواب علی اسلوب الحکیم ہے اور جواب علی اسلوب الحکیم کہتے ہیں کہ جو جواب سائل کے منشاء کے خلاف ہو اور سنن نسائی کے حاشیے میں ہے کہ یہ رد ہے بہر حال جو بھی ہو سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سائل کے استہزاء کو نظر انداز کر دیا اور فرمایا کہ جس کو تم قابل استہزاء سمجھتے ہو یہ تو مذہب کے محاسن میں سے ہے کہ ہر کام کے لئے آداب موجود ہیں۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین کو کامل اور تام کہا ہے۔ کامل کہتے ہیں ان اجزاء کے استیعاب کو جن اجزاء پر شئی کی حقیقت موقوف ہو اور وہ اجزاء جو حقیقۃ الشئی میں داخل نہیں مگر عوارض حسنہ ہیں وہ اس شئی میں ہوں تو اس کو تام کہتے ہیں۔ اور یہ دین اسلام کامل بھی ہے اور تام بھی۔ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ﴿اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا﴾۔

پانچویں بات: سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں جملہ ہے "وأن يستنجي أحدنا باقل من ثلاثة احجار" اب پتھر سے استنجاء کرے تو انقاء واجب ہے یا تثلیث بھی واجب ہے اس میں اختلاف ہے۔

شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ انقاء اور تثلیث دونوں واجب ہیں، اگر تین سے زائد استعمال کرنا چاہے تو ایتار مستحب ہے، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کہتے ہیں انقاء واجب ہے تثلیث مستحب ہے۔ شوافع کی دلیل باب کی حدیث کا مذکور ٹکڑا ہے کہ تین سے کم احجار سے استنجاء سے منع کیا، معلوم ہوا کہ تین کا استعمال واجب ہے۔

احناف و مالکیہ کی دلیل ① سنن ابوداؤد کی روایت ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ "من استجمر فليؤتر من فعل فقد أحسن ومن لا فلاحرج"، فلیوتر میں امر سے وجوب ثابت ہو رہا تھا، لیکن اگلے جملے سے معلوم ہوا کہ ایتار مستحب ہے، بیہقی کہتے ہیں یہاں ایتار بعد الثلاث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا مقصد انقاء ہے ایتار مقصود نہیں اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے "اذا ذهب أحدكم الى الغائط فليذهب معه بثلاثة أحجار فليستطب بها فانها تجزئ عنه" یہاں معلوم ہوا کہ شریعت کا مقصد عدد نہیں بلکہ پاکی حاصل کرنا ہے کہ تین کفایت کر جائیں گے دوسری روایت خزیمہ بن ثابت کی ہے "من استطاب بثلاثة احجار ليس فيهن رجيع كان له طهورًا" معلوم ہوا کہ اصل مقصد طہارت ہے۔ تیسری روایت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس میں ہے "اذا تغوط احدكم فليستنج بثلاثة احجار فان ذلك طهوره" اس کے علاوہ بھی کئی روایات ہیں۔ احناف کی تیسری دلیل قیاس ہے کہ اصل مقصد انقاء ہے عدد مقصود نہیں۔ سنن ترمذی میں ابواب الجنائز میں ہے کہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین یا پانچ مرتبہ غسل دو۔ ترمذی وہاں لکھتے ہیں کہ تین دفعہ

سے کم غسل دیا میت کو یہ بھی کافی ہے تین یا پانچ مرتبہ مستحب ہے پھر لکھتے ہیں "کذلک قال الفقهاء وهم اعلم بمعانی الحدیث" اب جب وہاں تین یا پانچ کو واجب قرار نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ عدد واجب نہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے ایک آدمی جبہ میں آیا جبہ پر خوشبو تھی آپ ﷺ نے فرمایا جبہ اتار دو اور خوشبو کو تین دفعہ دھولو (کتاب الحج) نووی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں ایک دفعہ دھونا بھی کافی ہے تین واجب نہیں تو جب تم وہاں تثلیث کو واجب نہیں مانتے ہو تو یہاں کیوں واجب کہتے ہو تو احناف غرض دیکھتے ہیں جبکہ شوافع کبھی غرض دیکھتے ہیں کبھی ظاہر پر جم جاتے ہیں۔ باقی شوافع کو احناف الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ اس حدیث کے ظاہر پر خود تمہارا عمل بھی نہیں۔ کیونکہ تم کہتے ہو تین کونے والے ایک پتھر کو استعمال کیا تو وہ وجوب پر عمل ہو گیا تو ظاہر پر آپ کا عمل بھی نہیں اس لئے مقصود کو دیکھو جو کہ انقاء ہے۔ البتہ ایتار کا حکم ہے اس لئے مستحب ہے دوسرا اگر کوئی تین پتھر لے جائے تو ایک پتھر بول اور دو غائط کے لئے استعمال کرے گا تو استنجاء تین احجار سے نہ ہوا۔

اشکال: پتھروں سے تو بالکلیہ نجاست ختم نہیں ہوتی؟ جواب: نجاست کے ازالے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ بالکلیہ ختم ہو جائے، دوسرا یہ کہ تقلیل نجاست ہو اب کسی جگہ پانی ملنا مشکل ہوتا ہے اس لئے وہاں پر شریعت نے نجاست کے ازالے کے لئے دوسرے طریقے کی اجازت دے دی تاکہ حرج لازم نہ آئے۔

باب فی الاستنجاء بالحجرین

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ قضائے حاجت کے لئے گئے مجھے حکم دیا کہ تین پتھر لاؤں میں دو پتھر اور ایک گوبر لے کر آیا تو انہوں نے گوبر پھینک دیا اور فرمایا "اِنھا رکس" اور پتھروں کو لے لیا۔

پہلی بات: اس باب کی حدیث سے احناف استدلال کرتے ہیں کہ استنجاء بالاحجار میں انقاء واجب ہے تثلیث واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، اس کی دلیل یہ روایت بھی ہے کیونکہ آپ نے ایک لید پھینک دی، اور وہ پتھر رکھ لئے، تو دو پتھروں سے استنجاء کیا اگر تثلیث واجب ہوتی تو یہاں دو پتھر کس طرح استعمال ہوتے۔

اس پر شوافع حضرات کچھ اعتراضات کرتے ہیں۔

اعتراض: ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دارقطنی میں ہے کہ جب روثہ کو پھینکا تو فرمایا "ائتنی بثالث" معلوم ہوا تین پتھر استعمال کئے۔

جواب: علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے تیسرا پتھر مانگا ہے مگر معلوم نہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیش کیا ہو دوسرا جس روایت میں تیسرا پتھر لانے کا حکم ہے وہ منقطع ہے جو کہ علمائے حدیث کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے، شوافع کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے خود تیسرا پتھر تلاش کیا ہوگا۔ جواب: ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو پتھر لائے حضور ﷺ نے دوبارہ بھیجا مگر ان کے علاوہ اور نہیں ملا معلوم ہوا اس جگہ پتھر موجود نہ تھے۔

اعتراض: احتمال دو قسم پر ہے: ایک یہ کہ احتمال کا منشاء یا وجہ موجود ہو تو پھر تو "اذا جآء الاحتمال بطل الاستدلال" والا قاعدہ چلے گا۔ دوسرا یہ کہ احتمال کی وجہ سے اور منشاء موجود نہ ہو تو ایسی احتمال استدلال کو ختم نہیں کر سکتی صحیح تربات یہ ہے کہ احناف کا استدلال اس حدیث سے صحیح ہے، اسی فائدے کے لئے امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا اصول ہے کہ اختلافی مسئلہ ہو تو اس کے لئے دو باب قائم کر کے دونوں فریقوں کے دلائل ذکر کرتے ہیں۔

دوسری بات: آپ ﷺ نے لید پھینک دی اور فرمایا "اِنهار کس" یہاں الفاظ مختلف ہیں بعض روایات میں رجس ہے بمعنی نجس کے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نجس ہے ایک روایت میں رکس کا لفظ ہے تو اس کا مطلب کیا ہے؟

اس میں دو باتیں ہیں نمبر ① یہ کہ رکس کا معنی ہے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل ہونا تو معنی ہوگا کہ یہ رکس ہے کہ ایک حالت (طہارت) سے دوسری حالت (نجاست) کی طرف تبدیل ہوگئی ہے کیونکہ جب خوراک تھی تو پاک تھی جب جانور نے کھالیا تو گوبر بن گیا تو حالت بدل گئی اور ناپاک ہوگئی۔ ② امام نسائی نے رکس کی تعریف کی ہے طعام الجن سے تو فرماتے ہیں کہ لغوی اعتبار سے رکس کا معنے طعام الجن سے صحیح نہیں۔ نسائی کو غلط فہمی ہوئی اور وہ سمجھے کہ ہڈی اور روثہ دونوں جن کی خوراک ہے، لیکن حضور ﷺ کا کہنا کہ "جنات کی خوراک ہے" صرف ہڈی کے ساتھ خاص ہے اور روثہ ان کے جانوروں کی غذا ہے۔

ہڈی اور روثہ وغیرہ سے استنجاء کرنے سے منع کیا اور کئی علتیں بیان کیں ① اِنهار کس ② یہ چیزیں پاک نہیں کرتیں ③ یہ جنات کی خوراک ہے معلوم ہوا ممانعت کی متعدد علتیں ذکر کیں اور ایک معلول کی کئی علتیں ہوسکتی ہیں اس لئے رکس کا معنے طعام الجن سے کرنا صحیح نہیں۔

تیسری بات: معارف السنن میں ہے کہ رجس کا لفظ یہاں زیادہ مناسب ہے یا رکس کا لفظ، اصل بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے روثہ استعمال نہ کیا۔ فرمایا "اِنهار جس" یہ نجس ہے۔ نجس ہونا حکم شرعی ہے یہ نجس کیوں ہے تو وصف حسی کا بیان نہیں کہ ہم اس کو علت بنا کر حکم کو متعدی کریں لیکن رکس کا لفظ ہو تو اس میں حکم بھی موجود ہے اور علت اور وصف حسی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نجس کیوں ہے؟ اس لئے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدل چکی ہے تو ہم حکم کو متعدی کر سکتے ہیں کہ جو چیز بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلے اس سے استنجاء صحیح نہیں اس لئے رکس کا لفظ بہتر ہے۔

چوتھی بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث نقل کی ہے اسرائیل عن ابی اسحق کی سند سے ابو اسحق کے متعدد شاگرد ہیں۔ ایک اسرائیل ہے، سند یوں ہے "اسرائیل عن ابی اسحق عن ابی عبیدہ عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ" اب امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سند کو راجح قرار دیدیا۔ جبکہ آگے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ خود فرمائیں گے کہ ابوعبیدۃ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے تھے لیکن والد کی وفات کے وقت اتنے کم عمر تھے کہ والد سے روایت نہ سن سکتے تھے معلوم ہوا روایت منقطع ہے پھر بھی امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو راجح کیوں کہا؟

جواب: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو ترجیح دی یہ تین وجوہ کی بناء پر دی۔ ① یہ حدیث جس طرح اسرائیل نے ابو اسحق سے نقل کی ہے تو اس کا متابع موجود ہے کہ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

② ابو اسحق کے شاگردوں میں اسرائیل، معمر، زہیر، زکریا بن ابی زائدہ شامل ہیں۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابو اسحق کے دو دور ہیں، ایک جوانی کا دور دوسرا بڑھاپے کا جب بڑھاپے کا دور آیا تو ان کے حافظے میں اختلاط آ گیا تھا لیکن اسرائیل نے استاد کی جوانی کی عمر میں ان سے سیکھا جبکہ دوسرے شاگردوں نے تب علم حاصل کیا جب ابو اسحق بوڑھے ہو چکے تھے۔

③ دار قطنی کہتے ہیں ابوعبیدہ کی روایت اپنے والد ابن مسعود سے یہ منقطع ہے مگر محدثین کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ اپنے والد کے علوم کا دوسرے شاگردوں کی بنسبت زیادہ اعلم ہے۔ اس لئے اس کی روایت کو ترجیح دی۔ تو اس روایت کے سند میں اضطراب تھا، لیکن ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اضطراب ختم کرنے کے لئے اسرائیل عن ابی اسحق والی سند کو ترجیح دی۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے زہیر کی سند سے ذکر کیا ہے "زہیر عن ابی اسحق عن عبدالرحمٰن بن الاسود بن یزید عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ" یہ سند متصل ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہوں نے کوئی

فیصلہ نہیں کیا لیکن کتاب میں زہیر والی سند ذکر کی ہے تو گویا ان کے ہاں یہ سند راجح ہے مگر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسرائیل والی سند کو ترجیح دی ہے۔

ابو عبیدۃ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے ہیں بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام عامر تھا، بعض کہتے ہیں نام ابو عبیدہ ہی ہے۔ ان کا سماع اپنے والد ابن مسعود سے ثابت ہے یا نہیں۔ تو ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ان کا سماع ثابت نہیں۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ سماع ثابت ہے کیونکہ معجم طبرانی کی حدیث ہے اس میں ابو عبیدہ کہتے ہیں "**سمعت ابن مسعود**" مبارک پوری نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں تو سماع کی صراحت ہے لیکن اس روایت کی صحت تلاش کرنی چاہئے۔ مگر یہ بیکار اعتراض ہے کیونکہ اگر اس کو کسی راوی پر اعتراض تھا تو ذکر کرنا چاہئے تھا۔

ابو عبیدہ کے متعلق ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ والد کے انتقال کے وقت سات سال کے تھے۔ اور محدثین کے نزدیک سات سال کا بچہ تحمل حدیث کرسکتا ہے بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر باب بھی باندھا ہے جس میں جمہور کے نزدیک عمر متعین نہیں لیکن سات سال کے بچے میں اتفاق ہے کہ سماع کرسکتا ہے، لیکن سماع ثابت نہ بھی ہو تو دارقطنی کا فیصلہ تو ہے "**کان اعلم بعلم أبیه**"۔

ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بخاری کے مقابلے میں اسرائیل والی سند کو ترجیح دی کیونکہ ابو حاتم اور ابو ذرعہ جو بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہم عصر ہیں انہوں نے بھی اسرائیل والی سند کو ترجیح دی ہے، تو ترمذی نے ابو حاتم اور ابو ذرعہ کی تابعداری کی ہے۔

باب کراھیة مایستنجی به

اس باب میں مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لید اور ہڈی سے استنجاء نہ کرو کیونکہ یہ (ہڈی) تمہارے بھائی جنوں کی خوراک ہے۔

یہ جنات کے ساتھ واقعہ پیش آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لے کر گئے جنات کے قریب کی جگہ میں دائرہ میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھایا اور فرمایا یہاں سے نہ نکلو صبح آپ نے واپس آکر بتایا کہ نصیبین علاقے کے جن تھے، واپسی پر انہوں نے غذا مانگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہڈی تمہاری خوراک ہے اس پر پہلے کی نسبت زیادہ گوشت ملیگا، اس وقت ہڈیوں اور گوبر سے استنجاء منع کیا۔

پہلی بات: باب کی حدیث میں جن اشیاء کا ذکر ہے ان سے بالاتفاق استنجاء مکروہ ہے، البتہ بعض کتابوں میں ہے کہ احناف کے ہاں اگر ممانعت کے باوجود کسی نے ہڈی سے استنجاء کرلیا تو مستنجی شمار ہوگا یا نہیں؟ تو احناف کہتے ہیں کہ مستنجی شمار ہوگا، کفایت کرجائے گا، کیونکہ یہاں ممانعت کی وجہ جنات کی خوراک ہے یہ نہیں کہ وہ پاک نہیں کرسکتی بلکہ فی نفسہ اس میں پاک کرنے کی صلاحیت ہے، اس لئے اگرچہ مکروہ ہے مگر کوئی کرے تو مستنجی شمار ہوگا۔ دوسرا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ان کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی تھی یہ ان سے استنجاء کیا کرتے تھے اس سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے لیکن گوبر یا لید سے کوئی استنجاء کرے تو وہ مستنجی شمار نہیں ہوگا کیونکہ وہ خود نجس ہیں تو حصول طہارت کا ذریعہ کس طرح ہوں گے؟

دوسری بات: یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کا ذکر کیا ان اشیاء میں سے جن سے استنجاء مکروہ ہے، لیکن ممانعت دو چیزوں میں محصور نہیں بلکہ فقہاء نے مجموعہ احادیث سے اصول مستنبط کئے کہ ہر اس شئے سے استنجاء نہ ہوگا (۱) جو خود طاہر نہ ہو (۲) انسانوں یا جنات کی خوراک ہو یا جانوروں کی خوراک ہو (۳) ہر وہ چیز جو قابل احترام ہو اس سے بھی استنجاء جائز نہیں جیسے لکھا ہوا کاغذ یا جس

کاغذ پر لکھا جاسکتا ہو ④ وہ چیز جو انسانی فائدے کی ہے اور استنجاء سے اس کا فائدہ فوت ہوتا ہو جیسے روئی اور پہننے کے نئے کپڑے۔ ⑤ جس چیز سے ایذا کا خطرہ ہو تو اس سے بھی استنجاء جائز نہیں جیسے لوہا وغیرہ ⑥ جس میں ازالہ نجاست کی صلاحیت نہ ہو جیسے شیشہ اور ہر چکنی چیز۔ اب ان اصول کے تحت جتنے افراد آجائیں تمام سے استنجاء ممنوع ہوگا باقی حدیث میں موقع کی مناسبت سے صرف دو کا ذکر کیا، اس لئے مکروہات دو اشیاء میں محصور نہیں۔

تیسری بات: نبی ﷺ نے فرمایا ''فانہ زاد اخوانکم من الجن'' پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا روث اور عظام جبکہ اُنہ میں مفرد کی ضمیر لائی اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب ❶: انہ کی ضمیر عظام کی طرف راجع ہے روث بالتبع خود داخل ہے۔

جواب ❷: انہ کی ضمیر دونوں کی طرف راجع ہے بتاویل مذکور کے۔

حدیث میں فرمایا کہ یہ جنات کی خوراک ہے تو کیا ایک چیز خوراک ہے یا دونوں۔ تو اس میں دو قول ہیں ① عظام جنات کی خوراک ہے اور روث ان کے جانوروں کی خوراک ہے ② عظام اور روث دونوں جنات کی خوراک ہیں، کیونکہ جس طرح ہڈی پر ان کو گوشت ملتا ہے، اسی طرح گوبر سے بھی دانے وغیرہ کی صورت میں خوراک ملتی ہے۔

اب یہ بات کہ گوشت کس قسم کا ملتا ہے اس کے بارے میں حدیث میں اختلاف ہے ایک روایت میں ہے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھی ہو وہ ملتا ہے ''**لکم کل عظم ذکر اسم اللّٰہ علیه یقع فی ایدیکم او فر مایکون لحماً و کل بعرة علف لدوابکم**'' رواہ مسلم اور ترمذی میں سورۃ الاحقاف کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ ''**کل عظم لم یذکر اسم اللّٰہ علیه یقع فی أیدیکم او فر ما کان لحماً**'' تو ان دونوں روایات میں بظاہر تعارض ہے۔ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس تعارض کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی ہے۔ البتہ سیرۃ الحلوبیہ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور تعارض ختم کرنے کی دو صورتیں لکھیں ہیں۔

① سنداً جو قوی ہو اس کو راجح کہیں گے اور سنداً مسلم کی روایت قوی ہے ترمذی کی روایت سنداً قوی نہیں اس لئے نہیں لیں گے۔

② صحیح مسلم کی روایت مسلمان جنات کے لئے ہے اور ترمذی کی روایت کافر جنات کے لئے ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تیسری صورت بھی بتائی کہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے قاعدہ لکھا ہے کہ متعارض روایات کے بارے میں محدثین کہتے ہیں ''**حفظ کل مالم یحفظه آخر**'' تو یہاں ہے کہ تمہارے لئے ہر وہ ہڈی ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہیں۔ تو بعض رواۃ نے ذکر اسم اللہ یاد رکھا اور بعض نے ولم یذکر یاد رکھا دوسرا بھول گئے۔ اب جمع کی صورت یہ ہے کہ ہر ہڈی پر گوشت ملے گا چاہے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہیں لیکن بعض راویوں کو پہلا لفظ یاد رہا بعض کو دوسرا۔

اس روایت میں داؤد بن ابی ھند سے حفص بن غیاث نے بھی نقل کیا ہے اور اسماعیل بن ابراہیم نے بھی نقل کیا ہے حفص بن غیاث کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا اور اسماعیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبی نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا اب شعبی تابعی ہے تو دوسری روایت مرسل ہے اور احناف جمہور کے ہاں مرسل روایت حجت ہے۔ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے مرسل کی حجیت کا انکار کیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس روایت کو اُصح کہا ہے، لیکن آگے جاکر نبیذ تمر میں اس کو ضعیف کہیں گے۔

وفی الباب عن جابر وابی ہریرۃ وسلمان وابن عمر: بعض حضرات کہتے ہیں کہ بعض ابواب میں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ دوبارہ لکھتے ہیں لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی ہے ورنہ دوبارہ اس کے ذکر کرنے کا کوئی مطلب نہیں۔

باب الاستنجاء بالماء

اس باب میں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے عورتوں سے کہا کہ اپنے ازواج کو حکم دو کہ وہ پانی کے ساتھ استنجاء کریں مجھے حیاء آتی ہے (کہ خود مردوں کو حکم دوں) بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانی سے استنجاء کرتے تھے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد استنجاء بالماء کا ثبوت ہے آپ جس طرح استنجاء بالاحجار کرتے تھے اسی طرح استنجاء بالماء بھی کرتے تھے۔

دوسری بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کو استنجاء بالماء کی ثبوت کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کے متعلق لکھا ہے کہ صحابہ میں بعض سے منقول ہے کہ وہ استنجاء بالماء کو ناپسند کرتے تھے۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ پانی سے استنجاء کریں تو ہاتھ سے بدبو آئے گی۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے بعض تابعین کہتے ہیں کہ اس کو انسان پیتا ہے، اس لئے محترم چیز ہے تو اس سے استنجاء مکروہ ہوگا تو ان صحابہ یا تابعین سے ممانعت منقول تھی تو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس کا جواز اور ثبوت نہ ہوگا۔ اس لئے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب قائم کر کے حدیث سے ثابت کر دیا۔

تیسری بات: استنجاء کی تین صورتیں ہیں ① بالاحجار، ② بالماء ③ جمع بین الحجارۃ والماء۔ اب ان تین صورتوں کے جواز پر ائمہ اربعہ کا اتفاق اور اجماع ہے۔ جمہور فقہاء اور محدثین کا بھی اتفاق ہے، لیکن افضل طریقہ کون سا ہے؟ تو اس میں بھی اتفاق ہے، کہ سب سے افضل طریقہ جمع بین الحجارۃ والماء ہے۔ دوسرے نمبر پر استنجاء بالماء ہے کیونکہ اس سے نجاست بالکلیہ زائل ہو جاتی ہے اور مکمل انقاء ہو جاتا ہے، بخلاف استنجاء بالاحجار کے کہ اس سے حکماً پاکی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر نجاست کے آثار باقی رہ جاتے ہیں۔

چوتھی بات: ان تینوں صورتوں کا ثبوت: استنجاء بالاحجار کے متعلق احادیث تواتر کے قریب ہیں۔ باقی استنجاء بالماء کا ثبوت بھی صحیح احادیث سے ہے اگرچہ زیادہ روایات نہیں۔ باقی تیسری صورت کے بارے میں معارف السنن میں ہے کہ علامہ حیثمی نے باب قائم کر کے احادیث نقل کی ہیں تو ایسی کوئی حدیث اس میں موجود نہیں جس میں جمع بین الماء والحجارہ کا ذکر ہو اور وہ صحیح بھی ہو۔ البتہ "فیھم رجال یحبون ان یتطھروا" یہ آیت اہل قبا کے بارے میں اتری حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم پہلے استنجاء بالاحجار پھر استنجاء بالماء کرتے ہیں۔ یہ روایت مفسرین نقل کرتے ہیں مگر محدثین نے نقل نہیں کیا ایسی کسی روایت کو جن میں ان کے جمع ہونے پر صراحت ہو البتہ روایات سے صرف اشارہ ملتا ہے۔

پانچویں بات: استنجاء بالماء کا حکم کیا ہے؟ اگر نجاست بقدر الدرہم تجاوز نہ کرے تو استنجاء بالماء اس صورت میں مستحب ہوگا۔ لیکن اگر نجاست بقدر الدرہم مخرج سے تجاوز کر جائے تو استنجاء بالماء فرض و واجب ہوگا یہ حکم اتفاقی ہے۔

فانی استحیھم الخ معلوم ہوا کہ شرعی مسئلہ ہو اس کے بیان کرنے میں عورت کو حیاء آئے اور مسئلے کے ضائع ہونے کا ڈر ہو تو اس مسئلے کا بیان کرنا اس پر لازم ہوتا ہے، لیکن ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو اور کسی طرح اس مسئلے کے پہنچنے کا امکان ہو پھر بیان کرنا لازم نہیں۔

باب ماجا أن النبی کان اذا اراد الحاجۃ ابعد فی المذھب

اس باب میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے گئے تو بہت دور گئے ① تو اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی

کہ بول یا غائط کے لئے بہت دور جا کر کرتے تھے تو مقصد صرف اتنا ہے کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ بیت الخلاء کے آداب میں سے ایک ادب بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دور جانا چاہئے۔

دوسری بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لئے باب قائم کیا ہے کہ دور جانا مستحب ہے اس استحباب پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

تیسری بات: دور جانا وہاں مستحب ہے جہاں دور جانا ممکن ہو لیکن بڑا شہر ہو وہاں دور جانا ممکن نہیں تو دور جانا مستحب بھی نہیں بلکہ ایسی جگہوں پر ابعاد کا مقصد پورا کرنا ہوگا۔

چوتھی بات: ابعاد کا مقصد کیا ہے اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ ① ستر مقصود تھا کہ عورت کو کوئی نہ دیکھے۔ ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود نظیف الطبع تھے تو دوسروں کو بھی نظافت کا حکم دیا۔ اب قریب بیٹھو تو ماحول گندہ ہوگا، یہ نظافت کے خلاف ہے اگر چہ انبیاء کے غائط کے بارے میں ہے کہ وہ پاک ہے۔ دوسرا بعض نے کہا ہے کہ زمین اس کو نگل لیتی ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دور جاتے تھے تعلیماً للامۃ۔ ③ حکماء کہتے ہیں غائط سے پہلے چلنے پھرنے سے قضائے حاجت جلدی ہو جاتی ہے ان وجوہات کی بنا پر دور جاتے تھے۔

پانچویں بات: "أبعد فی المذهب" مذہب مصدر میمی ہے بعض احادیث میں ظرف کی جگہ استعمال ہوا ہے اب کہاں ظرف کے لئے ہے اور کہاں مصدر میمی ہے یہ قرینہ سے معلوم ہوگا یہاں مصدر میمی ہے کہ جانے میں دوری اختیار کرتے۔

چھٹی بات: کتنا دور جاتے تھے نافع کی روایت میں منقول ہے کہ دو میل کی مقدار دور جایا کرتے تھے۔

یرتاد: ای یطلب مکانا لینا: کہ نرم جگہ تلاش کرنا جس طرح پڑاؤ کے لئے تلاش کی جاتی ہے، وہ ایسی جگہ ہو جس میں یہ صفات ہوں ① وہاں ستر حاصل ہو ② باعث ایذاء جگہ نہ ہو ③ مناسب جگہ ہو مثلاً نرم زمین ہو پتھر نہ ہو کہ چھینٹے پڑیں، وہاں پر بیٹھنے کی جگہ بھی ہو۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ابوسلمۃ تھے ان کا نام عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عوف الزہری ہے یہ فقہاء سبعہ میں سے ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة البول فی المغتسل

اس باب میں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اس بات سے کہ انسان غسل خانے میں بول کرے۔ اور فرمایا کہ عام وسواس اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث میں بول کے اداب میں سے ایک ادب بیان کیا جارہا ہے۔

دوسری بات: مستحم کا لفظ حمیم سے ہے بمعنی گرم پانی تو مستحم وہ مقام جہاں گرم پانی سے غسل کیا جاتا ہو (یہ لفظ باب استفعال پر لایا گیا ہے) اور یہ غسل خانہ ہی ہوتا ہے بعض نے کہا کہ حمیم کا لفظ اضداد میں سے ہے، الماء الحار اور الماء البارد دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے تو مستحم کا معنی ہوگا غسل کرنے کی جگہ چاہے گرم پانی سے غسل کیا جائے یا ٹھنڈے پانی سے۔

تیسری بات: معارف السنن میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فان عامة الوسواس منه" بعض نحاۃ کہتے ہیں کہ عامہ کا لفظ اضافت کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بطور حال کے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن تفتازانی نے شرح المقاصد کے مقدمے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط سے نقل کیا ہے اضافت کے ساتھ۔ تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہاں بھی اضافت کے ساتھ مستعمل ہے۔

چوتھی بات: جس مسئلے کے لئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب قائم کیا ہے اس کا حکم کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔

❶ جمہور کہتے ہیں کہ غسل خانہ اگر ایسا ہو کہ اس کی زمین کچی ہو بول کو جذب کرتا ہے، یا زمین پکی ہے مگر بول کے نکلنے کا راستہ نہیں، تو اس صورت میں چھینٹیں آئیں گی ایسی جگہ بول کرنا ممنوع ہے لیکن تیسری صورت جو ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول میں موجود ہے کہ غسل خانے کی زمین پکی ہے اور بول اور پانی کے نکلنے کا راستہ بھی موجود ہے۔ پھر بول کرنا جائز ہوگا ممنوع نہیں ہوگا۔ کیونکہ ممانعت کی علت موجود نہیں، اور الحکم یدور مع العلۃ کے قاعدے کے تحت جب علت نہیں تو حکم بھی نہ لگے گا یہ جمہور کا قول ہے۔

❷ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے محمد بن سیرین تابعی کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ بول فی المغتسل مطلقاً جائز ہے چنانچہ ان سے جب کہا گیا کہ ان عامۃ الوسواس منہ'' تو انہوں نے جواب دیا'' ربنا اللّٰہ لاشریک لہ''

❸ تحقیقی قول یہ ہے کہ غسل خانہ پہلی دو صورتوں میں سے کسی صورت پر ہو کہ زمین کچی ہے یا زمین پکی ہے مگر نکلنے کا راستہ نہیں ان صورتوں میں کراہت کراہت تحریمی ہے۔ اور اگر تیسری صورت ہو کہ غسل خانہ پکا ہے اور بول نکلنے کا راستہ بھی ہے تو یہاں کراہت کراہت تنزیہی ہوگی کیونکہ حدیث مطلق ہے اس میں کچا یا پکا ہونے کی تفصیل نہیں۔

❹ ابن اثیر رحمہ اللہ تعالیٰ اور نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کے کچے غسل خانے میں بول جائز ہے کیونکہ وہ جذب کرے گا، لیکن پکے میں جائز نہیں کیونکہ جذب نہیں کرتا تو چھینٹیں پڑیں گے۔

پانچویں بات: محمد بن سیرین کا جو قول ہے'' ربنا اللّٰہ لاشریک لہ'' اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ'' فان عامۃ الوسواس منہ'' حدیث کے الفاظ ہیں محمد ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول نہیں کیا بلکہ معارضہ کیا اور کہا'' ربنا اللّٰہ لاشریک لہ'' اب حدیث کے ساتھ معارضہ دو طرح کا ہے۔

① معارضہ حقیقی یہ کفر ہے ② صورۃً معارضہ ہو یہ صورت کفر کی نہیں مگر نامناسب تو ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صورۃ معارضہ بھی ناپسند کیا۔ جس طرح امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' کان رسول اللّٰہ ﷺ یحب الدباء'' ایک آدمی نے کہا'' اما انا فلااحبہ'' ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے تلوار سیدھی کر لی اور فرمایا'' تسب والا اقتلک'' تو اس نے توبہ کی، یہاں صورۃً معارضہ تھا۔ اسی طرح عبداللہ بن مغفل جا رہے تھے ایک آدمی کنکریاں مار رہے تھے انہوں نے فرمایا'' نھی رسول اللّٰہ ﷺ عن ذلک'' وہ پھر مارنے لگے تو اس پر وہ غصہ ہوئے کہ میں حدیث سنا رہا ہوں اور تم نہیں مانتے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک صوری معارضے پر پوری عمر اپنے بیٹے سے بات نہیں کی عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث سنائی'' الحیاء کلہ خیر'' کسی آدمی نے کہا کہ اس کے اقسام ہیں تو عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سخت غصہ ہوئے اب ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح معارضہ کیا؟

جواب: محمد بن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ تک حدیث نہ پہنچی تھی اور سائل نے یہ جملہ بطور حدیث ذکر بھی نہ کیا تھا بلکہ یقال سے کہا اس لئے انہوں نے یہ الفاظ کہے تو وہ معذور تھے باقی'' ربنا اللّٰہ لاشریک لہ'' کا مطلب یہ ہے کہ وسواس کا پیدا ہونا پیشاب سے نہیں کیونکہ ہر شئی کا خالق اللہ ہے۔ جب تم وسواس کے بارے میں کہو کہ بول سے وسوسہ ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت خالقیت میں شریک کر دیا۔

چھٹی بات: اشیاء میں تاثیر کا حکم کیا ہے؟ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسباب سے اس مسئلے کا تعلق ہے اس میں اختلاف ہے۔ ① اشاعرہ کہتے ہیں کہ اشیاء اور ان کی تاثیرات میں جوڑ نہیں دونوں کے خالق اللہ ہیں۔ ② معتزلہ قول بالتولید

کرتے ہیں یعنی وہ کہتے کہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشیاء کو پیدا کیا، اور اشیاء میں قابلیت پیدا ہوئی تو تاثیر ان اشیاء سے وجوب عقلی کے ساتھ ہے۔ (۳) فلاسفہ کا قول بالاستعداد ہے کہ چیز پیدا ہوئی تو مبدأ فیاض سے اس میں استعداد تام ہوئی۔ تو تاثیر اس استعداد تام کا نتیجہ ہے۔

(۴) ماتریدی کا قول ہے کہ اشیاء اور ان کی تاثیر میں ربط ہوتا ہے اگر چہ دونوں کے خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہیں جس طرح اشاعرہ کا مسلک ہے، لیکن اشیاء اور تاثیرات میں ربط ہے جیسے آگ میں اللہ نے احراق کی تاثیر رکھی اب جہاں آگ ہو جلائے گی اگر چہ اللہ قادر ہے کہ وہ نہ جلائے جس طرح ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے ہوا۔

باب کی حدیث میں بتایا کہ غسل خانے میں پیشاب کرنا اس میں اللہ نے یہ اثر رکھا ہے کہ اس سے وساوس پیدا ہوتے ہیں تو اشیاء کی تاثیر ہیں جیسے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چھتیس اشیاء لکھی ہیں جن میں نسیان کی تاثیر ہے جیسے جوں کو زندہ پھینکنا، سبز دھنیا کھانا، شلوار سرہانے رکھ کر سونا، کھٹے سیب کھانا، قبرستان کے کتبوں کو پڑھنا تو اشیاء میں تاثیر ہے اسی طرح بول فی المغتسل میں وساوس کی تاثیر ہے وسواس بمعنی حدیث النفس اردو میں ذہنی مریض کو کہتے ہیں جس کو مالی خولیا بھی کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی السواک

اس باب کے اندر امام ترمذی نے ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے اپنی امت کے مشقت میں پڑھ جانے کا خوف نہ ہوتا تو ان کو ہر نماز کیلئے مسواک کا حکم وجوبی دیدیتا۔ دوسری روایت زید بن خالد سے نقل کی ان کی حدیث کا پہلا حصہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرح ہے۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر امت کیلئے مشقت کا باعث نہ ہوتا تو عشاء کو ثلث اللیل تک مؤخر کر دیتا کہتے ہیں کہ زید بن خالد مسواک کو کان کے پاس رکھا کرتے تھے۔

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو خلاء اور آداب خلاء کے متعلق ابواب قائم کئے تھے وہ ختم ہوگئے یہاں سے وضوء کے دوسرے مستحبات، سنن اور آداب کی ابتداء ہو رہی ہے سب سے پہلے مسواک کے متعلق باب قائم کیا ہے اور بطور دلیل دو احادیث پیش کی ہیں۔

پہلی بات: سواک کا لغوی معنی کیا ہے؟ سواک مسواک کے مترادف ہے اور اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کو دانت کی صفائی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ سواک جس طرح سین کے کسرے کے ساتھ ہے اسی طرح سین کے ضمے اور ہمزے کے ساتھ ہوتا ہے یعنی سواک۔ شریعت میں سواک اس لکڑی کو کہتے ہیں جو مخصوص ہوتی ہے اور وضوء کے وقت منہ کی صفائی کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

دوسری بات: اس کی حکمت کیا ہے؟ محدثین کہتے کہ اس میں متعدد حکمتیں ہیں۔ بعض علماء نے اس کی حکمتوں پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱)۔ حدیث میں ہے "السواک مطهرة للفم ومرضاة للرب" تو ایک فائدہ پاکیزگی ہے اور (۲) دوسرا فائدہ رب کی رضاء ہے (۳) جو اس کا عمل کرے اس کو آخری وقت میں کلمہ شریف نصیب ہوگا یہ روایت اگر چہ ضعیف ہے بہر حال اس میں یہ فضیلت ہے (۴) دانت صاف ہو جاتے ہیں (۵) منہ میں بدبو نہیں رہتی وغیر ذالک۔ سب سے بڑی فضیلت جو مسند احمد میں روایت ہے اگر چہ اس کی سند ضعیف ہے مگر مزنی نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "صلاة بسواک افضل من خمس وسبعين صلاة بغير سواک" رواه المزنی فی کتابه المسمی بالترغيب والترهيب.

تیسری بات: مسواک کا شرعی حکم کیا ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مسواک مسنون ومستحب ہے یہی مذہب جمہور محدثین اور ائمہ اربعہ کا بھی ہے۔ امام اسحاق بن راہویہ اور داؤد ظاہری کے طرف وجوب کا قول منسوب ہے۔ نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اسحاق اور داؤد ظاہری کی طرف وجوب کا قول منسوب کرنا صحیح نہیں تو گویا کہ سب کے ہاں مستحب ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ اگر یہ دونوں حضرات وجوب کے قائل بھی ہوں تو ان کا اختلاف اجماع کیلئے مضر نہیں اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مسواک کے مستحب اور مسنون ہونے پر اجماع ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

چوتھی بات: جمہور کے ہاں حکم تو بیان ہو گیا لیکن اب یہ سنن وضوء میں سے ہے یا سنن صلاۃ میں سے ہے یا سنن دین میں سے ہے۔ علامہ عینی نے تین قول لکھے ہیں ① سنن وضوء میں سے ہے ② سنن صلاۃ میں سے ہے ③ سنن دین میں سے ہے۔ یہ تیسرا قول امام صاحب کی طرف منسوب ہے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سنت ہونا یا مستحب ہونا نماز یا وضوء کے ساتھ خاص نہیں۔

پہلا قول کہ سنن وضوء میں سے یہ ابوحنیفہ اور مالک کا قول ہے۔ دوسرا قول کہ یہ سنن صلاۃ میں سے ہے یہ احمد اور شافعی کا قول ہے ان دونوں میں ثمرہ اختلاف اس وقت ظاہر ہوگا کہ جب کسی نے ظہر کی نماز کیلئے مسواک کے ساتھ وضوء کیا پھر ظہر پڑھی تو مسواک کی فضیلت بالاجماع ثابت ہو گئی یعنی حاصل ہو گئی۔ اب وضوء باقی رہا اس وضوء سے عصر کی نماز پڑھی تو ابوحنیفہ و مالک فرماتے ہیں کہ اس کو مسواک والی فضیلت حاصل ہو جائے گی کیونکہ یہ مسنون ہے وضوء کیلئے اور وضوء پرانا باقی تھا اس میں مسواک کی تھی شوافع اور حنابلہ کے ہاں مسواک کی فضیلت حاصل نہ ہوگی۔

مذکورہ اختلاف حدیث کے الفاظ کی بناء پر ہے جن احادیث میں ہے "لأمرتهم بالسواك عند كل صلاة ان الفاظ سے شوافع دلیل پکڑتے ہیں۔ جن روایات میں ہے جس طرح سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک میں الفاظ یہ ہیں "عند كل وضوء"، بعض میں ہے "مع كل وضوء" اور بعض میں ہے "عند كل طهور" احناف اور مالکیہ ان الفاظ سے استدلال کرتے ہیں۔ صحیح ابن حبان میں عائشہ کی روایت ہے "لولا أن أشق على امتى لأمرتهم بالسواك مع كل الوضوء عند كل صلاة" احناف ان روایت میں تاویل کرتے ہیں جن میں "عند كل صلاة" ہے کہ اس سے وضوء مراد ہے کہ عند وضوء کل صلاۃ جس طرح باقی روایت میں صراحت کے ساتھ ہے۔

معارف السنن میں ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں جو اختلاف ذکر کیا جاتا ہے یہ اس طرح ذکر کرنا صحیح نہیں ہے صحیح بات یہ ہے کہ سب کا اتفاق ہے کیونکہ وضوء کے وقت سب کے ہاں مستحب ہے نماز کے وقت بھی سب کے ہاں استحباب کے اقوال ہیں۔ فتح القدیر میں جہاں مستحبات وضوء کا ذکر ہے (۲۲/۱) اس میں مقدمہ غزنویہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ احناف کے ہاں پانچ جگہ پر مسواک مستحب ہے: ① عند اصفرار السن ② عند تغییر رائحۃ الفم ③ عند الاستیقاظ من النوم ④ عند الوضوء ⑤ عند القیام الی الصلوۃ۔ تو عند القیام الی الصلاۃ مسواک احناف کے ہاں مستحب ہے اگرچہ بعض فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے کیونکہ خون آنے کا خطرہ ہے اور یہ ناقض ہے۔ جن کے ہاں ناقض نہیں نجس ان کے ہاں بھی ہے۔ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن کے مسوڑھے مضبوط ہیں ان کیلئے مستحب ہے اور جن کے مضبوط نہیں ان کیلئے استحباب نہیں۔ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ استحباب ان کیلئے بھی ہوگا بایں طور کہ دانتوں پر لگائیں مسوڑھوں پر نہ لگائیں۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں بھی ہے کہ "يستحب عندنا عند الوضوء وعند الصلوٰة"

معارف السنن میں ہے کہ نووی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء کے وقت ہی مسواک کرے البتہ صرف اصطلاح کا فرق

ہے شوافع کے ہاں مسنون ہے احناف کے ہاں مستحب ہے۔

پانچویں بات: حدیث "لولا أن أشق علی أمتی لأمرتهم بالسواک عند کل صلوة" کے الفاظ کے تحت نووی نے لکھا ہے کہ انبیاء کیلئے بھی اجتہاد جائز ہے بعض کہتے ہیں کہ انبیاء کیلئے اجتہاد جائز نہیں کیونکہ اجتہاد وہ کرتا ہے جس کو قطعی حکم معلوم نہ ہو لیکن انبیاء پر تو وحی آتی ہے مگر صحیح تر قول یہ ہے کہ انبیاء کیلئے بھی اجتہاد جائز ہے مسائل غیر منصوصی میں۔ یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اجتہاد کیا کہ مشقت کا باعث ہوگا اس لئے امر وجوبی نہیں دیا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ امر وجوب کیلئے آتا ہے الا یہ کہ قرینہ صارفہ موجود ہو۔

چھٹی بات: زید بن خالد کی روایت میں ہے "لأخر صلاة العشاء الی ثلث اللیل" عشاء کی تاخیر احناف کے ہاں بھی مستحب ہے مگر ایک قول میں ثلث اللیل تک ہے دوسرے قول میں نصف اللیل تک ہے۔

باب ماجاء اذا استیقظ أحدکم من منامه فلایغمسن یده فی الاناء

اس باب میں ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی رات کو اٹھے تو اپنے ہاتھ برتن میں نہ ڈالے یہاں تک کہ اس پر دو یا تین دفعہ پانی نہ بہائے کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گذاری ہے۔

یہاں حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ نیند سے اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ کو دھوئے بغیر داخل نہ کرو۔

پہلی بات: حضور ﷺ نے ممانعت کی ہے کہ نیند سے اٹھنے کے بعد بغیر دھوئے برتن میں ہاتھ نہ ڈالے اب اس نہی کی حکمت کیا ہے؟ عام شارحین نے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ نہی کی علت یہ ہے کہ عرب کے لوگ عموماً استنجاء بالحجارۃ کرتے تھے اور عرب کا علاقہ بھی گرم تھا کپڑے بھی آج کل کی طرح نہ ہوتے تھے اکثر لنگوٹی باندھتے تھے اب جب کوئی سوجاتا تو پسینہ آتا جب پسینہ نجس مقام پر پہنچتا تو نجاست کے باقی آثار جسم پر پھیل جاتے اور کبھی سوتے ہوئے اس مقام پر ہاتھ لگتا تو ہاتھ ناپاک ہوجاتا اب برتن میں ہاتھ ڈالے گا اور برتن کا پانی قلیل ہوتا ہے اب جب نجس ہاتھ لگا تو قلیل پانی ناپاک ہوجائے گا لیکن یہ آدمی پاک سمجھ کر وضوء کرے گا پھر نماز پڑھے گا تو نہ وضوء ہوا اور نہ نماز ہوئی اس علت کی وجہ سے حکم دیا کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دھولیا جائے۔

دوسری بات: جمہور کے نزدیک یہی مذکورہ علت ہے لیکن ابن تیمیہ نے دوسری علت نقل کی ہے ابن قیم نے ابوداؤد کی شرح تہذیب السنن میں اپنے استاد سے نقل کیا ہے کہ جس طرح دوسری جگہ میں ہے کہ انسان کے ناک میں شیطان رات گذارتا ہے تو نبی ﷺ نے ناک خوب دھونے اور اچھے طریقے سے صاف کرنے کا حکم دیا۔ ابن تیمیہ نے یہاں بھی وہی علت بیان کی ہے کہ یہاں بھی شیطان انسان کے ہاتھ پر رات گزارتا ہے اس لئے یہاں بھی دھونے کا حکم دیا ابن قیم نے کہا ہے کہ یہ مصالح معتبرہ کے قبیل سے ہے۔

معارف السنن میں اس پر رد کیا گیا ہے کہ یہ علت بیان کرنا صحیح نہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ کسی مجتہد نے یہ علت ذکر نہیں ہے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ممانعت کی علت "فانه لایدری أین باتت یده" بیان کی ہے یہ نہیں فرمایا کہ "فاذا باتت یده"۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ سنن ابن ماجہ، سنن بیہقی میں الفاظ آتے ہیں کہ "أین باتت تطوف یده" یہ الفاظ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی علت کی تصحیح کرتے ہیں جبکہ ابن تیمیہ کی علت ان وجوہات کی بناء پر صحیح نہیں۔

تیسری بات: اگر کسی نے بغیر دھوئے برتن میں ہاتھ ڈال دیا تو پانی نجس ہوگا یا نہیں؟

❶ ابو حنیفہ مالک، شافعی، احمد کے نزدیک نجس نہ ہوگا کیونکہ قاعدہ ہے کہ "الیقین لا یزول بالشک" اب پانی کی طہارت یقینی طور پر ثابت ہے اور ہاتھ یقیناً ناپاک نہیں بلکہ ناپاکی کا احتمال ہے اس لئے طہارت جو کہ یقینی چیز ہے وہ احتمال نجاست سے ختم نہ ہوگا اس لئے وضوء کرسکتا ہے البتہ مکروہ ہے احناف نے لکھا ہے کہ اگر ہاتھ پر نجاست کا ہونا یقینی ہو پھر ہاتھ دھونا فرض ہوگا اس صورت میں اگر بغیر ہاتھ دھوئے پانی میں ڈال دیا تو پانی ناپاک ہو جائے گا لیکن اگر نجاست کا صرف احتمال ہو تو ہاتھ دھونا سنت مؤکدہ ہوگا اور اگر طہارت یقینی نہ ہو تو ہاتھ دھونا مستحب ہوگا۔

❷ اسحاق اور بعض اہل ظواہر کہتے ہیں کہ بغیر دھوئے ہاتھ ڈالا اگر چہ احتمال نجاست ہو مگر پانی ناپاک ہو جائے گا اس لئے اس سے وضو جائز نہ ہوگا۔

چوتھی بات: جمہور کے نزدیک باب کی حدیث کا جو حکم ہے۔ یہ رات اور دن دونوں کی نیند کیلئے ہے کیونکہ جمہور کے نزدیک جو علت ہے وہ رات اور دن دونوں میں موجود ہے مگر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرق کرتے ہیں فرماتے ہیں یہ حکم رات کی نیند کیلئے ہے دن کی نیند کیلئے نہیں کیونکہ ایک تو دن کو احتمال کم ہوتا ہے دوسرا من اللیل کی قید ہے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ یہ قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے کہ عام طور غفلت کا سونا رات کو ہوتا ہے اس لئے من اللیل کی قید ذکر کی ورنہ جو علت رات کو ہے وہ دن کو بھی ہوسکتی ہے اور "الحکم یدور مع العلۃ" باقی مذکورہ حکم نیند کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نہ سویا ہو مگر نجاست کا ہاتھ پر احتمال ہو تو اس کا حکم بھی یہی ہوگا کہ ہاتھ برتن میں ڈالنا درست نہیں ہوگا۔

الولید بن مسلم: یہ راوی مدلس تھا اوزاعی کا شاگرد ہے اس کا اگر کوئی شیخ ضعیف ہوتا تو ساقط کر دیتا اس کو تدلیس تسویہ کہتے ہیں۔

احسب: یہ لفظ متقدمین کے نزدیک فرض کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بعض جگہ فرض کیلئے استعمال کیا ہے۔

باب التسمیۃ عند الوضوء

اس باب میں مصنف نے روایت نقل کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے وضوء کے وقت اللہ کا نام نہیں لیا اس کا وضوء ہی نہیں ہوا۔ یہ روایت سعید بن زید رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔

پہلی بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ترجمۃ الباب سے کیا مقصد ہے فرماتے ہیں کہ وضوء کی ابتداء میں تسمیہ کا ثبوت مقصد ہے۔

دوسری بات: اس ثبوت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ علماء مدینہ میں سے کچھ کی رائے ہے کہ وضوء کی ابتداء میں آپ ﷺ سے بسم اللہ پڑھنا ثابت نہیں مالک کے استاد ربیعہ بن عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں تسمیہ عند الوضوء کا ذکر ہے اس سے نیت مراد ہے۔ اسی طرح مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا "اترید ان تذبح" کیا ذبح کرنا چاہتے ہو اس لئے بسم اللہ پڑھتے ہو۔ یہ قول ابن عربی نے ترمذی کی شرح میں نقل کیا ہے عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عمدۃ القاری میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا کہ تسمیہ عند الوضوء بدعت ہے اس لئے مصنف نے اس پر باب قائم کیا کہ حضور ﷺ سے بسم اللہ پڑھنا ثابت ہے۔

تیسری بات: تسمیہ عند الوضوء کا حکم کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے امام اعظم ابو حنیفہ امام شافعی اور ایک قول میں امام احمد کے ہاں تسمیہ عند الوضوء مسنون و مستحب ہے یہ قول جمہور فقہاء و محدثین کا بھی ہے۔ دوسرا قول فقہائے مدینہ امام مالک اور ربیعہ بن عبد الرحمن

کا ہے ان کے ہاں اس کا ثبوت ہی نہیں اس لئے مستحب نہیں بلکہ بدعت ہے۔ تیسرا قول حسن بصری داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ کا اور ایک روایت میں امام احمد کا قول ہے کہ تسمیہ عندالوضوء واجب ہے اصل اختلاف قول اول اور قول ثالث کا ہے وجوب کے قائلین باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ "لاوضوء لمن لم یذکر اسم اللّٰہ" لا کبھی نفی حقیقت کیلئے آتا ہے جیسے "لاصلاۃ لحائض الا بخمار" اور کبھی لانفی کمال کیلئے آتا ہے جیسے "لاصلوۃ لجار المسجد الافی المسجد" اب قول ثالث والے کہتے ہیں کہ لا یہاں نفی حقیقت کیلئے ہے کیونکہ یہ حقیقی معنی ہے نفی کمال تو مجازی معنی ہے اور حقیقت پر عمل کرنا بہتر ہے تو حدیث کا معنی ہوا کہ جس نے بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہ ہوا کیونکہ اس نے واجب کو چھوڑ دیا۔

قول اول والوں کی پہلی دلیل ابن عمر اور ابن مسعود کی روایت ہے "من توضأ وذکر اسم اللّٰہ علیہ کانت طھوراً لجمیع بدنہ ومن توضأ ولم یذکر اسم اللّٰہ علیہ کانت طھوراً لأعضاء وضوئہ" یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ پڑھے تو ثواب بڑھ جاتا ہے مگر بسم اللہ نہ پڑھے تو اعضاء کی طہارت تو ہو گئی مگر ثواب کامل نہ ملا۔

دوسری دلیل حضور ﷺ کی احادیث وضوء جن صحابہ سے منقول ہیں ان تمام میں صحابہ نے وضوء کی کیفیت نقل کی لیکن کسی نے تسمیہ فی الوضوء کا تذکرہ نہیں کیا اگر تسمیہ واجب ہوتا تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے کوئی تو نقل کرتا۔

تیسری دلیل امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تسمیہ فی الوضوء کے باب میں مہاجر بن قنفذ کی روایت نقل کی ہے جس سے عدم وجوب پر استدلال کیا ہے "مررت بالنبی ﷺ وھو یتوضأ فسلمت علیہ فلم یرد علی" پھر جب فارغ ہوئے تو فرمایا مجھے جواب دینے سے کسی اور چیز نے منع نہیں کیا لیکن میں بغیر وضوء کے تھا تو میں نے ناپسند کیا کہ میں اللہ کا نام بغیر وضوء کے لوں۔ اب حالت حدث میں اللہ کا نام لینا ناپسند کیا معلوم ہوا کہ بسم اللہ بھی نہ پڑھی ہوگی معلوم ہوا یہ واجب نہیں کیونکہ ایک دفعہ بھی نہ پڑھا ہو تو عدم وجوب کیلئے کافی ہے باقی لاوضوء لمن...... الخ میں لانفی کمال کیلئے ہے۔

اشکال: لا کے معنی حقیقی سے مجازی میں استعمال کرنے کیلئے قرینہ ضروری ہے وہ قرینہ یہاں پر کیا ہے؟

جواب ❶: اوپر والی تین احادیث بتاتی ہیں کہ لانفی کمال کیلئے ہیں تو قرینہ مذکورہ احادیث میں ہیں۔

جواب ❷: مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ لانفی حقیقت کیلئے ہے لیکن "تنزیل الناقص بمنزلۃ المعدوم" کے قبیل سے ہے کیونکہ اس سے وضوء کا ثواب کم تھا اس کو نہ ہونے کے برابر قرار دیا ورنہ فی نفسہ وجود ہے صرف ثواب کے اعتبار سے ناقص تھا۔

چوتھی بات: تسمیہ فی الوضوء کی احادیث ثابت ہیں یا نہیں؟ اس میں دو رائے ہیں:

❶ احمد بن حنبل اور بعض دوسرے محدثین کہتے ہیں کہ تسمیہ فی الوضوء کی کوئی حدیث بھی سنداً قوی نہیں صاحب ترغیب والترھیب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس باب کی ایسی کوئی حدیث نہیں جس کی سند میں مقال نہ ہو تو سب ضعیف ہیں مگر کثرت طرق کی وجہ سے نفس ثبوت ہو گیا۔

❷ ابن ابی شیبہ، ابن کثیر، ابن صلاح، ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ تسمیہ فی الوضوء کی احادیث ثابت ہیں کم از کم حسن درجے کی ہیں اور حسن کے درجے کی روایت سے استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے جمہور کا مذہب ثابت ہو گیا کہ وضوء میں تسمیہ مسنون اور مستحب مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ وضوء کی ابتداء میں پوری بسم اللہ منقول نہیں بلکہ صرف بسم اللہ و الحمد للہ کے الفاظ ہیں۔

ابی ثفال عن رباح بن عبد الرحمٰن: ابوزرعہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں مجہول ہیں۔ عن جدتہ یہ سعید بن عمرو (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کی بیٹی ہیں۔

ڈالا اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ بھی کیا جائے۔

۵ المضمضۃ والاستنشاق بثلاث اکف: تین چلو پانی لیکر منہ میں ڈالے اور تین چلو ناک میں ڈالے اس میں فصل کی صورت ہوتی ہے وصل کی صورت نہیں۔

ان پانچ صورتوں میں پہلی دو صورتیں ممکن ہیں مگر ان پر عمل مشکل ہے تیسری صورت بھی کسی مشہور امام کی پسندیدہ صورت نہیں اصل اختلاف تیسری اور چوتھی صورت میں ہے اور اختلاف اولی اور غیر اولی کا ہے ورنہ جو صورت اختیار کرلے تو سنت ادا ہو جائے گی۔ احناف کے ہاں آخری صورت بہتر ہے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بھی ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ نقل کیا ہے مگر ان کا قول قدیم ہے جدید قول میں وہ چوتھی نمبر کی صورت کو اختیار کرتے ہیں باب کی حدیث سے بظاہر ان کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

احناف کی دلیل سنن ابی داؤد میں سلمہ بن شقیق سے مروی ہے کہ میں عثمان وعلی کے پاس وضوء سیکھنے آیا تو انہوں نے مضمضہ اور استنشاق تین دفعہ کیا اور مضمضہ اور استنشاق کو الگ الگ کیا پھر فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح دیکھا اصل میں عثمان وعلی کے دور میں وضوء میں اختلاف ہوا تو ان دونوں نے اس کا اہتمام کیا اور عملاً سکھایا۔

باقی باب کی حدیث میں احناف تاویل کرتے ہیں ① کف واحد کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہاتھ استعمال نہیں کئے تھے جس طرح منہ دھونے میں کرتے ہیں تین تین دفعہ مضمضہ اور استنشاق کیا ایک ہاتھ سے ② شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کتاب والی صورت ہمارے نزدیک جائز ہے اس لئے ہمیں ان کے جواب کی ضرورت نہیں باقی پانچویں صورت کو افضل اس لئے کہتے ہیں کہ دو خلفاء نے اس کی تعلیم دی ہے۔

اشکال: اول باب کی حدیث میں صرف استنشاق کا ذکر ہے جبکہ ترجمۃ الباب میں مضمضہ اور استنشاق دونوں کا ذکر ہے لہٰذا مطابقت نہیں؟

جواب: مضمضہ اور استنشاق کے ثبوت کے حکم میں تامل بالفصل کوئی نہیں جن کے ہاں ثابت ہے تو دونوں ثابت ہیں اس لئے ایک کا ذکر دوسرے کے ذکر پر دال ہے یا حدیث میں استنشاق ثابت ہے لہٰذا مضمضہ کو اس پر قیاس کر کے ثابت کریں گے۔

باب فی تخلیل اللحیۃ

اس باب میں جو حدیث نقل کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ حسان بن بلال کہتے ہیں کہ میں نے عمار بن یاسر کو دیکھا کہ انہوں نے وضوء کیا اور ڈاڑھی کا خلال کیا میں نے ان سے پوچھا کیا آپ ڈاڑھی کا خلال کر رہے ہیں انہوں نے فرمایا کہ میرے لئے خلال کرنے سے کیا مانع ہے جبکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ انہوں نے ڈاڑھی کا خلال کیا۔ دوسری حدیث عثمان بن عفان کی نقل کی ہے مقصد یہ ہے کہ ڈاڑھی کا خلال کرنا حضور ﷺ سے ثابت ہے۔

پہلی بات: تخلیل لحیہ کے متعلق جو احادیث ہیں ان کی حیثیت کیا ہے کیا وہ سنداً ثابت ہیں یا نہیں؟ نصب الرایہ میں زیلعی نے چودہ صحابہ سے اس باب میں احادیث نقل کی ہیں اس کے بعد دو رائے ہیں:

① ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں لکھا ہے کہ ”لایثبت فی تخلیل اللحیۃ حدیث“ اسی طرح زیلعی نے جہاں چودہ احادیث نقل کی ہیں اس کے بعد فرمایا کہ یہ ساری احادیث ایسی ہیں جن میں ہر ایک پر کوئی نہ کوئی اعتراض ہے اس لئے ایک رائے یہ ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حدیث سنداً صحیح ثابت نہیں۔

باب ماجاء فی المضمضة و الاستنشاق

اس باب میں امام ترمذی نے سلمۃ بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب وضوء کروتو استنشاق کرواور جب استنجاء کروتو طاق عدد استعمال کرو۔

دوسرا باب "المضمضة و الاستنشاق من كف واحد" اس میں مصنف نے عبداللہ بن زید کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ مضمضہ اور استنشاق ایک کف سے کرر ہے تھے یہ عمل تین دفعہ کیا۔

پہلی بات: مضمضہ اور استنشاق کس کو کہتے ہیں؟ مضمضہ کہتے ہیں "ادخال الماء فی الفم ثم تحریکه ثم اخراجه" کہ منہ میں پانی ڈالے پھر منہ میں ہلائے پھر اس کو نکال دے یہ تین صفات مضمضہ کی ہیں استنشاق کی تعریف: یہ نشق سے ہے اور نشق کہتے ہیں ناک کے ذریعے کسی چیز کو کھینچ کر اوپر چڑھانا اور جس پانی کو کھینچ کر اوپر لے گئے اس کا نکالنا استنثار کہلاتا ہے۔

دوسری بات: ان دونوں کا حکم کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے ① یہ دونوں وضوء اور غسل دونوں میں واجب ہیں یہ قول ابن ابی لیلی عبداللہ بن مبارک احمد اور اسحاق کا ہے لیکن احمد کے قول میں معمولی فرق ہے کہ استنشاق کا وجوب مضمضہ سے زیادہ مؤکد ہے۔ ② مضمضہ اور استنشاق وضوء میں مسنون ہیں لیکن غسل میں واجب ہیں یہ قول سفیان ثوری اور احناف کے ائمہ ثلاثہ کا ہے ③ یہ دونوں غسل اور وضو دونوں میں سنت ہیں یہ شافعی اور مالک کا قول ہے۔

وضوء کے اندر ان کا مسنون ہونا جمہور (احناف، شوافع، مالکیہ) کا مذہب ہے باقی احناف غسل میں واجب کہتے ہیں اس کی وجہ قرآن کی آیت ہے ﴿وان كنتم جنباً فاطهروا﴾ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے تو زیادہ ہونی چاہئے زیادتی یا مرات میں ہوگی یا محل میں۔ مرات میں کسی کی نزدیک زیادہ لازم نہیں بلکہ ایک دفعہ پانی بہانا فرض ہے اس لئے محل کی زیادتی مراد ہوگی اور محل کی زیادتی کی اور کوئی صورت نہیں لیکن بعض اجزاء من وجہ ظاہر ہیں من وجہ داخل ہیں جیسے ناک اور منہ اب مبالغے کے صیغے پر عمل کرتے ہوئے ہم ناک اور منہ کو ظاہر پر محمول کریں گے غسل کے اندر اور وضوء کی آیت میں مبالغہ نہیں اس میں ان کا باطن ہونا شمار کریں گے اس لئے وضوء میں مستحب ومسنون ہوگا۔

باب المضمضة والاستنشاق من كف واحد

اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک کف سے مضمضہ اور استنشاق کیا علماء فرماتے ہیں کہ اس کی ممکنہ پانچ صورتیں ہیں:

❶ دونوں من کف واحد بالوصل کی صورت میں یعنی تھوڑا سا منہ میں ڈالا پھر دوسری دفعہ پھر تیسری دفعہ اسی طرح ایک چلو سے کرنا۔

❷ المضمضة والاستنشاق من کف واحد بالفصل: ایک چلو لیکر تین دفعہ منہ میں پھر اسی کو تین دفعہ ناک میں ڈالے۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ دونوں صورتیں ممکن تو ہیں مگر اس پر عمل نہیں ہوسکتا کیونکہ اتنا بڑا ہاتھ کس کا ہوگا؟ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے بھی معارف السنن میں یہ نقل کی گئی ہے۔

❸ المضمضة والاستنشاق بغرفتین: اس میں فقط فصل کی صورت ہے کہ ایک دفعہ پانی لیا اس کو تین دفعہ منہ میں ڈالا دوسرا غرفہ لیا اور تین دفعہ ناک میں پانی ڈالا۔

❹ المضمضة والاستنشاق بثلاث غرفات: اس میں وصل ممکن ہے فصل ممکن نہیں جیسے ایک دفعہ پانی لیا آدھا ناک میں اور آدھا منہ میں

❷ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس بارے میں جو احادیث منقول ہیں ان میں عثمان کی حدیث سنداً صحیح ہے اور ترمذی نے بھی حسن صحیح کہا ہے یہ حدیث سنن ابن ماجہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک میں حاکم نے بھی نقل کی ہے اور حاکم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، جمہور فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے دوسری رائے اختیار کی ہے۔

دوسری بات: عثمان کی حدیث جب سنداً صحیح ہے تو اس سے تخلیل لحیہ کا ثبوت ہوجاتا ہے لیکن اب اس کا شرعی حکم کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔

❶ طرفین کا قول یہ ہے جو صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے کہ تخلیل لحیہ من الآداب ہے یعنی مستحب ہے۔

❷ ابو یوسف کے نزدیک سنت ہے۔ شامی نے مبسوط کے حوالے سے نقل کیا کہ ابو یوسف کا قول راجح ہے اور یہ قول شافعی احمد جمہور فقہاء اور محدثین سے بھی منقول ہے۔

❸ مالک کا ایک قول تو سنت ہونے کا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ کثیف نہ ہو خفیف ہو تو مسنون نہیں اگر کثیف ہو تو پھر مسنون ہے۔

❹ اسحاق بن راہویہ کا قول ترمذی نے وجوب کا نقل کیا ہے بعض اہل ظواہر کا قول بھی یہی ہے دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے خلال کیا اور فرمایا کہ "ھکذا امرنی ربی" معلوم ہوا اللہ کا امر ہے اور امر وجوب کیلئے آتا ہے۔ جمہور جواب دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ سنداً ثابت نہیں یہ تفصیل وضوء میں تھی۔

تیسری بات: اس بات پر اتفاق ہے کہ غسل میں پوری ڈاڑھی دھونا اور چمڑے تک پانی پہنچانا فرض ہے کیونکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تحت کل شعرۃ جنابۃ"۔

چوتھی بات: تخلیل لحیہ کی کیفیت کیا ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ آدمی اس طرح کرے کہ ہاتھ تر کرے اور اسفل لحیہ سے انگلیاں ڈال دے اور اوپر سے نکال لے ہاتھ الٹا رکھے یا سیدھا رکھے۔

پانچویں بات: وضوء میں ڈاڑھی کا حکم کیا ہے؟ ہمارے فقہاء صاحب ہدایہ اور فتاوی تاتارخانیہ والے نے لکھا ہے کہ وجہ مواجہ سے ہے اب جب تک بال نہ آئے ہوں وجہ پر یعنی چمڑے پر وجہ کا اطلاق ہوگا لیکن جب بال آجائیں تو چھپے ہوئے حصے پر وجہ کا اطلاق نہ ہوگا بلکہ بالوں پر ہوگا۔ اب بال دو قسم کے ہیں ① لحیہ خفیفہ ہو کہ اس سے بدن نظر آئے، دوسری قسم کہ گھنی ہو اور اندر سے بدن کا حصہ نظر نہ آئے اب خفیفہ ہو تو چمڑے تک پانی پہنچانا ضروری ہے اگر گھنی ہو تو ڈاڑھی کا وہ حصہ جو حد الوجہ میں آتا ہو اس کو اوپر سے دھونا فرض ہے کیونکہ وہ وجہ میں شامل ہے باقی لحیہ مسترسل کا دھونا وضوء میں فرض نہیں غسل میں ایک قول واجب ہے ایک قول میں واجب نہیں لیکن وضوء میں صرف مستحب ہے۔

چھٹی بات: ڈاڑھی کے خلال کا وقت کیا ہے؟ ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کا وقت غسل وجہ کے ساتھ ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ پاؤں دھونے سے پہلے خلال کرے۔

باب ماجاء فی مسح الرأس أنه يبدأ بمقدم الرأس الى مؤخره

اس باب میں عبداللہ بن زید کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مسح کیا ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے کی طرف لے آئے اور پھر پچھلے حصے کی طرف لے گئے ابتداء کی اگلے حصے سے پھر ہاتھ گردن کی طرف لے گئے پھر آگے کی طرف لے آئے اس جگہ کی طرف جہاں سے شروع کی تھی پھر پاؤں کو دھویا۔

دوسرا باب قائم کیا ''باب ماجاء انہ یبدأ بمؤخر رأسہ'' کہ سر کے پچھلے حصے سے مسح کی ابتداء کی جائے اس میں ربیع بنت معوذ بن عفراء کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے دو دفعہ مسح کیا اس طرح کہ پچھلے حصہ سے شروع کیا پھر اگلے حصے کی طرف لے گئے پھر اندر سے دونوں کانوں کا مسح کیا۔

پہلی بات: سر کا مسح کرنا وضوء کے فرائض میں سے ہے وضوء کی آیت میں ہے ﴿وامسحوا بروؤسکم﴾ اس سے مسح الرأس بالاتفاق فرض ہے۔

دوسری بات: ائمہ اربعہ جمہور فقہاء ومحدثین تمام کا اجماع ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا مستحب وبہتر اور اولی ہے۔

تیسری بات: مسح رأس میں فرض کتنی مقدار ہے؟ اسمیں اختلاف ہے مالک فرماتے ہیں کہ کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے کیونکہ قرآن میں پورے سر کا ذکر ہے دوسرا نبی کریم ﷺ سے صفۃ وضوء میں عام طور پر پورے سر کا مسح کرنا منقول ہے جمہور (امام اعظم، شافعی، احمد) فرماتے ہیں کہ کل سر کا مسح کرنا فرض نہیں بعض راس کا فرض ہے اب وہ بعض حصہ کیا ہے؟ اس میں امام صاحب کے تین اقوال ہیں: ① ربع رأس کا مسح فرض ہے ② مقدار ناصیہ فرض ہے ③ تین انگلیوں کی مقدار فرض ہے ان اقوال میں اختلاف نہیں اصل میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے جس میں ہے کہ ''فمسح علی ناصیۃ'' اس سے مقدار ناصیہ مراد ہے اب اس مقدار ناصیہ کو کبھی ربع رأس اور کبھی تین انگلیوں سے تعبیر کیا۔

قول ❷: شافعی کے متعدد اقوال ہیں ① سر کے اکثر حصے پر مسح فرض ہے ② تین بالوں پر فرض باقی پر مستحب ہے۔ یہ مسح کے عمومی مسائل تھے باب کی حدیث کا اس مسئلے سے تعلق نہیں بلکہ باب کی حدیثوں کا تعلق کیفیت مسح سے ہے تو مذکورہ احادیث میں متضاد کیفیتیں منقول ہیں۔ معارف السنن میں ہے کہ نبی ﷺ سے کیفیت مسح میں جو احادیث منقول ہیں ان میں اختلاف ہے ① عبداللہ بن زید کی روایت میں ہے کہ سر کے اگلے حصے سے شروع کرتے تھے ② ربیع بنت معوذ کی روایت میں ہے کہ مسح کی ابتداء سر کے پچھلے حصے سے کی۔ باقی جمہور فقہاء نے پہلی کیفیت کو پسند کیا۔ احمد کا بھی یہی قول ہے ③ مسند احمد میں ربیع بنت معوذ سے منقول ہے کہ سوال ہوا کہ عورت مسح کیسے کرے تو آپ نے ہاتھ سر کے درمیان میں رکھا پھر پیچھے لے گئے پھر اٹھا کر درمیان میں رکھا اور آگے لائے۔

تو ان تین کیفیات میں بظاہر تضاد ہے ان کے متعلق عام محدثین کہتے ہیں کہ نبی سے مسح رأس کی کیفیت کے متعلق جو احادیث منقول ہیں ان میں اصح حدیث عبداللہ بن زید کی ہے اس لئے قوت سند کی بنیاد پر یہ حدیث راجح ہوگی۔ دوسری احادیث سنداً زیادہ قوی نہیں اس لئے مرجوح ہونگی۔ مبارک پوری نے اور معارف السنن میں دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ربیع بنت معوذ کی حدیث میں جو کیفیات ہیں یہ بیان جواز پر محمول ہیں ابن العربی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تیسری توجیہ کی ہے کہ مسند احمد کی روایت نساء کے ساتھ خاص ہے اور ربیع بنت معوذ کی حدیث جو ترمذی میں ہے اس میں راوی سے غلطی ہوئی ہے اصل تھا ''وأقبل بهما وأدبر'' اسکی تفسیر راوی نے الٹی کی اب اس کی صحیح تفسیر کیا ہے تو اس میں قاعدہ ہے کہ فعل کو مسمی بالابتداء کیا جاتا ہے یا بالانتہاء اس میں اختلاف ہے بعض کے ہاں تسمیۃ الفعل بالابتداء ہے بعض کے نزدیک تسمیۃ الفعل بالانتہاء ہے دوسرے قول کے مطابق اقبل بهما کا معنی ہوگا مسح کی انتہاء اگلی طرف ہوگی یہی صحیح مفہوم ہے پہلے والے قول کا یعنی اقبل بهما'' کا معنی کرتے ہیں کہ مسح کی ابتداء اگلی طرف سے ہوئی یہ قول صحیح نہیں صحیح عبداللہ بن زید کا قول ہے کیونکہ صحیح بخاری میں اس کی تصریح ہے کہ اگلی طرف سے شروع کیا گردن تک لے گئے اس لئے بہتر اور مستحب طریقہ وہ ہے جو آج کل لوگ کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صاحب منیہ نے لکھی ہے ابن ہمام نے اس کو غلط کہا ہے

کیونکہ احادیث میں یہ کیفیت منقول نہیں (یعنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے بچانا) فقہاء نے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تا کہ انگلی شہادت اور انگوٹھے کو کان کے مسح کیلئے بچالیا جائے اور اگر اس کو سر میں استعمال کریں گے تو اس پر لگا ہوا پانی مستعمل ہو جائے گا جبکہ یہ بنیادی غلطی ہے کیونکہ پانی مستعمل تب ہوگا جب عضو سے گر جائے جب تک گرے نہیں متصل بالعضو ہو وہ مستعمل نہیں ہوتا اس لئے یہ علت نکالنا غلط ہے اور یہ طریقہ بھی اسی وجہ سے صحیح نہیں اور نہ یہ حضور ﷺ سے منقول ہے۔

فأقبل بهما و أدبر: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء پیچھے سے کی؟

جواب ❶: واو احناف کے ہاں ترتیب کیلئے نہیں آتی۔

جواب ❷: عرب جب دو متضاد چیزوں کو ذکر کریں تو اشرف کو مقدم کرتے ہیں اگرچہ حقیقت میں ہو مؤخر ہو جیسے یمین اور شمال میں یمین کو مقدم کرتے ہیں اس لئے یہاں بھی اقبال ادبار کی نسبت سے اشرف تھا اس لئے مقدم کیا۔

باب ماجاء أن مسح الرأس مرة

اس باب میں ربیع بنت معوذ بن عفراء کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو وضوء کرتے ہوئے دیکھا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے سر کا مسح کیا آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے کی طرف صدغین اور کانوں کا مسح کیا۔

صدغین کہتے ہیں ڈاڑھی اور کان کے درمیان خالی جگہ کو۔

پہلی بات: مسح رأس میں تثلیث ہے یا نہیں مصنف اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں اختلاف ہے عطاء بن ابی رباح، شوکانی نے اہل بیت کا مسلک نقل کیا ہے اور شافعی کا مشہور قول یہ ہے کہ مسح رأس میں تثلیث مسنون ہے شافعی کے نزدیک اس قول کے مطابق ہر دفعہ نیا پانی لیکر مسح کریگا۔

حسن بن زیاد نے امام صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے کہ تثلیث مستحب ہے لیکن ایک پانی سے ہوگا جدید پانی نہیں لے گا جمہور فقہاء امام اعظم، مالک اور احمد اور ایک قول کے مطابق امام شافعی، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک ان کے نزدیک ایک دفعہ مسح ہوگا تثلیث مسنون نہیں اگر کسی نے تثلیث کی تو کیا حکم ہے؟

بعض نے کہا کہ امام صاحب کے ہاں مکروہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بدعت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ لاباس بہ۔ چوتھا قول قاضی خان نے نقل کیا ہے کہ مسنون تو نہیں مگر تثلیث کو ناجائز بھی نہیں کہتے دارقطنی نے امام صاحب کی سند سے حدیث نقل کی ہے کہ جس میں تثلیث کا ذکر ہے اس کے بعد دارقطنی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کا مذہب اس کے خلاف ہے اس لئے اس روایت کا اعتبار نہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی روایت شوافع کے موافق تھی ان کو قبول کرنا تھا لیکن تعصب نے قبول نہیں کرنے دیا اور اس کو اس نے رد کر دیا۔

دوسری بات: صفۃ وضوء النبی کی جو احادیث ہیں تو عام میں مسح مرۃ کا ذکر ہے بعض میں تثلیث کا ذکر ہے ابوداؤد نے کثرت کے ساتھ وضوء کی کیفیت کے بارے میں روایات نقل کی ہیں ان میں جہاں عثمان بن عفان کی حدیث نقل کی ہے وہاں لکھا ہے "**واحاديث عثمان الصحاح كلها تدل على أن مسح الرأس مرة**" فرماتے ہیں کہ جہاں انہوں نے اعضاء وضوء کا ذکر کیا تو ثلاثا کی تصریح کی ہے لیکن جہاں مسح کا ذکر کیا وہاں عدد کا ذکر نہیں کیا اب اگر تثلیث مسنون ہوتی تو صحابہ عدد کو ذکر کرتے

قیاس بھی جمہور کی تائید کرتا ہے کہ تیمّم کے اندر مسح ہوتا ہے وہاں بھی ایک دفعہ کیا جاتا ہے پٹی پر مسح کرو تو ایک دفعہ کیا جاتا ہے تو ہر جگہ مسح میں تثلیث نہیں تو یہاں بھی مسح راس میں تثلیث نہ ہوگی۔

باب ماجاء انه یأخذ لرأسه ماء جدیدًا

اس باب میں عبداللہ بن زید کی روایت نقل کی ہے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ انہوں نے وضوء کیا اور مسح کیا ہاتھوں کے بچے ہوئے پانی کے علاوہ سے یعنی نیا پانی لے کر مسح کیا۔

مسئلہ: یہ ہے کہ مسح رأس کے لئے ماء جدید شرط ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسح رأس کے لئے ماء جدید شرط ہے باقی ماندہ ہاتھ کی تری سے مسح جائز نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کہتے ہیں کہ ہاتھ پر تری باقی ہو اور اس سے مسح کیا تو مسح ہو جائے گا۔ لیکن ماء جدید مسنون ہے احناف کہتے ہیں کہ وہ احادیث بھی ہیں جن میں باقی ماندہ پانی کا ذکر ہے۔ کہ اس سے مسح کیا، اور وہ احادیث بھی ہیں جن میں ماء جدید کا ذکر ہے۔ عبداللہ بن زید بن عبدربہ کی روایت کے دو قسم کے الفاظ ہیں۔ ایک کتاب والے الفاظ ''بماء غیر فضل یدیه'' اس سے جدید پانی سمجھ میں آتا ہے۔ عبداللہ بن لہیعہ اس روایت کو ''بماء فضل یدیہ'' کے الفاظ سے نقل کرتے ہیں کہ مابقیہ پانی سے مسح کیا نیا پانی نہیں لیا۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زید کی روایت دونوں طریقوں سے مروی ہے لیکن صحیح تر کتاب والی ہے۔ ''غیر والی روایت میں غلطی ہے کیونکہ عبداللہ بن لہیعہ ضعیف ہے مسئلہ پھر بھی صحیح ہے۔ ابوداؤد میں ربیع بنت معوذ کی روایت ہے ''مسح رأسه بماء کان فی یدیه'' یہ روایت سنداً صحیح ہے اس لئے یہ مسئلہ کہ یہ دونوں چیزیں منقول ہیں یہ ثابت ہوگیا۔ اب جن میں سابقہ پانی کا ذکر ہے اس پر احناف کا عمل ہے اگر سابقہ تری ہو۔ اگر سابقہ تری نہ ہو تو جدید پانی لے، احناف اس پر بھی عمل کرتے ہیں تو دونوں قسم کی روایات صحیح ہیں صرف محل وقوع الگ ہے۔ ایک کا محل تری ہونا ہے دوسرے کا محل جب تری نہ ہو۔ جو لوگ ماء جدید کو شرط قرار دیتے ہیں ان کے ذمے ہے کہ ان روایات کی تاویل کریں جن میں سابقہ تری سے مسح کا ذکر ہے۔

باب مسح الاذنین ظاهر هما وبا طنهما

اس باب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے سر کا مسح کیا اور کانوں کا مسح کیا اندر اور باہر دونوں طرف سے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ کانوں کے مسح میں اختلاف تھا۔ بعض کے نزدیک یہ اعضاء مغسولہ میں سے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ کانوں کا حصہ جو چہرے کی طرف ہے وہ مغسول ہوگا۔ اور سر کی طرف والا حصہ اس کا سر کے ساتھ مسح کیا جائے گا۔ تو اس اختلاف کی وجہ سے امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لئے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ پورا کان اعضاء مغسولہ میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح نہ آدھا مغسول ہے بلکہ کان اعضاء ممسوحہ کے قبیل سے ہے یہی جمہور کا مسلک ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء ومحدثین سب کے ہاں کان اعضائے ممسوحہ میں سے ہے۔

دوسری بات: مسح اذنین کی کیفیت کیا ہے؟ تو احناف کہتے ہیں کہ شہادت کی انگلی کان کے سوراخ میں ڈالی جائے گی اور انگوٹھے کان کی پشت پر رکھے جائیں گے، شہادت کی انگلی کان کے سلوٹوں میں پھیری جائے گی۔

ظاهرهما وباطنهما: اس میں دو قول ہیں ① ظاہر سے کان کا اندرونی حصہ اور باطن سے سر کی طرف والا حصہ مراد ہے دوسرا قول اس کا الٹ ہے۔

باب ماجاء ان الاذنين من الرأس

اس باب میں ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کیا۔ چہرہ اور ہاتھ تین دفعہ دھوئے، سر کا مسح کیا اور فرمایا "الاذنان من الرأس"۔

پہلی بات: "الاذنان من الرأس" کہ کان سر میں سے ہیں اس میں تین قول ہیں:

① کان بھی سر کی طرح اعضائے ممسوحہ میں سے ہے۔ ② کان کا اگلا حصہ چہرے کے ساتھ دھویا جائے گا پچھلا حصہ سر کے ساتھ مسح کیا جائے گا۔ ③ اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں کہ کان کا مسح ہوگا لیکن وقت الگ ہے۔ چہرہ دھوتے وقت اگلے حصے کا مسح کیا جائے گا۔ اور سر کا مسح کرتے وقت کان کے پچھلے حصہ کا مسح کیا جائے گا۔

یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کان کے مسح کے لئے ماء جدید ضروری ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے، شافعی اور دوسرے بعض کے ہاں کان کا مسح کرتے وقت نیا پانی لیا جائے گا۔ احناف، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کان پر مسح کے لئے ماء جدید شرط نہیں اگر پہلے سے تری نہ ہو پھر نیا پانی لینا ضروری ہے۔ مگر تری موجود ہو تو وہی کافی ہے۔

"الاذنان من الرأس" دوسرے قول والوں کی دلیل ہے کہ کانوں کا مسح سر کے پانی سے کیا جائے گا، شوافع اس میں مندرجہ ذیل تاویل کرتے ہیں۔

❶ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کانوں کا مسح سر کے مسح کے تابع ہے باقی نیا پانی لیا جائے گا، یا نہیں۔ اس سے حدیث کا تعلق نہیں۔

❷ اس کا مطلب یہ ہے کہ کان بھی سر کی طرح اعضائے ممسوحہ میں سے ہے۔

❸ یہ جملہ مرفوعاً ثابت نہیں، احناف کہتے ہیں کہ ثابت نہ بھی ہو پھر بھی مرفوع کے حکم میں تو ہے۔ کیونکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا خلاف القیاس مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔

دوسری بات: باب کی حدیث سنداً ضعیف ہے شہر بن حوشب سند میں واقع ہے۔ مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں لکھا ہے "ان شهرا تركوه او ان شهرا نزكوه" احناف کہتے ہیں حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ سابقہ تری سے کان کا مسح کیا اور یہ بھی ثابت ہے کہ جدید پانی لیا، احناف کہتے ہیں کہ ہمارا ان دونوں پر عمل ہے اگر پہلے تری ہو تو اسی سے مسح کیا جائے گا اور اگر پہلے والی تری نہ ہو تو ماء جدید لیا جائے گا۔

باب في تخليل الأصابع

پہلی بات: اس باب میں تخلیل اصابع کا ذکر ہے۔ احناف اور جمہور کے ہاں خلال عام حالات میں مستحب ہے، اگر کسی کے ہاتھ یا پاؤں کی انگلیاں جڑی ہوئی ہوں کہ خلاء نہ ہو اور خلال کے بغیر پانی اندر نہ جا سکے اس صورت میں خلال واجب ہوگا۔

دوسری بات: تخلیل اصابع کی کیفیت کیا ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ ہاتھ کے تخلیل کی کیفیت تشبیک ہے اور پاؤں کے تخلیل کا طریقہ یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کرے۔ بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے ختم کرے۔

باب ماجاء ويل للأعقاب من النار

اس باب میں مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہلاکت ہو خشک ایڑیوں کے لئے آگ ہے۔

پہلی بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سنن میں یہ حدیث مختصر نقل کی ہے۔ صحاح کی باقی کتب میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تفصیل سے مذکور ہے۔ مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ ہم سفر سے حضور ﷺ کے ساتھ واپس آرہے تھے راستے میں عصر کی نماز کے لئے وقت کم رہ گیا کچھ ساتھی جلدی جلدی چلے پانی کے پاس اور جلدی وضوء کیا۔ نبی اکرم ﷺ اور ہم جب پہنچے تو "اعقابھم تلوح ولم یمسھم الماء" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "ويل للاعقاب من النار" پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "اسبغوا الوضوء"۔

دوسری بات: نبی اکرم ﷺ نے جو الفاظ فرمائے "ويل للاعقاب من النار" یہ عام طور پر زجر اور بددعاء کے لئے آتے ہیں۔ احادیث میں دو قسم کے الفاظ ملتے ہیں: ① ویل ② ویحک۔ یہاں پر اہل لغت کے لئے ان دونوں میں فرق ہے "ویلک" اس آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ہلاکت کا مستحق ہو اور جو ہلاکت کا مستحق نہ ہو صرف زجر مقصود ہو تو وہاں "ویحک" کہتے ہیں۔

دوسرا فرق سیبویہ نے لکھا ہے کہ ویل کا لفظ اس کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ہلاکت میں واقع ہو چکا ہو مگر جو ہلاکت میں واقع نہ ہوا ہو بلکہ ہلاکت کے قریب ہو اس کو ویحک سے خطاب کرتے ہیں۔

تیسری بات: "الاعقاب" عقب کی جمع ہے، پیر کے پچھلے حصے کو کہا جاتا ہے جس کو اردو میں ایڑھی کہتے ہیں۔

چوتھی بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کسی آدمی نے موزہ یا جراب نہ پہنے ہوں تو اس کے لئے وضوء کرتے وقت مسح جائز نہ ہوگا بلکہ دھونا لازم ہوگا۔

پاؤں کا وظیفہ کیا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت وضوء میں اعضاء وضوء کا ذکر کیا ہے ﴿يا ايها الذين آمنوا اذا قمتم الى الصلاة فاغسلوا وجوهكم﴾ اب پاؤں اعضائے مغسولہ میں سے ہے یا ممسوحہ میں سے تو اہل سنت کے نزدیک پاؤں کی دو حالتیں ہیں۔

1. موزے یا جراب پہنے ہوئے ہوں پھر مقیم ایک دن ایک رات مسح کر سکتا ہے اور مسافر کے لئے تین دن تین راتیں مسح جائز ہوگا۔
2. پاؤں پر خفین یا جوربین نہ پہنے ہوئے ہوں پھر اس کا دھونا لازم ہے یہ اعضائے مغسولہ کے قبیل سے ہے۔

اہل سنت میں سے محمد بن جریر طبری اور داؤد ظاہری اور معتزلہ میں سے جبائی یہ تینوں کہتے ہیں کہ غسل بھی جائز ہے اور مسح بھی جائز ہے۔ تو وضوء والے کو اختیار ہے جس کو پسند کرے۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ ابن جریر طبری کی طرف یہ نسبت کرنا غلط ہے کیونکہ وہ غسل کے قائل ہیں۔ تخییر مسح کے قائل نہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ابن قیم کی یہ بات غلط ہے، کیونکہ ابن جریر طبری نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے مسح علی الرجلین کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ تعالیٰ مجتہد تھے۔ ان کے ہاں غسل کے ساتھ دلک بھی واجب ہے۔ اس دلک کی تعبیر لفظ مسح سے کی ہے، تو ان کا مقصد ہے کہ وضوء میں پاؤں کو دھوئے بھی اور ملے بھی۔ اب اس دلک کی تعبیر مسح سے کی جس وجہ سے شبہ پڑا۔ داؤد ظاہری کی طرف بھی نسبت صحیح نہیں البتہ جبائی قائل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ابن جریر طبری نام کے دو آدمی ہیں ایک ہے محمد بن جریر بن یزید الطبری یہ اہل سنت کے آدمی ہیں، دوسرا ہے محمد بن جریر بن رستم الطبری یہ بھی صاحب تفسیر ہے مگر یہ شیعہ ہے تو مسح کے قائل جو طبری ہے وہ یہی شیعہ ہے دوسرا مسح کا قائل نہیں۔

روافض کہتے ہیں اگر موزے پہنے ہوں تو مسح جائز نہیں اور اگر ننگے پاؤں ہو تو پھر مسح کرنا واجب ہوگا۔ ان کی دلیل اس آیت

میں جروالی قرأت ہے "وارجلکم الی الکعبین" اس کا عطف برؤسکم پر ہے تو رأس کی طرح رجل کا بھی مسح ہوگا۔اہلسنت کے ہاں موزے کے بغیر مسح جائز نہیں بلکہ غسل واجب ہے۔دلیل قرأت نصب ہے "ارجلکم" کا عطف وجوہکم پر ہے۔دوسری دلیل وہ متواتر احادیث ہیں جو آپ ﷺ سے وضوء کی کیفیت کے بارے میں مذکور ہیں۔سب میں "فغسل رجلیه" مذکور ہے اور ایک دفعہ بھی خالی پاؤں پر مسح آپ ﷺ سے ثابت نہیں۔اگر جائز ہوتو یہاں جواز کے لئے ایک مرتبہ عمل کرتے۔

روافض کی قرأت کا اہل سنت جواب دیتے ہیں کہ ① شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابواب التفسیر میں سورت روم میں حدیث نقل کی ہے۔﴿الم غلبت الروم﴾ میں دو قرأت ہے۔ایک غُلبت الروم دوسری غَلَبَتِ الروم. تو دو قرأتوں میں مختلف احوال کی طرف اشارہ ہے۔حضور ﷺ کی بعثت کی ابتداء میں دو سپر پاور، روم اور فارس تھے فارس لڑائی میں غالب آگئے تو مشرکین خوش ہوئے کہ ہم بھی غالب آئیں گے۔ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ سے تذکرہ کیا تو یہ آیتیں اتریں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شرط لگائی۔دوسری دفعہ روم والے غالب آگئے، اب غَلبت الروم بعد والے حالت کی طرف اشارہ ہے۔اور غُلبت الروم میں اول لڑائی کی حالت کی طرف اشارہ ہے اسی طرح آیت وضوء میں دو قرأت سے اشارہ ہے موزے پہنے ہوئے حالت کی طرف یہ جواب ابن العربی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی دیا ہے۔

② دوسری تأویل یہ ہے کہ عبارت "علفتها تبناً وماء بارداً" کے قبیل سے ہے۔قاعدہ ہے کہ دو عامل ہوں ان کے الگ الگ متعلقات ہوں اور دونوں عامل جب قریب المعنی ہو تو عرب ان کے عامل کو حذف کر دیتے ہیں۔اور محذوف عامل کے معمول کو مذکور عامل کے معمول پر عطف کر دیتے ہیں۔جس طرح یہاں اصل میں تھا "علفتها تبناً واستقیتها ماء بارداً" ماء بارداً کے عامل کو حذف کر کے عامل مذکور کے معمول "تبناً" پر عطف کر دیا۔اسی طرح شعر ہے۔

یالیت بعلک قد غدا متقلداً سیفاً ورمحاً

اصل میں تھا۔وحاملاً رمحا ترجمہ کرتے وقت عامل کو نکال کر ترجمہ کرتے ہیں اسی طرح وزججنا الحواجب والعیون اصل میں تھا واکحلنا العیون.

یہاں آیت میں بھی یہی قاعدہ ہے اصل میں تھا "وامسحوا برؤسکم واغسلوا ارجلکم الی الکعبین" اللہ تبارک وتعالیٰ نے ترتیب کے ساتھ اعضاء ذکر کئے اس لئے پاؤں کو اعضائے مغسولہ کے متصل ذکر نہیں کیا۔اب اس کا مسح بمعنی غسل خفیف بھی آتا ہے، تو مسح اور غسل قریب المعنی تھے تو دوسرے معمول کے عامل کو حذف کر کے اس کا عطف عامل اول کے معمول پر کیا۔

③ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسح علی الرجلین کا حکم پہلے تھا، اب منسوخ ہے تو قرأت جر کا حکم منسوخ ہے۔اور قرأت نصب اور احادیث ناسخ ہیں۔④ جر جوار کی وجہ سے ہے ورنہ منصوب تھا۔مگر مولانا انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جر جوار میں اختلاف ہے صیری اور ابن جنی مطلقاً انکار کرتے ہیں۔بعض قائل ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ ضرورت شعری کی وجہ سے آتا ہے۔فصیح کلام میں نہیں آتا اگر آئے بھی تو صفت کی صورت میں آتا ہے عطف کی صورت میں نہیں آتا۔اس لئے یہ توجیہ مناسب نہیں۔

⑤ پانچویں توجیہ: مولانا انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مائدہ کی آیت وضوء مدنی ہے اس سے پہلے بارہ سال تک مسلمان وضوء کرتے رہے اور وضوء میں پاؤں دھوتے تھے، بارہ سال کے بعد یہ آیت اتری اس کے بعد بھی آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل غسل رجلین کا رہا۔بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو آیت مائدہ کے نزول کے بعد مسح علی الخفین میں بھی شک پڑ گیا تھا، کہ اس کا جواز باقی رہا ہے یا نہیں۔

ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ صحابہ کا اجماع ہے کہ رجلین کا غسل ضروری ہے۔اور امت کے اندر غسل رجلین کا عمل متواتر منقول ہے، ان وجوہ کے بعد قرأت نصب کی ہو یا جر کی غسل ہی ہوگا۔قرآن نے فہم مخاطب کو دیکھ کر اجمالاً ذکر کیا کیونکہ وہ پہلے سے دھوتے تھے۔

⑥ متعلقات کے بدل جانے سے معنی بدل جاتے ہیں۔اس قاعدے کے مطابق "امسحوا" کا متعلق جب "بروسکم" ہے تو اس کا معنی امرار الید المبتلة اور جب اس کا متعلق ارجلکم ہو تو اس کا معنی غسل خفیف ہوگا۔جیسے ضربت زیداً میں ضرب کا معنی مارنا ہے جب فرمایا "اذا ضربتم فی الارض" یہاں متعلق بدلا تو معنی ہوا چلنا۔جب کہا "ضرب اللّٰہ مثلاً" یہاں اس کا متعلق بدلا تو معنے ہوا بیان کرنا۔

باب ماجاء فی الوضوء مرة مرة، باب ماجافی الوضوء مرتین مرتین باب ماجاء فی الوضوء ثلاثًا ثلاثًا، باب ماجاء فی الوضوء مرة ومرتین و ثلاثًا باب فیمن توضاء بعض وضوئه مرتین وبعضه ثلاثًا

پہلے باب میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وضوء فرمایا اور اعضاء کو ایک ایک دفعہ دھویا۔

دوسرے باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے وضوء کیا مرتین مرتین یعنی اعضاء کو دو دفعہ دھویا۔

تیسرے باب میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت لائی ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے وضوء کیا اور تین تین دفعہ اعضاء دھوئے۔

چوتھے باب میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے بعض دفعہ اعضاء ایک دفعہ دھوئے بعض دفعہ دو بار اور بعض دفعہ تین بار دھوئے۔

پانچویں باب میں عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے چہرہ تین دفعہ دھویا، بازوؤں کو دو دو دفعہ دھویا پھر مسح کیا اور پاؤں دھوئے۔

پہلی بات: تین دفعہ اعضاء وضوء کو دھونا کامل وضوء ہے اس سے زیادتی جائز نہیں، حدیث میں ہے "فمن زاد علیٰ هذا او نقص فقدا ساء وظلم" تو تین دفعہ سے زیادہ دھونا شرعاً جائز نہیں، اور تین سے کم درجہ یہ ہے کہ جن اعضاء میں تثلیث مسنون ہے، ان کو دو دو دفعہ دھوئے، تیسری صورت یہ ہے کہ اعضاء کو ایک دفعہ دھوئے، چوتھی صورت یہ ہے کہ بعض اعضاء کو تین مرتبہ دھوئے اور بعض کو دو مرتبہ دھوئے یہ بھی جائز ہے۔احادیث میں آپ ﷺ سے چار صورتیں منقول ہیں اور جمہور فقہاء محدثین کے ہاں چاروں صورتیں جائز ہیں۔

دوسری بات: اس پر اتفاق ہے کہ افضل تین دفعہ دھونا ہے پھر کم درجہ دو دفعہ کا ہے اور اس سے کم درجہ ایک دفعہ کا ہے۔تین صورتیں اس کی اور بھی ہیں ① بعض اعضاء کو تین دفعہ دھوئے اور بعض کو ایک دفعہ یہ بھی جائز ہے مگر حدیث میں صراحۃً منقول نہیں۔ ② بعض کو دو مرتبہ اور بعض کو ایک مرتبہ دھوئے یہ بھی جائز ہے لیکن احادیث میں منقول نہیں ③ ایک وضوء میں بعض اعضاء کو ایک دفعہ بعض کو دو دفعہ بعض کو تین دفعہ دھوئے یہ بھی جائز ہے مگر صراحۃً احادیث میں صرف پہلی چار صورتیں منقول ہیں۔آخری تین جائز تو ہیں، مگر احادیث میں صراحتاً موجود نہیں۔

باب فی وضوء النبی ﷺ کیف کان

ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا انہوں نے وضوء کیا۔اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو دھویا، یہاں تک کہ خوب صاف ہوگئے، پھر تین دفعہ مضمضہ کیا اور تین دفعہ ناک میں پانی ڈالا، تین مرتبہ چہرہ دھویا، تین مرتبہ دونوں بازو دھوئے، پھر ایک دفعہ سر کا مسح کیا، پھر پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھویا، پھر کھڑے ہوئے، اور بچے ہوئے پانی کو پیا اور پھر فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بتلا دوں کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح وضوء کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی وضوء کی کیفیت کو ذکر کیا، باقی وضوء کے اختلافی مسائل گزر چکے ہیں۔

پہلی بات: سنن ابو داؤد میں عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وضوء کا ذکر ہے وہ وضوء کرتے پھر کہتے یہ نبی ﷺ کا طریقہ ہے۔اور یہاں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضوء کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح وضوء کرتے تھے اب اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔تو تحفۃ الاحوذی میں ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں رسول اللہ ﷺ کے وضوء کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہوا تھا۔اس لئے ان حضرات نے ضرورت محسوس کی کہ حضور ﷺ کے وضوء کی کیفیت کو عملاً سکھلا دیں۔

دوسری بات: علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے اور وضوء کا باقی ماندہ پیا، اب حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر پینے سے منع کیا ہے یہاں انہوں نے کیسے کھڑے ہوکر پیا۔دوسرا یہ کہ وضوء کے بچے ہوئے پانی کے پینے میں حکمت کیا ہے؟

پہلے جز کا جواب یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ "نهی عن الشرب قائماً" کی روایات مقدم تھیں۔علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بعد کی ہے تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ممانعت والی احادیث کے لئے ناسخ ہے۔دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض نے کہا کہ جواز اور ممانعت والی روایات میں تطبیق یہ ہے کہ نہی خلاف اولیٰ پر محمول ہے۔اور کھڑے ہوکر پینا یہ جواز پر محمول ہے اور خلاف اولیٰ اور جواز جمع ہوسکتے ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ نہی والی روایات عام تھیں ابتداء علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ان کے لئے مخصص ہے تو نہیں والی روایات عام مخصوص منہ البعض ہیں۔یعنی نہی باقی ہے لیکن وضوء کا باقی ماندہ پانی، زمزم کا پانی یہ اس ممانعت سے خاص ہے۔ممانعت میں داخل نہیں یہ قول صحیح ہے۔

دوسرے جزء کا جواب یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کھڑے ہوکر پانی پینے کی حکمت لکھی ہے کہ ایک تو اس میں اشارہ ہے طہارت باطنی کی طرف کہ جس طرح تو نے اعضاء وضو کو دھو کر ظاہری پاکی حاصل کی، تو اسی طرح اللہ سے استدعا ہے کہ جس طرح ظاہری پاکی ہوگئی اے اللہ ہمارے باطن کو بھی پاک کردے۔اس حکمت کے لئے وضوء کا باقی ماندہ پانی کھڑے ہوکر پیا جاتا ہے دوسرا اس میں اشارہ ہے کہ باقی ماندہ وضوء کا پانی مستعمل نہیں ہوا لہٰذا پینا جائز ہے۔

تیسری بات: کھڑے ہوکر وضوء کا پانی پینا اس کا حکم کیا ہے؟ تو علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم استحبابی ہے پینے کی کیفیت یہ ہے کہ لوٹا ہو تو اٹھا کر پی لے اور اگر بڑا برتن ہو تو چلو سے لے کر پی لے۔

باب فی النضح بعد الوضوء

اس میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام آئے اور کہا کہ اے محمد (ﷺ) جب وضوء کرو تو نضح کا عمل کریں۔اب نضح کے حکم کا مفہوم کیا ہے اس کے متعلق شارحین نے خصوصاً ابن العربی کے حوالے

سے لکھا ہے کہ انہوں نے چار معانی ذکر کئے ہیں۔

❶ استنجا کریں تو خوب پانی ڈال دیں صرف پانی کا بہانا کافی نہیں۔

❷ یہ استبراء کے معنے میں ہے کہ جب استنجاء کریں تو خوب استبراء کریں اور بیٹھ جائیں اور یقین ہو جائے کہ اب قطرہ نہیں آئے گا۔

❸ نضح سے استنجاء بالماء مراد ہے کیونکہ عرب استنجاء بالاحجار کرتے تھے جس سے قطرے نہیں رکتے تھے۔

❹ نووی نے اس معنی کو لیا ہے اور کہا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہی معنی ہے وہ یہ کہ استنجاء یا وضوء سے فراغت کے بعد شرمگاہ والے کپڑے پر چھینٹے مارے تاکہ وسواس ختم ہو جائیں۔ کیونکہ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ وہ قطرہ نکل گیا اس نضح کا حکم استحباب کا ہے باقی اگر کسی کو وسوسہ محسوس ہو کہ شاید قطرہ نکل آیا تو اس سے وضوء نہ ٹوٹے گا بلکہ باقی رہے گا یہ شیطان کا حملہ ہوتا ہے وسوسہ ڈالنے کے لئے ہاں اگر یقینی طور پر قطرہ کا نکلنا محسوس ہو تو پھر وضوء دوبارہ کرے گا، مگر محض وساوس کی وجہ سے وضوء شرعاً باقی رہے گا۔

منکر الحدیث: اس کو کہتے ہیں کہ جس کی حدیث پر نکارت غالب ہو، نکارت کہتے ہیں کہ ضعیف ثقہ کی مخالفت کرے تو ضعیف کی روایت منکر ہوگی، اور ایسا آدمی منکر الحدیث ہوگا۔ تو حسن بن علی الہاشمی بھی منکر الحدیث ہے۔

باب في اسباغ الوضوء

اس باب میں بھی ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں آپ کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس کے دو فائدے ہوں۔ ایک یہ کہ اللہ گناہ معاف کر دے اور دوسرا اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ درجات بلند کرے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا بتائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین خصلتیں بتائیں ① اسباغ الوضوء علی المکارہ ② کثرۃ الخطی الی المساجد ③ انتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ

اسباغ بمعنی اتمام کے ہے اب اس کا کیا معنی ہے تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ اعضاء جن میں تثلیث مسنون ہے ان میں تثلیث کرنا اسباغ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وضوء کے فرائض سنن، مستحبات کی رعایت کرنا اسباغ ہے۔ تیسرا معنی جو کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں مذکور ہے کہ انہوں نے وضوء کیا ہاتھ کندھوں تک اور پاؤں نصف ساق تک دھوئے کسی نے پوچھا تو بتایا کہ مؤمن کے اعضاء کو وہاں تک کنگن پہنائے جائیں گے جہاں تک وضوء کا پانی پہنچا ہو۔ وہ جگہ چمک رہی ہوگی، تو وضوء کے اعضاء سے زیادہ دھونا اسباغ کہلاتا ہے ان تین میں تضاد نہیں بلکہ جمع ہو سکتے ہیں۔

کثرۃ الخطیٰ الیٰ المساجد: اس کا مطلب بعض نے لکھا ہے کہ چھوٹے قدم لے کر چلے لیکن معارف السنن میں اس کی تردید کی گئی ہے۔ اور لکھا ہے کہ گھر مسجد سے دور ہے اس کے باوجود چل کر مسجد میں جماعت میں شریک ہونے کے لئے آتا ہے اس کو ثواب ملے گا کہ درجہ بلند ہوگا اور گناہ معاف ہوں گے۔

انتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ: اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ ① فجر کی نماز پڑھی وہیں بیٹھ کر ظہر کی نماز کا انتظار کریں، ظہر پڑھی وہیں بیٹھ کر عصر کا انتظار کریں الخ۔ ② مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ معنی لینا صحیح نہیں کیونکہ اگر صحیح ہوتا تو سلف میں سے کوئی تو اس پر عمل کرتا، مگر سلف میں سے کسی نے اس پر عمل نہیں کیا دوسرا پھر معاش معطل ہو جائیگا اس لئے اس کا یہ معنے مراد نہیں۔ پھر کونسا معنی مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں ① قرب الوقت نمازوں میں انتظار مراد ہے ② مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ انتظار القلب مراد ہے فجر پڑھی تو دل میں خیال ہے کہ ظہر آئے گی نماز پڑھوں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بلال ہمیں نماز کے ساتھ راحت پہنچائیں، اسی طرح حدیث میں ہے کہ سات آدمیوں کو عرش کا سایہ ملے گا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "قلبهٗ معلق بالمسجد"۔

فذالکم الرباط: کامعنی ہے "حبس النفس علی الشیئی" اصطلاح میں کہتے ہیں کہ سرحد پررہ کر جہاد کاانتظار کرنااور سرحد کی حفاظت کرنا تو گویا نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رباط کا جو عمل ہے اس کا ثواب یہاں بھی ملے گا۔

باب المنديل بعد الوضوء

اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک کپڑا ہوتا تھا جس سے وضوء کے بعد اعضاء کو خشک کرتے تھے۔

پہلی بات: وضوء کے کپڑے سے پانی کا خشک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے لئے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو روایات نقل کی ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ وضوء کا پانی کپڑے سے خشک کرتے تھے، دوسری روایت حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے کہ حضور ﷺ نے وضوء کیا پھر کپڑے کے کنارے سے پانی خشک کیا۔

دوسری بات: اس باب کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے صراحۃً کوئی قول منقول نہیں فقہ کی کتب میں دو قول ملتے ہیں ایک صاحب منیہ کا قول کہ اس نے مستحبات میں نقل کیا ہے کہ وضوء کے پانی کا خشک کرنا مستحب ہے۔ لیکن عام علمائے احناف کہتے ہیں کہ استحباب کی دلیل نہیں اس لئے صحیح قول یہ ہے کہ یہ احناف کے ہاں صرف جائز کے درجے میں ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مالکیہ اور شوافع کے ہاں بھی مباح ہے، ابن العربی نے تین قول نقل کئے ہیں بعض صحابہ (انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور تابعین (حسن بصری) کہتے ہیں کہ غسل اور وضوء کے پانی کو خشک کرنا جائز ہے دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے فرماتے ہیں کہ غسل اور وضوء کے پانی کو خشک کرنا ممنوع ہے تیسرا قول یہ ہے کہ غسل کے پانی کو خشک کرنا صحیح ہے مگر وضوء کے بعد ممنوع ہے تو عام فقہاء ومحدثین جواز کے قائل ہیں مگر استحباب کی کوئی دلیل نہیں۔

تیسری بات: اس مسئلے کے متعلق جتنی احادیث ہیں، مصنف کہتے ہیں کہ ان میں سے سنداً کوئی بھی صحیح نہیں۔ مثلاً عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والی روایت ابومعاذ (سلمان بن ارقم) ہے یہ ضعیف ہے دوسری حدیث معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس میں رشدین بن سعد اور عبدالرحمن بن زیاد بن انعم الافریقی یہ دونوں ضعیف ہیں۔ باقی روایات بھی ضعیف ہیں۔ معارف السنن میں ہے کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ فضائل میں شروط کے ساتھ ضعیف حدیث پر بھی عمل جائز ہے اور سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ احکام میں ضعیف حدیث ہو اور احتیاط پر مبنی ہو تو اس پر عمل کیا جاتا ہے، یہاں بھی مسئلہ فرضیت وغیرہ کا نہیں۔ بلکہ مباح ہے، اس لئے ضعیف حدیث بھی چل جائے گی بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے غسل کیا ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یا کسی اور زوجہ نے کپڑا دیا، آپ نے قبول نہیں کیا۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ یہ رد کرنا کراہت کی دلیل نہیں بلکہ اور وجہ ہوسکتی ہے اس لئے اس مسئلے میں اباحت ہے۔

چوتھی بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے زہری کا قول نقل کیا ہے کہ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام زہری کہتے ہیں کہ وضوء کے بعد خشک کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ وضوء کا پانی نامہ اعمال میں وزن ہوتا ہے مگر ابن العربی فرماتے ہیں کہ یہ وجہ بیان کرنا صحیح نہیں کیونکہ وضوء کا پانی جو اعضاء پر رہتا ہے وہ خود بھی خشک ہو جاتا ہے، اس لئے خشک ہونا وزن کے منافی نہیں، دوسرا اعمال کا وزن حسی نہیں وزن ثواب کا ہوتا ہے یا بعض کے ہاں اعمال نامے کا وزن ہوتا ہے اس لئے پانی کے خشک ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے زہری کا کراہت کے لئے یہ وجہ بیان کرنا صحیح نہیں۔

منديل وہ کپڑا جس سے میل صاف کی جائے اور یہ ندل سے ہے بمعنی میل کچیل۔ حدثنیہ علی بن مجاھد عنی مستقل فن ہے۔ باب من

حدث ونسی اب ایسی حدیث کا حکم کیا ہے۔تو فرماتے ہیں اس کے کئی اقسام ہیں اگر شاگرد ضعیف ہو پھر اس حدیث کا جس کا استاد انکار کر رہا ہے تو یہ روایت غیر مقبول ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شاگرد ثقہ ہے اب دیکھیں گے کہ اگر استاد بالکل منکر ہو تو غیر مقبول ہے لیکن استاد کہے مجھے یاد نہیں تو یہ مقبول ہے، یہاں عبارت میں یہی صورت ہے۔

باب مایقال بعد الوضوء

اس باب میں عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے وضوء کیا اچھی طرح اور پھر دعا پڑھی "أشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريک له وأشهدأن محمداً عبده ورسوله اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين" تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس سے چاہے داخل ہو جائے۔

پہلی بات: باب کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے وضوء کے بعد کی دعا کی فضیلت بیان کی ہے کہ اس آدمی کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل دیئے جاتے ہیں۔ابن العربی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ بشارت چار جگہ دی ہے ان میں سے ایک مذکورہ جگہ ہے۔

دوسری بات: ہمارے فقہاء اور فقہاء شوافع اور مالکیہ نے وضوء کے درمیان کچھ ادعیہ کو ذکر کیا ہے جو منیۃ المصلی میں مذکور ہے۔اب ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ، نووی رحمہ اللہ تعالیٰ اور عبدالحئی فرماتے ہیں کہ وضوء کی درمیان والی دعائیں احادیث سے ثابت نہیں۔اس لئے سنت کی نیت سے یہ دعائیں نہ پڑھی جائیں۔البتہ معارف السنن میں ہے کہ علماء سے بطور استحباب پڑھنا منقول ہے، ابن حبان نے بعض ضعیف اسناد سے ذکر کیا ہے، اور یہ فضائل کے ابواب ہیں۔اور فضائل میں ضعیف حدیث شرائط کے ساتھ چل جاتی ہے اس لئے یہ دعائیں خلاصہ کیدانی کی تعریف کے تحت مستحب ہیں کہ "وأحب السلف"

تیسری بات: معارف السنن میں ہے کہ وضوء کی ادعیہ سے متعلق چار احادیث صحیح ثابت ہیں:

❶ ابتداء میں بسم اللہ والحمد للہ پڑھنا۔ ❷ باب مذکورہ والی دعا پڑھنا یہ بھی صحیح سند سے ثابت ہے۔
❸ اللهم اغفرلي ذنبي ووسع لي في داري وبارک في رزقي ❹ سبحانک اللهم وبحمدک لااله الا انت وحدک لاشريک لک استغفرک واتوب اليک حدیث میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے کا بھی ذکر ہے مگر انگلی اٹھانے کا ذکر نہیں۔

باب الوضوء بالمد

یہ روایت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ وضوء کرتے تھے ایک مد سے اور غسل ایک صاع سے کرتے تھے۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا مطلب ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے اور یہی مطلب جمہور فقہاء محدثین نے ذکر کیا ہے کہ باب کی حدیث میں جو مد سے وضوء اور صاع سے غسل کا ذکر ہے یہ مقدار مستحب کا ذکر ہے عموماً اس مقدار سے کفایت ہو جاتی ہے لیکن یہاں توقیت مقصود نہیں کہ اس مقدار سے کم یا زیادہ پانی کا استعمال جائز ہی نہ ہو۔

دوسری بات: صاع کی مقدار میں اختلاف ہے۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صاع چار مد کا ہوتا ہے۔احناف بھی کہتے ہیں کہ صاع چار مد کا ہے۔آگے مقدار میں اختلاف ہے، کہ مد کی کتنی مقدار ہے اس میں یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ایک مد ایک رطل اور ثلث رطل کا ہے اس لئے صاع کی مقدار پانچ رطل اور ثلث رطل بنے گی۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مد دو رطل کا ہے

اس لئے ایک صاع آٹھ رطل کا بنے گا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ احناف جو صاع کی مقدار آٹھ رطل بتاتے ہیں اس کا احادیث میں ثبوت نہیں اس پر ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ کا واقعہ بھی نقل کرتے ہیں۔ نصب الرایہ میں بیہقی کے حوالے سے ہے کہ ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ حج سے واپس آئے شاگردوں سے کہا کہ میں تم پر علم کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں، کہ میں مدینہ گیا وہاں لوگوں سے صاع کے بارے میں پوچھا دیکھا تو وہ پانچ رطل کا تھا۔ انہوں نے کہا "صاعنا هذا صاع رسول الله ﷺ" ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے سوال کیا کہ دلیل کیا ہے انہوں نے کہا کہ کل دلیل لائیں گے، دوسرے دن مہاجرین وانصار کی اولاد میں سے پچاس بزرگ لائے، انہوں نے بغلوں میں صاع رکھا ہوا تھا، اور سند سے بتایا کہ یہ حضور ﷺ کا صاع ہے، ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ نے احناف کے قول سے رجوع کیا۔

احناف جواب دیتے ہیں ہیں کہ آٹھ رطل کا صاع احادیث سے ثابت ہے، سنن ابی داؤد میں مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ آپ ایسے برتن سے وضوء کرتے ہیں جس میں دو رطل پانی آتا تھا۔ اب اس حدیث میں ہے کہ مد سے وضوء کرتے تھے اب وہ دو رطل والا برتن یہی مد ہے۔ اب صاع بالاتفاق چار مد کا ہے تو چار مد کا آٹھ رطل ہوگئے، یہ روایت ابوداؤد میں صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔

دوسری دلیل نسائی میں ہے کہ مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے سامنے برتن لایا گیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حدیث سنائی کہ نبی اکرم ﷺ اس جیسے برتن سے وضوء کرتے تھے اور وہ برتن دو رطل کا تھا، مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صاع آٹھ رطل کا تھا۔ حجاج بن یوسف کے پاس صاع تھا جو صاع عمری کے مطابق تھا، اور آٹھ رطل کا تھا، یہ سب مؤرخین نے لکھا ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے دو وجوہ ترجیح بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ حضور ﷺ کے زمانے میں دونوں قسم کے صاع تھے۔ صحاح کی کتابوں میں ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ کے لئے دعا کی فرمایا اے اللہ ہمارے صاع میں برکت ڈال دے۔ یہ برکت معنوی بھی تھی حسی بھی تھی کہ وہ بڑا ہوگیا۔ دوسری یہ کہ صدقات فرضیہ کی ادائیگی میں احتیاطاً بڑے صاع سے ادائیگی کی جائے، مد کے بارے میں قاموس میں لکھا ہے کہ یہ مد سے ہے اور معتدل آدمی دو ہاتھ ملا کر رکھے تو وہ مد کی مقدار ہوگی۔

باب كراهية الاسراف في الوضوء

اس باب میں ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ وضوء کے لئے بھی شیطان ہوتا ہے۔ جس کا نام ولہان ہے تم بچو پانی کے متعلق وساوس شیطان سے، ویسے تو ہر وقت شیطان لگا رہتا ہے، مگر وضوء میں خاص شیطان ہے جو وسوسہ ڈالتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ تم نے تین دفعہ نہیں دھویا، یا وسوسہ ڈالتا ہے کہ کچھ جگہ خشک باقی ہے، اس لئے مزید دھولو، اس لئے فرمایا کہ پانی کے بارے میں ولہان کے وسوسے سے ڈرو۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ تین دفعہ سے زائد پانی جو استعمال کرے گا وہ اسراف میں شمار ہوگا، یہ اسراف مقدار میں ہے دوسرا اسراف نفس استعمال میں بھی ہے، کہ تھوڑے پانی سے کلی کر سکتا ہے اور آپ زیادہ پانی ڈالیں، اور علماء کے نزدیک اسراف پانی کے اندر بھی ناجائز ہے۔

اسراف کہتے ہیں قدر حاجت سے زائد کسی چیز کا استعمال کرنا۔ قرآن میں مسرفین کو اخوان الشیاطین قرار دیا ہے۔

"ولھان" یہ ولہ سے تحیر کے معنے میں ہے اور اس کو ولہان اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ حیران ہوتا ہے کہ کس طرح اور کس تدبیر سے انسان کو گمراہ کرے اور وسوسہ ڈالے یا اس لئے ولہان کہتے ہیں کیونکہ جس کو یہ وسوسہ ڈالتا ہے وہ حیران ہوتا ہے۔

باب الوضوء لكل صلاة وباب ماجاء انه يصلي الصلوٰت بوضوء واحد

اس باب میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے لئے وضوء کرتے تھے طاہر ہوں یا حالت طہارت میں نہ ہوں (یعنی بے وضوء ہوں) حمید فرماتے ہیں کہ میں نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ تم کیا کرتے تھے، فرمایا ہم ایک ہی وضوء کرتے تھے۔

دوسرے باب میں فرماتے ہیں کہ عام عادت یہی تھی کہ ہر نماز کے لئے وضوء کرتے تھے مگر فتح مکہ کے دن ایک وضوء سے کئی نمازیں پڑھیں۔

قرآن میں ہے"اذا قمتم الی الصلاۃ" یہاں حدث کی قید نہیں لیکن مفسرین کے ہاں حالت حدث ہو تب وضوء واجب ہے، اس لئے مفسرین قید نکالتے ہیں۔"وانتم محدثون"

پہلی بات: انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر نماز کے لئے آپ ﷺ وضوء کرتے تھے اب یہ واجب ہے یا نہیں۔ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف نقل کیا ہے کہ وضوء لکل صلاۃ عند البعض واجب ہے۔ جمہور کے ہاں حدث ہو واجب ہے ورنہ واجب نہیں۔

نووی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو اختلاف نقل کیا ہے یہ صحیح نہیں بلکہ بالاجماع حالت حدث کے علاوہ واجب نہیں، لیکن معارف السنن میں ہے کہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات غلط ہے یہ اختلاف صرف طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں بلکہ ابن عبد البر مالکی اور دوسرے بڑے ثقہ نے بھی نقل کیا ہے اس لئے پہلے اختلاف تھا اب وضوء لکل الصلاۃ بالاجماع واجب نہیں۔

دوسری بات: وضوء لکل صلاۃ بالاجماع مستحب ہے۔

تیسری بات: نبی اکرم ﷺ کا حکم بھی عام امت کا تھا یا الگ تھا۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا حکم الگ تھا ان پر وضوء لکل صلاۃ واجب تھا۔ آنے والے باب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا وجوب بھی مشقت کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ جس طرح گزر گیا مسواک کو اس کے قائم مقام قرار دیا گیا۔

هذا اسناد شرقي: اس سے مراد بغداد اور کوفہ والے ہیں۔ لیکن محدثین نے لکھا ہے کہ کسی حدیث کی ضعف یا قوی ہونے کا تعلق مشرقی یا مغربی ہونے سے نہیں بلکہ راویوں کے ثقہ یا ضعیف ہونے کے اعتبار سے ہے۔

باب في وضوء الرجل والمرأة من اناء واحد وباب كراهية فضل طهور المرأة وباب الرخصة في ذلك

پہلے باب میں حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے جنابت کا غسل کرتے تھے۔

دوسرے باب میں قبیلہ غفار کے ایک آدمی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے بچے ہوئے پانی کے استعمال سے منع کیا ہے۔ تیسرے باب میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعض ازواج نے ایک برتن سے غسل کیا آپ نے اس برتن سے وضوء کرنا چاہا انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں جنبی تھی آپ نے فرمایا پانی تو جنبی نہیں ہوتا۔

پہلی بات: ان تینوں ابواب کا تعلق ایک ہی مسئلے سے ہے وہ یہ کہ عورت کسی پانی سے غسل یا وضوء کرے اور پانی بچ جائے اب باقی ماندہ سے کسی مرد کیلئے وضوء یا غسل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے لیکن پہلے یہ سمجھ لیں کہ اس باب میں متعدد روایات ہیں جیسے پہلے باب سے معلوم ہوا کہ دونوں اکٹھے غسل یا وضوء کریں تو جائز ہے۔ دوسرے باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بچے ہوئے پانی کا استعمال ممنوع ہے۔ تیسرے باب کی حدیث میں ہے کہ عورت کے استعمال سے بچا ہوا پانی استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے باقی ماندہ سے وضوء کیا چوتھی حدیث ہے اس میں ہے کہ آپ نے منع فرمایا اس بات سے کہ مرد عورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے اور عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے وضوء کرے۔ پانچویں حدیث ہے اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے منع فرمایا اس سے کہ مرد عورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے۔ اور عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے اس میں نہی جانبین سے ہے۔

دوسری بات: امکانی صورتیں کتنی بنتی ہیں اور کون کونسی ناجائز ہیں۔ ① عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے وضوء کرے ② عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے ③ عورت و مرد اکٹھے غسل کریں ④ ایک ساتھ وضوء کریں ⑤ مرد عورت کے باقی ماندہ پانی سے وضوء کرے ⑥ مرد عورت کے باقی ماندہ پانی سے غسل کریں۔ اب ان چھ صورتوں میں سے بعض کا حکم احادیث میں صراحۃً ثابت ہے۔

① مرد وعورت اکٹھے غسل کریں اس کا جواز باب اول کی حدیث میں ہے۔ ② مرد اور عورت اکٹھے وضوء کریں یہ بھی مصرح طور پر احادیث میں موجود ہے۔ ③ عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے وضوء کرے یہ بھی ائمہ اربعہ کے ہاں جائز ہے ④ عورت مرد کے باقی ماندہ پانی سے غسل کرے اس صورت کے متعلق ایک حدیث میں ممانعت ہے مگر ائمہ اربعہ کے ہاں بالاتفاق یہ صورت جائز ہے ⑤ مرد عورت کے غسل کے باقی ماندہ پانی سے غسل یا وضوء کرے۔ ⑥ مرد عورت کے وضوء کے باقی ماندہ پانی سے غسل یا وضوء کرے۔

اس میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء محدثین کی ہاں یہ صورتیں بھی جائز ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق بن راہویہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ عورت نے اکیلئے پانی استعمال کیا وضوء کیا یا غسل کیا۔ اب باقی ماندہ پانی سے مرد نہ وضوء کرسکتا ہے نہ غسل کرسکتا ہے، بلکہ اس کا استعمال مکروہ ہے، دلیل باب کی حدیث ہے کہ حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "نهى رسول الله ﷺ عن فضل طهور المرأة" ایک روایت میں ہے "نهى أن يتوضأ بفضل طهور المرأة" جب وضوء میں استعمال شدہ پانی کا استعمال جائز نہیں تو غسل کے بچے ہوئے پانی کا استعمال کیسے جائز ہوگا۔

جمہور کہتے ہیں کہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں کہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے غسل کیا برتن میں کچھ پانی بچ گیا آپ ﷺ نے وضوء کرنا چاہا انہوں نے کہا میں جنبی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا پانی پر جنابت کا اثر نہیں ہوتا۔ جمہور کہتے ہیں کہ ممانعت والی روایات کی علت یہ ہے کہ عورت طہارت کے مسئلے سے واقف نہیں ہوتی اس لئے وہ پانی میں چھینٹے گرائے گی۔ اور اگرچہ مستعمل پانی صحیح قول کے مطابق طاہر ہے۔ مگر انسان کی طبیعت نفرت کرتی ہے ایسے پانی کے استعمال سے اب یہ علت غسل میں وضوء کی نسبت زیادہ ہے یہاں چھینٹیں زیادہ گرسکتی ہیں اس کے باوجود حضور ﷺ نے غسل کے باقی ماندہ پانی کو استعمال کیا تو اگر عورت وضوء کرلے اس میں علت کا احتمال کم ہے اس کا استعمال بطریقہ اولیٰ جائز ہوگا۔ جمہور کے نزدیک چھ صورتیں سب جائز ہیں اب نہی والی روایات میں کیا تاویل کریں گے۔

❶ نہی کی احادیث ابتدائے اسلام پر محمول ہیں کیونکہ ابتدائے اسلام میں عورتیں طہارت کے احکام سے واقف نہ تھیں اس لئے آپ ﷺ نے منع کیا کہ مرد عورت کے وضوء یا غسل کے پانی کو استعمال نہ کرے اور عورت کی طبیعت کا خیال رکھا کہ وہ مرد کے غسل کا پانی استعمال نہ کرے یہ کراہت تنزیہی تھی جو جواز کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے۔

❷ بعد میں یہ کراہت تنزیہی بھی منسوخ ہوگئی اس لئے حضور ﷺ نے میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے وضوء کیا۔

❸ علامہ خطابی نے لکھا ہے کہ نہی کی احادیث ماء متقاطر پر محمول ہیں۔ کہ وہ پانی جو اعضاء سے گر کر جمع ہو جائے اس کا استعمال مکروہ وممنوع ہے ہے مگر جمہور نے اس کو قبول نہیں کیا ہے کیوں کہ حدیث میں "بفضل طهور المرأة" کے الفاظ ہیں۔

❹ معارف السنن میں مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے منقول ہے کہ شرعی قانون یہ ہے کہ وہ قطع وساوس کا اہتمام کرتا ہے اب اگر مرد عورت کا باقی ماندہ پانی استعمال کرے تو نہی کی علت بتائی کہ مستعمل پانی گر جائے اب یہ بھی احتمال ہے کہ عورت کے بدن پر نجاست لگی ہو تو شبہ اور وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تو اس کو قطع کرنے کے لئے آپ ﷺ نے منع کیا، تا کہ حصول طہارت یقینی ہو جائے یہ آداب معاشرت کے قبیل سے ہے اس لئے نہی تنزیہی ہے معلوم ہوا کہ جمہور کا قول قوی ہے۔

تیسری بات: وہ احادیث جن میں معاً غسل کا جواز ملتا ہے یا معاً وضوء کا جواز ملتا ہے وہ دال ہیں کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے باقی ماندہ پانی کو استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اگر پہلے مرد ہاتھ ڈالے تو عورت کو مرد کا باقی ماندہ پانی ملا اور اگر عورت ہاتھ ڈال دے تو مرد کے لئے عورت کا بچا ہوا پانی ملا۔

چوتھی بات: انسان کا جھوٹا پاک ہے چاہے مسلمان ہو یا کافر ہو، مرد کا ہو یا عورت کا لیکن کافر نے شراب پیا ہے اس کا جھوٹا عارض کی وجہ سے نجس ہوا۔ فقہاء احناف کہتے ہیں کہ مرد کے لئے اجنبیہ عورت کا جھوٹا مکروہ ہے یا عورت کے لئے اجنبی مرد کا جھوٹا مکروہ ہے یہ کراہت نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ استلذاذ کی وجہ سے منع کیا۔

باب ماجاء أن الماء لاينجسه شيئ

اس باب میں ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم بیر بضاعہ سے وضوء کر سکتے ہیں جبکہ اس میں حیض کے کپڑے، کتوں کا گوشت، اور بدبودار اشیاء ڈالی جاتی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں بنا سکتی۔

دوسرے باب میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا اس پانی کے بارے میں جو صحراؤں میں ہوتا ہے اور اس سے درندے اور چوپائے پیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اذا کان الماء قلتين لم يحمل الخبث" کہ جب پانی قلتین ہو تو نجاست کو نہیں اٹھاتا۔

پہلی بات: باب اول کی حدیث بئر بضاعہ کے نام سے مشہور ہے، بضاعہ باء کے ضمے اور کسرے دونوں کے ساتھ منقول ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ عورت کا نام ہے اس کی ملک میں یہ کنواں تھا اس کی طرف کنویں کو منسوب کر کے بئر بضاعہ کہتے ہیں۔

دوسری بات: حدیث کی ابتداء میں ہے "انتوضأ" یہاں جمع متکلم کے صیغے پر ہمزہ استفہام داخل کیا ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ سنن کے تمام نسخوں میں یہ لفظ جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ ہے۔ مگر نووی رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے ائمہ حدیث کہتے ہیں کہ صحیح تر یہ ہے کہ یہ مخاطب کے صیغے کے ساتھ ہے چنانچہ سنن نسائی میں ہے کہ کئی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے پاس سے گزرے۔ آپ بئر بضاعہ سے وضوء کر رہے تھے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا "اتتوضأ من بئر بضاعة"۔

تیسری بات: ائمہ میں دو باتوں میں اتفاق ہے اور ایک بات میں اختلاف ہے۔ ① پانی کے اوصاف ثلاثہ میں جب کوئی وصف متغیر ہو جائے تو وہ پانی بالاتفاق نجس کہلاتا ہے۔ ② قلیل پانی وقوع نجاست سے نجس ہو جاتا ہے مگر کثیر پانی وقوع نجاست سے نجس نہیں ہوتا

اس پر بھی اجمالاً اتفاق ہے۔ (۳) قلیل اور کثیر مقدار کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ اس کے بارے میں تمام اقوال کو جمع کیا جائے تو بیس سے زائد بنتے ہیں مگر مشہور اقوال اجمالاً تین ہیں۔

پہلا قول: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے فقہائے احناف کہتے ہیں کہ نجاست پانی کے اندر ایک کنارے پر گر جائے اور دوسرے تک سرایت کرنے کا گمان ہو تو یہ پانی قلیل ہوگا اور اگر مبتلا بہ کی رائے یہ ہو کہ ایک کنارے پر نجاست گرے وہ دوسرے کنارے تک سرایت نہ کرے گا وہ پانی کثیر ہوگا۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہی ہے جو مفتی بہ اور ظاہر روایت ہے تو اس قول کے مطابق امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کثیر وقلیل کی تحدید نہیں کی ہے بلکہ رائے مبتلا بہ کا اعتبار کرتے ہیں۔ دوسرا قول جو ان سے منقول ہے جو پانی عشر فی عشر ہو یہ کثیر ہے اگر اس سے کم ہو وہ قلیل ہے۔ تیسرا قول احناف کے ہاں ثمانیۃ فی ثمانیۃ کا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ہر جانب بارہ ذراع ہو تو وہ پانی کثیر ہے اگر اس سے کم ہو تو قلیل ہے اور وقوع نجاست سے نجس ہو جائے گا۔ یہ احناف کے اقوال ہیں لیکن صحیح تربات یہ ہے کہ احناف سے کوئی تحدید منقول نہیں۔ بلکہ محمد رحمہ اللہ تعالیٰ پڑھا رہے تھے کسی نے اس کے بارے میں سوال کیا کہ ماء کثیر کتنا ہے انہوں نے جواب دیا کہ "کمسجدی ھذا" اس کے بعد شاگردوں نے ناپا تو مسجد کی دیواروں کو بغیر ملانے کے ثمانیۃ فی ثمانیۃ تھی اور دیواروں کو ملا کر عشر فی عشر تھی تو اس وجہ سے اقوال مشہور ہو گئے۔

بدائع الصنائع میں ہے کہ عشر فی عشر کا قول کسی حنفی امام سے منقول نہیں سب سے پہلے ابوسلیمان جوزجانی جو امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا شاگرد ہے ان سے تحدید کے اقوال منقول ہیں کیونکہ احناف نے رائے مبتلا بہ کا اعتبار کیا تھا اور ہر آدمی کی رائے میں فرق ہوتا ہے تو ابوسلیمان نے آسانی کے لئے بطور مثال ذکر کیا۔

دوسرا قول: امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر وہ پانی جو وقوع نجاست سے حساً متغیر نہ ہو یعنی کوئی وصف نہ بدلے وہ کثیر ہے، اگرچہ گلاس ہی کیوں نہ ہو اور جو پانی وقوع نجاست سے حساً متغیر ہو جائے وہ پانی قلیل ہے اگرچہ ماء جاری کیوں نہ ہو۔ تو مالکیہ کے نزدیک قلت وکثرت کا مدار مبتلی بہ کے حس پر ہے۔

تیسرا قول: امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قلت وکثرت کا مدار قلتین پر ہے۔ اس لئے قلتین یا اس سے زیادہ پانی ہو تو وہ کثیر ہے اور قلتین سے کم ہو تو وہ قلیل ہوگا اور وقوع نجاست سے نجس ہو جائے گا۔

حدیث بئر بضاعہ سے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ دلیل پکڑتے ہیں کہ "الماء طھور لاینجسه شي" الماء کا الف لام جنس کا ہے، تو تمام پانیوں کا یہی حکم ہے بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں "مالم یتغیر طعمه اولونه" یہ استثناء جن احادیث میں موجود ہے، تو سند کے اعتبار سے یہ جملہ ضعیف ہے لیکن یہ مسئلہ اجماع سے ثابت ہے کہ جب کوئی وصف بدل جائے نجاست گرنے سے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے، یہ قول سنداً صحیح ثابت نہ بھی ہو لیکن یہ مسئلہ اجماعاً ثابت ہے۔

اب یہاں دو باتیں ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ بئر بضاعہ سے وضوء کرتے ہیں جبکہ اس میں حیض کے کپڑے، مردار کتے، اور بدبودار اشیاء ڈالی جاتی ہیں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیونکہ جس کنویں کا پانی پینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو کوئی ذی عقل آدمی ایسی جگہ یہ چیزیں نہیں ڈالتا۔

علماء نے اس کا ایک مطلب تو یہ بتایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں، ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے لوگوں میں طہارت اور نظافت کا شعور نہ تھا، اس لئے لوگ یہ چیزیں ڈالتے تھے اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ شبہ ہوا کہ زمانہ جاہلیت کی ڈالی ہوئی گندگی ان کا اثر اب بھی موجود ہوگا اس لئے ان کو شبہ ہوا کہ اس سے آپ وضوء کرتے ہیں جبکہ اس میں یہ اشیاء ڈالی جاتی رہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مدینہ میں یہود و منافق تھے اور بئر بضاعہ کے پانی کو مسلمان استعمال کرتے تھے تو یہود یا منافقین شرارت کے لئے یہ گندی اشیاء پانی میں ڈالتے تھے تاکہ مسلمانوں کو تکلیف ہو اور مسلمان کبھی عدم علم کی وجہ سے اس کو استعمال کرتے اور جب علم ہوتا تو یہ اشیاء نکال کر پانی استعمال کرتے اب مسلمانوں کو شبہ ہوا کہ یہ لوگ گندگی ڈالیں ہم لاعلمی میں استعمال کریں تو طہارت ہوگی یا نہیں؟

تیسرا مطلب جو علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ کافر یا مسلمان جس پانی کو استعمال کرتا ہے وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ پانی پاک ہو۔ تو اس لئے یہود وغیرہ نجاست نہ ڈالتے تھے لیکن یہ کنواں نشیبی جگہ پر تھا بارش ہوتی تھی سیلاب گلیوں اور پہاڑیوں سے گندگی لے کر آتا اور کنویں میں ڈال دیتا پھر جب سیلاب ختم ہوتا تو مسلمان کنویں کو صاف کرتے تھے۔ طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شبہ کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ مسلمان جب گندگی نکالتے اور صاف بھی کرتے ڈول نکال کر لیکن یہ شبہ ہوتا تھا کہ نجس پانی کنویں کی دیواروں یا زمین میں جذب ہوگیا ہے اب اگرچہ وہ شرعی صفائی کر لیتے ہیں مگر شبہ ہوتا تھا کہ کہ آیا یہ کنواں پاک ہوا یا نہیں ہوا کیونکہ دیواریں گندا پانی جذب کر چکی ہیں تو اس شبہ کو دور کرنے کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا "**الماء طهور**" یہ خاص پانی جس کا آپ پوچھ رہے ہیں یہ پاک ہے "**لاینجسه شئ**" تمہارے ذہن میں جو اس کے متعلق نجس ہونے کے شبہات ہیں وہ صحیح نہیں۔

اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ بئر بضاعہ سے وضوء کریں جبکہ اس میں حیض کے کپڑے، مردہ کتے، دوسرے ناپاک چیزیں ڈالی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "**الماء طهور لاینجسه شئ**" اب اس سوال و جواب کی دو صورتیں ہیں:

❶ یہ تین قسم کی نجاستیں کنویں کے اندر موجود ہوں، اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوال کریں کہ یہ نجاست یہاں موجود ہیں اور آپ وضوء کریں تو یہ وضو جائز ہے یا نہیں اور آپ جواب دیں "**الماء طهور**" لیکن یہ احتمال عقلاً صحیح نہیں، کیونکہ اتنی نجاست موجود ہو تو اس کا کوئی وصف ضرور متغیر ہوگا۔ دوسرا انسان کی نظافت طبع بھی یہ برداشت نہیں کرتی کہ یہ سب اشیاء موجود ہوں اور پھر آپ ﷺ کہیں کہ "**الماء طهور**"۔

❷ سیلاب یا منافقین نے یا زمانہ جاہلیت میں یہ اشیاء ڈالی گئیں، پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نجاستیں نکالیں نجس پانی بھی نکالا لیکن اب شبہ ہے کنویں کی دیواروں نے جو پانی جذب کیا ہے یہ پانی پاک ہے یا نہیں تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے جواب دیا "**الماء طهور**" یہ صورت صحیح ہے اور مسلک احناف اور جمہور کا بھی ہے۔ کہ نجاست نکال کر پانی نکالا جائے، تو باقی کنواں صاف ہوگا اس لئے اس سے مالکیہ کا استدلال صحیح نہیں۔

علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے باب کی حدیث کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا جواب "**الماء طهور الخ**" یہ جواب علی اسلوب الحکیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بئر بضاعہ میں نجاستیں نہ ڈالی گئیں بلکہ فقط شبہ تھا کہ یہود یا منافق تنگ کرنے کے لئے نہ ڈالتے ہوں۔ یہ فقط شبہ تھا آپ ﷺ نے فرمایا "**الماء طهور لاینجسه شئ**" کہ پانی تمہارے شبے کی وجہ سے نجس نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ پانی میں نجاست گرنے کا مشاہدہ نہ ہو صرف شبہ ہو تو پانی پاک ہوگا۔ یہ جمہور کا مسلک بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ اس کے نظائر بھی موجود ہیں بخاری میں باب ذبیحۃ الاعراب میں حدیث ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اعرابی گوشت لاتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ وہ عند الذبح بسم اللہ پڑھتے ہیں یا نہیں تو یہ گوشت حلال ہے یا نہیں آپ ﷺ نے جواب دیا کہ تم کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لیا کرو اور کھاؤ۔ حالانکہ مسئلہ ہے کہ متروک التسمیہ عامداً ہو یا غیر اللہ کے نام پر ذبح ہو تو کھاتے وقت ہزار دفعہ اللہ کا نام لو حلال نہ ہوگا اس لئے یہاں بھی جواب علی اسلوب الحکیم ہے کہ یہاں یقین نہ تھا شبہ تھا کہ بسم اللہ نہ پڑھی ہوگی اس لئے فرمایا کہ کھاتے وقت اللہ کا نام لے لینا۔

دوسری نظیر کتاب الطہارت میں صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ میرا دامن لمبا ہے، میرا کرتا بھی نجس زمین سے ٹکراتا ہے تو کپڑے ناپاک ہوں گے؟ جواب دیا "یطھر ہ مابعدہ" کہ بعد کی زمین سے جب کپڑا ٹکرائے تو پاک ہو جائے گا، حالانکہ ایسے کبھی کپڑا پاک نہیں ہوتا تو یہاں بھی علی اسلوب الحکیم تھا کیونکہ یہاں فقط نجاست کا شبہ تھا اور شبہ سے ناپاک نہیں ہوتا صرف ان کی تسلی کے لئے "یطھر مابعدہ" کہہ دیا۔

قدجود ابو اسامة: تجوید محدثین کے ہاں "حذف الضعیف بین الثقتین" جس کو تدلیس التسویہ بھی کہتے ہیں کہ سند میں ضعیف راوی آیا تو نقل کرنے والا راوی سمجھتا ہے کہ لوگ اس کو قبول نہیں کریں گے اس لئے وہ ضعیف آدمی کو حذف کر کے سند کو متصل بنا دیتا ہے لیکن یہاں یہ معنی مراد نہیں بلکہ معنی یہ ہے کہ ابو اسامہ نے اس کو جید سند کے ساتھ نقل کیا ہے جبکہ اس کی باقی اسانید اتنی عمدہ نہیں ہیں۔

باب منه آخر

پہلی بات: اس باب کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اس پانی کے متعلق سوال ہوا جو جنگل میں ہوتا ہے وجہ شبہ یہ ہے کہ ایسے جنگل کے پانی سے درندے وغیرہ پانی پیتے ہیں اب ہمیں اس کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ درندوں کی وجہ سے نجس ہو گیا ہو گا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ جب پانی دس مشکیزے کے برابر ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ باقی درندوں کا پینا صرف شبہ تھا، اس میں کوئی مشاہدہ نہیں تھا۔

دوسری بات: اس سے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ استدلال کرتے ہیں کہ یہاں محدود مقرر کر دی گئی کہ قلتین ہو تو ناپاک نہ ہو گا وقوع نجاست سے کیونکہ قلتین یا اس سے زائد ماء کثیر ہے اور قلتین سے کم ماء قلیل ہے۔ یہ مقدار شوافع کے ہاں حقیقی ہے یہاں تک بحر الرائق میں لکھا ہے کہ اسی طرح نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب المجموع میں لکھا ہے کہ اگر دو نجس قلے پانی ہو اور دونوں کو ملایا تو پاک ہو جائے گا اس لئے ان کے ہاں یہ تقریبی مقدار نہیں بلکہ حقیقی مقدار ہے۔

تیسری بات: حدیث میں قلت و کثرت کا مدار قلتین پر رکھا ہے تو احناف اس کو مدار کیوں نہیں بناتے تو احناف کہتے ہیں کہ ہم نے چند وجوہات کی بناء پر اس حدیث کو مدار نہیں بنایا مگر ان وجوہ سے قبل یہ سمجھیں کہ صاحب ہدایہ نے اس روایت کو ہدایہ میں لایا ہے۔ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مستدل کے طور پر اس کو نقل کر کے صاحب ہدایہ نے دو باتیں ذکر کیں پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے تأویل کی "لم یحمل الخبث" کہ قلتین نجاست برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ نجس ہو جاتا ہے۔ مگر اس تأویل پر اشکال ہے کہ عام محدثین اس کا یہ مفہوم مراد نہیں لیتے بلکہ وہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ اس پر نجاست اثر انداز نہیں ہوتی۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ صاحب ہدایہ کی یہ تأویل اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ بعض روایات میں ہے "اذا کان الماء قلتین لاینجسه شئ" یا "لم ینجسه شئ" معارف السنن میں ہے کہ صاحب ہدایہ کی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ینجسہ شئ کو روایت بالمعنی مراد لیں کہ راوی نے حدیث کے معنی یہ سمجھا اور ذکر کیا۔ ورنہ اصل الفاظ "لم یحمل الخبث" ہے اور لم یحمل الخبث میں صاحب ہدایہ اور جمہور دونوں کے معنے کا احتمال ہے لیکن لاینجسہ شئ آپ ﷺ کے الفاظ ہوں تو پھر صاحب ہدایہ کی بات غلط ہو گی۔

چوتھی بات: صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس روایت کے بارے میں "ضعفه ابو داؤد" اس پر اعتراض ہے کہ ابو داؤد نے جہاں اس کو ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے ضعیف قرار نہیں دیا بلکہ اس کے موقوف اور مرفوع ہونے میں اختلاف نقل کیا ہے کہ بعض راوی مرفوع اور بعض اس کو موقوف نقل کرتے ہیں صراحۃً ضعیف نہیں کہا ہے اس لئے صاحب ہدایہ نے غلط نسبت کیوں کی؟

اس کا ایک جواب معارف السنن میں ہے کہ شاید ابو داؤد نے اس روایت کی تضعیف کسی اور کتاب میں کی ہو بعض نے دوسرا جواب

یہ دیا ہے کہ صراحۃً ابوداؤد نے ضعیف نہیں کہا، مگر مرفوع یا موقوف کے اختلاف کو ذکر کرنے سے ضعف کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد کے کئی نسخے ہیں ایک نسخہ علی ابن الحسن بن العبد کا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "فیھا من الکلام علی الرجال مالیس فی غیرھا" کہ اس میں رجال پر بحث ہے وہ دوسرے نسخوں میں نہیں ممکن ہے صاحب ہدایہ نے علی بن الحسن کے نسخے سے لیا ہو۔ دلیل یہ ہے کہ صاحب عنایہ نے ابوداؤد کے الفاظ نقل کیے ہیں کہ "قال ابو داؤد حدیث القلتین ممالایثبت"

پانچویں بات: اور احناف نے اس حدیث کو پانی کے مسئلے میں مدار کیوں نہیں بنایا، اس کی مختلف وجوہات ہیں۔

❶ اس کی سند میں اضطراب ہے ولید بن کثیر اس کو نقل کرتے ہیں کہ کبھی محمد عباد بن جعفر کا نام لیتا ہے، اور کبھی محمد بن جعفر بن زبیر کا نام لیتا ہے اب یہ کس سے منقول ہے یہ اضطراب ہے دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ دوسرے راوی کبھی عبداللہ بن عبداللہ بن عمر کا نام لیتا ہے، کبھی عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر کا نام لیتے ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ جواباً یہ کہتے ہیں کہ محمد بن عباد، محمد بن جعفر، عبداللہ بن عبداللہ بن عمر عبیداللہ سب ثقہ ہیں۔ تو اضطراب نہیں بلکہ انتقال من الثقہ الی الثقہ ہے۔ احناف ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کو جواباً کہتے ہیں کہ جس کو آپ انتقال من ثقۃ الی ثقۃ کہتے ہیں محدثین اضطراب اسی کو کہتے ہیں۔

❷ جس طرح سے اس کی سند میں اضطراب ہے اسی طرح الفاظ میں بھی اضطراب ہے علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں مختلف الفاظ ہیں ① اذا کان الماء قلتین ② قلتین اوثلاثا ③ اربعین قلۃ ④ اربعین دلواً ⑤ اربعین غرباً لم یحمل الخبث" جب الفاظ الگ الگ ہیں تو پانی کی مقدار بھی الگ ہوگی۔

❸ اس حدیث کے معنی میں بھی اضطراب ہے کیونکہ قلہ کے کئی معانی ہیں۔ ① مٹکا ② ۔قامۃ الرجل ③ ۔راس الجبل۔ جیسے شعر میں ہے۔

لنقل الصخر من قلل الجبال احب الی من منن الرجال

❹ اس کے مصداق میں بھی اضطراب ہے اگر مٹکا مان لیں تو مٹکے کی مقدار میں اختلاف ہے۔

۔پانچ مشکیزے ۲۔ چھ مشکیزے ۳۔ دس مشکیزے کا ہوتا ہے اب مقدار کتنی ہے تو پانچ سو رطل، چھ سو رطل بلکہ ایک ہزار رطل تک کے اقوال شوافع سے منقول ہیں، تو احناف کہتے ہیں کہ اتنے اضطرابات والی حدیث کو ہم مدار کس طرح بنائیں۔

❺ حدیث کی صحت میں بھی اختلاف ہے، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض دوسرے اس کو صحیح قرار دیتے ہیں مگر امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے شیخ علی بن المدینی اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ، اسماعیل القاضی، اور بن جریر اور دوسرے کئی محدثین نے مطلقاً ضعیف قرار دیا ہے ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابن قیم مرفوعاً اور موقوفاً صحیح قرار دیتے ہیں۔ اس لئے یہ حدیث مدار بنانے کے قابل نہ تھی اس لئے احناف نے مدار نہیں بنایا۔

باب کی حدیث کا مفہوم

احناف کے ہاں اس میں تحدید مقصود نہیں بلکہ تقریب مراد ہے جس طرح ایک روایت میں ہے "قلتین او ثلاثا" کہ تقریباً دو یا تین قلے ہوں۔ اس سے تقریب ہی معلوم ہوتی ہے۔ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ انہوں نے حوض کھدوایا، اس میں اس مقدار پانی ڈالا اس کے قریب ایک طرف وضوء کیا اس میں دوسری طرف اثر نہیں پڑا تو انہوں نے کہا کہ اتنا پانی احناف کے ہاں بھی کثیر ہے۔

دوسرا مفہوم شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ سوال جاری چشموں کے بارے میں تھا ان چشموں میں جریاں ہوتا ہے مگر جریاں ضعیف تھا ان کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ وہ نجس نہیں ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کا مطلب پوچھا میں نے اقوال بتائے مگر وہ راضی نہ ہوئے میں نے پوچھا آپ بتائیں انہوں نے کہا کہ اس کا معنی ہے ''اذا کان الماء جاریا'' میں نے سنا تو بہت خوش ہوا معلوم ہوا اس پانی کا تعلق جاری پانی سے ہے قلیل یا کثیر ہونے سے تعلق نہیں۔

❻ حدیث میں دو قلتین ہیں ① یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال کو علمائے مدینہ نے مذہب بنایا ہے، اگر یہ بھی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح منقول ہوتی تو علمائے مدینہ مانتے، اس لئے اس میں شذوذ ہے۔ ② صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع اس کے مفہوم کے خلاف ثابت ہے۔ وہ اس طرح کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں زمزم میں زنجی گرا، اس کو نکالا گیا پھر سوال ہوا کہ کیا کریں؟ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ پورا پانی نکالا جائے مگر لوگ تھک گئے اور پانی منقطع نہ ہوا تو علماء نے کہا کافی ہے حالانکہ زمزم کا پانی قلتین سے زائد ہوگا، تو یہاں کسی صحابی نے اذا کان الماء قلتین پر فتویٰ نہیں دیا۔

باب كراهية البول فی الماء الراكد

اس باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تم سے کوئی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے (یہ کتنی بعید بات ہے) کہ پھر اس سے وضوء کرے گا۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب قائم کیا ہے ''باب كراهية البول فی الماء الراكد'' اور حدیث میں ہے ''لايبولن أحدكم فی الماء الدائم'' تو راکد اور دائم ہم معنے لفظ ہیں۔ اور ان کا مصداق ایک ہے یا نہیں اس کے متعلق دو قول ہیں۔

ا: بعض محدثین کہتے ہیں کہ حدیث میں دونوں الفاظ حضور ﷺ سے منقول ہیں بعض میں ماء راکد کا لفظ ہے۔ بعض میں ہے ''فی الماء الراكد الذی لايجر'' بعض میں ہے ''فی الماء الدائم'' اس لئے یہ دونوں لفظ ہم معنے ہیں اس سے مراد وہ پانی ہے جو کھڑا ہو اور اس میں جریان نہ ہو۔

❷ بعض محدثین فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ دائم وہ پانی ہے جو کسی وقت بھی منقطع نہ ہوتا ہو یعنی سوکھتا نہ ہو۔ اب جاری ہو یا نہ ہو۔ راکد کہتے ہیں کھڑے پانی کو۔ تو دائم عام ہے راکد سے، یہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے معارف السنن میں منقول ہے۔

دوسری بات: ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راکد اور دائم کو ہم معنی سمجھتے ہیں...... اس لئے ترجمۃ الباب میں ماء راکد کہا اور حدیث میں ماء دائم کے الفاظ نقل کئے۔

تیسری بات: باب کی حدیث دو باتوں پر دلالت کرتی ہے ① ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ باب کی حدیث کا تعلق آداب سے ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ماء راکد میں بول نہ کرے۔ ② معارف السنن میں ہے کہ اس حدیث کا تعلق آداب کے علاوہ احکام کے ساتھ بھی ہے کہ اس میں پانی کا حکم نقل کیا ہے کہ ماء دائم میں کوئی بول نہ کرے کیونکہ یہ کتنی بعید بات ہے (ثم استبعاد کے لئے ہے) کہ پہلے پیشاب کرے اور پھر ضرورت پڑے تو وضوء یا غسل کرے یا پی لے۔ اس لئے معارف السنن میں ہے کہ یہاں ادب کے ساتھ احکام ذکر کئے ہیں، کہ بول کرے تو ماء راکد نجس ہو جائے گا۔ پھر اس کا پینا، اس سے وضوء یا غسل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

چوتھی بات: حدیث میں فرمایا کہ کھڑے پانی میں کوئی پیشاب نہ کرے فرماتے ہیں کہ یہ ماء راکد میں بول کی ممانعت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جاری پانی میں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ قید احترازی نہیں طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ماء جاری میں بول کی ممانعت نہیں ماء

راکد میں بول کی ممانعت ہے کیونکہ ماء راکد میں بول پانی کے اندر تداخل کر جاتا ہے جبکہ جاری میں بول تداخل نہیں کر سکتا۔ یہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے ہے ورنہ عام محدثین کے ہاں یہ مطلب نہیں کہ جاری پانی میں بول جائز اور صحیح ہے، بلکہ ممانعت دونوں صورتوں میں ہے۔ لیکن راکد کی قباحت زیادہ ہے اس لئے راکد کی قید لائی ورنہ یہ کوئی احترازی قید نہیں۔

پانچویں بات: جمہور علماء کے نزدیک ماء راکد میں بول کی ممانعت ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں پانی میں بول ممنوع ہے اسی طرح غائط بھی ممنوع ہے مگر شریعت نے غائط کا ذکر نہیں کیا صرف بول کا ذکر کیا۔ کیونکہ بول کثیر الوقوع ہے جبکہ غائط کو پانی میں ہر ایک برا سمجھتا ہے اس لئے غائط کہیں شاذ و نادر ہوتا ہے لیکن اس کو قبیح سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر چہ وہ بھی بول کی طرح ممنوع ہے داؤد بن علی الظاہری کہتا ہے کہ بول کا ذکر ہے اس لئے بول ممنوع ہوگا۔ لیکن غائط کا ذکر نہیں اس کی ممانعت نہ ہوگی۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ بول میں ممانعت کی علت نجاست ہے وہ غائط میں بھی موجود ہے۔

چھٹی بات: باب کی حدیث پانی کے مسئلے میں احناف کی متدل ہے۔ احناف کا مسلک گزر چکا ہے کہ قلیل پانی وقوع نجاست سے نجس ہوتا ہے۔ کثیر پانی وقوع نجاست سے نجس نہیں ہوتا۔ اور کثیر پانی کی تحدید میں احناف کے قول کے مطابق رائے مبتلا بہ کا اعتبار ہے قلتین کا اعتبار نہیں۔ احناف کی دلیل یہ حدیث ہے اس طرح سے آپ نے فرمایا **"لایبولن احدکم فی الماء الراکد"** یہاں ممانعت کی وجہ بول سے پانی نجس ہو جاتا ہے۔ اور یہاں قطعاً ممانعت ہے قلتین یا اس سے زائد یا اس سے کم کی تحدید نہیں کی۔ اور ایسے مقامات جہاں پانی جمع ہو جائے اور اس میں گھس کر آدمی غسل کرے وہ قلتین سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے قلتین پر مدار نہیں۔

احناف کی دوسری دلیل **"اذا استیقظ أحدکم من منامه فلایغمسن یده فی الاناء حتی یغسله ثلاث مرات"** یہ ممانعت احتمال نجاست کی وجہ سے تھا کیونکہ **"فانه لایدری این باتت یده"** اب یہاں بھی ممانعت مطلقاً ہے۔ قلتین یا اس سے کم یا زیادہ کی تحدید نہیں ہے جبکہ وہاں بھی مسئلہ طہارت کا تھا اس لئے قلتین پر مدار نہیں۔ ان دونوں دلیلوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قلیل پانی وقوع نجاست سے نجس ہو جائے گا اگر چہ کوئی وصف نہ بدلے۔ کیونکہ بول سے یا ہاتھ سے کوئی وصف تبدیل نہیں ہوتا۔

احناف کی تیسری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے **"اذا ولغ الکلب فی اناء أحدکم فاغسلوه سبع مرات"** یہاں پانی کے گرانے کے بعد برتن کے دھونے کا حکم دیا، کیونکہ برتن ولوغ کلب سے نجس ہوا۔ یہاں بھی قلتین پر مدار نہیں رکھا بلکہ مطلقاً منع کیا، دوسرا یہ معلوم ہوا کہ قلیل پانی وقوع نجاست سے نجس ہوگا۔ اگر چہ کوئی وصف نہ بدلے۔

احناف کی چوتھی دلیل ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے۔ **"اذا وقعت الفارة فی سمن أحدکم فان کان جامداً فالقوه وما حولها وان کا مائعا"** اور اگر مائع ہو تو اس صورت میں فرمایا کہ پورے کو گرا دو۔ معلوم ہوا کہ قلیل چیز نجس ہو جاتی ہے وقوع نجاست سے۔ دوسرا یہاں بھی مطلقاً نجاست کا حکم لگایا گیا ہے۔ قلتین پر مدار نہیں رکھا، ان ادلہ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ قلت و کثرت میں مدار رائے مبتلا بہ پر ہے۔

عن همام بن منبه عن ابی هریرة: صحیفہ ہمام بن منبہ احادیث کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہیں سب اس صحیفہ سے نقل کرتے ہیں اس صحیفہ میں سے حدیث نقل کرنے میں محدثین کے مختلف طریقے ہیں کیونکہ اس میں تمام روایات کی سند ایک ہے اب وہ سند صرف پہلی حدیث **"الراحمون یرحمهم الرحمن الخ"** میں مذکور ہے۔ باقی احادیث کے ساتھ سند ذکر نہیں کی۔ اب عام حضرات یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ پہلی حدیث کی سند نقل کر کے بعد میں حدیث نقل کرتے ہیں۔ دوسرا طریقہ مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ سند ذکر کرتے ہیں پھر کہتے ہیں **"فذکر الاحادیث ومنها"** پھر مطلوبہ حدیث نقل کرتے ہیں۔ تیسرا

طریقہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔امام بخاری سند ذکر کرتے ہیں جو پہلی حدیث کے ساتھ ہے اور ساتھ پہلی حدیث کا ٹکڑا بھی ذکر کرتے ہیں۔اس کے بعد مطلوبہ حدیث ذکر کرتے ہیں اس لئے لوگوں کو مشکل پیش آتی ہے "الراحمون الخ" کا ربط کیا ہے، جبکہ یہاں مناسبت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔

باب ماجاء فی ماء البحر أنه طهور

ابو ہریرۃ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں اور کچھ پانی ساتھ لے جاتے ہیں۔اب اگر وضوء کریں تو (پینے کے لئے پانی نہیں بچتا اس لئے) پیاسے ہوتے ہیں۔تو کیا سمندر کے پانی سے وضوء کر سکتے ہیں۔آپ نے فرمایا "هو الطهور ماء ه والحل ميتته" یعنی اس کا پانی پاکی دینے والا ہے، اور اس کا مردار حلال ہے۔

پہلی بات: باب کی حدیث کی ابتداء میں "سأل رجل" معارف السنن میں بعض کتابوں کے حوالے سے منقول ہے کہ بعض نے ان کا نام عبداللہ بعض نے عبد بعض نے عبید اور بعض نے حمید بن صخر نقل کیا ہے، یہ بنو مدلج کے آدمی تھی اس قبیلے کے آدمی مچھیرے تھے۔اور سمندر میں مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے طویل سفر کرتے تھے، اس لئے ان کی ضرورت تھی تب سوال کیا۔

دوسری بات: اس آدمی کو نبی ﷺ سے سوال کی ضرورت کیوں پیش آئی یعنی منشأ سوال کیا تھا؟ اس کے بارے میں محدثین کے اقوال ہیں۔

❶ سنن ابوداؤد میں نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے "لاتركب البحر فان تحت البحر ناراً أوتحت النار بحراً" علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی سے سوال کیا کہ جہنم کہاں ہے، اس نے کہا کہ سمندر کے نیچے، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "ما اراه الاصادقاً" کیونکہ قرآن میں ہے "والبحر المسجور" اب منشاء سوال یہ تھا کہ اس کے نیچے جہنم ہے یا یہ جہنم ہے تو اس کے پانی سے وضوء جائز ہے یا نہیں۔

❷ سمندر کا پانی مالح ہے عام پانی سے اس کا ذائقہ الگ ہے، اس لئے شبہ ہوا کہ اس کا ذائقہ بدلا ہوا ہے، اس لئے اس سے وضوء جائز ہے یا نہیں۔

❸ دنیا کی گندگیاں سیلاب کے ذریعے سمندر میں گرتی ہیں، اسی طرح سمندری جانور اس میں مرتے ہیں، اب ان کی گندگی اندر گرتی ہے، تو کیا وضوء جائز ہوگا؟

تیسری بات: باب کی حدیث میں ہے کہ جب اس آدمی نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "الطهور ماء ه والحل ميتة" اشکال یہ ہے کہ معرف باللام ہونے کی وجہ سے یہ ترکیب حصر پر دال ہے۔جبکہ حصر کا معنی غلط ہے کیونکہ پھر مطلب ہوگا کہ اس کا پانی پاک ہے، اسی کا میتۃ حلال ہے جبکہ سمندر کے علاوہ پانی بھی پاک ہے، خشکی کا میتۃ (ٹڈی) بھی حلال ہے۔

جواب: معارف السنن میں انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ یہاں حصر مقصود نہیں بلکہ یہ تعریف المبتداء بحال الخبر کے لئے ہے۔

چوتھی بات: "والحل ميتته" یعنی سمندر کی میتۃ حلال ہے۔معارف السنن میں ہے کہ احناف کے نزدیک سمندر کے حیوانات میں سے صرف مچھلی حلال ہے، باقی سب جانور حرام ہیں۔شوافع کے کئی اقوال ہیں۔

❶ یہ فرماتے ہیں کہ حیوانات البحر تین قسم پر ہیں ① جن کی نظیر بر میں موجود ہے اور وہ حلال ہے تو وہ حیوانات البحر بھی حلال ہے۔②

وہ حیوانات البحر جن کی نظیر خشکی میں موجود ہے اور حرام میں ہیں، جیسے خنزیر یہ حیوانات البحر حرام ہیں۔ ③ وہ حیوانات جن کی نظیر بر میں موجود نہیں وہ حلال ہیں۔

② حیوانات البحر سب حلال ہیں، سوائے مینڈک کے کیوں کہ احادیث میں مینڈک کے مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شوافع کے ہاں یہ راجح ہے۔

③ سب حیوانات البحر حلال ہیں، سوائے سلحفاۃ اور تمساح کے۔ معارف السنن میں ہے کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک بھی شوافع کے قریب تر ہے۔ خلاصہ یہ ہوا ہے کہ احناف کے ہاں صرف مچھلی حلال ہے۔ شوافع مالکیہ کے ہاں چند اشیاء کے علاوہ حیوانات البحر سب حلال ہیں۔

احناف کی پہلی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ سے حیوانات البحر میں سے مچھلی کے علاوہ کسی حیوان کا کھانا ثابت نہیں اگر حلال ہوتا تو یہ حضرات کھاتے، بیان جواز کے لئے۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک غزوے میں بھیجا اس میں ہے کہ "فالقی لنا البحر دابة یقال له العنبر" فرماتے ہیں کہ اس کو کھاتے رہے، واپس آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بچا ہوا ہو تو مجھے بھی دو تو معلوم ہوا کہ مچھلی کے علاوہ بھی حیوان البحر کھایا۔

جواب: بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ حوت کا لفظ لایا ہے لیکن چونکہ بہت بڑی تھی کہ دس آدمی آنکھ کی جگہ میں بیٹھ جاتے اس لئے اس کو دابہ کہا ورنہ وہ مچھلی ہی تھی۔

دوسری دلیل احناف کی یہ ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ویحرم علیهم الخبائث﴾ اب مچھلی کے علاوہ سب خبائث ہیں۔

شوافع کی دلیل: أحل لكم صيد البحر ای مصید البحر تو صید کو اسم مفعول کے معنے میں لیتے ہیں کہ تمام شکار کی ہوئی چیزیں حلال ہیں۔ احناف جواب دیتے ہیں کہ یہاں مصید مصدر اپنے معنے میں ہے یہاں حلت اور حرمت کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ محرم کے لئے کون سے افعال جائز ہیں کون سے نہیں تو فرمایا کہ دریا میں شکار کر سکتے ہو اگرچہ حالت احرام میں ہو اس لئے اس کو مصید کے معنے میں لینا قرآن کے مقصود کے خلاف ہے۔

پانچویں بات: سمک طافی کا مسئلہ: طافی اس مچھلی کو کہتے ہیں کہ سمندر میں مرجائے اور الٹی ہو کر پانی کے اوپر آجائے اس کو متعدد صورتیں ہیں۔

① وہ سمک طافی جو بیرونی اثر کی وجہ سے مرگئی ہو۔ مثلاً گرمی یا سردی سے یا ٹکرا کر مرگئی یہ بالاتفاق حلال ہے اس کا کھانا جائز ہے۔

② وہ سمک طافی جو خود بخود حتف انفہ بغیر خارجی اثر کے مرجائے اس کے متعلق اختلاف ہے، احناف کے ہاں یہ جائز نہیں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے احناف کی دلیل ہے۔ "واما مات فطفی فلاتا کلوه" ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اثر منقول ہے۔ جس سے جمہور کی تائید ہوتی ہے مگر اس میں اضطراب ہے دوسرا حدیث مرفوع کے مقابلے میں اقوال صحابہ مقبول نہیں۔

چھٹی بات: صحابی نے پوچھا کہ "افنتوضأ بماء البحر" اب جواب میں صرف نعم کہتے تو کافی ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا لمبا جواب کیوں دیا؟

جواب: اگر نعم کہتے تو تخصیص کا شائبہ ہوتا دوسرا وضوء کا جواز معلوم ہوتا مگر شبہ کی وجہ معلوم نہ ہوتی۔

ساتویں بات: اس نے فقط وضوء کا سوال کیا تھا، جواب میں نبی ﷺ نے "الحل میتته" کی زیادتی کیوں کی؟
جواب ❶: یہ زیادتی جواب کے محاسن میں سے ہے۔ مثلاً جب دیکھا کہ وضوء کے مسئلے سے بھی جاہل ہے، جبکہ یہ عام ہے تو حلال اور حرام کا مسئلہ کیسے جانتا ہوگا۔ جبکہ اس کو کھانے کی بھی ضرورت تھی، اس لئے زیادتی کی۔
جواب ❷: سمندر میں وضوء کی طرح کھانے کا بھی مسئلہ ہے، اب اس کو دوبارہ کھانے کا مسئلہ دریافت کرنا پڑے گا، اس لئے شفقتاً علی السائل زیادتی کی تاکہ دوبارہ اس کو پوچھنا نہ پڑے۔
جواب ❸: سائل کے ذہن میں جو شبہ تھا، کہ اس میں جانور مرتے ہیں اس لئے وضوء جائز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "الحل میتته" ای الطاهر میتته" کہ اس کا میتہ طاہر ہے۔ اس سے سمندر کا پانی نجس نہیں ہوتا، اس لئے اس سے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ پانی نجس نہیں ہوتا۔ دوسرا شوافع تمام حیوانات کا حلت کے لئے اس سے استدلال حاصل کرتے ہیں۔ وہ نہیں کر سکتے کیونکہ حل بمعنی طہر کے ہے۔ یہ علامہ خطابی (شافعی) نے لکھا ہے اور حدیث میں حل طہر کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں ہے "فلما بلغت سد الصهباء حلت ای طهرت فبنیٰ علیها" (سدا الروحاء)

باب التشدید فی البول

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا۔ فرمایا، ان دونوں قبروں والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے معاملے میں سزا نہیں دی جا رہی ہے بلکہ یہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھایا کرتا تھا۔
پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ اس ترجمۃ الباب اور حدیث کی غرض یہ ہے کہ بول سے طہارت حاصل کرنی چاہیئے۔
دوسری بات: معارف السنن میں ہے کہ نبی ﷺ کے واقعات کے بارے میں تین احادیث مروی ہیں، ایک ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ روایت دوسری صحیح ابن حبان میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ اسی قسم کے واقعے میں وہاں یہ بات بھی ہے کہ شاخ لی دو ٹکڑے کر کے اس کو دونوں قبروں پر گاڑھ کر فرمایا۔ کہ جب تک یہ ٹکڑا سوکھ نہ جائے شائد ان سے عذاب میں تخفیف ہو۔ تیسری روایت صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل حدیث ہے کہ آپ ﷺ سفر میں تھے۔ دو قبروں سے گزر ہوا فرمایا، ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے، پھر دو شاخوں کو کاٹ کر ان کے قبروں پر گاڑھ دیا۔
اب یہ تینوں واقعات الگ الگ ہیں۔ اس میں پہلا قول یہ ہے کہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ اور علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے معارف السنن میں ہے۔ کہ اس قسم کے واقعات میں تعدد واقعہ یا اتحاد واقعہ کا قول یقین و جزم کے ساتھ کرنا یہ ممکن نہیں۔ اس لئے اسمیں اتحاد اور تعدد دونوں کا احتمال ہے۔
دوسرا قول یہ ہے کہ دو واقعات ہیں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات جو مسلم میں ہے۔ الگ واقعہ ہے جو سفر میں پیش آیا، اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو منقول ہے یہ ایک ہی واقعہ ہے جو مدینہ کا واقعہ ہے سفر کا واقعہ نہیں، یہ دوسرا قول علامہ نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا۔
تیسری بات: باب کی حدیث میں ارشاد ہے کہ ان کو عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس حدیث سے عذاب کا ثبوت ملتا ہے کہ مردہ کو جب قبر میں رکھا جائے تو قیامت سے پہلے اس عالم برزخ میں عذاب یا ثواب ملتا ہے۔ عذاب قبر پر صراحۃً یعنی ثبوت پر دس احادیث دلالت کرتی ہے۔ اہل سنت کا بھی یہی مسلک ہے کچھ معتزلہ جن میں بشر بن مریسی بھی ہیں یہ عذاب قبر کے منکر ہیں باقی معتزلہ اثبات عذاب قبر کے قائل ہیں۔

اشکال: نبی ﷺ نے فرمایا "وما یعذبان فی کبیر" اور بعض مفصل روایات میں ہے "بلٰی" اور بعض میں ہے "بلٰی انه لکبیر" اب ایک میں نفی دوسرے میں اثبات ہے لہٰذا تعارض ہے۔

جواب: یہ دونوں (بول سے نہ بچنا اور مشی بالنمیمہ) گناہ کبیرہ ہیں۔ اور آپ ﷺ نے جو فرمایا "وما یعذبان فی کبیر" یہ ان کے کبیرہ ہونے کی نفی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گناہ ہونے کے اعتبار سے تو کبیرہ ہیں۔ مگر احتراز کے اعتبار سے کبیرہ نہیں یعنی اتنی بڑی چیز نہیں جس سے بچنا ناممکن ہو بلکہ بچنا آسان تھا اس لئے تعارض نہیں تعارض تب ہوتا جب جملے سے کبیرہ ہونے کی نفی مقصود ہوتی۔

چوتھی بات: اشکال یہ ہوتا ہے کہ بول کی چھینٹوں کا لگنا گناہ کبیرہ کیسے ہے؟ جبکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رشاش البول معفو ہے۔

جواب: رشاش البول گناہ صغیرہ ہے مگر جب کوئی صغیرہ پر اصرار کرے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے، اس لئے اس کو کبیرہ کے ضمن میں داخل کر کے نقل کر دیا۔

پانچویں بات: دوسری احادیث میں بھی ہے اور اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ بول کو عذاب قبر سے مناسبت ہے۔ کہ بول سے نہ بچنا، عذاب قبر کا باعث بنتا ہے، اب بول کو عذاب قبر سے کیا مناسبت ہے؟ علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے مناسبت تلاش کی تو معراج الدرایہ کے حوالے سے بحر الرائق میں (۱۱۴/۱) پر منقول ہے کہ احتراز عن البول فی الاستنجاء۔ منازل طہارت میں سے پہلی منزل ہے اور قبر آخرت کے منازل میں سے پہلی منزل ہے، تو طہارت کی پہلی منزل کی رعایت نہیں کی اس لئے اس کو آخرت کی پہلی منزل میں سزا ملے گی۔

چھٹی بات: حدیث میں ہیں "کان لایستنزہ من البول" بعض طرق میں ہے لایستبری اور بعض لایستتر بعض میں لایتقی کا لفظ ہے۔ لایستتر کے علاوہ باقی سب الفاظ ہم معنی ہیں۔ لایستتر کا کیا معنی ہے۔

① لایستتر فی وقت بوله۔ بول کے وقت عورت نہیں چھپاتا تھا۔ ② خطابی نے لکھا ہے اس کا معنی ہے "لایجعل بینه وبین البول سترة" یعنی استنجاء بالماء اور استنجاء بالحجر نہیں کرتا تھا۔

ساتویں بات: دوسرے کے بارے میں فرمایا "فکان یمشی بالنمیمة الخ" نمیمہ کہتے ہیں "نقل کلام الغیر علی قصد الاضرار" یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہیں۔ احیاء العلوم کے حوالے سے امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اچھی باتیں نقل کی ہیں۔ مسلم (۷۱/۱) "باب بیان تغلیظ النمیمة" میں ہے کسی کی بات اس تک لے جائے جس کے بارے میں وہ بات کہی گئی ہے۔ کہتا ہے کہ فلاں آدمی یہ کہہ رہا تھا۔ نمیمہ صرف یہ نہیں بلکہ اصل تعریف یہ ہے "کشف مایکرہ کشفه" اور اسی طرح "کراهة المنقول والمنقول عنه" آخر میں لکھا ہے کہ ہر وہ آدمی جس کے پاس چغلخور بات پہنچائے اب اس پر چھ باتیں لازم ہیں:

❶ آپ اس کی تصدیق نہ کریں کیونکہ نمام فاسق ہے اور فاسق کے قول کی تصدیق شرعاً جائز نہیں۔

❷ آپ اس نمام کو روکیں کہ یہ گناہ ہے ایسا نہ کرو یہ بہت برا کام کر رہے ہو ❸ اس نمام سے بغض فی اللہ کریں کیونکہ وہ اللہ کے ہاں مبغوض ہے اور جو اللہ کا مبغوض ہے اس سے بغض واجب ہے ❹ جس کی بات نقل کر کے آپ تک لا رہا ہے آپ اس آدمی کے بارے میں بدگمانی نہ رکھیں ❺ اگر کوئی کہے کہ ہم نمام کو فاسق سمجھتے ہیں لیکن چلو تحقیق کر لیں تو فرمایا یہ تحقیق بھی جائز نہیں ❻ جس چیز سے نمام کو روک رہا ہے خود بھی اس کو نہ کریں اور اس کی چغلی کسی اور کو بھی نہ کرے۔

آٹھویں بات: آپ نے جو ٹہنی قبروں پر گاڑھی اس میں محدثین حضرات کا کلام ہے کہ قبر پر شاخ گاڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ قاضی عیاض وغیرہ کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ عذاب قبر کی تخفیف میں شاخ کو دخل نہ تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کی شفاعت موقت

بھی حضور ﷺ کا ہاتھ لگا اس کی وجہ سے عذاب قبر میں موقت تخفیف ہوئی اسلئے یہ کہنا کہ پھول وغیرہ تسبیح پڑھیں گے سزا کم ہوگی یہ جائز نہیں کیونکہ پھولوں یا شاخوں کی اپنی کوئی تاثیر نہیں۔ دوسرا پھول بھی بزرگوں کے قبور پر ڈالتے ہیں جبکہ عذاب قبر کی تخفیف پیدا کرنا اس کی عام لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

باب ماجاء في نضح بول الغلام قبل أن يطعم

ام قیس بنت محصن سے روایت منقول ہے فرماتی ہیں کہ میں اپنے بچے کو آپ ﷺ کے پاس لیکر آئی جو ابھی تک کھانا نہ کھاتا تھا اس نے رسول اللہ ﷺ پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی منگوایا اس پر چھڑک دیا۔

پہلی بات: یہاں مسئلہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ لڑکا پیشاب کر دے تو اس کا طریقہ تطہیر کیا ہے؟

دوسری بات: پہلی تمہید یہ ہے کہ لڑکے کا بول ہو یا لڑکی کا کھانے سے پہلے کا ہو یا بعد کا ہو دونوں صورتوں میں دونوں کا بول بالاتفاق نجس ہے۔ فقط ابن بطال اور قاضی عیاض نے شافعی کی طرف قول منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک مدت رضاعت میں لڑکے کا بول پاک ہے مگر نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی ہے کہ "ھذہ حکایة باطلة" اصل بات یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بول غلام کے طریقہ تطہیر میں آسانی ہے اس لئے انہوں نے سمجھا کہ شاید ان کے ہاں پاک ہوگا۔

دوسری تمہید یہ ہے کہ تمام ائمہ متفق ہیں کہ بول غلام کے طریقہ تطہیر میں اختلاف تب ہے جب وہ مدت رضاعت میں ہو لیکن وہ کھانا کھانے لگ جائے تو پھر لڑکے اور لڑکی کے بول میں کوئی فرق نہیں اور پھر دونوں کا طریقہ تطہیر عام نجاسات کی طرح ہے۔

تیسری بات: آپ ﷺ کے کپڑوں پر جو بول کیا تو آپ نے اس پر پانی چھڑک دیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ لڑکا بول کرے تو طریقہ تطہیر کیا ہے؟ کیا لڑکے اور لڑکی کے بول کے طریقہ تطہیر میں فرق ہے یا نہیں؟ اس میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کا ہے ان کے ہاں دونوں کا بول عام نجاسات کی طرح ہے۔ طریقہ تطہیر میں کوئی فرق نہیں مگر مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ موطا امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے ثابت ہوتا ہے کہ لڑکے کے بول کے طریقہ تطہیر میں احناف کے ہاں بھی کچھ تخفیف ہے اگرچہ بہتر یہ ہے کہ عام نجاسات کی طرح دھویا جائے اگر صرف پانی بہادے تو پاکی حاصل ہو جائے گی۔

دوسرا قول امام شافعی، احمد، اسحاق اور اکثر محدثین رحمہم اللہ کا ہے ان کے نزدیک لڑکے اور لڑکی کے طریقہ تطہیر میں فرق ہے کہ لڑکی کے بول کو عام نجاسات کی طرح دھویا جائے گا لیکن لڑکے کے بول پر صرف پانی چھڑکنا کافی ہے پھر شوافع کے دو قول ہیں: ① اتنا پانی چھڑکے کہ پانی غالب ہو ② پانی کا غالب ہونا ضروری نہیں۔

تیسرا قول امام اوزاعی اور ایک روایت میں مالک وشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ مدت رضاعت میں دونوں کے بول کا طریقہ تطہیر میں تخفیف ہے اور صرف پانی چھڑکنا کافی ہے اصل اختلاف قول اول اور قول ثانی کا ہے۔ شوافع باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ اس میں ہے "فدعا بماء ورشه علیه" ایک روایت میں ہے "فنضحه بماء" اس لئے یہ کہتے ہیں کہ دھونا ضروری نہیں صرف چھڑکنا کافی ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ حدیث میں نضح یا رش کا لفظ غسل کے معنی میں منقول ہے۔ ترمذی میں باب المذی یصیب الثوب میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مذی لگ جائے تو کہا فنضحه بالماء یہاں سب کے ہاں نضح غسل کے معنی میں ہے۔ صحیح مسلم میں باب غسل الدم کے

اندر حدیث ہے کہ کپڑوں کو خون لگ جائے تو عورت کو حکم دیا "فانضحیه" اسی طرح ترمذی میں ہے کہ حیض کا خون لگے تو "فانضحیه بالماء" یا "فرشی علیه الماء" کے الفاظ ہیں اب احناف کہتے ہیں ان جگہوں میں آپ کے ہاں بھی نضح اور رش غسل کے معنی میں ہے تو اسی طرح یہاں بھی غسل کے معنی میں ہے۔

شوافع کی دوسری دلیل یہ ہے کہ "فدعاء بماء فرشه ولم یغسله" احناف جواب دیتے ہیں کہ یہاں نفس غسل کی نفی نہیں کی بلکہ غسل مؤکد کی نفی ہے۔ دلیل مسلم کی روایت میں ہے کہ "لم یغسله غسلاً" قاعدہ ہے کہ کلام مؤکدہ پر نفی داخل ہو تو نفی قید کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس لئے معنی ہے کہ تاکید کے ساتھ نہیں دھرایا۔

چوتھی بات: نبی کریم ﷺ سے ان احادیث میں صرف اتنا ثابت ہے کہ مدت رضاعت میں لڑکی لڑکے کے بول کے طریقہ تطہیر میں فرق ہے لڑکے کے بول کے طریقہ تطہیر میں تخفیف ہے اسکی کیا حکمت ہے۔ معارف السنن میں ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ عرب لوگ عام طور پر بچوں کو گود میں اٹھاتے تھے۔ اس میں عموم بلویٰ تھا لیکن لڑکیوں کو نہ اٹھاتے تھے اس لئے ان میں عموم بلویٰ نہیں ہوتا۔ اس لئے لڑکوں میں تخفیف کی ضرورت پیش آئی تو شریعت نے تخفیف کا حکم دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑکے کا پیشاب جب کپڑے پر لگے تو پھیلتا ہے، لڑکی کا نہیں پھیلتا۔ یا اس کا الٹ ہے اس لئے تخفیف کی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ لڑکے کی طبعیت میں حرارت ہوتی ہے اس لئے اس کے بول میں بو نہیں ہوتی اس لئے اس کے طریقہ تطہیر میں تخفیف ہے۔ لیکن لڑکی کی طبعیت میں حرارت ہوتی اس لئے اس کے بول میں بدبو ہوتی ہے اس لئے خوب دھونے کا حکم دیا۔

باب ماجاء فی بول مایو کل لحمه

اس باب میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت منقول ہے کہ عرینہ کے لوگ مدینہ آئے اور مدینہ کی آب و ہوا انہوں نے ناموافق پائی۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ مدینہ سے باہر جو صدقہ کے اونٹ ہیں ان کے پاس جائیں اور ان کا دودھ اور پیشاب پئیں۔ جب ٹھیک ہوگئے تو انہوں نے راعی کو قتل کر دیا اونٹ لے گئے، اور مرتد ہوگئے، آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا وہ پکڑ کر لے آئے، آپ ﷺ کے حکم پر دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا۔ ان کی آنکھیں پھوڑ دیں اور ان کو پتھریلی زمین میں ڈال دیا گیا۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک زمین کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا یہاں تک کہ مر گئے۔

پہلی بات: اس حدیث میں ہے "ان ناساً من عرینة" احادیث میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض احادیث میں اس کے یہ الفاظ بھی ہیں "ان اناساً من عرینة وعکل"، اور بعض میں "ان اناساً من عرینة او عکل" کہتے ہیں کہ اصل میں یہ آٹھ آدمی تھے ان میں سے چار عرینہ قبیلے کے تھے اور تین قبیلہ عکل کے تھے۔ اور ایک دخیل تھا دونوں میں کسی قبیلے کا نہ تھا۔ تو بعض روایات میں اکثر کو دیکھ کر "من عرینة" کہا اور بعض نے دونوں کا ذکر کیا ہے "من عکل و عرینة" یہ بھی صحیح ہے۔ اور جس میں "او عکل" آیا ہے او تردید یہ نہیں بلکہ او عاطفہ کے معنی میں ہے اس لئے ان روایات میں تعارض نہیں ہے۔

دوسری بات: اس حدیث میں ہے کہ مدینہ میں آئے تو "فاجتووها" جویٰ کہتے ہیں پیٹ کی بیماری کو جس سے پیٹ پھول جاتا ہے جب یہ لمبی ہو جائے تو اس کو مرض جویٰ کہتے ہیں بعض نے کہا کہ کوئی آدمی شہر میں گیا اور شہر پسند نہ آئے اگرچہ آب و ہوا موافق ہو اس کو جویٰ کہتے ہیں، اور اگر شہر پسند آ گیا آب و ہوا ناموافق ہو اس کو استنبال کہتے ہیں۔

تیسری بات: نبی اکرم ﷺ نے ان کو اہل صدقہ کی طرف بھیجا۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنے اونٹوں کی طرف بھیجا یا یہاں بھی

صدقات کے اونٹوں کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ سے باہر دیہات میں چراگاہ میں اونٹ رکھے تھے، اور نبی کریم ﷺ کو مال غنیمت میں جو اونٹ ملے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے اونٹوں کو ان بیت المال کے اونٹوں میں رکھا تھا، واقعہ یہ ہے کہ مدینہ سے جب آپ ﷺ نے ان کو بھیجا تو ان کے ساتھ اپنا راعی اور اونٹ بھیجے۔ وہاں جا کر جب انہوں نے دودھ پیا اور صحیح ہو گئے تو راعی (یسار یا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا) اس کو قتل کر دیا اور اونٹ لے گئے آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا وہ پکڑ کر لے آئے۔

اس حدیث میں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: بول ماپوکل لحمہ پاک ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ماکول اللحم جانوروں کا بول پاک اور طاہر ہے بلکہ ابن العربی نے لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان جانوروں کا گوبر بھی پاک ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، اور بعض فقہاء کے ہاں ماکول اللحم جانوروں کا بول نجس ہے۔ قول اول والے باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اشربوا من ابوالها و البانها" معلوم ہوا کہ بول پاک ہے اس لئے پینے کا حکم دیا۔

قول ثانی والوں کی دلیل حدیث جلالۃ ہے اس میں ہے "نهى رسول الله ﷺ عن اكل الجلالة والبانها" جلالۃ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلیوں میں پھرے اور نجاست کھائے اور گلیوں میں عام طور پر جانوروں کا گوبر وغیرہ ہوتا ہے۔ اب آپ ﷺ نے جلالہ جو کہ حلال جانوروں کا گوبر کھاتا ہے اس کے گوشت سے منع کیا معلوم ہوا گوبر نجس ہے اس لئے اس کے کھانے والے جانوروں کا گوشت بھی ممنوع ہوا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے "استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه" اس حدیث میں مطلقاً بول سے پاکی کا حکم دیا انسان یا جانور ماکول اللحم یا غیر ماکول اللحم کی قید نہیں بلکہ عموم کے اعتبار سے سب کو شامل ہے اس لئے سب کا بول نجس ہے۔

باب کی حدیث میں یہ تاویل کرتے ہیں ❶ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "اشربوا من البانها و ابوالها" یہاں شرب کا حکم دودھ کے لئے ہے باقی عبارت تھی "اشربوا من البانها و استنشقوا من ابوالها" حکماء کہتے ہیں کہ اس مرض کے لئے اونٹوں کا پیشاب سونگنا مفید ہے۔ پھر "علفتها تبناً بارداً" کے قاعدے سے "استنشقوا" کو حذف کر دیا۔ دلیل وہ احادیث ہیں جن میں فقط البان پینے کا حکم ہے ابوال کا ذکر نہیں۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو ابوال کے پینے کا حکم دیا ہے یہ بطور تداوی کے ہے اور حالت اضطرار میں حکم دیا۔ اس لیے یہ اس کی دلیل نہیں عرب میں مشہور تھا کہ اونٹ کا پیشاب پیٹ کے بیماری کے لئے مفید ہے کیونکہ یہ بعض خاص بوٹیاں کھاتا ہے تو اضطراری حالت کا حکم الگ ہوتا ہے اور اختیاری حالت کا حکم الگ ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ: اگر نبی ﷺ نے شرب ابوال کا حکم بطور تداوی کے دیا تو کیا تداوی بالحرام جائز ہے یا نہیں۔ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خمر کے علاوہ تداوی بالحرام جائز ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ تداوی بالحرام مطلقاً جائز ہے شرائط کے ساتھ۔ ایک شرط یہ ہے کہ دیندار طبیب دوا تجویز کرے کہ اس مرض کی دوا فلاں حرام چیز ہے دوسری شرط یہ ہے کہ اس حرام چیز کے علاوہ اس مرض کی دوسری کوئی دوا نہ ہو تیسری شرط یہ ہے کہ ظن غالب ہو کہ اس دوائی سے صحت مل جائے۔

تیسرا مسئلہ: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جب یہ لوگ لائے گئے تو آپ ﷺ نے دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا آنکھوں میں گرم سلائی

ڈالی۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے ساتھ یہ عمل اس لئے کیا کہ انہوں نے بھی راعی کے ساتھ یہ کیا تھا۔ یہاں مماثلت فی القصاص کا مسئلہ ہے اس میں اختلاف ہے۔ ① مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، اور احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مماثلت فی القصاص ہوگا کہ جس طرح قاتل نے قتل کیا تھا اس قاتل کو بھی اسی طرح مارا جائے گا۔ البتہ شوافع کے ہاں دو صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ قاتل نے جلایا تھا تو قاتل کو نہ جلائیں گے کیونکہ تعذیب بالنار جائز نہیں۔ دوسرا یہ کہ قاتل نے حرام کاری سے قتل کیا ہو تو مماثلت نہیں ہوگی۔ ② امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کے ہاں قصاص میں مماثلت نہیں بلکہ قصاص صرف تلوار سے لیں گے۔ کیونکہ ابن ماجہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حدیث نقل کی ہے "لاقود الابالسیف" اور باب کی حدیث سے جو مماثلت معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کئی جرم تھے۔ ایک یہ کہ مرتد ہو گئے دوسرا راعی کو قتل کیا تھا، تیسرا ڈاکہ ڈالا تھا اور اونٹ لے گئے، تو گویا یہ ساعی بالفساد فی الارض تھے۔ اس لئے ہاتھ پاؤں کاٹے اور آنکھوں میں گرم سلائی ڈالی یہ سیاسۃ تھا تاکہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے دوسری وجہ یہ ہے جو محمد بن سیرین سے ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ حدود کے حکم کے نزول سے پہلے کا ہے لیکن جب حدود کا حکم اترا تو مماثلت کا حکم ختم ہوا۔

باب ماجاء في الوضوء من الريح

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وضوء نہیں ہے مگر ہوا سے یا آواز سے...... آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی مسجد میں ہو اور الیتین کے درمیان ہوا محسوس کرے تو مسجد سے نہ نکلے یہاں تک کہ بو نہ سونگھے یا آواز نہ سنے...... اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کی نماز کو قبول نہیں کرتے جب وہ بے وضوء ہو یہاں تک کہ وضوء نہ کر لے۔

پہلی بات: تیسری حدیث کا مضمون پوری امت میں اجماعی ہے کہ سب کے ہاں بے وضوء آدمی کی نماز وضوء کئے بغیر قبول نہیں ہوتی کیونکہ قرآن میں ہے ﴿یا ایها الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلاة فاغسلوا وجوهكم الخ﴾ یہاں بالاتفاق قید محذوف ہے "وانتم محدثون"

دوسری بات: پہلی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس میں ہے "لاوضوء الامن صوت اوریح" یعنی وضوء تب ہوگا جب آواز آئے یہ بدبو آئے۔

اشکال: یہاں سے حصر معلوم ہوتا ہے جبکہ اس باب میں حدیث ان دو کے علاوہ بھی گئی ہیں۔

جواب: یہ حصر مکان کے اعتبار سے ہے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے "اذا كان أحدكم في المسجد" اور مسجد میں نہ کوئی بول کر سکتا ہے اور نہ غائط بلکہ مسجد میں صرف ہوا سے وضوء ختم ہوتا ہے چاہے وہ ہوا بالصوت ہو یا بغیر الصوت ہو۔

تیسری بات: علامہ خطابی ابو داؤد کی شرح معالم السنن اور ابن العربی ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ "فلايخرج حتى يسمع صوتاً اويجد ريحاً" یہ کنایہ ہے تیقن سے ورنہ کوئی بہرہ ہو یا سونگھ نہ سکتا ہو تو یہ مطلب نہیں کہ ان پر بالکل وضوء واجب نہ ہوا اس لئے سن لینا یا سونگھ لینا مراد نہیں بلکہ تیقن سے کنایہ ہے۔

چوتھی بات: عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر عورت کے قبل سے ہوا نکلے تو وضوء واجب ہوگا۔ احناف کہتے ہیں کہ عورت مفضاۃ ہو پھر اگر قبل سے ہوا نکلے تو وضوء واجب ہے۔ لیکن اگر مفضاۃ نہ ہو تو احناف کے کئی اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وضوء واجب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وضوء واجب نہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر بو آئے تو وضوء واجب ہے۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حدث میں شک ہو تو اس پر وضوء واجب نہیں یہاں تک کہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اس پر قسم کھا سکے۔ اسی سے فقہاء نے قاعدہ نکالا ہے۔ "اليقين لايزول بالشك"

باب الوضوء من النوم

اس باب میں عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر کی ہے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت سجد میں سوئے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ آپ کے خراٹوں کی آواز آئی، پھر کھڑے ہوئے نماز پڑھنے لگے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ آپ سو چکے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضوء واجب نہیں ہوتا مگر اس پر جو چت لیٹ جائے کیونکہ اس سے استرخاء ہوجاتا ہے۔

دوسری روایت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سوجاتے تھے پھر اٹھتے تھے نماز پڑھتے اور وضوء نہیں کرتے تھے۔

پہلی بات: ''باب ماجاء فی الوضوء من الریح'' سے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسباب حدث شروع کئے۔

دوسری بات: اسباب حدث میں سے بعض اتفاقی ہیں بعض اختلافی ہیں۔بعض کے ہاں وہ ناقص ہیں اور بعض کے ہاں نہیں۔

تیسری بات: اس پہلی حدیث کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ حدیث قابل اعتبار ہے یا نہیں، بعض محدثین کے ہاں قابل اعتماد ہے، بعض کے ہاں نہیں۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض دوسرے محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث دو وجوہات کی بناء پر صحیح نہیں۔ ① اس کی سند میں ایک راوی ہے ابوخالد الدالانی جس کا نام یزید بن عبدالرحمن ہے اس پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ ② اس حدیث میں علت ہے۔کیونکہ اس میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اس سوال اور جواب میں مطابقت نہیں اس لئے یہ حدیث معلول ہے۔

بعض محدثین کے ہاں یہ حدیث صحیح ہے۔ابوخالد الدالانی کو بعض محدثین یحییٰ بن معین رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ثقہ کہا ہے۔باقی یہ کہ یہ حدیث معلول ہے تو مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کسی روایت کو متن کی بنیاد پر معلول کہنا فقہاء کا کام ہے۔محدثین کا نہیں، محدثین کا کام صرف سند سے ہے۔دوسرا تم نے کہا کہ سوال و جواب میں مطابقت نہیں یہ صحیح نہیں بلکہ مطابقت موجود ہے کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں یہ کہتے کہ میں نبی ہوں اور نبی کی نیند سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔اس سے جواب تو ہوجاتا مگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ نیند سے کس حالت میں وضوء ٹوٹتا ہے کس حالت میں نہیں ٹوٹتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کس حالت میں وضوء ٹوٹتا ہے اور کس حالت میں نہیں ٹوٹتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا وضوء نہیں ٹوٹا۔

چوتھی بات: نیند کے مسئلے کے متعلق اختلاف ہے، کہ کس حالت میں نیند ناقص ہے کس میں نہیں۔معارف السنن میں اس کے بارے میں نو اقوال ہیں لیکن اگر ان کو ترتیب دی جائے تو کم بنتی ہیں ان کی تعداد۔

❶ نیند سے کسی حالت میں وضوء نہیں ٹوٹتا۔یہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اور ائمہ میں سے اوزاعی سے منقول ہے۔

❷ نیند مطلقاً ناقض وضوء ہے قلیل ہو یا کثیر، استرخاء مفاصل ہو یا نہ ہو، لیٹ کر سوئے یا کھڑے ہوکر ہر حال میں وضوء ٹوٹ جائے گا یہ قول ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، حسن، مزنی، ابن راہویہ، ابن منذر، اور ابوعبید القاسم بن سلام سے منقول ہے۔

❸ وہ نیند جو کثیر ہو اور مطبق ہو اس سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے یہ جمہور کا مسلک ہے۔اب وہ نیند جو کثیر اور مطبق (عقل پر غلبہ آئے) ہو کونسی ہے اس میں اختلاف ہے۔بعض کہتے ہے کہ جو نیند نماز کے کسی ہیئت پر ہو وہ مطبق اور کثیر نہیں بعض کہتے ہیں کہ آدمی کا مقعد متمکن علی الارض ہو وہ نیند مطبق اور کثیر نہیں۔بعض نے کہا کہ اضطجاع کے علاوہ سب حالتیں مطبق اور کثیر نہیں باب کی حدیث جمہور کے مسلک کی مؤید ہے کیونکہ اس میں فرمایا ''لا وضوء الا علی من نام مضطجعًا'' اب لیٹ کر سونا استرخاء مفاصل کو مستلزم ہے اس لئے وضوء ٹوٹ جائے گا۔

پانچویں بات: جمہور کا مسلک باب کی حدیث کے مطابق ہے۔ ان حضرات کا اپنے مسلک کو اس باب کی حدیث کے مطابق رکھنا اس حدیث کی صحت کی علامت ہے۔
چھٹی بات: باب کی حدیث سے فقہاء نے قاعدہ نکالا ہے کہ ہر حکم کی بناء ہوتی ہے سبب پر اور کبھی سبب ظاہر ہوتا ہے اور کبھی مخفی ہوتا ہے۔ جہاں حکم کی بناء ہو سبب مخفی پر تو شریعت مدار رکھتا ہے سبب ظاہری پر جو سبب مخفی پر علامت ہو۔ جیسے وجوب غسل کے لئے اصل سبب خروج منی ہے مگر کسی نے دخول کیا لیکن خروج منی نہیں ہوا یہ مخفی سبب ہے اس لئے شریعت نے سبب ظاہری (دخول حشفہ) پر مدار رکھا۔ اسی طرح یہاں بھی حدث کا اصل سبب خروج ریح تھا مگر یہ سبب مخفی تھا کیونکہ سونے کی حالت میں خروج ریح کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے شریعت نے حکم کا مدار سبب ظاہری پر رکھا کہ جہاں بھی نیند مستلزم ہو استرخاء مفاصل کو اس صورت میں ناقض ہوگا۔

باب الوضوء مما غیرت النار وباب ترک الوضوء مما غیرت النار

اس باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وضوء اس چیز کے کھانے سے لازم ہے جس کو آگ نے چھوا ہو۔ اگرچہ پنیر کے چند ٹکڑے کھالو۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ اگر پکا ہوا تیل لگائیں تو کیا وضوء لازم ہوجائے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے حدیث بیان کی ہے اس لئے مثالیں نہ بیان کرو۔
دوسرے باب میں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ میں اور آپ ﷺ انصاری عورت کے دعوت پر گئے انہوں نے بکری ذبح کی آپ ﷺ نے کھایا ظہر کی نماز پڑھی پھر واپس آئے گوشت کھایا پھر عصر پڑھی اور وضوء نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا جبکہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء لازم ہے۔
پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز ناقض وضوء ہے یا نہیں۔ تو روایات میں اختلاف ہے اختلاف اس لئے ہوا کہ جمہور فقہاء محدثین کے نزدیک وضوء مما مست النار منسوخ ہے کیونکہ سنن ابوداؤد میں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے "کان آخر الامرین عن رسول اللہ ﷺ ترک الوضوء مما مست النار" ابوداؤد نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ آخر الامرین سے علی الاطلاق آخر الامرین مراد نہیں۔ بلکہ خاص واقعہ (جو ترمذی میں دعوت والا واقعہ ہے) میں آخر الامرین مراد ہے۔ مگر ابن حزم ظاہری نے لکھا ہے کہ ابوداؤد کی بات غلط اور بلا دلیل ہے۔ ترمذی نے جو نقل کیا ہے وہ الگ واقعہ ہے اور ابو داؤد نے جس کو نقل کیا ہے وہ الگ واقعہ ہے یہ نہیں کہ ابو داؤد والا واقعہ ترمذی والے واقعہ کا اختصار ہو۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ وضوء مما مست النار کا حکم استحبابی ہے کیونکہ جب انسان کھاتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ مشابہت ختم ہوجاتی ہے اس لئے دوبارہ وضوء کرے تاکہ ان سے مشابہت ہوجائے۔
علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ استحباب کا حکم بھی عام نہیں بلکہ خواص کے لئے ہے جن کی زندگی فرشتوں کے مشابہ ہو۔
دوسری بات: مما مست النار سے وضوء ابتدائے اسلام میں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جہنم یاد آجائے اور عبادت کرے اور عبادت کے لئے وضوء کرنا پڑے گا، اس لئے استحبابی حکم دیا تھا۔
تیسری بات: "الوضوء مما مست النار" یہ جملہ حصر پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہاں حصر نہیں، کیونکہ یہ جملہ معدولہ عن الفعل ہے اور جب جملہ معدولہ عن الفعل ہو تو اس میں حصر نہیں ہوتا۔

باب الوضوء من لحوم الابل

براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لحوم ابل کے بارے میں سوال ہوا کہ اس سے وضوء لازم ہو جاتا ہے یا نہیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا لحوم ابل سے وضوء کرو اور لحوم غنم کے بارے میں سوال ہوا (کہ ان کے گوشت کھانے سے وضوء لازم ہوتا ہے یا نہیں) آپ ﷺ نے فرمایا اس سے وضوء نہ کرو۔

پہلی بات: اونٹ کا گوشت کھانا اسباب حدث میں سے ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اونٹ کا گوشت کھانا اسباب حدث میں سے ہے ان کے کھانے سے پہلے اگر وضوء ہو تو ٹوٹ جائے گا، جمہور کے ہاں وضوء نہیں ٹوٹتا۔

دوسری بات: بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ وضوء لحوم الابل یہ وضوء مما مست النار کی فرع ہے۔ مگر معارف السنن میں ہے کہ یہ بات غلط ہے چنانچہ احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ وضوء مما مست النار کے قائل نہیں جبکہ وضوء من لحوم الابل کے قائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ وضوء لحوم الابل وضوء مما مست النار کی فرع نہیں۔ دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ کہ اونٹ کا کچا گوشت اگر کسی نے کھایا تو اس پر وضوء لازم ہے معلوم ہوا یہ وضوء مما مست النار کی فرع نہیں ہے۔

تیسری بات: لحوم ابل سے وضوء کے وجوب کا حکم لگانے والے اس باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں لحوم ابل کے بارے میں فرمایا "توضوٴا منہا" جمہور کہتے ہیں کہ باب کی حدیث میں جو وضوء کا قول ہے ایک یہ کہ اس سے وضوء ناقص مراد ہے کہ ہاتھ یا منہ دھولے۔

اشکال: ہاتھ یا منہ کا دھونا تو بکری کے گوشت کھانے کے بعد مسنون ہے، جبکہ آپ ﷺ نے بکری کا گوشت کھانے کے بعد اس کا حکم نہیں دیا اور اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد حکم دیا ہے، جواب: وضوء سے مراد ناقص ہے مگر چونکہ اونٹ کے گوشت میں تری ہوتی ہے اس وجہ سے آپ ﷺ نے اس کے کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے کا حکم تاکید سے دیا جبکہ بکری کے گوشت یا عام کھانے کے بعد ہاتھ دھونا مستحب ہے مگر استحباب میں تاکید نہیں جبکہ اونٹ کے گوشت کھانے کے بعد استحباب تاکیدی ہے۔

دوسری تاویل انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کی ہے کہ لحوم ابل کھانے کے بعد وضوء کا حکم اس کا استحباب خواص کے لئے ہے، اس کے دو سبب ہیں۔ ① ایک یہ کہ اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل پر حرام تھا، مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے وضوء کرنا مستحب ہے۔ ② اونٹ کا گوشت کھانا جب انبیاء بنی اسرائیل کے لئے ممنوع تھا تو ہمارے لئے جائز کس طرح ہوا اس میں شبہ ہو سکتا تھا اس شبہ کی وجہ سے وضوء کامل کا حکم دیا۔

تیسری تاویل یہ ہے کہ یہ حکم پہلے تھا اب منسوخ ہو گیا طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیاس چاہتا ہے کہ وضوء واجب نہ ہو کیونکہ اونٹ اور بکری کے گوشت میں حکم کے اعتبار سے فرق نہیں، کیونکہ دونوں حلال ہیں۔ اور جن کے ہاں ماکول اللحم کا بول طاہر ہے ان کے ہاں دونوں پاک ہے۔ اور جن کے ہاں نجس ہے ان کے ہاں دونوں نجس ہے، باقی سب احکام میں برابر ہیں تو وضوء میں بھی برابر ہوں گے اور اونٹ کا گوشت بھی اسباب حدث میں سے نہ ہوگا۔ اب آثار میں اختلاف ہے تو قیاس کی طرف جانے کا حکم ہے اور قیاس جمہور کی تائید کرتا ہے۔

باب الوضوء من مس الذكر / باب ترك الوضوء من مس الذكر

اس میں بسرہ بنت صفوان رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ذکر کو مس کیا وہ نماز نہ پڑھے جب

تک وضوء نہ کرے دوسرے باب میں طلق بن علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی روایت نقل کی کہ وہ اپنے والد کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ تیرے بدن ہی کا ٹکڑا ہے (یعنی جس طرح باقی بدن کو مس کرنے سے وضوء نہیں ٹوٹتا اس کے مس سے بھی نہ ٹوٹے گا)۔

پہلی بات: پہلے باب سے ثابت ہوتا ہے کہ مس ذکر اسباب حدث میں سے ہے لیکن دوسرے باب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب حدث میں سے نہیں۔

دوسری بات: امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی، امام شافعی، امام احمد اور امام اوزاعی رحمہم اللہ کے ہاں مس ذکر سبب حدث ہے، امام اسحاق کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام اعظم امام محمد امام ابو یوسف اور سفیان ثوری اور فقہائے کوفہ رحمہم اللہ کے ہاں مس ذکر ناقض وضوء نہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ سند میں "قیل قال" پہلی اور دوسری دونوں حدیثوں میں ہے لیکن صحیح تر یہ ہے کہ پہلی حدیث بھی حسن درجے کی ہے اور دوسرے باب کی حدیث بھی حسن درجے کی ہے اور دونوں قابل احتجاج ہیں۔ اس لئے قول اول والے پہلی حدیث سے اور قول ثانی والے دوسری حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

تیسری بات: احناف کہتے ہیں کہ مس ذکر ناقض وضوء نہیں۔ احناف بسرہ بنت صفوان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا کی روایت کے مقابلے میں طلق بن علی کی روایت کو ترجیح دیکر استدلال کرتے ہیں۔ پہلی وجہ ترجیح یہ ہے کہ طلق بن علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی روایت سنداً احسن اور اثبت ہے بسرۃ بنت صفوان کی حدیث کے مقابلے میں۔ امام بخاری کے استاد علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ "حدیث طلق بن علی اثبت اسناداً من حدیث بسرۃ"۔ دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ مس ذکر ناقض ہے یا نہیں اس کے متعلق مرفوع احادیث میں تعارض ہے اس لئے مسئلہ معلوم کرنے کیلئے آثار کو دیکھیں گے۔ طحاوی کے قول کے مطابق اس کے متعلق گیارہ آثار ہیں ان میں سے دو صحابہ (ابن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ وابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ) کے اثار سے وجوب ثابت ہوتا ہے باقی نو صحابہ کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مس ذکر ناقض نہیں ہے اب آثار صحابہ کی وجہ سے ہم طلق بن علی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ احناف کہتے کہ قیاس بھی کہتا ہے کہ مس ذکر ناقض نہیں کیونکہ یہ بھی بدن کا ایک ٹکڑا ہے جس طرح بدن کے باقی حصوں کو مس کرنا ناقض وضوء نہیں تو بدن کے اس حصے کو بھی مس کرنا ناقض نہیں ہوگا۔ تو طلق بن علی کی حدیث کا مؤید قیاس بھی [illegible] بسرۃ بنت صفوان کا ایک جواب یہ ہے کہ بقول ابن ہمام کے مس ذکر کنایہ ہے خروج مذی سے کہ مس ذکر سے مذی نکلی تو وضو کرے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مس ذکر سے وضوء کا حکم بھی حکم استحبابی ہے ابو بکر بن العربی، دار قطنی، امام بیہقی نے اس مسئلے کے متعلق مناظرہ نقل کیا ہے کہ رجاء بن مرجہ کہتے ہیں کہ امام احمد، یحی بن معین، علی ابن المدینی مکہ میں تھے کہ اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہوا۔ یحی بن معین نے کہا ناقض ہے علی بن المدینی نے کہا کہ ناقض نہیں امام احمد حکم بن گئے۔ یحی نے بسرۃ اور علی بن المدینی نے طلق بن علی کی روایت پیش کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی سند پر بحث کی احمد رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے فرمایا دونوں کے اعتراضات صحیح ہیں پھر یحی بن معین نے دلیل میں ابن عمر کا اثر پیش کیا کہ ان کے ہاں ناقض تھا علی بن المدینی نے ابن مسعود کا اثر پیش کیا یحی نے ابن مسعود کے اثر پر اعتراض کیا علی بن المدینی نے عمار بن یاسر کا اثر پیش کیا احمد نے فیصلہ کیا کہ عمار بن یاسر ابن عمر دونوں کے اثر کے سند صحیح ہے اب جو چاہے جس پر عمل کرے۔ معارف السنن میں ہے کہ عمار اور ابن عمر کے اثر کو احمد مساوی مانتے ہیں تو دوسرے کبار صحابہ کے آثار جو عدم نقض پر موجود ہیں تو عمار کے اثر کو ترجیح ہوگی اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ احمد کے ہاں مس ذکر ناقض نہیں۔ مالک کا قول بھی مس ذکر کے بعد وضوء کا قول استحباب کا ہے تو یہ دونوں احناف کے ساتھ ہوئے اور کثرت آثار صحابہ بھی احناف کے قول کے ساتھ ہے۔ ابن ہمام نے وجہ ترجیح میں بھی لکھا ہے کہ مس ذکر سے وضوء ایک بڑا اہم مسئلہ ہے تو اس کی روایت صرف بسرۃ سے ہے معلوم ہوا انکی روایت صحابہ میں مشہور نہ تھی۔

باب ترک الوضوء من القبلة

عروة بن زبیر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ازواج کی تقبیل کی پھر نماز کیلئے گئے اور وضوء نہیں کیا عروة نے کہا "من هي الا أنت" تو عائشہ ہنس پڑیں۔

پہلی بات: مشہور اختلافی مسئلہ کو مس مرأة اسباب حدث میں سے ہے یا نہیں۔ امام مالک امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق کے نزدیک مس مرأة نواقض وضوء کے قبیل سے ہے شوافع کے ہاں کچھ تفصیل ہے۔ بعض شوافع کے ہاں مس المرأة تب ناقض ہے جب شہوت کے ساتھ ہو۔ بعض شوافع مطلقاً ناقض کہتے ہیں۔ بعض شوافع کہتے ہیں کہ مس بلا حائل ناقض ہے۔ بعض شوافع کہتے ہیں کہ مس ناقض تب ہوگا جب عورت محارم کے قبیل سے نہ ہو اگر محارم میں سے ہو تو ناقض نہ ہوگا تو ان کے اقوال میں اضطراب واختلاف ہے۔

امام اعظم، سفیان ثوری، امام محمد، امام ابو یوسف اور فقہائے کوفہ کے ہاں مس المراة نواقض میں سے نہیں شہوة ہو یا نہ ہو محارم کا ہو یا غیر محارم کا ہو، حائل کے ساتھ ہو یا بلا حائل ہو، الا یہ کہ مس کیا یا مباشرت کی اور مذی نکل جائے تو خروج ناقض ہے اس لئے وضوء ٹوٹ جائے گا۔

قول اول والے قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہیں ﴿اولمستم النساء﴾ کیونکہ یہاں "اولمستم النساء فلم تجدوا ماءً فتيمموا صعيداً طيباً" اور لمس سے لمس بالید مراد ہے امام اعظم فرماتے ہیں کہ یہاں اولمستم النساء" کنایہ عن الجماع ہے اور عرب کا طریقہ ہے کہ بعض امور جو صراحت کے ساتھ باعث حیاء ہوں تو الفاظ کو کنایۃ نقل کرتے ہیں اسی طرح آیت میں بھی کنایہ ہے جماع سے دلیل یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حدث اکبر میں اور حدث اصغر میں دونوں میں تیمّم کر سکتے ہو اگر لمس بالید مراد لو تو حدث اکبر کیلئے تیمّم کا ثبوت نہ ہوگا۔

احناف کی دلیل باب کی مذکورہ روایت ہے اس میں صراحۃً ثابت ہے کہ تقبیل یا مس ناقض نہیں اس حدیث پر دو اعتراض ہیں اس باب کی حدیث کی سند ہے "وكيع عن الاعمش عن حبيب بن ابی ثابت عن عروة" اب عروة تابعین میں دو تھے ایک عروة المزنی اگر یہ مراد ہو تو اعتراض یہ ہے کہ عروة مزنی کا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سماع ثابت نہیں دوسرے عروة بن زبیر اگر یہ مراد ہوں جو عائشہ کے بھانجے تھے تو ان کا سماع ثابت ہے لیکن حبیب بن ثابت کا عروة بن زبیر سے سماع ثابت نہیں اس لئے دونوں صورتوں میں روایت منقطع ہے۔

احناف جواب دیتے ہیں کہ عروة بن زبیر مراد ہیں ابن ماجہ اور نسائی نے صراحۃً ان کا نام ذکر کیا ہے باقی رہا یہ کہ حبیب بن ثابت کا سماع عروة بن زبیر سے ثابت نہیں تو زیلعی کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ اولاً تو حبیب بن ثابت کی سماع چار احادیث میں عروة سے ثابت ہے صراحۃً۔ دوسرا حبیب بن ثابت کا سماع ان حضرات سے بھی ثابت ہے جو عروة سے پہلے فوت ہوئے تھے عروہ سے بطریق اولی سماع ثابت ہوگا۔ تیسرا یہ کہ یہ عروہ کے ہم عصر ہے اور حبیب بن ثابت جب عروہ سے عن سے روایت کریں گے تو مسلم نے لکھا ہے کہ جمہور کا مذہب ہے کہ عنعنۃ المعاصر سماع پر محمول ہوتا ہے جب ان دونوں کا لقاء ممکن ہو۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اعمش کا سماع حبیب بن ابی ثابت سے ثابت نہیں؟ جواب یہ غلط ہے اعمش کا سماع حبیب بن ثابت سے صراحۃً ثابت ہے۔ دوسرا مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق عنعنۃ المعاصر سماع پر محمول ہوتا ہے اس لئے یہ سند صحیح ہے اس پر اعتراض غلط ہے اور اس کا مسئلہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے۔

معارف السنن میں ہے کہ یہ روایت مزید چار اسانید سے ثابت ہے جس پر کوئی کلام نہیں صحیح مسلم میں ہے کہ عائشہ نے فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ کو گم پایا ٹٹولا تو سجدہ میں تھے اور میرا ہاتھ ان کے قدمین سے لگا معلوم ہوا مس سے وضوء نہیں ٹوٹتا کیونکہ شوافع کے ہاں مرد مس کرے یا عورت دونوں ناقض ہیں اب ممسوس کا وضوء ٹوٹے گا یا نہیں اس میں دو قول ہیں ا۔ ناقض ہے ۲۔ ناقض نہیں ہے صحیح اور راجح قول ان کا پہلا ہے۔

باب الوضوء من القئی والرعاف

اس باب میں ابوالدرداء کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قئی کی پھر وضوء فرمایا۔

مسئلہ: قئی اسباب حدث میں سے ہے یا نہیں اسی طرح رعاف ناقض وضوء ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ امام احمد، اور فقہاء کوفہ، سفیان ثوری، ابن المبارک اور صاحبین کے ہاں قئی مل الفم ہو تو ناقض وضوء ہے اور سبیلین کے علاوہ خون کا نکلنا بھی ناقض ہے۔ دوسرا قول امام مالک اور امام شافعی کا ہے ان کے ہاں نہ قئی ناقض ہے اور نہ خروج الدم سبیلین کے علاوہ ناقض ہے۔ امام صاحب کی پہلی دلیل باب کی حدیث ابوالدرداء اور ثوبان سے منقول ہے اسی میں ہے کہ آپ کو قئی ہوئی پھر وضوء کیا معلوم ہوا قئی ناقض ہے۔ خون کے متعلق احناف کی دلیل ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ "من اصابه رعاف اوقئ فلينصرف وليتوضأ وليبن على صلاته"

دوسری دلیل ابن عدی کی کتاب ہے "الکامل" اسمیں ہے "الوضوء من کل دم سائل" تیسری دلیل تابعین وصحابہ سے منقول ہے۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سفیان ثوری، سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ قئی اور خروج الدم دونوں ناقض ہیں۔

امام مالک اور امام شافعی کی دلیل بخاری شریف کی حدیث غزوے کا واقعہ ہے جابر فرماتے ہیں کہ جب ہم غزوے سے واپس ہوئے راستے میں پڑاؤ ڈالا ایک مہاجر اور انصاری صحابی نے پہرہ دیا مہاجر صحابی سو گئے انصاری صحابی پہرہ دے رہے تھے کہ دشمن نے تیر مارا وہ نماز میں تھے نماز پڑھتے رہے بعد میں خوف ہوا کہ اگر میں مر گیا تو دشمن حملہ کر دیگا اس لئے مہاجر کو جگایا جب مہاجر نے خون دیکھا تو کہا کہ مجھے جگایا کیوں نہیں انہوں نے کہا نماز میں سورت پڑھ رہا تھا جس کو آدھا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا نبی ﷺ کو جب اطلاع ہوئی تو آپ نے نکیر نہیں کی اب خون چلتا رہا وہ نماز پڑھتے رہے معلوم ہوا ناقض نہیں۔

احناف جواب دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کو یہ بتایا تھا کہ خون نکل رہا تھا یا نہیں بتایا اس کا ذکر نہیں اور صحابی کا اپنا عمل ہے اور مرفوع احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دوسرا خون آپ کے ہاں بھی نجس ہے جب کپڑے پر لگ جائے تو اس کپڑے میں نماز نہیں ہوگی جبکہ بخاری والی حدیث کے مطابق خون بھی تو کپڑوں سے لگا ہوگا اور اس کے باوجود نماز پڑھتے رہے۔ معلوم ہوا انکا اپنا اجتہاد تھا باقی اگر تم کہو کہ خون دھارے سے نکلا ہوگا تو یہ مذکورہ بات کے خلاف ہے جس میں ہے "فلما رأى المهاجر دمه" معلوم ہوا جسم پر خون لگا ہوا تھا اس لئے آپ کا استدلال صحیح نہیں اور احناف کا استدلال باب کی روایت سے صحیح ہے۔

ترمذی کے دو استاد تھے ایک عبیدہ بن ابی السفر انہوں نے معدان بن ابی طلحہ نقل کیا ہے اور دوسرے استاد اسحاق ہے انہوں نے معدان بن طلحہ نقل کیا ہے اس کی یہ بات صحیح نہیں صحیح ابوعبیدہ کی بات ہے کہ یہ راوی معدان بن ابی طلحہ ہے۔

باب الوضوء من النبیذ

اس باب میں ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے برتن میں کیا ہے میں نے کہا نبیذ ہے آپ نے فرمایا "تمرة طيبة وماء طهور" یہ جنات کا واقعہ ہے کہ آپ جنات کے پاس گئے تھے میں بھی ساتھ گیا تھا

جن پر یہ مسئلہ پیش آیا آپ نے فرمایا کھجور پاک ہے اور پانی پاک ہے پھر آپ نے وضوء کیا۔

مسئلہ: نبیذ تمر سے وضوء جائز ہے یا نہیں تو فرماتے ہیں کہ نبیذ کی مختلف صورتیں ہیں بعض اتفاقی ہیں اور ایک صورت اختلافی ہے۔ ① پانی میں تمر ڈالی اور تمر کی مٹھاس نے پانی میں اثر نہیں ڈالا بلکہ پانی اصلی حالت پر ہے اس پانی سے بالا جماع وضوء کرنا جائز ہے ② نبیذ التمر حد السکر تک پہنچ گیا ہو اس صورت میں بالا جماع ایسے نبیذ سے وضوء جائز نہیں ③ نبیذ التمر مطبوخ ہو کہ کھجور پانی میں ڈال کر پکا دیا اور کھجور پانی میں حل ہو گئی اس نبیذ کے ساتھ بھی بالاتفاق وضوء جائز نہیں ④ ایسا نبیذ جس میں جھاگ آجائے اس سے بھی بالا جماع وضوء جائز نہیں ⑤ پانی کے اندر مٹھاس کیلئے تمر ڈالی تمر نے پانی کے اندر مٹھاس کا اثر پیدا کر دیا لیکن پانی میں رقت اور سیلان باقی ہے ایسی نبیذ سے وضوء کرنے میں اختلاف ہے۔

① سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام اعظم اور بعض فقہائے کوفہ کے ہاں ایسے نبیذ تمر سے وضوء جائز ہے ② امام صاحب کا دوسرا قول یہ ہے کہ مستحب یہ ہے کہ تیمّم بھی کرے اور ایسے نبیذ سے وضوء بھی کرے ③ تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں (وضوء اور تیمّم) کو جمع کرنا واجب ہے ④ ایسے نبیذ سے وضوء جائز نہیں صرف تیمم کریگا یہ امام صاحب کا چوتھا قول ہے اور جمہور ائمہ کا بھی یہی قول ہے نوح بن مریم نے امام صاحب کا رجوع جمہور کے قول کی طرف ثابت کیا ہے۔ طحاوی، قاضی خان اور صاحب بحرالرائق اس آخری قول کو ترجیح دیتے ہیں کہ امام صاحب کے ہاں بھی ایسے نبیذ تمر سے وضوء کرنا جائز نہیں جب یہ امام صاحب کا آخری قول لیں تو یہ پانچویں صورت بھی اجماعی ہو جائے گی۔

احناف امام صاحب کے جواز والے قول کی بھی ادلہ نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ امام صاحب کا پہلا قول بھی دلیل سے ثابت ہے باب کی حدیث امام صاحب کی متدل ہے جو لوگ وضوء کو جائز کہتے ہیں نبیذ تمر سے ان کے استدلال کیلئے مرفوع حدیث نہیں ان کی دلیل ہے "فان لم تجدوا ماء" یعنی ماء مطلق نہ ہو تو "فتیمموا صعیداً طیباً" اور یہاں بھی ماء مطلق نہیں بلکہ مقید ہے اس لئے تیمّم کریں گے قرآن کی صراحت کیوجہ سے یہ لوگ باب کی حدیث پر اعتراضات کرتے ہیں:

اعتراض: سند میں ابوفزارہ ہے یہ مجہول ہے؟

اعتراض: ابوفزارہ ابوزید سے نقل کرتے ہیں ان کا بھی علم نہیں راشد بن کیسان ہے یا کوئی اور

اعتراض: ابن مسعود اور ان کے بیٹے کہتے ہیں کہ میں لیلۃ الجن میں آپ کے ساتھ نہیں تھا؟

احناف جواب دیتے ہیں کہ ابوفزارہ مجہول نہیں اسی طرح ابوزید سے راشد بن کیسان مراد ہے اصل جواب یہ ہے کہ اگر یہ دونوں مجہول بھی ہوں تو چودہ آدمی ان دو کے علاوہ اس حدیث کو نقل کرتے ہیں اس لئے ان کی جہالت صحت حدیث پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

علامہ انورشاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دارقطنی نے اس کی ایک سند نقل کی ہے "معاویۃ بن ابی سلام عن زید بن ابی سلام عن ابن غیلان (یہ عندالبعض صحابی ہے) عن ابن مسعود یہ سند شیخین کی شرط کے موافق ہے۔

باقی انہوں نے کہا کہ ابن مسعود ساتھ نہ تھے اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ جس روایت میں ابن مسعود نے معیت کی نفی کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جنات کے ساتھ جہاں نبی نے ملاقات کی وہاں نہ تھے بلکہ نبی ﷺ نے ان کو دائرے میں بٹھایا تھا۔ نبی واپس آئے تو فرمایا کہ نصیبین کے جن تھے ان کا فیصلہ کرنا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ لیلۃ الجن کئی دفعہ ہوئی ہے یعنی جنوں کے ساتھ ملاقات کئی دفعہ ہوئی "اکام المرجان فی احکام الجان" میں ہے کہ لیلۃ الجن کا واقعہ چھ دفعہ پیش آیا۔ ان میں چار مرتبہ ابن مسعود ساتھ تھے دو دفعہ کی ملاقات میں ساتھ نہ تھے تو جہاں ابن مسعود نے معیت کی نفی کی ہے اس سے یہ دو دفعہ مراد ہیں جن میں ساتھ نہ تھے۔ تیسرا جواب یہ ہے

کہ ابن مسعود کے بیٹے نے جو فرمایا کہ میرے والد ساتھ نہ تھے فرمایا "وان کان معه لعد من مفاخرنا" اس میں جو نفی ہے یہ قرآن کی آیت میں جہاں ذکر ہے جنوں کا وہاں کی معیت کی نفی کی ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ الاسباب الموجبۃ للا ختلاف" کتاب میں کہ ابن مسعود کی حدیث جس میں ہے "لیس معه احدمنا" فرمایا اصل میں یہ روایت تھی "لیس معه احدمنا غیری" راویوں نے "غیری" کا لفظ نقل کرتے وقت کہیں گرا دیا جس سے نفی معلوم ہوئی (اور استاذ محترم مفتی نظام الدین صاحب نے جب اس کی تحقیق کی تو اصل مل گئی) ابو نعیم الاصبہانی کی کتاب "دلائل النبوۃ" میں ابن مسعود کی حدیث صحیح سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے اس میں یہی الفاظ ہیں "لیس معه احدمنا غیری" معلوم ہوا امام صاحب کا قول دلیل پر مبنی ہے لیکن رجوع اسلئے کیا کہ ہوسکتا ہے کہ ابن مسعود کے پاس جو نبیذ تھی اس میں تمر نے اثر نہ کیا ہو اس لئے وضوء کیا ہو اس لئے انہوں نے رجوع کر لیا۔

باب المضمضة من اللبن

اس باب میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دودھ پیا اور پھر پانی منگوایا اور مضمضہ کیا اور فرمایا کہ اس میں چکناہٹ ہوتی ہے (باب کی حدیث سے معلوم ہوا کہ دودھ پینے کے بعد آپ نے کلی کی اور علت چکناہٹ بتائی)

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ دودھ پینے کے بعد مضمضہ امام مالک اور بعض حضرات کے ہاں آداب صلاۃ میں سے ہے کہ لبن کے بعد نماز پڑھنی ہو تو کلی کرنا مستحب ہے اور اگر نماز نہیں پڑھنی ہو تو کلی کرنا مستحب نہیں۔

دوسری بات: علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جس مضمضہ کا ذکر ہے یہ آداب طعام میں سے ہے مطلب یہ ہے کہ چکناہٹ والی چیز کھالی یا پی لی تو مضمضہ مستحب ہے اس کے بعد نماز پڑھنی ہو یا نہ پڑھنی ہو۔

تیسری بات: معارف السنن میں ہے کہ نبی ﷺ نے دودھ پینے کے بعد مضمضہ کیا اور علت بتائی کہ اس میں چکناہٹ ہے تو کلی کا حکم علت پر بناء ہے اور "الحکم یدور مع العلۃ" تو مضمضہ کے استحباب کا حکم لبن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چکناہٹ والی چیز کے بعد مضمضہ مستحب ہوگا۔

باب كراهية ردالسلام غير متوضئ

یہاں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کو سلام کیا اور آپ بول کر رہے تھے تو انہوں نے جواب نہیں دیا معلوم ہوا کہ بے وضوء ہونے کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔

تمہید: یہاں چند حالات ہیں ① انسان بول یا غائط میں مشغول ہو اس کا حکم یہ ہے کہ بالاتفاق ایسی حالت والے کو سلام کرنا بھی مکروہ ہے اور اس کے سلام کا جواب دینا بھی مکروہ ہے ② لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بول وغائط کے بعد پتھروں سے استنجاء سکھاتے ہیں بول وغائط سے فارغ ہوتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ متقدمین سے اس حالت کا حکم منقول نہیں البتہ ہمارے مشائخ میں سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز ہے اور سلام کا جواب دینا بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس حالت میں مانع نہیں اس لئے کہ ستر عورت ہو چکا ہے۔ دوسرا قول مظہر نانوتوی کا ہے کہ اس حالت میں سلام کرنا اور اس کا جواب دینا ممنوع ہے کیونکہ یہ حالت ملحق ہے پیشاب کے ساتھ جب وہ پیشاب میں مشغول ہو تو سلام کرنا یا جواب دینا جائز نہیں۔ اسی طرح پیشاب کر چکا ہو استنجاء سکھا رہا ہوں اس کو بھی سلام کرنا مکروہ ہے۔ ③ ایک آدمی محدث ہے بول یا غائط میں مشغول نہیں اور استنجاء بھی نہیں کر رہا ہے احادیث سے ثابت ہے کہ ایسی حالت میں سلام جائز ہے مگر بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس حالت میں بھی جواب نہ دیتے تھے جس طرح مہاجر بن قنفذ کی روایت ہے طحاوی نے نقل کی ہے کہ میں نے سلام کیا آپ نے جواب نہیں دیا پھر

تیمّم کیا اور جواب دیا فرمایا میں پسند نہیں کرتا کہ اللہ کا نام بغیر طہارت کے لوں۔ دوسری علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے راوی کہتے ہیں کہ میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا وہ قضاء حاجت کیلئے گئے واپس آئے قرآن پڑھنا شروع کیا میں نے تعجب سے دیکھا انہوں نے فرمایا کہ میں کیوں نہ پڑھوں کیونکہ "لایحجبه عن القرآن الا الجنابة" کہ نبی ﷺ ہر وقت پڑھتے تھے جب قرآن جائز ہے تو سلام بھی جائز ہوگا اب یہاں ایک مسئلہ ہے دوسرا تعارض ہے احادیث میں اس کو دفع کرنا ہے۔

مسئلہ: ائمہ اربعہ جمہور فقہاء محدثین کے ہاں حالت حدث میں سلام کرنا اور اس کا جواب دینا دونوں جائز ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ حدث کی دو حالتیں ہیں ایک حدث اصغر اور دوسرا حدث اکبر حدث اکبر کی حالت میں ائمہ کے ہاں قرآن کا مس اور اسی طرح پڑھنا جائز نہیں البتہ قرآن کے علاوہ باقی اذکار جائز ہیں قرآن کی وہ آیات جو دعا پر مشتمل ہیں ان کو دعا کی نیت سے پڑھنا جائز ہے کیونکہ ابوداؤد نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ "کان یذکر الله علی کل احیانه" اور اگر حدث اصغر ہو تو قرأت قرآن جائز ہے مگر مس جائز نہیں جب قرآن پڑھنا جائز ہے تو باقی اذکار بھی جائز ہوں گے جن میں سلام بھی ہے۔

تعارض کس طرح دفعہ ہوگا؟ تعارض کو دور کرنے کیلئے طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ مہاجر بن قنفذ کی روایت منسوخ ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ناسخ ہے۔ مرقات میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابن عبد الملک کا جواب نقل کیا ہے کہ ایک عزیمت ہے اور ایک رخصت ہے تو مہاجر بن قنفذ کی روایت میں عزیمت کا ذکر ہے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت رخصت پر محمول ہے۔ بذل المجہود میں سہارنپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں امت کیلئے تیسیر کا ذکر ہے اور مہاجر بن قنفذ کی حدیث میں نبی کا اپنا فعل ہے۔ بنوری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا ہے کہ مہاجر بن قنفذ کی روایت واقعات جزئیہ میں سے ہے اور آپ کی خاص حالت کا ذکر ہے جبکہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں قانون عام ہے۔

اشکال: ترمذی نے باب عام قائم کیا ہے کہ غیر متوضی کا جواب مکروہ ہے جبکہ دلیل خاص ہے کہ حالت مباشرت میں سلام ممنوع ہے؟

جواب: مہاجر بن قنفذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کی روایت میں کراہیت میں عموم ہے اس لئے دعویٰ اور دلیل برابر ہیں۔

باب ماجاء فی سور الکلب

اس باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت منقول ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب کتا برتن میں منہ ڈالے تو اس کو سات دفعہ دھویا جائے گا اور پہلی مرتبہ یا کہا آخری مرتبہ مٹی سے صاف کیا جائے گا اور جب بلی منہ ڈالے تو ایک مرتبہ دھویا جائے گا۔

مسئلہ:۔ کتا برتن میں منہ ڈالے تو کتنی مرتبہ دھویا جائے گا؟ اس میں اختلاف ہے امام مالک امام شافعی امام احمد امام اسحاق رحمہم اللہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ برتن میں مائع چیز ہو کتا منہ ڈالے تو برتن سات مرتبہ دھویا جائے گا پھر ان کا آپس میں اختلاف ہے کہ برتن کے اندر کی چیز کا کیا حکم ہے تو امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول مدونۃ الکبریٰ میں ہے میں اس کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں کہ اللہ کے رزق کی طرف قصد کہا جائے اور اس کو ایسے ہی گرادوں معلوم ہوا ان کے ہاں کتا اور اس کا جھوٹا پاک ہے جبکہ جمہور فقہاء محدثین اور ائمہ ثلاثہ کے ہاں کتا بھی نجس ہے اور اس کا جھوٹا بھی نجس ہے اس لئے برتن میں جو ہو اس کو گرائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں کتا پاک ہے جمہور کے ہاں نجس ہے۔

اشکال: مالکیہ کے ہاں جب کتا پاک ہے تو پھر سات دفعہ برتن دھونے کا حکم کیوں دیتے ہیں؟

پہلا جواب مدونۃ الکبری میں مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ سات مرتبہ دھونا امر تعبدی ہے۔ دوسرا جواب ابن رشد الکبیر نے مقدمات میں نقل کیا ہے اوران کے حوالے سے ابن رشد صغیر نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کتا کلب یعنی باؤلا ہو اس کے جھوٹے میں زہر ہو اس لئے برتن دھونے کا حکم دیا تو ان کے ہاں اس صورت میں علت باؤلا ہونا ہے۔ جمہور کے ہاں علت نجاست ہے۔

دوسرا قول امام ابوحنیفۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وفقہائے کوفہ کے ہاں اگر مائع چیز میں منہ ڈالے اس کو گرائیں پھر برتن تین دفعہ دھوئیں گے باب کی حدیث احناف کے خلاف ہے اس لئے اس میں تاویل کریں گے انور شاہ صاحب کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ احناف کے ہاں تین دفعہ دھونا واجب ہے ساتھ دفعہ دھونا مستحب ہے یہ باب ابن ہمام کی کتاب شرح تقریر میں موجود ہے تو احناف کے ہاں باب کی حدیث استحباب پر محمول ہے جبکہ جمہور کے ہاں سات دفعہ دھونا واجب ہے۔ احناف اور جمہور کے قول میں فرق کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ نجاست ذی جرم ہو تو اس کی طہارت ازالہ جرم ہے اگر نجاست غیر ذی جرم ہو تو عام قانون ہے کہ تین دفعہ دھونے سے پاک ہو جائے گا لہٰذا کتے اور خنزیر کی نجاست برتن پر لگ جائے تو تین دفعہ دھوئیں گے اس لئے ہم نے کہا تین دفعہ دھونا واجب ہے اور باب کی حدیث استحباب پر محمول ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس روایت کے راوی ابو ہریرۃ ہیں اور خود ان کا فتوی تین دفعہ دھونے کا ہے صحیح سند سے ثابت ہے کہ عطاء بن ابی رباح ابو ہریرۃ سے نقل کرتے ہیں کہ "اذا ولغ الکلب فی الاناء فاغسلوہ ثلاث مرأت" اب ہم کہتے ہیں کہ راوی کا فتوی اپنی روایت کے خلاف ہو اگر اسکی وجہ یہ ہو کہ تین دفعہ واجب تھا اور سات دفعہ مستحب، فتوی میں وجوب والے قول کو ذکر کیا اور روایت میں استحباب کا ذکر ہے اس سے ہماری بات ثابت ہوگئی اور اگر کہو کہ بھول گئے تھے تو ابو ہریرۃ کے متعلق یہ تصور کرنا محال ہے اگر کہو کہ جان بوجھ کر روایت کے خلاف فتوی دیا تو اس سے ان کی عدالت ساقط ہو جائے گی۔ اس لئے ماننا ہوگا کہ ان کا فتوی وجوب پر محمول ہے اور روایت استحباب پر محمول ہے۔

بعض احناف نے روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ سات دفعہ دھونا طبی حکم ہے اب مٹی سے دھونا ائمہ ثلاثہ کے ہاں اس طرح ہے کہ چھ دفعہ دھوئے ساتویں مرتبہ مٹی سے صاف کرے پھر پانی ڈال کر مٹی اتار دے احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سات دفعہ دھوئے آٹھویں مرتبہ مٹی لگائے۔

"اذا ولغ الکلب" مائع چیز ہو اس میں کتا منہ ڈال کر پی لے اس کو "ولوغ" کہتے ہیں اور جامد چیز کو زبان سے چاٹے تو اس کیلئے "لحس" مستعمل ہے۔

باب ماجاء فی سور الھرۃ

کبشہ بنت کعب بن مالک ابن ابی قتادۃ کے نکاح میں تھیں ابوقتادہ ان کے پاس آئے فرماتی ہیں کہ میں نے ان کیلئے وضوء کا پانی ڈالا بلی آئی اور برتن سے پینے لگی تو ابوقتادہ نے اس کیلئے برتن کو ٹیڑھا کر دیا یہاں تک کہ اس نے پانی پی لیا فرماتی ہیں کہ ابوقتادہ نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اے بھتیجی کیا تمہیں تعجب ہو رہا ہے میں نے کہاں ہاں تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بلی نجس نہیں بلکہ ان جانوروں میں سے ہے جو تمہارے پاس آتے جاتے ہیں۔

اختلاف: بلی کے جھوٹے میں اختلاف ❶ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بلی کا جھوٹا مکروہ ہے اب کراہت کونسی ہے اس میں دو قول ہیں: طحاوی کے نزدیک یہ کراہت تحریمی ہے وہ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے جھوٹے کا اور اس کے گوشت کا حکم ایک

ہوتا ہے اب بلی کسی چیز میں منہ لگائے تو اس میں لعاب گر جائے اور لعاب گوشت سے متولد ہے تو جو حکم گوشت کا ہوگا وہ حکم لعاب کا ہوگا اور جو حکم لعاب کا ہوگا لعاب جس کے ساتھ لگ جائیگا اس کا بھی وہی حکم ہوگا اب بلی کا لحم حرام ہے اس لئے لعاب بھی حرام ہے۔

کرخی فرماتے ہیں کہ یہ کراہت تنزیہی ہے اور معارف السنن میں ہے کہ یہی امام محمد کے قول سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تنزیہی کا قول زیادہ بہتر ہے۔

❷ جمہور ائمہ ثلاثہ عام فقہاء ومحدثین کے نزدیک بلی کا جھوٹا پاک ہے دلیل باب کی حدیث ہے اس میں ہے ''انہالیست بنجسۃ'' جب بلی نجس نہیں تو اس کا جھوٹا بھی نجس نہیں ہوگا امام صاحب کی دلیل ماقبل والے باب کی روایت ہے ''اذا ولغت فیه الهرة غسل مرة'' کہ بلی برتن کو جھوٹا کرے تو برتن کو ایک دفعہ دھوئیں گے معلوم ہوا کہ اس کا جھوٹا بالکل طاہر نہیں ورنہ دھونے کا حکم نہ دیا جاتا اور بالکل نجس بھی نہیں اگر بالکل نجس ہوتا تو برتن تین دفعہ دھونا پڑتا تو معلوم ہوا اس کا درمیانہ درجہ ہے کہ مکروہ ہے۔

شوافع کا جواب: ابن مندہ الاصفہانی کہتے ہیں کہ باب کی حدیث دو وجوہ کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حمیدہ عبداللہ بن رفاعہ کی بیٹی ہے یہ مجہول ہے اسی طرح کبشہ بھی مجہول ہے البتہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ بعض کے ہاں یہ صحابیہ ہیں پھر تو ان کا مجہول ہونا مانع نہیں۔ لیکن صحابیہ نہ ہوں تو پھر جہالت مانع ہوگی۔ باقی ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ حدیث کی سند میں اگر اس کا لحاظ کریں کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ جس کو نقل کریں وہ صحیح ہوتی ہے اگر اس کو دیکھیں تو صحیح ہوسکتی ہے۔ مگر قواعد کے لحاظ سے حدیث نہیں۔ کیونکہ حمیدہ اور کبشہ مجہول ہیں۔ اس لئے باب کی حدیث ثابت نہیں باقی یہ قاعدہ کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ جس کو نقل کرے وہ صحیح ہوگی یہ صرف مالکیہ کے لئے حجت ہوسکتی ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بلی کے جھوٹے کے متعلق اصل اختلاف اس میں ہے کہ بلی حکماً کن حیوانات میں سے ہے تو ائمہ ثلاثہ کے ہاں جنگلی حیوانات میں سے ہے اور ان کے ہاں جنگلی حیوانات کا جھوٹا پاک ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بلی سواکن البیوت کے حکم میں ہے جیسے چوہا، اور سواکن البیوت کا جھوٹا مکروہ ہے تو بلی کا جھوٹا بھی مکروہ ہوگا تو احناف کا قول مکروہ کا ہے یہ دونوں روایتوں میں تطبیق بھی پیدا کرتا ہے کیونکہ بعض سے حلت اور بعض سے حرمت معلوم ہوتی ہے تو کراہت تنزیہی درمیانی حالت ہے۔

باب المسح علی الخفین

جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیشاب کیا پھر وضوء کیا اور خفین پر مسح کیا ان سے کہا گیا کہ آپ مسح کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اس سے مجھے کوئی چیز مانع نہیں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ مسح کر رہے تھے، (ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محدثین کو جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث زیادہ پسند ہے کیونکہ یہ سورت مائدہ کی آیت وضوء کے بعد اسلام لائے تھے۔

پہلی بات: یہاں سے مسح کے احکام شروع ہوئے کہ مسح علی الخفین کا کیا حکم ہے؟

دوسری بات: مسح علی الخفین کا ثبوت ہے یا نہیں۔ اہلسنت کا اجماع ہے کہ مسح حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں سے ثابت ہے۔ تو گویا مسح علی الخفین باجماع امت ثابت ہے۔ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے لوگوں نے تین اقوال نقل کی ہیں۔

❶ ان کے نزدیک مسح علی الخفین جائز نہیں مگر علماء مالکیہ نے اس کی تردید کی ہے۔

❷ اس کا جواز مسافر کے لئے ہے مقیم کے لئے اس کا جواز نہیں۔

❸ جمہور کے قول کی طرح مسافر اور مقیم دونوں کے لئے جائز سمجھتے ہیں، البتہ روافض کا اختلاف ہے وہ عام حالت میں مسح کے قائل

ہیں۔ مگر مسح علی الخفین کے قائل نہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ متواتر احادیث سے مسح علی الخفین ثابت ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر صحابہ سے سنا ہے کہ وہ حضور ﷺ سے اس کا جواز بتا رہے تھے۔ بعض نے اسی تعداد لکھی ہے، جن میں خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور بدری صحابہ بھی ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے مسح علی الخفین کا قول اس وقت اختیار کیا جب دن کی روشنی کی طرح اس کا جواز میرے سامنے آیا۔ آگے انہوں نے قول نقل کیا ہے کہ اہلسنت کی پہچان یہ ہے کہ مسح علی الخفین کے قائل ہوں۔ شیخین کو فضیلت دیں اور آپ ﷺ کے دو دامادوں (عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے محبت کرتے ہوں۔ فقہاء احناف فرماتے ہیں کہ جو مسح علی الخفین کا انکار کرے اس کی تکفیر کی جائے گی۔

تیسری بات: مسح علی الخفین اولیٰ ہے یا موزے اتار کر دھونا افضل ہے، اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ غسل افضل ہے کیونکہ اس میں مشقت ہے اور غسل اصل بھی ہے اور مسح اس کا قائم مقام ہے۔ معارف السنن میں بعض فقہاء کا قول منقول ہے کہ مسح علی الخفین افضل ہے تاکہ روافض کی مخالفت ہو جائے۔

چوتھی بات: خفین کی تعریف:۔ محدثین اور فقہاء کے نزدیک خفین کی چند صفات ہیں ① کپڑا ہو تو چمڑے کی طرح موٹا ہو یا چمڑہ ہو۔ ② اس میں اگر ایک میل تک چلا جائے تو نہ پھٹے ③ خود بخود مسک ہوں باندھنے کی ضرورت نہ پڑے۔

پانچویں بات: مسح علی الخفین کس کے لئے جائز ہے کس کے لئے نہیں۔ تو فرماتے ہیں اہلسنت کے نزدیک مسافر اور مقیم دونوں کے لئے جائز ہے۔

فقیل لہ اتفعل هذا: اصل میں لوگوں کو شبہ اس لئے ہوا تھا کہ سورت مائدہ کی آیت وضوء کے بعد مسح علی الخفین منسوخ ہو گیا ہے، اس لئے لوگوں کو عجیب لگتا تھا یہی وجہ ہے کہ ایک تو جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسح علی الخفین کا جواز بتایا، شہر بن حوشب نے پوچھا کہ یہ سورت مائدہ سے پہلی کی بات ہے یا بعد کی تو اس نے کہا کہ بھائی میں تو سورت مائدہ کے نزول کے بعد مسلمان ہوا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ سورت مائدہ کی عجیب آیت ہے کہ جر کی قرأت دیکھ کر بعض نے غسل رجلین کا انکار کیا اور بعض کو مسح علی الخفین کے منسوخ ہونے کا شبہ ہوا۔

بقية: یہ ضعیف ہے ان کے بارے میں ہے "احادیث بقیة لیست بنقیة وکن منها علیٰ تقیة"۔

باب المسح على الخفين للمسافر والمقيم

خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے مسح علی الخفین کے بارے میں سوال ہوا (کہ اس کی مدت کیا ہے) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسافر کے لئے تین دن اور مقیم کے لئے ایک دن ہے۔ دوسری روایت صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہم کو حکم دیتے تھے کہ ہم اپنے موزے نہ نکالیں تین دن اور تین راتوں تک مگر جنابت سے (کہ جنابت لاحق ہو تو موزے اتارنے کا حکم دیتے تھے) لیکن قضاء حاجت بول اور نیند سے (یعنی ان چیزوں کی وجہ سے موزہ اتارنے کا حکم نہ دیتے تھے)

مسئلہ: پہلی بات: اس میں مسح علی الخفین کی مدت کی مقدار کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے، اس کی مدت کتنی ہے، تو فرماتے ہیں کہ مقیم کے لئے مسح کی مدت میں اتفاق ہے۔ کہ ایک دن اور ایک رات ہے البتہ مسافر کے لئے مدت مسح کتنی ہے اس میں اختلاف ہے۔ جمہور ائمہ، فقہاء اور جمہور محدثین کے ہاں تین دن اور تین راتیں ہیں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی تحدید نہیں اس کی دلیل خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جو ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے۔ بعض دوسری جگہ یہ الفاظ بھی ہیں "لو استزدناه لزادنا" مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ شریعت نے حد مقرر نہیں کی نبی ﷺ جتنا چاہیں مقرر کر سکتے تھے۔

جمہور اس کا جواب دیتے ہیں کہ پہلے اس استدلال کا پس منظر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ پر احکام اترتے تھے اللہ کی طرف سے۔ اور کبھی تیسیر کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نبی ﷺ کو اختیار دے دیتے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشورہ کر کے اختیار کر لیں۔ مسح علی الخفین بھی اس قبیل سے تھا کہ مسح علی الخفین کا حکم بھیجا اور فرمایا جس میں آسانی ہو مشورہ کر کے طے کر لو۔ نبی ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشورہ کیا تو مشورہ میں طے پایا کہ مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات ہونی چاہیئے۔ اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ مدت کا مشورہ دیتے تو حضور ﷺ زیادہ مدت مقرر فرما لیتے یہ نہیں کہ شریعت نے تحدید ہی نہیں کی ہے۔ شریعت کی طرف سے تحدید تھی مگر اختیار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا تھا۔ اور انہوں نے مسافر کے لئے تین دن ہی تک مدت مقرر کی۔

ابن سید الناس کہتے ہیں کہ "لو استزدناہ لزادنا" کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زائد سوال نہیں کیا۔ اس لئے نبی ﷺ نے زائد مقرر نہیں کیا۔ دوسرا خزیمہ بن ثابت کی یہ زیادتی "لو استزدناہ لزادنا" صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں۔

مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی دوسری دلیل ابن ابی عمارہ کی حدیث ہے جو سنن ابوداؤد میں ہے کہ ابی کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے مسح علی الخفین کرنے کے بارے میں سوال کیا کہ مسح علی الخفین کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نعم میں نے کہا یوما پھر سوال کیا کہ یومین، فرمایا یومین، پھر میں نے کہا ثلاثا نبی ﷺ نے جواب دیا "نعم وما شئت" معلوم ہوا کہ تحدید نہیں اس لئے وما شئت فرمایا جمہور اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس کو نقل کر کے خود فرمایا ہے کہ یہ قوی نہیں بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لا یصح اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے رجال پر اعتماد نہیں۔ دار قطنی کہتے ہیں "ھذا لایثبت"

دوسری بات یہ ہے کہ نعم وما شئت کا یہ مطلب نہیں کہ مسلسل مسح کرتے جاؤ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مثلاً مقیم نے ایک دن ایک رات مسح کیا پھر موزے اتارے وضوء کر کے موزے پہنے، تو اس کے لئے پھر ایک دن ایک رات مسح کرنا جائز ہوا۔ پھر موزے اتار کر وضوء کر کے اس نے موزے پہنے تو دوبارہ ایک دن ایک رات تک مسح کر سکتا ہے، یہ سلسلہ جہاں تک جاری رکھے رکھ سکتا ہے اسی طرح مسافر کے لئے بھی ہے۔

مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی تیسری دلیل طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے روایت نقل کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام تھا، ام فضل (ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ) نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجا۔ وہ دمشق سے چل کر آیا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا کہ کب سے مسح کرتے آئے ہو، اس نے کہا کہ ایک ہفتہ ہو گیا، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "اصبت السنة" جمہور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین دن تین راتیں مسح کیا پھر موزہ اتار کر وضوء کر کے موزہ پہنا پھر تین دن تین راتیں مسح کیا پھر اتار کر وضوء کر کے موزہ پہنا، یہ مطلب نہیں کہ مسلسل بغیر اتارے مسح کرتا رہا کیونکہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود توقیت کے قائل تھے۔

جمہور کی دلیل باب کی دونوں احادیث ہیں اس کے علاوہ جمہور صحابہ اور تابعین سب حضرات توقیت کے قائل ہیں۔

دوسری بات: باب کی حدیث کے بارے میں معارف السنن میں لکھا ہے کہ احناف نے مسافت سفر پر یا مسافت قصر پر استدلال کیا ہے۔ احناف کے ہاں یہ تین دن تک کی مسافت سفر مراد ہے کہ آرام سے تین دن تک متوسط چلنے کے ساتھ سفر طے کر سکے، یہ مسافت سفر ہے، دلیل یہ حدیث ہے کہ مسافر کے لئے مسح علی الخفین کے لئے تین دن تین رات تک مدت مقرر کی۔ اب مسافت تین دن سے کم ہو تو ایسا مسافر بھی نکل آئے گا جس کی مسح علی الخفین کی مدت تین دن سے کم ہو۔ صاحب فتح القدیر نے اس مسئلے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے اذا کنا سفرا۔ سفر جمع نہیں بلکہ اسم جمع ہے فرق دونوں میں یہ ہے کہ جمع کے اوزان مقرر ہیں جبکہ اسم جمع کے اوزان مقرر نہیں دوسرا جمع میں حکم ہر فرد پر ہوتا ہے اور اسم جمع میں حکم من حیث المجموع پر ہوتا ہے۔

باب فی المسح علی الخفین أعلاه و أسفله

مغیرۃ ابن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مسح کرتے تھے اوپر والی جانب اور نچلی والی جانب پر بھی۔

مسئلہ: یہ ہے کہ مسح علی الخفین اعلیٰ پر ہے یا اسفل پر ہے یا دونوں پر ہے؟ اس مسئلے کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے۔

① اس پر اجماع ہے کہ مسح صرف اسفل پر ہو یہ بالا جماع جائز نہیں۔ ② امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مسح علی الخفین صرف اعلیٰ پر ہوگا۔ ③ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسح الخفین اعلیٰ واسفل دونوں پر واجب ہے لیکن شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صرف اقتصار علی الاسفل جائز نہیں، اور صرف اعلیٰ پر مسح واجب ہے اسفل پر مستحب ہے تو گویا یہ بھی جمہور کی طرح ہیں کیونکہ ان کے ہاں بھی واجب صرف اعلیٰ پر ہے۔

باب کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا "مسح اعلیٰ الخف واسفلہ" اس سے مالکیہ کی تائید ہوتی ہے جمہور کہتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ کی دوسری حدیث ہے۔ "أن رسول اللہ ﷺ مسح اعلیٰ الخف" باقی باب کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ باب کی حدیث معلول ہے اور اس میں تین علتیں ہیں۔ ① امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ علت نقل کی ہے کہ رجاء بن حیوۃ یہ نقل کرتے ہیں کاتب مغیرہ سے جس کا نام رواد ہے لیکن حقیقت میں یہ رجاء نے خود کاتب مغیرہ سے نہیں سنی بلکہ درمیان میں واسطہ ہے کیونکہ رجاء کہتے ہیں "حدثت عن کاتب المغیرة" معلوم ہوا درمیان میں واسطہ تھا۔ ② دوسری علت یہ ہے کہ رجاء بن حیوۃ اور ثور بن یزید کے درمیان بھی انقطاع ہے کیونکہ ثور بن یزید نے رجاء بن حیوہ سے نہیں سنی ہے۔ ③ تیسری علت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کی ہے کہ یہ روایت مغیرہ سے ساٹھ آدمیوں نے نقل کیا ہے اور رجاء بن حیوہ کے علاوہ کوئی بھی اسفل کا ذکر نہیں کرتا۔

حدیث معلول کی تعریف: وہ حدیث جس میں علت خفیہ قادحہ ہو۔ اور وہ علت حدیث کی صحت کے لئے قادح ہو اس حدیث میں تین علتیں ہیں اس لئے یہ حدیث قابل احتجاج نہیں، باقی بعض احناف سے بھی استیعاب کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے "لو کان الدین بالرأی لکان باطن الخف اولیٰ بالمسح من اعلاہ" یہاں بحث یہ ہے کہ باطن خف سے کیا مراد ہے نچلا حصہ مراد ہے یا اندر کا حصہ جس میں پاؤں ہوتا ہے، اس میں چند اقوال ہیں مگر سبق سے اس کا تعلق نہیں۔

باب المسح علی الخفین ظاهرهما

اس باب میں جمہور کا مستدل ذکر کر رہے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا، کہ وہ ظاہر خفین پر مسح کر رہے تھے۔ کان مالک یشیر بعبد الرحمٰن یتکلم کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اس میں کلام فرماتے ہیں مگر باقی حضرات نے ثقہ کہا ہے۔

باب فی المسح علی الجوربین و النعلین

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے وضوء کیا اور مسح کیا جوربین پر اور نعلین پر۔ یہاں باب کی حدیث کے تحت محدثین نے دو مسائل نقل کئے ہیں۔

پہلا مسئلہ: مسح علی الجوربین جائز ہے یا نہیں؟ لیکن اس سے پہلے چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ جورب معرب ہے اصل میں فارسی لفظ ہے، گورب۔ اور اس کا اصل بھی گور پا ہے۔

دوسری بات: جورب چار قسم ہے۔ مجلد، جورب منعل، جورب ثخین، جورب رقیق

جورب منعل: فقہاء کے ہاں جورب منعل ان جرابوں کو کہتے ہیں جن کے نچلے حصے کی طرف چمڑا لگا ہوا ہو۔
جورب مجلد: جورب مجلد اس جورب کو کہتے ہیں جس میں جانب اعلیٰ اور جانب اسفل دونوں پر چمڑا لگا ہوا ہو۔
جورب ثخین: فقہاء کی اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جس میں دو صفات ہوں ① ممسک بنفسہ ہو ② اس میں تتابع مشی بغیر جوتے کے ممکن ہو۔
جورب رقیق: وہ ہیں جس میں جورب ثخین والی صفات موجود نہ ہوں، کہ بالکل باریک ہوں اور پانی لگے تو فوراً اندر چلا جائے یہ جورب رقیق ہے۔
تیسری بات: جورب پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ تو فقہاء کے ہاں مذکورہ بالا صورتوں میں تین اجماعی ہیں ایک میں اختلاف ہے۔
① جورب مجلد اور جورب منعل پر ائمہ اربعہ جمہور فقہاء اور محدثین کے ہاں بالاتفاق مسح جائز ہے۔ ② جورب رقیق پر ائمہ کا اجماع ہے کہ اس پر مسح جائز نہیں ③ جورب ثخین یہ صورت اختلافی ہے۔ اس میں دو قول ہیں ① ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ جورب ثخین پر مسح کرنا جائز ہے ② امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جورب ثخین پر مسح جائز نہیں۔
معارف السنن میں ہے کہ فقہاء احناف میں سے علامہ کاسانی نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رجوع نقل کیا ہے، جمہور کے قول کی طرف۔ بعض کتابوں میں ہے کہ نو دن انتقال سے قبل اور بعض نے انتقال سے سات دن قبل رجوع نقل کیا ہے عابد سندی کے نسخے میں واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات کے وقت ان کی عیادت کے لئے گیا انہوں نے وضوء کیا اور جراب پر مسح کیا۔ فرمایا میں نے ایسا کام کیا جو پہلے نہ کرتا تھا اس سے رجوع معلوم ہوتا ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ چاروں قسمیں جوربین کی اجماعی اور اتفاقی ہیں۔
دوسرا مسئلہ: نعلین پر مسح کرنا اس کا کیا حکم ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ ہمارے فقہاء میں سے کسی کے نزدیک مسح علی النعلین جائز نہیں۔ اس لئے حدیث کا جملہ "مسح علی الجوربین والنعلین" اس کی جمہور تاویل کرتے ہیں۔
پہلی تاویل: طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ نعلین پر مسح کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جورب پہنے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے مسح کیا، اس کا اصل مقصد جوربین پر مسح تھا اس وقت نعلین پہنے ہوئے تھے۔ اس لئے راوی نے اس کا تذکرہ الگ کر دیا۔ اس کو علامہ خطابی اور امام طیبی نے پسند کیا ہے۔
دوسری تاویل: نعلین پر آپ نے مسح کیا وضوء علی الوضوء کی حالت میں یعنی نفل وضوء کر رہے تھے، اس میں نعلین پر مسح کیا، یہ تاویل زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نصب الرایہ میں نقل کی ہے۔
تیسری تاویل: یہ تاویل بیہقی کے استاذ ابو الولید نے کی ہے کہ اس سے مسح علی الجوربین المنعلین مراد ہے۔
چوتھی تاویل: امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ مسح علی النعلین ابتداء تھا پھر منسوخ ہو گیا، سنن دارمی کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواز پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ بات مولانا عبد الحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مشکوٰۃ کے حاشیے میں لکھی ہے۔
قال ابو عیسیٰ ہذا حدیث حسن صحیح: محدثین فرماتے ہیں کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ حسن صحیح ہے مگر باقی محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے ان میں عبد الرحمن بن مہدی، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، اور مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ یہ لوگ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ جس نے اس

حدیث کوضعیف کہا ہے ان میں سے ہر ایک ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے مقدم ہے یعنی ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ صحیح کہیں۔ اوران میں سے کوئی ایک ضعیف کہے تو اسی کی بات مانی جائے گی۔ تو جب سب مل کر ضعیف کہتے ہیں توان کی بات بطریق اولیٰ مانی جائے گی۔ اس میں دو راوی ہیں ابوقیس اور ہزیل بن شرجیل ان کی وجہ سے اس کوضعیف کہا گیا ہے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ روایت معلول ہے کیونکہ مغیرہ بن شعبہ سے ساٹھ آدمی نقل کرتے ہیں لیکن والنعلین کسی اور نے ذکر نہیں کیا۔

باب ماجاء فی المسح علی الجوربین و العمامة

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے وضوء کیا اور مسح کیا خفین پر اور عمامہ پر دوسری روایت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے کہ خفین اور رومال پر مسح کیا۔ تیسری روایت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے کہ ان سے مسح علی الخفین کا سوال ہوا۔ انہوں نے کہا کہ سنت ہے پھر سوال ہوا مسح علی العمامہ کے بارے میں انہوں نے فرمایا بالوں کو مسح کرو۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب میں ہے ''مسح علی الجوربین والعمامۃ'' یہاں جوربین کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں ① اس کا باب ابھی ابھی گذر چکا ہے اس لئے دوبارہ لانے کی کیا ضرورت تھی یہ تکرار محض ہے۔ ② ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے دوسرے صحیح نسخوں میں ''الجوربین'' کا ذکر نہیں ابن العربی اور علامہ سندھی کے نسخوں میں یہ لفظ نہیں۔ ③ مصنف نے جو روایات اس باب میں ذکر کی ہیں ان میں سے کسی میں جورب کا ذکر نہیں اس لئے جوربین کا لفظ غلط ہے۔

دوسری بات: مسح علی العمامہ جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق اور ایک روایت میں مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ ان کے نزدیک مسح علی العمامہ جائز ہے البتہ بعض کے ہاں کچھ قیود ہیں۔ کہ یہ قیود ہوں تو مسح علی العمامہ جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ بعض حنابلہ نے قید لگائی ہے کہ مسح علی العمامہ کے لئے شرط یہ ہے کہ عمامہ حالت طہارت میں پہنا ہو۔ دوسری شرط بعض حنابلہ نے یہ لگائی ہے کہ مسح علی العمامہ تب جائز ہے جب عمامہ میں دو صفات ہوں۔ ایک یہ کہ سنت کے مطابق شملہ ہو۔ دوسرا یہ کہ ٹھوڑی کے نیچے سے گزرا ہو یعنی ٹھاٹھا باندھا ہو۔

دوسرا قول جمہور کا ہے یعنی امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ، ابن مبارک اور مشہور قول کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ ان کے نزدیک مسح علی العمامہ جائز نہیں۔ دلیل یہ آیت ہے ''وامسحوا برؤسکم'' اب مسح علی العمامہ مسح علی الرأس نہیں کہلاتا۔ جس طرح مسح علی الخفین مسح علی الرجلین نہیں کہلاتا، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم مسح علی الرأس کا دیا ہے۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ قرآن میں مسح علی الرأس اور اسی طرح غسل رجلین کا ذکر ہے۔ لیکن مسح علی الخفین احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اس لئے متواتر احادیث نے آیت میں تخصیص ہوئی لیکن مسح علی العمامہ متواتر نہیں بلکہ اخبار آحاد ہیں اس لئے خبر واحد سے قرآن کا قطعی حکم (مسح علی الرأس) تبدیل نہیں کر سکتے۔

حدیث کا جواب ❶: معارف السنن میں امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے منقول ہے کہ مسح علی العمامہ کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا ''بلغنا ان المسح علی العمامۃ کان ثم ترک''

جواب ❷: مسح علی العمامہ محمول ہے حالت عذر پر مثلاً سر پر چوٹ ہے کہ مسح نہیں کر سکتا، تو ایسی صورت میں مسح علی العمامہ کر سکتا ہے۔

جواب ❸: ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بعض طرق میں مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات میں ہے ''مسح علی الناصیۃ والعمامۃ'' تو مقدار فرض ناصیہ تھی یہ سر پر مسح کیا، باقی استیعاب عمامہ پر کیا، یہ تاویل احناف اور شوافع کے قول کے مطابق ہے کیونکہ ان کے ہاں

پورے سر کا مسح کرنا فرض نہیں۔

جواب ④: علی العمامہ کا مطلب یہ ہے کہ "مسح علیٰ رأسه حال كونه متعمما" کہ مسح علی الرأس کیا مگر عمامہ اتارا نہیں۔

جواب ⑤: ذکر حال کا ہے مراد محل ہے تو مسح علی العمامہ سے مسح علی الرأس مراد ہے۔

جواب ⑥: مغیرہ کی روایت میں مسح علی العمامہ کا ذکر شاذ ہے، یہ روایت معلول ہے، یہ روایت مغیرہ سے کئی شاگرد نقل کرتے ہیں بعض شاگردوں نے اضافے کر دیئے بعض نے جوربین بعض نے نعلین بعض نے عمامہ کی زیادتی کر دی اس لئے زیادتی شاذ ہے۔

باب ماء جاء في الغسل من الجنابة

اس باب میں غسل جنابت کی کیفیت کا ذکر ہے۔ حدیث میں میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تفصیل سے کیفیت نقل کی ہے۔ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خالہ تھیں۔ اور ام الفضل کی بہن تھیں۔ دوسری روایت میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کیفیت منقول ہے۔ وہ بھی اسی طرح ہے صرف ایک فرق معلوم ہوتا ہے۔ کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں آپ نے وضوء کیا نماز کی طرح، معلوم ہوا پاؤں پہلے دھوئے، جبکہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ پاؤں بعد میں دھوئے۔ اس میں اتفاق ہے کہ پاؤں پہلے دھونا بھی جائز ہے اور آخر میں دھونا بھی جائز ہے۔ فقہاء نے تطبیق دی ہے کہ پانی جمع ہوتا ہو غسل خانے میں پھر پاؤں بعد میں دھوئے لیکن پانی جمع نہ ہوتا ہو تو پاؤں پہلے دھولے۔ مذکورہ کیفیت میں سب کے ہاں اتفاق ہے کہ مستحب اسی طرح ہے، فرائض میں اختلاف ہے احناف کے ہاں پورے جسم کو دھونا، مضمضہ، استنشاق فرض ہے، باقیوں کے ہاں مضمضہ اور استنشاق فرض نہیں یہ اختلاف اپنی جگہ آئے گا۔

غسل سے پہلے وضوء کرنا مستحب ہے، صرف داؤد ظاہری کے ہاں غسل سے پہلے وضوء واجب ہے اور غسل کے بعد حدث پیش نہ آئے تو دوبارہ وضوء کرنا ضروری نہیں۔

باب هل تنقض المرأة شعرها عند الغسل

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں ایسی عورت ہوں کہ اپنے بالوں کو بٹنے کے بعد باندھ لیتی ہوں، کیا غسل جنابت کے لئے ان کا کھولنا میرے لئے ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ تم تین چلو پانی سر پر ڈالو پھر پورے جسم پر پانی بہادو۔ بس تم پاک ہو جاؤ گی۔ بالوں کا کھولنا ضرور نہیں۔

پہلی بات: غسل دو قسم کا ہے، ایک عام غسل ہے جیسے غسل مستحب جمعہ کے لئے، دوسرا غسل واجب ہے جیسے عورت کے لئے غسل حیض ونفاس اور غسل جنابت۔ اب غسل مستحب ہو یا غسل مباح ہو تو اس میں بالا جماع عورت کے بال کھولنا ضروری نہیں۔ اسی طرح اگر مرد نے بال رکھے ہوں اور باندھے ہوں، تو اس کے لئے بھی اس صورت میں بال کھولنا ضروری نہیں۔ دوسرا غسل جو واجب ہے اس میں ہمارے فقہاء اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ غسل واجب میں مردوں کے لئے بالوں کا کھولنا واجب ہے، دلیل سنن ابوداؤد کی روایت ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل واجب میں مردوں کو بال کھولنے کا حکم دیا۔ لیکن غسل واجب میں عورت کا کیا حکم ہے۔ احناف کے اس میں تین اقوال ہیں۔ ① بالوں کے جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے، بالوں کا کھولنا ضروری نہیں، یہ ظاہر الروایۃ ہے ② جڑوں تک پانی پہنچانا بھی ضروری ہے اور بالوں کا تر کرنا بھی ضروری ہے۔ ③ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا بھی لازم ہے اور بالوں کو اتنا تر کرنا بھی لازم ہے کہ تین دفعہ نچوڑ لے۔ مگر احناف کے ہاں مفتی بہ پہلی صورت ہے۔ یہی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک بھی ہے امام

احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ بالوں کا کھولنا غسل واجب میں عورتوں کے لئے بھی مستحب ہے۔

دوسری بات: اس مسئلے میں تین احادیث ہیں ایک باب کی حدیث ہے، اس میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ تین چلو پانی ڈالے یہ کافی ہے......اس میں اصول شعر تک پانی پہنچانے کا ذکر نہیں اس کو جمہور ابو حذیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی روایت سے ثابت کرتے ہیں وہ بیوی کو غسل جنابت کے وقت کہتے تھے کہ اصول شعر تک پانی پہنچاؤ۔ کہ یہ روایت استحباب پر محمول ہے یا بال اس طرح باندھے ہوئے ہوں کہ بالوں کے کھولے بغیر پانی نہ پہنچے۔اس صورت میں کھولنا لازم ہے۔

باب ماجاء ان تحت کل شعرۃ جنابۃ

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ ہر بال کے نیچے جنابت کا اثر ہے۔ بالوں کو دھولیا کرو اور جسم کو صاف کرلیا کرو۔اس حدیث کا مضمون ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول ہے۔

مسئلہ: نجاست دو قسم پر ہے ایک نجاست ظاہری اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں نجاست لگی ہو صرف اس کا دھونا لازمی ہے اس کے علاوہ جگہ کا دھونا لازم نہیں۔ دوسری نجاست حکمی ہے۔جس طرح حائضہ کے بارے میں شریعت نے کہا کہ اس کا بدن نجس ہے یا اس طرح جنبی کے بارے میں شریعت نے کہا کہ اس کا بدن نجس ہے چونکہ نجاست امر تعبدی ہے اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ پورے بدن کو احاطے میں لے لیتا ہے اور پورا بدن ناپاک ہوجاتا ہے بدن کے ہر حصے پر اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔اب نجاست کے زوال کے لئے جو آلہ (پانی) شریعت نے مقرر کیا ہے اس کا بھی ہر ہر جگہ پر پہنچنا ضروری ہے، اس لئے بدن میں بال برابر بھی جگہ خشک رہ جائے تو ائمہ کے ہاں طہارت حاصل نہ ہوگی۔

باب فی الوضوء بعدالغسل

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ غسل کے بعد وضوء نہ کرتے تھے۔

غسل کی ابتداء میں وضوء کرنا بالاتفاق مستحب ہے، وجوب کا تو ن لفظ بعض اہل ظواہر کی طرف منسوب ہے باقی غسل کرتے وقت آخیر تک سبب حدث پیش نہ آئے تو بالاتفاق غسل کے بعد وضوء مستحب نہیں بلکہ بعض نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔حدیث میں اس کی ممانعت بھی منقول ہے کہ ''من توضأ بعد الغسل فلیس منا'' ہاں اگر غسل کے آخر میں کوئی حدیث پیش آجائے تو وضوء کرنا لازم ہوگا۔

باب ماجاء اذا التقی الختانان وجب الغسل

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مرد کا مختون مقام عورت کے مختون مقام سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہوجائے گا میں نے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا، پھر غسل کیا۔دوسرے باب میں ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ الماء من الماء اول اسلام میں بطور رخصت کے تھا پھر اس سے روک دیا گیا۔

پہلی بات: ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب مرد اور عورت اکٹھے ہوں اور انزال نہ ہو تو غسل واجب نہ ہوتا تھا بلکہ فقط وضوء واجب ہوتا تھا چنانچہ ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ قبا گئے مجھے بھیجا کہ فلاں کو بلاؤ میں نے بلایا وہ کچھ دیر بعد نکلے تو سر سے پانی گر رہا تھا، تو نبی ﷺ نے فرمایا ''لعلنا اعجلناک'' اس نے کہا ''نعم یارسول اللہ'' آپ نے فرمایا آئندہ ایسا ہو تو فقط وضوء کرلیا کرو۔ اس لئے کہ الماء من الماء یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا مگر پھر منسوخ کر کے دوسرا حکم دیا کہ ''اذا جاوز الختان الختان وجب

الغسل " جب آپ ﷺ کا انتقال ہوا تو مہاجرین اور انصار میں اختلاف ہوا۔ انصار الماء من الماء کا فتویٰ دیتے تھے مہاجرین اذا جاوز الختان الختان پر فتویٰ دیتے تھے۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم ہوا تو انہوں نے صحابہ کو جمع کیا پھر ازواج مطہرات سے معلوم کیا تو حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مہاجرین کے فتویٰ کی طرح فتویٰ دیا۔ پھر انہوں نے اس پر حکم صادر فرمایا کہ جو الماء من الماء پر فتویٰ دے گا میں اس کو سزا دوں گا۔ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع ہوگیا کہ دخول حشفہ سے غسل واجب ہو جائے گا۔ صرف داؤد ظاہری اختلاف کرتا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس پر نظیر پیش کی ہے۔ ① فساد حج کا حکم بناء ہے دخول حشفہ پر نہ کہ انزال پر ② اسی طرح روزے کی حالت میں جماع کیا تو نفس دخول سے روزہ فاسد ہو جائے گا بالاتفاق اس میں انزال شرط نہیں ③ اسی طرح زانی نے دخول حشفہ کیا انزال نہ بھی ہوا ہو تو اس کو کوڑے لگیں گے یا رجم کیا جائے تو بہت سارے نظائر موجود ہیں کہ ان مسائل میں حکم کی بناء انزال پر نہیں بلکہ دخول پر ہے تو وجوب غسل کی بناء بھی دخول حشفہ پر ہوگی انزال پر نہ ہوگی۔

دوسری بات: وجوب غسل کا سبب انزال ہے مگر شرعی قاعدہ ہے کہ سبب مخفی ہو اس پر اطلاع ممکن نہ ہو تو شریعت سبب ظاہری کو اس کا قائم مقام بنا دیتی ہے، جس طرح نقض وضوء کا سبب خروج ریح ہے مگر اس پر اطلاع ممکن نہیں اس لئے سبب ظاہری نوم کو شریعت نے سبب حقیقی کا قائم مقام بنا دیا۔ اسی طرح غسل کا سبب حقیقی انزال ہے۔ مگر جب دخول ہو جائے تو انزال پر اطلاع ممکن نہیں، اس لئے شریعت نے سبب ظاہری (دخول حشفہ) کو اس کا قائم مقام بنا دیا۔

الماء من الماء من ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول منقول ہے کہ اس کا تعلق احتلام سے ہے کہ کسی نے خواب دیکھا انزال کی صورت دیکھی اب جاگا تو اگر انزال ہوا ہو تو غسل واجب ہوگا اگر انزال نہ ہوا ہو تو غسل واجب نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ حدیث ابتداء ہی اس مسئلے کے لئے وارد ہوئی ہے تو پھر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات صحیح نہیں۔ کیونکہ ابتداء میں بتایا کہ جس صحابی کے بارے میں نبی ﷺ نے بلانے کا حکم دیا تھا وہ جماع کر کے نکلے تھے ہاں اگر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا یہ مطلب ہو کہ حدیث منسوخ ہے بعض محامل اور مصادیق کے اعتبار سے، اور بعض محامل اور مصادیق کے اعتبار سے اس کا حکم باقی ہے یعنی اس کا مصداق جماع بھی تھا اور احتلام بھی جماع کا مصداق منسوخ ہوگیا لیکن احتلام کا مصداق اب بھی باقی ہے۔

باب فیمن یستیقظ ویری بللاً ولا یذکر احتلاماً

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو تری کو دیکھے لیکن اس کو احتلام یاد نہ رہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ غسل کرے اور اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس کو گمان ہو کہ احتلام ہوا ہے لیکن تری کو نہیں پاتا، آپ ﷺ نے فرمایا اس پر غسل نہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ یارسول اللہ اگر عورت ایسا دیکھے تو اس پر غسل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں کیونکہ عورتیں بھی مردوں کی مثل ہیں ان احکام میں۔

پہلی بات: معارف السنن میں منذری کے حوالے سے ہے کہ کوئی خواب میں احتلام دیکھے مگر جاگ جانے کے بعد احتلام کے آثار نظر نہ آئیں تو ائمہ مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آدمی پر غسل واجب نہیں۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور صاحب بحر الرائق نے لکھا ہے کہ اس مسئلے میں کل چودہ صورتیں ہیں۔ سات صورتوں میں غسل واجب ہے سات میں واجب نہیں ہوتا صاحب بحر الرائق کہتے ہیں کہ کوئی نیند سے جاگ جائے اب تری دیکھی تو ① اس کو یقین ہو کہ منی ہے ② یقین ہے کہ مذی ہے ③ یقین ہے کہ ودی ہے ④ اولین (منی اور مذی) میں شک ہو ⑤ طرفین (منی اور ودی) میں شبہ ہو ⑥ آخرین (مذی اور ودی) میں شک ہو ⑦ تینوں کے متعلق شبہ ہو کہ ممکن

ہے کہ منی ہو یا مذی ہو یا ودی ہو۔ اب ان میں سے ہر صورت میں احتلام یاد ہو گا یا نہیں ہوگا (۷×۲=۱۴) یہ چودہ صورتیں بن گئیں۔

دوسری بات: وہ سات صورتیں جن میں غسل واجب ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔ ① مذی ہونے کا علم ہو ② اولین (منی اور مذی) میں شک ہو ③ طرفین (منی اور ودی) میں شک ہو ④ آخرین (مذی اور ودی میں شک ہو۔ ⑤ منی کا یقین ⑥ مذی کا یقین ⑦ ودی کا یقین، مع تذکر الاحتلام۔ اس کے علاوہ سات صورتوں میں غسل واجب نہیں۔

تیسری بات: پانی کے خروج کی تین قسمیں ہیں ① منی اس کا قرآن وسنت دونوں میں ذکر موجود ہے ② مذی کا حدیث میں ذکر ہے ③ ودی کا ذکر فقہاء کے کلام میں ہے۔

❶ منی کی تعریف: ماء ثخین ہو دفق اور شہوت سے نکلے اس کے خروج کے بعد فتور لاحق ہو۔

❷ مذی کی تعریف: ماء ابیض رقیق اس کے خروج کے بعد فتور لاحق نہیں ہوتا۔

❸ ودی کی تعریف: منی کی طرح ثخین ہو، دوسرا اس میں کدورت ہوتی ہے اس کے خروج کے بعد فتور لاحق نہیں ہوتا۔ ودی عموماً پیشاب کے بعد آتی ہے یا بوجھ اٹھانے سے کبھی قطرے آجاتے ہیں۔ منی کے خروج کے بعد غسل واجب ہوتا ہے مذی اور ودی کے خروج کے بعد وضوء واجب ہوتا ہے، غسل نہیں۔

باب ماء جاء في المني والمذي

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا مذی کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ منی میں غسل ہے اور مذی میں وضوء ہے

پہلی بات: مسئلہ ❶ باب کی حدیث میں یہ ہے کہ خروج مذی سے وضوء واجب ہوتا ہے اور خروج منی سے غسل واجب ہوتا ہے یہ مسئلہ ائمہ اور محدثین کے نزدیک اجماعی ہے۔

مسئلہ ❷ مذی اور منی نجس ہیں یا نہیں اس پر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مستقل دو باب قائم کئے ہیں مختصراً سمجھ لیں کہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ مذی کی نجاست میں ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے۔ البتہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے تین قول منقول ہیں ① جمہور کی طرح مذی کو نجس مانتے ہیں ② مذی نجس ہے مگر عام نجاسات کی طرح تین دفعہ دھونا لازم نہیں بلکہ کپڑے پر لگ جائے تو پانی چھڑک دینا کافی ہے۔ ③ مذی بھی منی کی طرح ہے اور منی احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پاک اور طاہر ہے، تو مذی بھی پاک ہے اور طاہر ہوگی۔ مگر عام حنابلہ نے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا پہلا قول اختیار کیا ہے باقی منی میں اختلاف آگے آئے گا۔

دوسری بات: ترجمۃ الباب کی غرض یہ ہے کہ اس میں بتانا چاہتے ہیں کہ منی کے خروج کے بعد کیا واجب ہوتا ہے اور مذی کے خروج کے بعد کیا واجب ہوتا ہے؟ ''سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ'' علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث باقی سنن کی کتابوں میں تفصیل سے ہے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''کنت رجلا مذاء'' اب جب بھی مذی نکلتی تو میں غسل کرتا ہوں یہاں تک کہ جب مشقت ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہا مگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میرے نکاح میں تھی اس لئے مجھے پوچھنے میں حیاء محسوس ہوئی پھر ایک روایت میں ہے کہ مقداد کے ذریعے پوچھا اور دوسرے روایت میں ہے کہ عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ تم پوچھو اب کس نے پوچھا؟ تو تتبع کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ پانچ حضرات نے مذی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سہیل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اشکال: ترمذی کی روایت میں ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود پوچھا جبکہ دوسری روایات میں ہے کہ میں حیاء کی وجہ سے نہ

پوچھ سکا تو تضاد ہے۔

جواب ❶: ابن حبان نے لکھا ہے کہ ابتداءً مسئلہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ پوچھا ہو مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ہو۔ پھر جب مسئلہ چل پڑا تو انہوں نے خود بھی پوچھ لیا کہ اب مسئلہ معلوم ہو گیا ہے اب شرم کی کوئی بات نہیں، باقی وہ ابتداء بالسوال کو حیاء کے منافی سمجھتے تھے، لیکن یہاں انہوں نے بات چل جانے کے بعد سوال کیا۔

جواب ❷: علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو سألت کہا یہ نسبت مجازی ہے جیسے ''بنی الامیر المدینۃ'' اب امیر نے نہیں بنایا، بلکہ حکم دیا، اس لئے اس کی طرف نسبت کی، اسی طرح علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود سوال نہیں کیا مگر حکم دیا تھا اس لئے اپنی طرف نسبت کی مجازاً۔

باب فی المذی یصیب الثوب

مذی کپڑوں میں لگ جائے تو طریقہ تطہیر کیا ہے؟ گزر چکا ہے کہ ائمہ مجتہدین کا مذی کی نجاست میں اتفاق ہے۔ البتہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے تین قول ہیں مگر فتویٰ ان کے ہاں جمہور کے قول پر ہے۔

طریقہ تطہیر:

طریقہ تطہیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور اکثر فقہاء فرماتے ہیں کہ عام نجاست کی طرح اس کو بھی دھویا جائے گا باقی حدیث میں جو نضح کا ذکر ہے یہ نضح بمعنی غسل کے ہے اس لئے غسل ضروری ہے چھڑک دینا کافی نہیں لیکن امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فقط نضح کافی ہے۔

باب فی المنی یصیب الثوب

ہمام بن حارث فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں ایک آدمی مہمان بنے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے چادر بھیجی کہ رات کو اس میں سوئیں رات کو ان کو احتلام ہوا اور چادر پر بھی احتلام کا اثر پڑ گیا اب اس نے نامناسب سمجھا کہ چادر پر نجاست کا اثر موجود ہو اور چادر واپس کر دے اس لئے اس نے چادر دھو کر دی انہوں نے فرمایا کہ اس نے ہماری چادر خراب کر دی بلکہ کھرچ دینا ہی کافی تھا اور خود عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے منی کو انگلی سے کھرچ دیتی تھیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے منی کو دھولیا کرتی تھیں اب پہلی حدیث سے فی الجملہ طہارت منی کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور دوسری حدیث سے فی الجملہ منی کی نجاست کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے ① امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق رحمہم اللہ کے ہاں منی پاک اور طاہر ہے اس لئے کپڑے یا بدن پر لگ جائے تو وہ آدمی بغیر منی دھوئے نماز پڑھ سکتا ہے ② امام اعظم، امام مالک، امام اوزاعی، لیث بن سعد مصری، صاحبین اور سفیان ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ منی نجس ہے جس طرح بول، مذی اور ودی نجس ہے اس طرح منی بھی نجس ہے۔

قول اول والوں کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے منی کھرچ دیتی تھی اب کھرچنے سے منی بالکل صاف نہیں ہوتی اثرات باقی رہتے ہیں اس سے فی الجملہ معلوم ہوتا ہے کہ منی طاہر ہے کیونکہ دوسری نجاسات مثلاً غائط لگ جائیں تو کریدنے سے کپڑا صاف اور پاک نہیں ہوتا۔ دوسری دلیل آثار صحابہ میں سے کچھ اقوال ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے وہ فرماتے ہیں کہ منی ناک کی ریزش کی طرح ہے اس لئے اس کو کپڑوں سے صاف کر دیا گھاس سے

صاف کرو جب ریزش کی طرح ہو تو پاک ہوگی۔ تیسری دلیل شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کتاب الام میں ذکر کی ہے کہ انبیاء کی پیدائش منی سے ہوتی ہے یہ بات نامناسب ہے کہ انبیاء کی تخلیق اس چیز سے ہو جو نجس ہو اس لئے منی پاک ہوگی۔

قول ثانی والے کہتے ہیں کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے جو احادیث منقول ہیں ان میں سے بعض میں ہے کہ ان کے کپڑے دھوئے گئے بعض میں کھرچ دیئے گئے تو دونوں قسم کی اقسام سے ازالہ کیا گیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ منی سمیت کپڑوں میں نماز پڑھی ہو بلکہ وہ ازالہ کرتے تھے کبھی پانی سے کبھی کھرچ دینے سے معلوم ہوا نجس ہے اگر پاک ہوتی تو کبھی بیان جواز کیلئے بغیر ازالہ کے نماز پڑھ لیتے باقی شوافع کا کہنا کھرچنے سے اجزاء باقی رہتے ہیں تو یہ مالکیہ کے خلاف ہے احناف کے خلاف نہیں کیونکہ احناف کے ہاں فرک کی اجازت باقی ہے اجزاء بالکلیہ زائل نہیں ہوتے اس کا جواب یہ ہے کہ حصول طہارت کیلئے شریعت نے دو طریقے بتائے ہیں ① ازالہ نجاست بالکلیہ ② کبھی تقلیل نجاست سے بھی طہارت حاصل ہو جاتی ہے جیسے فرمایا کہ جو مسجد میں آئے وہ اپنے جوتوں کو دیکھے اگر گندگی لگی ہو تو زمین پر رگڑ لے وہ پاک ہو جائیگا اب زمین پر رگڑنے سے اجزاء بالکلیہ ختم نہیں ہوتے اس کے باوجود بھی شریعت نے طہارت کا حکم دے دیا معلوم ہوا کہ حصول طہارت کا ذریعہ تقلیل نجاست بھی ہے اسی طرح لباس پر درہم سے کم نجاست لگی ہو تو معاف ہے تقلیل نجاست کی وجہ سے اسی طرح فرک والی احادیث بھی منی کی طہارت کی دلیل نہیں بلکہ تقلیل نجاست ہو جاتا ہے جو حصول طہارت کا ایک ذریعہ ہے۔

احناف کی دوسری دلیل ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کپڑے میں نماز پڑھتے تھے جس میں جماع کرتے تھے انہوں نے جواب دیا "نعم اذا لم یر فیه أذی" یہ منی کی ناپاکی کی دلیل ہے کیونکہ منی نہ نظر آتی تو نماز پڑھتے اور اگر نظر آتی تو اس میں نماز نہ پڑھتے معارف السنن میں غسل منی کے متعلق پانچ احادیث اور پانچ آثار صحابہ منقول ہیں ان میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر بھی ہے یہ سب نجاست پر دال ہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ منی کا نکلنا اسباب حدث میں سے ہے اور نجاست میں جو حدث اکبر لاحق کرتی ہے تو وہ بطریق اولی نجس ہوگی باقی آثار صحابہ منی کی طہارت اور نجاست دونوں میں منقول ہیں۔ باقی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جو کہا کہ یہ مخاط کی طرح ہے یہ پاکی کی دلیل نہیں اگر پاک ہوتی تو ازالے کا حکم نہ دیتے جبکہ انہوں نے کہا اس کو زائل کرو اگرچہ اذخر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

شوافع کی دلیل کا جواب: انبیاء کا پیدا ہونا تکوینی امر ہے اور یہ الگ چیز ہے دوسرا حیض کا خون بچے کی غذا ہوتا ہے جبکہ خون بالاتفاق نجس ہے تو پھر اس کو بھی پاک مانو۔ اس لئے تکوینی امور کے احکام الگ ہیں تشریعی امور کے احکام الگ ہیں نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے مسئلہ ذکر کر کے احادیث لکھی ہے پھر انہوں نے لکھا ہے کہ شوافع نے قیاس نقل کئے ہیں جس کو میں ذکر نہیں کرنا چاہتا معلوم ہوا قیاس ان کے ہاں بھی بے کار ہوگا اس لئے نقل نہیں کیا۔

باب فی الجنب ینام قبل أن یغتسل

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت جنابت میں سو جاتے تھے اور پانی کو مس بھی نہ کرتے تھے۔ دوسری روایت بھی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے وضوء کر لیتے تھے جب جنابت کی حالت میں ہوتے تھے۔

پہلی بات: حالت جنابت میں ایک صورت یہ ہے کہ غسل کر کے سو جائے یہ بالاتفاق مستحب ہے لیکن غسل نہ کرے پھر کیا حکم ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں۔

پہلا قول: امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، اور جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ اگر غسل

نہیں کرتا تو مستحب یہ ہے کہ وضوء کر کے سو جائے اگر دوبارہ جماع کرے تو اس کے لئے بھی وضوء کرنا مستحب ہے اگر کھانا چاہتا ہو تو پھر بھی وضوء کرنا مستحب ہے۔

دوسرا قول: امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دوبارہ جماع اور کھانے کے لئے وضوء مستحب نہیں۔

تیسرا قول: ابن حبیب مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ اور داؤد ظاہری کے ہاں جنبی اگر غسل نہیں کرتا بغیر غسل کے سونا یا دوبارہ جماع کرنا چاہتا ہے تو وضوء کرنا اس کے لئے واجب ہے۔

اس کے متعلق تین قسم کی احادیث ہیں۔① کبھی جنابت کے بعد غسل کر کے سو جاتے تھے بلکہ کبھی اگر ایک سے زائد بیویوں سے جماع کرتے تو ہر ایک کے لئے الگ غسل کرتے تھے۔② جنابت سے فراغت کے بعد وضوء کر کے سو جاتے تھے۔③ نبی اکرم ﷺ جنابت کے بعد بغیر وضوء کے سو جاتے تھے۔ یہ تین قسم کے اعمال آپ ﷺ سے احادیث میں منقول ہیں۔ تطبیق کی پہلی صورت یہ ہے کہ اگر نبی اکرم ﷺ رات کے پہلے حصے میں جماع کرتے تو غسل کر کے سو جاتے تھے۔ کیونکہ رات کافی ہوتی تھی اور غسل کے بغیر سونا نامناسب سمجھتے تھے، کیونکہ جنبی گھر میں ہو تو وہاں فرشتے نہیں جاتے۔ لیکن آخری حصے میں جماع کرتے تو کبھی بیان جواز کے لئے وضوء اور غسل کئے بغیر سو جاتے تھے کیونکہ صبح صادق تک زیادہ وقفہ نہیں ہوتا اور کبھی مستحب پر عمل کر کے وضوء کر لیتے۔ تطبیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی عادت وضوء کر کے سونے کی تھی۔

ولا یمس الماء: یہ جو الفاظ ہیں یہ ابو اسحٰق نے زیادتی کی ہے لم یغتسل کے مفہوم کو ابو اسحٰق نے لا یمس الماء سے تعبیر کیا، دوسرا صحیح مطلب یہ ہے کہ غسل کے لئے پانی مس نہ کرتے تھے، بلکہ صرف وضوء کر لیتے تھے۔

دوسری بات: جمہور کے ہاں وضوء مستحب ہے کیا اس سے کامل وضوء مراد ہے یا ناقص وضوء مراد ہے تو فرماتے ہیں کہ دونوں قسم کی روایات موجود ہیں۔ اور زیادہ مستحب کامل وضوء ہے کیونکہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "کان یتوضأ وضوئہ الصلاۃ"

تیسری بات: حالت جنابت میں وضوء کا فائدہ کیا ہے کیونکہ اس سے نجاست حکمی تو ختم نہیں ہوتی اس کا جواب یہ ہے کہ نجاست حکمی میں تقلیل آجاتی ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جسم پر جو نجاست لگی ہے اس کی بو آتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے تیسرا جب وضوء کرے تو رحمت کے فرشتے آتے ہیں۔ یہ بھی فائدہ ہے ورنہ وضوء نہ کرے تو فرشتے گھر میں نہیں آتے۔

باب الوضوء للنجب الخ اس میں بھی ماقبل والا مسئلہ ہے۔

باب ماجاء فی مصافحۃ الجنب

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ان سے ملے اور میں جنبی تھا فرماتے ہیں کہ میں پیچھے ہٹ گیا پھر غسل کیا اور واپس آیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کہاں چلے گئے تھے میں نے کہا میں جنابت میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اِن المؤمن لاینجس"۔

اس روایت میں اختصار ہے دوسری جگہ تفصیل ہے کہ حضور ﷺ نے مصافحہ کرنا چاہا تو میں پیچھے ہٹا غسل کیا اور مجلس میں واپس آیا، انہوں نے پوچھا کہاں تھے میں نے کہا میں جنابت میں تھا اس لئے آپ سے مصافحہ کرنا یا آپ کی مجلس میں بیٹھنے کو ناپسند کیا اس لئے گیا۔

پہلی بات: جب مرد ہو یا حیض و نفاس والی عورت ہو اور ان کے بدن پر ظاہری نجاست نہ ہو تو اس کی نجاست نجاست حکمی ہے، ظاہری نہیں، مطلب یہ ہے کہ انسان یا کپڑا ان کے بدن سے مس ہو تو ناپاک نہ ہونگے یا انکا پسینہ کسی کو لگ جائے تو وہ چیز نجس نہ ہوگی۔ کیونکہ

ان کی نجاست حکمی ہے جس طرح قرآن میں ہے ﴿انما المشرکون نجس﴾ یہ تمام ائمہ کے نزدیک نجاست حکمی ہے۔ بشرطیکہ ظاہری نجاست بدن پر نہ ہو۔

یہاں دو اقوال ہیں ❶: ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "اعیانهم کالخنزیر" کہ وہ مشرک نجس العین ہیں خنزیر کی طرح اور ان کے بدن کو مس کرنا بھی جائز نہیں اس لئے حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "من صافحهم فلیتوضأ" کہ جو مشرک سے مصافحہ کرے اس کو چاہیئے کہ وضوء کرلے۔

دوسری بات: جمہور فقہاء کے ہاں کفار کا بدن نجس تو ہے مگر یہ نجاست ظاہری نہیں نجاست حکمی ہے۔ جمہور کے ہاں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول تشدید پر محمول ہے کہ ان لوگوں سے مصافحہ اور اختلاط نہیں کرنا چاہیئے۔ جمہور کی دلیل وہ آیت ہے جس میں اللہ نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے جب مسلمان شوہر ہوگا تو اس کا جسم اور لباس اس سے مس ہوگا اس کا پسینہ لگے گا، پھر بھی شریعت نے شادی کی اجازت دے دی ہے، اب جب بھی وہ عورت سے مس ہوگا اس کا پسینہ لگ جائے اور وضوء لازم ہو تو یہ مشکل چیز ہے اس لئے ان کی نجاست حکمی ہے، احناف کی کتابوں میں ہے کہ "سور الآدمی طاهر" اس سے مسلمان، کافر، مرد، عورت، طاہر، جنبی سب مراد ہیں اور سب اس میں داخل ہیں سب کا جھوٹا پاک ہے۔

تیسری بات: جمہور کے ہاں جنبی کے ساتھ مصافحہ جائز ہے اب جنبی کے لئے کس چیز کی ممانعت ہے تو فرماتے ہیں کہ وہ عبادات جو وضوء کے بغیر جائز نہیں وہ اسی جنبی کے لئے جائز نہیں جیسے نماز، قرأت، دخولِ مسجد، البتہ دخول مسجد فقط مرور کے لئے ہو اس میں اختلاف ہے، یہ اپنی جگہ آئے گا لیکن دخول مسجد عبور کے لئے نہ ہو تو ان کا مسجد میں جانا بالاتفاق جائز نہیں۔

فانخنست: میں پیچھے ہٹا اور ایک روایت میں ہے "فانسللت" اس کا معنی ہے کہ میں چپکے سے نکل گیا۔ "المؤمن لاینجس" اس کا معنی ہے کہ مؤمن کی نجاست دوسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتی کہ دوسرا بھی ناپاک ہو۔ بعض ظاہر یہ نے مفہوم مخالف مراد لیا ہے کہ مؤمن نجس نہیں مگر کافر نجس ہیں۔ مگر ان کی بات صحیح نہیں اور مفہوم مخالف مراد نہیں۔

باب ماجاء فی المرأة تری فی المنام مثل مایری الرجل

ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، سوال کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ حق بات سے حیاء نہیں کرتے مسئلہ یہ ہے کہ عورت احتلام کی کیفیت دیکھ لے تو اس پر مرد کی طرح غسل ہے آپ نے فرمایا ہاں جب پانی دیکھ لے تو غسل کرے۔

پہلی بات: عورت خواب میں احتلام کی کیفیت دیکھ لے تو اس پر غسل واجب ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ "إن النساء شقائق الرجال" مسئلہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء ائمہ اربعہ کے ہاں جب عورت احتلام کی کیفیت دیکھے اور منی دیکھی، تو اس پر غسل واجب ہوگا۔ لیکن خروج منی کیلئے شرط ہے کہ فرج خارج تک خروج منی ہو تو غسل واجب ہوگا۔ لیکن اگر فرج داخل تک خروج منی ہو تو جمہور کے ہاں غسل واجب نہیں۔ صرف امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس صورت میں غسل واجب ہوگا۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ عورت احتلام کی کیفیت دیکھے تو اس پر غسل واجب نہیں۔ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ان سے ثابت نہیں کیونکہ یہ اجماع امت کے خلاف ہے۔ یا اگر ان سے ثابت ہو تو اس پر محمول ہوگا کہ خروج منی فرج داخل تک ہوا ہو کیونکہ اگر تاویل نہ کریں تو ان کا قول اجماع امت کے خلاف ہوگا۔

دوسری بات: مرد کی طرح عورت کا خروج منی ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں اطباء کا اختلاف ہے، بعض اطباء کے ہاں عورت سے بھی منی کا

خروج ہوتا ہے بعض کہتے ہیں کہ عورت کے اندر ایک ایسا پانی ہوتا ہے جس میں علوق کی صلاحیت ہوتی ہے مگر اس پر منی کا اطلاق نہیں ہوتا۔

تیسری بات: "فبضحت النساء یا أم سلیم" اس پر کلام ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ اکثر احتلام کثرت شہوت کی وجہ سے ہوتا ہے اور عورت کثرت شہوت چھپاتی ہیں اس لئے انہوں نے فرمایا کہ تم نے عورتوں کی کثرت شہوت کو ظاہر کر کے عورتوں کو رسوا کر دیا۔

چوتھی بات: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کیا عورتوں کو بھی احتلام ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا "نعم" اس پر یہ کلام ہے کہ کیا ازواج مطہرات کو احتلام کا علم نہ تھا؟ اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ ازواج مطہرات کو اس کا علم نہ تھا۔ کیونکہ عورتوں میں شہوت کم ہوتی ہے اس لئے کسی کو احتلام ہوتا ہے کسی کو نہیں ہوتا اس لئے ازواج مطہرات کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

بعض کہتے ہیں کہ احتلام کا سبب کثرت منی ہے اس لئے ان کے ہاں انبیاء اور ان کی ازواج کو بھی پیش آسکتا ہے بعض کے ہاں احتلام کا سبب شیطان کا اثر ہے اس لئے ان کے ہاں انبیاء اور ان کی ازواج اس سے محفوظ ہیں اس لئے ان کو تعجب ہوا۔

پانچویں بات: "فضحت النساء" یہ الفاظ کس نے کہے بعض میں ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر ہے بعض میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر ہے ابن عبدالبر نے زہری کا قول نقل کیا ہے کہ ممکن ہے الگ واقعہ ہو ایک میں ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا ہوگا اگر ایک واقعہ بھی ہو تو ہو سکتا ہے دونوں نے کہا ہو دوسرا قول معارف السنن میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ قول ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔

ان اللہ لایستحی من الحق کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسئلہ بیان کرنے میں حیاء نہیں کی تو ہم کیوں حیاء کریں۔ حیاء تغیر اور انکسار کو کہتے ہیں جو حدوث پر دال ہے۔ اور صفات قائم بالذات ہوتے ہیں اس لئے حیاء کی صفت جب اللہ کے لئے استعمال ہو تو اس سے نتیجہ مراد ہوگا، اس صورت میں مطلب ہوگا کہ اللہ ان معاملات میں حق بات پوچھنے سے حیاء کا حکم نہیں دیتے۔

باب فی الرجل یستدفئ بالمراۃ بعد الغسل

شوہر اور بیوی جنبی ہوں، مرد نے غسل کیا اور مثلاً سردی ہے وہ شوہر بیوی کے پاس لیٹ کر لپٹتا ہے جبکہ عورت نے غسل نہیں کیا ہے تو اس وجہ سے مرد کا جسم ناپاک ہوگا یا نہیں؟ تو یہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ اگر عورت کے بدن پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو تو اس سے لپٹ جانا جائز ہے اس سے اس کا جسم ناپاک نہیں ہوگا کیونکہ جنابت کی نجاست یہ حکمی ہے، اس لئے ظاہری بدن پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

باب التیمم للجنب اذا لم یجد الماء

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پاک مٹی یہ طہارت کا ذریعہ ہے مسلم کے لئے اگرچہ دس سال تک پانی نہ پائے۔

پہلی بات: باب کی حدیث کی غرض یہ ہے کہ حدث اصغر کی طرح حدث اکبر کے لئے بھی تیمم جائز ہے۔

دوسری بات: امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ الباب میں قید لگائی ہے "اذا لم یجد الماء" اس سے اشارہ ہے کہ جو شرط جواز تیمم کے لئے حدث اصغر میں ہے وہی شرط جواز تیمم کے لئے حدث اکبر میں بھی ہے۔

تیسری بات: مسئلہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء ائمہ اربعہ اور محدثین صحابہ وتابعین کے ہاں ان شرائط کے ساتھ حدث اکبر میں بھی تیمم جائز ہے، جن شرائط کے ساتھ حدث اصغر کے لئے تیمم جائز ہے۔ صرف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہ قول تھا لیکن بعد میں انہوں نے اس قول سے رجوع کرلیا تھا یہاں پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان مکالمہ ذکر کیا جاتا ہے کہ عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم دونوں سفر میں تھے ہم دونوں کو احتلام ہوگیا تھا آپ نے نماز نہیں پڑھی میں نے تیمّم کرلیا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو انہوں نے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصویب کی تو اس کے بعد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رجوع کرلیا تھا۔

دوسرا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکالمہ ہوا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پیش کی تو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس روایت پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اطمینان نہیں ہوا ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کو دیکھو ''فان لم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا'' پھر وہ خاموش ہوگئے فرمایا کہ اس لئے میں یہ فتویٰ نہیں دیتا کیونکہ تھوڑی سردی ہو تو لوگ تیمّم شروع کردیں گے تو معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں بھی جائز ہے۔ مگر فتویٰ نہ دیتے تھے سداً للذرائع تاکہ لوگ غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

باب في المستحاضة

اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ فاطمہ بنت ابی جیش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں کہا کہ یارسول اللہ میں ایسی عورت ہوں کہ مجھے مرض استحاضہ لاحق ہوجاتا ہے پھر پاک نہیں ہوپاتی کیا میں نماز چھوڑ دوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رگ کا خون ہے حیض نہیں۔ فرمایا جب تیرے حیض کے دن آئیں تو نماز چھوڑ دو، اور جب حیض کے دن چلے جائیں تو خون دھولو اور نماز پڑھو دوسری روایت میں ہے ''توضئ لکل صلاۃ حتی یجئ لک الوقت''

پہلی بات: معارف السنن میں نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے منقول ہے کہ استحاضہ کے مسائل اہم بھی ہیں اور مشکل بھی۔ اہم اس لئے ہیں کہ دین کے بہت سارے مسائل کا تعلق حیض یا استحاضہ کے احکام کے ساتھ ہیں اور یہ مسائل مشکل بھی ہیں خصوصاً متحیرہ کے احکام یہ فقہ کے مسائل میں مشکل ترین مسائل ہیں۔

دوسری بات: حیض کی تعریف: ''دم ینفضہ رحم امرأۃ بالغۃ من غیر داء'' وہ خون جو بالغہ عورت کے رحم سے بغیر کسی بیماری کے طبعی طور پر نکلے۔

استحاضہ کی تعریف: ''دم یسیل من رحم امراء ۃ لداء بھا'' یعنی جو بالغ عورت کے رحم سے نکلے اقل مدت حیض سے کم اور اکثر مدت حیض یا نفاس سے زیادہ ہو اور یہ بیماری کے طور پر غیر طبعی طور پر نکلے۔

چوتھی بات: فقہاء احناف کہتے ہیں کہ ① وہ خون استحاضہ ہوگا جو اقل مدت حیض سے کم میں آئے اس پر استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے۔ ② اسی طرح اکثر مدت حیض سے زائد خون آئے وہ بھی استحاضہ ہوگا۔

③ وہ خون جو اکثر مدت نفاس سے زائد ہو اس پر بھی استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے نفاس کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

پانچویں بات: اقل مدت حیض و اکثر مدت حیض کیا ہے ''اقل مدت حیض'' میں اختلاف ہے۔

قول ①: امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اقل مدت حیض دفعۃ واحدۃ ہے۔

قول ②: امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اقل مدت حیض یوم ولیلۃ ہے۔

قول ③: امام ابوحنیفہ کے ہاں اقل مدت حیض تین دن اور تین راتیں ہیں تو احناف کے ہاں تین دن سے کم جو خون آئے گا وہ حیض نہ

ہو گا بلکہ استحاضہ ہو گا۔

قول ❹: ابن الماجشون مالکی فرماتے ہیں اقل مدت حیض پانچ دن اور پانچ راتیں ہیں۔

اکثر مدت حیض: میں بھی اختلاف ہے۔ ① امام صاحب کے ہاں اکثر مدت حیض دس دن ہے، اس لئے دس دن کے بعد جو خون آئے گا وہ حیض نہیں استحاضہ ہے۔ ② شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکثر مدت حیض پندرہ دن اور پندرہ راتیں ہیں۔ ③ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکثر مدت حیض سترہ دن ہے۔

چھٹی بات: معارف السنن میں ہے ابن العربی مالکی کے حوالے سے ابن رشد مالکی (صاحب بدایۃ المجتھد) ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی طرح دوسری کتب کے حوالے سے نقل ہے کہ اقل مدت حیض یا اکثرت مدت حیض میں اختلاف ہے۔ اس پر فقہاء بطور دلیل کے روایات بھی پیش کرتے ہیں لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ جن روایات سے استدلال کرتے ہیں وہ دو قسم پر ہیں بعض سند کے اعتبار سے بالکل قابل استدلال نہیں۔ بعض سنداً تو صحیح ہیں مگر وہ اقل یا اکثر مدت پر صراحۃً دلالت نہیں کرتے۔ اس لئے ابن العربی نے لکھا ہے کہ احناف یا شوافع کے اقوال تجربے پر مبنی ہیں دنیا کے احوال مختلف ہوتے ہیں اس لئے عورتوں کی عادت بھی مختلف ہوتی ہے۔

ساتویں بات: مستحاضہ پانچ قسموں کی طرف منقسم ہے احکام اور صفات کے اعتبار سے۔

① مستحاضہ مبتدئہ ② مستحاضہ معتادہ یعنی وہ مستحاضہ جس کا خون استحاضہ مستمر ہے مگر اس کو حیض کے ایام میں عادت معلوم ہے کہ حیض کب آتا ہے اور کتنے دن آتا ہے۔ ③ مستحاضہ متحیرہ: اس کو محیرہ، متحیرہ، ناسیہ، ضالہ اور مضلہ بھی کہتے ہیں یعنی وہ عورت جس کا خون استحاضہ مستمر ہے مگر اس کو ایام حیض یاد نہیں کہ کب آتا ہے اور کتنا آتا ہے پھر اس کی تین قسمیں ہیں ①: اس کو معلوم ہے کہ مہینے کے فلاں عشرے میں خون آتا تھا مگر کتنے دن آتا تھا یہ معلوم نہیں ② دن تو معلوم ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ کون سے عشرے میں آتا تھا۔ ③: متحیرہ بالزمان والعادۃ ہو یعنی نہ دن معلوم ہو نہ وقت معلوم ہے کہ کب اور کون سے عشرے میں آتا تھا یہ اقسام اجمالی ہیں۔

اختلافی صورتیں: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحاضہ کی اور قسم بھی ہے یعنی متمیزہ بالالوان کہ وہ رنگ دیکھ کر فرق کرلے کہ یہ حیض کا خون ہے یا استحاضہ کا۔ ان کے ہاں متمیزہ کی دو قسمیں ہیں۔ ① مبتدئہ متمیزہ ② متعادہ متمیزہ۔

تو پہلی تین قسموں کے ساتھ یہ ملا لو تو کل پانچ قسمیں بن جاتی ہیں اور متحیرہ کی تین صورتیں ملا کر کل آٹھ قسمیں بن جاتی ہیں۔

آٹھویں بات: متمیزہ میں یہ بات ہے کہ خون کل چھ رنگ کا ہوتا ہے حمرۃ، صفرۃ، کدرت الخ معارف السنن (۴۱۵/۱)

ائمہ ثلاثہ تمیز بالالوان کا اعتبار کرتے ہیں احناف نہیں کرتے۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل ابوداؤد کی روایت ہے "ان دم الحیض دم اسود یعرف" یہ تمیز الوان پر صراحۃً دلالت کرتی ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حیض کے ایام میں جتنے رنگ کا خون ہو وہ حیض ہی ہو گا استحاضہ نہ ہو گا۔

دلیل ❶: حدیث ہے جو بخاری نے تعلیقاً نقل کی ہے ابوداؤد نے بھی نقل کی ہے "کانت النساء یبعثن بالدرجة الی عائشة" تو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "لاتعجلن حتی ترین القصة البیضاء" یہاں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایام حیض میں سفیدی کے علاوہ تمام رنگوں کو حیض ہی سمجھتی تھیں۔

دلیل ❷: ابوداؤد نے ام عطیہ کی روایت نقل کی ہے "کنا لانعد الکدرة والصفرة شیئا" یعنی ہم اس کو حیض شمار نہیں کرتی تھیں۔

نویں بات: مبتدءہ، معتادہ، متحیرہ کے احکام کیا ہیں؟

① مبتدءہ وہ عورت ہے جو بالغ ہوتے ہی خون میں مبتلا ہوئی ہو تو بالاتفاق اکثر مدت حیض یعنی اتنے دن حائضہ شمار ہو گی پھر اکثر

مدت حیض کے بعد غسل کریگی اور یہ طاہرہ عورت ہوگی اس پر طاہرہ کے احکام جاری ہوں گے۔

② معتادہ مستحاضہ کا حکم یہ ہے کہ اپنی عادت کے مطابق ایام حیض گذار کر غسل کریگی اب غسل کے بعد یہ طاہرہ شمار ہوگی اور وضوء لکل صلاۃ کرے گی یہ اختلاف آگے آئے گا۔

③ متحیرہ کے احکام میں اختلاف ہے احناف کہتے ہیں کہ متحیرہ کو عذر نہ ہو تو ہر نماز کیلئے غسل کرے یہ مشکل ہو تو دو نمازوں کو جمع کرکے اس کے لئے غسل کرے اور پورے مہینے یہ احکام جاری رکھے۔

بعض صورتوں میں یہ کوئی دن مقرر کر لے اس کو حیض شمار کرے پھر غسل کرے ہر نماز کیلئے۔

دسویں بات: وضوء لکل صلوۃ ہوگا یا وضوء لوقت کل صلاۃ ہوگا اس میں اختلاف ہے احناف کے ہاں وضوء لوقت کل صلوۃ ہے مثلاً ظہر کا وضوء کیا اور کوئی ناقض پیش نہ آیا تو عصر تک وضوء باقی رہے گا۔ شوافع کے ہاں اس کا وضوء لکل صلوۃ ہے وضو کیا اس سے فرض پڑھے سنت پڑھے مگر دوسری قضاء نمازوں کیلئے الگ وضوء کریگی۔ سفیان ثوری کے ہاں نوافل بھی تابع نہیں بلکہ جب وضوء سے فرض پڑھ لے تو وضو ختم ہو جائے گا۔ احناف کی دلیل وہ عام روایات ہے جن میں "لوقت کل صلوۃ" کے الفاظ ہیں اور جہاں لکل صلوۃ ہو وہاں بھی وقت مقدر ہوگا۔

گیارہویں بات: غسل لکل صلوۃ یا دو نمازوں کو جمع کرکے غسل کرنا اس کے بارے میں جو احادیث ہیں یہ محمول ہیں علاج پر یا متحیرہ کے بعض اصناف پر باقی مبتدءَ یا معتادہ کا یہ حکم نہیں۔

بارہویں بات: نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مستحاضہ عورتیں گیارہ تھیں۔ معارف السنن (۱/۴۱۶)

تیرھویں بات: جن لوگوں کے ہاں تمیز بالالوان کا اعتبار ہے ان کے ہاں تمیز اور عادت جمع ہو جائے تو مقدم کیا ہے احناف کے ہاں تو الوان کا اعتبار نہیں اس لئے عادت مقدم ہے احمد کے ہاں بھی عادت مقدم ہے اور شوافع کے ہاں تمیز بالالوان مقدم ہے۔

باب أن المستحاضة تتوضأ لكل صلاة

وباب فی المستحاضة أنها تجمع بين الصلاتين الخ

سامرک بأمرین ایھما صنعت الخ اس کے مطلب کو سمجھنے کے لئے دو قول ہیں۔

قول ❶: وہ دو باتیں یہ ہیں کہ ایام ختم ہونے کے بعد غسل کرے پھر ہر نماز کے لئے وضوء کرے۔ دوسرا عمل ہر نماز کے لئے غسل کرنا ہے۔

قول ❷: کہ دونوں نمازوں کو جمع کرکے غسل کرے ہر نماز کے لئے الگ وضوء کرے۔

اقبلت الحیضة یا أدبرت: کا مطلب احناف کے ہاں عادت ہے کہ جب عادت کے ایام ختم ہو جائیں یا واپس آجائیں شوافع کے ہاں اس سے دم کے الوان مراد ہیں۔ اقبال یہ ہے کہ سیاہ خون ہو اور ادبار کا مطلب یہ ہے کہ زرد ہو جائے۔

باب ماجاء فی الحائض انها لاتقضی الصلاۃ

ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا کہ ہم میں سے کوئی عورت ایام حیض کی نمازیں قضا کرے گی۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تو حروریہ تو نہیں، پھر فرمایا جب ہم میں سے کسی کو حیض آتا تھا تو نبی کریم ﷺ کی طرف سے قضاء الصلاۃ کا حکم نہ دیا جاتا تھا۔

پہلی بات: حیض یا نفاس کے دنوں میں ان عورتوں کو حکم ہے کہ نہ نماز پڑھ سکتی ہیں اور نہ روزہ رکھ سکتی ہیں۔ ابن نجیم نے بحر الرائق میں

حیض ونفاس کے بائیس احکام نقل کئے ہیں ان میں سے بعض اتفاقی ہیں بعض اختلافی ہیں یہ اپنی جگہ پر ہے۔

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ حائضہ نے جب نماز نہیں پڑھی تو طاہرہ ہونے کے بعد نماز کی قضا کرے گی یا نہیں، تو بالاتفاق نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ حائضہ جب طاہرہ ہوئی تو روزے کی قضاء کرے گی یا نہیں تو بالاتفاق صوم کی قضا واجب ہے خوارج کہتے ہیں کہ جس طرح حائضہ پر صوم کی قضا واجب ہے حیض ونفاس کے دنوں کی اسی طرح نمازوں کی قضا بھی واجب ہوگی۔

دوسری بات: شریعت نے صوم کی قضاء واجب قرار دی نماز کی واجب نہیں وجہ فرق کیا ہے؟ معارف السنن میں ابوالزناد تابعی اور امام الحرمین کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حکم تعبدی ہے، ہم اس وجہ فرق سے واقف نہیں تمام شرعی احکامات علت پر مبنی ہیں لیکن ہمیں ہر حکم کی علت معلوم ہونا ضروری نہیں کبھی علت معلوم ہوتی ہے کبھی علت معلوم نہیں ہوتی۔

صاحب ہدایہ اور نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ قضاء الصوم لازم ہے کیونکہ یہ سال میں ایک مرتبہ آتا ہے اب رمضان میں جب حیض آئے تو زیادہ سے زیادہ دس روزے ضائع ہوں گے، اور سال بھر میں دس روزے رکھنا کوئی مشکل نہیں بخلاف قضاء صلاۃ کے کہ اگر اس کو لازم قرار دیں تو اس میں حرج ہے کیونکہ ہر مہینے دس دن عندالاحناف اور پندرہ دن عندالشوافع یا سترہ دن عند مالک حیض آئے اور ایک مہینے میں اتنے دنوں کی قضا نماز ادا کرنا بہت مشکل ہے اس لئے قضا کا حکم نہیں دیا۔

تیسری بات: فتاوی زیلعیہ کے حوالے سے بحرالرائق میں ہے کہ ابتداً جب آدم اور حوا علیہما السلام زمین پر اترے اور پہلی دفعہ حواء کو حیض آیا تو انہوں نے آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھا کہ ایام حیض میں عبادت کروں؟ یا نہیں؟ آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا لا اعلم تو اللہ نے وحی بھیجی کی عبادت نہ کرو۔ جب حیض ختم ہوا تو حواء نے پوچھا عبادت کی قضاء کروں یا نہیں آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا مجھے علم نہیں پھر وحی آئی کہ قضا نہیں پھر رمضان میں حوا کو حیض آیا تو انہوں نے خود یا آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے دوسری عبادت پر قیاس کر کے فرمایا کہ روزے کی قضاء نہیں تو پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحی کا انتظار کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسانی کی دوسری بات میں وحی کا انتظار نہیں کیا قیاس کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشقت والا حکم دیا۔

معارف السنن میں ہے کہ شرعی احکام علت پر مبنی ہیں۔ اب کبھی علت نص ہوتی ہے صراحۃً اور کبھی نص علت کی طرف اشارہ کر دیتی ہے اور کبھی نص علت کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتی تو فقہاء اجتہاد سے علت مقرر کرتے ہیں اور فقہاء کے علت نکالنے میں اختلاف ہوتا ہے تو حکم میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔

چوتھی بات: احکام کا علت پر مبنی ہونا ہمارے اعتبار سے ہے۔ ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں کہ اس کی علت کی رجعت اللہ کی طرف ہو۔

باب ماجاء في الجنب والحائض أنهما لايقرآن القرآن

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حائض اور جنبی مرد یا عورت قرآن نہ پڑھیں۔

پہلی بات: یہاں مسئلہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ جنبی مرد یا عورت اور حائضہ اور نفاس والی عورت کے لئے کیا کچھ پڑھنا جائز ہے کیا ناجائز ہے۔ ہمارے فقہاء کہتے ہیں حدث دو قسم پر ہے ① حدث اصغر ② اور حدث اکبر۔ حدث اصغر میں قرآن پڑھنا جائز ہے تو جب قرآن پڑھنا جائز ہے تو اذکار وادعیہ بطریق اولیٰ جائز ہوں گے لیکن حدث اصغر کی حالت میں مس قرآن ممنوع ہے بغیر حائل کے۔

دوسری قسم حدث اکبر کی ہے مثلاً جنابت کی حالت میں یا حیض کی یا نفاس کی حالت یہ سب حدث اکبر میں شامل ہیں۔

حدث اکبر کی حالت کا کیا حکم ہے؟ اس میں تفصیل ہے اذکار کے متعلق اتفاق ہے کہ قرآن کے علاوہ باقی اذکار پڑھنا حدث اکبر میں جائز ہے نبی ﷺ سے بعض ادعیہ پڑھنا ثابت ہے مثلاً نبی ﷺ جماع کے بعد دعا پڑھتے تھے۔

دوسری چیز ہے قرآن مجید کی تلاوت، اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ایک روایت میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، کے نزدیک حدث اکبر میں قرآن پڑھنا جائز نہیں۔ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول یہ ہے کہ کم پڑھ سکتا ہے زیادہ نہیں، احناف کی بھی اسی طرح اقوال ہیں وہ یہ کہ مادون الآیہ پڑھ سکتا ہے اسی طرح وہ آیات جو دعا پر مشتمل ہیں ان کو دعا کی نیت سے پڑھنا جائز ہے۔

معارف السنن میں علامہ انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ یسیر کا استثناء یا مادون الآیۃ کا جو استثناء کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز آیت کے ساتھ متعلق ہے مادون الآیۃ کے ساتھ قرآن کے اعجاز کا تعلق نہیں اس لئے مادون الآیۃ پڑھ سکتا ہے۔

جمہور کی دلیل: ❶ باب والی روایت ہے۔ ❷ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے "کان لایحجبه او لا یحجزه عن القرآن شئ الا الجنابة" مزنی، داؤد اور ابن المنذر کا قول یہ ہے کہ ہر حال میں قرآن پڑھنا جائز ہے تو ان حضرات کے نزدیک جنبی اور حائض قرآن پڑھ سکتے ہیں ان کی دلیل سنن ابوداؤد کی روایت ہے کہ "کان رسول اللّٰه یذکر اللّٰه علی کل احیانه" اور قرآن بھی ذکر ہے کیونکہ "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" آیا ہے اور نبی اکرم ﷺ ہر حالت میں ذکر کرتے تھے، اس میں جنابت کی حالت بھی داخل ہے جنابت حدث اکبر ہے اس میں حیض ونفاس کی حالت بھی شامل ہوگی کیونکہ وہ بھی حدث اکبر ہیں۔

جمہور ان کی دلیل کا جواب دیتے ہیں کہ "کان یذکر علی کل احیانه" میں اذکار متوادہ مراد ہیں اذکار متواردہ سے مراد وہ اذکار ہیں جو آدمی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے بعد پڑھتا ہے۔

دوسری بات: باب کی حدیث سنداً ضعیف ہے کیونکہ اسماعیل بن عیاش کی روایت اہل حجاز وعراق سے معتبر نہیں اور موسیٰ بن عقبہ اہل حجاز میں سے ہیں اس لئے یہ روایت معتبر نہیں ہوگی۔ معارف السنن میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ سے صرف اسماعیل بن عیاش نقل نہیں کرتے بلکہ مغیرہ بن عبدالرحمٰن بھی نقل کرتے ہیں۔ دوسرا اس حدیث کی تائید دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے، مثلاً علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ "کان لایحجبه عن القرآن الا الجنابة" اس لئے اسماعیل بن عیاش کی روایت صحیح ہے۔

باب ماجاء فی مباشرة الحائض

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی تو نبی اکرم ﷺ مجھے حکم دیتے کہ میں ازار باندھوں پھر مافوق الازار مباشرت کرتے تھے، اس باب میں حائضہ سے مباشرت کا جواز ثابت کر رہے ہیں۔

پہلی بات: حائضہ عورت سے جماع بالا جماع حرام ہے قرآن میں اس کی حرمت قطعی طریقے سے بیان کی گئی۔ فرمایا "ویسئلونک عن المحیض قل هو اذی فاعتزلو النساء فی المحیض" اس لئے فقہاء فرماتے ہیں کہ جو حیض کی حالت میں جماع کو حلال سمجھے وہ کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ حرام قطعی کو حلال کہنا اور حلال قطعی کو حرام سمجھنا کفر ہے۔

دوسری بات: حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کا کیا حکم ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ مباشرت دو قسم کی ہے۔

❶ مباشرت مافوق الازار ہو یہ بالاتفاق جمہور کے ہاں جائز ہے۔

❷ مباشرت ماتحت الازار بغیر جماع کے اس میں اختلاف ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کے ہاں جائز نہیں۔ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ

اور محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں جواز کا قول ملتا ہے مگر راجح جمہور کا قول ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے جو جواز ثابت ہے وہ مافوق الازار ہے۔ دوسرا یہ احوط بھی ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو چراگاہ کے اردگرد بکریاں چراتا ہے تو ہوسکتا ہے اس میں بکریاں واقع ہوجائیں تو یہاں بھی ممکن ہے جماع میں واقع ہوجائے جماع حیض کی حالت میں حرام ہے تو اس میں واقع کرنے والی چیز بھی حرام ہوگی۔

باب ماجاء فی مواکلة الجنب والحائض وسورهما

اس باب میں عبداللہ بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا حائضہ کے ساتھ کھاسکتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کھاسکتے ہو۔

پہلی بات: امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ الباب میں جنب اور حائض دونوں کا ذکر کیا ہے جبکہ حدیث میں جنب کا ذکر نہیں فقط حائض کا ذکر ہے معارف السنن میں ہے کہ سنن ترمذی کے بعض نسخوں میں فقط حائض کا ذکر ہے جنب کا ذکر نہیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ مواکلة الحائض وسورھا ہو۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ ترجمۃ الباب میں جو جنب کا ذکر ہے یہ صحیح ہے حدیث میں اگرچہ فقط حائض کا ذکر ہے مگر ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جنب کے حکم کو حائض پر قیاس کر کے ثابت کیا ہے۔

دوسری بات: زمانہ جاہلیت میں حائض کے بارے میں دو قول تھے۔

❶ یہود حائض کا بالکل بائیکاٹ کرتے اور بستی کے باہر مخصوص گھروں میں ان کو بھگا دیتے جب طاہرہ ہوجاتیں تو واپس آجاتیں۔

❷ دوسرا فریق مشرکین کا تھا یہ لوگ حائضہ سے بھی طاہرہ والے تعلقات جاری رکھتے مثلاً جماع وغیرہ کرتے، اب اسلام نے افراط تفریط کے درمیان کا حکم دیا نہ بالکل الگ کرو اور نہ جماع کرو۔ بلکہ گھر میں رکھو اس کے ساتھ کھاؤ پیو اور جماع نہ کرو۔ تو باب کی حدیث میں افراط وتفریط کے درمیان اسلامی حکم بتایا۔

باب ماجاء فی الحائض تتناول الشئ من المسجد

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ مسجد سے چٹائی پکڑاؤ، میں نے کہا میں تو حائضہ ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا مسئلہ یہ ہے کہ حائضہ عورت حالت حیض میں بغیر دخول فی المسجد ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز مسجد سے اٹھائے یا مسجد میں کچھ رکھ دے یہ جائز ہے یا نہیں ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں ہے یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اس کی وجہ علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ ایسے احکام میں قدمین کا اعتبار ہوتا ہے جیسے حرم کے مسائل ہیں کہ غیر محرم حرم کا شکار حدود حرم کے اندر نہیں کرسکتا مگر پرندے کے پاؤں حرم سے باہر ہوں اور سر اندر ہو تو اس کا شکار جائز ہے اور اگر اس کے پاؤں حرم میں ہوں سر باہر حل میں ہو تو اس کا شکار جائز نہیں۔ اگر کیا تو جزاء آئے گی، اسی طرح کوئی حلف اٹھائے کہ فلاں کے گھر میں داخل نہ ہوں گا تو فقط جھانکنے سے حانث نہ ہوگا، اسی طرح یہاں بھی حائضہ کے قدمین کا اعتبار ہے۔

دوسری بات: من المسجد کا متعلق کیا ہے؟ ❶ قال سے متعلق ہے تو معنی ہوگا کہ نبی ﷺ مسجد کے اندر تھے اور اندر سے فرمایا کہ مجھے چٹائی باہر سے دو یہ مفہوم قاضی عیاض نے بیان کیا ہے دوسری روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ "کان معتکفا فی المسجد"۔ ❷ من المسجد ناولینی کا متعلق ہے تو معنی ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور نبی ﷺ دونوں باہر تھے چٹائی مسجد کے اندر تھی تو مطلب یہ ہوا کہ اندر سے چٹائی نکال کر مجھے دو، ابوداؤد نے جو ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اس سے دوسری صورت کی تائید ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة اتیان الحائض

اس باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے حائضہ کے ساتھ جماع کیا یا عورت کے ساتھ دبر میں جماع کیا یا کاہن کے پاس آیا تو اس نے کفر کیا اس چیز کا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کی غرض یہ ہے کہ حائضہ کے ساتھ حالت حیض میں جماع جائز نہیں۔ جمہور امت کا اس کی حرمت پر اجماع ہے لہٰذا یہ مسئلہ مجمع علیہا سے اور مفروق عنہا ہے یعنی اس پر کوئی کلام نہیں۔

دوسری بات: حائضہ کے ساتھ جماع حرام ہے جبکہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کراہۃ کا لفظ ذکر کیا ایسا کیوں کیا ان کو حرمت کا لفظ لانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ کراہیت کا درجہ حرمت سے کم ہے اس لئے کہ کراہیت تب ہوتی ہے جب ثبوت یا دلالت کے اعتبار سے روایت ظنی ہو جبکہ یہاں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے اس لئے کراہیت سے حرمت مراد ہوگی۔

تیسری بات: اس اشکال کا جواب معارف السنن میں ہے کہ یہ درجات متاخرین کے استعمال کے اعتبار سے ہے۔ مگر متقدمین کی اصطلاح الگ ہے۔ ان کے نزدیک کراہیت کا لفظ وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس کا معنی ہے ممانعت اور ممانعت عام ہے کیونکہ حرمت کی بھی ممانعت ہے اور کراہیت کی بھی ممانعت ہے۔ کراہیت کا لفظ حرمت میں استعمال ہوتا ہے متقدمین سے ثابت ہے جیسے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤطا میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

چوتھی بات: دوسرا جملہ ہے "او امرأۃ فی دبرھا" کہ بیوی سے لواطت کی۔ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر نقل کیا ہے اس سے بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے جواز کے قائل تھے۔ بعض نے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھی بیوی سے لواطت کے جواز کا قول منسوب کیا ہے۔ معارف السنن میں ہے تفسیر روح المعانی اور تفسیر قرطبی کے حوالے سے کہ سحنون مالکی صرف مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے جواز کا قول نقل کرتے ہیں۔ باقی مالکیہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے جمہور والا قول نقل کرتے ہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ان پر افتراء ہے۔ دوسری چیز جو ابن عمر کا اثر ہے اس سے اشتباہ ہوتا ہے لیکن ان کی ایک دوسری روایت ہے جو حرمت پر دال ہے کہ کسی نے کہا کہ ہم جاریہ خریدتے ہیں ان سے تحمیض کرتے ہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا تحمیض کیا چیز ہے انہوں نے کہا کہ "اِتیانھا فی الدبر" ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا اُف اُف مسلمان ایسا کر سکتا ہے تو ان سے بھی حرمت ثابت ہے۔

پانچویں بات: تیسرا جملہ ہے "او اتی کاھنا" مقدمہ ابن خلدون کے حوالے سے شامی میں ہے کہ کہانت: "تعاطی الخبر عن الکائنات فی المستقبل و معرفۃ الاسرار" کائنات کے مستقبل کے متعلق کوئی خبر دے یا اسرار کی معرفت کا دعویٰ کرے۔ بلکہ فقہاء کے ہاں کاہن ہر وہ شخص ہے جو اس بات کا اظہار کرے جو عام لوگوں سے چھپی ہوئی ہو اس لئے جو طبیب نبض سے بیماری بتائیں عرب اس کو بھی کاہن کہتے ہیں۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ کہانت دو قسم پر ہے ① کاہن طبعی جیسے عرب میں زمانہ جاہلیت میں ہوتے تھے۔ عرب میں کوئی اختلاف ہوتا تو فیصلے کے لئے کاہنوں کے پاس جاتے تھے۔ جیسے کہ ہندہ کے شوہر نے اس پر زنا کی تہمت لگائی انہوں نے انکار کیا یہ فیصلے کے لئے یمن کے کاہن کے پاس گئے کاہن نے ہندہ کی تصدیق کی پھر انہوں نے طلاق لے کر ابوسفیان سے نکاح کیا۔ ② کاہن کسبی کہ کہانت کسب سے سیکھتے اور اسرار کے متعلق جاننے کا دعویٰ کرتے تھے۔ فقہاء کہتے ہیں کہ دونوں قسم کی کہانت حرام ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مداری جو شعبدہ بازی کرتے ہیں یہ بھی کاہنوں کے حکم میں ہیں ان کے کھیل کو دیکھنا ان کے مجمعوں میں کھڑا ہونا بھی حرام ہے، کیونکہ اس سے اہل اسلام التباس اور اشتباہ میں پڑتے ہیں ان کا عقیدہ کمزور ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ

کے علاوہ لوگ بھی اسرار جانتے ہیں اس لئے فقہاء نے کاہنوں کے کے پاس جانے کو حرام کہا۔

چھٹی بات: "فقد کفر بما انزل علی محمد ﷺ" یہاں اصولی مسئلہ ہے اور اس میں اختلاف بھی ہے وہ مسئلہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہوتا ہے یا نہیں معتزلہ کے ہاں مسلمان نہیں رہتا، اور کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا اس کی تعبیر یہ لوگ منزلۃ بین المنزلتین سے کرتے ہیں۔

دوسرا قول خوارج کا ہے ان کا مذہب یہ ہے کہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ باب کی حدیث سے بظاہر خوارج کی تائید ہوتی ہے اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تاویل کی ہے ان دلائل کی وجہ سے جن سے ثابت ہے کہ ارتکاب کبیرہ سے آدمی ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

تاویل ① ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کفر کی نسبت اس آدمی کی طرف تغلیظاً وتشدیداً ہے کیونکہ دوسرے باب میں ہے کہ جو حائضہ سے جماع کرے وہ دینار صدقہ کرے، اگر اس عمل سے وہ کافر ہو جاتا تو اس کو صدقہ کا حکم نہ ہوتا جب شریعت نے صدقہ یا کفارے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ شریعت کے ہاں کافر نہیں ہوا اس لئے یہاں تغلیظاً کافر کہا۔

تاویل ② جو حالت حیض میں وطی یا جماع فی الدبر کو حلال سمجھے کہانت کو حلال سمجھے وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

تاویل ③ کفر سے ناشکری مراد ہے جیسے بخاری نے نقل کیا ہے "باب کفر دون کفر" اس میں حدیث ہے، کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جہنم میں عورتوں کو زیادہ دیکھا کسی نے سوال کیا کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "یکفرن" سوال کیا "ایکفرن باللہ" فرمایا "یکفرن العشیر" معلوم ہوا کفر ناشکری کے معنے میں استعمال ہوتا ہے یہ تاویلات اہلسنت کرتے ہیں اور اس لئے کہ دوسری قطعی دلیلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر نہیں۔

باب ماجاء فی الکفارة فی ذلک

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ جس نے حالت حیض میں بیوی سے جماع کیا وہ نصف دینار صدقہ کرے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک دینار دے گا، آگے تطبیق بھی ہے کہ ابتداء ایام میں جماع کرے تو دینار دے گا، آخر میں جماع کرے تو نصف دینار دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ابتدائی ایام میں ایک دینار اس لئے ہے کہ ابھی ابھی طہارت کے دن گزرے ہیں اس میں جماع کر سکتا تھا لیکن چند دن کے بعد جماع کرنا بڑا جرم ہے، لیکن آخر میں چونکہ ممکن ہے شوق بڑھ گیا ہو اسلئے جرم کو ہلکا سمجھ کر آدھا دینار کہا۔

اختلاف مسئلہ: اس کفارے کا حکم کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ قول جدید میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بقول خطابی جمہور علماء فقہاء ومحدثین کے ہاں اس کفارے کا حکم استحبابی ہے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور قول قدیم میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ تصدق بدینار یا بنصف دینار واجب ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ حکم وجوبی کے ثبوت کے لئے قطعی دلیل ہونی چاہیئے جبکہ یہاں کی دونوں روایتیں سنداً قوی نہیں اس لئے ان سے وجوب ثابت نہ ہوگا صرف استحباب ثابت ہوگا۔

باب ماجاء فی غسل دم الحیض من الثوب

ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا اس کپڑے کے بارے میں جس پر حیض کا خون لگا ہو آپ ﷺ نے فرمایا "حتیه ثم اقرصیه بالماء ثم رشیه وصلی فیه" کہ پہلے کرید و پھر ہاتھ کی انگلیوں سے ملو پھر اس پر پانی بہا دو پھر اس میں نماز پڑھو۔

پہلی بات: باب کا مسئلہ یہ ہے کہ حیض کا خون کپڑے کو لگ جائے یہ نجس ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء ومحدثین کہتے ہیں کہ دم حیض نجس ہے البتہ تطہیر میں تھوڑا اختلاف ہے، مگر نجاست میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری بات: شارحین یہاں مسئلہ ذکر کرتے ہیں کہ نجاست غلیظہ میں قدر معفو کتنا ہے؟ مثلاً پانی نہیں ملا کہ دھولے تو نماز پڑھنے کے لئے کتنی مقدار معفو ہے۔ فقہائے کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ قدر درہم سے کم معاف ہے درہم کی مقدار سے زیادہ ہو تو اسی کپڑے میں نماز پڑھنا حرام ہے اور قدر درہم ہو تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور درہم سے کم ہو تو نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔

احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے کئی اقوال ہیں ① بقدر شبر معاف ہے ② بمقدار کف معاف ہے ③ نماز سے پہلے علم ہو تو مقدار درہم سے کم معاف ہے لیکن نماز کے بعد علم ہو جائے تو مقدار درہم سے بھی زیادہ معاف ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ بھی احناف کے ساتھ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل معاف نہیں اگرچہ متاخرین شوافع بھی جمہور کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔

باب ماجاء کم تمکث النفساء

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں نفساء چالیس دن تک مدت نفاس گزارتی تھیں فرماتی ہیں کہ ہم اپنے چہروں پر ورس نامی گھاس لیپ دیتی تھیں جھائیوں کے ڈر سے (کہ جھائیاں نہ پیدا ہو جائیں)

مسئلہ: باب کی حدیث میں یہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اکثر مدت نفاس کتنی ہے۔

پہلی بات: نفست المرأة بمعنی اذاولدت کہ ولادت کے بعد جو خون آتا ہے وہ نفاس کہلاتا ہے۔ اور جب تک خون آئے اس کو مدت نفاس کہتے ہیں۔

دوسری بات: مدت نفاس کا جانب اقل متعین نہیں اس میں تمام امت کا اتفاق ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ نفاس کا خون بالکل نہ آئے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو دن آئے پھر ختم ہو جائے اس لئے عدد اقل متعین نہیں۔

تیسری بات: مدت اکثر کیا ہے اس میں اختلاف ہے، امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکثرت مدت نفاس چالیس دن ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان میں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ذکر کیا ہے مگر یہ غلطی ہے ان کا صحیح تر قول ساٹھ دن کا ہے۔ دوسرا قول حسن بصری کا ہے ان کے ہاں اکثر مدت نفاس پچاس دن ہے، تیسرا قول عطاء بن ابی رباح، شعبی اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکثر مدت ساٹھ دن ہے باب کی حدیث سے اول قول جو جمہور کا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔

چوتھی بات: اشکال: باب کی حدیث میں چالیس دن سے زیادہ کی نفی نہیں صرف چالیس دن کی تصدیق ہوتی ہے جو جمہور کا مسلک ہے۔ مگر اس میں زیادتی کی نفی نہیں گزر چکا ہے کہ جس طرح حیض کی اقل واکثر مدت کے اقوال تجربے پر مبنی ہیں اسی طرح یہاں بھی تجربے کی بات ہے جس طرح حیض میں بعض روایات میں صراحۃً اقل یا اکثر مدت معلوم نہ ہوتی ہے اور جن سے صراحۃً معلوم ہوتی ہے وہ سنداً ضعیف ہیں اسی طرح یہاں نفاس میں بھی ہے۔

پانچویں بات: فقہاء نے چالیس دن کی مدت مقرر کرنے کی حکمت نقل کی ہے وہ یہ کی نطفہ جب رحم میں قرار پکڑے تو خون آنا بند ہو جاتا ہے۔ چار ماہ تک نطفہ مراحل طے کرتا ہے چار ماہ بعد روح ڈالی جاتی ہے، اس کے بعد یہ خون ماں کے رحم میں بچے کی غذا کا کام دیتا ہے، نالی کے ذریعے بچہ اس کو استعمال کرتا ہے تو چار ماہ کے بعد والا خون بچہ کھالیتا ہے، لیکن چار ماہ کا خون رحم میں جمع ہوتا ہے اور ہر ماہ

احناف کے ہاں اکثر مدت حیض دس دن ہے، تو چار ماہ کا خون کل چالیس دن بنتا ہے، جونفاس کی صورت میں نکلتا ہے، اس علئے اکثر مدت نفاس چالیس دن ہے یہ نکتہ احناف کے مسلک کے مطابق ہے ورنہ جن کے ہاں اکثر مدت حیض پندرہ یا سترہ ہے ان کے ہاں یہ نکتہ نہیں بن سکتا ہے۔

باب ماجاء في الرجل يطوف على نسائه بغسل واحد

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنی ازواج کا قربان کرتے تھے ایک غسل کے ساتھ۔

مسئلہ: باب کا مسئلہ یہ ہے کہ کسی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اور وہ سب سے جماع کرے اور آخر میں غسل کرے یہ جائز ہے یا نہیں، تو حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ صورت جائز ہے، اور یہ جواز اتفاقی ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ہر ایک سے جماع کے بعد الگ الگ غسل کرے اور نبی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے ہر جماع کے لئے الگ غسل کیا اور فرمایا "فانه اذکی و اطهر"

دوسری بحث: شریعت میں تقسیم واجب ہے کہ کسی کی زائد بیویاں ہوں تو باری مقرر کرنا واجب ہے اور ایک کی باری میں دوسری کے پاس جانا جائز نہیں لیکن نبی کریم ﷺ ایک کی باری میں دوسری بیویوں کے پاس کیسے گئے؟ اس کے متعدد جوابات ہیں۔

جواب نمبر ❶: نبی اکرم ﷺ کے لئے قسم واجب نہ تھی کیونکہ قرآن میں ہے "تو تی الملک من تشاء الخ"

جواب نمبر ❷: یہ واقعہ سفر سے واپسی کا ہے اور کسی کے پاس زیادہ بیویاں ہوں تو اس کو سفر میں اختیار ہے جس کو لے جانا چاہے لے جائے، سفر میں قسم واجب نہیں البتہ قرعہ ڈالنا مستحب ہے، اب جب سفر سے واپس آئے اس وقت باری شروع نہ ہوئی تھی کہ ایسا کیا۔

جواب نمبر ❸: یہ واقعہ ایک باری کے ختم ہونے کے بعد پیش آیا مثلاً ہر بیوی کے پاس تین تین دن گزارے جب سب کی باری پوری ہوئی تو ایسا کیا۔

جواب نمبر ❹: صاحبۃ النوبہ کی اجازت سے ایسا ہوا ہے اور شریعت نے جو منع کیا ہے وہ صاحبۃ النوبہ کے حق کی وجہ سے منع کیا ہے جب وہ خود اجازت دیدے تو صحیح ہے۔

جواب نمبر ❺: نبی اکرم ﷺ کا دن رات میں ایک خصوصی وقت تھا جو ان کا اپنا حق تھا یہ واقعہ اس وقت میں ہوا۔

جواب نمبر ❻: یہ واقعہ حجۃ الوداع کے سفر کا ہے یہ واقعہ دو دفعہ پیش آیا ایک حجۃ الوداع میں جاتے وقت احرام باندھنے سے پہلے ایسا کیا تھا اور فقہاء کہتے ہیں کہ حج کا احرام باندھنے سے پہلے بیوی سے جماع مستحب ہے تا کہ قلب کو سکون ہو اور یہ استحباب تب حاصل ہوگا جب سب سے جماع کریں، اور فقہاء کہتے ہیں کہ احرام کھولنے کے بعد بھی جماع مستحب ہے، اس لئے حضور ﷺ نے دوسری مرتبہ واپسی پر سب سے جماع کیا، تا کہ سب کو استحباب حاصل ہو جائے۔

باب ماجاء اذا اراد أن يعود توضأ

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے جماع کرے پھر دوبارہ جماع کرنا چاہے تو دونوں جماعوں کے درمیان وضوء کرلے درمیان میں وضوء کرنا مستحب ہے۔

مسئلہ: دو جماعوں کے درمیان وضوء کا حکم کیا ہے تو ائمہ اربعہ جمہور فقہاء و محدثین کے ہاں یہ وضوء مستحب ہے، تابعین میں سے عطاء قتادہ، ابن سیرین، حسن بصری کی طرف وجوب کا قول منسوب ہے، اور متاخرین میں اہل ظواہر اور ابن حبیب مالکی سے بھی وجوب کا قول منقول ہے، باب کی حدیث سے بظاہر وجوب معلوم ہو رہا ہے کیونکہ امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ اور یہاں بھی امر ہے، مگر جمہور کہتے ہیں کہ

بعض روایات میں اضافہ ہے کہ "فانہ انشط للعود" یہ بتاتا ہے کہ امر وجوبی نہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ امر وجوب کے لئے ہوتا ہے مگر قرینہ صارفہ عن الوجوب ہو تو امر وجوبی نہیں ہوگا یہاں بھی فانہ انشط للعود قرینہ صارفہ عن الوجوب ہے۔

باب ماجاء اذا أقيمت الصلاة ووجد احدكم الخلاء فليبدأ بالخلاء

عبداللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ قوم کے امام تھے ایک دفعہ اقامت ہوئی انہوں نے دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے اور تم میں سے کسی کو خلاء کی حاجت ہو تو پہلے حاجت کو پورا کرے۔

مسئلہ: یہ مسئلہ اعذار ترک جماعت کا ہے کہ کون سے اعذار ہیں جن کی وجہ سے جماعت ترک کرنا جائز ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیس اعذار کو ذکر کیا ہے. جماعت کے حکم میں اختلاف ہے ① فرض عین ہے ② فرض کفایہ ہے ③ واجب ہے ④ سنت مؤکدہ ہے ⑤ مستحب ہے ⑥ نماز کے لئے شرط ہے تو حکم میں اختلاف ہے جن کے ہاں حکم میں سختی ہے ان کے ہاں اعذار میں وسعت ہے اور جن کے ہاں حکم میں نرمی ہے ان کے ہاں اعذار میں کمی اور سختی ہے تو سب کے ہاں ترک جماعت کے اعذار موجود ہیں۔ احناف کے ہاں بیس اعذار ہیں ان میں سے ایک باب کی حدیث میں موجود ہے کہ جماعت تیار ہو مگر اس کو پاخانے یا پیشاب کی ضرورت ہو تو وہ جماعت چھوڑ سکتا ہے دوسری جماعتوں کی امید ہو یا نہ ہو اب اگر کسی نے جبر کر کے ایسی حالت میں نماز پڑھ لی۔ تو احناف، شوافع، حنابلہ کے ہاں نماز ہو جائے گی "مع الکراہت" لیکن مالکیہ کے ہاں اعادہ واجب ہے۔

باب ماجاء في الوضوء من الموطى

عبدالرحمٰن بن عوف کی ام ولد سے مروی ہے کہ ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے دامن کو لمبا کر دیتی ہوں، اور کبھی ایسے راستے پر چلتی ہوں جس پر گندگی ہوتی ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ بعد والی پاک زمین ماقبل والی ناپاک زمین کے اثر کو پاک کر دیتی ہے۔ دوسری حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور وضوء نہیں کرتے تھے گندگی کے پامال کرنے سے۔

پہلی بات: شارحین نے ان احادیث کی تشریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باب کی حدیث کا حکم عمومی نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ تفصیل یہ ہے کہ اگر تر نجاست ہو ذی جرم نہ ہو اس نجاست کے ساتھ کپڑا لگ جائے مثلاً وضوء کے بعد بول والی زمین سے گزرا۔ جس کی وجہ سے اس کے کپڑے کے ساتھ نجاست لگ گئی۔ پھر آگے پاک زمین سے وہ کپڑا گزرتا گیا تو بالاتفاق وہ کپڑا بغیر دھوئے پاک نہیں ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وضوء کرنے کے بعد بول سے ننگے پاؤں گذرے جس کا اثر پاؤں پر لگا پھر پاک زمین سے گزرے تو پاؤں پاک ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کے ہاں پاک نہ ہوگا۔ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ واحمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول یہ ہے کہ پاک زمین پر چلنے سے پاؤں پاک ہو جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تر نجاست ہو مگر ذی جرم ہو جیسے انسان کی گندگی، اب کسی نے وضوء کیا اور انسان کی تر غلاظت سے گزرا جس سے پاؤں ملوث ہو گیا بعد میں پاک زمین پر چلا تو پاک ہوگا یا نہیں؟ یا کپڑے کے ساتھ تر نجاست لگی پھر کپڑا زمین کے ساتھ رگڑتا گیا تو بالاتفاق دھوئے بغیر نہ کپڑا پاک ہوگا نہ بدن پاک ہوگا۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ انسان نے وضوء کیا پھر خشک نجاست والی زمین سے گزرا اس خشک نجاست کے ساتھ پاؤں لگا یا کپڑا لگا تو جمہور فقہاء ائمہ اربعہ ومحدثین کے نزدیک باب کی حدیث اس صورت پر محمول ہے اب آخری صورت پر محمول ہونے کی کیا ضرورت ہے تو

یہاں اصل میں اشکال ہے کہ پاؤں گیلا تھا جب وہ خشک نجاست اس کے ساتھ لگی تو پاؤں ناپاک ہونا چاہیئے۔اس پر فقہاء دو باتیں بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ یہ مذکورہ اعتراض صحیح ہے باب کی حدیث کا محمل یہ ہے کہ بدن بھی خشک ہو نجاست بھی خشک ہو پھر مابعد پاک کرے گا لیکن پاؤں تر ہو نجاست خشک ہو تو پاؤں ناپاک ہوگا۔

دوسری بات: بعض محدثین کے ہاں یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ یہاں ام ولد کا جو ذکر ہے یہ ہود بن عبدالرحمٰن کی ہے یا ابراہیم بن عبدالرحمٰن کی۔یہ ام ولد مجہول ہے اس لئے باب کی حدیث قابل استدلال نہیں۔فقہاء نے اپنے اقوال کا استنباط باب کی حدیث سے نہیں کیا۔دوسرے نصوص سے کیا ہے علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باب کی حدیث میں جواب علی اسلوب الحکیم ہے کیونکہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نجاست کا مشاہدہ نہیں کیا فقط شبہ کی بنا پر سوال کیا تھا تو نبی ﷺ نے یطہرہ مابعدہ سے اس شبہے کا جواب دیدیا۔جس شبہے کا کوئی منشاء نہ تھا، یعنی مقصد یہ تھا کہ یہاں ناپاک ہونا یقینی نہیں کہ اگر تمہیں شبہ ہو رہا ہے ناپاکی کا تو چلو بعد والی پاک زمین سے رگڑ کھا کر پاک ہو جائے گا۔

باب ماجاء فی التیمم

عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انکو تیمّم کا حکم دیا چہرے اور کفین کے لئے۔

تیمّم کی تعریف: تیمّم یمم سے ہے بمعنی قصد، معارف السنن میں ہے "ولا آدری اذا یممت أرضاً ارید الخیل" معلوم ہوا کہ کلام عرب میں یمم کا لفظ قصد کے لئے استعمال ہوا ہے۔یہ تو لغوی معنی تھا، اب شرعی معنی کیا ہے؟ تو معارف السنن میں اس کی شرعی تعریف ہے "قصد الصعید الطیب بصفة مخصوصة لرفع الحدث او لاباحة الصلاة او لامتثال الأمر عند عدم الماء حقیقة او حکماً" حکماً کا مطلب یہ ہے کہ پانی موجود ہے مگر عذر کی وجہ سے پانی استعمال نہیں کرسکتا۔

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ تیمّم کا جواز قرآن سے بھی ثابت ہے "فان لم تجدوا ماء فتیمموا صعیداً طیباً" احادیث متواترہ سے بھی اس کا جواز ثابت ہے اور اس کا جواز اجماع امت سے بھی ثابت ہے۔

دوسری بات: جمہور کے ہاں تیمّم حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں سے جائز ہے، حدث اکبر میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اختلاف تھا مگر گزر چکا ہے کہ انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔ابراہیم نخعی بھی حدث اکبر میں جواز کے قائل نہ تھے۔

تیسری بات: تیمّم کے بہت سے مسائل ہیں کچھ اتفاقی ہیں کچھ اختلافی ہیں۔باب کی حدیث میں شارحین نے صرف دو کو ذکر کیا ہے جو باب کی حدیث سے متعلق ہیں۔ ① فعل تیمّم ② محل تیمّم کیا ہے۔ان دونوں میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

فعل التیمم: اس کا یہ عنوان بھی ہوسکتا ہے کہ تعداد ضربات میں ائمہ کا اختلاف ہے۔کہ تیمّم کی کتنی ضربات ہیں۔

پہلا قول: احمد، اسحٰق، اوزاعی اور بعض کے ہاں اکثر محدثین کا قول یہ ہے کہ تیمّم ضربة للوجہ والکفین کہ ایک ہی ضرب چہرے پر پھر کفین پر ملے۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ تیمّم دو ضربیں ضربة للوجہ وضربة للیدین ہے۔یہ قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ، فقہائے کوفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مشہور قول میں امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ہے گویا یہ دوسرا قول جمہور فقہاء کا ہے۔

تیسرا قول: یہ ہے کہ تیمّم کی دو ضربیں ہیں اس طرح کہ پہلی ضرب کو چہرے اور یدین پر ملے پھر دوسری ضرب کو بھی چہرے اور یدین پر ملے یہ حسن بن حی اور ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے۔

چوتھا قول: تیمّم کے دوضربیں ہیں پہلا چہرے کے لئے دوسرا کفین تک واجب ہے مرفقین تک مستحب ہے، یہ مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

پانچواں قول: تیمّم تین ضربیں ہیں ایک خاص چہرے کے لئے، دوسرا خاص یدین کے لئے، تیسرا دونوں کے لئے ہے۔

چھٹا قول: تیمّم کے چار ضربات ہیں دوضربیں چہرے کے لئے ہیں اور دوضربیں یدین کے لئے ہیں۔

محل تیمّم: محل تیمّم میں بھی اختلاف ہے ① احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اسحق رحمۃ اللہ تعالیٰ اور اوزاعی کے ہاں تیمّم کا محل وجہ اور کفین ہے ② جمہور کے ہاں اسی طرح امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کا محل وجہ اور یدین الی المرفقین ہے۔ ③ مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا محل چہرہ اور یدین کفین تک واجب اور مرفقین تک مستحب ہے ④ محل چہرہ اور یدین الی الآباط ہے۔ یہ ابن شہاب زہری کا مسلک ہے۔

ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیمّم مین عمار کی روایت میں وجہ اور کفین کا ذکر بھی ہے اور وجہ اور یدین کا ذکر بھی ہے اور وجہ اور آباط کا بھی ذکر ہے تو سب صورتیں منقول ہیں ان احادیث کا مرتبہ کیا ہے تو معارف السنن میں ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے منقول ہے کہ اس مسئلے میں صرف دو صحابہ سے صحیح روایات منقول ہیں ایک تو عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرا ابوجہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق خلاصہ یہ ہوا کہ باقی روایات سنداً صحیح نہیں صرف دو صحابہ کی روایت صحیح ہیں ان پر کلام کریں گے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابوجہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یدین کا ذکر مجمل ہے اس لئے اجمال کی وجہ سے ان کی روایت صریح صورت پر دال نہیں باقی رہ گئی عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت تو اس میں اضطراب ہے اس میں تین صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔

① وجہ اور یدین مع المرفقین ② وجہ اور یدین الی الآباط ③ وجہ اور یدین مع الکفین۔ احناف اور جمہور نے کہا تیمّم ضربتان ہے اور دوسرا اس کا محل وجہ اور یدین الی المرفقین ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث دارقطنی مستدرک حاکم میں ہے انہوں نے اس کو علی شرط شیخین کہا ہے وہ مرفوعاً اور موقوفاً منقول ہے۔ "التمیم ضربتان ضربة للوجه وضربة للذراعين الى المرفقين" دوسرے الفاظ میں "وضربة لليدين الى المرفقين" یہ قولی روایت بھی ہے اور سنداً بھی صحیح اور قوی ہے اس میں اجمال بھی نہیں صرف رفع اور وقف کا اختلاف ہے، جو مضر نہیں جبکہ دوسرے احادیث والے وجوہ ضعف بھی اس مین نہیں اس لئے جمہور نے اس کو لیا۔

آخری بات: ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ذکر کیا ہے کہ وضوء کے مسئلے میں فرمایا "وايديكم الى المرافق" گویا غایت لائی مگر آیت تیمّم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غایت کا ذکر نہیں کیا اس لئے دوسری آیت ہے "السارق والسارقة فاقطعو ايديهما" یہاں بھی غایت نہیں جب یہاں کفین تک مراد ہے تو تیمّم بھی کفین تک ہوگا۔

جمہور جواب دیتے ہیں کہ جب مرفوع قوی حدیث آ گئی تو صحابہ کا قیاس معتبر نہیں اور اگر قیاس کرنا بھی ہو تو عبادت کا قیاس عبادت پر کرو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم نے عبادت کو عقوبت پر قیاس کیا جبکہ اس کو عبادات پر قیاس کرنا چاہیئے۔ اور وہ وضوء ہے وضوء میں مرفقین تک دھویا جاتا ہے تیمّم میں بھی مرفقین تک دھونا چاہیئے۔

طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیمّم میں جو اعضاء ساقط ہوئے وہ پورے ساقط ہوئے اور جو ساقط نہیں ہوئے جیسے چہرہ یہ پورا ساقط نہیں ہوا تو اسی طرح یدین بھی پورے ساقط نہیں ہوں گے بلکہ پورے پر مسح ہوگا جہاں تک دھویا جاتا تھا یہ نہیں کہ آدھا ساقط ہو اور آدھے پر تیمّم کیا جائے۔

باب ماجاء في الرجل يقرأ القرآن على كل حال مالم يكن جنبًا

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں قرآن پڑھاتے تھے ہر حالت میں جب تک جنبی نہ ہوں۔

باب کی حدیث کا مسئلہ گزر چکا ہے کہ حدث اکبر کی حالت میں قرآن پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ تو جمہور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حدث اکبر کی حالت میں قرآن کی تلاوت کی نیت سے پڑھنا جائز نہیں البتہ ابن منذر طبری اور بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جنبی قرآن پڑھ سکتا ہے باب کی حدیث جمہور کی متدل ہے اس میں ہے کہ جنابت کی حالت کے علاوہ قرآن پڑھاتے تھے معلوم ہوا کہ جنابت کی حالت میں قرأت قرآن جائز نہیں دوسری حالت ہے حدث اصغر کی اس میں قرآن پڑھنا جائز ہے جب قرآن پڑھنا جائز ہے تو باقی اذکار بطریق اولیٰ جائز ہوں گے لیکن حدث اکبر میں اذکار جائز ہیں جمہور کے ہاں قرآن پڑھنا جائز نہیں۔

دوسرا مسئلہ: مس مصحف کا ہے۔ اس میں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وضوء کے بغیر مصحف کو مس کرنا جائز نہیں۔ دلیل وہ روایت ہے جس میں ہے "لایمس القرآن الطاھر" یہ پانچ صحابہ سے منقول ہے۔ عمر بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حکیم بن حزام رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مصحف کو مس کرنے کے لئے طہارت (وضوء) شرط نہیں بلکہ بغیر طہارت کے بھی جائز ہے مگر جمہور کا مسلک حدیث مذکورہ کی وجہ سے راجح ہے۔

باب ماجاء في البول يصيب الارض

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اعرابی مسجد میں آیا نبی ﷺ بیٹھے ہوئے تھے پھر اعرابی نے نماز پڑھی اور دعا کی اے اللہ مجھ پر اور محمد (ﷺ) پر رحم کر، اور ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ فرما نبی اکرم ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی وسیع رحمت کو تنگ کر دیا، کچھ دیر بعد اعرابی نے مسجد میں بول کیا، لوگ اس کی طرف دوڑے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس پر ایک ڈھول پانی بہادو پھر فرمایا تم آسانی پیدا کرنے والے مقرر کئے گئے ہو سختی کرنے والے نہیں۔

پہلی بات: اس حدیث میں مسئلہ یہ بیان کر رہے ہیں کہ زمین اگر نجس ہو جائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

دوسری بات: اعرابی اعراب کی طرف منسوب ہے بمعنی دیہاتی جو شہر میں نہ رہتا ہو اس کا واحد نہیں بلکہ یہ لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے۔

تیسری بات: یہ اعرابی کون ہے، اس کے نام میں محدثین نے کلام کیا ہے، اس کے نام میں کئی اقوال ہیں ① عیینہ بن حصن نام ہے ② اقرع بن حابس مراد ہے۔ یہ نبی ﷺ کے زمانے میں مسلمان ہوا پھر مرتد ہوا، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں پکڑا گیا، بچوں نے کہا اے اللہ کے دشمن تو مرتد ہو گیا اس نے کہا میں تو اسلام ہی نہیں لایا تھا۔ ③ ذوالخویصرہ اس لقب سے دو آدمی مشہور ہیں ① تمیمی ② یمانی۔ بعض نے کہا کہ اس سے ذوالخویصرہ تمیمی مراد ہے جس کا نام رقوص بن زہیر ہے یہ خوارج کا سردار بن گیا تھا۔ بعض نے کہا کہ ذوالخویصرہ یمانی مراد ہے اس کے ناموں میں بھی اختلاف ہے علامہ سیوطی نے شرح مؤطا میں لکھا ہے کہ اس کے بارے میں محدثین کہتے ہیں۔ "ھو القائل والبائل والسائل" قائل اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اللّٰھم ارحمنی ومحمدًا کا نعرہ لگایا تھا، بائل اس لئے کہا کہ اس نے مسجد میں پیشاب کیا سائل اس لئے کہا کیونکہ اس نے قیامت آنے کا سوال کیا کہ کب آئے گی تو نبی ﷺ نے فرمایا تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے اس نے کہا مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے اور کوئی تیاری نہیں کی آپ نے فرمایا "لمرأ مع من أحب".

چوتھی بات: زمین نجس ہو جائے تو اس کی طہارت کی صورت کیا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک صورت یہ ہے جو باب کی

حدیث میں موجود ہے کہ نجاست پر پانی بہادیا جائے جب زمین سخت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ زمین پر بول کیا جائے پھر وہ خشک ہو جائے تو زمین طاہر ہو جاتی ہے لیکن مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے احناف کے ہاں خشک ہونے سے زمین پاک نہیں ہوتی، ان کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے پانی بہانے کا حکم دیا۔ خشک ہونے سے پاک ہوتی ہے تو دھونے کا حکم نہ دیتے، احناف کی دلیل سنن ابی داؤد میں ہے بخاری نے بھی تعلیقاً نقل کیا ہے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ میں نوجوان تھا مسجد میں رات کو سوتا تھا نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں "وكانت الكلاب تبول وتقبل وتدبر في المسجد" پھر جب صحابہ آتے تو اس پر پانی نہ بہاتے، بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تبول کا لفظ نہیں لایا ہے ابوداؤد نے لایا ہے۔ اب کتے پیشاب کرتے جب خشک ہو جاتا تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بغیر دھونے کے نماز پڑھتے تھے، علامہ خطابی نے معالم السنن میں اس کی تاویل کی ہے کہ کتے مسجد سے باہر پیشاب کرتے اور پھر اندر آتے تھے شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اتنے سمجھدار تھے تو شاید استنجاء بھی کرتے ہوں گے، یہ بیکار تاویل ہے۔

مصنف عبدالرزاق اور نصب الرایہ میں پانچ آثار ہیں جن میں سے بعض میں ہے "زكواة الارض يبسها" بعض میں یہ الفاظ ہیں "جفوف الأرض طهورها" بعض میں دوسرے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خشک ہونا بھی پاک ہونے کی صورت ہے باقی باب کی حدیث میں ایک صورت ہے اس سے دوسری صورتوں کی نفی نہیں ہوتی۔

پانچویں بات: حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ زمین نرم ہو تو پانی ڈالو تا کہ وہ چوس لے نجاست اندر چلی جائے، اور زمین سخت ہو تو اس کی مٹی کھود کر نکالی جائے، یہ تب جب جلدی صفائی کی ضرورت ہو جلدی ضرورت نہ ہو تو خشک ہو جانا کافی ہے۔

انما بعثتم ميسرين ولم تبعثوا معسرين الخ ،اصل مبعوث نبی کریم ﷺ ہیں لیکن جن امور کے لئے نبی اکرم ﷺ کو بھیجا گیا ہے انہوں نے وہ امور امت کے حوالے کئے، اس لئے امت کے لئے مبعوث کا لفظ استعمال کیا مجازاً حقیقۃً یہ اطلاق صحیح نہیں۔ تم ابواب الطہارۃ۔

ابواب الصلاۃ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب مواقيت الصلاة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

پہلی بات: صلوٰۃ کو مصنف نے طہارت کے بعد ذکر کیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سنن کی کتابیں فقہی ترتیب پر ہوتی ہیں اور فقہاء پہلے طہارت کے ابواب پھر صلاۃ کے ابواب کو ذکر کرتے ہیں تو سنن ترمذی میں بھی ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فقہاء کی ترتیب کے مطابق ابواب الطہارۃ کے بعد ابواب الصلاۃ کو ذکر کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابواب الصلاۃ کے لئے ابواب الطہارت بمنزلہ شرط کے ہے اس لئے شرط (طہارت) کو پہلے ذکر کیا اور شرط کا تقاضا ہے کہ مشروط کو اس کے بعد بغیر وقفے کے ذکر کیا جائے، اس لئے ابواب الصلاۃ کو اس کے بعد لے آئے۔

دوسری بات: مصنف نے ابواب کا لفظ لایا، کتاب الصلاۃ نہیں کہا، کیونکہ ابواب (جمع کا لفظ) کتاب کے معنے میں استعمال ہوتا ہے اس لئے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ابواب کو کتاب کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

تیسری بات: صلاۃ کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے معارف السنن میں ہے کہ دعا کے معنی میں بھی آتا ہے بعض کہتے ہیں کہ صلاۃ کا اصل اور حقیقی معنی دعاء ہی ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے ﴿وصل علیهم ان صلاتک سکن لهم﴾ یہاں مفسرین کے ہاں صلاۃ دعا کے معنے میں ہے اور نماز بھی دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے نماز پر صلاۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ صلاۃ بمعنی رحمت کے ہے اور صلاۃ بھی رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے تیسرا قول یہ ہے کہ صلیت العود سے ماخوذ ہے کیونکہ لکڑی ٹیڑھی ہو اس کو سیدھا کرنے کے لئے آگ میں ڈالا جاتا ہے پھر نکال کر ہموار زمین پر رکھ کر اوپر پتھر رکھ کر سیدھا کیا جاتا ہے، اور نماز سے بھی دل سیدھے ہوتے ہیں۔ چوتھا قول ہے کہ یہ مصلی سے ماخوذ ہے یعنی وہ گھوڑا جو دوسرے نمبر پر آئے اور مجلی کے تابع ہو اور یہاں بھی نمازی نماز اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے لئے پڑھتا ہے یا نبی ﷺ کی اتباع کرتا ہے یا امام کے تابع ہوتا ہے اس لئے اس عمل کو صلاۃ اور نمازی کو مصلی کہتے ہیں۔ پانچواں قول ہے تحریک الصلوین اور نماز میں بھی یہ معنی ماخوذ ہوتا ہے اس لئے اس کو صلاۃ کہتے ہیں کہ معارف السنن میں ہے کہ پہلا قول کہ صلاۃ بمعنی دعا ہے اور نماز بھی دعا پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے تو صلاۃ کا اطلاق نماز پر مجازاً ہے یا حقیقت عرفیہ کے تحت ہوتا ہے۔

چوتھی بات: نماز کی تعریف: عبادت مخصوص جو مخصوص طریقے سے ادا کیا جائے یعنی "عبادۃ مخصوصۃ بصفۃ مخصوصۃ" اور مخصوص صفت کی تفصیل آگے ابواب میں آئے گا۔

پانچویں بات: مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عن رسول اللہ ﷺ اس میں اشارہ ہے کہ ان ابواب میں جتنے احادیث اور آثار ہیں اکثر مرفوعہ ہوں گے۔

چھٹی بات: مصنف نے پہلا باب مواقیت الصلاۃ قائم کیا، مواقیت میقات کی جمع ہے بعض کہتے ہیں کہ یقات اور وقت میں کوئی فرق نہیں دونوں ہم معنی ہیں بعض کہتے ہیں کہ وقت عام ہے جبکہ میقات اس وقت کو کہتے ہیں جس میں محدود عمل کیا جائے۔

ساتویں بات: یہاں مذکور ہے نبی ﷺ نے فرمایا "امنی جبریل" اس کے متعلق دو باتیں ہیں۔

❶ جبریل کی امامت کا واقعہ کب کا ہے تو اس میں تین قول ہیں۔ ① عراقی سے منقول ہے کہ یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے عام محدثین نے اس قول کو ضعیف کہا ہے کیونکہ نماز پہلے فرض ہوئی تھی اس لئے تعلیم فعلی و عملی کی پہلے ضرورت تھی۔ ② یہ واقعہ ابتداء بعثت کا ہے پہلی وحی جب اتری اس کے دوسرے دن جبریل علیہ الصلاۃ والسلام آئے اور امامت کرائی مگر یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ لیلۃ الاسریٰ سے پہلے پانچ نمازیں فرض نہ تھیں صرف دو نمازیں (فجر و عصر) فرض تھیں جبکہ یہاں پانچ نمازوں کے اوقات ہیں۔ ③ جمہور کے ہاں یہ لیلۃ الاسریٰ کے دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے لیلۃ الاسریٰ میں پچاس نمازیں فرض کیں پھر کم کرتے کرتے پانچ کردیں پھر دوسرے دن جبریل علیہ الصلاۃ والسلام اوقات کی عملی تعلیم کے لئے تشریف لائے۔

❷ دوسری بات یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات کی ابتداء فجر سے ہوتی ہے مگر باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقات کی عملی تعلیم ظہر سے ہوئی اس کی وجہ کیا ہے اس کے متعلق دو قول ہیں ① علامہ عراقی کہتے ہیں کہ فجر میں جبریل علیہ الصلاۃ والسلام آئے تو نبی ﷺ سو رہے تھے اس لئے فجر سے ابتداء نہ ہو سکی اس کو ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کر کے تضعیف کی ہے۔ اصل میں عراقی کو لیلۃ التعریس اور لیلۃ الاسریٰ میں اشتباہ ہو گیا اس لئے وہ لیلۃ الاسریٰ کو لیلۃ التعریس سمجھے۔ ② ظہر سے ابتدا اس لئے کی کیونکہ فجر کے وقت کی عملی تعلیم کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نبی اکرم ﷺ بعثت کے بعد سے فجر اور عصر پڑھتے تھے اس کا وقت پہلے سے معلوم تھا اس لئے اس کی زیادہ اہمیت نہ تھی لیکن ترتیب سے پھر فجر کی نماز کا وقت بھی بتا دیا۔

آٹھویں بات: یہاں اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ صلاۃ المفترض خلف المتنفل جائز ہے یا نہیں یہ اختلافی مسئلہ ہے احناف اور اکثر حضرات کے نزدیک اقتداء المفترض خلف المتنفل جائز نہیں اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض دوسرے حضرات کے ہاں جائز ہے ان کی دلیل امنی جبریل کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ جبریل ان نمازوں کے مکلف نہ تھے اس لئے ان کی نفلی نماز تھی اور نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نماز فرض تھی تو یہ اقتداء المفترض خلف المتنفل ہے۔ احناف جواب دیتے ہیں کہ جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بھی منقول ہے "امــرت" کہ عملی تعلیم کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے حکم دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکم سے عملی تعلیم کے لئے آئے تھے۔ جب وہ مامور تھے تو دو دن تک ان کے ذمے بھی فرض تھیں تو یہ اقتداء المفترض خلف المفترض ہے۔

دوسرا قول علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جبریل کی امامت تمثیلی تھی حقیقت میں نبی اکرم ﷺ امام تھے مگر نبی کریم ﷺ کو عالم مثال میں جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی نظر آئے اس لئے عالم مثال کا واقعہ ہے شرعی احکام میں اس کا استدلال جائز نہیں۔

نویں بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اوقات کے متعلق دو قسم کے ابواب قائم کئے ہیں ① وہ ابواب جن میں اوقات جواز کا ذکر ہے مثلاً فجر کا وقت جواز کہ اس کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے اور انتہاء کہاں تک ہے۔ ② دوسرے قسم کے ابواب جو قائم کئے ہیں ان کا مقصد وقت افضل بتانا ہے کہ مثلاً فجر کی نماز کا وقت افضل کونسا ہے ہمارے سامنے جو باب شروع ہے یہ قسم اول کے قبیل سے ہے یعنی اس میں اور اس کے بعد چند ابواب میں وقت جواز کا بیان ہے۔

دسویں بات: ظہر کے وقت سے حدیث میں ابتداء کی ہے اب ظہر کے وقت کی ایک ابتداء ہے ایک انتہاء ہے تو ظہر کی ابتدائی وقت میں ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے ہاں وقت جواز زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، صرف احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول جمعہ کے متعلق ہے اور یہ بعض محدثین کا بھی قول ہے کہ جمعہ کی نماز زوال سے پہلے بھی جائز ہے لیکن جمہور کے ہاں زوال کے بعد اس کا وقت شروع ہوتا ہے چاہے جمعہ ہو یا ظہر۔ عین استواء شمس کا وقت مکروہ ہے، یہ نہایت ہی مختصر ہے لیکن احتیاطاً دو تین منٹ پہلے اور دو تین منٹ بعد ملا کر دس یا بارہ منٹ تک بتا دیتے ہیں۔

ظہر کے وقت جواز کی انتہاء کب ہوگی؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جمہور یعنی مالک، شافعی، احمد، اسحٰق، محمد، ابو یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت مثل اول پر ختم ہو جاتا ہے، اور عصر کا وقت مثل ثانی کے شروع ہونے سے شروع ہو جاتا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے متعدد اقوال مروی ہیں ① مشہور قول یہ ہے کہ امام صاحب کے ہاں ظہر کے وقت کا اختتام مثل ثانی کے انتہا پر ہوتا ہے اور عصر کے وقت کی ابتداء مثل ثالث کے ابتداء سے ہوگی اس کو بعض فقہاء نے ظاہر روایت کہا ہے ② دوسرا قول حسن بن زیاد سے نقل کیا ہے کہ ظہر کے وقت کی انتہاء مثل اول پر ہو جاتی ہے اور عصر کا وقت مثل ثانی کے ابتداء سے شروع ہوتا ہے گویا یہ جمہور کی طرح ہے احناف میں سے اسد بن فرات نے نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے قول اول سے جمہور کے قول کی طرف رجوع کیا ہے، مگر صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا رجوع جمہور کے قول کی طرف نہ روایۃً ثابت ہے اور نہ درایۃً۔ ③ بعض احناف نے امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ ظہر کے وقت کا اختتام مثل اول کے انتہاء پر ہوتا ہے اور مثل ثانی وقت مہمل ہے اور عصر کے وقت کی ابتداء مثل ثالث کی ابتداء سے ہوتی ہے۔ ④ امام صاحب کے ہاں مثل اول خاص ظہر کا وقت ہے اور مثل ثالث صرف عصر کا وقت ہے۔ اور مثل ثانی دونوں میں مشترک ہے اس میں ظہر اور عصر دونوں پڑھ سکتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ مریض اور اصحاب الاعذار کے لئے اور مسافروں کے لئے مثل ثانی مشترک وقت ہے۔

معارف السنن میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ صاحب درمختار نے امام صاحب کے اس قول کو ترجیح دی ہے جو

جمہور کے موافق ہے جس کو حسن بن زیاد نے نقل کیا ہے کیونکہ امام صاحب سے جو اقوال مختلف ہوں تو اصحاب الترجیح ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں اور وجوہ ترجیح لوگوں کے انظار کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔بعض وجہ ترجیح یہ بتاتے ہیں کہ اس قول کو لیں گے جو جمہور کے قول کے مطابق ہو اس وجہ ترجیح کو صاحب درمختار نے لیا ہے، مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود قول رابع کو ترجیح دی ہے کہ مثل ثانی ظہر اور عصر کے درمیان مشترک ہے کیونکہ اشتراک کا قول احادیث سے بھی ثابت ہے۔ تابعین میں سے عطاء، ربیعۃ الرائے اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی اشتراک کا قول ثابت ہے کیونکہ ائمہ ثلاثہ کی کتابوں میں ہے کہ عورت عصر کی نماز کے وقت حیض سے پاک ہوئی تو ظہر اور عصر دونوں کو پڑھے گی اسی طرح عشاء کو پاک ہوئی تو مغرب بھی پڑھے گی اب یہاں پر ظہر اور مغرب پڑھنا واجب ہے جبکہ ان کا وقت نکل گیا تھا تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں ظہر وعصر اسی طرح مغرب وعشاء کا وقت مشترک ہے اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اشتراک والے قول کو ترجیح دی ہے۔

لیکن امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اول جو مشہور اور ظاہر الروایۃ ہے اس کے دلائل دیتے ہیں یہاں امامت جبریل سے معلوم ہوتا ہے کہ مثل اول کے انتہاء پر ظہر کی انتہاء ہو جاتی ہے لیکن امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ مثل ثانی پر ظہر ختم ہو گی اس لئے احناف امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر دلائل پیش کرتے ہیں۔

دلیل اول: وہ احادیث جن میں یہ الفاظ ہیں ”اذا اشتد الحر فابردوا بالظهر“ اب گرمیوں میں ابراد مثل ثانی کے وقت شروع ہوتا ہے۔

دلیل ثانی: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے مؤذن نے اذان دینی چاہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابرد اس نے کچھ انتظار کے بعد پھر ارادہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابرد تیسری دفعہ پھر ارادہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابرد صحابی فرماتے ہیں کہ ”حتی رأینا فیئ التلول“ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا اب ٹیلوں کا سایہ تب شروع ہوتا ہے جب عام چیزوں کا سایہ مثل اول سے بڑھ جاتا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثل ثانی میں ظہر پڑھی یہ واقعہ صحیح مسلم میں موجود ہے۔

دلیل ثالث: کئی کتابوں میں ہے کہ ہماری مثال امم سابقہ کے مقابلے میں اس طرح ہے کہ جس نے فجر سے ظہر تک مزدوری کی اس کو آدھا دینار ملا، دوسرے نے ظہر سے عصر تک مزدوری کی اس کو بھی نصف دینار ملا، تیسرا عصر سے مغرب تک کرتا ہے اس کو پورا دینار ملتا ہے۔ یہ مثال ہماری اور یہود ونصاریٰ کی ہے یہود نے زیادہ کام کیا جس طرح ظہر اور فجر کے درمیان ان کو کم ثواب ملا، عیسائیوں کو ظہر سے عصر تک کا وقت ملا مگر ثواب ان کو کم ملا، مسلمانوں کو عصر سے مغرب تک کا وقت ملا مگر ثواب زیادہ ملا۔

بستان المحدثین میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ احناف استدلال اس طرح کرتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فجر سے ظہر تک کا وقت زیادہ ہے، ظہر سے عصر تک کا وقت زیادہ ہے اور عصر سے مغرب تک کا وقت کم ہے اگر عصر مثل ثانی سے شروع ہو جائے تو عصر اور مغرب کا وقت ظہر سے عصر تک کے وقت سے زیادہ ہو جائے گا، اس صورت میں تمثیل صحیح نہ ہو گی تمثیل تب صحیح ہو گی جب ظہر کا وقت مثل ثانی تک ہو مثل ثالث سے عصر شروع ہو تا کہ ظہر سے عصر تک کا وقفہ زیادہ ہو جائے تا کہ تمثیل صحیح ہو۔ محققین احناف کہتے ہیں کہ احتیاط یہ ہے کہ ظہر مثل اول میں پڑھ لے اور عصر کی نماز مثل ثانی کے بعد پڑھے۔

عصر کا ابتدائی اور آخری وقت کیا ہے؟

عصر کے ابتدائی وقت میں وہی اختلاف ہے جو اختلاف ظہر کے وقت اخیر میں ہے اور دلائل بھی وہی ہیں کیونکہ ظہر کا وقت اخیر اس

میں وہی اختلاف مستلزم ہے عصر کے ابتدائی وقت کے اختلاف کو کیونکہ امام صاحب کا مشہور قول اور جمہور کے قول کے مطابق ظہر اور عصر کے درمیان مہمل وقت نہیں۔

عصر کا وقت اخیر:

عصر کے وقت اخیر میں بعض کا قول یہ ہے کہ عصر کا آخری وقت اصفرار شمس تک ہے اور اصفرار سے مغرب تک مکروہ وقت ہے لیکن تمام فقہاء کا مشہور قول یہ ہے کہ عصر کا وقت اخیر غروب الشمس تک ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے طلوع اور غروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا لیکن ''الا العصر یومہ'' کا نبی ﷺ نے استثناء کیا ہے تو غروب تک کا وقت ہے لیکن عصر کا سارا وقت برابر نہیں ہے۔

مغرب کا ابتدائی وقت:

مغرب کے ابتدائی وقت میں اتفاق ہے کہ اس کا وقت غروب الشمس سے شروع ہوتا ہے صرف روافض کے ہاں ستارے چمکنے لگیں تو پھر مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے۔

مغرب کا آخری وقت:

مغرب کے آخری وقت میں اختلاف ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مغرب کا وقت غروب شفق تک ہے لیکن شفق کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شفق حمرۃ کا نام ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور قول قدیم میں امام شا[illegible] اللہ تعالیٰ اور بعض ائمہ کہتے ہیں کہ حمرۃ کے بعد جو بیاض آتا ہے وہ شفق ہے وہ جب غائب ہو جائے تو مغرب کا وقت ختم ہو گیا[illegible]لغت سے شفق کے دونوں معانی منقول ہیں۔ احادیث میں عام طور پر غاب الشفق کا لفظ آتا ہے مگر یہاں حدیث میں ''غاب الافق'' ہے اور افق تب غائب ہوگا جب بیاض ختم ہوگا یہ امام صاحب کی دلیل ہے۔ بعض نے یہاں رجوع نقل کیا ہے مگر امام صاحب کا رجوع ثابت نہیں۔ امام صاحب کا ایک قول یہاں بھی اشتراک کا ہے کہ مغرب کا وقت حمرۃ تک ہے اور عشاء کا وقت خاص بیاض غائب ہونے کا بعد شروع ہوتا ہے درمیان کا وقت دونوں میں مشترک ہے۔

عشاء کا ابتدائی وقت:

عشاء کے اول وقت میں وہی اختلاف ہے جو مغرب کے وقت اخیر میں ہے۔

عشاء کا آخری وقت:

جمہور فقہاء کا قول یہ ہے کہ طلوع فجر تک عشاء کا وقت جواز ہے، ثلث اللیل تک افضل نصف اللیل تک جائز بلا کراہت ہے اور طلوع فجر تک جائز مع الکراہت ہے۔

فجر کا ابتدائی اور آخری وقت:

فجر کا ابتدائی وقت طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور آخری وقت طلوع آفتاب تک ہے یہ بالاتفاق ہے۔

''یا محمد هذا وقت الأنبياء من قبلک'' اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پانچ نمازیں تو صرف اس امت پر فرض ہیں تو پھر کیسے کہا کہ یہ تم سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کا وقت ہے جبکہ ان پر پانچ نمازیں فرض نہیں تھیں۔

جواب: یہ پانچ نمازیں تو اکٹھی تمام انبیاء پر فرض نہیں تھیں۔ مگر الگ الگ ملا کر پانچ نمازیں بنتی ہیں۔ مثلاً فجر کی نماز آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

شروع کی جب آسمان سے اتارے گئے، ظہر کی نماز ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع کی جب اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جگہ دنبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ذبح کیا گیا۔ عصر کی نماز یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع کی اور مغرب کی نماز داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شروع کی اور عشاء کی نماز اس امت کی خصوصیت ہے تو سب ملا کر فرمایا یہ پہلے انبیاء کا وقت ہے۔

اشکال: حدیث میں ہے "الوقت فیما بین ھذین الوقتین" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اور دوسرے دن جس وقت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نمازیں پڑھائیں ان کے درمیان نماز کا وقت ہے۔ تو گویا جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خارج از وقت نمازیں پڑھائیں تھیں۔

جواب: جن اوقات میں جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نمازیں پڑھائیں وہ بھی وقت تھا مگر وقت جواز، جبکہ مابین ہٰذین الوقتین یہ وقت افضل ہے۔

باب منه

یہ باب بھی مواقیت الصلاۃ کے متعلق ہے اس میں وہی مسائل ہیں جو باب اول میں گزر چکے ہیں اس باب میں دو احادیث نقل کی ہیں ان میں مسائل وہی ہیں صرف چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

پہلی بات: "اِن للصلاۃ اولاً و آخراً" اصل عبارت ہے کہ "اِن لوقت الصلاۃ اولاً و آخراً" کہ اوقات الصلاۃ محدود ہیں، ایک اول وقت ہے ایک آخری وقت ہے۔ اسی کی طرف آیت میں اشارہ ہے "اِن الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اوقات صلوٰۃ محدود ہیں۔

اول وقت صلاۃ الظهر حین الخ: طلوع الشمس کے بعد زوال تک کا وقت مہمل ہے اس میں کسی فرض نماز کا وقت نہیں اور استواء شمس کے وقت نبی کریم ﷺ نے نماز سے منع فرمایا ہے اب استواء سے جب سورج مغرب کی جانب ڈھلنے لگ جائے تو یہ زوال کا وقت ہے۔ عین استواء کا وقت انتہائی مختصر ہے مگر اوقات الصلاۃ کے نقشوں میں دس بارہ منٹ کا وقفہ نقل کرتے ہیں احتیاطاً۔

اوقات ممنوعہ تین ہیں ① طلوع الشمس کا وقت ② استواء الشمس کا وقت ③ غروب الشمس کا وقت۔ اگرچہ اصل مکروہ وقت اصفرار شمس کے بعد شروع ہوتا ہے مگر نبی ﷺ نے اِلا عصر یومہ کا استثناء کیا ہے اس لئے احناف کے ہاں اسی دن کی نماز اصفرار کے وقت جائز ہے۔

و آخر وقتها حین تطع الشمس: یہ جمہور کا قول ہے مالکیہ کا ایک قول یہ ہے کہ جب روشنی پھیل جائے تو فجر کا وقت ختم ہو جاتا ہے اب روشنی پھیلنے کے بعد اگر فجر پڑھے گا تو وہ قضاء ہوگی ادا نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث: اتی رجل النبی فساله: یہ مدینہ کا واقعہ ہے کہ یہ آدمی اوقات الصلاۃ سیکھنے کے لئے آیا تھا اس آدمی کا نام کیا ہے تو معارف السنن میں ہے اس کا نام کسی شارح نے ذکر نہیں کیا۔

حین طلع الفجر: سورج جب اٹھارہ درجے زیر افق ہو تو اس وقت صبح کاذب طلوع ہوتا ہے اور اگر سورج پندرہ درجے زیر افق ہو تو صبح صادق طلوع ہوتا ہے صبح صادق اور صبح کاذب میں تین درجے کا فرق ہے جو بارہ منٹ بنتا ہے۔

باب ماجاء في التغليس بالفجر و باب ماجاء في الاسفار بالفجر

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے اور عورتیں واپس لوٹتیں انصار کہتے ہیں کہ عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی گزرتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے نہ پہچانی جاتی تھیں۔

دوسرے باب کی روایت رافع بن خدیج کی ہے فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہتے ہوئے سنا کہ صبح کی نماز میں اسفار کرو یہ اجر کے بڑھ جانے کا سبب ہے۔ یہاں دو باب ہیں پہلے باب سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اندھیرے میں فجر پڑھتے تھے جبکہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غلس کی نسبت سے اسفار بہتر ہے۔

پہلی بات: پہلے بتایا تھا کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مواقیت الصلاۃ میں دو قسم کے ابواب قائم کئے ہیں ① وقت جواز کے متعلق جن کی بحث گزر گئی۔ ② وقت مستحب کیا ہے تو یہاں سے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا وقت افضل اور مستحب بیان کر رہے ہیں۔

دوسری بات: ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طلوع صبح صادق سے لے کر طلوع الشمس کے وقت تک فجر کی نماز پڑھی جائے تو وہ ادا کہلائے گی صرف مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول اس کے خلاف ہے۔

تیسری بات: فجر کا وقت مستحب کونسا ہے اس میں تین اقوال ہیں ① امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فجر کا وقت مستحب اول وقت ہے کہ غلس میں شروع کی جائے اور غلس میں ختم کی جائے۔ ② فقہائے کوفہ (امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ) کے ہاں ابتداً اور انتہاءً اسفار افضل ہے۔ ③ امام محمد بن حسن کا مسلک ہے جس کو طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ ثلاثہ کا قول قرار دیا ہے مگر حقیقت میں یہ فقط امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ ابتداء تغلیس میں مستحب ہے اور انتہاء اسفار میں مستحب ہے کہ اندھیرے میں شروع کرے خوب لمبی قرأت کرے تاکہ خوب اسفار ہو جائے، طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں دونوں قسم کی احادیث جمع ہو جاتی ہیں کہ تغلیس کی احادیث کو ابتداء پر حمل کریں گے اور اسفار والی روایات کو انتہاء پر حمل کریں گے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کی دلیل باب اول کی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے جس میں ہے "مایعرفن من الغلس"

فقہائے کوفہ کی دلیل باب ثانی کی روایت ہے وہ قولی حدیث ہے سنداً قوی اور راجح ہے کہ "اسفروا بالفجر فانه اعظم للأجر" احناف پہلے حدیث میں تأویل کرتے ہیں نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہ ہوتا تھا کہ مرد ہے یا عورت۔ اس کا جواب بدرالدین عینی نے دیا ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ مرد ہے یا عورت ہے بلکہ مایعرفن کا مطلب ہے کہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون ہے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون ہے پردے کی وجہ سے۔ "من الغلس" یہ راوی کا اضافہ ہے دلیل اس کی سنن نسائی، ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے "مایعرفن تعني من الغلس".

شوافع ہماری روایت میں تاویل کرتے ہیں ترمذی نے نقل کیا ہے کہ "اسفروا بالفجر" کا معنی احمد رحمہ اللہ تعالیٰ وشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے کہ اس سے وضاحت فجر مراد ہے کہ فجر ہوگئی ہے یا نہیں۔ اس سے روشنی پھیلنا مراد نہیں صحیح بات یہ ہے کہ فقط افضل وقت میں اختلاف ہے اس لئے احادیث کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح تطبیق دی جانی چاہئے کہ غلس میں شروع کی جائے تاکہ تغلیس والی روایت پر عمل ہو جائے اور ختم اسفار میں کی جائے تاکہ اسفار والی روایت پر بھی عمل ہو جائے۔

احناف کی ایک دلیل ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جو سنن میں ہے کہ نبی ﷺ نے اوقات سے ہٹ کر نماز نہیں پڑھی

سوائے دو دفعہ کے ایک فجر کی نماز وقت مستحب سے پہلے پڑھی مزدلفہ میں اور دوسری عرفات میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھی۔

دوسری دلیل ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا اثر ہے "ما اجتمع اصحاب النبی ﷺ علی شیئ کما اجتمعوا علی التنویر"

باب ماجاء فی التعجیل بالظهر
وباب ماجاء فی تاخیر الظهر فی شدة الحر

پہلے باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ظہر میں تعجیل کرنے والا کوئی نہیں دیکھا دوسری روایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی جب سورج ڈھل گیا تھا۔

دوسرے باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جب گرمی زیادہ ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لو کا اثر ہے۔ دوسری ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان کا ارادہ کیا آپ ﷺ نے فرمایا "ابــــــرد" انہوں نے کچھ انتظار کے بعد دوبارہ اذان کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "ابرد" یہاں تک کہ ہم نے ٹیلوں کے سائے دیکھے پھر نماز پڑھائی اور فرمایا "ان شدة الحر من فیح جهنم فابردوا عن الصلاة"

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ امام صاحب کا مسلک ہے کہ تمام نمازوں میں تاخیر مستحب ہے سوائے مغرب کے جبکہ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے کہ تمام نمازوں میں تعجیل مستحب ہے سوائے عشاء کے۔

یہاں اس اختلاف اقوال سے معلوم ہوا کہ مغرب کی تعجیل بالاتفاق مستحب ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جمہور ائمہ کے نزدیک بالاتفاق عشاء کی نماز میں تاخیر مستحب ہے باقی تین نمازوں کا وقت مستحب اختلافی ہے۔ ظہر کی نماز میں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تعجیل مستحب ہے، جبکہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء کے ہاں سردیوں میں تعجیل مستحب ہے اور گرمیوں میں تاخیر مستحب ہے۔ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل اول یہ ہے کہ جو باب اول میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ نبی ﷺ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ جلدی ظہر کی نماز پڑھنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ دلیل ثانی انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج زائل ہوا، گویا اول وقت میں پڑھی فقہائے شوافع نے کچھ عمومی استدلالات بھی کئے ہیں مثلاً آیت ہے "فاستبقوا الخیرات" اور نماز بھی نیکی ہے۔ نیکیوں کی طرف سبقت کا حکم ہے تو نماز میں سبقت یہ ہوگی کہ جب وقت آئے تو ادا کرو۔ دوسری عمومی دلیل ﴿وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها الخ﴾ اس میں مغفرت کے اسباب کی طرف جلدی کا حکم ہے۔ نماز بھی ان اعمال میں سے ہے جو سبب مغفرت ہے اس لئے اس میں بھی جلدی کرنی چاہئے تیسری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ سے سوال کیا گیا "ای الأعمال أفضل" آپ ﷺ نے فرمایا "الصلاة لاول وقتها"

جمہور کی دلیل: باب ثانی کی ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے "اذا اشتد الحر فابردوا بالصلاة" اب ٹھنڈک تب ہوگی جب خوب تاخیر کی جائے اور مثل ثانی میں پڑھی جائے۔

❶ امام صاحب کی طرف سے احناف کہتے ہیں کہ بعض احادیث سے تعجیل معلوم ہوتی ہے، اور بعض احادیث سے گرمیوں میں

تأخیر کا استحباب معلوم ہوتا ہے اس لئے ان کو جمع کرنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ تعجیل ظہر کی روایات کو سردیوں پر محمول کیا جائے اور تأخیر ظہر کی روایات گرمی کے موسم پر محمول ہیں۔ یہ تطبیق بھی ہوگئی اور احادیث کے جوابات بھی دینے نہیں پڑیں گے۔

❷ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسری بات یہ نقل کی جاتی ہے کہ ظہر کی نماز تعجیل سے پڑھنا اول زمانے پر محمول ہے مگر نبی ﷺ کا آخری عمل ظہر کی نماز میں تأخیر کا تھا۔ اس کی دلیل مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ روایت ہے جس کو ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے تلخیص کبیر میں نقل کیا ہے کہ "وکان آخر الأمرین عن رسول الله ﷺ هو تأخیر الظهر" یہ روایت بخاری کے ہاں صحیح ہے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس کو سنداً صحیح مانتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ تعجیل ظہر کی روایات منسوخ ہیں تأخیر ظہر کے عمل سے جو آخری عمل ہے۔

❸ معارف السنن میں ہے کہ نبی ﷺ کا عمل تعجیل ظہر اور تأخیر ظہر دونوں کا رہا مگر قولی احادیث سے تأخیر ظہر کا ثبوت ہوتا ہے اور قولی اور فعلی احادیث میں تعارض ہو تو قولی احادیث کو ترجیح دی جاتی ہے اور قولی احادیث تأخیر ظہر کی ہیں۔

دوسری بات: دوسرے باب میں دو احادیث لائے ہیں ایک ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوسری ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ ان احادیث کی شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تأویل کی ہے وہ یہ کہ نبی ﷺ نے جو فرمایا کہ ابراد کرو یہ اس مقام پر ہوگا کہ دور سے مسجد میں جانا پڑے لیکن اگر آدمی اکیلے نماز پڑھے یا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھے پھر تأخیر مستحب نہ ہوگی امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ تأویل نقل کر کے اس کی تردید کی ہے کیونکہ یہ عام احادیث کے خلاف ہے، کیونکہ ابوذر رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ ہم سفر میں تھے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان کا ارادہ کیا آپ ﷺ نے فرمایا ابرد پھر دوسری دفعہ اذان کا ارادہ کیا آپ ﷺ نے فرمایا ابرد پھر فرمایا "ان شدة الحر من فيح جهنم فابردوا الصلاة"۔ اب یہ واقعہ سفر کا ہے سب اکٹھے تھے دور سے چل کر آنے کی ضرورت نہ تھی اس کے باوجود ابرد کا حکم دیا، اس لئے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو تأویل کی ہے کہ ابراد کی روایت دور سے چل کر آنے پر محمول ہے یہ غلط ہے۔

تیسری بات: "فان شدة الحر من فيح جهنم" اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا میں گرمی سردی کا ہونا یہ سورج کے زمین سے قرب اور بعد کا نتیجہ ہے جبکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی جہنم کا اثر ہے۔

معارف السنن میں ہے کہ قدیم فلاسفہ کا یہ مسلک تھا کہ سورج ان اجرام فلکیہ میں سے ہے کہ اس کی اپنی گرمی یا سردی کی تأثیر نہیں اس مسلک کو لیں تو پھر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اس مسلک کے مطابق سورج کے قرب یا بعد سے گرمی کا تعلق نہیں، مگر جدید فلاسفہ کہتے ہیں کہ اس میں گرمی کی تأثیر ہے تو ان کے ہاں اعتراض ہوگا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بعض امور کے اسباب ظاہری ہوتے ہیں بعض اسباب مخفیہ ہوتے ہیں ظاہری اسباب سے شریعت تعارض نہیں کرتا بلکہ شریعت اس سبب کو بتاتی ہے جو مخفی ہو اور عقل کی رسائی وہاں تک ممکن نہ ہو۔ اب یہ کہنا کہ سورج آگ کی لپیٹ میں ہے یہ ظاہری بات ہے مگر سورج مادہ ہے اور مادہ کی تأثیر نہیں ہوتی اس لئے اس کا کوئی اصل منبع ہے جس کی وجہ سے اس میں گرمی پیدا ہوتی ہے یہ سبب مخفی ہے یہ شریعت نے بتلا دیا ہے، دوسرا اہل سنت کے ہاں جنت اور جہنم مخلوق ہیں اگرچہ ہمیں نظر نہیں آتے۔

باب ماجاء فی تعجیل العصر

اس باب میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی جس وقت سایہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے سے زائل نہ ہوا تھا بلکہ سورج ان کے حجرے میں تھا۔

دوسری روایت ہے کہ علاء بن عبدالرحمن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے بصرہ میں اس کے گھر میں جب وہ ظہر کی نماز

سے واپس لوٹے تو فرمایا اٹھو اور عصر کی نماز پڑھو ہم نے عصر کی نماز پڑھ لی جب فارغ ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ کوئی آدمی بیٹھا رہتا ہے اور سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جائے (یعنی غروب کے قریب ہو) یہ اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے لگاتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس میں بہت کم یاد کرتا ہے۔

باب ماجاء في تاخير صلاة العصر

ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ظہر تم سے زیادہ جلدی پڑھتے تھے اور تم عصر کو ان سے بہت جلدی پڑھتے ہو۔

یہ دونوں باب عصر کے مستحب وقت سے متعلق ہیں عصر کے مستحب وقت میں اختلاف ہے اس لئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو ابواب قائم کئے۔

مسئلہ: یہ ہے کہ عصر کا مستحب وقت کیا ہے۔ ① امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ عصر کی نماز کا مستحب وقت اول وقت ہے۔ ② ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عصر میں تاخیر مستحب ہے یہ قول سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کا بھی ہے پھر تاخیر کی دو صورتیں ہیں۔ ① اول وقت سے کچھ دیر کرے یہ ہمارے ہاں مستحب ہے۔ ② اتنی تاخیر کی جائے کہ سورج اصفرار کی طرف مائل ہو جائے یہ تاخیر مفرط ہے یہ احناف کے ہاں بھی مکروہ ہے یہ وقت کسی کے ہاں مستحب نہیں۔

شوافع کے دلائل جو لوگ وقت اول کے استحباب کے قائل ہیں ان کی دلیل باب اول کی پہلی روایت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے کہ نبی ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی جب دھوپ میرے حجرے میں تھی۔ یہاں کل تین باتیں سمجھنی ہیں۔

پہلی بات: شوافع کا طریقہ استدلال کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ حجرے سے وہ صحن مراد ہے جس کے ارد گرد چار دیواری ہوتی ہے مگر اوپر چھت نہیں ہوتی۔ اب سورج جب نصف النہار کے قریب ہو تو ایسی جگہ دھوپ زمین پر ہوتی ہے جس جگہ پر دیواروں کا احاطہ ہو اور جیسے جیسے زوال ہوتا ہے سورج دیوار پر چڑھتا جاتا ہے اور زمین پر سایہ آتا ہے اب استدلال اس طرح ہے کہ سورج نصف النہار کے قریب تھا۔ اس لئے دھوپ زمین پر تھی اگر بہت دیر ہو گئی ہوتی تو سورج زمین پر نہ لگتا بلکہ دیواروں پر ہوتا۔

دوسری بات: شمس کا اطلاق سورج کی ٹکیہ پر بھی ہوتا ہے یہاں ٹکیہ مراد نہیں بلکہ دھوپ مراد ہے۔

تیسری بات: یہ حدیث احناف کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے احناف اس حدیث کے متعلق دو باتیں ذکر کرتے ہیں:

❶ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات ہے انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے کہ عصر کی نماز پڑھی تو دھوپ حجرے میں تھی دیوار پر نہ تھی، تو جواب یہ ہے کہ ان کے حجرے کی دیواریں لمبی نہ تھیں کہ ڈھلتے ہی دیواروں پر سورج چڑھ جائے بلکہ قصیر دیواریں تھیں جب دیواریں چھوٹی ہوں تو غروب شمس تک وہاں سے دھوپ غائب نہیں ہوتی اس لئے یہاں فی الجملہ تاخیر پر استدلال ہو سکتی ہے کہ یہ جملہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ دیر سے عصر پڑھتے تھے۔

❷ شوافع نے اس توجیہ پر اعتراض کیا ہے کہ دیواریں اتنی کم نہ تھیں کہ غروب تک سورج لگتا رہے۔

جواب: انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح بخاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ دیواریں بہت کم تھیں وہ روایت یہ ہے کہ

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تراویح میں نبی ﷺ کی اقتداء کی نبی ﷺ حجرے میں تھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حجرے سے باہر تھے اب اقتداء تب ہوسکتی ہے جب دیواریں چھوٹی ہوں اور صحابہ حضور ﷺ کی نقل وحرکت کو دیکھ سکیں، معلوم ہوا کہ دیواریں بہت چھوٹی تھیں۔

تعجیل کی دوسری حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جس کو شوافع نے نقل کیا ہے جو باب میں مذکور ہے اس سے وہ دو طرح استدلال کرتے ہیں:

❶ علاء بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ ظہر پڑھی واپس آئے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اٹھو عصر کی نماز پڑھو تو ظہر آخر وقت میں پڑھی ہوگی اور معمولی دیر بعد عصر کی نماز اول وقت میں پڑھ لی۔

احناف جواب دیتے ہیں کہ یہ واقع حجاج کے دور کا ہے حجاج کی عادت تھی کہ وہ نمازوں کو دیر سے پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ نمازوں کا وقت جواز بھی نکل جاتا تھا۔ اس حدیث سے تقدیم عصر یا تأخیر عصر پر استدلال صحیح نہیں۔

❷ دوسرا طریقہ استدلال کا یہ ہے کہ فانہ صلاۃ المنافق الخان الفاظ سے تأخیر عصر کی مذمت ثابت ہوتی ہے احناف کہتے ہیں کہ یہاں جس تأخیر کی مذمت ہے وہ تأخیر مفرط ہے اس کو ہم بھی مکروہ سمجھتے ہیں ہمارے ہاں جو تأخیر مستحب ہے یہ اصفرار سے پہلے تک ہے۔

احناف کے دلائل: ❶ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب ثانی میں جو حدیث نقل کی ہے ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ ظہر میں تم سے تعجیل کرتے تھے اور تم عصر کی نماز تعجیل سے پڑھتے ہو۔ اب ظاہر ہے کہ صحابہ وقت داخل ہونے کے بعد عصر پڑھتے تھے مگر وقت اول میں پڑھتے تھے اس لئے ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ تم تعجیل سے پڑھتے ہو معلوم ہوا نبی ﷺ تأخیر سے پڑھتے تھے۔ ❷ معارف السنن میں بعض کتب کے حوالے سے ہے کہ آپ ﷺ کی عادت مبارک تأخیر عصر کی تھی۔ ❸ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عصر کو مؤخر کرتے تھے اور صحابہ عمل میں حضور ﷺ کے زیادہ مشابہ تھے جب ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیر سے پڑھتے تو معلوم ہوا تأخیر سنت ہے۔

باب ماجاء فی وقت المغرب

یہ باب ہے مغرب کی نماز کے مستحب وقت کے بارے میں ائمہ کے ہاں مغرب کے مستحب وقت میں اجماع ہے وہ یہ کہ مغرب کو وقت اول میں پڑھنا مستحب ہے۔ فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ مغرب کی نماز کے درجے ہیں ایک یہ کہ تارے چمکنے سے پہلے تک تأخیر کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اشتباک النجوم تک تأخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے الا یہ کہ کوئی مسافر یا معذور ہو وہ جمع بین الصلاتین کرنا چاہے ان کے لئے بغیر کراہت کے یہ جائز ہے۔

باب ماجاء فی وقت صلاۃ العشاء الاخرۃ
وباب ماجاء فی تاخیر العشاء الآخرۃ

عشاء کی نماز کا مستحب وقت یہ ہے کہ ثلث اللیل تک مؤخر کیا جائے یہ بالاجماع مستحب وقت ہے اس میں اختلاف نہیں نصف اللیل تک تأخیر مباح ہے اور طلوع فجر تک بغیر عذر کے مؤخر کرنا مکروہ ہے، اب یہ کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی ہے تو صحیح یہ ہے کہ یہ کراہت تنزیہی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة النوم قبل العشاء والسمر بعدھا

ابو برزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد باتوں کو ناپسند فرماتے تھے۔

ترجمۃ الباب میں دو مسئلے ہیں: ❶ عشاء کی نماز سے پہلے سونا ❷ عشاء کے بعد باتیں کرنا۔

اس کے بعد حدیث نقل کی جس سے دونوں کی کراہت معلوم ہوتی ہے۔

پہلا مسئلہ: پہلے مسئلے کے متعلق معارف السنن میں ہے کہ اکثر علماء کا مسلک ہے کہ نبی ﷺ نے جو عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو ناپسند کیا ہے یہ کثیر احادیث میں ہے مگر ہم علت کو دیکھیں گے اب جہاں بھی علت ہو وہاں کراہت کا حکم ہوگا اور جہاں علت نہ ہو وہاں کراہت نہ ہوگی اب وہ علت کیا ہے تو فقہاء کہتے ہیں کہ مغرب اور عشاء میں وقفہ کم ہوتا ہے اب اگر انسان سو جائے تو عشاء کی نماز قضا ہو جائے گی یا جماعت فوت ہو جائے گی اب یہ علت ہے اب جہاں علت موجود نہ ہو وہاں کراہت نہ ہوگی مثلاً کوئی مریض ہے وہ سو گیا اور کسی کو اٹھانے کیلئے مقرر کر دیا اس صورت میں کراہت نہ ہوگی یہ مضمون کئی صحابہ سے منقول ہے۔ جس طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کراہت کا قول منقول ہے اسی طرح رخصت کا قول بھی منقول ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے شاگردوں سے بھی رخصت منقول ہے اس لئے ان دونوں میں پہلی تطبیق تو یہ ہے کہ جہاں کوئی جگانے والا نہ ہو نماز با جماعت کے فوت ہو جانے کا ڈر ہو تو سونے کی ممانعت ہوگی۔ دوسری تطبیق یہ ہے کہ جہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام یا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رخصت معلوم ہوتی ہے وہ رمضان پر محمول ہوگی کیونکہ رمضان میں نبی ﷺ اور صحابہ بہت عبادت کرتے تھے پوری رات جاگتے تھے اس لئے مغرب کے بعد آرام کی اجازت دی تھی اس لئے رخصت کے اقوال رمضان پر محمول ہیں اور کراہت کے اقوال غیر رمضان پر محمول ہیں۔ تیسری تطبیق یہ ہے کہ ممانعت تب ہے جب عشاء کا وقت داخل ہو چکا ہو مگر وقت داخل نہ ہوا ہو تو قبل العشاء سونا جائز ہے۔

دوسرا مسئلہ: دوسرا مسئلہ بعد العشاء کا ہے۔ سمر کا مادہ اس کا لغوی معنی ہے چاند کی روشنی، عرب کی عادت تھی کہ چاندنی راتوں میں گھروں سے باہر نکل کر قصہ گوئی کرتے تھے اور دیر تک بلکہ فجر تک مشغول رہتے تھے تو سمر چاند کی روشنی کو کہتے ہیں مگر اس میں توسیع کی اور چاندنی راتوں میں قصہ گوئی پر اطلاق کیا اس کے بعد مزید توسیع کی اور اس کا اطلاق مطلق باتوں پر ہونے لگا اس میں قصہ گوئی ہو یا نہ ہو جس طرح دوسرے باب کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ اور ابو بکر صدیق سمر کرتے تھے اب وہ قصہ گوئی نہیں کرتے تھے بلکہ امور مسلمین کے متعلق گفتگو کرتے تھے مگر اس پر سمر کا اطلاق کیا عام معنی کے اعتبار سے۔

پہلی بات: سمر بعد العشاء کی نبی ﷺ نے ممانعت کیوں کی؟ اس کا ایک جواب اور وجہ یہ ہے کہ یہ مشرکین کا طریقہ تھا اس لئے نبی ﷺ نے مسلمانوں کو منع فرمایا دوسری وجہ یہ ہے کہ اسمیں ضیاع وقت تھا اور تیسری وجہ یہ ہے عشاء کے بعد دیر تک جاگے تو ایسے آدمی کی فجر کی نماز فوت ہو جاتی ہے تو اس کی یہ گپ شب فجر کی نماز فوت ہونے کا سبب بنتی ہے اس لئے منع کیا۔

دوسری بات: سمر بعد العشاء کا حکم کیا ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ سمر بعد العشاء جو قصہ گوئی سے متعلق ہو اس میں کوئی فائدہ نہ ہو تو یہ ممنوع ہے خصوصاً جب فجر فوت ہونے کا ڈر ہو لیکن اس میں اگر ضروری فائدہ ہو یا امور مسلمین سے بحث ہو تو یہ جائز ہے بشرطیکہ فجر کے فوت ہونے کا ڈر نہ ہو۔

باب ماجاء فی الرخصة فی السمر بعد العشاء

مسئلہ گذر گیا" لاسمر الالمصل اومسافر" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی تہجد کیلئے اٹھا مگر نیند آرہی ہے تو یہ نیند دور کرنے کیلئے باتیں کرسکتا ہے اسی طرح رات کو مسافر چل رہے ہیں وہ بھی آپس میں باتیں کرسکتے ہیں۔

باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل

اس باب میں کئی احادیث نقل کی ہیں ام فروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے سوال ہوا "ای الاعمال افضل" آپ نے اس کو جواب دیا کہ "الصلاۃ لأول وقتها" دوسری حدیث ابن عمر کی ہے کہ نبی نے فرمایا کہ اول وقت میں نماز پڑھنا اللہ کی رضاء کا باعث ہے اور آخری وقت میں پڑھنا اللہ کی طرف سے عفو اور رخصت ہے اسی طرح علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے اس میں بھی اول وقت میں نماز کا ذکر ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو دیر نہ کرو۔ چوتھی حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اور پانچویں حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے۔

اب اس باب میں امام ترمذی نے طبعیت کے خلاف مفصلاً روایات نقل کردیں ورنہ وہ وفی الباب عن فلان وفلان سے اشارہ کر کے چلے جاتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی کی تائید کرنا چاہتے ہیں گذر چکا ہے کہ نماز کا افضل وقت کونسا ہے اس میں اختلاف ہے شوافع کے ہاں عشاء کے علاوہ باقی سب میں تعجیل افضل ہے اور احناف کے ہاں مغرب کے علاوہ باقی تمام میں تاخیر کرنا افضل ہے یہاں امام ترمذی نے امام شافعی کے مسلک کی تائید کیلئے بے شمار احادیث نقل کی ہیں مگر بدقسمتی سے ان میں ابن مسعود کی روایت کے علاوہ کوئی صحیح نہیں اور جو صحیح ہے اس میں الصلاۃ لمیقاتھا ہے اس سے اول وقت میں پڑھنا صراحۃً معلوم نہیں ہوتا ہے۔

معارف السنن میں ابن الجوزی اور نووی کا اعتراض نقل کیا ہے ابن الجوزی کہتے ہیں کہ اول وقت کی فضیلت میں کوئی حدیث صحیح نہیں نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں بھی لکھا ہے کہ وہ احادیث جو صراحۃً اول وقت کے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے کوئی سنداً صحیح نہیں۔

پہلی بات: ملاعلی قاری نے مرقات میں لکھا ہے کہ بالفرض یہ احادیث اول وقت کے متعلق صحیح اور قابل استدلال بھی ہوں پھر بھی اس میں دو باتیں ہیں: ① اول وقت سے وقت مختار اور اول وقت مستحب مراد ہے ② دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں ہے "کان آخر الامرین من رسول اللہ التاخیر" تو وہ احادیث جو اول وقت کی افضلیت بتاتی ہیں وہ بعض نمازوں میں منسوخ ہیں جیسے یہاں عصر کے بارے میں منسوخ ہے۔

دوسری بات: ام فروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں سوال ہے "ای الاعمال افضل" تو اس سوال کے جواب میں کئی جوابات آئے ہیں بعض میں "الصلاۃ لمیقاتھا" بعض میں الجہاد بعض میں اطعام الطعام کا ذکر ہے تو اب کلام کیا گیا ہے کہ ان میں تطبیق کیا ہے؟

جواب ❶: نبی اکرم ﷺ سے جواب میں جو اختلاف ہوا یہ احوال سائل کے اختلاف کی وجہ سے ہوا مثلاً کسی میں جہاد کی کمزوری تھی اس کو جہاد سے جواب دیا کیونکہ کسی کے اعتبار سے افضل عمل وہ ہے جس میں اس کیلئے مشقت ہو اب ایک آدمی جان دینے کیلئے تیار ہے مگر پیسہ نکالنا اور خرچ کرنا مشکل ہے تو اس کے لئے مال خرچ کرنا افضل ہوگا۔

جواب ❷: آپ ﷺ سے جوابات میں جو اختلاف ہے یہ مطلقاً اختلاف احوال کا ذکر ہے مثلاً قحط کے زمانے میں اطعام الطعام

افضل ہے اور جہاد کا زمانہ ہے تو جہاد افضل ہے۔

جواب ③: اختلاف ہے جواب میں نبی ﷺ کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے تھا کبھی آپ کی طبعیت پر ایک عمل کا غلبہ ہوتا اور کبھی دوسرے کا۔

جواب ④: یہ مطلب نہیں کہ فلاں عمل افضل ہے تو تمام چیزوں سے افضل ہے بلکہ افضل اعمال کی فہرست ہے اس میں یہ بھی افضل ہے یہ بھی افضل ہے تو جب کہا کہ الجھاد افضل الاعمال تو اس کا معنی ہوگا کہ الجھاد من افضل الاعمال......الخ۔

جواب ⑤: اعمال کے انواع مختلف ہیں مثلاً عبادات بدنیہ نوع ہے اس میں نماز افضل ہے عبادات مالیہ نوع ہے اس میں اطعام الطعام افضل ہے۔

جواب ⑥: شیخ اکبر کے حوالے سے معارف السنن میں ہے علامہ انور شاہ کشمیری نے اس کو پسند کیا ہے کہ پوچھنے والوں کے الفاظ الگ تھے کسی نے "ای العمل احب" کہا، کسی نے "ای العمل افضل" کہا، اور کسی نے "ای العمل خیر" کہا اور ان الفاظ کے مفہوم میں تفاوت ہے تو جب الفاظ مختلف تھے تو جواب بھی مختلف دیا۔

باب ماجاء فی السهو عن وقت صلاۃ العصر

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ جس سے عصر کی نماز فوت ہوجائے گویا کہ سلب کر لیا گیا اس سے اس کے اہل اور مال کو۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جس کی عصر کی نماز فوت ہوجائے تو اس کا کیا نقصان ہے تو اس کا بیان ہے کہ اس کی حالت اس شخص کی طرح ہے کہ اس کے اہل اور مال کو چھین لیا جائے اب ایسے شخص کا کتنا نقصان ہوگا اسی طرح جس کی عصر فوت ہوجائے اس کو اتنا نقصان لاحق ہوگا جتنا اہل و مال چھین جانے سے ہوتا ہے۔ اور فائت الصلاۃ مجرم بھی ہے جس طرح اہل وعیال کو ہلاک کرنے والا مجرم ہے۔

دوسری بات: محدثین نے کلام کیا ہے کہ "الذی تفوته صلاۃ العصر" اس سے کیا مراد ہے۔

① امام اوزاعی کا قول یہ ہے کہ صلاۃ عصر کے فوت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصفرار الشمس کے وقت تک عصر نہ پڑھ سکے اور اصفرار کے بعد پڑھے۔ اس کی سزا حدیث میں موجود ہے معارف السنن میں ہے کہ اس قول کی بعض روایات سے تائید بھی ہوتی ہے۔

② فوت سے مراد جماعت کا فوت ہونا ہے کہ حدیث میں جو نقصان ذکر ہے یہ اس شخص کیلئے ہے جس کی عصر کی نماز کی جماعت فوت ہوجائے۔

③ وقت مکروہ کے داخل ہونے تک نہ پڑھ سکے یہ اس کا فوت ہونا ہے۔

④ بالکل عصر کی نماز نہ پڑھ سکا یہاں تک کہ مغرب کا وقت داخل ہوگیا تو یہ نماز کا فوت ہونا ہے۔ وتـر ہو تو معنی ہوگا ہلاک کرنا اور وتر ہو تو معنی ہوگا سلب ہوجانا۔

باب ماجاء فی تعجیل الصلاۃ اذا أخرها الامام

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد امراء آئیں گے جو نماز کو مؤخر کریں گے تو تم نماز کو وقت پر ادا کرو اگر نماز وقت پر پڑھی گئی اور امام کے ساتھ تم نے پڑھ لی تو تیرے لئے زائد ثواب ہوگا اور اگر وقت پر نہ پڑھی گئی تو تم نے

چونکہ پڑھ لی ہے اس لئے تمہاری نماز ہوگئی تم نے نماز کو وقت کے اندر محفوظ کرلیا۔

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ باب کی حدیث میں دو الگ الگ مسئلے ہیں: ① امام جو ظالم ہو اور وہ نماز کو وقت مختار سے مؤخر کرتا ہو تو عام آدمی کا کیا حکم ہے وہ اپنی نماز الگ پڑھے یا امام کا انتظار کرے تو اس مسئلے میں ائمہ احناف سے کچھ منقول نہیں کہ مقتدی کو کیا کرنا چاہئے انفرادی نماز پڑھے یا امام کے ساتھ پڑھے یا دونوں کام کرے۔ امام شافعی کا قول یہ ہے کہ ظالم حاکم اگر نماز کو وقت مختار سے مؤخر کرتا ہو تو مقتدی وقت مختار میں اکیلا نماز پڑھ لے پھر تاخیر والی جماعت اگر وقت کے اندر مل جائے تو اس میں شریک ہو جائے تو پہلی فرض ہوگی اور دوسری نفل ہوگی اور جماعت کا ثواب بھی مل جائے گا یہ احمد اور عام فقہاء کا مسلک ہے۔

دوسری بات: دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے نماز پڑھ لی پھر جماعت مل گئی تو کن نمازوں میں شریک ہو سکتا ہے کن نمازوں میں نہیں؟ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز پڑھ لی تو پھر جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا اسی طرح عصر کی نماز کا حکم بھی ہے کیونکہ متواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "نهى رسول الله ﷺ عن الصلاة بعد الفجر حتى تطلع الشمس ونهى عن الصلاة بعد العصر حتى تغرب الشمس" اب جب آدمی نے فجر اور عصر کی نماز پڑھ لی تو فرض ادا ہوگئی اب اگر امام کے ساتھ پڑھے گا تو نفل ہوگی جبکہ فجر اور عصر کے بعد نفل ممنوع ہیں۔ احناف کے ہاں مغرب بھی اکیلے پڑھ لی تو دوبارہ امام کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا کیونکہ اگر امام کے ساتھ سلام پھیرا تو تین رکعت نفل ہو جائیں گے جو مشروع نہیں اور اگر چوتھی رکعت ملا لے تو امام کی مخالفت لازم آئیگی جو جائز نہیں ظہر اور عشاء کی نماز کا حکم یہ ہے کہ کسی نے انفرادی نماز پڑھی پھر جماعت مل گئی تو احناف کے ہاں شریک ہو سکتا ہے اور نفل کی نیت سے شرکت کرے۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرض کی نیت کرے لیکن فرض نماز کونسی شمار ہوگی اس میں اقوال ہیں اس لئے اس کو اللہ کے حوالے کردے۔ باقی فقہاء جو کہتے ہیں کہ دوسری نفل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا زائد ثواب ہے باقی فرض کونسی ہے نفل کونسی ہے یہ اللہ کو معلوم ہے۔

تیسری بات: اس سے پہلے مسئلے کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ پہلے مسئلے میں احناف کے ہاں صراحت نہیں لیکن یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر فجر عصر مغرب پڑھ لی تو امام کے ساتھ شریک نہ ہو اگر ظہر یا عشاء پڑھ لی تو جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔

باب ماجاء فی النوم عن الصلاۃ باب ماجاء فی الرجل ینسی الصلاۃ

ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیند کا ذکر کیا آپ نے جواب دیا نیند میں تفریط نہیں بلکہ تفریط جاگنے میں ہے تم میں سے اگر کوئی بھول جائے یا سو جائے تو جب یاد آجائے تو نماز پڑھے۔

دوسرے باب میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی نماز کو بھول جائے تو جب یاد آجائے ادا کرے۔ ان دونوں ابواب کی دونوں احادیث کا تعلق ایک ہی مسئلے سے ہے۔

پہلی بات: کوئی آدمی کام میں مشغول تھا کہ نماز بالکل یاد ہی نہیں رہی یا کوئی آدمی سو گیا اور وقت فوت ہو گیا تو اس عمل کی وجہ سے گنہگار ہوگا یا نہیں۔ تو حدیث سے معلوم ہوا کہ گنہگار نہیں ہوگا کیونکہ حدیث میں ہے "رفع القلم عن الثلاثة" ان میں ایک ہے "عن النائم حتى يستيقظ" معلوم ہوا کہ ترک صلاۃ سے اس پر گناہ نہیں۔

دوسری بات: ایسے شخص پر اس نماز کی قضا ہے یا نہیں تو ائمہ اربعہ جمہور فقہاء و محدثین کے ہاں اس نماز کی قضا واجب ہوگی عمداً ترک صلاۃ کی تو اس پر قضاء ہے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے جو اپنی جگہ پر آئے گا لیکن نوم یا نسیان کی صورت میں قضاء واجب ہے۔

تیسری بات: کوئی سو گیا یا بھول گیا اب جب وہ جاگا یا اس کو یاد آیا وہ وقت مکروہ تھا مثلاً رات کو سویا جب جاگا تو طلوع کا وقت تھا یا عصر کو بھول گیا یا سو گیا جب جاگا اور یاد آیا تو غروب کا وقت تھا تو یہ مکروہ وقت میں ادا کرے گا یا نہیں اس میں فی الجملہ اختلاف ہے۔

امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اس کو یاد آئے گا اور جب جاگ جائے تو اسی وقت اس پر ادا لازم ہے وہ جائز وقت ہو یا مکروہ وقت ہو۔ ② امام اعظم کے ہاں اگر طلوع کے وقت جاگا تو اس وقت نہیں پڑھے گا بلکہ مکروہ وقت نکل جائے پھر پڑھے گا مگر عصر کی نماز عین غروب میں پڑھ سکتا ہے اب یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ طلوع شمس کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیوں کرتے ہیں اس کی دو وجہیں ہیں ① حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے طلوع شمس کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا ہے ② لیلۃ التعریس میں جب جنگ خیبر یا حنین سے واپس آرہے تھے راستے میں سو گئے جب جاگ گئے تو طلوع شمس کا وقت تھا اسکے بعد صحیح تر روایت میں ہے کہ مکروہ وقت شروع تھا آپ نے فرمایا سوار ہو جاؤ وہاں سے چلے گئے جب مکروہ وقت ختم ہوا تو وضوء کیا اور نماز پڑھی یہاں صراحت ہے کہ مکروہ وقت میں نماز ادا نہیں کی بلکہ تاخیر کی یہ خصوصی دلیل ہے فجر کے بارے میں۔

❷ عصر کی نماز میں امام صاحب کے ہاں بھی عین غروب کے وقت عصر کی نماز جائز ہے کیونکہ اگرچہ غروب کے وقت نماز سے نہی وارد ہوئی ہے نہی میں عموم تھا لیکن باب کی حدیث کو اس لئے مخصص بنایا جائے گا دوسرا طلوع شمس کے بعد کا وقت ایسا ہے کہ وہ کسی نماز کا وقت نہیں اس لئے قضاء فجر من کل الوجوہ متحقق ہوگی کیونکہ جب غروب ہو گیا اور نہیں پڑھی تو مغرب کا وقت شروع ہو جائے گا اور تیسری مشہور اصولی وجہ ہے کہ عصر کی نماز ناقص واجب ہوئی ہے اور ناقص ادا کی جبکہ فجر کا سارا وقت مکمل ہے اس لئے وہ ناقص (مکروہ) وقت میں ادا نہیں ہوگی۔

چوتھی بات: ذکرو اللنبی ﷺ نومھم یہ لیلۃ التعریس کا واقعہ ہے یہ کب پیش آیا ① خیبر سے واپسی کا واقعہ ہے ② تبوک سے واپسی کا واقعہ ہے ③ حدیبیہ سے واپسی کا واقعہ ہے ④ حنین سے واپسی کا واقعہ ہے ⑤ مطلقاً سفر سے واپسی کا واقعہ ہے اور راجح خیبر اور تبوک ہے اور ان دونوں میں سے خیبر راجح ہے۔

عن علی......الخ وفی وقت أوفی غیر وقت۔ احناف کے ہاں فی وقت کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً ظہر کے وقت کو بھول گیا ابھی وقت باقی تھا کہ یاد آ گیا اور فی غیر وقت کا مطلب یہ ہے کہ ظہر کا وقت ختم ہو گیا تھا اور عصر کا وقت داخل ہو گیا تھا کہ یاد آ گیا۔

باب ماجاء فی الرجل تفوته الصلوات بایتهن یبدأ

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو خندق کے دن چار نمازوں سے مشغول کر دیا یہاں تک رات کا کافی حصہ گزر چکا تو آپ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا انہوں نے اذان دی پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور عصر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور مغرب کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور عشاء کی نماز پڑھ لی۔

اس سلسلے میں دوسری روایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقل کی ہے اس میں ہے کہ خندق میں ایک نماز عصر کی فوت ہوئی تھی پھر اس کو مغرب کے بعد ادا کیا اس باب کو سمجھنے کیلئے تین باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلی بات: نبی کریم ﷺ سے خندق کے دن کتنی نمازیں فوت ہوئی تھیں؟ کیونکہ اس کے متعلق جو احادیث ہیں ان میں اختلاف ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ سے دو نمازیں فوت ہوئی تھیں یعنی عصر اور مغرب کی دوسری حدیث ترمذی نے نقل کی ہے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک عصر کی نماز فوت ہوئی تھی اور مغرب کی نماز

آپ ﷺ نے اپنے وقت پر ادا کی تھی عصر کی نماز قضاء کرنے کے بعد وقف تام۔ تیسری روایت باب کی پہلی حدیث ہے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ اس میں ہے کہ چار نمازیں فوت ہوئی تھیں ظہر عصر مغرب اور عشاء عشاء باقی عشاء کو اس اعتبار سے فوت کہا کہ وقت مختار سے فوت ہوئی تھی وقت جواز باقی تھا۔

دوسری بات: ان احادیث میں جو تعارض ہے معارف السنن میں اس کیلئے دو تطبیقیں ذکر کی ہیں

❶ قوت سند کی بناء پر ترجیح دیں گے۔ اور سنداً صحیح بخاری کی روایت قوی ہے اسی کو ترجیح دیں گے۔ معارف السنن میں ہے کہ یہ تطبیق قاضی ابو بکر ابن العربی سے منقول ہے۔

❷ صحیح تر یہ ہے کہ خندق کی جنگ ایک دن نہ تھی بلکہ کئی دن جاری رہی اس لئے متعدد روایات تعداد واقعہ کی وجہ سے ہیں وہ اس طرح کہ بعض ایام میں ایک نماز فوت ہوئی بعض ایام میں دو اور بعض میں تین یا چار نمازیں فوت ہوئیں۔

تیسری بات: ترجمۃ الباب میں مسئلہ یہ ہے کہ نمازیں فوت ہوں تو جس طرح فوت ہوئی ہیں اسی ترتیب پر پڑھنا اس کا کیا حکم ہے تو احناف مالک اور احمد کا مسلک یہ ہے کہ ترتیب واجب ہے مثلاً کسی کی فوت شدہ نمازیں تین ہیں ظہر عصر اور مغرب تو ان کی آپس میں بھی ترتیب واجب ہے اور فوت شدہ اور وقتی نماز میں بھی ترتیب واجب ہے کہ پہلے فوت شدہ بالترتیب ادا کرے پھر وقتی ادا کرے۔

شوافع کے ہاں ترتیب مستحب ہے اصل بات یہ ہے کہ نبی سے متعدد نمازیں خندق کے دن فوت ہوئیں اب اس پر اتفاق ہے کہ نبی ﷺ کے فعل سے ترتیب ثابت ہے اور احناف کے ہاں فعل سے وجوب ثابت نہیں ہوتا لیکن دوسرے احناف کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کا یہاں صرف فعل نہیں بلکہ اس کے ساتھ قرائن بھی ہیں جو وجوب پر دال ہیں ①۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے کہ انہوں نے ترتیب کو ضروری کہا ②۔ نبی ﷺ کا قول ہے کہ "صلوا کما رأیتمونی اصلی" تو امر قولی موجود ہے تو جب قولی امر کو فعل کے ساتھ ملایا تو وجوب ثابت ہو گیا۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اصول فقہ کے قواعد یہ اصول اجتہاد نہیں بلکہ ان کے کلام کے استخراج کے بعد لوگوں نے سمجھ کر اصول بنا دیئے یہ ٹھیک ہے کہ وجوب فعل یا عمل سے ثابت نہیں ہوتا مگر خارجی قرائن ہوں تو مجتہدین ان کی وجہ سے عمل سے وجوب کو ثابت کر لیتے ہیں اس لئے یہ قواعد بعد کے ہیں اس سے اصول اجتہاد میں فرق نہیں آتا۔

احناف کہتے کہ بعض اسباب اور عوارض آجائیں تو ترتیب کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے مثلاً احناف کے ہاں کثرۃ الفوائت سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے احمد کے ہاں کثرت فوائت سے ترتیب کا وجوب ساقط نہیں ہوتا احناف کے ہاں نسیان سے بھی ترتیب کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ان کے ہاں نسیان سے ترتیب کا وجوب ساقط نہیں ہوتا مگر مالکیہ اور حنابلہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ نسیان سے ترتیب کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

چوتھی بات: یہ نمازیں کیوں فوت ہوئیں کیا اس وقت صلاۃ الخوف جائز یعنی مشروع نہ تھی اور آج کل حرب کی وجہ سے نماز میں تاخیر جائز ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء کے ہاں آج کل تاخیر الصلوۃ جائز نہیں۔

اشکال: نبی سے جو مؤخر ہوئیں جواب: اس وقت صلاۃ الخوف مشروع نہ ہوئی تھی۔ دوسرے بعض کہتے ہیں کہ صلاۃ الخوف نبی ﷺ کے زمانے میں ہوئی تھی مگر مباشرت قتال کی وجہ سے نماز مؤخر کی اور مباشرت قتال آج بھی ہو تو نماز مؤخر کرنا جائز ہے باقی قرآن میں جو ہے کہ "رِجَالاً اَوْ رُكْبَانًا" تو بعض کے ہاں سوار ہو کر اشارے سے نماز ادا کرے لیکن احناف کے ہاں مؤخر کریگا۔

ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود: ابو عبیدہ کا نام کیا ہے؟ بعض نے کہا کہ عامر نام ہے بعض کے ہاں ابو عبیدہ نام بھی ہے کنیت بھی۔ دوسری

بات یہ ہے کہ ان کا سماع اپنے والد ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہے یا نہیں تو بعض کے ہاں سماع ثابت نہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر سات سال تھی اور سات سال کا بچہ بالاتفاق سماع کا متحمل ہوسکتا ہے بلکہ بخاری نے تو لکھا ہے کہ پانچ سال کا بچہ بھی سماع کا تحمل کرسکتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ طبرانی کی معجم الاوسط میں ان کے سماع کی تصریح بھی موجود ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ سماع نہ بھی ہو تو دارقطنی کا فیصلہ ہے "ابوعبیدہ کان اعلم بعلم ابیہ" کہ ابوعبیدہ اپنے والد کے علم کے زیادہ جاننے والے تھے ان حضرات سے جنہوں نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سماع کیا۔

باب ماجاء فی الصلاۃ الوسطی انها العصر

سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صلاۃ الوسطی صلاۃ عصر ہے دوسری روایت ابن مسعود کی ہے اس میں بھی ہے کہ "صلاۃ الوسطی صلاۃ العصر" کہ صلاۃ وسطی عصر کی نماز ہے۔

قرآن میں ہے کہ ﴿حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطی﴾ تو صلاۃ وسطی کی قرآن میں تاکید ہے اب بحث یہ ہے کہ صلاۃ وسطی کونسی ہے؟ علامہ شامی نے ۲۳ اقوال نقل کئے ہیں۔ علامہ عینی نے انیس اقوال نقل کئے ہیں۔ دمیاطی نے ۱۳ اقوال کا اضافہ کیا ہے معارف السنن میں ہے کہ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ۴۴ اقوال ہیں۔

امام اعظم اور جمہور کے ہاں صلاۃ الوسطی صلاۃ عصر ہے کیونکہ عام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے غلام کو مقرر کیا کہ قرآن لکھو اور کہا کہ جب اس آیت پر پہنچو تو مجھے بتاؤ جب ان کے پاس آیا تو انہوں نے بطور تفسیر بتایا کہ صلاۃ عصر مراد ہے۔ خندق کی فوت شدہ نمازوں کے بارے میں ہے۔ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے گھروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں صلاۃ وسطی سے مشغول کردیا اس میں بھی عصر ہی کا ذکر ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک قول ظہر کا ہے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے صبح کا قول بھی ہے۔

آخری بات: بعض چیزیں ایسی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا علم مخفی رکھا ہے مثلاً لیلۃ القدر ہے اسی طرح جمعہ کے دن ایک گھڑی ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتے ہیں یہ سب مخفی ہے ان میں کئی اقوال ہیں مگر شریعت نے تعیین نہیں کی ہے اسی طرح صلاۃ وسطی کا علم بھی مخفی ہے مگر صحیح تر یہ ہے کہ مراد صلاۃ العصر ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة الصلوۃ بعد العصر والفجر

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں جو صحابہ میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں وہ یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کے بعد نماز سے منع کیا یہاں تک کہ طلوع شمس ہوجائے اور عصر کے بعد نماز سے منع کیا یہاں تک کہ غروب ہوجائے۔

پہلی بات: اس باب کی حدیث جو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اس کے متعلق احناف، مالکیہ، شوافع اور دوسرے حضرات نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جس کے الفاظ متواتر ہیں احناف میں سے طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح معانی الآثار میں کہا ہے کہ یہ متواتر ہے اسی طرح شوافع میں سے علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ اور سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ حدیث متواتر ہے۔ مالکیہ میں سے ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی صراحت کی ہے کہ یہ روایت متواتر ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ الازهار المتناثرة فی احادیث المتواترة میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔

دوسری بات: امام اعظم فرماتے ہیں کہ اوقات ممنوعہ کی دو قسمیں ہیں صحیح مسلم کی حدیث میں نبی ﷺ سے تین اوقات مکروہ منقول ہیں

صحیح مسلم میں ہے "نهی عن الصلوة عند طلوع الشمس وعند استوائها وعند غروبها" تین اوقات یہ ہوئے اور دو اوقات مکروہ باب کی حدیث میں ہے تو کل پانچ اوقات مکروہ ہوگئے۔ یہ پانچ اوقات دو اقسام کی طرف تقسیم ہوتے ہیں۔

❶ پہلی قسم وہ ہے جو صحیح مسلم میں ہے اس کے متعلق امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان اوقات میں فرض بھی مکروہ ہے، واجب لعینہ اور لغیرہ بھی ممنوع ہے۔ نفل ہو نماز جنازہ، یا سجدہ تلاوت ہو یہ بھی مکروہ وممنوع ہیں البتہ امام صاحب اور جمہور کے ہاں غروب شمس کے وقت اسی دن کی عصر کی نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ بعض آثار میں "الا عصر یومه" کا استثناء آیا ہے۔

تیسری بات: امام اعظم فرماتے ہیں کہ ان اوقات مکروہ ثلاثہ میں اگر کسی نے فرض نماز پڑھ لی تو باطل ہوگی اور واجب الاعادہ ہوگی اور اگر کسی نے ان اوقات میں نفل پڑھے تو ادا ہو جائیں گے مگر کراہت تحریمی کے ساتھ اور کراہت اور تحریم ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں صرف ابن تیمیہ کا مسلک ہے کہ جواز اور کراہت دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

❷ اوقات مکروہ کی دوسری قسم باب کی حدیث میں موجود ہے کہ "نهی عن الصلوه بعد الفجر حتی تطلع الشمس وعن الصلاة بعد العصر حتی تغرب الشمس" امام اعظم فرماتے ہیں کہ اس دوسری قسم میں فوت شدہ فرائض بھی جائز ہیں اور وہ نمازیں جو واجب لعینہ ہوں وہ بھی جائز ہیں البتہ واجب لغیرہ اور نوافل جائز نہیں۔ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجہ لکھی ہے کہ اوقات ممنوعہ کی پہلی قسم میں کراھیت اور ممانعت وقت کی وجہ سے تھی اس لئے اس میں ہر قسم کی نماز ممنوع ہے البتہ اسی مکروہ وقت میں جنازہ آجائے یا سجدہ تلاوت اسی وقت واجب ہو جائے تو یہ دونوں چیزیں کر سکتا ہے باقی اوقات ممنوعہ کی قسم ثانی میں ممانعت حق الصلاۃ کی وجہ سے ہے گویا شریعت کے نزدیک فجر فرض کا وقت ہے اور غروب تک عصر کا وقت ہے اب چونکہ یہاں ممانعت حق الفرائض کی وجہ سے تھی اس لئے یہاں فرائض پڑھ سکتا ہے کیوں کہ فرائض فرائض کو منع نہیں کرتے لیکن نفل ممنوع ہیں کیونکہ نفل فرض نماز میں داخل نہیں تو یہ ان میں فرق کی وجہ حکمت ہے یعنی دونوں قسموں میں۔

چوتھی بات: نهی عن الصلاة بعد الفجر حتی تطلع الشمس...... الخ یہ روایت احناف اور جمہور کی مستدل ہے جن کے نزدیک طلوع الشمس تک اور بعد الغروب تک نفل جائز نہیں۔

عن قتادة ابو العالیة: قتادہ نے ابوالعالیہ سے سنا ہے یا نہیں تو شعبہ فرماتے ہیں کہ قتادہ نے صرف تین احادیث سنی ہیں ایک مذکورہ باب کی حدیث دوسری ابن عباس والی حدیث "لاینبغی لأحد أن یقول أنا خیر من یونس بن متی" تیسری علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "القضاة ثلاثة"۔ ابوداؤد نے چار احادیث ذکر کی ہیں جن میں قتادہ کا سماع ابوالعالیہ سے ثابت ہے اور معارف السنن میں ہے کہ چھ میں سماع ثابت ہے پانچ مرفوع اور ایک موقوف ہے۔ باب کی حدیث میں بھی سماع ثابت ہے اس لئے یہ روایت متصل ہے۔

لاینبغی لأحد أن یقول: اگر یہ خطاب امت کو ہو تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ کوئی امتی نبی سے افضل نہیں ہوتا اور اگر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو تو اشکال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں پھر لاینبغی لأحد أن یقول انا خیر من یونس بن متی کا کیا مطلب ہے؟

جواب ❶: یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء سے افضل ہونے کا علم نہیں تھا۔

جواب ❷: یہاں افضل اور مفضول بیان کرنا مقصد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن میں یونس علیہ الصلاۃ والسلام کا جو واقعہ ہے وہاں "فظن أن لن نقدر علیه" ہے تو اس سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ یونس علیہ الصلاۃ والسلام نے خلاف ورزی کی اور اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو خلاف ورزی نہ کرتا اس سے نبی کی تنقیص ہوگی تو نبی کی تنقیص سے ممانعت مقصود ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ بعد العصر

پہلے باب میں گذر گیا کہ عصر سے لیکر مکروہ وقت شروع ہونے تک بالاتفاق فرائض جائز ہیں اختلاف نوافل کے متعلق ہے اسی طرح وہ نوافل جو ذوات السبب ہوں اس میں اختلاف ہے۔ اور تیسرے طواف کے بعد کی دو رکعتوں میں اختلاف ہے۔

① امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عصر کے بعد غروب تک نوافل مطلقاً جائز نہیں، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک بھی یہی ہے چاہے وہ ذوات السبب ہوں یا نہ ہوں ممنوع ہیں امام احمد کے مختلف اقوال ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عصر کی نماز کے بعد نوافل پڑھنا جائز ہیں اور خصوصاً ذات السبب نفل پڑھنا جائز ہے شوافع کے ہاں مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہ بالکل نہیں اس لئے ان اوقات مکروہ میں طواف کی دو رکعتیں بھی جائز ہیں۔

امام اعظم کی دلیل ① باب اول کی روایت ہے کہ نھی عن الصلوۃ الفجر حتی تطلع الشمس وعن الصلوۃ بعد العصر حتی تغرب۔ دوسری دلیل اس باب کی روایت ہے کہ ایک دفعہ پڑھیں ثم لم یعد ہما۔ تیسری دلیل ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر پڑھائی کہ مال آ گیا اس کی تقسیم میں مشغول ہوئے کہ ظہر کے بعد کی دو رکعتیں رہ گئیں پھر عصر کی نماز کے بعد ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں ان کو پڑھا ام سلمہ نے باندی کے واسطے سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظہر کے بعد کی دو رکعت پڑھ رہا تھا ام سلمہ نے پوچھا کیا ہم بھی قضاء کیا کریں فرمایا "لا" معلوم ہوا قضاء کرنا صرف نبی کی خصوصیت تھی۔

رکعتین بعد الطواف بھی احناف کے ہاں مکروہ اوقات میں جائز نہیں پہلی دلیل تو عمومی ہے کہ ان اوقات میں نماز مکروہ ہے دوسری دلیل یہ کہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف کی اجازت لی اور طواف طلوع فجر کے بعد کیا اور حرم سے نکل کر طلوع شمس کے بعد دو رکعت ادا کیں۔ تیسری دلیل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صبح کو طواف کیا پھر حرم سے باہر مکروہ وقت کے بعد دو رکعت نماز ادا کی۔

شوافع کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں الا بمکۃ کا استثناء ہے مگر احناف کہتے ہیں کہ یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبد مناف سے خطاب فرمایا کہ "لاتمنعوا احداً یطوف بهذا البیت ویصلی أیة ساعة شاء" احناف کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اختلاف ہے اس لئے شیخین نے اس کو نقل نہیں کیا۔ دوسرا اس وقت بنی عبد مناف کے گھر بیت اللہ کے اردگرد تھے وہ شام کو گھر کے دروازے بند کر دیتے تھے جس کی وجہ سے لوگ داخل نہ ہو سکتے تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ دروازے بند نہ کیا کرو بلکہ لوگوں کو آنے دیا کرو۔

باب ماجاء فی الصلاۃ قبل المغرب

عبد اللہ بن مغفل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہر دو اذانوں (یعنی اذان واقامت) کے درمیان نماز ہے ان کیلئے جو پڑھنا چاہیں۔

مسئلہ: یہ ہے کہ مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟ احناف اور مالکیہ کے ہاں رکعتین قبل صلاۃ المغرب بعد الاذان ثابت نہیں۔ دوسرا قول احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں فقط جائز ہے چنانچہ منقول ہے کہ ان سے جب رکعتین قبل المغرب کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا جب سے میں نے حدیث سنی ہے تو عمل کرنے کیلئے صرف ایک دفعہ پڑھے ہیں تو ان کے ہاں فقط جائز تو ہے مستحب نہیں جبکہ ترمذی نے ان کی طرف استحباب کا قول منسوب کیا ہے۔

تیسرا قول شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کا مشہور قول رکعتین قبل المغرب کے استحباب کا ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ صاحب فتح القدیر

نے لکھا ہے کہ جواز کا قول احناف کے ہاں بھی راجح ہے یعنی احناف کے ہاں بھی یہ رکعتین جائز اور مباح ہیں کیونکہ نبی ﷺ اور بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثبوت ہے تو کم از کم نفس جواز ہوگا اس لئے پڑھنا تو نہیں چاہئے لیکن اگر پڑھ لئے تو ثواب مل جائے گا اور گناہ نہ ہوگا۔امام شافعی کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ ''بین کل اذانین صلاۃ لمن شاء'' اس سے شافعی استحباب ثابت کرتے ہیں۔

جمہور کی پہلی دلیل مسند بزار میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''ان عند کل اذانین صلاۃ ماخلا المغرب'' یہ روایت مجمع الزوائد میں مسند بزار کے حوالے سے مذکور ہے مگر اس میں عبداللہ بن حبان ایک روای ہے محدثین نے اس کو کذاب کہا ہے اس لئے یہ روایت قابل حجت نہیں۔

معارف السنن میں ہے کہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن حبان کا ہونا اور اس کو کذاب کہنا غلطی ہے عبداللہ بن حبان دو ہیں ایک عبداللہ بن حبان دارمی یہ کذاب ہے اور دوسرا عبیداللہ بن حبان البصری یہ ثقہ ہے اور مسند بزار کی روایت میں عبیداللہ بن حبان ہے۔عبداللہ بن حبان نہیں اس لئے یہ روایت ضعیف نہیں۔

احناف اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے طاؤس نقل کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلاۃ قبل المغرب کے بارے میں سوال کیا گیا انہوں نے جواب دیا ''مارأیت أحداً یصلیهما علی عهد رسول الله ﷺ'' یہ روایت بھی سنداً قوی ہے اس سے معلوم ہوا کہ صلاۃ قبل المغرب مستحب نہیں۔تیسری دلیل یہ ہے کہ احناف کہتے ہیں کہ خود نبی ﷺ کے عمل سے اس کا ثبوت نہیں کہ کسی موقع پر آپ نے پڑھے ہوں۔چوتھی دلیل ابراہیم نخعی کا اثر ہے کہ ''ان النبی ﷺ وابا بکر وعمر لم یصلوھا'' ابن حجر نے اس اثر پر اعتراض کیا ہے کہ اثر مرسل ہے کیونکہ ابراہیم تابعی ہیں انہوں نے نبی کا زمانہ نہیں پایا۔اس لئے جن سے انہوں نے یہ حدیث سنی ہے ان کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے یہ مرسل ہے۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ شافعی کے علاوہ باقی سب کے ہاں روایت مرسل حجت ہے دوسرا ابراہیم نخعی کے مراسیل کو شوافع بھی قبول کرتے ہیں۔تیسرا یہ کہ ابراہیم سے شاگرد نے پوچھا کہ کبھی آپ براہ راست قال النبی ﷺ کہتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ جب میں کسی صحابی کا نام لوں تو روایت صرف انہی سے منقول ہوتی ہے اور جب میں قال النبی ﷺ کہوں تو وہ مجھے کثیر اسناد سے پہنچی ہوتی ہے اس لئے میں نام نہیں لیتا۔

ان ادلہ کی وجہ سے احناف استحباب کے قائل نہیں البتہ چونکہ احادیث میں مذکور ہے اس لئے نفس جواز ثابت ہوگا۔

باب کی حدیث کا اصل مصداق: آپ نے صلاۃ بعد العصر سے منع کیا تھا غروب تک تو اس حدیث میں یہ بتایا کہ وہ ممانعت جو عصر کے بعد تھی وہ غروب کے وقت تک تھی اب جب غروب ہو چکا تو یہ اباحت کا وقت ہے اس میں وہ ممانعت ختم ہوگئی اس لئے یہ حدیث اباحت پر دلالت کرتی ہے۔

باب ماجاء فی من ادرک رکعة من العصر قبل ان تغرب الشمس

ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ جس نے طلوع سے پہلے ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب سے پہلے ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔

حدیث کا مفہوم: عام محدثین کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ صبح کی نماز سے کوئی سو گیا یا بھول گیا طلوع کے وقت جاگ گیا یا یاد آ گیا اب ایک رکعت ادا کی کہ طلوع ہو گیا تو اب یہ کیا کریگا۔اس میں ائمہ ثلاثہ اور جمہور فقہاء کے ہاں دوسری رکعت ملائے گا اس کی نماز ہو جائے گی ہمارے احناف امام ابوحنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے ہاں عصر کی نماز میں جمہور والا قول ہے کہ غروب سے پہلے ایک

رکعت پالی تو باقی غروب کے وقت ادا کرسکتا ہے تو عصر میں جمہور کا اتفاق ہے۔

لیکن فجر کی نماز میں احناف کا اختلاف ہے احناف کے ہاں ایک رکعت پڑھ لی کہ طلوع شمس ہوگیا تو اس کی نماز نہ ہوگی محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل باطل ہوجائے گی لیکن شیخین کے ہاں نفل بن جائے گی۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ اس کی اصل صورت یہ ہے کہ جب ایک رکعت کے بعد طلوع ہوگیا تو کھڑا ہوجائے اور جب سمجھے کے طلوع کا وقت ختم ہوگیا ہے پھر دوسری رکعت ملالے تو یہ دو رکعت نفل ہوجائی گی اور فرض بعد میں قضاء کرلے یہاں دو باتیں ہیں ① یہ مسلک صرف امام ابو یوسف کا نہیں امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہے ② دوسری بات یہ ہے کہ نفل تب بنیں گے جب درمیان میں رک کر انتظار کرے عین طلوع کے وقت نہ پڑھے۔

باب کی حدیث میں ان پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ عصر کی نماز میں آپ نے حدیث کے مفہوم پر عمل کیا اور فجر میں آپ عمل نہیں کرتے اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں احناف متعدد باتیں ذکر کرتے ہیں۔

باب کی حدیث سے طلوع اور غرب کے وقت نماز پڑھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے جبکہ دوسری روایات میں ان اوقات میں نماز سے ممانعت موجود ہے اس لئے تعارض آگیا تو ساقط ہوگا اس لئے قیاس کی طرف رجوع کیا اور قیاس کہتا ہے کہ فجر کے وقت جب طلوع ہو تو نماز فاسد ہونی چاہئے اور عصر میں غروب ہوگیا تو نماز باطل نہ ہونی چاہئے وجہ اس کی یہ ہے کہ فجر میں وجوب کامل ہوا تو ادا بھی کامل ضروری ہے اور عصر میں وجوب ناقص ہوا تو ادا بھی ناقص کافی ہے اب وقت جیسے آیا تو نماز کا امر متوجہ ہوجائے گا اگر اس وقت ادا نہ کیا تو دوسرا اس وقت سبب بن جائے گا اسی طرح کرتے کرتے آخری وقت تک پڑھ سکتا ہے فجر کا سارا وقت کامل ہے اس لئے وجوب کامل تھا تو کامل ادا کرنا ہوگا اس لئے طلوع کا وقت جو کہ ناقص وقت ہے اس میں کامل ادا صحیح نہیں ہوگا جبکہ عصر کا آخری وقت ناقص ہے جب پہلے وجوب تھا تو کامل تھا اب جب وجوب ناقص وقت میں داخل ہوا تو وجوب بھی ناقص ہے ادا بھی ناقص ہوگی۔

طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے توجیہ کی ہے کہ باب کی حدیث اس پر محمول ہے جس پر فجر یا عصر کی نماز اس مختصر وقت میں واجب ہوئی ہو کہ ایک رکعت کی بقدر وقت باقی تھا تو اس پر اس وقت کی نماز واجب ہوجائے گی لیکن اس پر اعتراض ہے کیونکہ بعض روایات میں ہے "فلیصل الیھا اخری" اس میں صراحت ہے کہ حدیث کا یہ مفہوم نہیں لیکن اس کا جواب ہوسکتا ہے کہ اصل الفاظ ترمذی نے نقل کئے ہیں اور "فلیصل الیھا اخری" میں ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہو۔

باب کی حدیث کا صحیح تر مطلب یہ ہے کہ احناف کا بھی اس پر عمل ہے کیونکہ عصر میں تو واضح ہے لیکن فجر کی رکعت ملانے میں بھی احناف کا عمل ہے احناف کہتے ہیں کہ دوسری رکعت ملالے تو نفل بن جائے گی ثواب مل جائے گا تو فقد ادرک کا معنی یہ ہے کہ ثواب مل جائے گا البتہ نماز نفل ہوگی۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تاویل یہ کی ہے کہ یہ جماعت پر محمول ہے کہ جس نے ایک رکعت پالی اس نے جماعت کی فضیلت پالی۔

باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین

ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر اور عصر اسی مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھا مدینہ میں بغیر خوف اور بارش کے ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایسا کرنے کا مقصد کیا تھا جواب دیا کہ مقصود یہ تھا کہ امت حرج میں واقع نہ ہو ابن عباس سے دوسری روایت منقول ہے اس میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا اس نے کبائر میں سے ایک کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

پہلی بات: جمع بین الصلاتین کے بارے میں کچھ مسائل اتفاقی ہیں کچھ اختلافی ہیں۔

دوسری بات: اتفاقی مسائل یہ ہیں ❶ ایسی دونمازوں کو بالاتفاق جمع کرنا جائز نہیں جن کے درمیان اتصال نہ ہو جیسے فجر اور ظہر کی جمع جائز نہیں کیونکہ ان کے درمیان وقت مہمل ہے اور وہ فجر اور ظہر کے درمیان فاصل ہے۔

❷ ایسی دونمازوں کو بھی جمع کرنا جائز نہیں جن کے درمیان اور کوئی نماز حائل ہو جسے عصر اور عشاء کی جمع بالاتفاق جائز نہیں۔

❸ جن کے ہاں جمع کرنا جائز بھی ہے ان کے ہاں بھی جمع بین الصلاتین بغیر عذر کے جائز نہیں البتہ اگر عذر ہو جس کو شریعت عذر سمجھے اس کے بغیر بالاتفاق جائز نہیں ابن حجر، علامہ نووی، قاضی حسین وغیرہ کا قول ہے ابن عباس کی روایت کی توجیہ میں کہ جمع بین الصلاتین حضر میں جائز ہے بغیر عذر کے جب وہ اس کو عادت نہ بنائے لیکن جمہور کے ہاں بغیر عذر کے جائز نہیں۔

❹ جمع بین الصلاتین جمع تقدیم کے ساتھ عرفات میں بالاتفاق جائز ہے شرائط کے ساتھ ابواب الحج میں شرائط آئیں گی۔

❺ جمع بین الصلاتین جمع تاخیر کے ساتھ مزدلفہ کے مقام پر بالاتفاق جائز ہے جب عرفہ سے آدمی چلتا ہے تو عشاء کو پہنچتا ہے مغرب کو نہ عرفہ میں پڑھ سکتا ہے اور نہ راستے میں پڑھ سکتا ہے بلکہ مزدلفہ میں عشاء کے وقت ادا کرے گا۔

تیسری بات: جمع کی اختلافی صورت یہ ہے کہ جمع بین الصلاتین تقدیم کے ساتھ ہو یا تاخیر کے ساتھ سفر میں یہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔ دوسرا قول امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں جمع بین الصلاتین سفر میں تاخیر کے ساتھ جائز ہے کہ ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشاء کے ساتھ پڑھے لیکن جمع تقدیم جائز نہیں۔ بخاری نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا ہے جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ جمع تاخیر جائز ہے اس لئے ابن حجر اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس باب سے بخاری کا قول ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ بخاری تراجم میں قول مختار کو ذکر کرتے ہیں۔

تیسرا قول احناف کا ہے احناف اور فقہائے کوفہ کے ہاں سفر ہو مطر ہو یا مرض ہو نہ جمع تقدیم جائز ہے نہ جمع تاخیر جائز ہے البتہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ عذر کی وجہ سے اگر کوئی جمع فعلی یعنی صوری کرے تو جائز ہے ابن نجیم، علامہ عینی، علامہ کاسانی، صاحب بحرالرائق نے جمع فعلی سے تعبیر کیا ہے۔ معارف السنن میں اس کو پسند کیا ہے اور صاحب برھان نے بھی جمع فعلی سے تعبیر کیا ہے ائمہ ثلاثہ کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں ہے کہ نبی ﷺ سے منقول ہے کہ جمع بین المغرب والعشاء یا جمع بین الظہر والعصر احناف کہتے ہیں کہ جمع تقدیمی کے ہم اس لئے قائل نہیں کیونکہ معرفۃ العلوم میں حاکم نے بخاری کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے اس راوی سے پوچھا جس نے لیث سے جمع تقدیم کی روایت نقل کی ہے کہ تم نے یہ کس کے ساتھ سنا تھا اس نے کہا خالد المدائنی کے ساتھ سنا تھا تو بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں سمجھ گیا کہ یہ موضوع روایت ہے کیونکہ خالد المدائنی محدثین کی احادیث میں اپنی طرف سے حدیثیں گھڑتا تھا اس لئے احناف بھی جمع تقدیم کے قائل نہیں کیونکہ اس کے بارے میں صحیح حدیث منقول نہیں۔ دوسرا قرآن کہتا ہے ﴿ان الصلوة كانت على المؤمنين كتابًا موقوتًا﴾ کہ وقت پر ادا کرو۔ اور وقت کے علاوہ پڑھنے کیلئے دلیل کی ضرورت ہے جو موجود نہیں۔

احناف جمع تاخیر کے اس لئے قائل نہیں کیونکہ جمع کے بارے میں جو احادیث ہیں وہ محمول ہیں جمع فعلی پر مثلاً ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث ہے یہ صحیح مسلم میں ابوالشعثاء کی سند سے ہے ابوالشعثاء کے شاگرد نے ان سے سوال کیا کہ میرا گمان ہے کہ نبی ﷺ نے یہ صورت اختیار کی ہوگی کہ ظہر کو آخری وقت میں اور عصر کو اول وقت میں اسی طرح مغرب کو آخری وقت میں اور عشاء کو اول وقت میں پڑھا ہوگا تو ابوالشعثاء نے کہا "وانا اظن ذالک"۔

سنن نسائی میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا قول ہے ''جمع رسول اللہ ﷺ بین الظہر والعصر والمغرب والعشاء'' اس کے بعد الفاظ ہیں ''اخر الظہر وعجل العصر واخر المغرب وعجل العشاء'' معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ جمع صوری پر محمول ہے۔ ابن مسعود رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ ''ما صلّی رسول اللہ ﷺ صلاۃ لغیر وقتہا الا صلاتین'' یعنی عرفات اور مزدلفہ میں اسی طرح قرآن کی آیت ہے ﴿ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا﴾ ان ادلہ کی وجہ سے جمع کی احادیث جمع فعلی پر محمول ہیں۔

دوسرے ائمہ جو جمع کے قائل ہیں ان کے ہاں بھی جمع تقدیم کیلئے شرائط ہیں: ① جب پہلی نماز وقت میں پڑھتے تو نماز کے درمیان جمع کی نیت کرلے ② وقت بھی تنگ نہ ہو ③ ترتیب کے ساتھ پڑھے ④ پہلی نماز کے وقت نکل جانے سے پہلے جمع کی نیت کرے اب کب جائز ہے؟ تو سفر میں تینوں کے ہاں جمع جائز ہے مطر میں امام شافعی واحمد قائل ہیں مرض میں صرف احمد واسحاق قائل ہیں۔

چوتھی بات: ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی جو حدیث ہے اس کے بارے میں ترمذی نے کتاب العلل میں نقل کیا ہے کہ میری اس کتاب کی تمام احادیث ایسی ہیں جن پر کسی نہ کسی امام کا عمل ہے سوائے دو احادیث کے ایک ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی مذکورہ حدیث۔ دوسری ابواب الحدود کی حدیث کہ کوئی شراب پی لے تو تین مرتبہ حد لگائی جائے اگر چوتھی مرتبہ پھر پئے تو قتل کر دیا جائے۔

ابن حجر وغیرہ نے بہت زور لگایا ہے کہ ابن عباس کی روایت سفر کا واقعہ ہے لیکن بالمدینۃ سے ان کی تردید ہوتی ہے بعض نے کہا کہ مرض کی وجہ سے جمع کیا اس کا جواب یہ ہے کہ شافعی کے ہاں مرض عذر نہیں۔ دوسرا کیا پوری قوم بیمار تھی اس لئے ابن حجر اور قرطبی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حدیث جمع فعلی پر محمول ہے تاکہ امت حرج میں نہ پڑے۔ اس وجہ سے مولانا انور شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں کہ ترمذی کی یہ حدیث بھی احناف کے ہاں معمول بہا ہے جب جمع فعلی پر حمل کیا جائے اور دوسری روایت بھی معمول بہا ہے کہ تعزیراً قتل کیا جائے۔

باب ماجاء فی بدء الاذان

پہلی بات: یہاں سے اذان کے ابواب شروع ہو رہے ہیں اذان کا لغوی معنی ہے اعلام شریعت کی اصطلاح میں اذان کہتے ہیں الاعلام المخصوص بالفاظ مخصوصۃ فی وقت مخصوص۔

دوسری بات: اذان کی ابتداء کہاں ہوئی تو اس میں اتفاق ہے کہ اذان کی ابتداء مدنی دور میں ہوئی مکی دور میں نہیں ہوئی تھی قرآن میں اس کا ذکر ہے ﴿اذا نادیتم الی الصلوۃ اتخذوھا ھزوا﴾ دوسری جگہ ہے ﴿اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ﴾ اب قرآن میں اذان کا حکم نہیں کہ اذان دو کیونکہ اذان کی ابتداء ہوئی عبداللہ بن زید کی خواب سے اور قرآن نے اس کی توثیق کی۔ مدینہ میں ابتداء کا واقعہ ہے کہ صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے مشورہ کیا کہ نماز کے اوقات مقرر کئے جائیں تاکہ سارے شریک ہو سکیں بعض نے کہا ناقوس بجایا جائے بعض نے کہا یہودیوں کی طرح سینگ بجایا جائے مگر نبی ﷺ نے اور صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے یہود ونصاریٰ کی مشابہت کی وجہ سے اس کو پسند نہ کیا عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ نماز کے وقت ایک آدمی آواز لگائے ''الصلاۃ جامعۃ'' تو آپ نے فرمایا ''قم یا بلال فناد بالصلاۃ'' چند دن تک اس پر عمل ہوتا رہا مگر صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کو انتظار تھا کہ کوئی علامت ہونی چاہئے تو عبداللہ بن زید بن عبدربہ نے خواب دیکھا فرماتے ہیں کہ میں نوم اور یقظہ کے درمیان میں تھا کہ سبز کپڑوں والا ایک آدمی آسمان سے اترا دیوار پر کھڑا ہو گیا اسکے پاس ناقوس تھا میں نے اذان کیلئے مانگا تو اس نے کہا کہ میں تمہیں اس سے بہتر کلمات نہ بتاؤں اس نے کانوں میں انگلیاں دیں اور اذان دی پھر بیٹھا اور پھر کھڑا ہو گیا بغیر انگلیاں ڈالے اقامت کہی نبی ﷺ کو جب بیان کیا تو آپ نے فرمایا بلال کو یہ کلمات سکھلا دو

تاکہ وہ اذان دیں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دیکھا تھا مگر شرم کی وجہ سے نہ بتایا کہ لوگ کہیں گے کہ ویسے کہہ رہا ہے جب اذان سنی تو صبر نہ کرسکے آکر حضور ﷺ کو بتایا کہ میں نے بھی یہ دیکھا ہے آپ نے فرمایا کہ پہلے مجلس میں کیوں بیان نہیں کیا انہوں نے وجہ بتائی آپ نے فرمایا "ذالک اثبت" کہ یہ بہتر ہے کہ دوسری شہادت مل گئی اس کے علاوہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خواب دیکھا تھا کل بیس صحابہ نے خواب دیکھا تھا۔

اشکال: خواب سے حکم شرعی کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

جواب: خواب کی وجہ سے یہ حکم شرعی نہیں بنا بلکہ آپ ﷺ کی توثیق سے حکم شرعی بنا۔ ② آپ نے لیلۃ الاسریٰ میں فرشتے سے سنا مگر مکہ میں ضرورت نہ تھی اس لئے بھول گئے جب دوبارہ سنا تو بات یاد آگئی دوسرا قرآن نے بھی توثیق کردی۔

تیسری بات: حدیث سے معلوم ہوا کہ مستحب ہے کہ ① مؤذن حسن الصوت ہو ② اس کی آواز اونچی ہو کہ اعلام کا مقصد اچھے طریقے سے حاصل ہو ③ اذان شعائر دین میں سے ہے اس لئے اگر لوگ اس کو ترک کردیں تو ان کے ساتھ قتال کیا جائے گا۔ قرطبی کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ اذان دین کی ضروریات پر مشتمل ہے مثلاً توحید، رسالت، معاد وغیرہ پر مشتمل ہے۔

باب ماجاء فی الترجیع فی الاذان

ابومحذورہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو بٹھایا اور اذان کے کلمات ان پر القاء کیے ایک ایک کلمہ کرکے ابراہیم کہتے ہیں کہ ہماری اذان کی طرح تھی۔ بشر کہتے ہیں کہ میں نے کہا مجھے کلمات سنادیں تو انہوں نے ترجیع کے ساتھ کلمات سنائے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابومحذورہ کو اذان کی تعلیم دی انیس کلمات کے ساتھ اور اقامت کی تعلیم دی سترہ کلمات کے ساتھ۔

پہلی بات: ترجیع کی تعریف کیا ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ ترجیع کہتے ہیں "**اعادة الشهادتين مرتين بصوت عال بعد النطق بصوت منخفض**"

دوسری بات: اذان میں ترجیع کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اتنی بات پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ اذان کے کلمات میں ترجیع وعدم ترجیع کا جو اختلاف ہے یہ اختلاف مباح کا ہے یعنی ترجیع کے قائلین کے ہاں بدون ترجیع اذان صحیح ہے اور ترجیع کے عدم قائلین کے ہاں ترجیع کے ساتھ اذان جائز ہے۔

تیسری بات: اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ واحمد فی روایۃ سفیان ثوری اور فقہائے کوفہ کے ہاں اذان بغیر ترجیع کے دینا مستحب ہے۔ دوسرا قول امام مالک اور امام شافعی کا ہے ان دونوں کے ہاں ترجیع کے ساتھ اذان دینا مستحب ہے۔ تیسرا قول امام اسحاق اور امام احمد کا ہے کہ ترجیع کے ساتھ بھی بہتر ہے اور بلا ترجیع بھی بہتر ہے اس قول کے مطابق ترجیع اور عدم ترجیع مساوی ہیں۔

امام اعظم کی دلیل دو قسم کی احادیث ہیں ایک قسم کی احادیث اصل التاذین کے نام سے مشہور ہیں یعنی جو عبداللہ بن زید سے منقول ہیں اس کو مصنف ابن ابی شیبہ میں نقل کیا گیا ہے یہ صحیح سند کے ساتھ ہے عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ حدثنا اصحاب محمد کہ عبداللہ بن زید نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ایک آدمی دیوار پر کھڑا ہوا آسمان سے اتر کر "**فأذن مثنى مثنى وأقام مثنى مثنى**" ابن الجوزی نے التحقیق میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن زید کی حدیث جو صحیح طرق سے منقول ہے اس کے کسی طریق میں ترجیع کا ذکر نہیں۔

احناف کا دوسرا مستدل بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان ہے طحاوی نے نقل کیا ہے کہ "**کان یثنی الاذان ویثنی الاقامة**" بلال کے اذان کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان کی اذان بغیر ترجیع کے ہوتی تھی۔ مالکیہ اور شوافع کی

دلیل ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جو باب میں دوسندوں کے ساتھ منقول ہے ایک میں "فوصف الاذان بالترجیع" دوسری میں ہے کہ اذان کی تعلیم انیس کلمات کے ساتھ۔

احناف ابومحذورہ کی حدیث میں تاویل کرتے ہیں صاحب ہدایہ نے تاویل کی ہے کہ ابومحذورہ کو آپ تعلیم دے رہے تھے انہوں نے شہادتین کو صحیح نہیں پڑھا تھا اس لئے فرمایا "اعدہ" تو آپ کا اصل مقصد تعلیم تھی ابومحذورہ نے اس کو ترجیع سمجھا۔

دوسری تاویل طحاوی نے کی ہے کہ ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آہستہ آواز سے شہادتین پڑھے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے آرہے تھے مکہ سے باہر ٹھہرے موذن نے اذان دی مکہ کے بچوں نے نقل اتارنا شروع کردیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلایا اور پوچھا کہ اچھی آواز کس کی ہے سب نے ابومحذورہ کی طرف اشارہ کردیا آپ نے فرمایا پڑھو اس وقت وہ مسلمان نہیں تھے اس لئے شہادتین کو آہستہ پڑھا آپ نے حکم دیا کہ "اعدہما بصوت عال" ترجیع مقصود نہیں تھی۔

تیسری تاویل ابن جوزی نے کی ہے کہ آپ نے جو شہادتین کے اعادے کا حکم فرمایا اس سے مقصود تھا کہ اس کے دل میں شہادتین کا اخلاص پیدا ہو اور رسوخ فی الایمان ہو ورنہ ترجیع مسنون ہوتی تو بلال کو بعد میں ترجیع کا حکم دیتے جبکہ اس کے بعد بلال نے ترجیع نہیں کی۔

اصل بات یہ ہے کہ اذان کے متعلق اختلاف مباح کا ہے مختلف شہروں میں مختلف طریقے ہیں ابن رشدؒ کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ چار اذانیں مشہور ہیں: ① مکی اذان یہ ترجیع کے ساتھ انیس کلمات ہیں ② مدنی اذان یہ مالکیہ کے ہاں راجح ہے یہ ترجیع کے ساتھ سترہ کلمات ہیں شروع میں اللہ اکبر دومرتبہ ③ اذان کوفی یہ پندرہ کلمات کی ہے اس میں ترجیع نہیں ④ اذان بصری اس میں انیس کلمات ہیں چار دفعہ اللہ اکبر پھر شہادتین مکمل ایک دفعہ پھر حی علی الصلوۃ اور ایک دفعہ حی علی الفلاح پھر اسی طرح شہادتین سے حی علی الفلاح تک دومرتبہ لوٹائے۔ تو یہ چار اذانیں مشہور تھیں پانچویں قسم ابویوسف ومحمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ایک قول میں یہ بھی منقول ہے کہ ترجیع کے بغیر ہے اور پندرہ کلمات ہیں کیونکہ اللہ اکبر شروع میں دومرتبہ ہے احناف نے اذان کوفی کو ترجیح دی ہے اس لئے کہ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسی طرح دی جاتی تھی دوسرا اصل عبداللہ بن زید کی روایت ہے اس میں ترجیع نہیں ہے۔

باب ماجاء فی افراد الاقامة باب ماجاء فی أن الاقامة مثنى مثنى

پہلے باب میں انس بن مالک کی روایت نقل کی ہے کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اذان دُگنے کلمات کے ساتھ کہیں اور اقامت میں افراد کریں۔ دوسرے باب میں عبداللہ بن زید کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذان دُگنے کلمات کے ساتھ ہوتی تھی اذان میں بھی اور اقامت میں بھی۔ ان دونوں بابوں کا تعلق کلمات اقامت کے ساتھ ہے کہ اس میں کیا اختلاف ہے۔

اختلاف: امام ابوحنیفہ کے ہاں اقامت کے سترہ کلمات ہیں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشہور قول میں کلمات اقامت گیارہ ہیں مالک کے ہاں کلمات اقامت دس ہیں شوافع کا بھی ایک قول یہ ہے۔ شوافع کا ایک قول نو کلمات کا بھی ہے۔ ان کا ایک قول آٹھ کا ہے۔ مشہور اقوال میں تین مذاہب ہیں احناف کے ہاں سترہ کلمات، شافعی کے ہاں گیارہ کلمات، اور مالک کے ہاں دس کلمات ہیں۔

ایتار والوں کی دلیل انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ "امر بلال ان یشفع الاذان ویوتر الاقامة" وہ ایتار سے کلمات کی ایتار مراد لیتے ہیں۔ امام صاحب کی دلیل ① اصل التاذین کی روایت میں ہے ابوبکر بن ابی شیبہ عن وکیع عن الاعمش عن عمرو بن مرۃ عن عبدالرحمن بن ابی لیلی قال حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سند بالکل صحیح ہے لوقریٔ علی المجنون لافاق اس سند پر کوئی کلام نہیں یہ سلسلۃ الذہب کی سند ہے اس سند سے حدیث منقول ہے اس میں ہے "فأذن مثنى مثنى وأقام مثنى مثنى" دوسری دلیل ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

ہے حدیث میں ہے کہ علمه الاذان تسع عشرة كلمة والاقامة سبع عشرة كلمة تیسری دلیل بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقامت کے بارے میں طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا اور ابن جوزی نے بھی نقل کیا ''ان بلالا کان یثنی الاقامۃ'' باقی رہ گیا ''ان یوتر الاقامۃ'' کا مطلب تو احناف کہتے ہیں کہ اس سے ایتار فی الصوت مراد ہے شوافع بھی بعض جگہ یہ تاویل کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں اقامت کے شروع میں اللہ اکبر دو مرتبہ ہے اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہاں دو دفعہ ایتار کہاں ہے تو وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہاں ایتار سے ایتار فی الصوت مراد ہے احناف کہتے ہیں کہ جب آدھی جگہ تاویل کرتے ہو تو پوری اقامت میں بھی کرو۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے دوسری تاویل (کے عنوان کے نیچے) لکھا ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بعض مقامات پر ضرورت کے تحت اختصار مراد ہے اور ضرورت کے مقام پر جائز ہے تو ضرورت کے وقت بیان جواز کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایتار کیا۔

اعتراض: بعض سندوں میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عبداللہ بن زید سے نقل کرتے ہیں جبکہ ان کی ملاقات آپس میں نہیں ہوئی ہے؟

جواب: ابن ابی لیلیٰ کبار تابعین میں سے ہیں ۱۲۰ صحابہ سے ملے ہیں تو صحابی کے واسطے سے نقل کیا ہوگا تو یہ صحابی کا مرسل ہے جو کہ قابل قبول ہے۔

جواب ❷: دوسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ حدثنا اصحاب محمد اور صحابی کا نام نہیں لیا یہ مانع نہیں کیونکہ صحابہ سارے عادل ہیں۔

جواب ❸: ابن ابی لیلیٰ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں پیدا ہوئے اور عبداللہ بن زید عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فوت ہوئے ان کی وفات کے وقت ابن ابی لیلیٰ آٹھ سال کے تھے اور آٹھ سال کا بچہ سماع کا اہل ہے اس لئے ممکن ہے ان سے سنا ہو۔

باب ماجاء فی الترسل فی الاذان

جابر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو فرمایا کہ اے بلال جب تم اذان دو تو جلدی نہ کرو اپنی اذان میں اور جب اقامت کہو تو جلدی سے کلمات اقامت ادا کرو اور اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ رکھو کہ کھانے پینے والا کھانے پینے سے فارغ ہو جائے اور قضائے حاجت والا قضاء حاجت سے فارغ ہو جائے اور تم کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھے نہ دیکھ لو۔

پہلی بات: ترسل کسے کہتے ہیں؟ معارف السنن میں ہے کہ ترسل تانیہ اور عجلت کی ضد کو کہتے ہیں کہ کام میں اعتدال اختیار کرنا۔

دوسری بات: ''اذا أقمت فاحدر'' حدر تعجیل اور سراع کو کہتے ہیں، کہ کام میں جلدی کرنا۔ اب باب کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اذان کے کلمات کی ادائیگی میں جلدی نہ کرو، بلکہ اطمینان سے کلمات ادا کرو۔ اور اقامت کے کلمات میں جلدی کرو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اذان میں کلمات کو اس طرح ادا کرو کہ ایک سانس میں صرف ایک کلمہ ادا کیا جائے، صرف اللہ اکبر چار دفعہ ہے اور یہ دو کلمات کے حکم میں ہے۔ اس لئے ان چاروں کو دو سانسوں میں ادا کیا جاتا ہے اور اقامت میں دونوں کلمات کو ایک سانس میں ادا کیا جاتا ہے۔

تیسری بات: اذان میں ترسل اور اقامت میں حدر اس کا فقہی حکم کیا ہے؟ ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ کلمات اذان میں ترسل سنت اور مستحب ہے اور اقامت میں حدر مستحب ہے اور اس کے خلاف کرنا مکروہ ہے۔

چوتھی بات: معارف السنن میں ہے کہ اذان و اقامت کے کلمات کو جب ادا کریں گے تو آخر میں جزم پڑھیں گے اعراب جاری نہ کریں گے، جیسے اللہ اکبر یہ جزم سے پڑھنا بھی مستحب ہے۔

پانچویں بات: فرمایا جب اذان دو تو اذان و اقامت کے درمیان وقفہ کرو، یہ وقفہ بالاتفاق ائمہ مجتہدین کے ہاں مسنون ہے سوائے مغرب کے، کہ مغرب کی نماز میں وقفہ نہیں ہے۔ مغرب میں اذان دے تو بعض فقہاء کے نزدیک صرف اتنا وقفہ کرے کہ انسان تین قدم

چل سکے، بعض نے کہا کہ اتنا وقفہ کرے جتنا کہ دوخطبوں کے درمیان ہوتا ہے، بالکل اتصال اسمیں بھی مکروہ ہے باقی چار نمازوں میں اتنا وقفہ ہونا چاہئے کہ اسمیں آدمی چار رکعت پڑھ سکے اور ہر رکعت میں دس آیات تلاوت کر سکے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر لوگ مؤذن کی اذان کے بعد جلدی آئیں تو جلدی نماز قائم کرے اور اگر جلدی نہ آئیں تو جب لوگ آ جائیں پھر نماز قائم کرے۔

چھٹی بات: "لاتقوموا حتی ترونی" امام کے مسجد میں داخل ہونے سے پہلے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے اس لئے جب امام داخل ہو تو مقتدی کھڑے ہوں۔ طریقہ یہ ہے کہ اگر امام محراب کی طرف سے آئے تو امام کو دیکھتے ہی سارے لوگ کھڑے ہو جائیں، اور اگر پیچھے سے آ رہا ہو تو جس صف سے گزرتا جائے مقتدی کھڑے ہوتے جائیں۔ یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ امام اگر مسجد میں موجود ہے تو مقتدی کس وقت کھڑے ہوں تو بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑے ہوں عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے پہلے کھڑے ہونا منع ہے جیسے بریلوی کرتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے فقہاء کا مطلب یہ نہیں ہے، طحاوی نے درمختار کی شرح میں لکھا ہے کہ اس کے بعد بیٹھنا جائز نہیں۔ یعنی احتراز عن التاخیر لاعن التقدیم کے پہلے اٹھنا چاہئے تھا مگر عذر کی وجہ سے دیر ہوگئی تو قد قامت الصلوٰۃ کے بعد بیٹھنا جائز نہیں تفصیل اپنی جگہ آئیگی۔

باب ماجاء فی ادخال الاصبع الاذن عند الاذان

عون بن ابی جحیفہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے بلال کو دیکھا کہ وہ اذان دے رہے تھے اور پھیرتے تھے اپنے منہ کو ایک جانب اور دوسری جانب اور انکی انگلیاں کانوں میں تھیں اور نبی اکرم ﷺ سرخ خیمے میں تھے (شاید چمڑے کا تھا) پھر بلال نیزہ نکال کر لائے اس کو میدان میں گاڑھا اس کی طرف آپ نے نماز پڑھائی اور سامنے کتے گدھے گزر رہے تھے اور نبی ﷺ کے بدن پر سرخ جوڑا تھا مجھے اس طرح بات یاد ہے گویا کہ ابھی ابھی آپ کی پنڈلیوں کی چمک کو دیکھ رہا ہوں۔

پہلی بات: یہاں اذان کے آداب میں سے ایک ادب کو بیان کر رہے ہیں وہ یہ کہ مؤذن جب اذان دی تو اس کی انگلیاں کانوں میں ٹھونسی ہوئی ہوں۔

دوسری بات: کانوں میں اذان کے وقت انگلیاں ڈالنا اس کا کیا حکم ہے؟ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے ہاں یہ مستحب ہے اس کے ضروری یا واجب ہونے کا کوئی امام قائل نہیں۔

تیسری بات: یہ استحباب صرف اذان میں ہے یا اقامت میں بھی ہے تو ائمہ اربعہ کے ہاں اس کا استحباب صرف اذان میں ہے سوائے امام اوزاعی کے کہ ان کے ہاں اس کا استحباب اقامت کیلئے بھی ہے، مگر جمہور صرف اذان میں استحباب کے قائل ہیں ① کیونکہ یہ ہیئت صرف اذان میں منقول ہے اقامت میں یہ ہیئت منقول نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ادخال الاصبعین فی الاذان کی علت یہ ہے کہ یہ آواز اونچی کرنے میں ممد اور معاون ہے اور آواز اونچی کرنا اذان میں مطلوب ہے تا کہ باہر کے لوگ سن لیں لیکن اقامت میں اعلام مقصود نہیں ہوتا اس لئے اتنی رفع الصوت کافی ہے جس سے مسجد کے اندر کے لوگوں کو علم ہو سکے اس لئے اقامت میں اس کی ضرورت ہی نہیں۔

چوتھی بات: کانوں میں اذان کے وقت انگلیاں دینا اس کی حکمت کیا ہے اس کے متعلق دو باتیں ہیں:

❶ اس میں ان لوگوں کے لئے بھی اعلام ہے جو بہرے ہیں جب وہ ہیئت دیکھیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اذان دے رہا ہے

❷ یہ رفع الصوت میں معاون ہے جب کان کے منفذ بند ہوئے تو ساری آواز منہ سے نکلے گی جدید سائنس اس کی تردید کرتی ہے وہ کہتے ہیں کہ آواز کا منفذ صرف منہ میں ہے کان یا ناک میں نہیں لیکن یہ علت ہو یا نہ ہو یہ چیز رفع الصوت میں ممد ہے کیونکہ کان میں انگلیاں ہونگی تو زور سے بولے گا سمجھے گا کہ مجھے آواز نہیں پہنچ رہی تو اور لوگوں کو بھی نہیں پہنچی ہوگی۔

پانچویں بات: ویدور ویتبع فاہ ھھنا وھھنا ...... الخ یہ حکم حی علی الصلاہ اور حی علی الفلاح کے اندر ہے ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ اس وقت بھی صرف گردن پھیرے گا سینہ نہ پھیرے گا سینہ بدستور متوجہ الی القبلہ ہوگا اگر اذان منارے میں دے رہا ہو تو فقہاء کے نزدیک حی علی الصلاۃ کے وقت ایک جانب سر باہر نکالے اور حی علی الفلاح کے وقت دوسری جانب سر باہر نکالے تاکہ لوگ آواز سن لیں۔

چھٹی بات: نبی کریم ﷺ نے سرخ کپڑا پہنا تھا اس کا کیا حکم ہے؟ علامہ شامی نے سات اقوال نقل کئے ہیں راجح کراہت کا ہے کہ خالص سرخ کپڑا مکروہ ہے البتہ سرخ دھاریوں والا جائز ہے جیسے یہاں نبی کریم ﷺ نے پہنا کیونکہ حبری کپڑا کہتے ہی اس کو ہیں جو سرخ دھاریوں والا ہو۔

باب ماجاء فی التثویب فی الفجر

بلال کی روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی نماز میں تثویب مت کیا کرو سوائے نماز فجر کے۔

تثویب کی تعریف: ثوب یثوب تثویباً بمعنی رجع، مراد یہ ہے کہ مؤذن نے اذان دی پھر دوبارہ لوٹ کر نماز کی دعوت دی۔ اصطلاحی معنی کیا ہے؟ تو ترمذی نے دو تفسیریں کی ہیں ایک یہ کہ فجر کی نماز میں الصلاۃ خیر من النوم کہنا تثویب ہے اس معنی کے اعتبار سے تثویب بالاتفاق فجر کی نماز کی اذان میں ثابت ہے حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور کہا الصلاۃ خیر من النوم آپ نے پسند کیا اور فرمایا کہ "اجعلھافی اذانک" نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس معنی کے اعتبار سے بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرف انکار کی نسبت کی ہے مگر یہ نسبت غلط ہے علماء احناف نے اس کی تردید کی ہے۔

دوسری تفسیر یہ کی ہے کہ مؤذن اذان دے اور محسوس کرے کہ لوگ تاخیر کر رہے ہیں تو وہ ایک اور آواز لگائے اذان اور اقامت کے درمیان اس معنی کے اعتبار سے تثویب محدث ہے آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں اس کا وجود نہیں تھا لیکن امام محمد نے لکھا ہے کہ بعض علماء کوفہ نے جب لوگوں کے اندر سستی دیکھی تو فجر کی نماز میں اس قسم کی تثویب شروع کر دی علی الفلاح اور حی علی الصلاۃ کے الفاظ سے ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اس میں عموم ہے یعنی ساری نمازوں میں جائز مگر حکام اور قاضی وغیرہ جو امور مسلمین میں مشغول ہیں اس معنی میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہے اس معنی میں یہ بدعت نہیں لیکن عام اعلان محدث ہے حکام کے پاس جاکر الصلاۃ رحمک اللہ وغیرہ کہنا بدعت نہیں بلکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے باقی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس مسجد سے نکلے تھے وہ اس لئے کہ وہاں مؤذن نے عام اعلان کیا تھا جو کہ محدث ہے۔

باب ماجاء أن من اذن فھو یقیم

زیاد بن حارث الصدائی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ حکم دیا کہ میں فجر کی اذان دوں تو میں نے اذان دی بلال نے اقامت کہنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صداء قبیلے کے اس بھائی نے اذان دی ہے جس نے اذان دی ہے وہی اقامت کریگا یہ سفر کا واقعہ ہے کہ فجر کے وقت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود نہ تھے اس لئے زیاد بن حارث نے اذان دی تھی۔

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے اذان دی اب دوسرا آدمی اقامت کہتا ہے تو دوسرے کیلئے اقامت کہنا جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے امام شافعی اور امام احمد کے ہاں جس نے اذان دی وہی اقامت کہے گا۔ دوسرے آدمی کی اقامت مکروہ ہے چاہے دوسرے کی اقامت سے پہلے کو تکلیف ہو یا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ اور فقہائے کوفہ فرماتے ہیں کہ اگر اقامت کہنے سے اذان دینے والے کو تکلیف ہوتی ہو تو دوسرے کیلئے اقامت مکروہ ہے لیکن اذان دینے والا دوسرے کو اجازت دے دے یا اس کو تکلیف نہ ہو تو دوسرا اقامت کر سکتا ہے۔

قول اول والوں کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ "من اذن فھو یقیم" امام صاحب کی پہلی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن زید بن عبدربہ کی روایت میں ہے کہ جب انہوں نے خواب میں اذان دیکھی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خبر دی آپ نے فرمایا کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سکھادو ان کی آواز اونچی ہے تو عبداللہ بن زید بلال کے اذان دینے سے پریشان ہوئے کہ یہ فضیلت مجھے نہیں ملی تو آپ نے ان کی دلجوئی کیلئے عبداللہ بن زید سے اقامت کرائی۔

دوسری دلیل یہ کہ عبداللہ بن ام مکتوم کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کبھی اذان دیتے تھے اور بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اقامت کرتے تھے اور کبھی بلال اذان دیتے تھے اور عبداللہ بن ام مکتوم اقامت کہتے تھے معلوم ہوا دوسرے کی اقامت صحیح ہے البتہ جب اذان دینے والا اس کو پسند نہ کرے اور اس کو تکلیف ہو تو ایذاء مسلم کی وجہ سے اس میں کراہت آتی ہے اور اگر کسی کو ایذاء نہ ہو تو جائز ہے۔

دوسری بات: احناف کے ہاں بھی اولیٰ یہ ہے کہ جو اذان دے وہی اقامت کہے اس کی وجہ کیا ہے معارف السنن میں مولانا انور شاہ صاحب سے منقول ہے کہ اذان اعلام عام ہے اقامت اعلام خاص ہے دونوں اعلاموں کا تعلق ایک نماز سے ہے اب کسی نے اعلام عام کردیا تو اعلام خاص کا بھی وہ حقدار بن گیا۔

تیسری بات: احناف کہتے ہیں کہ باب کی حدیث ضعیف بھی ہے کیونکہ زیاد بن انعم افریقی اس کی سند میں ہے۔یحیٰ بن سعید القطان اور احمد نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے جبکہ احناف نے جو احادیث پیش کی ہیں وہ سنداً اقوی ہیں۔

چوتھی بات: زیاد بن انعم افریقی کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ یہ مقارب الحدیث ہے اور گزر چکا ہے کہ مقارب الحدیث الفاظ توثیق میں سے چوتھے مرتبے کے ہیں مقارب کو مقارب بھی پڑھ سکتے ہیں یعنی یقارب حدیثہ حدیث غیرہ اور مقارب اسم مفعول بھی صحیح ہے کہ "یقارب حدیث غیرہ حدیثہ" دونوں صورتوں میں لفظ توثیق ہی کا ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ الاذان بغیر وضوء

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذان نہ دے مگر باوضوء آدمی۔

اختلاف: اذان بغیر وضوء کے دینا اس کا کیا حکم ہے؟ اس بات میں تو ائمہ کا اتفاق اور اجماع ہے کہ بغیر وضوء اذان دینے سے اذان ہوجاتی ہے اس کا اعادہ لازم نہیں، الا یہ کہ کسی کو حدث اکبر لاحق ہو اور پھر اذان دے تو اذان واجب الاعادہ ہے۔اختلاف اس بات میں ہے کہ بے وضوء کا اذان دینا جائز ہے یا نہیں تو امام شافعی امام اسحاق کے ہاں بے وضوء اذان دینا مکروہ تحریمی ہے، امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن المبارک اور جمہور کے ہاں جائز ہے۔مگر خلاف اولیٰ ہے البتہ اقامت کے بارے میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول کراہت تحریمی اور تنزیہی دونوں کا ہے لیکن اذان میں خلاف اولیٰ کا قول ہے، باب کی حدیث قول اول والوں کی دلیل ہے اور اس حدیث کو بالکل ظاہر پر شوافع بھی حمل نہیں کرتے ورنہ اذان بالکل جائز نہ ہوتی احناف کہتے ہیں یہ حدیث ابوہریرہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔دوسرا یہ منقطع ہے کیونکہ زہری نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں سنا البتہ چونکہ اذان اسماء اللہ پر مشتمل ہے اس میں دعوت بھی ہے اس لئے اس کے لئے وضوء کرنا مستحب ہوگا تو باب کی حدیث استحباب پر محمول ہے۔

باب ماجاء أن الامام احق بالاقامۃ

اس میں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن انتظار کرتے تھے اور اس وقت تک اقامت نہ کہتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہ لیتے۔

ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ اذان مؤذن جب چاہے دے سکتا ہے اذان کے وقت امام کا حاضر ہونا ضروری نہیں بلکہ دخول وقت کے بعد مؤذن جب چاہے اذان دے سکتا ہے، لیکن اقامت مؤذن تب کہے گا جب امام نکل آئے تو اقامت میں امام کا حاضر ہونا ضروری ہے، اور یہی مطلب ہے إن الامام احق بالاقامۃ کا مسئلے کے لحاظ سے یہ مفہوم اتفاقی ہے کہ اذان کے لئے حضور امام ضروری ہے اور اقامت کے لئے امام کا حضور ضروری ہے کیونکہ اقامت صلاۃ بالجماعۃ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

باب ماجاء فى الأذان بالليل

سالم اپنے والد عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو اذان دیتے ہیں اس لئے تم کھایا پیا کرو یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی اذان نہ سن لو۔ تنقیح مسئلہ کے لئے ایک بات کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلی بات: فجر کے علاوہ باقی اوقات صلاۃ میں ائمہ کا اجماع ہے کہ دخول وقت سے پہلے اذان دینا جائز نہیں اور اگر کسی نے دخول وقت سے پہلے اذان دی تو اذان واجب الاعادہ ہوگی۔ فجر میں اختلاف ہے، امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف کے ہاں فجر کے لئے دخول وقت سے پہلے بھی اذان جائز ہے اب کب دینا جائز ہے اس میں پانچ اقوال ہیں۔ ① عشاء کے بعد دے سکتا ہے ② رات کے تیسرے حصے میں جائز ہے ③ دوسرے حصے میں جائز ہے ④ آخری ثلث جب شروع ہو تو فجر کی اذان دینا جائز ہے۔ ⑤ صبح کاذب کے بعد جائز ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کے ہاں باقی چار اوقات کی طرح فجر میں بھی خول وقت سے پہلے اذان دینا جائز نہیں اگر اذان دے دی تو واجب الاعادہ ہوگی۔ احناف کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ "یا بلال لاتؤذن حتی تستبین لک الفجر" دوسری حدیث میں ہے کہ "یا بلال لاتؤذن حتی یطلع الفجر" ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان نہ دو۔ باقی باب کی حدیث ہے اس میں اصل بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پورا سال (عندالمالکیہ) یا صرف رمضان میں (عندالجمہور) یہ دستور تھا کہ دو اذانیں ہوتی تھیں، ایک رات کو ہوتی تھی تاکہ سوئے ہوئے سحری کے لئے جاگ جائیں، اور جو لوگ کام کاج میں لگے ہوئے ہوں وہ واپس لوٹ جائیں۔ احناف میں سے بعض نے لکھا ہے کہ رمضان میں یہ اذان مستحب ہے، یہ معارف السنن میں ہے شرح شرعۃ الاسلام کے حوالے سے منقول ہے، دوسری اذان طلوع فجر کے بعد ہوتی تھی فجر کے لئے۔

یہ بات کسی حدیث میں نہیں کہ رات کو جو اذان دی وہی فجر کے لئے تھی طلوع فجر کے بعد دوسری اذان نہیں دی وہی فجر کے لئے کافی تھی، بلکہ تمام روایتوں میں ہے کہ فجر کے لئے دوسری اذان دی جاتی تھی۔

دوسری بات: حدیث میں تعارض ہے کبھی فرمایا بلال کی اذان رات کو ہوتی ہے۔ ایک دفعہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وقت سے پہلے اذان دی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ اعلان کرو کہ "ان العبد قدنام" تو یہ تعارض ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ ابتداء میں ابن ام مکتوم سحری کو اذان دیتے تھے۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فجر کی دیتے تھے بعد میں بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر کمزور ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب الٹ دی۔ ابن ام مکتوم فجر کی دینے لگے، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کی دینے لگے۔ اس لئے دونوں احادیث الگ الگ اوقات پر محمول ہیں اس لئے تعارض نہیں۔ باقی ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا تعارض کو پیدا کرکے "ان العبد قدنام" والی روایت کو غلط کہنا صحیح نہیں کیونکہ یہاں تعارض ہی نہیں بلکہ یہ دونوں روایتیں تعدد واقعات پر محمول ہیں۔

باب ماجاء فی کراھیة الخروج من المسجد بعد الأذان

ابو شعثاء فرماتے ہیں کہ عصر کی اذان ہو جانے کے بعد ایک آدمی مسجد سے نکلا تو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ باب کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی مسجد کے اندر ہو کہ اذان ہوگئی اب اس کے لئے نماز پڑھے بغیر نکلنا مکروہ ہے۔

پہلی بات: اس مسئلے میں ائمہ کے مذاہب متفق ہیں۔ معارف السنن میں ہے کہ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا مکروہ وممنوع ہے۔

دوسری بات: فقہاء نے جو کہا ہے کہ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا مکروہ ہے اس کی علت کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ اس کی علت یہ ہے کہ یہاں خطرہ ہے کہ دوسری جگہ پہنچ نہ سکے اور اس کی جماعت فوت ہو جائے، تو خوف فوت الجماعۃ علت ہوئی۔

تیسری بات: فقہاء نے دوسری احادیث کی وجہ سے بعض صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ ① آدمی مسجد میں تھا کہ اذان ہوگئی اور یہ بے وضوء تھا اب یہ وضوء کی غرض سے مسجد سے نکل رہا ہے تو اس کے لئے اجازت ہے۔ ② وہ شخص بھی مستثنیٰ ہے جس کے ساتھ دوسرے کا حق متعلق ہو مثلاً وہ دوسری مسجد کا مؤذن یا امام ہو یہ بھی نکل سکتا ہے ③ کوئی ایسا معاملہ ہو جو انتہائی ضروری ہے مثلاً کوئی مسجد کے اندر ہے اب باہر ایک آدمی ایسی حالت میں ہے کہ یہ نکل کر نہ بچائے تو اس کی جان کو خطرہ ہے تو یہ آدمی بچانے کے لئے نکل سکتا ہے۔ ④ کوئی آدمی باہر حاجت کے لئے جائے مگر اس کا لوٹنے کا ارادہ ہے تو نکل سکتا ہے یہ چیزیں جو فقہاء نے مستثنیٰ کی ہیں اس پر دلیل سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے اس میں ہے کہ اذان کے بعد کوئی نکلا یعنی "ثم خرج ولم یخرج لحاجة وھو لایرید الرجوع"۔

چوتھی بات: کوئی مسجد سے باہر ہو اس کے لئے جانا ممنوع نہیں جبکہ خوف فوت الجماعۃ اس باہر والے کے لئے بھی ہے معارف السنن میں ہے اس سے معلوم ہوا کہ اتحاد علت کے باوجود کبھی عارض کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے جیسے یہاں علت (خوف فوت جماعت) اندر والے کے لئے بھی ہے اور باہر والے کیلئے بھی ہے معارف السنن میں ہے کہ یہ قاعدہ عام اصولی تسلیم کرتے ہیں مگر ابن تیمیہ اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے مگر جمہور کی بات قوی ہے اور اس مسئلے سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

پانچویں بات: فقہاء کہتے ہیں کوئی مسجد میں تھا کہ اذان ہوگئی اس کے لئے نکلنا بھی ضروری ہے لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں اور دوسری جماعت بھی نہیں مل سکتی۔ اب یہ اکیلے نماز پڑھے تو پھر باہر نکل سکتا ہے کیونکہ نماز پڑھ لی تو فرض ادا ہو گیا اب خروج کی علت باقی نہ رہی۔

باب ماجاء فی الأذان فی السفر

مالک بن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا چچازاد بھائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ہم جب جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم سفر کرو تو اذان دیا کرو اقامت کیا کرو اور نماز پڑھائے تم میں سے جو بڑا ہو۔

پہلی بات: سفر میں اذان دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اس سے پہلے یہ سمجھو کہ اذان کا مقصد اعلام ہے یعنی لوگوں کو نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دینا۔

دوسری بات: سفر میں اذان دینے کا کیا حکم ہے؟ اس میں اتنی بات پر اتفاق ہے کہ ائمہ اربعہ کے ہاں سفر میں اذان واقامت افضل اور اولیٰ ہے۔

تیسری بات: کسی نے سفر میں اذان نہ دی اور صرف اقامت پر اکتفا کر لیا تو یہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بلا کراہت جائز ہے کیونکہ سفر میں اذان کا حکم ان کے ہاں استحباب کا ہے ہمارے ہاں کراہت تب ہوگی جب اذان واقامت دونوں کو

چھوڑ دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سفر میں بھی اذان سنت ہے اس لئے کوئی سفر میں اذان نہ دے تو کراہت ہوگی تنزیہی، دلیل ان کی باب کی روایت ہے مگر اس سے سنت ہونے پر مستدل بنانا صحیح نہیں کیونکہ امر کا صیغہ ہے امر وجوب کے لئے آتا ہے، اور وجوب کسی کے ہاں مراد نہیں۔ مراد نہیں تو کیا مراد ہے تو شوافع سنت مراد لیتے ہیں احناف استحباب مراد لیتے ہیں اس لئے یہ حدیث احناف کے خلاف نہیں۔

چوتھی بات: "فاذنا واقیما" یہ تثنیہ ہے تو ظاہر مفہوم ہے کہ دونوں اذان دو اور دونوں اقامت کہو۔ مگر ظاہری مفہوم کسی کے ہاں مراد نہیں تو نبی ﷺ نے یہ تعبیر کیوں فرمائی شارحین نے لکھا ہے کہ اس تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ اذان اور اقامت میں دونوں مساوی ہیں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں جبکہ امامت میں اکبر کو ترجیح دی گئی تھی تو یہاں دونوں برابر ہیں۔ مساوات ظاہر کرنے کے لئے تثنیہ کا صیغہ لایا بعض نے لکھا ہے کہ جب تم اکیلے اکیلے سفر کرو تو ہر آدمی اپنے لئے اذان بھی کہے اور اقامت بھی کہے۔

ولیؤمکما اکبر کما یہ مسئلہ امامت کے ابواب میں آئے گا کہ امامت کے وجوہ ترجیح کیا ہیں مختصراً سن لو کہ اگر امام الحی مقرر ہو تو وہاں مقرر امام کا حق ہے چاہے اس سے بڑا عالم اور اقرأ کیوں نہ آ جائے لیکن سفر کی صورت ہو کوئی آدمی ہوں مقرر کردہ امام نہ ہو پھر وجوہ ترجیح دیکھا جائے گا یہ وجوہ ترجیح اپنی جگہ آئیں گی۔

پانچویں بات: یہاں اس حدیث میں اعلم اور اقرأ کا ذکر نہیں کیا اکبر کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اکٹھے مسلمان ہوئے برابر وقت نبی ﷺ کے ساتھ گزارا تو یہ علم اور قرأت میں برابر تھے اس لئے صرف اکبر ہونے کا ذکر کیا۔

باب ماجاء فی فضل الاذان

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے سات سال اذان دی اس حال میں کہ وہ ثواب کی امید کرتا ہو تو اس کے لئے آگ سے براءۃ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب ہے "فضل الاذان" اذان دینے کے فضائل۔ اذان کے فضائل نبی ﷺ سے بہت سارے صحیح اسانید سے منقول ہیں۔

دوسری بات: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو اذان کی فضیلت میں حدیث لائی ہے یہ سنداً ضعیف ہے کیونکہ اس سند میں جابر بن یزید الجعفی ہے اور یہ رافضی تھا رجعت پر ایمان لایا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے عطاء بن ابی رباح سے زیادہ افضل اور جابر جعفی سے زیادہ کذاب کسی کو نہیں دیکھا بعض نے کہا ہے کہ یہ کذاب تھا اور سال میں ایک مدت میں اس کو جنون بھی آتا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ شعبدہ باز بھی تھا، بعض محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے مثلاً شیعہ سے توثیق ثابت ہے وکیع کا قول ہے کہ کوفہ میں یہ نہ ہوتا تو کوفہ والے حدیث سے محروم ہوتے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ بعض کے ہاں کوفہ والوں سے سفیان ثوری مراد ہیں کیونکہ انہوں نے اکثر احادیث لی ہیں۔ (کوکب الدری)

تیسری بات: فضل الاذان میں صحیح احادیث موجود ہیں تو امام ترمذی نے ضعیف حدیث کیوں لائی؟

معارف السنن میں شروط الائمۃ الخمسہ کے حوالے سے ہے کہ ترمذی کا یہ طریقہ ہے کہ کبھی باب میں ایسی حدیث کو لاتے ہیں جس کی تخریج عام محدثین نے نہ کی ہو مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث بھی سامنے آجائے باقی اس کا قوی ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

لکان اھل کوفۃ: کوکب الدری میں ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کو کذاب کہتے ہیں اس لئے اہل کوفہ سے سفیان ثوری مراد ہیں جو اس سے احادیث نقل کرتے ہیں۔

باب ماجاء أن الامام ضامن والمؤذن مؤتمن

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام ضامن ہے اور مؤذن امانتدار ہے اے اللہ ہدایت دے ائمہ کو اور مغفرت فرما مؤذن کی۔

الامام ضامن: باب کی حدیث بہت سارے مسائل میں احناف کی مستدل ہے اور بہت مسائل مین شوافع کے خلاف ہے۔ مثلاً احناف کہتے ہیں کہ امام کی نماز صحۃً وفساداً متضمن ہوتی ہے مقتدیوں کی نماز کو مثلاً امام نماز میں تھا، درمیان میں یا بعد میں ظاہر ہوا کپڑے ناپاک تھے تو احناف کے ہاں نہ امام کی نماز ہوئی نہ مقتدیوں کی۔ جبکہ شوافع کے ہاں امام کی نماز نہ ہوئی مقتدیوں کی ہوگئی کیونکہ ان کے ہاں امام صرف راعی (یعنی رعایت کرنے والا) ہے۔ باقی نمازیں ان کی اپنی اپنی ہیں..... الامام ضامن کا معنے احناف کرتے ہیں کہ امام کفیل ہے یعنی امام مقتدیوں کی نماز کی کفالت کرتا ہے یہ معنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی منقول ہے۔

اسی طرح قرأت خلف الامام میں بھی احناف کہتے ہیں کہ الامام ضامن۔ امام مقتدیوں کی طرف سے کفالت کرتا ہے ان کے بعض اقوال میں جیسے فاتحہ یا سورت "والمؤذن مؤتمن" مؤذن امین ہے یعنی وقت کو دیکھتا ہے صحیح وقت پر اذان دیتا ہے صحیح وقت پر نماز قائم کرتا ہے۔

باب مایقول اذا اذن المؤذن

ابو سعید خدری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اذان سنو تو وہی کلمات اس طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے۔

پہلی بات: اذان کی اجابت کا حکم کیا ہے؟ یعنی مؤذن جب حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کہتا ہے تو اس دعوت کی اجابت کا کیا حکم ہے؟ تو فقہاء کہتے ہیں کہ اجابت بالفعل یعنی اجابت بالقدم یہ تو واجب ہے بالاتفاق دوسری اجابت بالقول ہے کہ اذان سن کر اذان کے کلمات کو دہرانا یہ اجابت بالقول ہے اور مستحب ہے۔

دوسری بات: حدیث میں ہے "فقولوا مثل مایقول المؤذن" یہاں مثل کا لفظ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کلمات مؤذن کہتا ہے تم بھی وہی کلمات اس طرح کہو تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح مؤذن کہے تم بھی یہ کہو۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ مؤذن یہ الفاظ کہہ کر دوسروں کو دعوت دے رہا ہے لیکن سننے والا کہہ کر کس کو دعوت دے گا۔

جواب: سننے والا یہ کہہ کر اپنے نفس کو صلاۃ اور فلاح کی دعوت دے گا۔ تو اذان کے جواب کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہی الفاظ لوٹائے مگر دوسری صورت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں آپ نے "**لاحول ولاقوۃ الا باللہ**" کہا اور دوسروں کو بھی یہ کہنے کا حکم دیا۔

عمدۃ القاری میں عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ، فی روایۃ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فی روایۃ ان کا قول یہ ہے کہ قولوا مثل مایقول المؤذن پر عمل کیا جائے گا یعنی وہی الفاظ لوٹائے۔ دوسرا قول امام اعظم امام مالک فی روایۃ امام احمد فی روایۃ اور جمہور کے ہاں باقی وہی الفاظ دہرائے مگر حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کے وقت لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک بھی یہ دوسرا ہے۔ تو ان کی بات سے معلوم ہوا کہ ائمہ میں اختلاف نہیں۔ ابن المنذر کا قول ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ یہ اختلاف مباح کا ہے کہ اگر وہی الفاظ کہے تو یہ بھی جائز ہے اور اگر حیعلتین کے وقت لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے یہ بھی جائز ہے اور دونوں پر اجر ملے گا۔

احناف کے فقہاء میں سے صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے زمانے کے مشائخ تصوف کو دیکھا کہ وہ حیعلتین میں دونوں چیزوں کو جمع کرتے تھے علامہ انور شاہ کشمیری رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کا قول ہے۔ کہ میں نے پندرہ سال تک جمع پر عمل کیا لیکن پندرہ سال بعد میرے ذہن میں بات آئی کہ جمع کرنا شارع کا مقصد نہیں اور نہ یہ منقول ہے اس لئے کبھی ایک صورت پر عمل کرنا چاہیئے اور کبھی دوسری صورت پر عمل کرنا چاہیئے۔

باب ماجاء في كراهية أن ياخذ المؤذن على الأذان أجرًا

عثمان بن ابی العاص رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مجھے آخری وصیت جو فرمائی (یہ طائف جارہے تھے ان کو وہاں کا والی مقرر کیا تھا) کہ میں اپنے لئے ایسا مؤذن مقرر کردوں جو اذان پر اجرت نہ لے۔

پہلی بات: عثمان بن ابی العاص رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ آخری وصیت جو مجھے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے کی اس سے کیا مراد ہے تو فرماتے ہیں کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو طائف کا گورنر بنایا مرض الوفات میں جب عثمان رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ جارہے تھے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان کو یہ آخری وصیت کی۔

دوسری بات: اذان پر اجرت لینا اس کا کیا حکم ہے؟ یہ مسئلہ اذان تک محدود نہیں بلکہ اس کا عنوان ہے "**اجرة على الطاعات**"، تو اس میں اذان، اقامت، حج، تلاوت سب شامل ہیں۔ احناف اور حنابلہ کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ ہر وہ طاعت جس کے ساتھ مسلمان کا اختصاص ہو اس پر اجرت لینا جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے اجرت کی ممانعت منقول ہے، اسی آیات "ولاتشتروا بایاتی ثمناً قلیلا"، جس میں ثمن قلیل لینے کی ممانعت ہے۔ اس کا ظاہر بھی اس کو ممنوع قرار دیتا ہے، سنن میں روایت ہے کہ ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو قرآن پڑھایا اس آدمی نے مجھے ترکش دیا، تو نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تو چاہتا ہے کہ قیامت میں تجھ کو آگ پہنادی جائے تو لے اس لئے احناف اور حنابلہ فرماتے ہیں کہ وہ طاعت جس کا اس کو ثواب ملتا ہو اس پر اجرت لینا جائز نہیں یعنی "**كل طاعة يختص بها المسلم لايحل عليه الاجرة**"

امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اور امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی کے ہاں اذان، امامت، جہاد، تعلیم قرآن سب پر اجرت لینا جائز ہے۔ دلیل بخاری اور سنن کی حدیث ہے کہ صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے لدیغ پر سورۃ فاتحہ دم کی اور اجرت میں بکریوں کا ریوڑ لیا، جب نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو علم ہوا تو انہوں نے رضا کا اظہار کیا۔

احناف کہتے ہیں کہ دم ہو یا تعویذ ہو اس پر اجرت لینا ہمارے ہاں بھی جائز ہے کیونکہ یہ طاعات کے قبیل سے نہیں بلکہ علاج کے قبیل سے ہے۔ اس لئے مذکورہ حدیث ہمارے خلاف نہیں کیونکہ یہ علاج کے لئے ہے جو ہمارے ہاں بھی جائز ہے، متاخرین احناف نے پہلے تعلیم القرآن پر اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا کیونکہ پہلے زمانے میں معلمین کو عطیات بیت المال سے ملتے تھے اس لئے وہ تعلیم کے لئے فارغ ہوتے، لیکن اب یہ معاملہ نہیں اب اگر معلمین روزی کی تلاش میں لگ جائیں تو تعلیم القرآن ضائع ہو جائے گی، بعد کے فقہاء نے اس علت کو دیکھ کر امامت اور اذان، تعلیم القرآن پر اجرت لینا بالاتفاق جائز قرار دیا، ان تینوں کے علاوہ احناف کے ہاں اب بھی کسی چیز پر اجرت کو متاخرین کی دو تین کتابوں کو دیکھ کر فتویٰ نہیں دینا چاہیئے۔ کیونکہ متاخرین غلطیاں کرتے ہیں ایک نے غلطی کی دوسرے نے اس کو دیکھ کر نقل کر دیا، اسی طرح تیسرا دیکھ کر نقل کر دیتا ہے۔ اس پر علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی نے مثالیں پیش کی ہیں کہ متقدمین فقہاء احناف نے ان تینوں کے جواز کا فتویٰ

دیا ہے بعض نے لکھا ہے کہ ایصال ثواب پر اجرت لینا جائز ہے، شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ طاعات میں صرف تین چیزیں مستثنیٰ ہیں باقی نہیں۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں متاخرین نے صرف تین کو مستثنیٰ کیا ہے باقی طاعات میں وہی فتویٰ ہے کہ ان پر اجرت جائز نہیں۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شفاء العلیل میں لکھا ہے کہ احناف نے جو استثناء کیا ہے وہ صرف تین چیزوں کا ہے باقی طاعات پر اجرت جائز نہیں۔

ایصال ثواب کن چیزوں کا ہوتا ہے اس میں اختلاف ہے، احناف کے ہاں عبادات مالیہ، بدنیہ نفلیہ کا ثواب بھی پہنچ جاتا ہے لیکن ایصال ثواب کے لئے جو ختم کیا جاتا ہے اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ حلقہ بنا کر قرآن پڑھتے ہیں یہ قرآن کے آداب کے خلاف ہے اور دوسرا خیر القرون سے منقول نہیں ہے تیسرا جب اجرت لے لے تو پڑھنے والا خود ثواب کا مستحق نہیں ہوتا جب خود مستحق نہیں ہوتا تو دوسرے کو کیا ثواب پہنچائے گا اس لئے اجرت لینا کھانا وغیرہ جائز نہیں۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے سختی سے اس کی تردید کی ہے البتہ اپنے طور پر قرآن پڑھ کر بخشا جائے یہ جائز ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری بات: باب کی حدیث اس وقت پر محمول ہے جب عام لوگوں کے عطایا مقرر تھے، دوسرا یہ اولیٰ پر محمول ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ اجرت نہ لے۔

چوتھی بات: مؤذن کے لئے جو ثواب کا ذکر ہے اب مؤذن اجرت لے تو اس کو ثواب ملے گا یا نہیں؟ تو علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ ثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

باب مایقول اذا أذن المؤذن من الدعاء وباب منه ایضًا

مؤذن جب اذان دے تو کیا دعا پڑھنی چاہیئے، پہلے باب میں ہے کہ مؤذن جب اذان دے اور سننے والا یہ دعا پڑھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ گناہوں کو بخش دیں گے

أنا اشهدان لا الٰه الا اللّٰه وحده لاشريک له وأن محمدًا عبده ورسوله رضيت باللّٰه ربًا وبالاسلام دينًا وبمحمد رسولاً

دوسرے باب میں ہے کہ جس نے اذان سنی اور یہ دعا پڑھی:

اللّٰهم رب هذه الدعوة التامة والصلاة القائمة اٰت محمدا ن الوسيلة والفضيلة وابعثه مقاما محمودا ن الذى وعدته".

تو قیامت میں اس کے لئے شفاعت کا استحقاق حاصل ہوا۔

معارف السنن میں ہے کہ پہلی دعا اثناء اذان کی ہے مثلاً مؤذن کہے اشهدان لا اِله الا اللّٰه تو سننے والا کہے وانا اشهدان لا اِله اِلا اللّٰــه الـخ اور دوسری دعا آخر اذان کے متعلق ہے، بعض روایات میں درود کا ذکر بھی آتا ہے، تو دعا کے ساتھ آہستہ سے درود کہنا چاہیئے۔ کیونکہ جب دعا آہستہ ہے تو درود بھی آہستہ کہنا چاہیئے تاکہ اذان کے جزء ہونے کا شبہ نہ ہو۔

تشریح:

اللّٰهم رب هذه الدعوة التامة الخ دعوت تامہ سے مراد دعوت اذان ہے دعوت تامہ اس لئے کہا کہ یہ عقائد کی جامع ہے اس

میں عقائد اور اعمال سب کا ذکر ہے۔ القائمہ بمعنی دائمہ کے ہے الوسیلہ کا لغوی معنی ہے حاجت، اصطلاح میں وسیلہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جائے یہاں مراد شفاعت ہے فضیلہ سے نبی ﷺ کی بڑائی مراد ہے تمام انبیاء پر۔

اس دعا پر بعض زیادتی کرتے ہیں مثلاً "والدرجة الرفيعة وارزقنا شفاعتهٗ يوم القيامة" یہ اضافے ثابت نہیں البتہ بعض جو انک لاتخلف المیعاد کی زیادتی کرتے ہیں یہ ثابت ہے۔ احناف میں سے جصاص نے لکھا ہے کہ دعا توقیفی ہوتی ہے اس میں زیادتی جائز نہیں مقاماً محموداً سے تمام شفاعت مراد ہے۔

باب ماجاء أن الدعاء لايرد بين الاذان والاقامة

اس باب میں اس بات کا ذکر ہے کہ جو دعاء اذان اور اقامت کے درمیان کہی جائے وہ رد نہیں کی جاتی حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے۔

پہلی بات: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ اوقات اجابت مقرر کئے ہیں، کچھ مقامات اجابت مقرر کئے ہیں، مثلاً کعبہ کے اندر، مقام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام، زمزم کے پیتے وقت اور اوقات اجابت شریعت نے بتائے ہیں ایک یہ مذکورہ مقام ہے۔ دوسرا جمعہ کی ساعۃ ہے اب یہاں مقامات اجابت یا ساعات اجابت مقرر ہیں ان میں زیادتی کرنا جائز نہیں۔

دوسری بات: یہاں ہے دعاء اذان اور اقامت کے درمیان رد نہیں ہوتی جبکہ ہماری دعاء کبھی قبول نہیں ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ موانع ہوتے ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس وغیرہ حرام کا ہو تو دعاء کس طرح قبول ہوگی دوسرا جواب یہ ہے کہ قبول کی چند صورتیں ہیں۔ ① جو مانگو وہ مل جائے ② دعاء کی برکت سے آفت ٹل جائے ③ قیامت کے دن دعاء کا اجر ملے گا۔

باب ماجاء كم فرض الله على عباده من الصلوٰة

انس بن مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پر لیلۃ الاسریٰ میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر تعداد کم کر کے پانچ کر دی گئیں، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ندا ہوئی "اے محمد ﷺ میرے ہاں قول کی تبدیلی نہیں ہوتی تمہارے لئے پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ہے۔"

مسئلہ: بندہ پر کتنی نمازیں فرض ہیں اس میں تمام امت کا اجماع ہے کہ نمازوں کی تعداد کتنی ہے البتہ یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔

پہلی بات: بعض لوگوں نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے وتر کے وجوب پر اعتراض کیا ہے کہ حدیث میں ہے کہ فرائض کی تعداد پانچ ہے، اور وتر کو واجب مانو تو چونکہ واجب پھر عملاً فرض ہوتا ہے اس لئے فرائض چھ بن جائیں گے اس کے متعلق علمائے احناف نے دو باتیں ذکر کی ہیں ایک یہ کہ وتر واجب ہے فرض نہیں اور واجب اور فرض میں احناف کی اصطلاح میں فرق ہے اس لئے فرض پانچ ہی رہتے ہیں چھ نہیں بنتے۔ چھ تب بنتے جب ہم وتر کو فرض کہتے ہیں۔ دوسری بات احناف یہ ذکر کرتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ وتر فرض عملی ہے پھر احناف کہتے ہیں کہ اس کا الگ ذکر نہیں ہوا کیونکہ وقت کے اعتبار سے یہ عشاء کے تابع ہے جبکہ باقی فرائض کا الگ الگ وقت ہے اس لئے ان کو مستقل ذکر کر دیا لیکن وتر کا مستقل وقت نہ تھا اس لئے اس کو مستقلاً ذکر نہیں کیا بلکہ جس طرح اس کا وقت عشاء کے تابع ہے تو عشاء کا ذکر جب کیا تو وتر کا ذکر تبعاً آ گیا۔

دوسری بات: "ثم نقصت حتیٰ جعلت خمسًا" اس ٹکڑے کے متعلق یہ ذکر کیا ہے کہ پچاس نمازیں فرض کیں پھر پینتالیس منسوخ کی گئیں یہ نسخ کی کونسی قسم ہے کیونکہ یہ نسخ قبل العمل ہے جبکہ نسخ قبل العمل میں اصولیین کا اختلاف ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا

تمہاری امت پر پچاس نمازیں فرض کردی گئیں ہیں اب ان کو خبر مانو تو بھی صحیح نہیں کیونکہ خبر میں نسخ نہیں ہوتی۔ اور انشاء مانو تو لازم آئے گا کہ نسخ قبل العمل، اوراس میں اختلاف ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ انشاء ہے مگر پچاس اور پانچ کا فرق یہ عالم کا فرق ہے تو عالم دنیا اور عمل کے اعتبار سے پانچ ہیں مگر عام حالات کے اعتبار سے پچاس ہیں۔

اشکال: اگر یہ بات ہے تو نبی ﷺ بار بار جاتے تھے ایک روایت کے مطابق دس دس اور ایک روایت کے متعلق پانچ مرتبہ نمازوں میں کمی ہوئی اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: معارف السنن میں ہے کہ کمی ہوتی رہی آخر میں کہا کہ یہ پانچ ہیں اور پچاس کے برابر ہیں تو پانچ یہاں کے اعتبار سے ہیں اور پچاس اس عالم کے اعتبار سے ہیں لیکن نمازوں کے اہتمام کے لئے بار بار جانے کا طریقہ اختیار کیا نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے مرتبے کے اظہار کے لئے اور موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی خیر خواہی ظاہر کرنے کے لئے۔ اگر یہ صورت اختیار کی جائے تو نسخ قبل العمل لازم نہیں آئے گی۔

اگر یہ مراد لیں کہ پچاس نمازیں تھیں پھر پانچ رہ گئیں اور یہ انشاء ہے تو نسخ قبل العمل لازم آئے گا۔ اس میں اختلاف ہے، احناف، شوافع اور اشاعرہ کے ہاں نسخ قبل العمل جائز ہے جبکہ حنابلہ بعض شوافع، معتزلہ اور ماتریدیہ کے ہاں نسخ قبل العمل جائز نہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ نے جن پر جو چیز فرض کی اب کسی ایک کو خبر ملے اور اس کو عمل کی قدرت حاصل ہو اس کی نسخ جائز ہے مگر اگر عمل کی قدرت نہ ہو تو یہ نسخ ان کے ہاں جائز نہیں۔ اب جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچاس نمازیں فرض کیں تو نبی ﷺ بھی مکلف تھے ان کو خبر ملی جب وہ واپس آئے تو عمل کا تمکن بھی حاصل ہو گیا اس لئے یہ نسخ قبل العمل نہیں ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے بیٹے کے ذبح کا واقعہ ہے کہ ان کو ذبح کا موقع ملا مگر جب چھری رکھی تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منسوخ کر دیا اسی طرح یہاں بھی نسخ تمکن علی العمل کے بعد ہوئی اس لئے اعتراض کوئی باقی نہیں۔

باب فی فضل الصلوات الخمس

یہ باب پانچ نمازوں کی فضیلت کے بارے میں ہے کہ پانچ نمازیں اور جمعہ کی نماز دوسرے جمعے تک درمیانی گناہوں کے لئے کفارہ ہے، بشرطیکہ کبائر کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

پہلی بات: "کفارات لمابینھن" اس سے کونسے گناہ مراد ہیں عام شارحین اور محدثین کہتے ہیں کہ اس سے صغائر مراد ہیں کہ اعمال صرف صغائر کے لئے کفارہ ہیں کبائر کے لئے کفارہ توبہ ہے۔

دوسری بات: "الصلوات الخمس والجمعة الی الجمعة کفارات لما بینھن" اشکال جب ایک نماز دوسری نماز تک گناہوں کے لئے کفارہ بن جائے یا وضوء سے گناہ معاف ہو جائیں تو جمعے کے لئے گناہ باقی نہ رہے تو اس سے کیا معاف ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ باب کی حدیث میں عمل کی خاصیت بتائی ہے مگر کبھی عمل کی خاصیت عمل نہیں کر سکتی مانع کی وجہ سے۔ اب نماز دوسری نماز تک گناہوں کے لئے کفارہ ہے مگر کبھی مانع کی وجہ سے معاف نہ ہو تو جمعہ کی وجہ سے وہ معاف ہو جائیں گے۔

تیسری بات: "مالم یغش الکبائر" شارحین نے اس میں دو احتمال بتائے ہیں۔

❶ یہ بمنزلہ استثناء کے ہے کہ صغائر کے لئے نماز کفارہ بنتی ہے "الا الکبائر" کبائر کے لئے نہیں بنتی عام شارحین نے اس کو لیا ہے۔

❷ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ یہ بمنزلہ شرط کے ہے کہ نماز دوسری نماز تک کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے بشرطیکہ اس نے کبائر کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اگر کبائر کا ارتکاب کیا ہو تو پھر گناہ معاف نہیں ہوں گے، بعض نے کہا ہے کہ شرط کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے

لیکن مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شرط کا معنی مراد لینا بھی صحیح ہے۔

چوتھی بات: یہاں کبائر اور صغائر کی حد کیا ہے معارف السنن میں ہے کہ اس میں بہت سارے اقوال ہیں باقلانی وغیرہ کہتے ہیں کہ ہر گناہ ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے دوسرا یہ کہ جس پر دنیا میں سزا یا آخرت میں اس پر وعید بالنار ہو یہ کبیرہ ہوگا اور جو گناہ اس قبیل سے نہ ہو وہ صغیرہ ہوگا۔

پانچویں بات: گناہ دو قسم کے ہیں ① حقوق العباد یہ نہ اعمال سے معاف ہوتے ہیں نہ توبہ سے جب تک کہ آدمی اس کا حق ادا نہ کرے، یا صاحب حق اس کو معاف نہ کردے۔ ② حقوق اللہ یہ دو قسم کے ہیں ایک صغائر دوسرے کبائر، اعمال صغائر کے لئے کفارہ ہے نہ کہ کبائر کے لئے اگر صغائر نہ ہوں تو کبائر میں اعمال سے ضعف پیدا ہوجاتا ہے اور اگر صغائر اور کبائر دونوں نہ ہوں تو یہ اعمال رفع درجات کا سبب بنیں گے۔

باب ماجاء فی فضل الجماعة

یہ باب جماعت کی فضیلت کے بارے میں ہے کہ جماعت کی نماز اکیلے نماز پر ستائیس (۲۷) درجے فضیلت رکھتی ہے دوسری روایت میں پچیس (۲۵) کا ذکر ہے۔

پہلی بات: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جماعت شعائر اسلام میں سے ہے اس سے مسلمانوں کی شوکت اور اجتماعیت کا اظہار ہوتا ہے اس لئے شریعت نے اسکے فضائل بیان کئے ہیں باقی اس کا فقہی حکم کیا ہے؟ یہ دوسرے باب میں آئے گا۔

دوسری بات: پہلی بات یہ ہے کہ پہلی حدیث میں ستائیس درجے اضافے کا ذکر ہے دوسری روایت میں پچیس گنا اضافے کا ذکر ہے اس تعارض کو دفع کرنے کے لئے تقریباً پندرہ اقوال ہیں جن میں مشہور یہ ہیں:

① ابتداء پچیس کا اضافہ کیا تھا بعد میں بڑھا کر ستائیس کردیا۔ ② ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ سری نماز میں پچیس اور جہری میں ستائیس درجے بڑھتی ہے۔ ③ جماعت کی کثرت وقلت کی بناء پر ثواب میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ لوگوں کی قلت اور کثرت سے ثواب پر اثر پڑتا ہے اس لئے بازار کی مسجد میں لوگ زیادہ ہوتے ہیں، وہاں ثواب زیادہ ہے محلے کی مسجد کی نسبت سے۔

ابن عبد البر مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے التمہید میں لکھا ہے کہ چالیس درجے بھی ثواب ملتا ہے۔ ④ عدد اقل عدد اکثر کے منافی ہیں اس لئے کہ اکثر میں اقل خود بخود داخل ہوتا ہے۔ ⑤ پچیس والی روایت سنداً اقوی ہے اس لئے اس کو لیں گے۔ ⑥ پچیس کا عدد یقینی ہے اس لئے یہ راجح ہے۔

تیسری بات: ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری میں باقلانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ستائیس کی تحدید کیوں کی اس کی حکمت یہ ہے کہ جماعت کی اقل تعداد تین ہے اور ہر نیکی کا دس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے تو کل تیس ہوگئے تین نمازیں ان کی اپنی ہیں اور ستائیس زائد اور افضل ہے جو ان کو ملا اس لئے ستائیس کے عدد کو ذکر کیا ہے۔

باب ماجاء فیمن سمع النداء فلایجیب

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے قصد کیا ہے کہ میں نوجوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے جمع کریں پھر نماز کے متعلق حکم دوں کہ وہ قائم کی جائے پھر خود جا کر ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے۔

پہلی بات: حدیث کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لئے تہدید اور مذمت ہے جو جماعت کو ترک کرتے ہیں ان کے لئے سزا کا بیان ہے کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں کیونکہ انبیاء اور خصوصاً نبی اکرم ﷺ کسی ناجائز معاملے کا قصد نہیں کرتے جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ جب نبی ﷺ نے ان کے لئے اس سزا کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس سزا کے مستحق تھے اگر مستحق نہ ہوتے تو اس سزا کا قصد نہ کرتے۔

دوسری بات: جماعت کا کیا حکم ہے؟ اس سے پہلے سمجھ لو کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ جماعت کے متعلق دو قسم کی احادیث ہیں۔ ایک قسم کی احادیث سے جماعت کے بارے میں تشدیدی حکم منقول ہے۔ دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جن سے بہت معمولی عذر پر بھی ترک جماعت کا جواز ملتا ہے۔ گزر چکا ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ترک جماعت کے فقہاء نے بیس اعذار احادیث سے مستنبط کر کے جمع کئے ہیں۔ اب شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن علماء نے اعذار کو نہیں دیکھا اور جماعت کے متعلق سخت احادیث کو دیکھا ان سے جماعت کا سخت حکم منقول ہے، لیکن جنہوں نے دونوں کو دیکھا یعنی جماعت کے متعلق اعذار بھی دیکھے اور جماعت کے متعلق احادیث میں تشدیدی حکم کو بھی دیکھا ان سے جماعت کے متعلق زیادہ تشویش منقول نہیں۔

تیسری بات: جماعت کے حکم کے متعلق کیا اقوال ہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے دو قول منقول ہیں۔

❶ عام احناف نے وجوب کا قول نقل کیا ہے۔ ❷ بعض احناف نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنت مؤکدہ کا قول بھی نقل کیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی دو قول ہیں ❶ مشہور قول جماعت کے سنت ہونے کا حکم ہے ❷ دوسرا قول جماعت کا حکم فرض کفایہ ہونے کا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی دو قول ہیں ❶ جماعت کا حکم فرض عین کا ہے۔ ❷ فرض عین بھی ہے اور صحت صلاۃ کے لئے شرط بھی ہے۔ اہل ظواہر کے ہاں جماعت صلاۃ کے لئے شرط ہے۔

احناف کے ہاں وجوب کا مرتبہ فرضیت کے مرتبہ سے کم ہے اور سنت سے اس کا مرتبہ اونچا ہے اب احناف کہتے ہیں کہ ہم نے وجوب کا قول اختیار کیا۔ اس لئے کہ دو قسم کی احادیث تھیں ایک وہ جس میں سخت تشدیدی حکم منقول ہے دوسری وہ احادیث جن میں معمولی عذر پر ترک کا جواز ملتا ہے ان دونوں قسم احادیث کی جمع کی صورت یہ ہے کہ جماعت مستحب بھی نہیں پہلی قسم کی احادیث کو دیکھ کر اور فرض بھی نہیں دوسری قسم کی احادیث کو دیکھ کر اس لئے ہم نے وجوب کا قول اختیار کیا۔

چوتھی بات: باب کی حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو جماعت ثانیہ کے بلا کراہیت جواز کے قائل ہیں۔ طریقہ استدلال یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے ارادہ کیا کہ جماعت ہو جائے اور خود گھروں کی طرف جائیں اب آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے ساتھ تھے وہ فارغ ہو کر ضرور دوسری جماعت کرتے کیونکہ ایسا نہیں کہ دوسرے کو جس کام پر سزا دیں خود نہ کریں لیکن یہ بے کار استدلال ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ اسی مسجد میں جماعت کرتے دوسری جگہ کر لیتے، کراہت والوں نے بھی اس سے استدلال کیا ہے کہ جماعت ثانیہ مکروہ ہے اس لئے اس سزا کا ارادہ کیا۔ اگر جماعت ثانیہ جائز ہوتی تو وہ لوگ عذر کر لیتے کہ جماعت ثانیہ کریں گے۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح حدیث سے جماعت ثانیہ بلا کراہت پر استدلال صحیح نہیں اسی طرح جماعت ثانیہ مع الکراہت پر بھی استدلال صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا یہ موضوع ہی نہیں ہے۔

پانچویں بات: گھر جلانے کا مطلب کیا ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ لوگوں کو نکال کر سامان جلانا مراد ہے۔ لوگوں کا جلانا مقصود نہیں کیونکہ تعذیب بالنار ممنوع ہے۔ اس چیز کو دیکھا جائے تو غرامہ مالیہ (مالی جرمانہ) لینے کا ثبوت ہوگا، جبکہ احناف کے ہاں یہ جائز نہیں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اتنا جائز ہے کہ مال کو حاکم لے لے۔ پھر پاس رکھ لے، سال دو سال بعد واپس کر دے یہ جائز ہے باقی دوسری صورتیں جائز نہیں یہاں سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ دوسری روایت میں ہے "أحرق البیوت علیٰ من فیھا" اس سے آدمیوں کو جلانے کا ثبوت بھی ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین لوگ جماعت سے پیچھے رہتے تھے۔ اس لئے اس سزا کا ارادہ کیا۔

اشکال: یہ تعذیب بالنار ہے جو ممنوع ہے۔

جواب: تعذیب بالنار کی نہی بعد میں آئی یہ ارادہ پہلے کیا تھا اس لئے نہی کی حدیث اس ارادے کے لئے ناسخ ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی وحدہ ثم یدرک الجماعة

کوئی آدمی اکیلے نماز پڑھ لے پھر جماعت پالے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا اس باب میں بیان ہے۔ یزید بن اسود فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھا۔ مسجد خفیف (منیٰ) میں صبح کی نماز پڑھی جب نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ دو آدمی بیٹھے تھے وہ شریک نہ ہوئے تھے تو نبی ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ ان کو بلاؤ جب ان کو بلایا گیا تو ڈر کی وجہ سے ان کے کندھے کانپ رہے تھے آپ ﷺ نے شرکت نہ کرنے کی وجہ پوچھی ان دونوں نے کہا ہم اپنے ٹھکانوں میں نماز پڑھ چکے تھے آپ ﷺ نے فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا پھر فرمایا جب تم گھر میں نماز پڑھ چکو پھر مسجد میں آؤ تو لوگوں کے ساتھ نماز پڑھو یہ تمہارے لئے افضل نفل ہوگی۔

اختلاف: کوئی نماز پڑھ کر مسجد میں آیا دیکھا تو وہاں جماعت شروع تھی اب یہ شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فی روایۃ ان کے ہاں بعض نمازوں میں شرکت جائز ہے۔ جیسے ظہر عشاء اور بعض میں جائز نہیں جیسے عصر، مغرب، فجر۔ فجر اور عصر میں امام صاحب بطور دلیل ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جن میں متواتراً منقول ہے کہ "نھی رسول اللہ ﷺ عن الصلاۃ بعد الصبح حتی تطلع الشمس وبعد العصر حتی تغرب" اب اس حدیث سے عصر اور فجر کے بعد نوافل کی ممانعت وارد ہے ان میں جس طرح اکیلے نماز پڑھنے کی ممانعت ہے جماعت کے ساتھ پڑھنے کی بھی ممانعت ہے۔ اسی طرح مغرب کی نماز پڑھ لی اب جماعت ہو رہی ہے اس میں بھی احناف کے ہاں مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں روایۃ شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر تین پڑھے تو تین نفل مشروع نہیں اور اگر چار پڑھے تو امام کی مخالفت لازم آئے گی اور اس کی بھی نظیر نہیں کہ شروع سے امام کے ساتھ شریک ہو اور آخر میں ایک رکعت اکیلے پڑھے۔

باب کی حدیث کے متعلق چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں ❶ نھی رسول اللہ ﷺ عن الصلاۃ بعد الفجر وبعد العصر والی روایات اس حدیث کے ناسخ ہیں۔

اشکال: اگر باب کی حدیث منسوخ ہے تو ظہر اور عشاء میں کیوں جائز قرار دیتے ہو؟

جواب: ان دو اوقات میں نفل کی ممانعت پر دلیل نہیں اس لئے وہاں اصل (اباحت) پر عمل کیا۔

❷ نبی ﷺ کا یہ مقصد نہیں کہ فجر کی نماز پڑھ لو تو اس میں بھی شریک ہو، بلکہ ان کی غلط فہمی دور کی وہ سمجھتے تھے کہ ہم پڑھ چکے ہیں اس لئے ہمارے لئے کسی بھی نماز میں شرکت کا جواز نہیں اور بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے تو نبی ﷺ نے یہ غلط فہمی دور کی کہ یہ مقصد نہ

تھا کہ عصر یا فجر کے بعد شریک ہو سکتے ہو یا نہیں۔

اشکال: تم فجر کو بھی اور عصر کو بھی مستثنیٰ کرتے ہو جبکہ باب کی حدیث وارد ہی فجر میں ہوئی تھی اور مورد میں نص کی تخصیص جائز نہیں یہ تو نسخ ہے۔

جواب: نص کا مورد عام ہو پھر مورد نص کی بھی تخصیص ہو سکتی ہے اس سے اس کا ناسخ ہونا لازم نہیں آتا جبکہ اس کے بعض افراد میں اس کا حکم موجود ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے۔ ③ باب کی حدیث میں اضطراب بھی ہے کتاب الآثار میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ روایت ظہر کی متعلق منقول ہے جب ظہر کے بارے میں منقول ہے تو احناف کا اس پر بغیر تاویل کے عمل ہے۔ تیسری روایت میں ہے کہ "صليت معه صلاة الظهر او العصر" تو یہاں شک ہے اس لئے اس روایت میں اضطراب ہے یہ قابل استدلال نہیں۔

باب ماجاء فی الجماعة فی مسجد قدصلی فيه مرة

ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اس حال میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو اس کے اوپر تجارت کرے تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی۔

مسئلہ: یہاں جو مسئلہ موجود ہے اس کو فقہاء جماعت ثانیہ کے مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں جماعت ثانیہ جائز ہے یا نہیں اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے۔ ① امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھی جا چکی ہے، دوسری مرتبہ وہاں جماعت کرنا بلاکراہت جائز ہے مطلقاً بغیر کسی تفصیل کے۔ ② امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن المبارک، اور جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جماعت ہو چکی ہو وہاں دوبارہ جماعت کرنا مکروہ ہے کراہت تحریمی کے ساتھ البتہ چند صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

① پہلی جماعت جو ہوئی ہے وہ اہل محلہ نے نہیں کی ہے باہر کے لوگوں نے کی تھی مگر بغیر تداعی یعنی بغیر اذان کے کی تھی اب دوبارہ جماعت بلاکراہت جائز ہے۔ ② پہلی جماعت ہو چکی ہے اور اہل محلہ نے کی تھی مگر بغیر تداعی یعنی بغیر اذان کے تھی اب دوبارہ جماعت بلاکراہت جائز ہے۔ ③ راستے کی مسجد ہے امام وہاں مقرر نہیں لوگ جماعت در جماعت آتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں یہاں بھی تمام جماعتیں بلاکراہت جائز ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے تحت فقہاء نے دو باتیں نقل کی ہیں ایک یہ کہ جماعت ہو چکی ہو اور جماعت ثانیہ قلیل ہو یہ جائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جماعت ثانی میں ہیئت بدل لی جائے تو جماعت ثانی جائز ہے مثلاً محراب سے ہٹ کر کسی کونے میں نماز پڑھ لے جماعت سے

جواز کے قائلین باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ① کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باہر سے آنے والے آدمی کے ساتھ شرکت کی اور اس نے جماعت سے نماز ادا کی۔ ② انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ وہ شاگردوں کے ساتھ مسجد میں آئے جماعت ہو چکی تھی انہوں نے نماز پڑھائی شاگردوں نے اقتداء کی۔

جمہور کی دلیل رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالے "القطوف الدانیہ" میں سنن بیہقی کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر گئے تھے جب واپس آئے تو جماعت ہو چکی تھی "فمال الى بيته فجمع اهله وصلى بهم" اب انہوں نے لکھا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسجد میں دوسری جماعت مکروہ نہ ہوتی تو مسجد نبوی ہی میں پڑھتے جس میں پڑھنے کا ثواب بھی زیادہ ہے لیکن آپ نے مسجد کے بجائے گھر میں پڑھی۔ ② علامہ کاسانی نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے "کان

اصحاب النبی ﷺ اذا فاتتهم الجماعة صلوا فرادی" معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عام حالت یہ تھی کہ جماعت فوت ہوجائے تو اکیلے نماز پڑھتے تھے اب جماعت میں ستائیس یا پچیس گنا زیادہ ثواب ملنے کے باجود اکیلے پڑھتے تھے معلوم ہوا جماعت ثانیہ مکروہ ہے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کتاب الامام میں لکھا ہے کہ کسی کی جماعت فوت ہوگئی ہو تو میں پسند کرتا ہوں کہ وہ اکیلے نماز پڑھے کیونکہ سلف سے یہ منقول نہیں باقی مسجد کی حدود سے باہر کوئی دوسری جماعت کرے تو جمہور کے ہاں اس کی کراہت نہیں۔

باب کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس میں کامل جماعت نہ تھی کیونکہ مقتدی صرف ایک تھا وہ بھی متنفل اس لئے اس سے جماعت کاملہ پر استدلال صحیح نہیں۔

باب ماجاء فی فضل العشاء والفجر فی جماعة

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو عشاء کی نماز کی جماعت میں شریک ہوا تو اس کے لئے نصف رات کے قیام کا ثواب ہے اور جس نے فجر اور عشاء دونوں کو جماعت کے ساتھ ادا کیا تو اس کو پوری رات کے قیام کا ثواب ملے گا۔

دوسری روایت جندب بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کے عہد میں ہے تم اللہ کے عہد کومت توڑو تیسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا خوشخبری دو۔ اندھیروں میں مساجد کی طرف چلنے والوں کو قیامت کے دن مکمل نور ملے گا۔

پہلی بات: پانچوں نمازوں کو جماعت سے ادا کرنا افضل ہے مگر ان دو نمازوں کی تخصیص کی۔ کیونکہ عشاء کا وقت ایسا وقت ہے جس میں انسان کام کر کے آتا ہے تھکا ہوتا ہے اس لئے یہاں مشقت زیادہ ہوتی ہے اور فجر کا وقت بھی غفلت کا وقت ہے اس میں بھی مشقت زیادہ ہے اور "افضل الاعمال احمزها واشقها" یعنی جن اعمال میں مشقت زیادہ ہے اس کا ثواب بھی زیادہ ہے جس طرح نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے "العطایا علی متن البلایا"۔

دوسری بات: "کان له کقیام لیلة" اعتراض ہوتا ہے کہ ایک آدمی پوری رات قیام کرتا ہے اس کو جو ثواب ملے گا وہ عشاء اور فجر پڑھنے والے کو بھی مل گیا تو فرق کیا ہوا؟

جواب: عشاء اور فجر کے پڑھنے والے کو ثواب ملے گا یہ اصل ثواب ہے، فضل ثواب نہ ملے گا، جبکہ قیام اللیل کرنے والے کو قیام کا ثواب بھی ملے گا اور "والحسنة بعشرة امثالها" دس گناہ زیادہ مزید ثواب بھی ملے گا۔

باب ماجاء فی فضل صف الاول

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مردوں کو صفوف میں سے بہترین صف صف اول ہے، اور بری صف آخری ہے۔ اور عورتوں کی بہترین صف آخری ہے اور بدترین صف پہلی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صف اول والوں کے لئے تین مرتبہ دعاء مغفرت کی اور صف ثانی والوں کیلئے ایک مرتبہ دعاء کی تیسری حدیث میں ہے کہ اگر لوگ جان لیں کہ اذان دینے اور صف اول میں کتنا ثواب ہے تو پھر اس کے حصول کا ذریعہ نہ پاتے سوائے قرعہ اندازی کے قرعہ اندازی بھی کرتے۔

پہلی بات: ان احادیث میں صف اول کی فضیلت بیان کرنی مقصود ہے اور صف اول کی طرف ترغیب دینا مقصود ہے۔

دوسری بات: اس مقام پر شارحین نے ذکر کیا ہے کہ صف اول سے کیا مراد ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ معارف السنن میں ہے کہ پہلے زمانے میں محراب بڑے ہوتے تھے ایک مستقل صف امام کے ساتھ محراب کے اندر ہوتی تھی۔ دوسرا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور

معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں جب خوارج نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا پھر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ ہوا تو امام کے لئے محصورہ بنایا گیا اس میں خلیفہ اور دوسرے بڑے گورنر کھڑے ہوتے تھے اس کے بعد دوسری صفوف ہوتی تھیں اب صف اول کی جو فضیلت منقول ہے کیا اس سے وہ صف اول مراد ہے جو محراب کے اندر ہوتی ہے یا محصورہ کے اندر جو ہوتی ہے یا وہ صف مراد ہے جو مسجد کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک مکمل ہوتی ہے اس میں متعدد اقوال ہیں۔ مگر جمہور کے ہاں کامل صف مراد ہے، جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہوتی ہے مافی المحراب یا مافی المحصورہ مراد نہیں......

تیسری بات: صف اول کے متعلق بعض محدثین نے نقل کیا ہے کہ صف اول سے وہ لوگ مراد ہیں جو اذان کے ساتھ یا اذان کے بعد وقت اول میں داخل ہوں چاہے قیام صلاۃ کے وقت صف اول میں ہوں یا نہ ہوں۔

لیکن معارف السنن میں اس کی تردید کی ہے کہ وقت اول میں آنا اس کی فضیلت اور اس کا ثواب الگ چیز ہے لیکن صف اول سے وہ مکبرین مراد نہیں بلکہ صف اول سے مراد اصطلاحی مراد ہے جو کہ قیام صلاۃ کے وقت صف اول میں ہوں ان کے لئے یہ فضیلت ہے۔

چوتھی بات: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مردوں کی صفوں میں بہترین صف اول ہے اور بدتر آخری صف ہے اور عورتوں کی بہترین صف آخر ہے اور بدتر اول صف ہے۔ اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مردوں کی اول صف کو بہتر اور آخری کو بدتر کہا اس کی حکمت کیا ہے۔

❶ بعض نے اس کی حکمت یہ بتائی ہے کہ صف اول عورتوں کی صفوں سے دور ہوتی ہے اس لئے اس کو خیر قرار دیا کیونکہ عورتوں کے صفوف سے دور ہو تو وساوس پیدا نہیں ہوں گے، لیکن اخیر صف متصل بالنساء ہے اس لئے دل میں وساوس پیدا ہوں گے اس لئے آخری صف بدتر ہے، اور عورتوں کی پہلی صف مردوں کے قریب ہے اس لئے بدتر ہے اور آخری صف بعید عن الرجال کی وجہ سے بہتر ہے۔

❷ دوسرا قول بعض کا یہ ہے کہ خیر وشر کی بنیاد تکبیر اور عدم تکبیر پر ہے۔ کہ صف اول میں جو بیٹھیں گے ظاہر ہے وہ پہلے آئے ہوں گے اس لئے ان کو ثواب زیادہ ملے گا تو یہ خیر ہے۔ اور جو بعد کی صفوف میں ہوں گے تو یہ بعد میں آئے ہوں گے، اس لئے ان کو ثواب کم ملے گا، تو خیر یا شر کا مدار قلت ثواب یا کثرت ثواب پر ہے مگر یہ قاعدہ عورتوں میں نہیں چلے گا کیونکہ وہاں جو عورتیں پہلے آئی ہیں وہ پہلی صف میں ہوں گے، ان کو ثواب زیادہ ملے گا جبکہ ان کی پہلی صف کو بدترین کہا ہے اس لئے شراح نے اول حکمت کو ترجیح دی ہے۔

معارف السنن میں ہے کہ نماز جنازہ کا معاملہ عام نمازوں کے برعکس ہے وہاں مردوں کی آخری صف افضل ہے کیونکہ نماز جنازہ پڑھنے والے شفعاء ہیں اور سفارش کی بنیاد تواضع پر ہے اور تواضع آخر میں رہنے میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ ترغیب کے لئے صف اخیر کو افضل کہا تا کہ سارے لوگ شریک ہوں ان کو یہ وہم نہ ہو کہ دیر ہوگئی ہے اس لئے جانے کی کیا ضرورت ہے تو ترغیب دی کہ دیر ہو جائے پھر بھی جاؤ زیادہ ثواب ملے گا۔ جنازے کے بارے میں کوئی ایسی حدیث وارد نہیں کہ اس کی صف اخیر بہتر اور افضل ہے۔

أنه كان يستغفر للصف الاوّل ثلاثا: سنن نسائی میں کچھ زیادتی ہے کہ صف اول کے لئے تین دفعہ ثانی کے لئے دو دفعہ اور صف ثالث کے لئے ایک دفعہ استغفار کیا۔ معارف السنن میں مجمع الزوائد کے حوالے سے ہے کہ اس میں جو حدیث منقول ہے کہ اس میں سنن ترمذی والی ترتیب ہے۔

لو أن الناس يعلمون مافي النداء: یہاں مطلق چھوڑا اس میں ثواب کی کثرت کی طرف اشارہ ہے یا یہ ابہام ترغیب کے لئے ہے۔

باب ماجاء فی اقامة الصفوف

اس باب میں نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت لائی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہمارے صفوں کو سیدھا کیا کرتے تھے ایک دفعہ

آئے کہ ایک آدمی کا سینہ صف سے باہر نکلا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ضرور بالضرور اپنی صفوں کو سیدھا کرو گے ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے چہروں میں مخالفت پیدا کر دیں گے یعنی تمہارے درمیان اختلاف ڈال دیں گے۔

پہلی بات: اقامۃ الصفوف کا حکم کیا ہے؟ معارف السنن میں منقول ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اقامۃ الصفوف کا حکم استحباب کا ہے حنابلہ کے ہاں سنت لکھا ہوا ہے مگر سنت ان کے ہاں وجوب کے درجے میں ہے۔اہل ظواہر کے ہاں یہ صحت صلاۃ کیلئے شرط ہے۔

اشکال ❶: احادیث میں عام طور پر اس عمل کے لئے امر کے صیغے منقول ہیں تو ظاہری طور پر وجوب کا قول اختیار کرنا چاہیے۔لیکن ہمارے فقہاء مالکیہ اور شوافع نے استحباب کا قول اختیار کیا ہے۔

اشکال ❷: احادیث میں عدم تسویۃ الصفوف پر وعید وارد ہوئی ہے جبکہ ترک استحباب پر وعید نہیں ہوتی اس لئے ہمارے فقہاء میں سے بعض جیسے فتح القدیر والے نے وجوب کا قول اختیار کیا ہے کہ تسویہ واجب ہے لیکن کسی نے نہ کیا تو نماز ہو جائے گی جبکہ اہل ظواہر کے ہاں نماز ہی نہیں ہوتی مگر اس پر کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات: تسویۃ الصفوف کی کیفیت کیا ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے کیفیت اس طرح منقول ہے کہ ہر آدمی کا کندھا دوسرے کے کندھے کے ساتھ اور ایڑی ایڑی کیساتھ ملی ہوئی ہو۔مگر اس میں یہ سمجھنا ہے کہ حدیث میں جو ''الزاق الکعب بالکعب'' منقول ہے اس سے مبالغہ مراد ہے ظاہر معنی مراد نہیں کیونکہ اگر حقیقۃً الزاق الکعب بالکعب کریں تو الصاق المناکب بالمناکب نہیں ہوسکتا اس لئے جمہور فقہاء کے ہاں مبالغہ مراد ہے، شوافع کے ہاں ٹانگوں کے درمیان ایک بالشت فاصلہ ہونا چاہیئے ،احناف کے ہاں کم از کم چار انگلیوں کا فاصلہ ہونا چاہیئے۔ صحیح یہ ہے کہ اس طرح کھڑا ہو کہ اس کی طبعی ہیئت میں تبدیلی نہ آئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تعلیقا اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسنداً الکعب بالکعب اور الصاق المنکب بالمنکب کا ذکر کیا ہے۔

تیسری بات: تسویۃ الصف میں ایڑی کا اعتبار ہے یا پنجوں کا۔محقق قول یہ ہے کہ ایڑی کا اعتبار ہے کہ اس میں تسویہ ہونا چاہیئے۔

چوتھی بات: اولیخالفن اللہ بین وجوہکم'' اعمال کی تاثیر ہوتی ہے اور احادیث میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے یہاں عدم تسویۃ الصفوف کی تاثیر بیان کی، گزر چکا ہے کہ اشیاء کی تاثیر میں اختلاف ہے اشاعرہ کے ہاں اشیاء اور ان کی تاثیر میں ربط نہیں جبکہ معتزلہ اور فلاسفہ کہتے ہیں کی شئی میں جب قوت پیدا ہوتی ہے تو تاثیر خود اس سے پیدا ہوتی ہے ماتریدیہ کے ہاں اشیاء اور ان کی تاثیر میں ربط تو ہوتا ہے مگر وہ اللہ کی قدرت کا محتاج ہے تو جس طرح اشیاء میں تاثیر ہے اسی طرح عمل میں بھی تاثیر ہے یہاں عدم تسویۃ الصفوف کی تاثیر بتائی کہ چہروں میں مخالفت ہوگی اور چہروں کی مخالفت یہ نتیجہ ہوتا ہے دلوں کی مخالفت کا کیونکہ دلوں میں مخالفت ہو تو آدمی اس آدمی سے چہرہ پھیر لیتا ہے۔

باب ماجاء لیلینی منکم اولوا لأحلام والنهى

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے قریب بردبار اور عقلمند لوگ کھڑے ہوں''۔

پہلی بات: احلام حلم کی جمع ہو تو بمعنی اناءت یعنی بردباری کے ہے عجلت کی ضد ہے، اگر حلم کی جمع ہو تو بمعنی بالغ ہونا اور عقل والے کا ہونا نہی کا معنی ہے عقل والا حلم کی صورت میں معنی ہوگا کہ میرے قریب بردبار اور عاقل کھڑے ہوں اور حلم ہو تو نہی اس کی تاکید ہوگی کہ عاقل بالغ کھڑے ہوں۔

دوسری بات: نبی ﷺ کے زمانے میں عقلمندوں کے قریب کھڑے ہونے کی حکمت یہ تھی کہ وہ آپ ﷺ سے مسائل نماز اور کیفیت اخذ کریں لیکن آج کل اس کے استحباب کی کیا حکمت ہے؟

جواب: اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر امام بھول جائے تو یہ فتحہ دیں گے، اگر امام کو حدث لاحق ہو جائے تو اس کو خلیف بنا سکے گا اور اگر امام عالم اور صالح ہے تو اس کو دیکھ کر اپنی نماز درست کرے گا اس لئے آج بھی استحباب کا حکم باقی ہے۔

وہیشات الاسواق: بمعنی ارتفاع الصوت مطلب یہ ہے کہ مسجد میں بازار کی طرح شور وشغب نہ کرو، مساجد کو اس سے بچاؤ۔

باب ماجاء فی کراهیة الصف بین السواری

عبدالحمید بن محمود کہتے ہیں کہ ہم نے ایک امیر کے پیچھے نماز پڑھی، لوگوں کی کثرت نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم ستونوں کے پیچھے کھڑے ہوں، جب نماز پوری کی تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم اس سے بچتے تھے۔

پہلی بات: منفرد کے لئے بین السواری کھڑا ہونا یا محراب میں یا کسی کونے میں کھڑا ہونا بالاتفاق جائز ہے، چنانچہ نبی ﷺ نے کعبہ کے اندر جو نماز پڑھی تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ دو ستونوں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔

دوسری بات: قاضی ابوبکر بن العربی مالکی نے ترمذی کی شرح عارضة الأحوذی میں لکھا ہے کہ مسجد میں نمازی زیادہ ہو جائیں اور جگہ تنگ ہو جائے تو اس عارض کی وجہ سے بالاتفاق بین الساریتین نماز پڑھنا جائز ہے۔

تیسری بات: فقہ حنفی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام کیلئے بین الساریتین یا محراب یا کسی زاویئے اور کونے میں کھڑا ہونا مکروہ ہے باقی مقتدی کا کیا حکم ہے تو معارف السنن میں ہے کہ مقتدی کا حکم صراحۃً فقہ حنفی میں منقول نہیں۔ البتہ علامہ شوکانی نے نیل الأوطار میں لکھا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صف بین السواری مکروہ نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کراہت ہے مکروہ کہنے والوں کی دلیل باب والی روایت ہے اور جمہور بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کعبہ میں بین الساریتین نماز پڑھی۔ جمہور کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں جو نماز بین الساریتین کی ممانعت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ستون ترتیب سے نہ تھے ٹیڑھا ہونے کا خطرہ تھا اس لئے آپ ﷺ کے زمانے میں اس کی ممانعت تھی۔

باب ماجاء فی الصلاة خلف الصف وحده

ہلال بن یساف کہتے ہیں کہ زیاد بن ابی جعد میرا ہاتھ پکڑ کر ایک شیخ کے پاس لے گئے جس کا نام وابصہ بن معبد تھا زیاد نے کہا کہ اس شیخ نے مجھے حدیث سنائی کہ ایک شخص کو نبی اکرم ﷺ نے اعادہ کا حکم دیا جس نے اکیلے صف میں نماز ادا کی تھی۔

پہلی بات: مسئلہ: آدمی اکیلے صف میں نماز پڑھے اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ، اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ، اور سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ہاں ایسا کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ہے۔ جس کو معارف السنن میں نقل کیا ہے کہ صف مکمل ہو گئی ہو کوئی آدمی آئے تو وہ کھڑا رہے دوسرے کے آنے کا انتظار کرے لیکن اگر انتظار کیا مگر کوئی نہ آیا اب رکعت فوت ہونے کا خطرہ ہے تو یہ اگلی صف سے آدمی کو کھینچے اور پھر نماز پڑھے، اس پر دلیل حدیث ہے، مقاتل بن حبان مرسلاً نقل کرتے ہیں کہ کوئی صف میں اکیلے ہو تو وہ کسی آدمی کو کھینچ لے اور پھر نماز پڑھے یہ ابوداؤد نے مراسیل میں نقل کی ہے، مگر احناف کے متاخرین فقہاء نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں دوسرے کا

انتظار کرے دوسرے کو نہ کھینچے کیونکہ جہالت کا زمانہ ہے ممکن ہے لڑائی کردے، اس لئے اکیلے ہی پڑھ لے کراہت کے ساتھ۔ احناف کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو کراہت کے ساتھ ادا کی جائے اس کا اعادہ واجب ہے یعنی ''کل صلاۃ ادیت مع الکراھۃ فاعادتہ واجب'' صاحب ہدایہ کے ہاں کراہت داخلی ہو یا خارجی ہو اعادہ واجب ہے، مگر علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کراہت داخلی ہو تو اعادہ واجب ہے۔ لیکن وقت نکل جائے تو اعادہ واجب نہیں مستحب ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ اعادہ صلاۃ مستحب ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کراہت تنزیہی ہو تو اعادہ مستحب ہے اور کراہت تحریمی ہو تو اعادہ واجب ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اسحق رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام ترمذی کے مطابق بعض اہل کوفہ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، حماد رحمۃ اللہ تعالیٰ، ابن ابی لیلی، وکیع کے نزدیک نماز واجب الاعادہ ہے بطلان کی وجہ سے۔ ان کے ہاں خلف الصف وحدہ نماز بالکل باطل ہے اعادہ جمہور کے ہاں بھی ہے مگر کراہت کی وجہ سے اعادہ ہے اب ان دونوں مذہبوں میں فرق یہ ہے کہ جب یہ آدمی اعادہ کرے تو جمہور کے ہاں نیا مقتدی شریک نہیں ہوسکتا۔ جبکہ احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ وغیرہ کے نزدیک نیا مقتدی شریک ہوسکتا ہے۔ باقی جمہور کے ہاں نماز ہوجائے گی کراہت کے ساتھ اس پر دلیل ابو بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں آیا تو سب رکوع میں تھے مجھے خطرہ ہوا کہ اگر صف تک پہنچوں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ جائیں گے تو میں نے وہیں رکوع کیا اور رکوع کی حالت میں چل کر صف سے مل گیا اب جب انہوں نے نیت باندھی صف سے نہ ملے تھے اکیلے تھے اب اگر نماز باطل ہوجائے تو یہ حصہ باطل ہوجاتا ہے اور جب ایک حصہ باطل ہو تو پوری نماز باطل ہوگی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زادک اللہ حرصاً ولا تعد'' اور اعادہ صلاۃ کا حکم نہیں دیا یہ دلیل طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے اور یہ دوسری دلیل بھی طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے کہ حدیث میں ہے کہ اگلی صف میں جگہ خالی ہو تو پچھلی صف سے چل کر اگلی صف میں جائے اب پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف تک پہنچنے تک یہ خلف الصف وحدہ ہے اگر نماز اس سے باطل ہو تو اس کی نماز بھی باطل ہونی چاہیئے، جبکہ شریعت نے اس کی نماز کو باطل نہیں کیا اس لئے جمہور کے ہاں نماز باطل نہیں ہوگی بلکہ ہوجائے گی مگر کراہت کے ساتھ اور اعادہ واجب ہوگا۔

والشیخ یسمع الخ یہ جملہ معترضہ ہے کہ زیاد ابن ابی الجعد جب وابصہ بن معبد کی طرف سے حدیث سنا رہے تھے تو اس وقت وابصہ بن معبد سن رہے تھے تو گویا یہ تصدیق ہوئی۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی و معه رجل

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ایک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب کھڑا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سر سے پکڑا پیچھے سے اور اپنے دائیں طرف کردیا۔

مسئلہ: یہ ہے کہ اگر مقتدی ایک ہو تو وہ کہاں کھڑا ہوگا امام کے پیچھے کھڑا ہوگا یا یہ جمع کے حکم میں نہیں اس لئے ساتھ کھڑا ہوگا۔ ① اتنی بات پر اتفاق ہے کہ ایک مقتدی قیام میں جمع کے حکم میں نہیں اس لئے امام کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ ② اس پر بھی اتفاق ہے کہ دائیں جانب کھڑا ہوگا بائیں جانب کھڑا نہ ہوگا ③ امام کے ساتھ بالکل مساوی کھڑا ہوگا یا کچھ پیچھے ہٹ کر اس میں احناف کے دو قول ہیں۔

❶ شیخین کے ہاں امام کے بالکل مساوی کھڑا ہوگا البتہ نماز میں اس کی ایڑیاں امام کی ایڑیوں سے آگے نہ ہوں۔ اگر ایسا ہو تو مقتدی کی نماز نہیں ہوگی۔

❷ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور شوافع کا قول ہے کہ مقتدی امام کے کچھ پیچھے کھڑا ہو، کہ امام کے ایڑیوں کے برابر مقتدی کے پنجے ہوں،

تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقتدی آگے بڑھ جائے اوراس کی نماز ہی نہ ہو۔ اس لئے اس کی نماز کو بچانے کے لئے کچھ پیچھے کھڑا ہونا چاہیئے ۔ بدائع الصنائع میں ہے کہ عام احناف نے اس کو اختیار کیا ہے احتیاط کی وجہ سے۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی مع الرجلین

سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ جب ہم تین آدمی ہوں تو ہم میں سے ایک آگے کھڑا ہو۔

مسئلہ: اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو مقتدی ہوں تو یہ جمع کے حکم میں ہے کہ نہیں؟ ائمہ اربعہ میں اتفاق ہے کہ اگر دو مقتدی ہوں تو یہ جماعت کے حکم میں ہیں۔ اس لئے خلف الامام کھڑے ہوں گے۔ اس کی تائید دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ''الاثنین فما فوقہا جماعۃ'' اور نبی ﷺ کا فعل بھی یہی ہے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو شاگردوں (علقمہ اور اسود رحمہما اللہ تعالیٰ) کے ہاں اگر دو مقتدی ہوں تو ایک دائیں اور ایک بائیں جانب کھڑا ہو۔ اور دلیل میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ نبی ﷺ نے اس طرح کیا تھا، جمہور کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات منسوخ ہے اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناسخ نہیں پہنچی تھی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور نبی ﷺ الگ الگ نماز نفل پڑھ رہے تھے۔ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بائیں جانب تھے مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ دائیں جانب کھڑے ہوئے حضور ﷺ نے جماعت کرائی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھے کہ ابوذر بھی شریک ہیں جبکہ وہ شریک نہ تھے تو ان کو یہ غلط فہمی ہوئی ورنہ شروع سے یہ حکم تھا کہ مقتدی دو ہوں تو خلف الامام کھڑے ہوں گے۔ ③ یہ جواب طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے علقمہ اور اسود کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی ومعہ رجال ونساء

انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کی نانی ملکیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی جو کھانا آپ کے لئے تیار کیا تھا آپ ﷺ نے کھانا کھایا اور پھر فرمایا اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا ایک چٹائی کی طرف جو زیادہ مدت پڑی رہنے کی وجہ سے میلی ہو چکی تھی اس کو میں نے پانی سے دھویا نبی ﷺ اس پر کھڑے ہوئے میں اور یتیم ان کے پیچھے کھڑے ہوئے اور بڑھیا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی آپ نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی پھر سلام پھیر لیا۔

پہلی بات: امام کے ساتھ مرد بھی ہو اور عورتیں بھی ہوں تو اس صورت میں صفوف کی ترتیب کیا ہوگی باب میں اس کا ذکر ہے۔ اس حدیث میں اس کی کیفیت یہ ہے کہ آگے امام پھر مرد اور پھر عورتوں کی صف ہو۔ یہ ترتیب علماء اور ائمہ مجتہدین کے درمیان اتفاقی ہے کہ امام کے ساتھ تین آدمی ہوں یعنی ایک مرد ایک بچہ اور ایک عورت تو مرد اور بچہ امام کے پیچھے ہوں گے (پہلی صف میں) اور عورت ان کے پیچھے ہوگی یہ تب جب بچہ ایک ہو۔

دوسری بات: امام کے ساتھ مقتدیوں کی کثرت ہو اور مقتدیوں کی کئی انواع ہوں مثلاً مرد، عورتیں اور بچے ہوں تو فقہاء کے ہاں بہتر صورت یہ ہے کہ پہلے مردوں کی صف بنائی جائے اس کے بعد بچوں کی اس کے بعد عورتوں کی صف ہوگی۔ استدلال اس حدیث میں ہے ''لیلینی منکم اولوا الاحلام والنھی''۔

تیسری بات: باب کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب کھانا کھایا تو فرمایا ''قوموا فلنصل بکم'' ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل

کیا ہے کہ یہ نفلی نماز تھی آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی عبادت سے ان کے گھر میں برکت پیدا ہو۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں جو نوافل کی جماعت کے قائل ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نوافل کی جماعت جائز نہیں البتہ مقتدی تین یا چار سے کم ہوں اور تداعی بھی نہ ہو پھر نفل کی جماعت جائز ہے۔ تو باب کی حدیث امام صاحب کے خلاف نہیں کیونکہ یہاں مقتدی بھی تین تھے اور تداعی بھی نہ تھی اور یہ صورت احناف کے ہاں جائز ہے البتہ لوگ زیادہ ہوں اور تداعی بھی ہو یہ احناف کے ہاں جائز نہیں شوافع کے ہاں جائز ہے اس کی تفصیل مستقل باب میں آئے گی۔

ان جدتــه مليكة: جدتہ کی ضمیر انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف راجع ہے یہ جدہ من قبل الام تھی یعنی نانی تھی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جدتہ کی ضمیر اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ کی طرف راجع ہو۔ انا والیتیم وراءہ الخ یتیم انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی کے بیٹے تھے، ان کا نام ضمیرہ تھا لیکن یتیم تھے اس لئے مبہم لفظ لایا نام نہیں ذکر کیا بعض حضرات کہتے ہیں کہ یتیم اس نابالغ بچے کا نام تھا۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ شخص کرائے جو کتاب اللہ کا زیادہ اقرأ ہو اگر قرأت میں برابر ہوں تو أعلم بالسنۃ مقدم ہے اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہے وہ امامت کرائے اور اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو زیادہ عمر والا جماعت کرائے۔ آگے فرمایا آدمی کی غلبے کی جگہ پر امامت نہ کرائے اور گھر میں اس کے بیٹھنے کی جگہ پر نہ بیٹھے اس کی اجازت کے بغیر۔

پہلی بات: فقہاء نے وہ اوصاف محمودہ جن کی بناء پر آدمی مستحق امامت بنتا ہے بارہ تک نقل کی ہیں یہاں حدیث میں چار مذکور ہیں۔

دوسری بات: احناف شوافع مالکیہ اور حنابلہ سب کے ہاں یہ اوصاف محمودہ چار سے زائد ہیں۔ مگر ترتیب میں فرق ہے۔

تیسری بات: پہلے وصف میں اختلاف ہے کہ احق بالامامۃ اعلم ہے یا أقرأ، امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعلم مقدم ہے اقرأ پر بشرطیکہ اعلم بقدر ما یجوز بہ الصلاۃ قرآن صحیح پڑھ سکتا ہو اور اتنا یاد بھی ہو۔ دوسرا قول امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ہے کہ اقرأ مقدم ہے اعلم پر۔ دوسرے قول والوں کی دلیل باب کی حدیث ہے اس میں ہے ''یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللہ'' دوسری حدیث میں ہے صحابی فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی خدمت میں آئے جب واپس ہوئے تو آپ ﷺ سے پوچھا کہ ہم میں سے کون امامت کرے آپ ﷺ نے فرمایا ''اکثرکم حفظا للقرآن''

جمہور ائمہ کی دلیل: احناف میں سے صاحب ہدایہ اور امام سرخسی نے، شوافع میں سے علامہ خطابی نے، مالکیہ میں عبدالبر نے باب کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانے میں اقرأ اعلم بھی ہوتا تھا کیونکہ اس زمانے میں لوگ صرف الفاظ یاد نہیں کرتے تھے بلکہ الفاظ و معانی سب یاد کرتے تھے اس لئے اس زمانے میں اقرأ سب أعلم تھے۔ ابن رشد نے بھی اس حدیث کو جمہور کی متدل بنایا ہے۔ معارف السنن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ جمہور کا اس سے استدلال صحیح نہیں کیونکہ اقرأ اعلم کے معنی میں نہیں بلکہ احفظ کے معنے میں ہے مگر جمہور کی بات صحیح ہے کیونکہ جمہور اقرأ کا معنی أعلم نہیں کرتے بلکہ دوسرے علت بیان کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اقرأ اعلم ہوتے تھے۔

احناف میں سے صاحب فتح القدیر نے دوسرا استدلال ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت سے کیا ہے کہ آخری زمانہ نبوت میں آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آگے کیا وہ أعلم الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔ جبکہ اقرأ ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کو امام نہیں بنایا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اعلم ہونا اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اقرأ ہونا احادیث میں موجود ہے، ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے

"کان ابوبکر اعلمنا" یہ اس وقت کہا جب "اذا جاء نصر اللہ الخ" والی سورت آپ نے تلاوت کی اور کہا کہ ایک بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ دنیا میں رہے یا اللہ کے پاس آئے تو اس نے اللہ کے پاس جانے کو پسند کیا اس پر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے، ہم کو تعجب ہوا کہ آپ ﷺ کسی آدمی کی بات کر رہے ہیں اور یہ رو رہے ہیں لیکن جب آپ ﷺ کا انتقال ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ عبد کون تھے اس پر فرمایا "کان ابوبکر اعلمنا"

امامت میں ترتیب یوں ہوگی ❶ أعلم ❷ اقرأ ❸ اقدمھم ہجرۃ ❹ اکثرھم سنا ❺ اورع ❻ جس کے کپڑے صاف ہوں وغیرہ۔

چوتھی بات: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "لایؤم الرجل فی سلطانہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی امام مقرر ہے وہ اس کے غلبے کی جگہ ہے یا وہاں کا کوئی بڑا ہے اس کا غلبہ ہے تو اس کی اجازت کے بغیر کوئی امامت نہ کرے۔

تکرمۃ: بیٹھنے کی جگہ مراد ہے کہ بغیر اجازت کے اس جگہ نہ بیٹھے۔ الا باذنہ جمہور کے ہاں یہ دونوں کے ساتھ لگتا ہے۔

پانچویں بات: باب کی حدیث میں جو ترتیب بتائی گئی ہے یہ تین جگہ معتبر نہیں ① امام الحی مقرر ہو تو وہی مقدم ہوگا۔ اگرچہ وہاں اقرأ یا اعلم بھی آجائے ہاں اگر امام اجازت دیدے تو وہ الگ بات ہے۔

② صاحب الدار احق بالامامۃ ہے بشرطیکہ قدر مایجوز بہ الصلاۃ قرآن پڑھ سکے الا یہ کہ گھر والا کسی کو اجازت دیدے۔ ③ کسی کی غلبے کی جگہ ہو مثلاً امام یعنی خلیفہ موجود ہے تو وہی احق بالامامۃ ہے۔

چھٹی بات: امامت دو قسم پر ہے ① امامت کبریٰ یعنی خلافت اس کے صفات کیا ہیں اس کا تعلق علم کلام سے ہے۔ ② امامت صغریٰ اس کے اوصاف کو فقہ میں بیان کیا جاتا ہے۔

اقدمھم ھجرۃ الخ بعض نے معنی کیا ہے کہ جو گناہوں سے بچتا ہو جس طرح حدیث میں ہے "المھاجر من ھجر مانھی اللہ عنہ"۔

باب ماجاء اذا ام احدکم الناس فلیخفف

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو اس کو چاہئے کہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں چھوٹے، کمزور، اور مریض بھی ہوتے ہیں اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو جس طرح چاہے پڑھے۔

دوسری روایت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ تخفیف کرنے والے تھے نماز میں مگر اتمام کے ساتھ۔

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ امام کو چاہئے کہ ایسی نماز پڑھائے جس میں لوگوں کے لئے مشقت نہ ہو۔ اس لئے طویل قیام کر کے ان کو مشقت میں نہ ڈالے، کیونکہ بعض بے صبرے ہوتے ہیں بعض بچے بوڑھے اور بعض مریض ہوتے ہیں۔ معارف السنن میں ہے کہ جمہور فقہاء ومحدثین ائمہ اربعہ کے نزدیک تخفیف کا حکم استحباباً ہے اس پر معارف السنن میں حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے قول بھی نقل کئے ہیں۔

دوسری بات: تخفیف جو مستحب ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کے بارے میں صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے کہ قرأت قرآن میں

تخفیف مراد ہے، رکوع سجدے کی تخفیف مراد نہیں کہ آدمی سنت طریقے سے بھی تخفیف کردے یا تعدیل ارکان فوت کردے یہ مراد نہیں۔

تیسری بات: قرأت کی جو تخفیف مراد ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مسنون طریقے کے اندر رہ کر تخفیف کرے۔ مثلاً فجر اور ظہر میں طوال مفصل ہے اس سے زیادہ کرنا صحیح نہیں طوال مفصل کے اندر رہ کر پڑھنا یہ تخفیف ہے۔ اسی طرح عصر اور عشاء میں اوساط مفصل ہے اس میں اوساط مفصل پڑھنا تطویل نہیں بلکہ تخفیف ہی ہے البتہ اس سے زیادہ تطویل ہوگی۔ اسی طرح مغرب میں قصار مفصل ہے اس میں زیادتی کرنا تطویل ہے قصار مفصل کے اندر اس کو ادا کرنا تطویل نہیں بلکہ تخفیف ہی ہے یہ صاحب فتح القدیر سے منقول ہے۔

چوتھی بات: معارف السنن میں حافظ ابن دقیق العید کے حوالے سے منقول ہے کہ تطویل اور تخفیف اضافی چیز ہے، مثلاً تسبیحات آپ ﷺ سے بہت دفعہ پڑھنا ثابت ہے۔ ان کے لئے تخفیف تھا لیکن ہمارے لئے باعث ثقیل ہے اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ امام کو تین دفعہ تسبیح پڑھنی چاہیے تا کہ تخفیف ہو۔ بعض نے پانچ دفعہ پڑھنے کا لکھا ہے تا کہ بعض جو دیر سے آئیں وہ رکوع میں شامل ہوسکیں اور بعض کے ہاں تو نماز ہی باعث ثقیل ہے اس لئے اس طریقے سے پڑھے کہ مسنون طریقے کی رعایت رکھے۔

باب ماجاء فی تحریم الصلاۃ وتحلیلها

ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نماز کی چابی طہور ہے اور اس کو حرام بنانے والی چیز تکبیر ہے اور حلال بنانے والی چیز سلام ہے اور نماز نہیں اس آدمی کی جو الحمد للہ اور سورت نہیں پڑھتا، فرض یا غیر فرض میں۔

یہ حدیث پہلی گزر چکی ہے اس کے تمام مباحث وہاں موجود ہیں یہاں صرف دو باتیں ہیں۔

پہلی بات: وہاں کی حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے یہاں والی حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں کی سند حسن صحیح تھی یہاں کی سند ابوسفیان طریف سعدی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ وہاں صرف تین جملے تھے "مفتاح الصلاۃ الطهور" "تحريمها التكبير" "تحليلها التسليم" جبکہ یہاں چوتھا جملہ بھی منقول ہے کہ "ولا صلاۃ لمن يقرأ بالحمد وسورة فی فريضة اوغيرها"

دوسری بات: احناف کے ہاں مطلق قرأت کسی نے نہ کی تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی اس لئے یہ احناف کی مؤید ہے اگرچہ ضعیف ہے مگر اس سے اثر نہیں پڑتا کیونکہ دوسری روایات اس کی مؤید ہیں مثلاً "أمرنا رسول الله ﷺ أن نقرأ بسورة القرآن والفاتحة" اور ایک روایت میں ہے "لا صلاۃ لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعداً"

تیسری بات: "تحريمها التكبير" اس کی تحریم تکبیر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امور جو تکبیر تحریمہ سے پہلے جائز تھے مثلاً کھانا، پینا اور باتیں کرنا اب وہ حرام ہوگئے "وتحليلها التسليم" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو امور دوران صلاۃ ناجائز تھے وہ سلام کے بعد جائز ہوگئے۔ باقی یہ مسئلہ کہ احناف کے ہاں سلام فرض نہیں خروج بصنعہ فرض ہے جبکہ حدیث میں "تحليها التسليم" ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بھی نماز کی تحلیل سلام ہی کے ساتھ ہے اس لئے سلام احناف کے راجح قول کے مطابق واجب ہے باقی خروج بصنعہ کا فرض ہونا امام صاحب کا مسلک نہیں بلکہ یہ صرف ابوسعید البردعی کی تخریج ہے۔ احناف ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "اذا قلت هذا او فعلت هذا فقد تمت صلاتک" کی وجہ سے کہتے ہیں کہ قاعدہ اخیرہ فرض ہے اتنی مقدار بیٹھا پھر اٹھ کر چلا گیا تو اس کی نماز ہوجائے گی، نماز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نماز مکروہ تحریمی ہے اور واجب الاعادہ ہے تو مآل کے اعتبار سے احناف کا مسلک بھی جمہور کی طرح بنتا ہے۔

باب فی نشر الاصابع عند التکبیر

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے تکبیر کہتے تو انگلیوں کو پھیلا لیتے تھے۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت مصلی انگلیوں کو کھلا رکھے یعنی زبردستی انگلیوں کو نہ ملائے اور زبردستی کھولے بھی نہیں بلکہ طبعی حالت پر رکھے یہ طریقہ مسنون و مستحب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور جمہور احناف نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

دوسری بات: نشر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مٹھیاں بند نہ کرے بلکہ ہاتھ کھلے رکھے تو پہلے معنے کے اعتبار سے نشر ضد الضم اور دوسرے معنے کے اعتبار سے نشر ضد القبض ہوگا۔ اس کے دونوں معانی صحیح ہیں کہ انگلیاں نہ قبض کرے نہ ضم کرے۔ ہاتھ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہتھیلی کاندھوں کے برابر اٹھائے، انگوٹھے کانوں کے لو کے برابر اور انگلیاں کانوں کے برابر ہوں اس طریقے سے تمام احادیث صحیح ہو جاتی ہیں یہ کیفیت شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس طریقے کو بہت اچھا جانا ہے۔

تیسری بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نشر اصابع کی حدیث صحیح نہیں اور ''رفع یدیہ مداً'' کی حدیث صحیح ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ سند کے اعتبار سے اگر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ رفع یدیہ مداً کو قوی سمجھیں تو صحیح ہے کیونکہ سند سے محدثین ہی بحث کرتے ہیں اگر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نشر الاصابع کو ضعیف اس لئے کہا ہو کہ وہ اس کو رفع یدیہ مداً کے خلاف سمجھتا ہو تو ان کی یہ بات غلط ہے کیونکہ نشر اصابع رفع یدیہ مداً کے منافی نہیں۔ دونوں جمع ہو سکتے ہیں کہ ہاتھ لمبا کر کے اٹھائے اور انگلیاں طبعی حالت پر پھیلا کر رکھے۔

باب فی فضل التکبیر الاولیٰ

انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے چالیس دن جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کیں اللہ کے لئے اس طریقے سے کہ تکبیر اولیٰ کو پاتا رہا اس کے لئے دو براءتیں لکھی جائیں گی ایک آگ سے براءت اور دوسری نفاق سے براءت۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا موضوع اور مقصود تکبیر اولیٰ کی ترغیب کا بیان ہے۔

دوسری بات: تکبیر اولیٰ کی فضیلت میں کسی کا اختلاف نہیں تکبیر اولیٰ کے ادراک کے ساتھ نماز ادا کرنا بالاتفاق افضل ہے۔

تیسری بات: مدرک تکبیر اولیٰ کونسا ہوگا اس کے متعلق متعدد اقوال ہیں۔ ① جس طرح ظاہر معنی ہے کہ تکبیر اولیٰ کا مدرک وہ ہے جو امام کی تکبیر تحریمہ کے ساتھ تکبیر تحریمہ میں شریک ہو۔ ظاہر معنے کے اعتبار سے یہ راجح لگتا ہے مگر فقہاء کہتے ہیں کہ یہ قول اضیق ہے یعنی اس میں تنگی ہے۔ ② قراءت شروع کرنے تک جو امام کے ساتھ شریک ہو جائے یہ تکبیر اولیٰ کا مدرک ہے۔ ③ سورۃ فاتحہ کے اختتام تک شریک ہو جائے وہ مدرک تکبیر اولیٰ کہلائے گا۔ ④ رکوع کی تکبیر تک جو امام کے ساتھ شریک ہو جائے وہ مدرک تکبیر اولیٰ ہے کیونکہ تکبیر رکوع تکبیر ثانیہ ہے۔ ⑤ مدرک رکعت مدرک تکبیر اولیٰ ہے یعنی امام کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے پہلے جو آدمی امام سے مل جائے وہ مدرک تکبیر اولیٰ کہلائے گا فقہاء نے لکھا ہے یہ قول اوسع ہے۔

چوتھی بات: حدیث میں ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کی جائے یہ چالیس کا عدد عادت کے لئے ہے کہ چالیس دن تک جو یہ عمل کرے تو اس کو اس عمل کی عادت پڑ جائے گی۔

پانچویں بات: کتب لہ براءتان اشکال براءت من النار خود براءت من النفاق ہے۔ کیونکہ منافق جہنم سے خلاصی نہیں پا سکتا، جب براءت من النار ہو گئی تو پھر براءت من النفاق کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: برأت من النار کا فیصلہ تو آخرت میں ہوگا لیکن برأت من النفاق ہماری تعلیم کے لئے کہا کہ جب چالیس دن تک جماعت کے ساتھ تکبیر اولیٰ پا کر نماز پڑھے اس کے بارے میں تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اس کے نفاق کا گمان کرو۔

باب مایقول عند افتتاح الصلاۃ

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو تکبیر کہتے پھر یہ دعاء پڑھتے "سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولاالٰہ غیرک" پھر کہتے اللہ اکبر کبیراً" پھر کہتے "اعوذباللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم من ھمزہ ونفخہ ونفثہ" دوسری روایت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے اور اس میں "ولا الٰہ غیرک" تک منقول ہے۔ اور اس میں نوافل کا ذکر بھی نہیں بلکہ مطلقاً ہے "اذا افتتح الصلاۃ"

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان دعاء مسنون یا مستحب ہے یا نہیں اس کے متعلق دو اختلاف ہیں۔

❶ ایک امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اختلاف ہے۔ جمہور کے ساتھ وہ یہ کہ جمہور فقہاء کے ہاں تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان دعاء ہے۔ اور نبی ﷺ سے منقول ہے جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہاں کوئی دعا پڑھنی منقول نہیں۔ آگے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے "باب فی افتتاح القراءۃ بالحمدللہ رب العالمین"۔ اس میں ہے کہ نبی ﷺ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرأت کو الحمد للہ سے شروع کرتے تھے۔ اس سے مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ دو استدلال کرتے ہیں ایک تکبیر اولیٰ اور فاتحہ کے درمیان دعاء نہیں اور دوسرا یہ کہ بسم اللہ پڑھنا بھی منقول نہیں۔ جمہور کی دلیل وہ احادیث ہیں جس میں نبی ﷺ سے دعاء منقول ہے صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ "انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰات ولأرض حنیفاً وما أنامن المشرکین ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین" یہ دعاء پڑھتے تھے۔ دوسری روایت ہے "اللھم باعدبینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب اللھم نقنی من خطایای کالثوب الابیض من الدنس اللھم اغسلنی بالثلج والماء والبرد" ان ادلہ کی وجہ سے جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت سے پہلے دعا پڑھنا نبی ﷺ سے منقول ہے باقی جو حدیث آپ نے پیش کی ہے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ مجمل ہے جیسا کہ آگے باب میں آجائے گا۔

❷ دوسرا اختلاف جمہور کے درمیان ہے کہ جب دعاء ثابت ہے تو کونسی دعا پڑھنی چاہیئے۔ اتنی بات میں اتفاق ہے کہ منقول دعاؤں میں جو بھی دعاء پڑھی جائے تو سنت ادا ہو جائے گی اور استحباب پر عمل ہو جائے گا اس میں اختلاف ہے کہ کونسی دعاء افضل ہے تو احناف اور مشہور قول میں احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک باب والی دعاء زیادہ افضل ہے شوافع کے ہاں "انی وجھت وجھی الخ" کے افضل ہونے کا بھی قول ہے اور باب والی دعاء کے افضل ہونے کا بھی قول ہے اور مشہور قول ان کا یہ کہ "اللھم باعدبینی وبین خطایای الخ" افضل ہے۔

احناف اور حنابلہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی عام عادت مبارکہ باب والی دعاء پڑھنے کی تھی دوسرا بعض روایات سے ثابت ہے کہ اس کے الفاظ قرآنی الفاظ ہیں البتہ منسوخ التلاوت ہیں۔ تیسرا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ان الفاظ کی تعلیم دیتے تھے ان وجوہ کی بناء پر احناف اس دعا کو ترجیح دیتے ہیں۔

دوسری بات: عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ ان الفاظ کو جھر کے ساتھ پڑھتے تھے تو جمہور کا مسلک یہ ہے کہ یہ الفاظ سراً پڑھنے مستحب ہیں جھراً پڑھنا مستحب نہیں باقی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعلیماً جھراً پڑھے تھے۔

باب ماجاء فی ترک الجهر ببسم اللہ الخ

باب من رأی الجهر ببسم اللہ الخ

باب ماجاء فی افتتاح الخ

پہلے باب میں ابن عبداللہ بن مغفل کی روایت ہے کہ میرے والد نے مجھے نماز میں جھراً بسم اللہ کہتے ہوئے سنا تو مجھ سے کہا کہ اے بیٹے یہ بدعت ہے اور اسلام میں اپنے آپ کو بدعت کی ایجاد کرنے سے بچاؤ۔ اور انہیں بدعت فی الاسلام سے کوئی چیز زیادہ مبغوض نہ تھی پھر فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی کوئی بھی اس کو جہراً نہ پڑھتا تھا اس لئے تم بھی نماز میں جھراً نہ پڑھو۔

دوسرے باب میں ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی نماز کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے تھے۔

تیسرے باب میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت لائی ہے کہ نبی اکرم ﷺ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرأت کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے۔

پہلی بات: معارف السنن میں لکھا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مسئلہ اختلافی ہے، اس لئے اس مسئلے کا تعلق نماز سے ہے اس وجہ سے یہ اختلاف وسیع بھی ہوا اور اہم بھی قرار پایا کہ محدثین نے اس پر کتابیں لکھیں چنانچہ معارف السنن میں کئی محدثین کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

دوسری بات: یہاں پر دو مسئلے ہیں جن میں اختلاف ہیں۔

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ بسم اللہ سورت یا قرآن کا جز ہے یا نہیں اس مسئلے میں تفصیل ہے سورت نمل میں جہاں سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خط ہے اس میں بسم اللہ مذکور ہے وہ بالاتفاق اور بالاجماع قرآن کا جز ہے۔ اختلاف اس بسم اللہ میں ہے جو سورت کی ابتداء میں لکھا جاتا ہے اس میں کل تین اقوال ہیں۔

پہلا قول: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، صاحبین، جمہور فقہائے کوفہ، بعض قراء کوفہ اور ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بھی یہی ہے کہ بسم اللہ قرآن کی آیت ہے، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فصل بین السورتین کے لئے اتارا ہے۔ یہ نہ سورت فاتحہ کا جز ہے اور نہ کسی اور سورت کا جزء ہے چنانچہ سنن ابوداؤد میں سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔

کہ نبی کریم ﷺ سورت کے اختتام اور دوسرے سورت کی ابتداء کو نہ پہچانتے تھے اس مقصد کے لئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت اتاری جس سے معلوم ہو جائے کہ ایک سورت کی انتہا ہے دوسری سورت کی ابتداء ہے۔

دوسرا قول: امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن جریر طبری رحمہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاں بسم اللہ قرآن کا جزء بھی نہیں، اور کسی سورت کا جز بھی نہیں۔

تیسرا قول: امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ وفی روایۃ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ وامام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے وہ یہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سورت فاتحہ کا جز ہے۔ باقی سورتوں کا جز ہے یا نہیں اس میں شوافع کی روایات میں اختلاف ہے، مگر بقول نووی رحمہ اللہ تعالیٰ راجح

یہ ہے کہ ہر سورت کا جز ہے۔ یہ مذکورہ مسئلہ باب سے متعلق نہیں اس لئے اس کے دلائل اپنی جگہ آئیں گے۔ لیکن ایک بات سمجھ لیں کہ اشکال یہ ہے کہ بسم اللہ قرآن کی آیت ہو تو اس سے انکار کفر ہے۔ اگر آیت نہ ہو تو اس کو آیت کہنا بھی کفر ہے تو یہ اختلاف کفر و اسلام کا اختلاف ہے۔

جواب: باقی آیات قرآنیہ میں یہی قانون ہے کہ آیت کا انکار بھی کفر ہے اور غیر آیت کو آیت کہنا بھی کفر ہے۔ مگر بسم اللہ کے بارے میں ائمہ کا یہ قانون نہیں تو اس کا آیت ہونا قطعی اور اجماعی نہیں اس لئے جنبی کے لئے اس کا پڑھنا جائز ہے، صرف اس کی تلاوت سے نماز نہ ہوگی مگر یہ بات سورت نمل کے علاوہ کا ہے۔

دوسرا مسئلہ: بسم اللہ کو جب نماز میں پڑھیں گے تو اس کا حکم کیا ہے اس کا ثواب ہے یا نہیں اس میں بھی تین اقوال ہیں۔

پہلا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے، ان کے ہاں تکبیر تحریمہ کے بعد امام فوراً الحمد للہ سے نماز شروع کردے اس لئے اس کو بالکل نہ پڑھا جائے گا ایک قول کے مطابق تہجد اور نوافل میں اس کے پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ دوسرا قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، فقہائے کوفہ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ بسم اللہ نماز کی ہر رکعت میں فاتحہ کے ساتھ پڑھی جائے گی مگر اخفا کے ساتھ جہری نماز ہو یا سری نماز ہو امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا پڑھنا واجب نہیں بلکہ مسنون اور مستحب ہے۔ اسی طرح سورت فاتحہ کے ساتھ ضم سورت کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنا امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحب ہے۔

ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جواز کا ہے مگر شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو مُفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔

تیسرا قول شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں بسم اللہ جہری نمازوں میں جہر کے ساتھ پڑھی جائے گی اور دوسرے میں اخفاء کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

اب یہاں دو باتیں سمجھ لو ایک بات یہ ہے کہ معارف السنن میں ہے کہ بعض کے ہاں دوسرے مسئلے کا اختلاف مبنی ہے پہلے والے مسئلے کے اختلاف پر مگر معارف السنن میں اس کی تردید موجود ہے کہ دوسرا مسئلہ پہلے مسئلے پر مبنی نہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ مثلاً قراء کوفہ سورت کی جزئیت کے قائل ہیں مگر سراً پڑھنا مستحب قرار دیتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ زیلعی نے نصب الرایہ میں لکھا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق احادیث تین قسم کی ہیں ایک قسم کی وہ جو احناف کی مؤید ہیں، وہ سنداً صحیح ہیں مگر بہت قلیل ہیں اور صریح نہیں بلکہ اس میں تاویل ہو سکتی ہے کہ تاویل کے ساتھ اس کو احناف کے مسلک پر حمل کیا جائے تیسری قسم کی احادیث شوافع کی مؤید ہیں یہ تعداد کے اعتبار سے چودہ ہیں مگر کیف کے اعتبار سے محدثین کے ہاں کوئی بھی صحیح نہیں، چنانچہ شوافع کے محدثین نووی رحمہ اللہ تعالیٰ، دارقطنی اور بیہقی نے خود ان روایات کی تضعیف کا اقرار کیا ہے۔ زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لطیفہ لکھا ہے کہ دارقطنی نے اس مسئلے پر کتاب لکھی۔ مالکی عالم ان کے پاس آئے اور کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ان میں کوئی صحیح حدیث ہے تو دارقطنی خاموش ہو گئے پھر کہا کہ مرفوع حدیث کوئی نہیں، البتہ اقوال صحابہ بعض صحیح ہیں اور بعض ضعیف ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ شوافع کے ہاں اس مسئلے میں کوئی بھی مرفوع حدیث نہیں۔ جبکہ احناف کی چھ یا سات احادیث بنتی ہیں جو سب سنداً قوی ہیں۔

❶ صحیح مسلم میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو جہراً بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔ حالانکہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پینتیس سال خلفائے راشدین کے پاس رہے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بچے تھے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بچے تھے، مگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تو شیوخ میں سے ہو گئے تھے۔

❷ دوسری دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے یعنی قسمت الصلاۃ بینی وبین عبدی الخ، اس میں صراحۃ ہے کہ "اذا قال العبد الحمدللہ رب العالمین فیقول اللہ حمدنی عبدی" اگر بسم اللہ فاتحہ کا جز ہوتو بسم اللہ کا ذکر بھی ہوتا۔

❸ باب اول کی حدیث صریح علی الجہر ہے۔

شوافع کی روایات کے بارے میں زیلعی نے لکھا ہے کہ ان میں تو بعض نہ صحیح ہیں اور نہ صریح ہیں اور کچھ صحیح ہیں صریح نہیں اور کچھ صریح ہیں صحیح نہیں اسلئے اس مسئلے میں بہت سارے شوافع نے احناف کا مسلک لیا ہے۔

یہاں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تین باب قائم کئے ہیں ایک احناف کا مؤید ہے دوسرا شوافع کا مؤید ہے تیسرا مالکیہ کا مؤید ہے، تیسرے باب میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل ہے اس کے بارے میں احناف کہتے ہیں کہ اس میں افتتاح بالجہر مراد ہے، مطلقاً بسم اللہ کی نفی نہیں کیونکہ مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ "فلم أسمع أحدهم يجهر ببِسْمِ اللّٰه" کہ بسم اللہ جہراً پڑھتے ہوئے نہیں سنا اور بعض روایات میں ہے کہ "كانوا لايجهرون ببِسْمِ اللّٰه الرحمن الرحيم" اور بعض میں ہے "كانوا يخفون ببِسْمِ اللّٰه الرحمن الرحيم" اس لئے یہاں بھی انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطلب مطلقاً نفی نہیں بلکہ جہر کی نفی ہے۔

باقی احناف شوافع کو جواب دیتے ہیں کہ اگر کہیں جہراً بسم اللہ کا ثبوت ہے تو وہ تعلیماً ہے جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نعیم بن مجمر کی روایت ہے کہ اگر چہ زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کلام کیا ہے مگر اس میں تعلیماً جہر کا ذکر ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں جیسے کبھی ثناء جہراً پڑھی اور کبھی التحیات کو جہراً پڑھا گیا۔

باب کی حدیث کی جو روایت ہے کہ "كانوا يستفتحون القرأة بالحمدللّٰه رب العلمين" امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تاویل کی ہے کہ یہاں سورت کا نام بتلایا ہے کہ الحمدللہ رب العلمین کی سورت سے شروع کرتے ہوئے اور بسم اللہ اس کا جز ہے اس لئے وہ بھی پڑھی ہوگی۔ مگر یہ تاویل مردود ہے کیونکہ اس کا نام سورۃ الحمد ہے پورا الحمدللہ رب العلمین نہیں۔

باب ماجاء أنه لاصلاة الابفاتحة الكتاب

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت منقول ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز نہیں ہوتی اس کی جو سورت فاتحہ نہ پڑھے۔

پہلی بات: اس باب کی اس حدیث کے ساتھ دو مسائل کا تعلق ہے ایک مسئلہ مقصود ہے جس کے لئے باب قائم کیا ہے دوسرا مسئلہ جو مقصود ہے نہیں وہ آگے آئے گا۔ پہلا مسئلہ جو باب کی حدیث میں مذکور ہے یہ سورت فاتحہ کے پڑھنے کے بارے میں ہے کہ نماز میں اس کا پڑھنا فرض ہے یا واجب ہے یا مستحب ہے یا اور کچھ ہے؟ دوسرا مسئلہ قرأت خلف الامام کا ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے۔

اس مسئلے کے متعلق یہ سمجھ لو کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے بالکل قرأت نہیں۔ یہ الامام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحیح تر قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عام مسلک یہ نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں قرأت خلف الامام سری اور جہری دونوں نمازوں میں واجب ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ مزنی کی کتاب مختصر اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب الام سے ثابت ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فاتحہ خلف الامام واجب ہے مگر جہری نمازوں میں اختیار ہے، لیکن متاخرین شوافع جیسے نووی رحمہ اللہ تعالیٰ بیہقی اور دار قطنی وغیرہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ سے متاثر ہو کر کہنے لگے کہ جہری میں بھی واجب ہے معارف السنن میں

سری نمازوں کے بارے میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے چھ اقوال منقول ہیں۔ ① واجب ہے ② سنت ہے ③ مستحب ہے ④ مباح ہے ⑤ مشہور قول یہ ہے کہ سری نمازوں میں بھی قرأت خلف الامام ناجائز ہے، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام واجب ہے مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں مستحب ہے اس مسئلے کی مزید تفصیل اکتالیس ابواب کے بعد "باب ماجاء فی القرأة خلف الامام" میں آئے گی۔

اس باب کا تعلق پہلے مسئلے سے ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز میں سورت فاتحہ پڑھنا واجب ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشہور قول میں اور محقق قول کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ سورت فاتحہ نماز میں فرض اور رکن نہیں۔ احناف کا مشہور قول فاتحہ کے وجوب کا ہے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بدرالدین عینی رحمہ اللہ تعالیٰ اور "الاشراف بمذاهب الأشرف" میں وزیر بن، ہبیرہ نے لکھا ہے کہ ان کے ہاں بھی یہ رکن نہیں کیونکہ مالکیہ کا مسلک ہے کہ کوئی نماز میں فاتحہ بھول گیا نہ پڑھ سکا تو سجدہ سہو کر لے تا کہ جبیرہ ہو جائے اس سے معلوم ہوا کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ رکن نہیں کیونکہ رکن کا جبیرہ سجدہ سہو سے نہیں ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نماز میں سورت فاتحہ کا پڑھنا فرض اور رکن ہے اس لئے کسی نے فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ یہ مذہب ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ، اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور داؤد ظاہری کا بھی ہے۔

قول ثانی والوں کی دلیل باب کی حدیث ہے "لاصلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" یہ روایت متعدد صحابہ سے مختلف الفاظ کے ساتھ ثابت ہے مگر مفہوم ایک ہی ہے قول اول والے یعنی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مطلق قرأت فرض ہے دلیل قرآن کی آیت ہے ﴿فاقرء وا ما تيسر من القرآن﴾ یہ مکی آیت ہے اگرچہ شان نزول کے مطابق تہجد کے بارے میں اتری ہے کہ نبی ﷺ کے قیام اللیل کی وجہ سے پاؤں سوجھ گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسانی کے لئے یہ آیت اتاری، مگر قاعدہ یہ ہے کہ آیت کا حکم شان نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوتا بلکہ "العبرة لعموم الالفاظ" اس لئے یہ آیت نماز کے متعلق ہے اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماتیسر من القرآن فرض ہے اب حدیث کی طرف جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے "لاصلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ پڑھنا بھی ضروری ہے۔ اب قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز قطعی الثبوت چیز سے ثابت ہو یعنی کتاب اللہ سے جو چیز ثابت ہو خبر واحد سے وہ چیز اسی درجے میں ثابت کر کے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔ ورنہ قطعی الثبوت اور ظنی الثبوت میں فرق نہ رہے گا۔ اب ہم نے سوچا کیا کریں خبر واحد کو بالکل چھوڑ بھی نہیں سکتے ہیں اس لئے جمع کریں گے کہ کتاب اللہ سے جو ثابت ہے وہ فرض ہے اور خبر واحد سے جو ثابت ہے وہ واجب یا مستحب ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ سورت فاتحہ متعین طور پر واجب ہے، حدیث کی وجہ سے، اور مطلق قرأت فرض ہے قرآن کی وجہ سے جب یہ تطبیق کی جائے تو باب کی حدیث نہ مہمل رہے گی اور نہ اس میں تأویل کی ضرورت پڑے گی۔

لاصلاة الخ میں لانفی کمال کے لئے بھی لی جاسکتی ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں تأویل کی ضرورت نہیں کیونکہ حدیث ظنی الثبوت پہلے سے ہے اب اگر لاصلاۃ میں بھی مجازی معنے مراد لیا جائے یعنی نفی کمال تو یہ حدیث ظنی الدلالۃ بھی بن جائے گی اور ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ سے وجوب بھی ثابت نہ ہوگا اس لئے ہمارا مذہب بھی ثابت نہ ہوگا اس لئے یہاں نفی ذات کی ہے اور "تنزيل الناقص بمنزلة المعدوم" کے ہے کہ جب فاتحہ نہ پڑھی تو نماز ناقص ہے اور واجب الاعادہ ہے اس لئے یہ تنزیل الناقص بمنزلہ معدوم کے ہے تو نتیجے کے اعتبار سے اس بات میں جمہور اور احناف کا اختلاف نہیں رہتا کوئی فاتحہ نہ پڑھے تو احناف کے ہاں بھی واجب الاعادہ ہے ترک واجب کی وجہ سے اور جمہور کے ہاں بھی واجب الاعادہ ہے مگر ترک فرض کی وجہ سے۔

ایک روایت میں ہے کہ جس نے فاتحہ نہیں پڑھی "فصلاته خداج" اس سے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے جو گزر چکا ہے
دوسری بات: روایت ہے "لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب" دوسری صحیح مسلم کی روایت ہے ابوموسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے "اذا کبر فکبروا واذا رکع فارکعوا اذا سجد فاسجدوا واذا قرأ فانصتوا" مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ سے شاگرد نے پوچھا کہ یہ صحیح ہے انہوں نے فرمایا ہاں دوسری روایت بھی صحیح یا حسن ہے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے "من کان له امام فقراء ة الامام له قرأة" اب ایک صورت یہ ہے کہ کہو کہ ان احادیث میں تعارض ہے آخری دو سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی پر قرأت نہیں اور باب کی حدیث کو عام لو تو مقتدی پر بھی قرأت ہے تو اس صورت میں تعارض ہوگا یا یہ تاویل کرو کہ حدیث اول منفرد پر محمول ہے اور دوسری دو روایات کا تعلق جماعت سے ہے اس صورت میں سب پر عمل ہو جائے گا۔
تیسری بات: فصل الخطاب میں مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے علمی بحث لکھی ہے کہ قرأت، مسح اور وتر کے الفاظ لغوی معنے کے اعتبار سے متعدی ہوتے ہیں بغیر واسطے کے جیسے قرأت الکتاب، مسحت الرأس، مگر شریعت نے ان الفاظ کو ایک خاص معنے کے اندر استعمال کیا، اب جہاں شرعی اصطلاح میں استعمال ہوتے ہیں وہاں یہ حرف جر کے واسطے سے متعدی ہوتے ہیں جیسے کہا "لاصلاة الابفاتحة الکتاب" فاتحۃ الکتاب نہیں کہا اس سے معلوم ہوتا ہے دونوں استعمالوں میں فرق ہے وہ یہ کہ قرأت کا لفظ متعدی بنفسہ ہو تو مفعول کل مفعول ہوتا ہے۔ مفعولیت میں کوئی اور شریک نہیں ہوتا جیسے قرأتُ یٰسین میں "میں نے صرف سورت یاسین پڑھی"، لیکن جب حرف جر کے واسطے سے متعدی کرو تو وہ مفعول کل مفعول نہیں ہوتا بلکہ مفعولیت میں کوئی اور بھی شریک ہوتا ہے اب حدیث کو دیکھو تو با کے ساتھ متعدی ہے اس میں بھی یہی معنی ہے کہ لم یقرأ کا مفعول صرف فاتحۃ الکتاب نہیں بلکہ اور بھی کوئی چیز ہے جو مفعولیت میں شریک ہے، جس کی دوسری جگہ تفصیل موجود ہے کہ "لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب فصاعداً"، بعض میں ہے "وسورة"، بعض میں ہے "وزائداً" اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جس نے سورت فاتحہ اور ساتھ میں کوئی اور قرأت نہ کی یعنی مطلق قرأت نہ کی تو اس کی نماز ہی نہیں اور احناف کا مسلک بھی یہی ہے۔

باب ماجاء فی التامین

وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین اور اس کے بعد آمین کہا۔ اور اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچا اور اونچی آواز سے پڑھا۔
علقمہ بن وائل کی سند سے دوسری حدیث نقل کی ہے اس میں ہے کہ آپ نے غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین پڑھی آمین کہا اور آواز کو پست کیا۔
پہلی بات: معارف السنن اور دوسری شروح میں ہے کہ امین کا تلفظ مد اور تخفیف کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی آمین۔ بعض حضرات نے ایک لغت بغیر مد کے تشدید کے ساتھ یعنی امّین بھی نقل کیا ہے مگر یہ لغت شاذہ ہے۔
دوسری بات: اس کا معنی کیا ہے؟ تو معارف السنن میں ہے کہ بعض شارحین نے اس کا معنی کیا ہے "یا اللہ استجب دعاءنا" بعض نے معنی کیا ہے "فلیکن کذلک" کیونکہ جب دعا کی تو آمین کہا کہ اے اللہ جو دعا جس طرح مانگی ہے اسی طرح قبول کر، دونوں معنوں کا مقصود ایک ہی ہے کہ اللہ سے فاتحہ میں دعا کی آمین اس کے بعد مستقل دعا ہے، کہ فاتحہ کے اندر جو دعا کی وہ قبول فرما۔
تیسری بات: باب کی حدیث سے دو مسئلوں کا تعلق ہے۔ پہلا مسئلہ آمین کہنا امام اور مقتدی دونوں کا وظیفہ ہے یا صرف مقتدی

کا یا صرف امام کا وظیفہ ہے یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے، مشہور قول میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ آمین کہنا مقتدی اور امام دونوں کا وظیفہ ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول جو حسن بن زیاد نے نقل کیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے ابن القاسم نے نقل کیا ہے کہ آمین کہنا مقتدی کا وظیفہ ہے امام کا وظیفہ نہیں۔ اگلے باب میں روایت آئے گی کہ "اذا امن الامام فامنوا" یہ جمہور کی متدل ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام بھی آمین کہے گا یہ روایت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف ہے۔

دوسرا مسئلہ جس کا باب کی حدیث سے تعلق ہے وہ آمین بالسر یا بالجہر ہے۔ کہ امام کے ساتھ مقتدی کھڑا ہو وہ آمین جھراً کہے گا یا سراً۔ اس میں اختلاف ہے مگر اختلاف سے پہلے سمجھ لو کہ مجموع الفتاویٰ میں ابن تیمیہ نے لکھا ہے اور ابن قیم نے بھی لکھا ہے کہ آمین کے بارے میں جو اختلاف ہے یہ اختلاف مباح کے قبیل سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طریقے جائز ہیں بغیر کراہت کے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان میں سے افضل طریقہ کیا ہے اختلاف مباح کا یہ مطلب ہے۔

اختلاف: ایک قول اس میں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، فقہائے کوفہ یعنی الثوری، ابن ابی لیلیٰ، صاحبین، ابراہیم نخعی، علقمہ، اسود، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ یہ حضرات اس کے قائل ہیں کہ آمین بالسر اولیٰ ہے یہ مالک کا قول بھی ہے جو مدونۃ الکبریٰ میں منقول ہے۔

دوسرا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں آمین بالجہر افضل ہے، تیسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان سے دو قول منقول ہیں۔

❶ آمین بالجہر افضل ہے یہ ان کا قول ہے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

❷ امام آمین بالجہر کہے گا اور مقتدی آمین بالسر کہے گا یہ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جدید ہے۔ مگر ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ عام شوافع قول قدیم کو ترجیح دیتے ہیں۔

چوتھی بات: ائمہ کے مستدلات کیا ہیں؟ دلائل کے متعلق ایک بات سمجھ لو کہ ترمذی کے قول کے مطابق تین احادیث ہیں جو آمین بالجہر کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایک باب کی حدیث ہے وائل بن حجر کی دوسری دو ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہیں جو مافی الباب ہیں۔ دوسری دو احادیث سنداً ضعیف ہیں کیونکہ ان میں اسحٰق بن ابراہیم الزبیدی راوی ہیں بعض نے اس کو کذاب بھی لکھا ہے۔ باقی وائل بن حجر کی روایت دو طریقوں سے منقول ہے۔

❶ "سفیان الثوری عن سلمة بن كهيل عن حجر بن العنبس عن وائل بن حجر" اس میں الفاظ میں "قال آمين ومد بها صوته" اس طریق سے آمین بالجہر کا ثبوت ہوتا ہے اگرچہ احناف نے "مد" میں تاویل کی ہے لیکن بعض طرق میں "رفع بها صوته" کے الفاظ ہیں اس لئے تاویل صحیح نہیں۔

❷ "شعبة عن سلمة بن كهيل عن حجر ابى العنبس عن علقمة بن وائل عن أبيه" تو فرق یہ ہوا کہ پہلے سند میں حجر نقل کر رہا تھا بلا واسطہ وائل بن حجر صحابی سے، جبکہ دوسری سند میں حجر نقل کرتے ہیں علقمہ کے واسطے سے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلے سند میں تھا حجر بن العنبس جبکہ دوسری روایت میں حجر ابی العنبس ہے تیسرا فرق یہ ہے کہ دوسرے سند میں شعبہ نے الفاظ نقل کئے ہیں "قال آمين وخفض بها صوته" اس لفظ سے آمین بالسر کا ثبوت ہوتا ہے۔

ترمذی نے بخاری کا قول نقل کر کے شعبہ والے طریق پر تین اعتراض نقل کئے ہیں کہ شعبہ سے اس میں تین غلطیاں ہوئی ہیں۔

پہلی غلطی یہ ہے کہ صحیح نام حجر ابن العنبس ہے جس طرح سفیان نے نقل کیا جبکہ شعبہ نے حجر ابی العنبس نقل کیا ہے دوسری غلطی یہ ہے کہ حجر اور وائل کے درمیان واسطہ نہ تھا جبکہ شعبہ نے علقمہ کا واسطہ ذکر کردیا۔

تیسری غلطی یہ ہوئی کہ صحیح الفاظ "مدبها صوته" ہیں شعبہ نے غلطی کی کہ "خفض بها صوته" کے الفاظ نقل کردیئے۔

چوتھا اعتراض: ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے علل کبریٰ میں نقل کیا ہے کہ علقمہ کا سماع وائل بن حجر سے ثابت نہیں اس لئے شعبہ والی سند منقطع ہے۔

پانچواں اعتراض: ابن عبدالهادی نے اپنی کتاب التنقیح میں ذکر کیا ہے کہ شعبہ سے سفیان کی طرح مدبها صوته کے الفاظ موجود ہیں ان پانچ اعتراضات کی وجہ سے سفیان کا قول راجح ہے اور چھٹی وجہ یہ ہے کہ شعبہ کا اپنا قول ہے کہ "سفیان احفظ منی"

اب احناف کہتے ہیں کہ پہلا اعتراض آپ نے یہ کیا کہ صحیح حجر بن عنبس ہے شعبہ نے حجر ابی العنبس کہدیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں صحیح ہیں، کیونکہ حجر کے باپ اور بیٹے دونوں کا نام عنبس ہے چنانچہ خود سفیان کی سند ہے اس میں ہے "عن سلمة بن كهيل عن حجر ابن العنبس وهوابوالعنبس"۔

دوسرا اعتراض تھا کہ وائل ابن حجر کے درمیان شعبہ نے علقمہ کا اضافہ کیا، زیلعی نے نصب الرایہ میں سنن بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث مجھے علقمہ بن وائل نے بیان کی اور میں نے خود بھی وائل بن حجر سے سنی۔ اس لئے کبھی واسطہ لایا کبھی بغیر واسطے کے لایا، اس لئے اعتراض کی بات نہیں۔

تیسرا اعتراض جو علل کبریٰ میں تھا کہ علقمہ کا سماع اپنے والد وائل سے ثابت نہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کیونکہ کئی روایات میں سماع کی تصریح موجود ہے کہ "سمعت أبی" اصل بات یہ ہے کہ علقمہ کا بھائی تھا عبدالجبار اس کے سماع میں علماء کا اختلاف تھا وہاں بھی صحیح یہ ہے کہ ان کی پیدائش والد کی وفات سے پہلے ہوئی تھی مگر بہت کم عمر تھے، اس لئے ان کے بارے میں تو اختلاف ہے مگر علقمہ کا سماع بالاتفاق ثابت ہے۔

چوتھا اعتراض یہ تھا کہ شعبہ سے مدبها صوته کے الفاظ بھی منقول ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ سفیان الثوری نے بھی "خفض بها صوته" کے الفاظ لائے ہیں بلکہ سفیان کا اپنا مسلک بھی آمین بالسر کا ہے۔

پانچواں اعتراض یہ تھا کہ شعبہ نے غلطی کی کہ صحیح الفاظ "مدبها صوته" کے ہیں "خفض بها صوته" کے الفاظ غلط ہیں مگر یہ محض دعویٰ ہے اس پر دلیل نہیں ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل الفاظ "خفض بها صوته" کے تھے ابوسفیان نے غلطی کی اور "مدبها صوته" کہدیا۔

چھٹا اعتراض تھا کہ شعبہ کہتے ہیں کہ "سفیان احفظ منی" اس کا جواب یہ ہے کہ سفیان کا قول بھی ہے کہ شعبہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں۔

اب صحیح بات یہ ہے کہ جو صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ اگر میری بات کوئی مانے تو دونوں الفاظ صحیح ہیں۔ جہر بھی منقول ہے مگر جہر زیادہ نہ تھا بلکہ کچھ اخفا بھی تھا۔ خفض سے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے اس لئے معاملہ بین بین کا تھا اس لئے قریب والوں نے رفع کہدیا، اور دور والوں نے خفض کہدیا، دلیل اس کی یہ ہے کہ وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود کہتے ہیں کہ میں نے آمین سنا کیونکہ میں قریب تھا۔

احناف جو آمین بالسر کو افضل کہتے ہیں کہ علامہ ماردینی نے الجوہر النقی میں لکھا ہے کہ دونوں قسم کی روایات میں کسی کا انکار ممکن نہیں مگر اکثر صحابہ وتابعین آمین بالسر کے قائل تھے۔ تو اس تعامل کی وجہ سے احناف نے آمین بالسر کو افضل قرار دیا، تو خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ میں اختلاف صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ کا تھا مگر آج کل لوگوں نے اس کو نزاع کا باعث بنادیا۔

"فقال حدیث سفیان فی هذا أصح" اصح اسم تفضیل ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیان کی حدیث اَصح ہے تو شعبہ کی صحیح ہوگی دوسرا ابن جریری طبری رحمۃ اللہ تعالیٰ اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو مساوی قرار دیا ہے۔

باب ماجاء فی فضل التامین

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

پہلی بات: امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو آمین کی فضیلت کے اظہار کے لئے ذکر کیا ہے اور باب کی حدیث جس مقصد کے لئے لائی ہے وہ اس پر پوری دلالت کرتی ہے کیونکہ "غفر لهٗ ماتقدم من ذنبه" میں آمین کی فضیلت بالکل واضح ہے۔

دوسری بات: یہ حدیث آمین کی فضیلت کے لئے لائی ہے اور آمین کی فضیلت کوئی فقہی مسئلہ نہیں اس لئے تمام کا اتفاق ہے کہ آمین کو جو سنت کے مطابق کہے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوگی۔

تیسری بات: امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو صحیح بخاری میں نقل کر کے اس سے آمین بالجہر پر استدلال کیا ہے شاہ صاحب کا قول معارف السنن میں ہے کہ بخاری کا طریقہ استدلال اس طرح ہے کہ جب امام آمین کہے تو مقتدیوں کو حکم ہے کہ تم بھی آمین کہو۔ اب امام کے آمین کا علم مقتدیوں کو تب ہوگا جب امام جہراً آمین کہے، پھر مقتدیوں کی آمین اس پر متفرع ہوگی لیکن امام آہستہ آمین کہے تو مقتدیوں کو علم نہ ہوگا پھر ان کا فأمنوا کا حکم صحیح نہ ہوگا اس استدلال کے متعلق معارف السنن میں علامہ عینی کے حوالے سے منقول ہے کہ اس حدیث سے آمین بالجہر کا استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا مفہوم دوسری حدیث سے واضح ہوتا ہے وہ حدیث ہے "اذا قال الامام غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا آمین" اس حدیث سے "اذا امن الامام" کا مطلب واضح ہوتا ہے کیونکہ اس حدیث میں آمین کا مقام بتایا ہے اور "اذا أمن الامام" کا بھی یہی معنی ہے کہ جب آمین کہنے کا مقام آجائے تو آمین کہو اور امام کے آمین کہنے کا وقت وہ ہے جو دوسری حدیث میں ہے۔

چوتھی بات: حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اس حدیث سے عدم القراۃ خلف الامام پر استدلال کیا ہے کیونکہ مقتدی کے ذمے قرأت ہوتی تو یہ نہ کہتے کہ امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو بلکہ کہتے کہ جب ولا الضالین کہو تو، اس وقت آمین کہو جس طرح امام کو حکم ہے کہ جب قراۃ فاتحہ ختم کرو تو آمین کہو۔

پانچویں بات: باب کی حدیث میں فرمایا "فمن وافق تامینه تامین الملائکة" اب عرض یہ ہے کہ موافقت سے کیا مراد ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ دو مراد ہیں ① موافقت فی التکلم مراد ہے چونکہ فرشتوں کے اعمال مقبول ہوتے ہیں جب تکلم میں اس کا عمل ان کے عمل کے موافق ہو تو گناہ معاف ہو جائیں گے ② موافقت سے موافقت فی الاخلاص مراد ہے کہ اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کسی کی آمین فرشتوں کے موافق ہو جائے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

چھٹی بات: باب کی حدیث میں ہے "غفر لهٗ ماتقدم من ذنبه" پہلے گذر چکا ہے کہ بعض احادیث میں اعمال کو ذنوب کے معاف ہونے کا ذریعہ بتایا گیا ہے تو فرماتے ہیں کہ اگر ذنوب حقوق العباد کے قبیل سے ہوں تو اعمال ان کے لئے کفارہ نہیں جب تک کہ صاحب حق سے معاف نہ کرائے یا حق ادا نہ کردے باقی رہ گئے حقوق اللہ وہ دو قسم پر ہیں ① کبائر ② صغائر۔ تو فرماتے ہیں کہ اعمال فقط صغائر کیلئے کفارہ ہیں کبائر کیلئے کفارہ نہیں یعنی کبائر معاف نہیں ہونگے اور جس کے صغائر بالکل نہ ہوں تو اعمال سے ان کے کبائر میں

ضعف پیدا ہوگا اور جس کے نہ صغائر ہوں اور نہ کبائر ہوں تو اعمال ان کے لئے رفع الدرجات کا سبب بنیں گے۔ ''آمین'' ایک قول کے مطابق سریانی لفظ ہے اور اس کا معنی ہے یا اللہ استجب دعاء نا یافلیکن کذالک کے معنی میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عبرانی زبانی کا لفظ ہے اور معنی وہی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ فارسی کا لفظ ہے اصل فارسی میں ''ہمین'' کا لفظ تھا عربی میں لاکر آمین بنادیا گیا اور اس کا معنی وہی ہے جو فارسی میں ہمین کا ہے۔

ساتویں بات: اذا امن الامام فأمنوا یہ جمہور کی مستدل ہے کہ آمین مقتدی اور امام دونوں کا وظیفہ ہے اور یہ روایت رد ہے امام مالک پر کیونکہ ان کے ہاں آمین صرف امام کا وظیفہ ہے۔

صاحب البحر ابن نجیم نے لکھا ہے کہ یہ روایت مقتدیوں کی آمین کیلئے عبارۃ النص ہے اور امام کے آمین کہنے کیلئے اشارۃ النص ہے۔

باب ماجاء فی السکتتین

دوسکتوں کے بارے میں جو احادیث ہیں ان کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

پہلی بات: سکتات سے کیا مراد ہے؟ معارف السنن میں مولانا انور شاہ کشمیری صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ احناف کے ہاں تین سکتے مستحب ہیں ① تکبیر تحریمہ کے بعد افتتاح قراۃ سے پہلے ② سورت فاتحہ کے اختتام کے بعد آمین بالسر کہنے کیلئے ③ قراۃ سے فراغت کے بعد رکوع کی تکبیر کہنے سے پہلے سکتہ کرے قرات اور تکبیر رکوع میں وصل نہ کرے آگے معارف السنن میں ہے کہ اس ترتیب کے ساتھ ہماری فقہ کی کتابوں میں ان سکتات کے استحباب کا ذکر نہیں جس طرح انور شاہ صاحب نے بیان کیا۔

دوسری بات: نووی نے ''التبیان فی آداب حملة القرآن'' میں لکھا ہے کہ امام شافعی کے ہاں چار سکتات مستحب ہیں ① تکبیر تحریمہ کے بعد افتتاح قرأت سے پہلے ② سورت فاتحہ کے اختتام پر مختصر سکتہ کرے ③ آمین بالجہر کے بعد طویل سکتہ کرے تا کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں امام اس وقت آیت قرآن میں تدبر یا ذکر کرے ④ تکبیر رکوع سے پہلے سکتہ کرے۔

تیسری بات: پہلا سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد ہے یہ سکتہ جمہور یعنی امام اعظم شافعی امام احمد اور باقی تمام حضرات کے ہاں یہ سکتہ دعائے افتتاح کیلئے ہے مالک کا مسلک گذر چکا ہے کہ ان کے ہاں تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے استفتاح نہیں اس لئے انکے ہاں یہ سکتہ نہیں ابن رشد نے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا نام لیا ہے اور کہا ہے کہ انکے ہاں کوئی سکتہ نہیں مگر معارف السنن میں ہے کہ ابن رشد کی بات غلط ہے پہلے سکتے میں مالک کے علاوہ سب کا اتفاق ہے باب کی حدیث میں دوسکتوں کا ذکر ہے ① تکبیر افتتاح کے بعد ② قرات فاتحہ کے بعد۔

چوتھی بات: حدیث میں جو دوسرا سکتہ ہے یہ احناف کی مؤید ہے کہ یہ دوسرا سکتہ آمین بالسر کیلئے تھا۔

پانچویں بات: احناف نے لکھا ہے کہ قرات کا اختتام اللہ کے اسماء میں سے کسی اسم پر ہو تو قرات کو تکبیر رکوع کے ساتھ وصل کر کے پڑھنا افضل ہے مگر اختتام اللہ کے اسماء میں سے کسی اسم پر نہ ہو تو تکبیر رکوع کے درمیان سکتہ کرنا اولی وافضل ہے۔

باب ماجاء فی وضع الیمین علی الشمال فی الصلاۃ

قبیصۃ بن ھلب اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمیں امامت کراتے تو نمازوں کے دوران بائیں ہاتھ کو پکڑ لیا کرتے تھے دائیں ہاتھ سے (ھلب کا نام یزید بن قنافہ الطائی ہے)۔

مقصد حدیث: اس حدیث کا تعلق وضع الیمین علی الشمال کے ساتھ ہے کہ نمازی قیام کی حالت میں ہو تو کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے لیکن شارحین عام طور پر یہاں تین مسئلے ذکر کرتے ہیں ① یہ مسئلہ جس کے لئے مصنف حدیث لائے ہیں

کہ نماز کے اندر قیام میں ہاتھوں میں ارسال کرے یا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے اوپر رکھے ② دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مقام وضع کیا ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر جب رکھے گا تو ان کو کہاں رکھے گا تحت السرۃ یا فوق السرۃ یا فوق الصدر رکھنا مستحب ہے ③ تیسرا مسئلہ ہے کیفیت وضع کا کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کس رکھے یعنی اس کی مسنون کیفیت کیا ہے۔

پہلا مسئلہ: پہلے مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے امام اعظم امام احمد اور امام اسحاق ایک قول میں امام مالک اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ قیام کی حالت میں مسنون کیفیت وضع الید علی الید کی ہے دوسرا قول صحابہ میں سے ابن زبیر تابعین میں سے حسن بصری ابن سیرین اور ائمہ میں سے امام مالک سے منقول ہے کہ حالت قیام میں ارسال کی کیفیت مسنون ہے کہ دونوں ہاتھ باندھنے کے بجائے کھلے چھوڑ دے امام مالک کا قول ابن القاسم نے نقل کیا ہے تیسرا قول امام اوزاعی کا ہے ان کے ہاں اختیار ہے چاہے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑے اور چاہے ارسال کردے۔ چوتھا قول امام مالک سے منقول ہے کہ اصل صورت تو ارسال کی ہے مگر طویل قیام کی وجہ سے اگر ارسال میں تکلیف ہو تو ضرورت کی بناء پر وضع الید علی الید کی کیفیت اختیار کرسکتا ہے جمہور کی ادلہ کے بارے میں معارف السنن میں ہے کہ کل بیس روایات ہیں اٹھارہ مرفوع ہیں دو مرسل ہیں، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے موطا میں بھی وضع الید علی الید کی روایت نقل کی ہے جبکہ ارسال کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں۔

دوسرا مسئلہ: وضع الید علی الید کا مقام کونسا ہے اس میں بھی اقوال ہیں پہلا قول امام اعظم ،فقہائے کوفہ، سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحیح قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ اس کا مقام تحت السرہ ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ رکھنا مستحب ہے۔ دوسرا قول شوافع کا ہے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کئی اقوال منقول ہیں ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ تحت الصدر اور فوق السرہ ہاتھ رکھے داؤد ظاہری سے علی الصدر کا قول بھی ہے۔ معارف السنن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ وضع کی جو احادیث ہیں یعنی جو بیس احادیث ہیں ان میں سے اکثر احادیث مقام وضع سے ساکت ہیں مقام وضع کی تصریح صرف دو احادیث میں ہے ایک وائل ابن حجر کی روایت میں اور یہ تین طریقے سے منقول ہے۔ ① صحیح ابن خزیمہ میں وائل کی حدیث کی سند مؤمل بن اسماعیل عن سفیان الثوری عن عاصم بن کلیب عن وائل بن حجر ہے اس میں ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی آپ کو دیکھا کہ آپ نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا اور سینے پر رکھا۔ ② مؤمل بن اسماعیل کی سند سے یہ حدیث مسند بزار میں ہے اس میں الفاظ ہیں "عند صدرہ" ③ علامہ قاسم نے لکھا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ روایت ہے اس میں الفاظ ہیں "تحت سرتہ"

اب احناف کہتے ہیں کہ "علی صدرہ" کے الفاظ صحیح بھی ہوں تو شوافع کے مسلک کے مطابق نہیں کیونکہ ان کا صحیح مسلک تحت الصدر کا ہے۔ البتہ مسند بزار کی روایت کے الفاظ "عند صدرہ" شوافع کے مؤید ہیں معارف السنن میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مؤمل بن اسماعیل کے علاوہ سفیان سے دس آدمی بھی نقل کرتے ہیں جو مؤمل سے زیادہ ثقہ ہیں ان میں سے کوئی بھی عند صدرہ یا تحت السرہ یا فوق السرۃ کے الفاظ نقل نہیں کرتے اس لئے یہ الفاظ مؤمل بن اسماعیل کی غلطی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آخری عمر میں ان کے مناکیر کی کثرت ہوگئی تھی اور بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ان کو منکر الحدیث بھی کہتے ہیں۔ یہ ان کے ہاں سخت ترین جرح ہے بعض نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں حافظے سے روایت کرتا تھا اور اختلاط واقع ہوتا تھا۔ تیسرا جواب ابن حجر نے فتح الباری (۲۰۶/۹) میں لکھا ہے کہ مؤمل بن اسماعیل عن سفیان یہ سند ضعیف ہے خلاصہ یہ ہے کہ روایت تین وجوہ سے قابل استدلال نہیں ① دوسرے دس شاگرد مؤمل کے علاوہ مقام وضع کا ذکر نہیں کرتے ② مؤمل آخری عمر میں مناکیر احادیث نقل کرتے تھے اس لئے ان کو منکر الحدیث کہا گیا ③ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس حدیث کی سند بھی ضعیف ہے۔

دوسری روایت حضرت ھلب کی ہے اس میں الفاظ ہیں "رأیت یضع ھذا علی صدرہ" اس کے متعلق معارف السنن میں ہے کہ اس روایت میں سماک بن حرب ہے اس کو محدثین لین کہتے ہیں۔ دوسرا صحیح روایات میں اس کے صرف اتنے الفاظ ہیں "فیضع ھذہ علی ھذہ" اور وہاں مقام وضع کا ذکر نہیں۔

احناف تحت السرہ کو جو افضل کہتے ہیں کہ اس کی وجہ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے کہ "ان من السنة وضع الکف علی الکف تحت السرة" دوسری وجہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا اثر ہے اور تیسری وجہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے یہ سارے آثار سنداً صحیح ہیں خصوصاً علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر مرفوع کے حکم میں ہے یہ یاد رکھو! کہ یہ اختلاف اختلاف مباح کے قبیل سے ہے اس لئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ائمہ کے ہاں اس میں وسعت ہے جہاں ہاتھ رکھے سنت ادا ہو جائے گی۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بعض محدثین کہتے ہیں کہ وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں اضطراب ہے۔ علی صدرہ، عند صدرہ، اور تحت السرہ کے الفاظ ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ اضطراب نہیں بلکہ یہ اقوال تقریر ہیں، اصل واقعہ یہ تھا کہ وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی ﷺ کے پاس آئے تو سنن نسائی میں آمین بالجہر کے بارے میں ہے کہ ان کے پیچھے تھا اور ان سے آمین سنا، اس حدیث میں ہے کہ سردی کا زمانہ تھا کمبل اوڑھے ہوئے تھے، تو وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے بھی پیچھے اور آپ ﷺ کے ہاتھ بھی کمبل میں تھے اس لئے ان کے الفاظ تقریری ہیں یعنی گمان کے مطابق کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے یہاں رکھے ہوں یا یہاں رکھے ہوں۔

تیسرا مسئلہ: وضع الید علی الید کی مسنون کیفیت کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ کف علی الرسغ ہو۔ اب عام احادیث میں اخذ کا ذکر ہے اس لئے اس طرح ہاتھ رکھے کہ اس میں اخذ کی کیفیت آجائے بعض نے کہا کہ اخذ کا لفظ بھی ہے اور وضع کا بھی ہے تو دونوں کو جمع کرے اس طرح کہ انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے اخذ کرے، اور باقی انگلیاں اوپر رکھی ہوں، مگر عام شوافع اور احناف نے اخذ والی کیفیت کو اولیٰ لکھا ہے۔

باب ماجاء فی التکبیر عند الرکوع والسجود

اس میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہر خفض اور رفع میں قیام وقعود کی طرف تکبیر کہتے تھے اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی عمل تھا۔ دوسری روایت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ سجدے کی طرف جاتے تو تکبیر کہتے۔

پہلی بات: ایک رکن سے دوسرے رکن اور ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہوتے وقت تکبیر پڑھنا منقول ہے یا نہیں فقہاء کی اصطلاح میں ان کو تکبیرات انتقالات کہتے ہیں۔

دوسری بات: ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ ہر خفض ورفع یعنی جب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوں گے تو تکبیر کہی جائے گی، سوائے رکوع سے اٹھتے وقت کیونکہ اس میں "سمع اللہ لمن حمدہ" کہا جاتا ہے خلفائے بنوامیہ میں سے بعض خلفاء، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ "کانوا لایتمون التکبیر" عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ پہلے یہ طریقہ انہوں نے شروع کیا بعض نے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے بعض نے زیاد کی طرف منسوب کیا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بوڑھے ہو گئے تو اوپر

سے نیچے جاتے وقت جہراً تکبیر نہ کہتے تھے کیوں کہ اس وقت لوگ کیفیت دیکھ سکتے تھے لیکن نیچے سے اوپر جاتے وقت علم نہیں ہوتا تھا اس لئے اس وقت زور سے کہتے مگر بعد والے خلف نے ان کی اقتداء کی اور سمجھے کہ وہ بالکل نہ کہتے تھے بعض نے کہا ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف یہ نسبت غلط ہے وہ اس کے قائل تھے بہر حال اب سب کے ہاں تکبیرات انتقالات ثابت ہیں۔

باب رفع الیدین عند الرکوع

سالم اپنے والد ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب وہ نماز کی ابتداء کرتے تو ہاتھ اٹھاتے یہاں تک کہ ہاتھ کندھوں کے برابر ہوتے اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی حدیث میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بین السجدتین ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ دوسری روایت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھاؤں پھر نماز پڑھائی اور پہلی مرتبہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔

پہلی بات: اس باب میں رفع الیدین عند الرکوع وعند رفع الرأس من الرکوع کے متعلق مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات: رفع الیدین کا حکم کیا ہے؟ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ رفع الیدین کا فقہی حکم یہ ہے کہ عام فقہاء اور محدثین کے ہاں رفع الیدین کا حکم استحباب کا ہے۔ عند الافتتاح بھی مستحب ہے اور جن کے ہاں رفع الیدین رکوع کے وقت بھی ہے ان کے ہاں بھی مستحب ہے بعض احناف کے ہاں جیسے صاحب منیۃ المصلی وغیرہ نے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کو مکروہات میں نقل کیا ہے اور بعض احناف نے تو اس کو مفسدات صلوٰۃ میں ذکر کیا ہے اس کے مقابلے میں بعض حضرات جیسے ابن خزیمہ وغیرہ ان کے ہاں تکبیر تحریمہ کے وقت یا رکوع کے وقت یا رکوع کے بعد تینوں جگہوں میں رفع الیدین کا حکم استحبابی ہے جنہوں نے رکوع کے وقت رفع الیدین کو مکروہ یا مفسد صلوٰۃ یا واجب کہا ہے ان تینوں کے اقوال غلط ہیں اور افراط وتفریط پر مشتمل ہیں۔

تیسری بات: ابن تیمیہ اور بعض دوسرے فقہاء کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ رکوع میں جاتے وقت یا اٹھتے وقت رفع یدین میں جو اختلاف ہے یہ اختلاف مباح کے قبیل سے ہے خود احناف میں سے ابوبکر جصاص نے لکھا ہے کہ احکام القرآن میں ہے کہ یہ اختلاف مباح کے قبیل سے ہے یعنی اولیٰ اور افضل کا اختلاف ہے کہ افضل کیا ہے۔

چوتھی بات: احادیث میں جب اس مسئلے کو تلاش کیا جائے اور احادیث کو جمع کیا جائے تو نماز میں متعدد مقام پر رفع یدین کا ثبوت ملتا ہے ① تکبیر افتتاح کے وقت رفع الیدین کا ثبوت تقریباً تمام احادیث میں ملتا ہے اس وقت تمام امت رفع یدین کے قائل ہے سوائے زیدیہ (فرقہ شیعہ) کے۔ ② ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رکوع میں جاتے وقت رفع یدین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ ③ رکوع سے اٹھتے وقت کرتے تھے ④ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کے لئے جاتے تو بعض احادیث میں رفع کا ذکر ہے ⑤ مابین السجدتین بھی نسائی کی صحیح روایت سے رفع یدین ثابت ہے۔ ⑥ دوسری رکعت کے بعد جب تیسری رکعت کے لئے آدمی اٹھتا ہے اس وقت بھی رفع یدین کا ثبوت ہے۔

پانچویں بات: تکبیر تحریمہ کے وقت جو رفع الیدین ہے اس پر ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے کہ یہ مستحب ہے۔ صرف زیدیہ کے قول میں اس وقت رفع الیدین نہیں۔ باقی سجدے میں جاتے وقت، مابین السجدتین، دوسری رکعت کا قعدہ ختم کر کے جب تیسری رکعت کی طرف اٹھے، ان تین جگہوں میں رفع یدین کے عدم استحباب پر ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے، صرف بعض شوافع جیسے بیہقی نے مابین السجدتین کے رفع کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں مگر شوافع کے قواعد کے مطابق یہاں بھی استحباب ہونا چاہیئے۔ اب وہ مقام رہ گئے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اس میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحیح تر قول کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جس کو ابن القاسم نے نقل کیا ہے اور فقہائے مالکیہ نے اس کو ترجیح بھی دی ہے اسی طرح تمام فقہائے کوفہ کا قول یہ ہے کہ ان مقامات پر رفع یدین مستحب نہیں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان دو مقامات پر بھی رفع الیدین مستحب ہے۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات نیل الفرقدین کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ اس مسئلہ میں جو احادیث ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بیہقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ رکوع میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت اس مسئلے کے بارے میں پچاس احادیث ہیں بعض نے کہا کہ پچیس ہیں مگر صحیح محقق قول یہ ہے کہ صحیح روایات جو شوافع کی مؤید ہیں اس بارے میں وہ بارہ ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صحیح تحقیق کی جائے تو قوی تر احادیث چھ رہ جاتی ہیں اسی طرح احناف و مالکیہ جو ترک رفع کے قائل ہیں ان کی تائید میں بھی صحیح طریقے سے احادیث منقول ہیں۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے کم ہیں۔ مگر دو باتوں کا لحاظ کیا جائے، وہ یہ کہ شوافع اور حنابلہ کا قول وجودی ہے وجودی کے لئے ثبوت ضروری ہے، اور احناف کا قول عدمی ہے اور عدمی کے لئے ثبوت ضروری نہیں کیونکہ عدم اصل ہے، دوسری بات یہ ہے کہ احناف کہتے ہیں کہ اس کے متعلق دو قسم کی احادیث ہیں، ایک قسم کی وہ ہیں جن میں ان دو مقامات پر عدم رفع یدین کا ذکر ہے وہ کم ہیں، لیکن وہ احادیث جو صفۃ صلاۃ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہیں وہ روایات رفع الیدین کے ذکر سے خالی ہیں، اگر ان کو بھی ملا لیا جائے کیونکہ یہ مقام، مقام بیان تھا یہاں رفع یدین کو ذکر نہیں کیا تو مقام بیان میں عدم ذکر اس کے عدم ہونے کی دلیل ہے ان روایات کو بھی اگر ملا لیا جائے تو احناف کی روایات زیادہ ہو جائیں گی۔

چھٹی بات: مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع الیدین کے مسئلے کا ثبوت بھی عملاً متواتر ہے! عینہٖ اسی طرح عدم رفع کا بھی انکار نہیں، کیونکہ وہ بھی عملاً متواتر منقول ہے اصل بات یہ ہے کہ جو عمل امت میں متواتر چلا آرہا ہے، تو ان اعمال میں اسناد سے بحث فضول ہوتی ہے کیونکہ جب عمل توارث کے ساتھ امت میں چلا آرہا ہو تو اس میں ثبوت اور عدم ثبوت کے لئے اسنادی بحث ضروری نہیں ہوتی۔ اب بات یہ ہے کہ ان میں اولیٰ کیا ہے احناف کہتے ہیں کہ عدم رفع اولیٰ ہے اور اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

❶ آپ ﷺ سے حدیث منقول ہے کہ "قوموا الله قانتين" سے پہلے صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم باتیں کرتے تھے چلتے پھرتے تھے مگر آیت اتری تو سب کچھ بند ہو گیا، یہاں سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ کا اصل مبنیٰ سکون ہے اسی طرح صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ صحابہ سلام کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا "**مالی اراکم رافعی ایدیکم کانها اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلاۃ**" اب یہاں علت بتائی کہ سکون اختیار کرو اور سکون عدم رفع میں ہے۔

❷ احادیث میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صراحت کے ساتھ اور صحیح اسانید کے ساتھ یہ منقول ہے کہ یہ لوگ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھاتے وقت رفع یدین نہ کرتے تھے۔ زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام آثار نقل کئے ہیں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عدم رفع کی بہت سے احادیث منقول ہیں۔ رفع کی کوئی حدیث منقول نہیں، باقی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جس پر شوافع اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک قائم ہے، اس میں بعض روایات میں چھ مقامات پر ثابت ہے، بعض میں دو مقامات پر ثابت ہے اس لئے ایک تو ان کی روایات میں اضطراب ہے دوسرا اس میں جہاں چھ مقامات کا ذکر ہے وہاں تم چار کو چھوڑتے ہو دو پر عمل کرتے ہو تو ان چار جگہوں میں رفع کا جو جواب دو گے۔ وہی ان دو مقامات میں ہمارا بھی جواب ہوگا۔ بلکہ مجاہد نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عدم رفع کا قول بھی نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں دونوں طریقے جائز تھے۔

ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عدم رفع الیدین والوں کا مستدل جو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے یہ ثابت

نہیں ہمارے احناف کہتے ہیں کہ تحقیقی بات یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو احادیث ہیں ایک قولی اور دوسری فعلی حدیث۔ یہاں ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو کہا کہ ابن مسعود کی روایت ثابت نہیں یہ قولی مراد ہے، باقی فعلی حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خود ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ نقل کر رہے ہیں۔ اس لئے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سنداً بالکل صحیح ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات پر اعتراضات کرتے ہیں ① عاصم بن کلیب پر کلام ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح مسلم کے راوی ہیں اس لئے ان پر کلام قابل اعتبار نہیں ② عبدالرحمٰن بن اسود کی علقمہ سے سماع ثابت نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کا سماع ثابت ہے کیونکہ یہ علقمہ کا ہم عصر ہے، اگر ثابت نہ بھی ہو تو دوسری سند ہے "عن أبي حنيفة عن حماد عن ابراهيم عن علقمة" اس سند میں نہ عاصم ہے نہ عبدالرحمٰن ہے اور یہ سند مسلسل بالفقہاء ہے اس لئے یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عاصم کی وجہ سے اس کو حدیث حسن کہا ہے لیکن حاکم نے لکھا ہے کہ جو سند مسلسل بالفقہاء ہو وہ راجح ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی وضع الیدین علی الرکبتین فی الرکوع

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رکوع کی حالت میں گھٹنوں کو پکڑنا سنت قرار دیا گیا ہے اس لئے تم رکوع کی حالت میں گھٹنوں کو پکڑا کرو۔

اختلاف: ائمہ مجتہدین کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام ائمہ اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رکوع کی حالت میں ہاتھ گھٹنوں پر اسی طرح رکھے جس طرح کسی چیز کو پکڑے ہوئے ہو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول منقول ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ علقمہ اور اسود کو نماز پڑھا رہے تھے رکوع میں انہوں نے ہاتھ رکبتین پر رکھے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اشارہ کیا کہ تطبیق کرو۔

علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ تطبیق کی دو صورتیں ہیں ① دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان رکھے، یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصح صورت ہے۔ ② دونوں ہاتھوں کے درمیان تشبیک کرے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھیں، تو سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوا کہ تطبیق کا یہ طریقہ منسوخ ہے علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ ابتداءً اہل کتاب کی موافقت کی وجہ سے اختیار کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جن امور میں وحی نہ آئی تھی اس میں اہل کتاب کے طریقے کو اختیار کرتے، اسی طرح یہاں بھی اہل کتاب کی مشابہت سے تطبیق کرتے تھے پھر وحی نے کیفیت بتا کر پہلی صورت منسوخ کر دی، یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اہل کتاب کی نماز میں رکوع بالکل نہ تھا اس لئے ان کے مشابہت کی کوئی بات نہیں بلکہ پہلے تطبیق کا طریقہ تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جیسے غیر مقلدین کہتے ہیں کہ یہ طریقہ منسوخ ہو گیا اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نسخ کا علم نہیں ہوا وہ منسوخ پر عمل کرتا رہا، اسی طرح عدم رفع یدین پہلے تھا پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرنے لگے اس لئے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رفع یدین نہ کرتے تھے تو جس طرح ابن مسعود کا تطبیق میں قول معتبر نہیں عدم رفع یدین بھی ان کا قول معتبر نہیں، اسی طرح معوذتین کو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کی سورت نہ مانتے تھے کیونکہ ان کو معلوم نہ ہوا تھا کہ یہ قرآن کی سورت ہے تو جس طرح معوذتین میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول معتبر نہیں اسی طرح عدم رفع یدین میں بھی ان کی بات معتبر نہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناسخ کا علم نہیں ہوا یہ صریح جھوٹ ہے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دونوں کا علم تھا، مگر ان کا موقف تھا کہ تطبیق اصل طریقہ ہے مگر اس میں مشقت تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

رکبتین پر ہاتھ رکھنے کی اجازت دے دی بطور رخصت کے دوسرا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کوفہ پر مسئلہ پیش کیا، اہل کوفہ نے ان کی بات آنکھ بند کر کے نہیں مانی، بلکہ علقمہ اور اسود نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نماز سیکھی تو انہوں نے بتایا کہ عام صحابہ کا عمل تطبیق کا نہ تھا اس لئے تطبیق کو نہیں لیتے، اسی طرح رفع الیدین میں بھی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو آنکھ بند کر کے نہیں لیا، بلکہ دوسرے صحابہ سے نماز سیکھی، اگر دوسرے صحابہ رفع الیدین کرتے تو علقمہ اور اسود یہاں بھی تطبیق کی طرح ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول عدم رفع کا اختیار نہ کرتے، مگر انہوں نے یہاں ان کا عدم رفع والا قول لے لیا معلوم ہوا دوسرے صحابہ سے بھی منقول ہوگا اس لئے انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو اختیار کیا اسی طرح معوذتین میں بھی صحیح قول یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو سورتیں مانتے تھے۔

باب ماجاء أنه يجافي يديه عن جنبيه في الركوع

پہلی بات: ابوحمید ساعدی کی حدیث بہت طویل حدیث ہے، جس میں پوری طرح نماز کا پورا طریقہ منقول ہے، صفۃ الصلاۃ میں محدثین اس کو مکمل ذکر کرتے ہیں یہاں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک ٹکڑا نقل کیا ہے آگے صفۃ الصلاۃ میں مکمل حدیث آئے گی، اس حدیث پر کلام ہے خصوصاً احناف کے شارحین نے اس پر کلام کیا ہے تفصیل آگے آئے گی۔

دوسری بات: "فوضع يديه على ركبتيه كانه قابض عليهما" اس حدیث میں کیفیت وضع بتائی ہے کہ رکوع میں ہاتھ گھٹنوں پر کس طرح رکھے تو بتایا کہ وہ طریقہ ہے کہ ہاتھ اس طرح رکھے جس طرح کسی چیز کو پکڑے ہوئے ہوں۔

تیسری بات: "ووتر يديه فنحاهما عن جنبيه" وہ آلہ جس کے ذریعے تیر پھینکتے ہیں یعنی (کمان) اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک تو وہ ٹیڑھی لکڑی اور دوسرا اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چمڑے کا تسمہ (دھاگہ) لگا ہوتا ہے وہ دھاگہ وتر کہلاتا ہے اسی طرح دھاگے پر تیر رکھا جاتا ہے تو یہاں مطلب یہ ہے کہ رکوع کی حالت میں کمر اس لکڑی کی طرح جھک جاتی ہے اور ہاتھوں کو رکبتین پر رکھے تو وہ وتر کی طرح محسوس ہوتے ہیں مطلب یہ بیان کرنا ہے کہ ہاتھ دور تھے بدن کے ساتھ چمٹے ہوئے نہ تھے۔

چوتھی بات: یہ طریقہ کہ ہاتھوں کو جنبین سے دور رکھے یعنی تجافی یہ تمام ائمہ کے ہاں مسنون ہے اور مستحب ہے اور ہاتھوں کو جنبین کے ساتھ ملا کر رکوع کرنا مکروہ ہے۔

باب ماجاء في التسبيح في الركوع والسجود

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی رکوع کرے اور تین دفعہ سبحان ربی العظیم پڑھے تو اس کا رکوع تام ہو جائے گا، یہ ادنیٰ درجہ ہے، اور جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو سجدے میں سبحان ربی الأعلیٰ تین مرتبہ پڑھے تو اس کا سجدہ مکمل ہو جائے گا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔

پہلی بات: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ جب "فسبح باسم ربك العظيم" آیت اتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اجعلوها في ركوعكم" اور جب "سبح اسم ربك الاعلى" اتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اجعلوها في سجودكم" تو اس کے بعد صحابہ کا اس پر عمل جاری رہا کہ رکوع میں اور سجدے میں یہ پڑھتے رہے۔

دوسری بات: فرمایا تین دفعہ تسبیحات پڑھو تو رکوع اور سجدہ تام ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ رکوع کرنا فرض ہے سبحان اللہ کی بقدر طمانینت فرض ہے اور تسبیح پڑھنا نہ فرض ہے اور نہ واجب ہے بلکہ جمہور کے ہاں مستحب ہے۔

تیسری بات: تین دفعہ پڑھنے کے بارے میں فرمایا "ذالک ادناه" تو احناف کے ہاں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ادنیٰ مقدار استحباب ہے ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ امام کے لئے پانچ دفعہ پڑھنا مستحب ہے، تا کہ مقتدی تین دفعہ ادا

کر سکے، احناف کہتے ہیں کہ اگر اکیلے نماز پڑھ رہا ہو تو جتنی مرتبہ پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ اختتام وتر پر ہو لیکن اگر کوئی امام ہو تو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ نہ پڑھے تاکہ مقتدیوں کے لئے یہ ثقیل نہ ہو باقی اگر امام پہلے جاتا ہے تو اٹھتا بھی تو پہلے ہے اور مقتدی دیر سے جاتا ہے تو اٹھتا بھی دیر سے ہے اس لئے دونوں تین دفعہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ امام پانچ دفعہ کہے تاکہ مقتدی تین دفعہ کہہ سکیں۔

چوتھی بات: "وما اتی علیٰ آیة رحمة الا وقف الخ" احناف اور مالکیہ کے نزدیک اس کا تعلق نوافل سے ہے شوافع اور حنابلہ کے نزدیک فرائض میں بھی جائز ہے مگر احناف کہتے ہیں کہ فرائض میں تخفیف ہونی چاہیئے، اسی طرح رکوع اور سجدے میں جو دعائیں منقول ہیں یہ بھی نوافل پر محمول ہے لیکن اگر امام فرض میں بھی پڑھے تو جواز ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ نفل میں پڑھے۔

باب ماجاء فی النهی عن القرأة فی الرکوع والسجود

اس باب میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے قسی کپڑا پہننے سے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے اور رکوع اور سجدے میں قرآن پڑھنے سے۔

پہلی بات: باب کی حدیث میں ایک مسئلہ تو وہ ہے جس کے لئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب قائم کیا ہے کہ رکوع یا سجدے کی حالت میں قرآن پڑھنا اس کا کیا حکم ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے اس کراہیت کے متعلق فقہاء اور احناف کے دو قول ہیں ① مکروہ بکراہت تنزیہی ② یہ کراہت کراہت تحریمی ہے۔

دوسری بات: اس ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ معارف السنن میں مرقات کے حوالے سے منقول ہے کہ ممانعت کی ایک وجہ یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رکوع اور سجدے کی حالت میں تسبیح مقرر کردی ہے اب جب نبی ﷺ نے ایک ذکر مقرر کردی ہے تو اس کے بجائے دوسرا ذکر پڑھنا خلاف ورزی ہے دوسرا قرآن کریم اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات میں قیوم اور قیام ہے اس لئے قرآن کی قرأت قیام کے حالت کے مناسب ہے رکوع اور سجدے میں مناسب نہیں۔

تیسری بات: نبی ﷺ نے قسی کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو ریشم اور دوسرے دھاگے سے مخلوط بنایا جائے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ قس معرب ہے قز کا اور ریشم کو کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ ریشمی کپڑوں کے پہننے سے منع فرمایا اور معصفر سے اس لئے منع فرمایا کیونکہ زعفران کے رنگ سے عورتوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے تختم ذہب کی بھی مردوں کے لئے حرمت آئی ہے اس لئے ممانعت فرمائی۔

باب ماجاء فیمن لایقیم صلبه فی الرکوع والسجود

ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس کی نمازیں کفایت نہیں کرتیں جو رکوع میں اپنی پیٹھ اور سجدے میں اپنی پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا۔

اختلاف: باب کی حدیث میں جو مسئلہ ہے اس کو فقہاء تعدیل ارکان کے نام سے یاد کرتے ہیں تو مسئلہ یہ ہے کہ تعدیل ارکان کا شرعی حکم کیا ہے؟ باب کی حدیث میں منقول ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "لاتجزیٔ صلاة" اس مسئلے کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تعدیل ارکان فرض ہے اس لئے ان کا مسلک یہ ہے کہ جس کی نماز میں

تعدیل ارکان نہ ہو اس کی نماز فاسد ہے اس لئے اس کو اعادہ کا حکم ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے تین اقوال منقول ہیں۔ (۱) احناف میں سے کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تخریج کے مطابق تعدیل ارکان واجب ہے۔ (۲) جرجانی کی تخریج کے مطابق سنت ہے (۳) طحاوی کی تخریج کے مطابق فرض ہے۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنا صریح قول نہیں محققین علماء احناف نے کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تخریج کو ترجیح دی ہے اس لئے احناف کے ہاں تعدیل ارکان واجب ہے اس لئے اگر کسی نے بغیر تعدیل ارکان کے نماز ادا کی تو چونکہ یہ نماز مستلزم ہے ترک واجب کو اس لئے یہ نماز واجب الاعادہ ہے تو مآل کے اعتبار سے احناف اور جمہور میں فرق نہیں ہے۔ کیونکہ انکے نزدیک بھی واجب الاعادہ ہے اور احناف کے راجح قول میں بھی واجب الاعادہ ہے صرف اعادہ کی وجہ میں فرق ہے احناف کے ہاں اعادے کی وجہ نقصان صلاۃ ہے اور جمہور کے ہاں اعادے کی وجہ فساد صلاۃ ہے ثمرہ اس وقت نکلے گا جب یہ اعادہ کرے گا تو احناف کے ہاں دوسرا آدمی اس کی اقتداء نہیں کر سکتا کیونکہ فرض ادا ہو چکا ہے یہ اعادہ جبیرہ نقصان کے لئے ہے لیکن جمہور کے ہاں دوسرا اقتداء کر سکتا ہے۔

احناف کی کتابوں میں لکھا ہے کہ رکوع اور سجدے میں سبحان اللہ کی مقدار ٹھہرنا فرض ہے، تین دفعہ تسبیح کی مقدار ٹھہرنا واجب ہے اگرچہ تسبیحات پڑھنا سنت ہے۔

باب مایقول الرجل اذا رفع رأسه من الركوع باب آخر منه

پہلے باب میں علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے "**سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد ملأ السموات والأرض وملأما بينهما وملأ ماشئت من شئ بعد**"

دوسرے باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب امام "سمع اللہ لمن حمدہ" پڑھے تو تم **ربنا ولک الحمد** پڑھو۔ بیشک جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہو جائے اس کے گذشتہ سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

پہلی بات: ان احادیث کے متعلق شارحین نے دو مسئلے لکھے ہیں (۱) امام جب سمع اللہ لمن حمدہ پڑھے تو امام اور مقتدی ربنا ولک الحمد ہی تک پڑھے یا اس کے بعد بھی پڑھے جس طرح باب اول میں طویل دعا منقول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ یہ طویل دعا فرض اور نفل دونوں میں پڑھنی چاہیئے، گزر چکا ہے کہ احناف کے ہاں جو دعائیں منقول ہیں وہ نوافل میں پڑھی جائیں گی فرائض میں نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرائض میں بالکل جائز نہیں بلکہ جائز تو ہے مگر خلاف اولیٰ ہے کیونکہ فرائض میں تخفیف مقصود ہے اگر امام یہ دعائیں پڑھے گا تو تثقیل کا باعث ہو جائے گا یہ صاحب کبیر نے لکھا ہے۔

دوسری بات: دوسرا مسئلہ باب کی حدیث میں یہ ہے کہ "**اذا قال الامام سمع الله لمن حمده فقولوا ربنا ولک الحمد**" سمع اللہ الخ یہ امام اور مقتدی دونوں کا وظیفہ ہے یا کسی ایک کا، اس میں تین قول ہیں (۱) امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں امام **سمع الله لمن حمده** کہے مقتدی **ربنا ولک الحمد** کہے۔ (۲) امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت یہ ہے کہ امام دونوں پڑھے گا اور مقتدی ربنا ولک الحمد پڑھے گا۔ (۳) ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ یہ دونوں چیزیں دونوں کا وظیفہ ہیں یہ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت بھی ہے دوسرے باب کی حدیث امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے کیونکہ یہاں تقسیم ہے آپ ﷺ نے امام کا وظیفہ الگ بتایا تو مقتدی کا وظیفہ الگ پڑھ کر بتایا۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی لکھا ہے کہ عام احادیث تقسیم پر دلالت کرتی ہیں صاحبین اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں کہ امام دونوں پڑھے مقتدی ربنا ولک الحمد پڑھے۔ عام احناف نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

تیسری بات: ربنا لک الحمد چار طریقوں سے منقول ہے۔ "اللّٰھم ربنا ولک الحمد"، "اللھم ربنا لک الحمد"، "ربنا ولک الحمد"، "ربنا لک الحمد" ان میں سے جس طریقے کو بھی پڑھے سنت ادا ہو جائے گی۔

باب ماجاء فی وضع الیدین قبل الرکبتین فی السجود باب آخر منه

وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ سجدہ کرتے تو رکبتین ہاتھوں سے پہلے رکھتے تھے اور جب اٹھتے تو رکبتین سے پہلے ہاتھ اٹھاتے۔

دوسرے باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص قصد کرتا ہے اور نماز میں اس طریقے سے بیٹھتا ہے جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔

پہلی بات: ابواب میں یہ مسئلہ بیان کر رہے ہیں کہ جب آدمی سجدے کی طرف جائے تو پہلے رکبتین رکھے گا یا یدین پہلے رکھے گا۔ یہ مسئلہ ائمہ مجتہدین کے درمیان اختلافی ہے اس میں کل تین اقوال ہیں۔ پہلا قول: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مشہور روایت کے مطابق احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہ قول ہے اور اسی طرح امام حسن رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اوزاعی کا بھی یہ قول ہے کہ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے پھر گھٹنے رکھے پھر پیشانی رکھے۔ تیسرا قول امام مالک اور ایک روایت احمد کی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے کہ ہاتھ پہلے رکھے یا رکبتین کو پہلے رکھے۔

دوسری بات: قول اولیٰ والے یعنی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، جمہور فقہاء و محدثین باب اول کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اس سے پہلے رکھتے اور اٹھتے وقت اس کا عکس کرتے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل باب ثانی کی روایت ہے جس میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی نماز کا قصد کرتا ہے اور اونٹ کی طرح بیٹھتا ہے، یہاں اس حدیث میں اختصار ہے طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ آگے اس میں یہ الفاظ ہیں "ولکن لیضع یدیه قبل رکبتیه"

تیسری بات: جمہور کی مستدل پر اعتراض ہے کہ اس کے نقل کرنے میں شریک بن عبداللہ القاضی متفرد ہے اور شریک پر ائمہ جرح وتعدیل نے کلام کیا ہے۔ جمہور اس کا جواب دیتے ہیں کہ شریک بن عبداللہ پر بعض نے کلام کیا ہے مگر یہ صحیح مسلم کا راوی ہے، اس لئے اس کے متعلق کلام کرنا قابل اعتبار نہیں۔

چوتھی بات: امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے مستدل کے بارے میں جمہور چند باتیں ذکر کرتے ہیں ① امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ اور دار قطنی ان تین حضرات نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے غربت کی وجہ یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ بن حسن اس کو نقل کرنے میں ابوالزناد سے متفرد ہے اس حدیث کے نقل کرنے میں اس سے غلطی ہوئی ہے اس لئے یہ حضرات اس حدیث کا معلول کہتے ہیں ② دوسری بات یہ کرتے ہیں کہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب شرح معانی الآثار اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبۃ میں بھی یہ حدیث ہے۔ مگر اس میں الفاظ اس طرح ہیں "ولکن لیضع رکبتیه قبل یدیه" یہ الفاظ عبداللہ بن سعید المقبری کے طریق سے منقول ہیں ③ تیسری بات اس حدیث میں یہ ہے کہ اس حدیث کا اول حصہ آخری حصے سے متعارض ہے ④ چوتھی بات یہ ہے کہ ابن خزیمہ نے کہا ہے کہ اس میں جو صورت منقول ہے کہ ہاتھ پہلے رکھے یہ صورت منسوخ ہے چنانچہ انہوں نے سعد کی حدیث نقل کی ہے کہ جب ہم پہلے نماز پڑھتے تو ہاتھ پہلے رکھتے

تھے اس میں یہ الفاظ ہیں "فأمرنا ان نضع الرکبتین قبل الیدین".

پانچویں بات: معارف السنن میں علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ، بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن سید الناس ان محدثین کا قول ہے کہ وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے سند کے اعتبار سے اصح ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی۔

چھٹی بات: ابن قیم کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی قصد کرتا ہے اور نماز میں اونٹ کی طرح بیٹھتا ہے، اب اونٹ پہلے اگلے پاؤں رکھتا ہے جو بمنزلہ یدین کے ہیں اور پچھلے پاؤں بعد میں رکھتا ہے تو فرمایا کہ اونٹ کی طرح نہیں بیٹھنا چاہیئے، اور اونٹ ہاتھ پہلے رکھتا ہے تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ سجدے میں جاتے وقت پہلے نہ رکھو جبکہ حدیث کا دوسرا حصہ ہے "ولکن یضع یدیه قبل رکبتیه" تو مطلب یہ ہوا کہ اونٹ بیٹھتے وقت رکبتین جو کہ اس کے ہاتھوں میں ہیں ان کو پہلے رکھتا ہے تم اس طرح نہ بیٹھو یعنی تم اپنے رکبتین کو جو پاؤں میں ہیں پہلے نہ رکھو۔

ابن قیم فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ اونٹ کے رکبتین ہاتھوں میں ہے یہ لغت سے ثابت نہیں اس لئے یہاں راوی سے قلب ہوا ہے اصل میں تھا اونٹ کی طرح نہ بیٹھو "ولکن یضع رکبتیه قبل یدیه" مگر راوی سے قلب ہوا تو اس نے کر دیا "ولکن یضع یدیه قبل رکبتیه".

ساتویں بات: مولانا انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہاں ایک وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے ایک ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے اب سند کے اعتبار سے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث صحیح مان لیں تو اس میں ہے کہ "ولکن لیضع یدیه قبل رکبتیه" کہ ہاتھ پہلے رکھے اب کہاں رکھے تو فرماتے ہیں کہ نیچے جاتے وقت اگر جوان اور صحت مند ہو تو جس طرح چاہے جاؤ لیکن ضعیف ہو تو ہاتھوں کو رکبتین سے پہلے رکھے پھر رکبتین کو زمین پر رکھے۔ شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ علامہ مجری نے بھی اس طرح ان احادیث کو جمع کیا ہے۔

اشکال: ترجمۃ الباب میں ہے کہ "باب ماجاء فی وضع الیدین قبل رکبتین فی السجود" جبکہ حدیث سے اس کا خلاف ثابت ہوتا ہے کیونکہ حدیث سے وضع الیدین بعد الرکبتین یعنی ہاتھوں کا بعد میں رکھنا ثابت ہوتا ہے، تو ترجمۃ الباب میں جو بمنزلہ دعویٰ کے ہے اور حدیث جو بمنزلہ دلیل کے ہے اس میں مطابقت نہیں۔

جواب: یہاں ترجمۃ الباب میں غلطی ہے صحیح یہ ہے کہ باب ماجاء فی وضع الرکبتین قبل الیدین فی السجود اور دوسرے نسخے میں اسی طرح ہے۔

جواب: یہاں ترجمۃ الباب کے الفاظ صحیح ہیں مگر یہ ترجمۃ الباب استفہامی ہے کہ کیا یدین رکبتین سے پہلے رکھے گا؟

باب ماجاء فی السجود علی الجبهة والانف

ابوحمید الساعدی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دیتے اور اپنے ہاتھ اپنے پہلوؤں سے دور کر کے رکھتے اور دونوں ہاتھوں کو منکبین کے برابر رکھتے تھے۔

پہلی بات: باب میں جو مسئلہ ہے اس میں اتنی بات پر اتفاق ہے کہ مسنون طریقہ سجدے کا یہی ہے کہ سجدے میں ناک اور جبہہ دونوں کو استعمال کیا جائے دوسرے باب میں آئے گا کہ سجدے میں ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفاء کر دیا تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا اس میں تین اقوال ہیں۔

پہلا قول اہل ظواہر امام احمد اور اسحاق کا ہے کہ ان دو میں سے کسی ایک پر اکتفاء جائز نہیں اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک پر اکتفاء کیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

دوسرا قول امام شافعی، امام محمد اور امام ابو یوسف کے ہاں اقتصار علی الجبھۃ جائز ہے مگر فقط اقتصار علی الانف کرے تو سجدہ ادا نہ ہوگا نماز فاسد ہو جائے گی۔

تیسرا قول امام اعظم کا ہے ان کے ہاں اقتصار علی الجبھۃ کی طرح اقتصار علی الانف بھی جائز ہے اس مسئلے میں جو احادیث منقول ہیں ان میں سے اکثر میں چہرے یا پیشانی کا ذکر ہے لیکن فقط ناک پر اکتفاء کیا جائے اس کی دلیل کوئی مرفوع حدیث نہیں البتہ معارف السنن میں ہے کہ احناف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی ﷺ رات کی نماز میں یہ دعا کرتے تھے "**سجد وجهی للذی خلقه وشق سمعه وبصره**" احناف میں سے بعض کا طریقہ استدلال اس طرح ہے کہ نبی نے سجدے کی اضافت وجہ کی طرف کی ہے اور سجدے میں پورا چہرہ تو استعمال نہیں ہوتا بلکہ بعض حصہ زمین پر لگایا جاتا ہے اب اس بعض کو پورے چہرے کا سجدہ قرار دیا تو ناک بھی چہرے کا بعض ہے تو ناک پر سجدہ بھی چہرے پر سجدہ ہے، مگر شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ حدیث اس معنی کیلئے نہیں آئی اور نہ اس کا مفہوم یہ ہے اس لئے احناف کے اس قول کی کوئی مرفوع حدیث بطور دلیل کے موجود نہیں۔

فقہائے احناف نے (ابن نجیم اور ابن عابدین شامی) لکھا ہے کہ امام صاحب نے اس قول سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اب اگر رجوع کا قول صحیح ہو تو امام صاحب اور جمہور میں اختلاف نہ رہے گا تو جمہور کا مسلک یہ قول ہوگا کہ افضل یہ ہے کہ دونوں پر سجدہ کیا جائے لیکن اگر ایک پر اکتفاء کیا تو اگر جبھہ پر اکتفاء کیا تو جائز ہے مگر فقط انف پر اکتفاء کیا تو سجدہ ادا نہ ہوگا۔

صاحب فتح القدیر نے امام صاحب کے قول کو اور طریقے سے جمہور کے موافق کیا ہے کہ امام صاحب جو فرماتے ہیں کہ اقتصار علی الانف کوئی کرے تو نماز ہو جائے گی مگر کراہت تحریمی کے ساتھ اور فقہاء کا قاعدہ ہے کہ کل صلاۃ ادیت مع الکراھۃ فاعادتھا واجبۃ تو صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ جمہور کے ہاں بھی اعادہ واجب ہے امام صاحب کے ہاں بھی واجب ہے تو مآل ایک ہی ہے۔

جمہور کہتے ہیں کہ اقتصار علی الجبھہ جائز ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حدیث میں جبھہ اور انف دونوں کا ذکر ہے تو فقہاء کس طرح جبھہ پر اکتفاء جائز قرار دیتے ہیں۔

جواب: سجدے کا لغوی معنی ہے پیشانی کا زمین پر رکھنا یعنی "**وضع الجبهة على الأرض بغير السخرية**" اب جمہور نے جو کہا ہے کہ اقتصار علی الجبھہ جائز ہے یہ اس لئے ہے کہ سجدے کا معنی بھی یہی ہے۔

جواب دوسری حدیث میں ہے کہ سجدہ اعضاء سبعہ پر کیا جائے لیکن سب پر سجدہ فرض نہیں اب یہاں بھی انف کا ذکر ہے مگر اس پر سجدہ کرنا فرض تو نہیں۔

دوسری بات: پیر زمین سے سجدے کی حالت میں اٹھ جائیں تو اس کا کیا حکم ہے عام لوگ کہتے ہیں کہ انگلی اٹھ جائے تو نماز نہ ہوگی صاحب بحر الرائق نے فقہاء احناف کے تین قول نقل کئے ہیں ① سجدے میں دونوں پاؤں کا زمین پر رکھنا فرض ہے ② ایک پاؤں کا زمین پر رکھنا فرض ہے ③ دونوں پاؤں کا رکھنا فرض نہیں اس تیسرے قول کو صاحب بحر الرائق نے ضعیف کہا ہے اور لکھا ہے کہ کم از کم ایک پاؤں کا ایک انگوٹھا زمین پر رکھنا فرض ہے۔

تیسری بات: **ونحا يديه عن جنبيه** اگر انفراداً نماز پڑھ رہا ہو تو جتنا دور رکھ سکتا ہے رکھ لے لیکن صف میں ہو تو تجافی کرے مگر اتنا زیادہ کھلا نہ رکھے کہ دوسرے کو تکلیف دے اور تجافی اعضاء مسنون ہے الصاق کرنا مکروہ ہے کراہت تنزیہی کے ساتھ۔

چوتھی بات: تیسرا جملہ ہے "ووضع کفیه حذو منکبیه" آگے باب آرہا ہے کہ سجدے میں ہاتھ کہاں تک رکھے جائیں گے۔

باب ماجاء این یضع الرجل وجهه اذا سجد

براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابو اسحاق نے دریافت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کے وقت چہرہ کہاں رکھتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان۔

پہلی بات: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سجدے کے وقت ہاتھ کندھوں کے پاس رکھے یا کانوں کے پاس رکھے صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے کہ آئمہ ائمہ کا اختلاف ہے مگر اختلاف اولیٰ غیر اولیٰ کا ہے اس لئے سجدے میں کسی نے دونوں ہاتھ کندھے کے برابر رکھے یہ بھی جائز ہے اور اگر کانوں کے قریب رکھے یہ بھی جائز ہے۔

دوسری بات: اختلاف کیا ہے؟ تو امام طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شرح معانی الآثار میں لکھا ہے کہ جو لوگ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کندھوں تک اٹھانے کو اولیٰ کہتے ہیں ان کے ہاں ہاتھ سجدے میں بھی کندھوں کے برابر رکھنا افضل ہے اور جو تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کے برابر ہاتھ اٹھانے کو افضل کہتے ہیں ان کے ہاں سجدے میں بھی ہاتھ کانوں کے برابر رکھنا افضل ہے۔

تیسری بات: معارف السنن میں ہے کہ امام اعظم، صاحبین سفیان ثوری کہتے ہیں کہ سجدے کے وقت دونوں ہاتھ کانوں کے برابر ہونے چاہئیں اور چہرہ دونوں ہاتھوں کے درمیان ہو امام شافعی کے ہاں نووی کی تصریح کے مطابق افضل یہ ہے کہ سجدے میں ہاتھ کندھے کے برابر ہونے چاہئیں ان کی دلیل ابو حمید الساعدی کی حدیث ہے جس میں "وضع کفیه حذو منکبیه" امام اعظم کی دلیل مذکورہ باب کی حدیث ہے اس میں براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب ان سے پوچھا گیا کہ سجدے میں نبی چہرہ کہاں رکھتے تھے انہوں نے جواب دیا کہ "بین کفیه" دوسری دلیل صحیح مسلم کی روایت ہے کہ "وضع وجهه بین کفیه" تیسری دلیل طحاوی نے حدیث نقل کی ہے اس میں ہے "کانت یداه حیال اذنیه" معارف السنن میں ہے کہ جس طرح تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کے اٹھانے میں اختلاف تھا بعض نے رفع یدین کندھوں کے برابر ذکر کیا ہے اور بعض نے کانوں کے برابر تو اسی طرح یہاں سجدے کی حالت میں اسی کیفیت سے احادیث کو جمع کیا جائے کہ ہتھیلی کندھوں کے برابر ہو اور چہرہ انگلیوں کے برابر ہو پھر تعارض نہ رہے گا۔

باب ماجاء فی السجود علی سبعة اعضاء

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ بندہ جب سجدہ کرتا ہے تو اس کے سات اعضاء بھی سجدہ کرتے ہیں چہرہ کفین رکبتین قدمین

پہلی بات: حدیث کا مفہوم ہے کہ سجدے کے وقت انسان کے سات اعضاء استعمال ہوتے ہیں چہرہ جو عبارت ہے پیشانی اور ناک سے اور کفین قدمین اور رکبتین ان سات اعضاء پر سجدہ کرنا مسنون طریقہ ہے۔

دوسری بات: جن سات اعضاء کا یہاں ذکر ہے تو آیا ان سات اعضاء پر سجدہ کرنا واجب ہے یا نہیں؟ تو شافعی اور بعض دوسرے حضرات کے ہاں سات اعضاء کو سجدے میں استعمال کرنا واجب یعنی فرض ہے امام اعظم کے ہاں مشہور قول میں ان سات اعضاء کا سجدے میں زمین پر رکھنا سنت ہے مگر صاحب فتح القدیر نے وجوب کو ترجیح دی ہے اس قول کے مطابق کسی نے اگر سات اعضاء میں سے کسی ایک عضو کو استعمال نہ کیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی تو صاحب فتح القدیر کے اس قول کے مطابق امام صاحب اور شوافع میں مآل کے اعتبار سے اختلاف نہ رہا۔

تیسری بات: یدین سے کل ید مراد نہیں بعض ید مراد ہے کیونکہ ید کا اطلاق ابطین تک پر ہوتا ہے جبکہ سجدے میں فقط کفین استعمال ہوتے ہیں اسی طرح قدمین اور رکبتین سے بھی بعض حصہ مراد ہے کل مراد نہیں۔

چوتھی بات: احناف میں سے صاحب کبیری نے لکھا ہے کہ سجدے میں پاؤں کی انگلیوں کے سروں کا متوجہ الی القبلہ ہونا ضروری ہے اگر ایسا نہ ہوا تو فاسد ہو جائے گا مگر عام احناف کے ہاں انگلیاں قبلے کی طرف موڑنا لازمی نہیں اور ایسا نہ کرنے سے نماز فاسد نہ ہوگی۔

ولا یکف شعرہ نماز سے پہلے اور نماز کے اندر دونوں صورتوں میں بالوں کو جمع کر کے باندھ لینا مکروہ ہے۔

باب ماجاء فی التجافی فی السجود

عبداللہ بن اقرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ غزوہ نمرہ کے اندر ایک میدان میں تھا۔ جب قافلہ گزرا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کر رہے تھے۔ اور آپ جب سجدہ کرتے تو آپ کے بغلوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

تجافی اعضاء کا مطلب: اس حدیث میں تجافی اعضاء کا حکم ذکر ہے۔ کہ ہاتھوں کو جنبین کے ساتھ نہ ملائے، اور افتراش بھی نہ کرے، پیٹ کو رانوں سے جدا رکھے، یہ تجافی اعضاء ہے، اسکا حکم یہ ہے کہ یہ مسنون ہے۔ اور الصاق جو کرے اس میں کراہت ہے، یہ حکم مرد کا ہے عورت کیلئے الصاق بہتر ہے، کیونکہ وہ اسکے لئے استر ہے۔ اور عورت کی نماز کی بناء تستر پر ہے۔

من نمرہ: یہ عرفات کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔

وأری بیاضہ: بعض علماء نے کہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغلوں کے بال حلقۃً نہ تھے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ خصوصیت کیلئے دلیل ضروری ہے، صرف احتمال سے خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔

باب ماجاء فی الاعتدال فی السجود

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے اس کو چاہیئے کہ اعتدال کرے، اور نہ بچھائے بازوؤں کو کتے کے بچھانے کی طرح۔

اعتدال فی السجود کا مطلب: اعتدال فی السجود سے کیا مراد ہے۔ محدثین نے اس کے تین مطلب بیان کئے ہیں۔ ①۔ سجدہ کے وقت ہاتھ نہ بغلوں سے ملے ہوئے ہوں اور نہ زمین پر بچھے ہوئے ہوں۔ ②۔ دوسرا معنے اعتدال فی الارکان والا ہے کہ آرام سے سجدہ کرے۔ ③۔ تیسرا معنی یہ کیا ہے کہ رکوع میں اعتدال یہ ہے کہ پیٹھ برابر ہو۔ گردن پیٹ کے ساتھ برابر ہو۔ اور سجدے کی حالت میں اعتدال یہ ہے کہ سر نیچے ہو اور پچھلا حصہ اونچا ہو۔ اعتدال فی الارکان کی تفصیل گزر چکی ہے، باقی افتراش کلب سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ حالت خشوع کے منافی ہے۔ دوسرا کتے سے مشابہت لازم آئیگی۔

باب ماجاء فی وضع الیدین ونصب القدمین

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے سجدہ میں ہاتھوں کے زمین پر رکھنے اور پاؤں کے کھڑا رکھنے کا حکم دیا۔

تشریح: نصب قدمین کا مطلب یہ ہے کہ انگلیوں کو زمین پر ٹکا دے اور اگر انگلیاں قبلہ کی جانب ہوں تو افضل ہے اور وضع یدین کا مطلب یہ ہے کہ ہتھیلیاں زمین پر رکھے۔ پورا ید رکھنا مراد نہیں۔

باب ماجاء فی اقامة الصلب اذا رفع رأسه من السجود والرکوع

اسمیں براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نماز کہ جب آپ رکوع کرتے اور سر اٹھاتے اور اس کے بعد سجدہ کرتے اور سر اٹھاتے تو تقریباً آپکی نماز برابر تھی۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ قومہ کے وقت سیدھے کھڑا ہونے سے پہلے سجدے کی طرف نہ جائے۔ اسی طرح سجدے سے جب سر اٹھائے تو پورے طریقے سے بیٹھ نہ جائے تو دوسرے سجدے میں نہ جائے۔ تو ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان کیا کہ قومہ اور جلسے میں اقامۃ الصلب کرے۔ یعنی قومے اور جلسے کو اس طرح ادا کرے کہ سارے اعضاء اپنی اپنی جگہ آجائیں۔

دوسری بات: اس باب سے مسئلہ اعتدال فی الارکان کو ثابت کرنا ہے۔ احناف کے مشہور قول میں تو اعتدال فی الارکان سنت ہے۔ مگر محققین احناف کے ہاں اعتدال فی الارکان واجب ہے۔ اگر بغیر تعدیل کے کسی نے نماز پڑھی تو واجب الاعادہ ہے۔ جمہور کے ہاں تعدیل ارکان فرض ہے بغیر تعدیل کے نماز جمہور کے ہاں بھی واجب الاعادہ ہے اور احناف کے اس قول کے مطابق بھی واجب الاعادہ ہے۔

تیسری بات: باب کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کی نماز کے بارے میں ہے کہ قیام، رکوع، سجدہ، قومہ اور جلسہ کے احوال برابر ہوتے تھے۔ یہاں یہ اشکال ہے کہ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی نماز کے متعلق منقول ہے کہ فجر میں ساٹھ سے سو آیات تک ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔ اب اتنے طویل قیام کی طرح رکوع۔ سجدہ۔ قومہ۔ اور جلسہ میں آپ برابری کرتے تھے یہ نہیں ہوسکتا۔

جواب ①: نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بعض احوال میں یہ ہوتا تھا۔ کہ رکوع۔ قیام۔ سجدہ اور قومہ اور جلسہ میں آپ برابری کرتے تھے۔

جواب ②: امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جو باب کی حدیث نقل کی ہے۔ اسکے بارے میں بعض روایات میں استثناء موجود ہے کہ الا القیام والقعود۔ اس سے ثابت ہوا کہ رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ انکے احوال برابر ہوتے تھے۔ قیام وقعود کے ساتھ برابری مراد نہیں۔

جواب ③: راوی مبالغۃ یہ لفظ ذکر کر رہا ہے، راوی کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے رکوع، قومہ، سجدہ اور جلسہ سارے اطمینان کے ساتھ کئے تھے۔ تو راوی نے اعتدال کو ظاہر کرنے کیلئے قریباً من السواء کہدیا اور قریباً من السواء خود بتاتا ہے کہ فرق ہوتا تھا۔

جواب ④: معارف السنن میں انور شاہ صاحب سے منقول ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز برابر ہوتی تھی یعنی کبھی قرأت کرتے تو اسکی مناسبت سے رکوع اور سجدہ، قومہ اور جلسہ بھی طویل کرتے، اور اگر قرأت مختصر کرتے تو اسکی مناسبت سے رکوع اور سجدہ اور قومہ وجلسہ کو بھی مختصر کرتے تھے۔

باب ماجاء فی کراهیة ان یبادر الامام فی الرکوع والسجود

اسمیں بھی براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جب آپ رکوع سے اٹھ جاتے، تو ہم میں سے کوئی آدمی اپنا کمر نہ جھکاتا تھا، سجدے میں جانے کیلئے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ سجدے میں پہنچ جاتے پھر ہم سجدہ کرتے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مفہوم یہ ہے کہ سجدے اور رکوع میں جاتے وقت امام سے مبادرت مکروہ ہے۔

دوسری بات: امام سے جو مبادرت مکروہ ہے یہ مبادرت کی کراہت صرف رکوع اور سجدے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام ارکان میں مبادرت مکروہ ہے مگر رکوع اور سجدے کی تخصیص کی کیونکہ عموماً مبادرت ان دو ارکان میں ہوتی ہے۔

تیسری بات: مسئلے کا جو حکم ہے کہ کوئی آدمی کسی رکن میں نماز کے ارکان میں سے امام سے مبادرت کر لے تو اسکا حکم اجماعی اور اتفاقی ہے کہ یہ مکروہ ہے۔اور کراہت بھی کراہت تحریمی ہے۔

چوتھی بات: اگر کسی آدمی نے مبادرت کر لی امام سے تو اب اسکی دو صورتیں ہیں: ① امام سے پہلے مثلاً رکوع میں گیا اور امام ابھی رکوع میں نہیں گیا تھا کہ یہ رکوع کر کے اٹھ گیا تو اسکی نماز بالاتفاق فاسد ہے ② دوسری صورت یہ ہے کہ مثلاً امام سے پہلے رکوع میں چلا گیا اب ابھی تک یہ رکوع ہی میں تھا کہ امام نے بھی رکوع کر لیا، امام کے ساتھ رکوع میں اسکی شرکت ہوگئی، تو اسکی نماز میں کراہت تحریمی تو ہے۔مگر نماز اسکی ہو جائے گی اسمیں بھی اتفاق ہے۔

وھو غیر کذوب ۔یہ کس کے متعلق ہے؟ اسمیں دو قول ہیں: ایک یہ کہ یہ جملہ ابواسحاق کا ہے اس نے اپنے استاد عبداللہ بن یزید کے متعلق کہا ہے اور مقصود اپنے استاد کا تزکیہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن یزید کا جملہ ہے اور انہوں نے یہ حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کہا ہے۔

اشکال: کذوب مبالغہ ہے، اسکا مطلب یہ بنتا ہے کہ زیادہ جھوٹ نہ بولتے تھے۔تو کیا کم بولتے تھے؟

جواب: معارف السنن میں ہے کہ یہاں یہ مبالغہ کا صیغہ ہے مگر مقصود نفس کذب کی نفی ہے۔ جس طرح قرآن میں ہے۔﴿وما ربک بظلام للعبید﴾ یہاں یہ بھی مبالغہ ہے۔مگر نفس ظلم کی نفی مقصود ہے۔

اشکال: سارے صحابہ عادل ہیں، اس جملے کی پھر ضرورت کیا ہے؟

جواب: معارف السنن میں ہے کہ ایسے جملے تاکید کلام کیلئے ذکر کئے جاتے ہیں۔اپنے کلام کو مؤکد کرنے کیلئے یہ کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی کراھیة الاقعاء بین السجدتین وباب ماجاء فی الرخصة فی ذلک

پہلے باب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اے علی میں تمہارے لئے پسند کرتا ہوں جو اپنے نفس کیلئے پسند کرتا ہوں۔اور تمہارے لئے وہ چیز ناپسند کرتا ہوں جو اپنے نفس کیلئے ناپسند کرتا ہوں۔تو تم دو سجدوں کے درمیان اقعاء مت کرو۔ دوسرے باب میں طاؤس کہتے ہیں کہ ہم نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اقعاء علی القدمین کے بارے میں پوچھا۔انہوں نے فرمایا کہ یہ سنت ہے ہم نے کہا کہ ہم تو اسکو آدمی کی جہالت سمجھتے ہیں۔انہوں نے کہا نہیں بلکہ یہ تمہارے نبی کی سنت ہے۔

اقعاء کی تفسیر: اقعاء کسے کہتے ہیں؟ شارحین نے اسکی دو تفسیریں کی ہیں: ① ایک تفسیر یہ ہے کہ جس طرح کتا بیٹھتا ہے اس طرح بیٹھے کہ پاؤں کھڑے رکھے اور سرین زمین پر ہو اور ہاتھ زمین پر رکھے۔اس تفسیر کے اعتبار سے اقعاء ائمہ کے ہاں بالاتفاق وبالاجماع ناجائز ہے۔ ② دوسری تفسیر یہ ہے کہ کبھی آدمی بوڑھا ہو، زمین ہموار نہ ہو، تو آدمی بین السجدتین پاؤں کو کھڑا کر کے ایڑیوں پر بیٹھ جائے۔اس تفسیر کے مطابق ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عطاء بن ابی رباح کے قول کے مطابق یہ اقعاء سنت ہے یہ شافعی کا بھی ایک قول ہے لیکن امام اعظم امام مالک اور امام احمد و جمہور کے ہاں اقعاء نہ پہلی تفسیر کے مطابق سنت ہے اور نہ دوسری تفسیر کے مطابق سنت ہے۔البتہ دوسری تفسیر کے مطابق اقعاء کا جواز ہے۔اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو تو عذر کی بناء پر کیا ہوگا یا بیان جواز کیلئے کیا ہوگا۔

باب مایقول بین السجدتین

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ دو سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے۔ اللھم اغفرلی وارحمنی واجبرنی واھدنی وارزقنی احناف کے ہاں یہ تمام دعائیں محمول ہیں نوافل پر۔ کیونکہ فرائض کا مبنیٰ تخفیف پر ہے۔ اور اگر امام انکو فرائض میں پڑھے۔ تو یہ باعث تثقیل ہے۔ لیکن اگر کسی نے فرائض میں پڑھ لی تو جائز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ابو یوسف سے کسی نے پوچھا کہ رکوع کے بعد دعا پڑھی جائیگی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ربنا لک الحمد پڑھے۔ تو انہوں نے دعا سے منع نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا کہ ربنالک الحمد پڑھنا چاہیے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرائض میں بھی پڑھی جائیں گی۔

باب ماجاء فی الاعتماد فی السجود

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی سجدے کی مشقت کی تو آپ نے فرمایا کہ مدد حاصل کرو گھٹنوں سے۔

حدیث کا مطلب: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی طویل سجدہ کرنا چاہے، اب اسکے لئے تفریج میں مشقت ہوگی، اسلئے وہ مشقت دور کرنے کیلئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے یہ جائز ہے۔ اسی طرح امام طویل سجدہ کرے اور مقتدی بیمار ہے یا ضعیف ہے، تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ سکتا ہے۔

استعینوا بالرکب: اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب سجدے سے اٹھنا چاہو تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھو۔ لیکن پہلا مطلب حدیث کے سیاق کے مطابق ہے۔

باب کیف النھوض من السجود و باب منه ایضاً

مالک بن حویرث لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ نبی کریم ﷺ جب نماز کی وتر (پہلی اور تیسری) رکعت میں ہوتے تو اس وقت تک نہ اٹھتے یہاں تک کہ سیدھے بیٹھ جاتے۔ دوسرے باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نماز میں صدور قدمین (پنجوں کے بل) پر اٹھتے تھے۔

پہلی بات: ان دونوں ابواب کے مسئلے کا عنوان جلسہ استراحت ہے۔ صورت اسکی یہ ہے کہ دوسری رکعت کی طرف اٹھنے کے دو طریقے ہیں۔ ① ۔ ایک طریقہ پہلی حدیث میں ہے کہ سجدے سے اٹھے تو اطمینان سے بیٹھ جائے پھر دوسری رکعت کیلئے کھڑا ہو۔ اسی طرح تیسری رکعت کے سجدے کے بعد بیٹھے پھر اٹھے۔ یہ صورت جلسہ استراحت کی ہے۔ ② ۔ دوسری کیفیت یہ ہے کہ پہلی رکعت یا تیسری رکعت کے سجدے سے فارغ ہو تو بغیر بیٹھنے کے قدموں کے بل اٹھ جائے۔ یہ دوسری صورت دوسرے باب کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات: اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ پہلی کیفیت اختیار کرنی چاہئے یا دوسری کیفیت اختیار کرنی چاہئے؟ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور غیر مشہور قول کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ امام اوزاعی اور جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ دوسری اور چوتھی رکعت کی طرف اٹھنے کیلئے دوسرا طریقہ اختیار کرے، یعنی سیدھا اٹھے بغیر جلسہ استراحت کے۔ جبکہ امام شافعی کے نزدیک جلسہ استراحت مستحب ہے۔

تیسری بات: اس مسئلے کے متعلق جو اختلاف ہے۔ تو فقہاء احناف اور فقہاء شوافع نے تصریح کی ہے کہ یہ اختلاف مباح

کے قبیل سے ہے، یعنی جلسہ استراحت کرے وہ بھی سب کے ہاں جائز ہے، بشرطیکہ جلسہ خفیفہ ہو۔ کیونکہ جلسہ لمبا ہو جائے تو احناف کے ہاں سجدہ سہو لازم آئے گا۔ اور اسی طرح کوئی صدور قدمین پر اٹھے۔ یہ صورت بھی سب کے ہاں جائز ہے۔ اسلئے اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے۔

چوتھی بات: روایات میں دونوں طریقے منقول ہیں، مالک بن حویرث کی حدیث سے استراحت کا ثبوت ملتا ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے صدور قدمین پر اٹھنا منقول ہے اور کئی روایات ہیں مگر احناف نے عدم استراحت کا قول اختیار کیا ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں۔ ① ۔ احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول معارف السنن میں ہے کہ اسکے متعلق اکثر احادیث میں جلسہ استراحت کا ذکر نہیں، اسلئے افضل طریقہ عدم جلسہ استراحت کا ہے۔ ② ۔ وہ احادیث جن میں جلسہ استراحت کا ذکر ہے، یہ احادیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر کی ہیں، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھاری ہو گیا تھا عذر کی بناء پر جلسہ استراحت کرتے تھے، ورنہ عام عادت جو صفۃ صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں منقول ہے، یہ عدم جلسہ استراحت کی ہے۔ ③ ۔ نبی اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا متواتر عمل اور اہل مدینہ کا عمل متواتر عدم جلسہ استراحت کا تھا، اسلئے احناف نے جلسہ استراحت کو افضل نہیں کہا۔

مولی التوامۃ۔ توأمہ ایک عورت کا نام ہے۔

وخالد بن ایاس ضعیف۔ اگر خالد بن ایاس ضعیف بھی ہوں، تو مسئلے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ کان ینھض علی صدور قدمیہ ولم یجلس اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کئی صحابہ کے بارے میں ہے کہ کانوا ینھضون علی صدور اقدامھم.

باب ماجاء فی التشھد وباب منہ ایضا

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا کہ جب دو رکعتوں کے بعد بیٹھ جائیں تو ہم یہ پڑھیں۔

التحیات للہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین اشھدأن لاالہ الا اللہ واشھدأن محمداً عبدہ ورسولہ۔

دوسرے باب میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی طرح یہ تشہد سکھلاتے تھے:

التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ سلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین.

پہلی بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے چودہ صحابہ نے تشہد کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ ائمہ نے ان چودہ صحابہ میں سے تین کو اختیار کیا۔ ① ۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری، ابن المبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق، جمہور فقہاء ومحدثین نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد کو اختیار کیا ہے۔ ② ۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد کو اختیار کیا ہے۔ جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح ہے۔ صرف اسمیں "الزاکیات" کا اضافہ ہے۔ ③ ۔ امام شافعی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد کو پسند کیا ہے۔

دوسری بات: اس مسئلے میں اختلاف بھی مباح کا اختلاف ہے، مقصود یہ ہے کہ صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے تشہدات نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تشہد کا نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

تیسری بات: تشہدات چودہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہیں۔ کسی کے ثبوت کے متعلق اعتراض نہیں۔ صرف وجوہ ترجیح کو دیکھا گیا ہے۔ احناف نے ان وجوہ کی بنا پر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد کو افضل کہا ہے۔ ① ۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تشہد کے نقل کرنے میں تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ صحاح ستہ، مسانید جوامع سب نے انکے تشہد کو نقل کیا ہے۔ ② ۔ ترمذی فرماتے ہیں اس روایت کے بارے میں کہ یہ اصح مافی الباب ہے۔ ③ ۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تشہد اسکے متعلق محدثین نے نقل کیا ہے کہ اکثر صحابہ نماز میں یہی تشہد پڑھتے تھے۔ ④ ۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے تشہد سکھلایا اس حال میں کہ ''کفی بین کفیہ'' کہ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ الفاظ شدت اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ ⑤ ۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ سختی سے شاگردوں کو یاد کراتے یہاں تک کہ واو پر بھی مواخذہ کرتے تھے۔ ⑥ ۔ اکثر فقہاء نے بھی اسی تشہد کو اختیار کیا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق منقول ہے کہ وہ مجلس میں تھے کہ ایک آدمی آیا سوال کیا ''بوا و واو بـواوین'' آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ بواوین اس نے کہا بارک اللہ فیک کما بارک فی لالا لاقعہ سے شاگرد حیران تھے، انہوں نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا، کہ آپ نے کیا فرمایا؟ انہوں نے بتایا کہ اس نے سوال کیا کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تشہد پڑھوں جو دو واو کے ساتھ ہے یا ابو موسیٰ کا جو ایک واو کے ساتھ ہے میں نے کہا دو واو والا پڑھو، اس نے دعاء دی اور اشارہ کیا اس آیت کی طرف ﴿من شجرة مباركة زيتونة لاشرقية ولا غربية﴾ کہ جس طرح اس درخت میں اللہ نے برکت دی ہے اسی طرح اللہ تم میں بھی برکت دے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ زیادتی حروف زیادتی معانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسلئے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تشہد احناف نے اختیار کیا۔

التحیات: سے عبادات قولیہ مراد ہے۔ **والصلوات:** سے عبادات بدنیہ مراد ہیں۔ **الطیبات:** سے عبادات مالیہ مراد ہیں۔

باب ماجاء انه يخفى التشهد

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نقل کیا ہے کہ سنت میں سے ہے کہ تشہد کو مخفی پڑھا جائے۔

پہلی بات: تشہد کو بدون الجہر پڑھنا اس پر ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے۔

دوسری بات: بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے تشہد کے الفاظ جہر کے ساتھ پڑھے۔ جس طرح عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے جہر کے ساتھ تشہد پڑھا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو تشہد جہر کے ساتھ منقول ہے۔ یہ تعلیم پر محمول ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کبھی ظہر اور عصر میں تعلیم کیلئے جہراً قرأت کرتے تھے۔

باب كيف الجلوس في التشهد و باب منه ايضًا

وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کو دیکھوں تو جب آپ تشہد کیلئے بیٹھ گئے بائیں پاؤں کو بچھایا اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھا اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھا۔ ابو حمید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں زیادہ جاننے والا ہوں تم سے نبی کریم ﷺ کی نماز کو پھر فرمایا کہ نبی کریم ﷺ تشہد کیلئے بیٹھ گئے تو بائیں پاؤں کو زمین پر بچھایا اور دائیں پاؤں کو قبلے کی طرف متوجہ کرلیا۔

دائیں ہاتھ کو دائیں گھٹنے پر اور بائیں ہاتھ کو بائیں گھٹنے پر رکھ لیتے اور سبابہ انگلی سے اشارہ کرتے۔

پہلی بات: اس مسئلے کا عنوان ہے کہ تورک کا طریقہ مسنون ہے یا نصب یمنی مسنون ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ پہلا قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں تمام نمازوں میں نصب یمنی۔ اور افتراش یسری کا طریقہ افضل ہے۔ سفیان ثوری اور ابن مبارک کا

بھی یہی مسلک ہے۔ ② ۔دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے انکے ہاں قعدہ اولی اور قعدہ ثانیہ دونوں میں تورک کا طریقہ افضل ہے، چاہے دورکعتی نماز ہو چاہے چار رکعتی نماز ہو۔ تو احناف کے ہاں نصب یمنیٰ کا طریقہ مطلقاً افضل ہے اور مالکیہ کے ہاں تورک مطلقاً افضل ہے۔ ③ ۔تیسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے انکے ہاں دورکعتی نماز میں تورک ہوگا اور چار رکعتی نماز میں قعدہ اولیٰ میں نصب یمنیٰ اور قعدہ ثانیہ میں تورک کا طریقہ افضل ہے۔ ④ ۔چوتھا قول امام احمد کا ہے ان کے ہاں دورکعتی نمازوں میں تورک نہیں، البتہ چار رکعتی نماز ہو تو قعدہ ثانیہ میں تورک افضل ہے۔ باقی دو رکعتی ہو یا چار رکعتی نماز کا قعدہ اولیٰ ہو۔ ان میں احناف والا طریقہ انکے ہاں افضل ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو باب قائم کئے پہلے باب میں جو حدیث نقل کی ہے یہ احناف کے طریقے کی مؤید ہے، دوسرے باب میں جو حدیث ہے اس سے تورک کے قائلین نے استدلال کیا ہے۔

دوسری بات: تورک کے دو طریقے ہیں۔ ① ۔دایاں پاؤں سیدھا ہو بایاں پاؤں بچھائیں لیکن پاؤں پر نہ بیٹھیں بلکہ سرین زمین پر رکھے۔ ② ۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دایاں پاؤں دائیں جانب نکلا ہوا ہو۔ اسی طرح بایاں پاؤں دائیں طرف نکلا ہو۔ اور سرین کے بل بیٹھا ہو۔ تورک کے قائلین کے ہاں دونوں طریقے جائز ہیں۔

تیسری بات: تورک جن احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ احناف اسکو عذر پر محمول کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی عام عادت وہ ہے جو باب اول کی حدیث میں ہے مگر جب آپ ﷺ متبدن ہو گئے۔ تو تورک کرتے تھے چنانچہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مربع ہو کر بیٹھے تھے۔ کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ نصب یمنیٰ اور افتراش یسریٰ ہو۔ لیکن میں مربع بیٹھتا ہوں کیونکہ ان رجلای لا یحملانی۔ کہ میں پاؤں پر عذر کی بنا پر نہیں بیٹھ سکتا۔

چوتھی بات: ائمہ کا اختلاف ہے یہ اختلاف مباح کے قبیل سے ہے، دونوں طریقے جائز ہیں۔ اگر کسی نے تورک کیا تو احناف کے نزدیک جائز ہے۔ اور اگر کسی نے نصب یمنیٰ اور افتراش یسریٰ والا معاملہ اختیار کیا۔ تو دوسرے ائمہ کے ہاں یہ بھی جائز ہے۔

باب ماجاء فی الاشارة

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز میں بیٹھتے دایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھتے اور انگوٹھے کے ساتھ جو انگلی ملی ہوئی ہے اسکو اٹھاتے اس سے اشارہ کرتے۔ اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر بچھا کر رکھتے۔

پہلی بات: انگلی سے اشارے کے متعلق ائمہ کے مختلف اقوال ہیں، ائمہ ثلاثہ جمہور فقہاء و محدثین کے ہاں انگلی سے اشارہ مسنون اور مستحب ہے، احناف کے علماء اور فقہاء کو اس میں اشتباہ ہوا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی چھ کتابیں ہیں ان میں سے ظاہر روایت میں امام صاحب سے کوئی روایت منقول نہیں، اسلئے بعض کو اشتباہ ہوا کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اشارے کے قائل نہیں، اس اشتباہ کی وجہ سے مجدد الف ثانی نے رسالہ لکھا، اور اشارے کے بارے میں وارد ہونے والی روایات میں اضطراب ثابت کیا ہے۔ خلاصہ کیدانی میں مکروہات کے بارے میں باب قائم کیا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ والا شارة کاهل الحدیث لیکن صحیح تربات یہ ہے کہ جس طرح باقی ائمہ کے نزدیک اشارہ مسنون اور مستحب ہے، اسی طرح احناف کے ہاں بھی مسنون اور مستحب ہے۔ موطاء امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور کتاب الامالی لابی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ میں امام صاحب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے، معلوم ہوا ظاہر روایت کتابوں میں امام صاحب کا قول منقول نہیں مگر نوادر کی کتابوں میں اقوال ہیں اور قاعدہ ہے کہ اگر کوئی مسئلہ ظاہر روایت کتب احناف میں نہ ملے تو نوادر کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس میں بھی نہ ہو تو نوازل کو دیکھتے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ احناف اسکے قائل نہیں یہ غلط ہے بلکہ احناف کے ہاں بھی مسنون ہے۔

دوسری بات: اشارہ کس طرح کیا جائے؟ تو احادیث میں جو کیفیات ہیں۔ وہ مختلف ہیں۔ بعض احادیث میں ہے۔ انگلیاں کھلی رکھیں ایک اشارہ کرے۔ حلقے کی کیفیت بھی منقول ہے۔ یہ طریقہ بھی ہے کہ انگوٹھے کو انگلی سے ملایا جائے۔ معارف السنن میں ہے کہ روایات میں جو اختلاف ہے یہ کوئی تعارض کی دلیل نہیں بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک انگلی کو اٹھائے، باقیوں کو بند رکھے، اب بند کس طرح رکھے اسمیں اختلاف ہوا۔ معارف السنن میں ہے کہ روایات میں مختلف کیفیات تھیں اسلئے احناف کے علماء نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں یہ ثابت کیا ہے کہ احناف کے ہاں بھی اشارہ مسنون ہے۔

تیسری بات: انگلی کب اٹھائی جائے۔ احناف کے ہاں لا الٰہ پر اٹھائے اور الا اللہ پر کھدے۔ مگر مولانا رشید احمد گنگوھی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ جب انگلی اٹھائی جائے۔ تو اس کے بعد اثبات کے وقت پورا وضع احادیث میں منقول نہیں۔ اسلئے تھوڑا سا نیچے کرنے بالکل نیچے نہ لے جائے۔ مالکیہ کے ہاں اشارے کے ساتھ حرکت بھی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں یہ اشارہ دعاء کیلئے ہے۔ اسلئے آخر تک اٹھائے۔ اور یہ دعا بالتوحید کہلاتی ہے۔

باب ماجاء فی التسلیمْ فی الصلاۃ و باب منه ایضًا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ پڑھتے تھے۔ دوسرے باب میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک سلام پھیرتے تھے، سامنے کی طرف پھر کچھ دائیں طرف مائل ہوتے تھے۔

پہلی بات: سلام کے متعلق تو بہت سے مسائل ہیں، ایک مسئلہ یہاں پر یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ نماز کے آخر میں سلام کتنے ہیں۔ ایک ہے یا دو ہیں۔ اسمیں اختلاف ہے۔ ① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ جمہور فقہاء و محدثین کے ہاں امام اور مقتدی دونوں کے ذمے دو سلام ہیں۔ ایک دائیں اور ایک بائیں طرف۔ ② امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اوزاعی کا قول یہ ہے کہ امام کے ذمے ایک سلام ہے سامنے کی طرف اور مقتدیوں کے ذمے تین سلام ہیں۔ ایک سامنے کی طرف ایک دائیں اور ایک بائیں طرف۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول قدیم یہ ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو امام کے ذمے ایک سلام ہے، اور مسجد بڑی ہو تو امام کے ذمے دو سلام ہیں۔

اصل اختلاف قول اول اور قول ثانی کا ہے۔ جمہور کی دلیل باب اول کی روایت ہے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جو حدیث ہے کہ "یسلم بتسلیمة واحدة تلقاء وجهه" یہ مالک کی مستدل ہے۔ جمہور اس میں تاویل کرتے ہیں۔ ① یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسلئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زہیر بن محمد اس روایت کا راوی ہے۔ اہل شام نے ان سے منکر احادیث نقل کی ہیں یہ حدیث بھی زہیر کے مناکیر میں سے ہے۔ ② دوسری تاویل یہ کرتے ہیں کہ سلام کی ابتداء تلقاء وجہ سے ہوتی ہے، پھر گردن دائیں اور بائیں جانب پھیر لیتے تھے۔ ③ بعض نے تاویل یہ کی ہے کہ ایک طرف یعنی دائیں جانب جہراً سلام پھیرتے تھے، تاکہ سب سن لیں اور بائیں طرف آہستہ سلام پھیرتے تھے، عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چونکہ آخری صفوں میں ہوتی تھیں، اسلئے وہ سمجھیں کہ شاید ایک سلام کہتے ہیں۔

دوسری بات: دوسرا مسئلہ سلام کا حکم کیا ہے؟ احناف کے ہاں صحیح قول واجب ہے باقی بحث گزر چکی ہے۔

باب ماجاء ان حذف السلام سنة

حذف السلام کا مطلب: معارف السنن میں ہے کہ حذف السلام سے مراد یہ ہے کہ ایک تو مد نہ کرے دوسرا آخر میں اعراب ظاہر نہ کرے، بلکہ جزم اور وقف کے ساتھ پڑھے۔ یہ سب کے ہاں سنت ہے۔

باب مایقول اذا سلم الامام

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب سلام پھیرتے تو نہیں بیٹھتے تھے۔ مگر اتنی مقدار جس میں دعاء پڑھی جا سکے۔ اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام ایک روایت میں ہے کہ۔ سلام کے بعد دعا پڑھتے تھے۔ لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ لملک ولہ الحمد یحی ویمیت وھو علی کل شئ قدیر اللھم لامانع لما اعطیت ولامعطی لما منعت ولاینفع ذالجد منک الجد تیسری روایت میں ہے کہ دعا پڑھتے تھے سبحان ربک رب العزت عمایصفون وسلام علی المرسلین والحمدللہ رب العلمین ۔ چوتھی روایت میں ہے کہ سلام کے بعد نبی ﷺ تین دفعہ استغفار پڑھتے تھے۔ پھر یہ دعا کرتے تھے۔ انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام امام اوزاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ استغفار میں صرف استغفر اللہ پڑھے۔

پہلی بات: اس باب میں امام ترمذی نے وہ اذکار وادعیہ ذکر کی ہیں جو نبی ﷺ سے نماز کے بعد پڑھنا منقول ہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ نماز کے بعد نبی ﷺ یہ اذکار پڑھتے تھے۔

دوسری بات: فقہاء احناف کی کتابوں میں لکھا ہے کہ فرائض اور سنتوں کے درمیان طویل فاصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ بعض فقہاء جیسے صاحب نورالایضاح نے صراحۃً لکھا ہے اور بعض نے اشارۃً لکھا ہے۔ یہاں جو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پہلی روایت ہے اس سے فقہاء نے استنباط کیا ہے کہ اس مقدار سے زیادہ فاصلہ نہیں کرنا چاہیے، باقی اذکار وغیرہ نوافل کے بعد پڑھنے چاہیئں اور بالکل وصل بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے اہل کتاب سے مشابہت لازم آتی ہے۔

تیسری بات: فرائض کے بعد جو ادعیہ مذکور ہیں اسکی کیفیت کیا ہوگی؟ عموماً جو طریقہ ہمارے ہاں ہے۔ کہ امام اور مقتدی ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ اسکا کیا حکم ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ احادیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرائض کے بعد دعاء مانگی ہے "اللھم انت السلام" بھی منقول ہے۔ اور اس سے لمبی دعائیں بھی مانگی ہیں جیسا کہ کتاب الادعیہ میں آئیگا۔ اسی طرح اذکار بھی منقول ہیں، مولانا انورشاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اذکار اور ادعیہ کبھی بمعنی خواندن کے ہوتے ہیں اور کبھی بمعنی خواستن کے ہوتے ہیں۔ اگر خواندن کے معنی میں ہوں۔ جیسے اذکار متواردہ ان میں ہاتھ نہیں اٹھانے چاہئیں لیکن جو اذکار اور ادعیہ خواستن کے معنی میں ہوں تو اسکے اداب میں رفع الیدین ہے۔

تدریب الراوی میں دعا کے وقت رفع الیدین کو متواتر کی مثالوں میں ذکر کیا ہے۔ اب اگر کسی حدیث میں اسکا ذکر نہ ہو تو یہ اسکے عدم کی دلیل نہیں جس طرح کہے۔ صلی النبی ﷺ تو یہاں نہ تسلیم کا ذکر ہے، نہ رکوع کا، تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ رکوع سجدہ یا قیام بالکل نہ ہو۔

چوتھی بات: فرائض کے بعد جو اذکار ہیں انکی حیثیت کیا ہے؟ کیا بمعنی خواندن کے ہے یا بمعنی خواستن کے، عام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی حیثیت خواستن کے ہے، اس لئے رفع یدین کیا جائیگا کیونکہ یہ دعا کے آداب میں سے ہے اور اجتماع کی صورت خود ثابت ہوجاتی ہے کیونکہ یہ امام کے ہاتھ اٹھانے کا وقت بھی ہے اور مقتدیوں کے ہاتھ اٹھانے کا وقت بھی ہے تو اجتماع کی صورت ثابت ہوگئی لیکن کوئی اسکو ضروری سمجھے یا اجتماعیت کو لازم سمجھے تو یہ بدعت کے اندر داخل ہوجائیگی۔ لیکن اگر فقط استحباب سمجھ کر کرے تو بدعت میں داخل نہ ہوگی۔ اسکی دلیل یہ ہوگی کہ اگر امام کبھی دعا نہ کرے تو مقتدی اس پر نکیر نہ کریں۔ کیونکہ مستحب چیز کے نہ کرنے پر نکیر نہیں کی جاتی۔

صحیح مسلم (۱۔۲۱۷) پر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی نماز کی اختتام کو نہیں جانتے تھے مگر اس سے کہ امام اور مقتدی۔ لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ زور سے پڑھ لیتے۔ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس ذکر کا جھر سے پڑھنا ثابت ہے۔ مگر نبی ﷺ کا جھر برائے تعلیم تھا۔ اب اخفاء کے استحباب پر اور جھر کے عدم استحباب پر ائمہ اربعہ متفق ہیں۔ یعنی جھر جائز نہیں۔ البتہ کوئی ایک دو مرتبہ جھر کے ساتھ بطور تعلیم پڑھ لے تو جائز ہوگا۔ بعض لوگ دعاء مذکور۔ اللھم انت السلام۔ میں زیادتی کرتے ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقات میں اور صاحب تحفۃ الاحوذی والے نے لکھا ہے کہ یہ زیادتی واعظین نے ایجاد کی ہے۔ احناف کے علماء نے لکھا ہے۔ کہ جو دعائیں ماثورہ ہیں انکے صیغے بدلنا بھی جائز نہیں۔ امام جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ نے آیت۔ فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم کے تحت لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں یا احادیث میں جو دعاؤں کے الفاظ منقول اور موجود ہیں وہ توقیفی ہیں ممکن ہے کہ کمی زیادتی اس آیت کے تحت داخل ہو۔

باب ماجاء فی الانصراف عن یمینه وعن یساره

اس باب میں منقول ہے کہ سلام کے بعد انصراف عن الیمین بھی جائز ہے کہ دائیں طرف سے اٹھ کر چلا جائے اسی طرح انصراف عن الشمال بھی جائز ہے کہ بائیں جانب بائیں ہاتھ پر اٹھ کر چلا جائے۔

پہلی بات: معارف السنن میں ہے کہ اس باب سے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ امام جانب یمین کے انصراف کو لازم نہ سمجھے۔ جس طرح ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ "لایجعل احدکم الشیطان حظه فی صلاته" کہ تم میں کوئی شیطان کیلئے اپنی نماز میں حصہ نہ بنائے۔ اسکی صورت یہ ہوگی کہ اپنے اوپر وہ لازم کردے کہ میں صرف دائیں جانب انصراف کرونگا کیونکہ نبی ﷺ اکثر جانب شمال کی طرف اٹھتے تھے۔

دوسری بات: معارف السنن میں ہے کہ ان احادیث کا یہ مطلب ہے کہ انسان کی ضرورت یمین میں جانے کی ہے تو یمین کی جانب انصراف کرے اور اگر ضرورت جانب شمال میں ہے تو شمال کی جانب انصراف کر کے چلا جائے۔ اب اگر حاجت نہ جانب یمین میں ہو اور نہ جانب شمال میں ہو تو پھر یمین کو اختیار کرنا اولی ہوگا۔ بشرطیکہ جانب یمین کو لازم نہ سمجھے، بغیر لازم سمجھنے کے دائیں طرف مڑنا اولی ہے۔ حضرت عائشہ کی حدیث کی وجہ سے جو سنن ابوداؤد میں ہے کان رسول اللّٰہ ﷺ یحب التیامن۔ اگر امام نماز کے بعد انصراف کا ارادہ نہ رکھتا ہو بلکہ وہاں ہی بیٹھنا چاہے تو وہ قبلہ رخ نہ رہے تاکہ آنے والے کو شبہ نہ ہو، اس لئے مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو بشرطیکہ کوئی نمازی سامنے نہ ہو، نبی کریم ﷺ کا اکثر جانب شمال کی طرف انصراف ہوتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ انکے حجرات جانب شمال میں تھے۔

باب ماجاء فی وصف الصلاة

اس باب کے اکثر مسائل تفصیل کے ساتھ گذر چکے ہیں۔ یہ روایت رفاعہ بن رافع سے منقول ہے، اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ مسجد میں تھے ایک آدمی آیا جو دیہاتی لگ رہا تھا اس نے نماز تخفیف کے ساتھ ادا کی پھر آیا آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا دوبارہ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی ہے، تین دفعہ اس طرح واپس کرتے رہے تو یہ دیکھ کر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو یہ بات شاق گذری کہ تخفیف کرنے کی وجہ سے نماز ہی نہیں ہوتی، پھر آپ ﷺ سے اس آدمی نے کہا کہ آپ سکھلا دیں تو آپ ﷺ نے طریقہ بتلایا کہ اعتدال سے پڑھو پھر فرمایا کہ اگر تم نے ان ارکان میں سے کسی میں کمی یا تخفیف کی تو اس کے بدلے میں ثواب کم ملے گا یہ سن کر صحابہ خوش ہوئے کیونکہ آخری جملے سے معلوم ہوا کہ تخفیف کرنے سے نماز بالکل ختم نہیں ہوتی بلکہ صرف نقصان آتا ہے۔

پہلی بات: امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہاء جو تعدیل ارکان کے فرضیت کے قائل ہیں۔ وہ لوگ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے نماز کے اعادے کا حکم دیا جو نماز کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ دوسرا فرمایا ارجع فصل فانک لم تصل اس سے معلوم ہوا کہ اعتدال ارکان سے نماز نہ پڑھی جائے تو نماز نہ ہوگی، معلوم ہوا اعتدال فی الارکان فرض ہے۔ احناف کے چند اقوال ہیں۔ ① بعض نے سنت ہونے کا قول نقل کیا ہے۔ ② کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجوب کا قول نقل کیا ہے۔ ③ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرض ہونے کا قول نقل کیا ہے۔ مگر محققین احناف نے وجوب کا قول اختیار کیا ہے۔ دلیل میں احناف یہ روایت پیش کرتے ہیں کیونکہ اسکے آخری جملہ میں ہے وان انتقصت منه شيئا انتقصت من صلاتک یعنی ارکان کی تعدیل میں کمی کا ثواب بھی اتنا ملتا ہے، یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ تعدیل ارکان واجب ہے۔ فرض نہیں ہے کیونکہ فرض کے ترک کرنے پر نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ثواب کی کمی کی بات نہیں۔ جبکہ اس جملے میں ہے۔ کہ اعتدال میں اگر تم نے کمی کی تو ثواب میں کمی ہوگی تو یہ وجوب پر صراحۃً دال ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی یہی بات سمجھی جو احناف نے سمجھی کیونکہ پہلے جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا فانک لم تصل۔ یہ سن کر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پریشان ہوئے کہ اعتدال میں کوئی کمی کرے، اسکی نماز نہ ہوگی۔ اس سے صحابہ کو تکلیف ہوئی مگر جب آخری جملہ وان نقصت منه شيئا ارشاد فرمایا تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی پریشانی ختم ہوئی کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ نماز ختم نہ ہوگی اسمیں کمی آئیگی اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ بھی یہی سمجھے ہیں۔ معارف السنن میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ ائمہ ثلاثہ نے جو بات سمجھی ہے۔ یہ وہی بات ہے جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سمجھی تھی۔ اور احناف نے وہ استنباط سمجھا جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حدیث کے آخر سے استنباط سمجھا۔ باقی نبی ﷺ نے اعادے کا حکم دیا یہ احناف کے خلاف نہیں کیونکہ احناف کے ہاں جب واجب چھوڑا تو نماز ناقص پڑھی اور مکروہ تحریمی کے ساتھ نماز ادا ہوگئی اور احناف کے ہاں قاعدہ ہے کل صلاۃ ادیت مع الکراھۃ فاعادتها واجبة باقی حدیث کا جملہ فانک لم تصل یہ تنزیل الناقص بمنزلۃ المعدوم کے ہے کہ جب واجب کو چھوڑا تو نماز ناقص پڑھی اور ناقص کو معدوم قرار دے کر فانک لم تصل فرمایا۔

دوسری بات: ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اعتراض کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پہلی دفعہ دیکھا کہ اس آدمی نے پہلی دفعہ اعتدال کے بغیر نماز پڑھی، اس لئے یہ نماز مکروہ تحریمی کے ساتھ ادا ہوگئی، اب آپ ﷺ نے پہلی دفعہ طریقہ کیوں نہیں بتایا جبکہ وہ دو تین دفعہ اسی طرح کراہت کے ساتھ پڑھتا رہا یہ تو ایسا ہے کہ نبی ﷺ نے اسکو گناہ پر برقرار رکھا۔

جواب ❶: کراہت تحریمی کے ساتھ جو نماز ادا ہو ثواب اس پر بھی ملتا ہے، اسلئے اس آدمی کو دو تین دفعہ نہیں بتایا جب وہ نماز پڑھتا رہا تو اسکو ثواب ملتا رہا۔

جواب ❷: آپ نے دوبارہ پڑھنے کا کہا تثبیت کیلئے کہ آپ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ غلطی اسکی عادت ہے یا عارضی اور اتفاقی ہے جب معلوم ہوا کہ اسکی عادت ہے تو پھر سمجھایا۔

جواب ❸: آپ نے دو تین دفعہ جو مہلت دی یہ اسلئے دی کہ اسکو خود پوچھنا چاہئے تھا مگر اس نے استغناء ظاہر کیا اور اسکا زعم تھا کہ مجھے طریقہ آتا ہے اسلئے اگر از خود بتاتے تو صحیح طریقے سے آپ ﷺ سے طریقہ نہ سیکھتا کیونکہ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ مجھے طریقہ آتا ہے۔ اس لیئے اس کو بار بار بھیجا تا کہ وہ سمجھے کہ مجھے تو طریقہ نہیں آتا اس لیئے وہ غور سے طریقہ سیکھے گا۔ یہ مقصد تھا گناہ پر برقرار رکھنا مقصود نہ تھا۔

اذجاء رجل کالبدوی: یہ آدمی خلاد بن رافع تھا، یہ صحابی ہیں، بدوی نہیں تھے بلکہ مدینہ میں رہتے تھے۔ اس لئے کہا "کالبدوی" کہ بدوی نہیں لیکن انکی طرح تھے۔

فصلی فاخف صلاتہ: یہاں تخفیف ہے ارکان کی تخفیف مراد ہے، قرأت کی تخفیف مراد نہیں کیونکہ تخفیف فی القرأۃ تو خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ کبھی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو تخفیف کردیتے تھے۔ "مخافة ان تفتن امه"

محمد بن عمرو بن عطاء عن ابی حمید الساعدی۔ یہ صفۃ الصلاۃ کی دوسری حدیث ہے، اس کے اندر بہت سے اختلافی مسائل مذکور ہیں جو بمع ادلہ گزر چکے ہیں، یہاں صرف سند سے بحث ہے۔

پہلی بات: احناف میں طحاوی کی رائے یہ ہے کہ ابوحمید الساعدی کی یہ حدیث صحیح نہیں، محمد بن عمرو بن عطاء ابوحمیدی ساعدی سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحمید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث دس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موجودگی میں بیان کی۔ ان دس میں سے ایک ابوقتادہ بھی تھے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ ابوقتادہ کا انتقال علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں ۳۸ھ میں ہوا۔ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور محمد بن عمرو بن عطاء ۱۲۰ھ کو فوت ہوئے۔ محدثین کہتے ہیں کہ انکی عمر ۸۰ سال تھی۔ یہ حساب لگایا جائے تو ۴۰ھ کے بعد پیدا ہوئے ہونگے۔ تو ابوحمید کا مجلس لگانا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موجود ہونا محمد بن عمرو کا بھی موجود ہو کر سننا قابل اشکال ہے۔ کیونکہ اس وقت محمد بن عمرو پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ دوسرا اسکی سند میں محمد بن عمرو کے بجائے دوسری بعض طرق میں عباس بن سہیل ہیں، اور عباس بن سہیل جس طرح نقل کرتے ہیں اس میں نہ رفع یدین کا ذکر ہے، نہ تورک کا ذکر ہے اور عباس بن سہیل کی حدیث صحیح بھی ہے۔

دوسری بات: طحاوی نے ثابت کیا ہے کہ ابوحمید ساعدی نے جس مجلس میں حدیث سنائی ہے اس میں سارے یعنی دس کے دس صحابہ نہ تھے بلکہ تین صحابی تھے۔

تیسری بات: طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسکے متعدد طرق کو جمع کیا ہے، تو طحاوی نے اضطراب بھی ثابت کیا ہے، اسلئے ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اس کو حسن صحیح کہنا قابل اعتبار نہیں۔

باب ماجاء فی القرأة فی الصبح

یہ باب اور اسکے بعد مزید تین ابواب ہیں، ان میں نمازوں میں مستحب قرأت کا ذکر ہے۔ اس میں کسی امام کا اختلاف نہیں سب کے ہاں فجر میں طوال مفصل، ظہر میں اسی طرح عصر اور عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل افضل ہے۔ سورۃ محمد یا سورۃ فتح یا حجرات سے سورۃ والضحی یاسبح سم ربک الاعلیٰ تک طوال مفصل ہے۔ وہاں سے الم ترکیف تک اوساط مفصل اور الم ترکیف سے آخر قرآن تک قصار مفصل ہے۔

باب ماجاء فی القراۃ خلف الامام باب ماجاء فی ترک القرأة

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی، قرأت پڑھنا آپ کے لئے دشوار ہوا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، میرا خیال ہے کہ تم امام کے پیچھے نماز میں قرأت کرتے ہو، ہم نے کہا ہاں یارسول اللہ، آپ نے فرمایا کہ مت پڑھا کرو سوائے سورت فاتحہ کے کیونکہ اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

دوسرے باب میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ جہری نماز پڑھا رہے تھے۔ نماز کے بعد آپ نے پوچھا کہ نماز میں میرے ساتھ کسی نے قرأت کی۔ ایک آدمی نے کہا میں نے کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں کہتا ہوں کہ قرآن میں مجھ سے منازعت کیوں کی جارہی ہے۔ یہ بات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنی تو جہری نماز میں

قرأت خلف الامام سے رک گئے۔ دوسری روایت حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جو فاتحہ نماز میں نہ پڑھے اسکی نماز نہیں ہوتی الا یہ کہ وہ مقتدی ہو اس کو فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔

پہلی بات: اس مسئلے کا تعلق قرأت خلف الامام سے ہے، مسئلہ یہ ہے کہ کوئی مقتدی ہو تو یہ مقتدی امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں کچھ اختلاف ہے کچھ اتفاق ہے، اتنی بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر کوئی امام کے پیچھے ہو تو فاتحہ کے علاوہ باقی قرآن نہ پڑھے اس پر سب کا اتفاق ہے کسی کے ہاں فاتحہ کے علاوہ باقی قرآن پڑھنا جائز نہیں۔

دوسری بات: امام کے پیچھے سورت فاتحہ کا پڑھنا اس کا کیا حکم ہے؟ یہ مسئلہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔

❶ ایک حصہ جہری نمازوں سے متعلق ہے۔ ② دوسرا حصہ سری نمازوں سے متعلق ہے۔

تیسری بات: جہری نمازوں کے متعلق ائمہ کے اقوال یہ ہیں ا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک، امام احمد قول قدیم میں، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء و محدثین کے ہاں جہری نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام جائز نہیں۔ بعض علماء کی تحقیق کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جدید بھی یہی ہے۔ اس تحقیق کو لیا جائے تو جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام بالاتفاق نہیں۔ احناف کے ہاں بالکل جائز نہیں، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی عدم جواز کا قول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول اباحت کا ہے مگر دوسرا قول انکا بھی عدم جواز کا ہے۔

❷ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول، داؤد ظاہری، اما بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل ظواہر کے ہاں فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

چوتھی بات: سری نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام کا کیا حکم ہے؟ ا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے کئی اقوال منقول ہیں، مشہور قول جہری کی طرح سری نمازوں میں بھی قرأت فاتحہ خلف الامام جائز نہیں، فقہ کی بعض کتابوں میں امام صاحب کے کئی اقوال بھی منقول ہیں: ① واجب ہے۔ ② سنت ہے۔ ③ مستحب ہے۔ ④ مباح ہے۔ فقہاء احناف میں سے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے کہ وہ سری نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔

❷ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سری نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام مستحب ہے۔

❸ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل ظواہر کے ہاں سری نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

قرأت خلف الامام کے قائلین باب اول کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ہے۔ **لاتفعلوا الابام القرآن** یہ حکم صبح کی نماز میں دیا تھا تو جب جہری نماز میں قرأت فاتحہ کی اجازت دے دی تو سری میں بطریق اولی اجازت ہوگی۔

احناف کا مستدل جہری نمازوں میں عدم قرأت فاتحہ خلف الامام کیلئے ایک تو قرآن کی آیت ہے یعنی ﴿اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا﴾ اس میں اختلاف ہے کہ یہ خطبے کے متعلق اتری ہے۔ بعض نے کہا نماز کے متعلق اتری ہے، اگر خطبے کے متعلق اتری ہو تو پھر بھی استدلال جائز ہے کیونکہ عموماً الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے مورد کے خصوص کا اعتبار نہیں ہوتا۔ احناف کہتے ہیں کہ فاستمعوا کا حکم جہری نمازوں کے لئے ہے۔ اور وانصتو کا حکم سری نمازوں کیلئے ہے، مگر علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس سے سری نمازوں میں عدم قرأت خلف الامام کا استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ جہری نماز کے بارے میں ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو۔

احناف کی دوسری دلیل ابوموسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے اسکو امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقل کیا ہے ابوعوانہ نے

تفصیل سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے خطبہ دیا وعظ کیا، اس میں نماز کے مسائل بھی بتائے اور فرمایا۔ **اذا کبر الامام فکبروا اذا رکع فارکعوا واذا سجد فاسجدوا** اس میں یہ الفاظ ہیں کہ **واذا قرأ فانصتوا** مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے۔اس کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔

احناف کی تیسری دلیل سنن ابن ماجہ۔سنن نسائی۔اور دوسری کتابوں میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ **اذا قرأ فانصتوا**

چوتھی دلیل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کئی کتابوں میں ہے، دارقطنی اور شرح الکبیر وغیرہ میں بھی ہے۔اس میں الفاظ یہ ہیں کہ **من کان له امام فقرأة الامام له قرأة** شرح الکبیر میں ہے کہ یہ حدیث سنداً بالکل صحیح ہے۔

پانچویں بات: عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث ہے، شروع میں احناف کہتے ہیں کہ اس حدیث کے دو جز ہیں: ①۔ **لاتفعلوا الابام القرآن** ۔②۔دوسرا واقعہ جو عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ پر فجر میں قرأت بھاری ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو، احناف اسکے بارے میں چند باتیں کہتے ہیں:

❶ عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث معلول ہے کیونکہ عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے نبی ﷺ کا واقعہ نہیں، محمود بن ربیع کہتے ہیں کہ میں فجر میں عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھا، عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام کے پیچھے قرأت کی محمود بن ربیع نے پوچھا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرر ہے تھے؟ انہوں نے کہا میں اسلئے پڑھتا ہوں کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے۔ **لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** معلوم ہوا یہ نبی ﷺ کا واقعہ نہیں، عبادہ کا واقعہ ہے۔

❷ دوسرا عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے قول سے استدلال کیا، اس سے معلوم ہوا کہ عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث سے اجتہاد کر کے قرأت امام کے پیچھے کی۔

❸ تیسری بات یہ ہے کہ باب کی حدیث میں محمود بن ربیع فرماتے ہیں کہ جب عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام سنی تو محمود بن ربیع نے تعجب کیا، اور پوچھا کہ آپ قرأت کرر ہے ہیں، معلوم ہوا اسوقت قرأت خلف الامام کا رواج نہ تھا، اسلئے انکو تعجب ہوا۔

❹ چوتھی بات یہ ہے کہ عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرأت خلف الامام کو لازم نہ سمجھتے تھے، اگر لازم سمجھتے تو محمود بن ربیع نے چونکہ امام کے پیچھے قرأت نہ کی۔اسلئے عبادۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انکو اعادے کا حکم دیتے، جبکہ انہوں نے اعادے کا حکم نہیں دیا۔

احناف کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے مقتدی کے بارے میں کئی احادیث منقول ہیں۔ایک حدیث ہے کہ **لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** ۔دوسری حدیث سنن نسائی میں ہے۔ **اذا قرأ فانصتوا** ۔تیسری حدیث صحیح مسلم میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے، اسی طرح قرآن میں ہے۔ **اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا** اب ان کو جمع کرنے کی صورت شوافع نے اختیار کی ہے کہ عام حکم تو یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو یعنی **فاستمعوا له وانصتوا** مگر فاتحہ والی حدیث اس کے لئے مخصص ہے۔اور احناف نے اسطرح جمع کیا ہے کہ قرآن کی آیت اور وہ احادیث جن میں انصات کا ذکر ہے۔وہ احادیث مقتدی کیلئے ہیں۔ اور **لاصلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** یہ منفرد پر محمول ہے۔چنانچہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ باب کی حدیث منفرد پر محمول ہے۔احناف والی جمع کی اس صورت کو اگر اختیار کیا جائے تو تمام احادیث معمول بہا ہونگی، کسی حدیث میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

باب ماجاء فی ترک القرأة خلف الامام اذا جهر بالقرأة

اس میں جو روایت ہے یہ احناف اور جمہور کی دلیل ہے۔ شوافع نے اعتراض کیا ہے کہ اسمیں اکیمۃ اللیثی ضعیف ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ آپ کی بات غلط ہے، یہ ثقہ راوی ہے۔

دوسرا اعتراض کرتے ہیں کہ فانتھی الناس عن القرأۃ یہ زہری کا قول ہے۔

اسکا ایک جواب یہ ہے کہ یہ زہری کا قول نہیں بلکہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ جس طرح سنن ابوداؤد میں اسکی تصریح ہے کہ قال ابوھریرۃ فانتھی الناس عن القرأۃ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ جب زہری نے اپنے شاگردوں کو یہ حدیث سنائی بعض شاگرد نہ سن سکے۔ انہوں نے ساتھیوں سے پوچھا۔ ماقال الزھری؟ انہوں نے جواب دیا کہ۔ قال الزھری فانتھی الناس عن القرأۃ۔ اس سے بعض لوگ سمجھے کہ یہ زہری کا قول ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر زہری کا قول ہوتو پھر بھی مانع نہیں کیونکہ انہوں نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھا ہوگا کہ وہ قرأت خلف الامام نہ کرتے تھے۔ اسلئے زہری نے کہا کہ فانتھی الناس عن القرأۃ۔

وقالو یتبع سکتات الامام: ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ باب ثانی کی روایت قرأت خلف الامام کے منافی نہیں کیونکہ سکتات میں قرأت کی جائے گی۔ مگر ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی یہ بات غلط ہے کیونکہ حدیث میں صراحۃً ہے کہ فانتھی الناس عن القرأۃ دوسرا کسی بھی صحابی سے سکتات الامام میں قرأت ثابت نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ من صلی صلاۃ لم یقرا فیھا بام القرآن فھی خداج شوافع کہتے ہیں کہ من کا لفظ عام ہے کہ جو بھی فاتحہ نہ پڑھے اسکی نماز نہ ہوگی۔

احناف کہتے ہیں کہ کبھی من خصوص کیلئے بھی آتا ہے، جس طرح ویستغفرون لمن فی الارض میں "لمن" سے مراد مسلمان ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی من خصوص کیلئے ہے کہ منفرد کیلئے فاتحہ لازمی ہے اور ہم بھی اسکے قائل ہیں۔

من صلی صلاۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج: میں لفظ خداج جو بتا رہا ہے کہ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں کیونکہ خداج کا معنی ہے ناقص، اگر فاتحہ فرض ہوتی تو فرض کے ترک سے نماز ناقص نہیں ہوتی، بلکہ بالکل سرے سے نماز ہوتی ہی نہیں۔

احناف میں علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اسی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے عدم قرأت خلف الامام کے آثار منقول ہیں۔

اقرأبھا فی نفسک احناف کے ہاں اس سے مراد تدبر ہے کہ قرأت نہ کرے اس میں غور وفکر ہے۔

باب مایقول عند دخول المسجد

حضرت فاطمۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے حدیث منقول کی ہے کہ مسجد میں داخل ہوتو کیا دعا پڑھے۔

پہلی بات: مسجد میں داخل ہونے کے آداب یہ ہیں کہ دایاں پاؤں پہلے داخل کرے، اور نکلتے وقت پہلے بایاں پاؤں نکالے، اسی طرح داخل ہوتے وقت درود شریف پڑھے، پھر رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک پڑھے، اور جب نکلے تو درود پڑھے اور رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلک پڑھے، یہ طریقہ مسنون ہے اس کے خلاف مکروہ ہے، اب مکروہ تنزیہی ہے یا مکروہ تحریمی۔ اسمیں دونوں اقوال ہیں۔

دوسری بات: باب کی حدیث سنداً منقطع ہے کیونکہ فاطمہ بنت حسین فاطمہ کبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کرتی ہیں جبکہ فاطمہ کبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فاطمہ بنت حسین کی ملاقات ثابت نہیں بلکہ فاطمہ کبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال جب ہوا تو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چھ ماہ زندہ رہی تھیں۔

تیسری بات: داخل ہوتے وقت رحمتک کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ مسجد کے اندر آدمی ذکر، تلاوت اور نماز پڑھتا ہے۔ یہ چیزیں سب رحمت ہیں، اسلئے دخول کے وقت رحمت کی دعا مانگنی چاہئے اور نکلنے کیلئے فضل کا لفظ استعمال کیا کیونکہ جب نکلتا ہے تو رزق تلاش کرتا ہے جس طرح قرآن میں ہے ﴿فاذا قضیت الصلاۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ﴾ اور فضل سے رزق مراد ہے اسلئے اللہ سے فضل مانگنا چاہیے۔

باب ماجاء اذا دخل احدکم المسجد فلیر کع رکعتین

ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرے۔

پہلی بات: اس باب میں تحیۃ المسجد کا ذکر ہے۔ باب کی حدیث کے متعلق چند باتیں ہیں۔

دوسری بات: حدیث میں جو مذکور ہے کہ فلیر کع رکعتین۔ فقہاء ان رکعتین کو اپنی اصطلاح میں تحیۃ المسجد کہتے ہیں، معارف السنن میں ہے کہ حقیقت میں یہ تحیۃ المسجد ہے۔

تیسری بات: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن رکعتین کے پڑھنے کا حکم دیا ہے تو ان رکعتین کا فقہی حکم کیا ہے؟ اسکے حکم میں اختلاف ہے۔

❶ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، اور صحیح تر قول میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان رکعتین کا حکم استحباب کا ہے۔ احناف کی بعض کتابوں میں سنت کی تعبیر کی ہے اور بعض کتابوں میں استحباب کی تعبیر کی ہے اور شوافع کی کتابوں میں سنت کی تعبیر کی ہے، جو بھی ہو مقصود یہ ہے کہ وجوب نہیں۔ داؤد بن علی ظاہری کے ہاں اس کا حکم وجوب کا ہے۔ مگر ابن حزم ظاہری نے المحلی میں عدم وجوب کو ترجیح دی ہے۔

❷ داؤد بن علی ظاہری کی دلیل باب کی حدیث ہے اس میں ہے "فلیر کع" اور یہ امر کا صیغہ ہے، امر وجوب کیلئے آتا ہے، اس لئے حکم کا وجوب ہوگا۔

احناف اور جمہور کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ روایات ایسی منقول ہیں کہ جن سے عدم وجوب کا حکم ثابت ہوتا ہے اور اصول فقہ میں موجود ہے کہ امر وجوب کیلئے ہوتا ہے مگر اگر قرینہ صارفہ عن الوجوب موجود ہو تو پھر امر وجوب کیلئے نہ ہوگا۔ یہاں بھی دوسری احادیث میں قرینہ صارفہ عن الوجوب موجود ہے، جس طرح سنن اور صحاح کی کتابوں میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا گردنیں پھلانگ کر صف اول میں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اجلس فقد آذیت یہاں جمہور استدلال کرتے ہیں اگر تحیۃ المسجد واجب ہوتا تو اس آدمی کو کہتے کہ رکعتین پڑھو پھر بیٹھو۔ اسی طرح مصنف ابوبکر ابن ابی شیبہ میں اثر موجود ہے کہ۔ کان اصحاب النبی یدخلون المسجد ولم یصلونه کبھی داخل ہوتے تھے۔ اور نماز تحیۃ المسجد نہ پڑھتے تھے، معلوم ہوا وجوب نہیں۔

چوتھی بات: کوئی اوقات مکروہ میں مسجد میں آیا تو تحیۃ المسجد پڑھے نہ پڑھے۔ تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ صحیح قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اوقات مکروہ میں مسجد میں آیا تو تحیۃ المسجد جائز نہیں، دوسری نہی کی احادیث کی وجہ سے اور نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شافعی کے صحیح قول میں تحیۃ المسجد اوقات مکروہہ میں جائز ہیں۔ شوافع اسکے بارے میں کہتے ہیں کہ

ذوات الاسباب نوافل اوقات مکروہہ میں پڑھنے جائز ہیں۔ یہ لوگ۔ اذا جاء احد کم المسجد کونہی کی روایات کیلئے مخصص مانتے ہیں۔ جبکہ احناف اور جمہور اس مذکورہ روایت کیلئے نہی کی احادیث کومخصص مانتے ہیں، جمہور کی بات صحیح بھی ہے کیونکہ اباحت اور ممانعت میں تعارض آجائے تو ممانعت والے دلائل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں وجوہ ترجیح میں لکھا ہے کہ نہی اور اباحت میں جب تعارض ہوا اور جمع ممکن نہ ہو تو نہی کو ترجیح ہوتی ہے۔

پانچویں بات: کوئی مسجد میں آگیا اور بیٹھ گیا تو تحیۃ المسجد کا استحباب جلوس سے ساقط ہوگا یا نہیں؟ تو شوافع کے صحیح اقوال میں جلوس سے استحباب ساقط ہو جائیگا، مگر ائمہ ثلاثہ کے ہاں جلوس سے استحباب ساقط نہیں ہوگا۔ باقی حدیث میں "قبل ان یجلس" کی قید اتفاقی ہے۔

ابن حبان نے حدیث پر باب قائم کیا ہے "باب ماجاء فی ان تحیة المسجد لایسقط بالجلوس" اس میں ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث لائی ہے کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ دو رکعتیں پڑھی ہیں؟ میں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا "قم فارکع رکعتین" معارف السنن میں ہے کہ وقفہ طویل ہو جائے تو استحباب ساقط ہو جائے گا لیکن وقفہ طویل نہ ہو تو استحباب ساقط نہ ہوگا۔

چھٹی بات: تحیۃ المسجد کی دو رکعت سب مسجدوں کا تحیۃ ہے، سوائے مسجد حرام کے تحیۃ کے کیونکہ تمام ائمہ کے ہاں مسجد حرام کا تحیہ طواف ہے۔

ساتویں بات: تحیۃ المسجد کا بعض مواقع سے استحباب ساقط ہو جاتا ہے۔ مثلاً وقت تنگ ہے یا جماعت کھڑی ہے یا بے وضوء مسجد میں داخل ہو۔

آٹھویں بات: ہمارے فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ کوئی آدمی مسجد میں آئے اور وقت کی تنگی کی وجہ سے رکعتین ادا نہیں کر سکتا تو اگر چند دفعہ یہ تسبیح۔ سبحان الله والحمدلله ولا اِلٰهَ الاالله والله اكبر ۔ پڑھ لے تو ثواب مل جائے گا مگر یہ کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں۔ صرف تابعین سے منقول ہے۔

باب ماجاء ان الارض كلها مسجد الا المقبرة والحمام

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین پوری کی پوری مسجد ہے سوائے مقبرہ اور حمام کے۔

پہلی بات: احادیث سے ثابت ہیکہ ان الارض كلها مسجد یہ اس امت کی خصوصیت ہے کیونکہ پہلی امتوں کیلئے معبد سے باہر عبادت کرنا جائز نہ تھا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جن خصوصیات سے نوازا ہے، ان میں سے یہ خصوصیت بھی عطاء کی ہے کہ ہر جگہ نماز ادا کر سکتے ہیں، الا یہ کہ کوئی مانع ہو مثلاً زمین نجس ہو پھر اس جگہ نماز جائز نہ ہوگی کیونکہ طہارت مکان شرط ہے۔

اس مذکورہ حدیث میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عوارض کی دو مثالیں دی ہیں کہ ان عوارض کی وجہ سے ہر جگہ نماز جائز نہیں وہ یہ ہیں یعنی مقبرہ اور حمام، مقبرہ کثرت پر دلالت کرتا ہے اسلئے مقبرہ اسکو کہیں گے جس میں کثیر قبریں ہوں

دوسری بات: حمام او مقبرہ میں نماز کا کیا حکم ہے؟ اسمیں اختلاف ہے، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور اہل ظواہر کے ہاں یہ نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ جمہور کے ہاں نہی کراہت تحریمی کیلئے ہے۔

تیسری بات: مقبرہ میں نماز کی ممانعت تب ہے جبکہ قبر سامنے ہو اور قبر اور مصلی کے درمیان کچھ حائل نہ ہو لیکن اگر مسجد مقبرے میں ہو اور سامنے دیوار ہو پھر کراہت نہ ہوگی بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قبر دائیں بائیں یا پیچھے ہو تو نماز میں کراہت نہیں۔

چوتھی بات: حمام میں نماز کی ممانعت تب ہے جب جگہ پاک نہ ہو تو جگہ کی نجاست کے احتمال کی وجہ سے مکروہ ہے اور بعض نے کراہت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگوں کی عورت نظر آئے گی، اسلئے اگر وہاں جگہ بنی ہوئی ہو عورت نہ نظر آئے تو نماز جائز ہوگی۔ بعض نے مطلق کراہت کا کہا ہے کہ کیونکہ اس میں نماز کی توہین ہے اسلئے کہ یہ عظمت کی جگہ نہیں۔

پانچویں بات: بعض شارحین جیسے تعلیق الصبیح میں مولانا ادریس رحمۃ اللہ تعالیٰ نے علامہ تورپشتی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مقبرے میں نماز کی کراہت بھی مطلق ہے کیونکہ اگر قبر کی طرف نماز پڑھے، اگر قصد قبر کی تعظیم کا ہو تو شرک ہے۔ اگر صرف قبر کی وجہ ہو پھر بھی جائز نہیں کیونکہ تعظیم کا شبہ ہے اور اگر نہ تعظیم کرے اور نہ تعظیم کا شبہ ہو تو بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں قبور کی عبادت کرنے والوں سے مشابہت لازم آئے گی۔

باب ماجاء فی فضل بنیان المسجد

عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ جس نے اللہ کے لئے مسجد بنائی تو اللہ اس جیسا گھر جنت میں اسکے لئے بنائیں گے۔

دوسری حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اس میں صغیراً کان اوکبیراً زیادتی ہے۔

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مقصد مسجد بنانے کی فضیلت ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اسمیں کسی کا اختلاف نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے کثرت سے مسجد بنانے کے فضائل منقول ہیں۔ تو ترجمۃ الباب میں جو مسئلہ ہے یہ مفروق عنہا ہے۔

دوسری بات: معارف السنن میں ہے کہ حدیث میں جو ہے کہ من بنی للہ مسجداً اس میں ''للہ'' کا لفظ اسلئے لایا کہ کوئی بھی کار خیر ہو اسکی مقبولیت کیلئے اخلاص شرط ہے تو ''للہ'' لاکر اس اخلاص کو ذکر کیا جو قبولیت کی شرط ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ کسی نے مسجد بنائی اور اس پر اپنا نام لکھا تو ثواب نہ ملے گا۔

تیسری بات: حدیث میں لفظ ہے من بنی للہ مسجداً کی تنوین تعظیم اور تکثیر کیلئے ہے کہ جیسی مسجد ہو چھوٹی ہو یا بڑی اس کے بنانے سے فضیلت ملے گی۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوسری روایت میں ہے کہ ''صغیراً کان اوکبیراً'' اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے گھونسلے کے برابر بھی مسجد بنائی تو اللہ اس کے مثل گھر جنت میں بنائیں گے۔

چوتھی بات: حدیث میں ہے ''من بنی للہ مسجداً بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ'' اب مثلہ سے کیا مراد ہے۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے عمدۃ القاری میں مثلہ کے دس وجوہ لکھی ہیں، مشہور یہ ہے کہ مثلیت سے مثلیت عمل مراد ہے۔ کہ جس طرح اس آدمی نے اللہ کے لئے مسجد بنائی۔ اسی طرح جنت عام ہے مگر اسکے لئے مخصوص گھر بنائیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ آدمی نے جتنی بڑی مسجد بنائی ہو گھر بھی اتنا ہی بنائیں گے کیونکہ بندہ عاجز ہے، وہ اپنی طاقت کے اعتبار سے بنائے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ اپنی قدرت سے جتنا بڑا چاہیں بنائیں گے۔

پانچویں بات: من بنی للہ مسجداً بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ دوسری جگہ تفصیل ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں انہوں نے دور دراز ملکوں سے عمدہ پتھر لائے اور مسجد میں توسیع کرنا چاہی بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعتراض کیا کہ نبی ﷺ کے بنیادوں کو کیوں بدل رہے ہو، اس پر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ میں نے سنا ہے کہ جس نے اللہ کیلئے مسجد بنائی اللہ اسکی مثل اسکے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔ اسلئے میں اچھی مسجد بنا رہا ہوں۔

معارف السنن میں اس مقام پر مسجد کے نقش ونگار کا مسئلہ لکھا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر متولی اپنے مال اور دولت سے تزئین وآرائش

کرے تو کر سکتا ہے، مسجد کے مال سے نہیں کر سکتا، البتہ ایک صورت یہ ہے کہ مسجد کا اتنا پیسہ ہو کہ ضائع ہونیکا خطرہ ہو تو پھر تزئین جائز ہے مگر علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ آجکل چندے کے مال سے تزئین جائز ہے کیونکہ چندہ دینے والے مسجد کی تزئین کو بھی مسجد کی بنا میں داخل سمجھتے ہیں۔

چھٹی بات: ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک مسجد کا مال بہت زیادہ ہو کہ ضرورت سے زیادہ تو وہ دوسری مسجد یا مدرسے میں اسکو دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو متقدمین حضرات فرماتے ہیں کہ جائز نہیں کیونکہ دینے والوں نے اسی نام پر دیا ہے لیکن متاخرین کے نزدیک جائز ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ أن یتخذ علی القبر مسجداً

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے قبور کی زیارت کرنے والی عورتوں پر۔ اور قبور پر مساجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر۔

پہلی بات: حدیث کے تین جملے ہیں ① زائرات القبور پر آپ نے لعنت کی۔ اسکے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ ابتداءً نبی ﷺ نے ممانعت فرمائی تھی مگر بعد میں جب لوگوں کو مسائل معلوم ہوئے تو نبی ﷺ نے اجازت دیدی جس طرح حدیث میں ہے انی نھیتکم عن زیارۃ القبور الافزوروھا الخ اب بعد میں جب اجازت دی اسکے متعلق دو رائے ہیں، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اجازت صرف مردوں کے لئے ہے عورتوں کیلئے اب بھی ممانعت ہے، مگر بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلے ممانعت دونوں کیلئے تھی، اسلئے اب اجازت بھی دونوں کیلئے ہوگی۔ ہمارے متاخرین علماء نے لکھا ہے کہ عورتوں کیلئے اب بھی زیارت قبور نا جائز اور منع ہے، چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے کہ ایک عالم سے کسی نے زیارت قبور کے متعلق پوچھا کہ عورت جا سکتی ہے یا نہیں تو انہوں نے جواب دیا اجازت ہے یا نہیں یہ نہ پوچھو بلکہ یہ پوچھو کہ عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو اس کے ساتھ کتنی لعنت ہوتی ہے۔

اب عورتوں کیلئے ممانعت کی علت کیا ہے؟ تو بعض کہتے ہیں کہ حدیث میں جو اجازت ہے یہ صرف مردوں کیلئے ہے، عورتوں کیلئے اب بھی ممانعت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اجازت عورتوں کو بھی شامل ہے مگر خارجی موانع کی وجہ سے عورت کو منع کر دیا گیا کیونکہ عورتوں میں جزع فزع زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض نے فرق کیا ہے کہ بوڑھیاں جا سکتی ہیں نوجوان نہیں جا سکتیں۔

دوسری بات: مردوں کیلئے جو زیارت قبور کی اجازت ہے عرف الشذی کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ صالحین کی قبور کی زیارت کیلئے سفر کرنا اسکا ثواب نہیں، البتہ آبادی کے قریب قبرستان ہو وہاں جانا مستحب ہوگا کیونکہ فانھا تذکر الاخرۃ حضور ﷺ بھی جنت البقیع میں زیارت کیلئے جاتے تھے۔

تیسری بات: دوسرا جملہ ہے "والمتخذین علیھا المساجد" ہمارے عام فقہاء نے لکھا ہے کہ قبر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ قبر بلا حائل سامنے ہو تو ممانعت ہے اور اگر قبر سامنے ہو حائل کے ساتھ یا سامنے نہ ہو پھر اگر وہاں نماز کی جگہ بنی ہوئی ہو تو وہاں نماز جائز ہوگی، باقی قبرستان میں مسجد بنانا جائز نہیں کیونکہ وقف کرنے والے کے وقف کو تبدیل کرنا جائز نہیں، لیکن اگر پرانی قبریں ہوں اور اب وہاں کوئی قبریں نہ بناتے ہوں پھر وہاں مسجد بنانا جائز ہے جس طرح مسجد نبوی پرانی قبرستان پر بنائی گئی تھی۔

چوتھی بات: باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ انبیاء اور صالحین کی قبور کے پاس نمازیں ادا کرتے تھے تو حدیث میں اسکی ممانعت کی کہ انبیاء اور صالحین کی قبروں پر نماز جائز نہیں۔ گزر چکا ہے کہ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اگر اس سے قبر کی تعظیم مقصود ہو تو یہ شرک جلی ہے اور اگر توجہ مقصود ہو تو شرک خفی ہے اور اگر نہ توجہ مقصود ہو اور نہ تعظیم مقصود ہو پھر فقط

شبہ کی وجہ سے ممانعت ہوگی۔ سداللذ رائع۔

پانچویں بات: تیسرا جملہ ہے "والسراج" میت کی تعظیم کیلئے چراغ جلانا بالاتفاق حرام وناجائز ہے، ہاں اگر قبرستان بڑا ہے لوگ رات کو جاتے ہیں تو راستے میں اندھیرا دور کرنے کیلئے چراغ جلانا جائز ہے۔

باب ماجاء فی النوم فی المسجد

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد میں سویا کرتے تھے اور ہم نوجوان تھے۔

پہلی بات: باب کی حدیث سے فقہائے احناف نے مسئلہ ثابت کیا ہے وہ یہ کہ زمین پر نجاست لگ جائے پھر سوکھ جائے اور نجاست کا اثر باقی نہ رہے تو وہ جگہ پاک ہو جائیگی، دلیل باب کی حدیث ہے اس میں فرمایا "ونحن شباب" یہ جملہ اسلئے لایا کہ احتلام ہوسکتا تھا اور احتلام ہو تو زمین پر اسکا اثر پڑتا ہے تو اسکو دھویا نہ جاتا تھا بلکہ خشک ہونے پر اکتفاء کیا جاتا تھا۔

دوسری بات: حدیث کو ترمذی نے نوم فی المسجد کیلئے ذکر کیا ہے تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مسجد میں مسافر اور ضرورتمند کیلئے سونا جائز ہے مگر جسکا گھر ہو یا کوئی حاجت نہ ہو تو ایسے شخص کیلئے سونا جائز نہیں، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اسی طرح اصحاب صفہ مسجد میں سوتے تھے ضرورت کی وجہ سے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر نہ تھا اور اصحاب صفہ ضرورتمند تھے۔

باب ماجاء فی کراهية البيع والشراء وانشاد الضالة والشعر فی المسجد

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے حدیث لائے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے مسجد میں اشعار پڑھنے سے، بیع وشراء کرنے سے اور منع کیا اس بات سے کہ مسجد میں جمعے سے پہلے حلقے بنائے جائیں۔

پہلی بات: باب کی حدیث سے تین چیزوں کی کراہیت ثابت ہوتی ہے ① بیع وشرا کی کراہیت ② انشاد ضالہ کی کراہیت ③ انشاد شعر کی ممانعت۔

دوسری بات: ائمہ کا پہلے مسئلے پر اتفاق ہے کہ مسجد میں بیع وشراء جائز نہیں بیع وشراء کی مسجد میں دو صورتیں ہیں ① بیع وشراء فی المسجد ہو باحضار المبیع اس صورت کی ممانعت اور کراہیت اشد ہے۔ ② بیع وشرا فی المسجد ہو بدون احضار مبیع یعنی مسجد میں صرف ایجاب وقبول ہو یہ صورت بھی ممنوع ہے مگر اسکی ممانعت اور کراہت اول صورت کی کراہت اور ممانعت سے ہلکی ہے بلکہ بعض فقہاء نے دوسری صورت کی اجازت بھی دیدی ہے۔

تیسری بات: دوسرا مسئلہ انشاد ضالہ کا ہے، علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ انشاد ضالہ کی دو باتیں ہیں۔ ①۔ کوئی چیز مسجد کے اندر گم ہوگئی ہو، ایسی چیز کا اعلان مسجد میں بدون شور وشغب جائز ہے۔ اس میں بھی بہتر ہے کہ دروازے میں کھڑا ہو جائے اور نکلنے والوں سے کہے کہ میری فلاں چیز گم ہوگئی ہے۔ ②۔ مسجد سے باہر چیز گم ہوئی ہو اور اعلان کرنے والا اندر اعلان کرے یہ اشد کراہت ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنو تو دعا کرو کہ اللہ کرے تمہیں نہ ملے کیونکہ مساجد اس کے لئے نہیں ہوتیں۔

چوتھی بات: تیسرا مسئلہ انشاد الشعر کا ہے، اسکی بھی دو صورتیں ہیں۔ ①۔ مذموم شعر ہو مثلاً اسلام کے خلاف ہو یا اسمیں اسلام کی تائید کی

کوئی بات نہ ہو اسکا مسجد میں پڑھنا اور سننا ممنوع ہے۔② ۔اسلام کے احکام میں سے کسی حکم کی منقبت یا فضیلت ہو یا کفار کی مذمت ہو یا نبی ﷺ کی مدح ہو تو اسکی اجازت ہے اور حسان ایسے شعر پڑھا کرتے تھے۔

اشکال: ترجمۃ الباب میں انشاد ضالہ کا ذکر ہے جبکہ حدیث میں اسکا ذکر نہیں؟

جواب: اگرچہ انشاد ضالہ کی ممانعت کے بارے میں احادیث میں مگر ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے قیاس سے یہاں انشاد ضالہ کو ثابت کیا ہے۔

پانچویں بات: ان تحلق الناس فیه حلقه بنانے سے اسلئے منع کیا کیونکہ یہ نماز کی ہیئت کے خلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حلقہ علم کیلئے ہو یا وعظ ونصیحت کے لیے ہو یہ ممنوع نہیں بلکہ وہ حلقہ ممنوع ہے جو خطیب کے نکلنے سے پہلے لوگ گپ بازی کیلئے لگاتے ہیں۔

عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده : سلسلہ نسب یہ ہے عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص عمرو بن شعیب عن ابیہ۔ یہاں ابیہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔① ۔عمرو کی طرف راجع ہے۔ کہ عمرو اپنے والد شعیب سے نقل کرتے ہیں، اور جدہ کی ضمیر بھی عمرو کی طرف راجع ہے کہ عمرو اپنے والد شعیب اور شعیب عمرو کے دادے محمد سے نقل کرتے ہیں پھر روایت مرسل ہوگئی۔② ۔ابیہ اور جدہ کی ضمیریں عمرو کی طرف راجع ہیں مگر جد سے جد اعلیٰ مراد ہے کہ عمرو اپنے والد شعیب سے اور شعیب عمرو کے دادا عبداللہ بن عمرو سے نقل کرتے ہیں، اس صورت میں سند متصل ہوگی کیونکہ شعیب کی ملاقات عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ثابت ہے۔③ ۔ابیہ کی ضمیر عمرو کی طرف راجع ہے۔ جدہ کی ضمیر شعیب کی طرف راجع ہے۔ کہ عمرو اپنے والد شعیب اور شعیب اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے نقل کرتے ہیں۔ اس صورت میں انتشار ضمائر ہے۔ ورنہ معنے دوسری صورت والا بنتا ہے۔ یعنی اس صورت میں بھی یہ روایت متصل ہوگی۔

باب ماجاء فی المسجد الذی اسس علی التقوی

تعارض دفع کرنے کی صورت: لمسجد اسس علی التقوی سے کیا مراد ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ قرآن میں مسجد ضرار کا ذکر ہے۔ منافقین نے مدینہ منورہ کی آبادی سے باہر مسجد بنائی تھی۔ کہ ہم بھی یہاں ٹھہریں گے۔ اور باہر سے آنے والوں کو بھی ٹھہرائیں گے۔ اور نبی ﷺ سے آکر کہا کہ بارش جب ہوتی ہے تو ہم یہاں نماز پڑھیں گے اسلئے آپ اسکا افتتاح کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تبوک سے واپسی پر افتتاح کردونگا۔ واپسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپکو متنبہ کیا اور آیات اتاردیں۔

اس میں "لمسجد اسس علی التقوی" کے بارے میں تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مسجد قباء مراد ہے اس آیت میں ہے فیه رجال یحبون ان یتطهروا نبی کریم ﷺ نے انکو بلایا اور پوچھا کہ تمہارا کیا عمل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری تعریف قرآن میں کی؟ انہوں نے کہا کہ ہم استنجے میں ڈھیلوں کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں اسی لئے آپ کی تعریف کی گئی ہے۔

باب کی حدیث میں ہے کہ "لمسجد اسس علی التقوی" سے میری مسجد یعنی مسجد نبوی مراد ہے تو بظاہر تعارض ہے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ کا یہ قول قول باللازم ہے۔ کہ جن صفات کی وجہ سے مسجد قباء کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ صفات بدرجہ اتم مسجد نبوی میں موجود ہیں۔ اسلئے اگر قباء کی مسجد اسکا مصداق ہے۔ تو مسجد نبوی بطریق اولی اسکا مصداق ہوگی۔ باقی مسجد قباء سے اسکی نفی مقصود نہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃ فی مسجد قباء

مسجد قباء میں نماز کی فضیلت بیان کی جارہی ہے۔ کہ اس میں نماز پڑھنے کا ثواب اتنا زیادہ ملتا ہے جتنا عمرے کا ثواب ہوتا ہے۔ اور مسجد قباء میں ثواب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے ثواب کی بنسبت اتنا ہے۔ جتنا حج کے مقابلے میں عمرے کا ثواب ہے۔ یعنی مسجد قباء میں

عمرے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبوی میں حج کے برابر ثواب ملتا ہے۔

باب ماجاء في أي المساجد افضل

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری مسجد میں نماز پڑھنا ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے جو دوسری مساجد میں پڑھی جائیں سوائے مسجد حرام کے۔ دوسری روایت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مساجد کی طرف یعنی مسجد حرام، میری مسجد نبوی اور مسجد اقصی۔

پہلی بات: پہلی حدیث میں "الا المسجد الحرام" کا جو استثناء ہے۔ شارحین نے لکھا ہے۔ کہ اسمیں تین احتمال ہیں۔ ① ۔استثناء اس طرح ہے۔ کہ مسجد حرام میں مسجد نبوی ﷺ سے کم ثواب ملتا ہے۔ ② ۔استثناء سے مساوات مراد ہے۔ ③ مسجد حرام کی فضیلت مراد ہے کہ مسجد حرام میں زیادہ ثواب ملتا ہے۔ اب فرماتے ہیں کہ یہاں تین احتمالوں میں کونسا احتمال مراد ہے۔ تو احادیث سے ثابت ہے کہ یہاں آخری احتمال مراد ہے۔ کیونکہ مقصود یہ ہے کہ مسجد حرام میں مسجد نبوی سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ اسلئے اسمیں نماز افضل ہے۔ اس کے بعد مسجد نبوی اسکے بعد مسجد اقصی میں زیادہ ثواب ملتا ہے۔ تمام ائمہ کے ہاں فضل میں یہی ترتیب ہے۔ کہ سب سے افضل مسجد حرام اس کے بعد مسجد نبوی اسکے بعد مسجد اقصی افضل ہے۔ ان کے علاوہ مساجد برابر ہیں۔ مگر بعض حضرات نے چوتھے نمبر پر مسجد قباء میں نماز کو افضل قرار دیا ہے۔ ان چار مساجد کے علاوہ باقی سب مساجد ثواب اور فضیلت میں برابر ہیں۔ مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول جمہور کے خلاف ہے انکے ہاں مسجد نبوی مسجد حرام سے افضل ہے۔ یہ مالکیہ نے ان سے نقل کیا ہے یہ انکا مشہور قول ہے۔

دوسری بات: زمین کے اندر افضل البقاع وہ حصہ ہے جسکے ساتھ نبی کریم ﷺ کا جسم اطہر ملا ہوا ہے یعنی آپ کے قبر مبارک افضل البقاع ہے، اسکے بعد کعبہ ہے۔ اسکے بعد مسجد حرام، پھر مسجد نبوی ہے۔ بعض علماء کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ نبی ﷺ کے جسم کا جو حصہ ارض سے ملا ہے وہ جنت سے افضل ہے۔ اور بعض کے ہاں عرش اور کرسی سے بھی افضل ہے کیونکہ اللہ کا عرش ہے مگر اسپر وہ جالس نہیں کیونکہ وہ مکان سے پاک ہے، اسلئے روضہ اطہر سب سے بہتر اور افضل ہے۔

تیسری بات: دوسری حدیث "لاتشد الرحال" اسکا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص زیادتی ثواب کے حصول کے لئے سفر کرنا چاہتا ہو تو نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ اسکو سفر نہیں کرنا چاہئے۔ ابتغاء فضل کیلئے تین مساجد کے علاوہ کیونکہ انکا ثواب زیادہ ہے جبکہ باقی مساجد میں ثواب برابر ہے، اس لئے انکی طرف سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔

چوتھی بات: اس حدیث کے ساتھ ایک مختلف فیہ مسئلے کا تعلق ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت کیلئے سفر کرنا اسکا کیا حکم ہے؟ تو ابن تمیہ، امام الحرمین کے والد ابو محمد الحوینی، مالکیہ میں قاضی عیاض مالکی اور ابن قیم کی رائے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کیلئے مستقل شد الرحال اس حدیث کی بناء پر جائز نہیں۔ انکا یہ مطلب نہیں کہ قبر النبی ﷺ کی زیارت جائز نہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جب جائے تو مسجد نبوی کی زیارت کا قصد کرے۔ پھر وہاں جا کر قبرستان میں بھی جائے اور نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کرلے، اسلئے زیارت قبر النبی کے استحباب کے وہ بھی قائل ہیں۔ اسلئے ابن قیم کی طرف جس نے قول منسوب کیا ہے کہ ان کے ہاں قبر النبی ﷺ کی زیارت جائز نہیں یہ غلط ہے۔ باقی حضرات کہتے ہیں کہ خاص قبر النبی ﷺ کی زیارت کی نیت سے جانا بھی جائز ہے۔ یہ "لاتشد الرحال" کے منافی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مستثنیٰ میں اختلاف ہے۔ ابن تیمیہ وغیرہ کے ہاں یہ استثناء مفرغ ہے۔ مستثنیٰ منہ عام ہے،

اسکی تائید موطا امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ کعب احبار کوہ طور کی زیارت کیلئے گئے تھے واپس آئے تو ایک صحابی ان سے ملے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم مجھے پہلے بتاتے تو میں منع کرتا کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ لاتشد الرحال ۔اس سے معلوم ہوا کہ اس صحابی کے نزدیک استثناء مفرغ تھا اور نہی عام تھی۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر طلب علم اور جہاد وغیرہ کا سفر بھی جائز نہ ہوگا؟ اسکا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ دو سفر اجماع امت کی وجہ سے اس نہی میں داخل نہ ہونگے ۔ جمہور کے نزدیک یہ استثناء متصل ہے۔اور الرحال الا الی ثلاثة مساجد درمختار میں تطبیق منقول ہے کہ جب مدینہ آجائے تو ینوبهما جمیعا یعنی روضہ اطہر اور مسجد نبوی دونوں کی نیت کرلے۔ اس حدیث کے تحت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ قبور صالحین کی زیارت کیلئے سفر ممنوع ہے کیونکہ اسکی اباحت کیلئے دلیل ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں۔ باقی اسکو قبر النبی ﷺ کی زیارت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

باب ماجاء فی المشی الی المسجد

مسئلہ: ماادرکتم فصلوا وما فاتکم فأتموا ۔ان الفاظ کے تحت ایک مسئلہ لکھا جاتا ہے۔اگرچہ معارف السنن میں ہے کہ ان الفاظ سے اس مسئلے کا تعلق نہیں وہ مسئلہ یہ ہے کہ امام کے ساتھ آخری رکعت میں شریک ہوا۔امام کے فارغ ہونے کے بعد جو رکعات قضاء کریگا، یہ اسکی آخر صلاۃ ہوگی یا اول صلاۃ ہوگی۔امام صاحب فرماتے ہیں کہ امام نے جو ادا کی یہ آخر صلاۃ تھی اور جو اکیلے پڑھے گا یہ اول صلاۃ ہوگی، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو امام کے ساتھ ادا کیا وہ اول صلاۃ ہے اور جو اکیلے پڑھے گا یہ آخری صلاۃ ہوگی۔ عام احادیث میں احناف کے موافق الفاظ ہیں۔

باب ماجاء فی القعود فی المسجد وانتظار الصلاة من الفضل

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی حکماً نماز ہی میں ہوتا ہے جب تک وہ نماز کے انتظار میں ہو اور فرشتے اس کے لئے دعاء کرتے ہیں جب تک وہ مسجد میں ہوتا ہے۔ اللهم اغفر له اللهم ارحمه جب تک حدث لاحق نہ ہوجائے۔

پہلی بات: باب کی حدیث کا تعلق کسی فقہی مسئلے سے نہیں بلکہ نماز کی انتظار کی فضیلت بیان کی جارہی ہے۔ کہ فرشتے اسکے لئے دعاء کرتے ہیں۔

دوسری بات: انتظار صلاۃ کا حکم استحباب کا ہے۔

تیسری بات: انتظار صلاۃ کی تین صورتیں ہیں ① نماز کے وقت سے پہلے آئے اور انتظار کرے ② نماز ادا کرنے کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرے ③ انتظار سے انتظار فی القلب مراد ہے کہ مسجد میں موجود نہیں کام کررہا ہے یا گھر میں ہے مگر دل اسکا نماز کی انتظار میں کب وقت آئیگا کہ نماز پڑھوں گا۔مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ دوسری صورت انتظار صلاۃ بعد الصلاۃ یعنی فجر پڑھی تو ظہر کے انتظار میں بیٹھا رہے ظہر پڑھی عصر کا انتظار کرے الخ یہ صورت باب سے بظاہر ثابت ہوتی ہے مگر یہ مراد نہیں کیونکہ اسکو اختیار کریں تو تمام مصالح معطل ہوجائیں گے۔ دوسرا یہ سلف سے منقول نہیں۔مگر بعض کہتے ہیں کہ یہی صورت مقصود ہے ۔مگر انتظار سے قریب الوقت نمازوں کا انتظار مراد ہے معارف السنن میں ہے کہ تینوں قسم کے انتظار مراد ہوسکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آئے اسی طرح قریب الوقت نمازوں میں انتظار کرے اسی طرح قلبی انتظار ہو جسکا ذکر صحیح مسلم کی روایت میں ہے "سبعة يظلهم

الله فى ظله يوم لاظل الاظله" ان میں ایک ہے "وقلبه معلق بالمساجد" کہ اس کا دل مساجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہو۔

مالم يحدث: اسکا مطلب یہ ہے کہ جب حدث لاحق ہوا تو فرشتوں کی دعا ختم ہو جاتی ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ صرف دعا ختم نہیں ہوتی بلکہ فرشتے مسجد میں بے وضوء ہونے والے کیلئے بددعا بھی کرتے ہیں۔

فقال فساط او ضراط: اسباب حدث کئی ہیں مگر یہاں تخصیص باعتبار محل کے ہے کیونکہ مسجد میں صرف یہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

باب ماجاء فى الصلاة على الخمرة باب ماجاء فى الصلاة على الحصير باب ماجاء فى الصلاة على البسط

ان تینوں ابواب کا تعلق ایک ہی مسئلے کے ساتھ ہے لیکن الفاظ الگ تھے اسلئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ باب قائم کر دیئے۔

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ سجدہ زمین پر ہونا ضروری ہے یا انسان اور زمین کے درمیان حائل ہو پھر بھی جائز ہے اسمیں اختلاف ہے ① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء اور محدثین کے ہاں زمین پر سجدہ بھی جائز ہے اور انسان اور زمین کے درمیان حائل ہو تب بھی جائز ہے، بغیر شک وشبے کے۔ ② امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین میں سے عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ سجدہ زمین پر ہو یا اس چیز پر ہو کہ زمین کی جنس سے ہو اگر زمین یا زمین کی جنس پر سجدہ نہ کیا تو انکا ایک قول یہ ہے کہ نماز جائز نہ ہوگی یعنی بالکل ادا نہ ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز ہو جائیگی مگر کراہت کے ساتھ ادا ہوگی۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ فرائض جائز نہیں نوافل جائز ہیں، مالکیہ کی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض میں کبھی حائل کے ساتھ سجدہ نہیں کیا حصیر، خمرہ وغیرہ کا استعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے مگر نوافل میں، احناف اور جمہور کہتے ہیں کہ احکام صلاۃ جو ہیں یعنی نماز کی شرائط اور ارکان وغیرہ ان میں نوافل اور فرائض میں فرق نہیں اب جب نوافل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جواز ثابت ہے تو فرائض میں بھی ثابت ہوگا۔ دوسری جمہور یہ کرتے ہیں کہ بعض احادیث میں تو ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوافل ان چیزوں پر ادا کئے مگر بعض روایات میں مطلقاً ذکر ہے۔ مثلاً صلى على الحصير ياصلى على الخمرة۔ اسلئے نوافل کی تخصیص بغیر دلیل کے ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ فرائض بغیر حائل کے ادا کرے اور نوافل پڑھ سکتا ہے۔ معارف السنن میں ہے کہ میں نے مولانا انور شاہ صاحب اور شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا کہ شیخ الہند کا شاگرد تھا۔ وہ ہمیشہ فرائض بغیر حائل کے پڑھتا تھا۔

دوسری بات: خمرہ اور حصیر میں فرق نہیں لیکن بعض کہتے ہیں کہ جیسے سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ لغت میں ترادف نہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی یہی رائے ہے کہ ہر لفظ کا لغوی معنیٰ الگ ہے اسلئے فرق کرتے ہیں کہ خمرہ چھوٹی چٹائی کو کہتے ہیں کہ اس پر اگر کھڑا ہو تو سجدہ اس پر نہ کر سکے۔ اگر سجدہ کرے تو کھڑا نہ ہو سکے جبکہ حصیر اس بڑی چٹائی کو کہتے ہیں جس پر کھڑا بھی ہو سکے اور سجدہ بھی کر سکے۔ جسکا تانا کھجور کی شاخ کا ہو اور بانا دھاگے کا ہو،

يا اباعمير مافعل النغير۔ احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ مدینہ کا حرم مکہ کی حرم کی طرح نہیں۔ کیونکہ مکہ کے حرم میں شکار پکڑنا جائز نہیں۔ اور مدینہ کے حرم میں اسکی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ اس کا اختلاف ابواب الحج میں آئے گا۔

باب ماجاء فى الصلاة فى الحيطان

حیطان حائط کی جمع ہے بمعنی بستان۔ یعنی وہ باغ جسکے اردگرد چار دیواری لگادی ہو۔ مقصود یہ ہے کہ باغ میں نماز پڑھنا نبی

کریم ﷺ سے ثابت ہے بلکہ وہ اسکو پسند کرتے تھے کیونکہ وہاں سکون ہوتا ہے سایہ اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ مگر یہ نوافل کا حکم ہے ورنہ فرائض مسجد میں ادا کرنی چاہئے۔ باغ میں نوافل کو پسند کرتے تھے۔

والحسن بن ابی جعفر قدضعفه اگر چہ حدیث ضعیف ہے۔ مگر اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ دوسری روایت یہ ہے کہ جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً خطیب بغدادی نے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حدیث حلال حرام اور احکام کے متعلق ہو تو حدیث میں ہم سختی سے تحقیق کرتے ہیں لیکن اگر فضائل میں ہو تو ہم تسابل سے کام لیتے ہیں۔ اسلئے اگر حدیث ضعیف بھی ہو تو فضائل میں چل جاتی ہے۔

باب ماجاء فی سترة المصلی باب ماجاء فی کراهته

موسیٰ بن طلحہ اپنے والد طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ کہ جب تم میں سے کوئی اپنے سامنے کجاوے کی پچھلی لکڑی کے برابر لکڑی رکھے تو وہ نماز پڑھے اور اس لکڑی کے آگے گزرنے والے کی پرواہ نہ کرے۔

پہلی بات: اس باب کا تعلق سترے کے ساتھ ہے۔ کہ نماز پڑھے۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔ ① مسجد میں نماز پڑھے یا ایسی جگہ میں نماز پڑھے جہاں سامنے سے آدمی کے گزرنے کا خطرہ نہ ہو تو ایسی جگہ سترہ کی ضرورت نہیں۔ ② دوسری صورت یہ ہے کہ صحراء میں نماز پڑھے۔ یا ایسی جگہ پڑھے جہاں آدمی گزرتے ہوں۔ اس صورت میں سترہ رکھنا چاہئے۔

دوسری بات: سترہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ عام فقہاء کے ہاں سترہ رکھنا مستحب ہے۔ وجوب کا قول کسی سے منقول نہیں۔

تیسری بات: فتح الباری میں ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض فقہاء کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہاں کئی صورتیں ہیں۔

❶ نمازی ایسی جگہ کھڑا ہو۔ جہاں سے دوسرے آدمی کا گزرنا ضروری ہو۔ کوئی اور جگہ نہ ہو اور نمازی ایسی جگہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ جہاں کسی کو گزرنے کی ضرورت نہ ہو۔ ایسی صورت میں نمازی کے سامنے گزرنے والا آثم نہ ہوگا بلکہ نمازی کو گناہ ہوگا۔

❷ نمازی ایسی جگہ نماز پڑھے کہ گزرنے والا۔ دوسری جگہ سے گزر سکتا تھا۔ تو نمازی پر گناہ نہیں ہوگا۔ گزرنے والے پر گناہ ہوگا۔ اور اگر نمازی کے لئے بھی دوسری جگہ پڑھنے کی تھی۔ اور گزرنے والے کیلئے بھی دوسری جگہ گزرنے کی تھی۔ تو اس صورت میں دونوں گنہگار ہوں گے۔

❸ گزرنے والے کیلئے اور راستہ موجود ہے۔ مگر نماز پڑھنے والے کیلئے اور جگہ نہیں۔ تو گزرنے والے پر گناہ ہوگا۔

❹ نمازی کیلئے بھی اور جگہ نہیں کہ وہاں نماز پڑھے۔ اور گزرنے والے کے لئے بھی دوسرا راستہ نہیں۔ تو ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دونوں گناہ گار نہ ہوں گے۔ یہ تفصیل فقہاء مالکیہ کے نزدیک ہے جبکہ عام فقہاء کہتے ہیں کہ اور راستہ ہو یا نہ ہو گزرنے والے پر گناہ ہوگا، حدیث کی وجہ سے۔ یعنی اگر مصلی کے سامنے گزرنے کا گناہ گزرنے والے کو معلوم ہو جائے تو چالیس سال تک کھڑا رہے۔

چوتھی بات: سترہ کی لمبائی ایک ذراع ہونی چاہئے۔ کیونکہ نبی ﷺ سے موخرہ الرحل کی تعبیر منقول ہے۔ وہ کم سے کم ذراع ہوتی ہے۔ اسی طرح سترہ ایک انگلی کے برابر موٹی ہونی چاہئے۔ بعض فقہاء کے نزدیک موٹا ہونے کی مقدار ضروری نہیں۔ بلکہ جو حائل معلوم ہو وہ کافی ہے۔ پھر اس سترہ کو گاڑا جائے لیکن گاڑنا ممکن نہ ہو تو اسکو زمین پر رکھ دے۔ لیکن اگر نہ گاڑی جاسکتی ہو اور نہ زمین پر وضع کی جاسکتی ہو تو اسکو زمین پر بچھادے۔ اب طولاً رکھے یا عرضاً۔ تو بعض نے لکھا ہے کہ عرضاً رکھے بعض نے لکھا ہے کہ طولاً رکھے۔ اور اگر سترہ نہ ہو تو

خط کھینچے خط کی تین صورتیں ہیں۔ ① عرضاً خط کھینچے۔ ② طولاً کھینچے۔ ③ محراب کی شکل میں بنائے۔اور معارف السنن میں اسکو بہتر کہا ہے احناف کے ہاں خط کا اعتبار نہیں مگر صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے کہ سترہ نہ ہوتو خط سے کام چلایا جاسکتا ہے۔

پانچویں بات: امام کا سترہ مقتدیوں کیلئے کافی ہے یا نہیں۔تو ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ امام کا سترہ کافی ہے۔ ہر مقتدی کیلئے سترہ رکھنا ضروری نہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں امام کا سترہ ہی مقتدیوں کے لئے سترہ ہے اور مالکیہ کہتے ہیں کہ سترہ امام کیلئے ہے اور امام سترہ ہے مقتدیوں کیلئے۔

چھٹی بات: کتنا دور آدمی نمازی کے سامنے سے گزر سکتا ہے۔تو بعض کہتے ہیں کہ مسجد صغیرہ ہوتو سامنے سے بالکل نہیں گزر سکتا۔اگر گزرنا بھی ہوتو ایک آدمی سامنے کھڑا ہو دوسرا گزر جائے پھر سامنے کھڑا ہونے والا سامنے سے ہٹ جائے۔اور اگر ایک آدمی ہوتو ضرورۃً نمازی کے سامنے رومال لٹکا کر بھی گزر سکتا ہے۔ بڑی یا چھوٹی مسجد معلوم کرنا عرف پر بنا ہے۔ مسجد کبیر میں بعض کے ہاں تین بعض کے ہاں پانچ اور بعض کے ہاں چالیس ذراع چھوڑ کر گزر سکتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ جہاں تک نمازی کی نظر پڑتی ہو اس سے آگے گزر سکتا ہے۔ دوسرے باب میں اس مرور پر وعید کا ذکر ہے۔ کہ اگر گزرنے والا جان لے کہ نمازی کے سامنے گزرنے کا کتنا گناہ ہے اور کتنا بڑا اعذاب ہے تو چالیس سال تک نہ گزرتا اور کھڑا رہتا۔ بعض کہتے ہیں کہ جو گناہ ایسا ہو کہ اس پر وعید وارد ہوتو وہ کبیرہ ہوتا ہے۔ اسلئے مصلی کے سامنے سے گزرنا گناہ کبیرہ ہے۔

باب ماجاء لایقطع الصلاۃ شئ

باب ماجاء لایقطع الصلاۃ الا الکلب والحمار والمرأۃ

کسی چیز کا گزرنا سبب قطع نہیں یعنی نماز کو توڑنا۔ دوسرے باب میں ہے کہ کتا۔ گدھا۔اور عورت گزر جائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

اختلاف: ❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کا مصلی کے سامنے سے گزرنا اسکی نماز کیلئے قاطع نہیں۔

❷ دوسرا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ کالا کتا اگر گزر جائے تو قاطع نماز ہے اور عورت اور گدھے کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرے دل میں شبہ ہے کہ قاطع ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل دوسرے باب کی حدیث ہے کہ نمازی کے سامنے کوئی چیز نہ ہوتو اسکی نماز کو قطع کر دیتا ہے۔ کالا کتا، عورت اور گدھے کا گزرنا۔ جمہور کہتے ہیں کہ عورت کا گزرنا قاطع نہیں دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ وانا معترضۃ بین یدیہ کاعتراض الجنازۃ۔ جب عورت سامنے ہوتو قاطع نہیں تو گزرنا بطریق اولی سبب قطع نہیں ہوگا۔ اسی طرح جمہور کے ہاں گدھا بھی قاطع نہیں ہے۔ اسکی دلیل باب اول کی حدیث ہے یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس طرح کتے کا گزرنا بھی قاطع نہیں۔ دلیل اسکی یہ ہے کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات کیلئے مدینہ سے باہر گئے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے کتا بھی گزرا لڑکیاں بھی گزریں۔ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ ان تین چیزوں میں شیطان کے اثرات ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ قاطع للصلاۃ ہیں۔ جمہور جواب دیتے ہیں کہ خود شیطان کا گزرنا قاطع نہیں تو یہ چیزیں جن میں شیطان کا اثر ہوتا ہے۔ وہ کس طرح قاطع ہو سکتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پیچھے ہٹے اور پھر کسی چیز کو دفع کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد میں پوچھا کہ یہ کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان آگ کا شعلہ لیکر آیا تھا۔ مجھے جلانے کے لئے۔ اسلئے میں پیچھے ہٹا۔ معلوم ہوا خود شیطان کا گزرنا قاطع نہیں ہے۔ حدیث میں احناف تاویل کرتے

ہیں کہ خشوع کا قطع ہونا مراد ہے۔ دوسرا جواب طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ علامہ انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قطع سے قطع الوصل مراد ہے۔ جو بندے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ فی ثوب واحد

یہ باب ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے متعلق قائم کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں نماز ادا کر رہے تھے۔ ایک کپڑے میں لپٹ کر۔

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ احناف کہتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ آدمی تین کپڑوں میں نماز ادا کرے۔ یعنی شلوار قمیص اور عمامہ۔ عمامہ کے بغیر نماز ادا کرنا بغیر کراہت کے امام کیلئے بھی جائز ہے اور مقتدیوں کے لئے بھی جائز ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ بعض علاقوں میں مشہور ہے کہ امام بغیر عمامے کے ہو تو مکروہ ہو جاتی ہے۔ بعض علاقوں میں مشہور ہے کہ مقتدی عمامہ استعمال نہ کریں تو انکی نماز مکروہ ہے۔ یہ بات غلط ہے بلکہ کسی فقیہ کا قول نہیں کہ عمامہ کے بغیر نماز مکروہ ہے۔ صرف فتاوی امینیہ میں ایک قول ہے کہ بغیر عمامہ نماز مکروہ ہے۔

دوسری بات: دو کپڑے میسر ہوں اسکے باجود کوئی ایک کپڑے میں نماز ادا کرے کہ کل ستر چھپا ہوا ہو۔ تو یہ بھی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بغیر کراہت کے جائز ہے۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جسکو دو کپڑے میسر ہوں۔ اس کی ثوب واحد میں نماز مکروہ ہے لیکن ایک ہی کپڑا ہو تو نماز جائز ہے۔ جب ایک کپڑے میں نماز ادا کرے تو فرماتے ہیں کہ چادر اس طرح لپیٹے کہ ہاتھ اٹھا سکے ورنہ اشتمال الصماء مکروہ ہے۔ کہ اسطرح کپڑا لپیٹ لے کہ ہاتھ باہر نہ نکال سکے۔ اسی طرح اگر ایک کپڑا ہو اسکو لپیٹا مگر کندھے دونوں کھلے ہوں تو امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں۔ نماز فاسد ہو جائیگی۔ جمہور کے ہاں جائز ہے۔

باب ماجاء فی ابتداء القبلة

یہ باب ان احادیث کے بیان میں ہے۔ جو ابتدائے قبلہ کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

پہلی بات: قبلہ کی ابتداء کس طرح ہوئی۔ اسکے متعلق محدثین کا اختلاف ہے۔

❶ علامہ انورشاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں قبلے کے متعلق یہ آیت اتری ﴿قد نری تقلب وجهک فی السماء﴾ اس سے پہلے نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر حکم نہ اترا تھا، آپ ﷺ مکہ میں کبھی کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے کیونکہ وہ آپکے قوم کا قبلہ تھا۔ اور مدینہ آکر آپ ﷺ نے بیت المقدس کی طرف منہ کرنا شروع کر دیا کیونکہ یہ اہل مدینہ کا قبلہ تھا۔ اور اس وقت لوگ اپنی قوم کے قبلے کی طرف متوجہ تھے۔ تو حاصل یہ ہے کہ مکہ میں بیت اللہ کی طرف توجہ کرنا حکم کی بناء پر نہ تھا۔ اور اسی طرح مدینہ میں بیت المقدس کی طرف توجہ کرنا بھی کسی حکم کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ پہلا حکم اس آیت میں اترا۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نسخ قبلہ ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ نسخ تب ہوتا کہ پہلے ایک حکم ہو۔ پھر دوسرا حکم دیا جائے، جبکہ یہاں پہلے کوئی حکم نہ تھا۔

❷ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مکہ میں قبل الہجرت نبی ﷺ بیت اللہ کی طرف توجہ کرتے تھے یہ کسی حکم کی بنا پر نہ تھا بلکہ یہ انکے قوم کا قبلہ تھا پھر مدینہ آئے تو بیت المقدس کی طرف توجہ کا حکم دیا پھر سولہ یا سترہ ماہ بعد بیت المقدس کی طرف توجہ منسوخ کر کے بیت اللہ کی طرف توجہ کا حکم دیا۔ اس قول کا مفاد یہ ہے کہ نسخ قبلہ مرۃ واحدۃ ہوا ہے۔

❸ جب نبی ﷺ مکہ میں تھے تو آپ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے کہ کعبہ بھی درمیان میں آجائے۔ اسلئے آپ رکنین یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان کھڑے ہوتے تھے تو کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے تھے۔ اسلئے مکہ میں اظہار نہ ہو سکا کہ بیت اللہ کی طرف توجہ ہے یا بیت المقدس کی طرف لیکن مدینہ آئے تو بیت المقدس بیت اللہ کی مخالف جہت میں تھا، اسلئے وہ رعایت ممکن نہ تھی۔ اسلئے حکم کا اظہار وہاں ہوا۔ اور بیت المقدس کی طرف منہ کیا، مگر آپ ﷺ بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کو پسند کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ بنی اسماعیل کی اولاد میں سے تھے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ بنی اسماعیل کے مطابق کعبۃ اللہ کی طرف توجہ کریں۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نسخ قبلہ مرۃ واحدۃ ہے۔ فرق اس اور دوسرے قول میں یہ ہے کہ دوسرے قول کے مطابق قبلہ کا حکم مدینہ میں دیا گیا۔ اور تیسرے قول کے مطابق مکہ میں حکم دیا گیا تھا۔

❹ معارف السنن میں چوتھے قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ یہ اعدل الاقوال ہے۔ کہ یہ نسخ قبلہ مرتین ہوا ہے۔ وہ یہ کہ مکہ میں قریش کی آبادی تھی، انکی رعایت کیلئے بیت اللہ کیطرف توجہ کا حکم ہوا۔ اور جب مدینہ آئے تو پہلا حکم منسوخ ہوا اور دوسرا حکم آیا کہ بیت المقدس کی طرف توجہ کرو۔ تاکہ اہل کتاب (یہود) کی رعایت ہو۔ وہ اسلام کیطرف مائل ہوں۔ کیونکہ اہل کتاب جانتے تھے کہ پہلے انبیاء بیت المقدس کی طرف توجہ کرتے تھے۔ یہ ان انبیاء کی مخالفت کر رہا ہے۔ اسلئے سولہ یا سترہ ماہ کے بعد حکم اترا کہ بیت اللہ کی طرف توجہ کرو۔ یہ دوسرا نسخ ہوا اور یہ نسخ السنۃ بالسنۃ ہے۔

دوسری بات: تین قسم کی روایات ہیں ایک قسم کی روایات میں تردد ہے کہ سولہ ماہ نماز پڑھی یا سترہ ماہ بعض میں سولہ ماہ کا ذکر ہے، بعض میں سترہ ماہ کا ذکر ہے۔ اسکے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ ① نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سولہ ماہ کی مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ ② قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے سترہ ماہ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ ③ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے تردد کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ اسکو بہت سارے علماء نے اختیار کیا ہے۔ بعض نے تطبیق دی ہے کہ آپ ﷺ ربیع الاول کے درمیان میں مدینہ پہنچے اور ہجرت کے دوسرے سال رجب میں قبلے کا حکم آیا۔ تو رجب اور ربیع الاول ناقص تھے۔ جنہوں نے یہ ناقص شمار کئے ہیں، انکے ہاں سترہ بنتے ہیں۔ اور جنہوں نے ناقص شمار نہیں کئے کامل مہینے شمار کئے انہوں نے سولہ کہدیا۔ اسلئے تردد کیساتھ صحیح ہے کہ کسور شمار کرو تو سترہ ماہ ہونگے۔ اور کسور شمار نہ کرو تو سولہ ماہ ہونگے۔

تیسری بات: رجب ② ھ کا واقعہ ہے کہ نبی ﷺ بنو سلمہ کی مسجد میں تھے۔ وہاں صحابی بشر بن براء بن معرور فوت ہوئے تھے۔ انکے جنازے کیلئے گئے۔ ظہر کی نماز میں تھے کہ نسخ قبلہ کا حکم ہوا۔ اس مسجد کو آج بھی مسجد ذو قبلتین کہتے ہیں۔ دونوں قبلوں کے نشانات موجود ہیں۔ پھر مسجد نبوی میں عصر کی نماز بیت اللہ کی طرف توجہ کر کے پڑھی، اہل قباء کو فجر میں علم ہوا۔

چوتھی بات: یہاں ہے کہ نبی ﷺ نے مسجد نبوی میں عصر پڑھی۔ آپ کے ساتھ ایک انصاری صحابی تھے۔ جنہوں نے آپ ﷺ کیساتھ نماز ادا کی۔ انکا نام عباد بن بشر ہے۔ انکا گزر بنو عبد الاشہل کی مسجد سے ہوا وہ عصر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اس نے انکو اطلاع دی کے قبلہ بدل گیا ہے۔ وہ نماز ہی میں پھر گئے۔ اب پھرنے کی صورت یہ ہوگی۔ کہ امام چل کر آگے آئے اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پھر جائیں۔ اب عورتیں آگے ہونگی۔ اسلئے وہ چل کر پیچھے جائیں، مرد آگے آجائیں۔

پانچویں بات: ظہر میں نسخ قبلہ ہوا۔ اور جن کو فجر میں حکم پہنچا۔ انہوں نے چند نمازیں منسوخ قبلے کی طرف ادا کیں تو انکا اعادہ ہے یا نہیں تو اصولیین کے دو طبقے ہیں۔ ① ناسخ بعض مکلفین تک پہنچ جائے تو اسکا حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اس صورت میں جنہوں نے قبلہ منسوخہ کی طرف نماز ادا کی انکے ذمہ اعادہ لازم ہے۔ ② ناسخ تب معتبر ہے۔ جب انکو اطلاع مل جائے۔ اس صورت میں

اعادے کا حکم نہ ہوگا کیونکہ اطلاع دیر سے پہنچی ہے۔

چھٹی بات: یہاں عباد بن بشر نے لوگوں سے کہا کہ قبلہ بدل گیا ہے۔ اب اعتراض یہ ہے کہ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا حکم ثابت تھا۔ وہ قطعی تھا۔ اور ایک آدمی کی اطلاع خبر واحد ہے جو ظنی ہے۔ تو ظنی سے قطعی کو کسطرح چھوڑ دیا۔

جواب۔ خبر واحد دو قسم ہے۔ ① ۔ مجرد عن القرائن۔ ② ۔ محتف بالقرائن۔ قسم اول تو ظنی ہے۔ مگر دوسری قسم کی خبر واحد قطعیت کا فائدہ دیتی ہے اور یہاں بھی خبر واحد محتف بالقرائن تھی کیونکہ صحابہ کو علم تھا کہ نبی ﷺ بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہتے تھے۔ اسلئے انکو حکم کا انتظار تھا۔

باب ماجاء ان بین المشرق و المغرب قبلة

پہلی بات: قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ یہ حکم اہل مدینہ اور وہ لوگ جو مدینہ کی جہت میں واقع ہیں انکے لئے ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے لیکن وہ لوگ جو دوسری جہات میں ہیں۔ جیسے ہم لوگ ہمارا قبلہ مغرب میں ہے۔

دوسری بات: قبلے کا حکم یہ ہے کہ جو لوگ بیت اللہ کے پاس ہوں۔ انکے لئے عین قبلہ کی طرف توجہ کافی ہے۔ البتہ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول ہے کتاب الام میں ہے۔ کہ وہ غائبین کے لئے بھی عین کعبہ کی طرف توجہ کرنا فرض قرار دیتے ہیں۔ مگر معارف السنن میں ہے کہ انکا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جن کے لئے توجہ ممکن ہو وہ عین کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ دور کے لوگوں کو عین کی طرف توجہ کا حکم تو تکلیف مالا یطاق ہے۔ جہت کے بارے میں احناف نے لکھا ہے کہ جہت میں انحراف اگر ۴۵ ڈگری سے کم ہو تو جائز ہے۔ اگر اس سے انحراف زیادہ ہو جائے تو نماز نہ ہوگی۔ واجب الاعادہ ہوگی۔

باب ماجاء فی الرجل یصلی بغیر القبلة فی الغیم

یہ باب اس آدمی کے حکم میں ہے کہ کوئی بادل یا اندھیرے میں غیر قبلہ کی طرف نماز ادا کرے۔ بعد میں معلوم ہو کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف نماز ادا کی ہے تو اسکا کیا حکم ہے۔

پہلی بات: حدیث جو نقل کی ہے اس سے بظاہر یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے غیر قبلہ کی طرف نماز ادا کی پھر ظاہر ہوا کہ اس نے غلط طرف کی جانب نماز ادا کی ہے تو اس پر اعادہ نہیں اس کی نماز ہو جائیگی۔ اشتباہ قبلہ کا حکم یہ ہے کہ اگر آدمی کوئی موجود ہو تو اس سے پوچھ لے لیکن آدمی کوئی نہ ہو تو تحری کرے اور اگر تحری کے بعد نماز ادا کرے پھر معلوم ہو کہ غلط جہت میں نماز ادا کی ہے تو اسکی نماز ہو جائیگی، اس پر اعادہ نہیں، یہ اتفاقی بات ہے۔

دوسری بات: ﴿فاینما تولوا فثم وجه اللہ﴾ اس آیت کے شان نزول میں متعدد اقوال ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ سواری پر نماز پڑھنے کے بارے میں ہے۔ بعض نے کہا کہ قبلہ مشتبہ ہو جائے۔ اسکے متعلق ہے اصل بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کہیں کہ آیت اس چیز کے بارے میں اتری ہے۔ تو اسکے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی واقعہ کے لئے اتری ہے۔ دوسرا یہ کہ اس واقعہ پر بھی منطبق ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فی کراهية مايصلی اليه وفيه

حدیث میں سات مقامات مذکور ہیں جن میں نماز پڑھنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

المزبلة۔ یہ جائے زبل کو کہتے ہیں۔ جہاں کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی جاتی ہے۔ کیونکہ زبل گندگی کو کہتے ہیں۔ تو مزبلہ گندگی ڈالنے کی

جگہ ہوئی۔ المجزرۃ یہ جزر سے ہے۔یعنی وہ مقام جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہوں اور انکی گندگی وہاں ہی پڑی رہتی ہو۔المقبرۃ مقبرہ بمعنی قبرستان، جہاں کثیر قبریں ہوں۔
قارعۃ الطریق بمعنی وسط طریق کے یعنی راستے کے درمیان میں نماز کی ممانعت ہے۔الحمام۔ جہاں پر لوگ غسل کرتے ہوں۔معاطن الابل۔اونٹوں کا باڑہ جہاں اونٹ بیٹھتے ہوں۔فوق ظہر البیت۔بیت اللہ کی چھت پر بھی نماز جائز نہیں۔

ممانعت کی علت: ان سات مقامات میں جو نماز سے ممانعت ہے۔ان میں نہی کی علت برابر نہیں جیسے مزبلہ میں نہی کی علت گندگی ہے، اسی طرح مجزرہ میں بھی نہی کی علت نجاست ہے۔لیکن مقبرہ اسمیں علت نجاست بھی ہوسکتی ہے۔جب قبروں سے مردے نکال کر باہر ڈال دیئے ہوں۔مگر اصل علت یہ ہے کہ قبروں کی طرف متوجہ ہونے سے شریعت نے منع کیا ہے۔کیونکہ اسمیں قبر کی عبادت سے مشابہت آتی ہے۔اسی طرح قارعۃ الطریق میں یہ بھی علت ہوسکتی ہے کہ لوگوں کے چلنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ دوسرا ممکن ہے جانور آئے مصلی کو تکلیف دے۔حمام میں نہی کی علت نجاست بھی ہوسکتی ہے۔اور یہ بھی علت ہوسکتی ہے کہ اسکی نظر دوسرے کی عورت پر پڑ جائے۔دوسرا یہ مقامات نماز کی عظمت کے بھی خلاف ہیں، معاطن الابل کی وضاحت دوسرے باب میں آئے گی۔بیت اللہ کی چھت پر نماز کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔اسکا حکم یہ ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بیت اللہ کی چھت پر فرائض اور نوافل سب جائز ہیں کراہت تنزیہی کے ساتھ۔امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرائض جائز نہیں۔باقی نمازیں جائز ہیں۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرائض، اور رکعتین طواف، سنت فجر اور وتر بیت اللہ کی چھت پر جائز نہیں۔ان چار کے علاوہ سب نمازیں جائز ہیں۔احناف کہتے ہیں کہ باب کی حدیث میں جو ممانعت ہے اسلئے کہ یہ تعظیم کعبہ کے خلاف ہے۔دوسرا کثرت سے لوگ اسپر پڑھیں گے۔تو لوگوں کے دلوں سے بیت اللہ کی تعظیم ختم ہوجائے گی۔اس وجہ سے کراہت تنزیہی ہوگی۔لیکن نماز کے فساد کی کوئی دلیل نہیں۔
مزبلہ اور مجزرہ۔اسمیں ممانعت کی علت نجاست بھی ہوسکتی ہے۔اگر نجاست ہو تو نماز فاسد ہوگی۔کیونکہ طہارت مکان شرط ہے۔لیکن اگر ان جگہوں میں ممانعت کی علت یہ ہو کہ یہ جگہیں نماز کی تعظیم کے خلاف ہیں۔پھر ممانعت سے مراد کراہت ہوگی۔یعنی کراہت تنزیہی۔ اسی طرح حمام میں علت نجاست ہو تو نماز فاسد ہوگی۔اور اگر نجاست علت نہ ہو تو ممانعت تعظیم صلاۃ کی وجہ سے ہوگی۔پھر نماز فاسد نہ ہوگی بلکہ کراہت کے ساتھ ادا ہوجائے گی۔

باب ماجاء فی الصلاۃ فی مرابض الغنم واعطان الابل

پہلی بات: مرابض جمع ہے مربض کی۔بمعنی بکریوں کا باڑا۔اور اعطان الابل وہ باڑا جہاں اونٹ رات گزارتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ اونٹ کو پانی پلاتے ہیں اونٹ کی عادت ہے کہ پانی پی کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے پھر آ کر پانی پیتا ہے تو پانی پی کر جہاں کچھ عرصہ ٹھہرتا ہے یہ معاطن الابل ہے۔
دوسری بات: مسئلہ یہ ہے کہ بکریوں اور اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے تو فرماتے ہیں کہ بکریوں کا باڑا پاک ہو تو بالاتفاق اسمیں نماز جائز ہے البتہ اونٹوں کے باڑے کے بارے میں اختلاف ہے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک کے ہاں اونٹوں کے بارے میں بھی نماز جائز ہے احناف کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جو ممانعت کی ہے اسکی علت اور ہے اب اسکی علت کیا ہے۔تو شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب الام میں لکھا ہے کہ

اصل بات یہ ہے کہ اونٹ چرانے والے گندے ہوتے ہیں یہ لوگ جہاں اونٹ باندھتے ہیں وہاں قضائے حاجت بھی کرتے ہیں۔جبکہ بکریوں والے گندے نہیں ہوتے اسلئے اونٹوں کی جگہ گندی ہوتی ہے اسلئے وہاں نماز پڑھنے سے منع کیا۔لیکن بکریوں کی جگہ صاف ہوتی ہے اس لئے اسمیں اجازت دیدی۔دوسری علت بعض نے یہ ذکر کی ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ اونٹوں کے لئے رات گزارنے کے لئے جگہ نہیں بناتے تھے اس لئے زمین ہموار نہیں ہوتی تھی جبکہ بکریوں کے باڑے کو صاف کر کے ہموار کرتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے اعطان الابل میں نماز سے منع کیا ہے کیونکہ وہاں جگہ ہی نہیں ہوتی تھی جبکہ بکریوں کے باڑے میں جگہ ہوتی ہے اسلئے وہاں نماز پڑھنے کی اجازت دیدی تو نماز کے جواز یا عدم جواز کا تعلق خارجی علت کی وجہ سے ہے نفس اونٹ اور بکری سے اس کا تعلق نہیں تیسری علت بعض نے لکھی ہے کہ بکری ضعیف جانور ہے اس سے تکلیف پہنچنے کا خطرہ اور اندیشہ نہیں جبکہ اونٹ طاقتور ہوتا ہے کبھی اس کی دشمنی انسان سے بھی ہوتی ہے اس لئے اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔چوتھی علت یہ ذکر کی ہے کہ بکریوں کے باڑے میں اسلئے اجازت دی کہ بکری اگر پیشاب کرے تو کپڑوں پر چھینٹے پڑنے کا احتمال نہیں ہوتا بہر حال جو علت بھی مراد لی جائے یہ علتیں خارجی ہیں ورنہ اونٹ اور بکری کی ذات سے ممانعت صلاۃ کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ جن کے ہاں ماکول اللحم کا بول پاک ہے اسلئے بکری کے باڑے میں نماز کی اجازت دی مگر اس کا جواب ہم دیتے ہیں کہ یہ استدلال بالملازم ہے کیونکہ جن کے ہاں بول مایوکل لحمہ پاک ہے ان کے ہاں دونوں کا پاک ہے جن کے ہاں ناپاک ہے ان کے ہاں دونوں کا ناپاک ہے۔دونوں میں فرق نہیں۔

باب ماجاء فی الصلاۃ علی الدابۃ حیث ماتوجھت بہ

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے۔کہ نوافل سواری پر جائز ہیں یا نہیں۔تو اس باب میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔کہ سواری پر نوافل پڑھنا جائز ہیں۔ اور فرائض بدون عذر بالاتفاق سواری پر پڑھنے جائز نہیں۔الا یہ کہ آدمی مطلوب ہو۔یعنی اس کے پیچھے دشمن لگا ہوا ہو۔مالکیہ کے ہاں طالب کے لئے بھی فرائض جائز ہیں۔

دوسری بات: نوافل جب سواری پر جائز ہیں تو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت توجہ الی القبلہ ضروری ہے۔ احناف و جمہور کے ہاں ضروری نہیں۔

تیسری بات: اب سواری پر نفل کے لئے سفر شرط ہے یا نہیں۔تو شوافع کے ہاں شرط نہیں۔اور احناف کے ہاں بھی سفر شرط نہیں ہاں صرف خارج المصر ہونا شرط ہے۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نوافل علی الدابہ کے لئے سفر شرط ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ الی الراحلۃ

مسئلہ:۔مسئلہ یہ ہے کہ ذی روح چیز کو بطور سترہ کے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں۔تو فرماتے ہیں کہ جائز ہے۔جیسا کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔البتہ وہ ذی روح چیز جس کی لوگ عبادت کرتے ہیں مثلاً گائے۔اس کی طرف نماز جائز نہ ہوگی خارجی علت کی وجہ سے۔اس طرح اگر انسان سترہ ہو اور وہ نمازی کی طرف رخ کر کے باتیں کر رہا ہو تو یہ مکروہ ہوگا۔

باب ماجاء اذا حضر العشاء واقیمت الصلاۃ فابدأوا بالعشاء

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب شام کا کھانا حاضر ہو اور نماز کھڑی ہو تو کھانے سے ابتدا کرے۔

پہلی بات: اس مسئلے کا تعلق ترک الجماعۃ لاجل الاعذار سے ہے۔ ترک جماعت کے اعذار میں سے ایک عذر اس باب کے اندر بیان کیا جارہا ہے۔

دوسری بات: مغرب کی نماز کا وقت ہو اور کھانے کی حاجت بھی ہو تو کھانے کو مقدم کرنا اور نماز کو موخر کرنا یہ مسئلہ ائمہ مجتہدین کی درمیان اتفاقی ہے۔ لیکن شرط کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً بعض نے یہ شرط ذکر کی ہے جس کو ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے وکیع کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کہ کھانا ایسا ہو کہ اگر آپ نماز میں لگ جائیں تو کھانا فاسد ہو جائے گا۔ اور مزید کھانا بھی نہ ہو۔ پھر جماعت کا ترک جائز ہے ورنہ نہیں۔ یہ بعض شوافع سے بھی منقول ہے بعض نے یہ شرط لگائی ہے کہ کھانے کی شدید حاجت ہو۔ ایسی حاجت کو اگر نماز شروع بھی کردے تو توجہ کھانے کی طرف ہوگی۔ نماز کی طرف نہ ہوگی پھر جماعت ترک کرسکتا ہے۔ مگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر ترک جماعت جائز نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر کھانا خفیف ہو کہ چند منٹوں میں فارغ ہوسکتا ہے۔ تو پھر جماعت سے پہلے کھاسکتا ہے۔ اگر اہتمام والا کھانا ہو کہ زیادہ وقت لگ جائے گا۔ پھر جماعت کا ترک جائز نہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ سے جو بات منقول ہے۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے التصحیح القدوری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ احناف کے ہاں بھی کھانا ترک جماعت کے لئے عذر بن سکتا ہے۔ لیکن جب کھانے کی حاجت ہو۔ کیونکہ امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا کھانا نماز بن جائے یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ میری نماز کھانا بن جائے۔ لیکن حاجت شدیدہ نہ ہو۔ بغیر کھانے کے بھی اطمینان سے نماز پڑھ سکتا ہے تو پھر اجازت نہ ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اجازت صرف مغرب کے لئے ہے۔ اور وہ بھی صرف رمضان کے لئے ہے کہ انسان اس وقت بھوکا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے آدمی کے لئے کھانے کو مقدم کرنا جائز ہے۔ لیکن مغرب کے علاوہ یا نفلی، روزہ دار کے لئے اجازت نہیں مگر بعض کے ہاں مطلقاً صائم کے لئے اجازت ہے نفلی روزہ ہو یا فرضی ہو۔ مگر جمہور کہتے ہیں کہ یہ بات صائم یا مغرب کی وجہ سے نہیں بلکہ حکم کی علت شدت حاجت ہے۔ وہ صوم رمضان یا مغرب کی ساتھ خاص نہیں۔ اس لئے جب حاجت ہو تو ہر نماز میں کھانے کو مقدم کرسکتا ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ عند النعاس

پہلی بات: حدیث کا مفہوم:۔ اونگھ کے وقت نماز پڑھنے کے متعلق جو احادیث ہیں یہ باب ان کے بیان میں ہے۔ اس میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو نیند آرہی ہو نماز میں تو وہ سو جائے اور نماز چھوڑ دے کیونکہ یہ غفلت کی حالت ہے ممکن ہے یہ اپنے لئے مغفرت طلب کررہا ہو مگر غفلت میں اپنے لئے بددعا کردے۔

دوسری بات: اس باب کی حدیث کا تعلق نوافل کے ساتھ ہے فرائض کے ساتھ نہیں۔ کہ کوئی آدمی نوافل پڑھنا چاہے تو نیند کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ حالت غفلت کی ہے۔ دل اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ ممکن ہے دعا کی جگہ بددعا کردی۔

تیسری بات: معارف السنن میں مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے منقول ہے۔ کہ دماغ پر نیند کا اثر ہو اس کو نعاس کہتے ہیں۔ اگر صرف آنکھوں پر اثر ہو تو اس کو سنة کہتے ہیں۔ اور اگر دل پر بھی غفلت آجائے تو اس کو "نوم" کہتے ہیں۔

چوتھی بات: فلعله یذهب الخ یہاں یذہب یرید کے معنی میں ہے۔ فیسب نفسه اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ نفس کو گالی دے دے گا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ اس سے ظاہری معنی ہی مراد ہے۔ کہ اس کیفیت میں نماز پڑھے گا تو نماز سے اکتا جائے گا۔ آدمی جب کسی کام سے اکتا جائے تو نفس کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس لئے یہ بھی تنگ آکر نفس کو برا بھلا کہے گا۔ مگر دوسرے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ یستغفر کے مقابلے میں ہے۔ اس لئے اس سے بددعا مراد ہے ظاہری معنی مراد نہیں۔

باب ماجاء من زار قوماً فلا یصل بهم

پہلی بات: یہ باب قائم کیا ہے کہ کوئی آدمی اگر کسی قوم کی ملاقات کے لئے جائے تو ان کو نماز نہ پڑھائے۔ حدیث جو نقل کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی کے پاس گھر میں جائے یا مسجد میں کسی قوم سے ملنے جائے تو بہتر یہ ہے کہ یہ آدمی خود بڑھ کر امام نہ بنے۔ تو یہ باب آداب امامت میں سے ہے۔

دوسری بات: جمہور کی نزدیک باب کی حدیث ظاہر پر محمول ہے۔ کہ اس کے لئے امامت جائز نہیں۔ ① یہ کہ وہ لوگ اس کو اجازت دے دیں اور اس کو مجبور کریں۔ تو جمہور کے ہاں نماز پڑھا سکتا ہے۔ مگر اسحق بن راھویہ اور بعض اہل ظواہر کے نزدیک اجازت کے باوجود اس کے لئے امامت جائز نہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ پہلے باب میں گزر چکا ہے۔ کہ کوئی آدمی کسی کے غلبے کی جگہ نماز نہ پڑھائے۔ وہاں استثنا ہے "الا أن یأذن له" اس لئے اذن کی صورت مستثنٰی۔ ② دوسرا دوسری کی جگہ جو نماز نہ پڑھانے کی علت دوسرے کی دل آزاری ہے۔ لیکن وہ اجازت دیدے تو اس کی دل آزاری نہ ہوگی۔ اس لئے منع کی علت نہیں پائی گئی۔ تو ممانعت بھی نہ رہے گی۔

تیسری بات: "یؤم القوم أقرأهم" کی ترتیب تب ہے جب ترجیح نہ ہو۔ لیکن کوئی امام راتب ہے تو وہ زیادہ حق دار ہے۔ اسی طرح صاحب دار احق بالامامۃ ہے۔ ہاں اگر وہ لوگ کسی اعلم یا اقرأ کو اجازت دے دیں۔ پھر وہ نماز پڑھا سکتا ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة ان یخص الامام نفسه بالدعا

پہلی بات: اس باب میں جو حدیث نقل کی ہے۔ اس کے تین جملے ہیں۔ ① دوسرے کے گھر کے اندر دیکھنا جائز نہیں الا یہ کہ وہ آدمی اندر آنے کی اجازت دیدے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راستے میں چلتے ہوئے کسی کے گھر میں جھانکنا جائز نہیں۔ یا کسی سے ملاقات کرتے وقت دروازہ کھلا ہو اور گھر میں جھانکنے لگ جائے یہ جائز نہیں لیکن وہ اندر آنے کی اجازت دے دے تو گھر کو اندر سے دیکھنا جائز ہوگا۔ لیکن عورتوں کا دیکھنا پھر بھی جائز نہ ہوگا۔

دوسری بات: دوسرا جملہ ہے۔ کہ امامت کرے اور نفس کو خاص کرے دعا کے ساتھ۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ نماز کے اندر جو دعائیں مانگتا ہے یہ جمع متکلم کے صیغے کی ساتھ مانگے واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ نہ مانگے۔ مگر اس پر اشکال ہے کہ نماز کے اندر نبی ﷺ سے جو ادعیہ منقول ہیں۔ وہ واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ منقول ہیں۔ اس اشکال کی وجہ سے محمد بن حزیمہ نے باب کی حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو موضوع کہنا غلط ہے۔ باقی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے دوران ایسے وقت میں دعا نہ مانگے جو ادعیہ کا وقت اور مقام نہ ہو۔ کیونکہ دعا کے مقام میں دعا مانگے گا تو اس وقت مقتدی بھی دعا مانگیں گے۔ لیکن یہ ایسے مقام پر دعا مانگتا ہے۔ جو دعا کا مقام نہیں۔ اس لئے مقتدیوں کو تنبیہ نہ ہوگا۔ اس لئے وہ نہ مانگ سکیں گے۔ تو گویا اس نے دعا میں اپنے آپ کو خاص کیا۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے لئے دعا کرے دوسروں کے لئے بد دعا کرے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

باب ماجاء من ام قوماً وهم له کارهون

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تین آدمیوں پر لعنت کی ہے۔ ایک وہ شخص جو کسی قوم کا امام ہو اور وہ اس کو

ناپسند کرتے ہوں۔ دوسری وہ عورت جورات گزارے اس حال میں کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو۔ اور تیسرا وہ شخص جس نے اذان کی آواز سنی اور اجابت نہیں کی۔

پہلی بات: کوئی امامت کرے اور مقتدی اس سے ناراض ہوں۔ اس کا تعلق آداب امامت کے ساتھ ہے۔

دوسری بات: فقہاء فرماتے ہیں کہ اس میں اعتبار اکثر اور اقل کا ہے۔ یعنی امام کے مقتدیوں کی اکثریت اگر اس کو ناپسند کرے تو اس کے لئے امامت کرنا مکروہ ہوگا۔ لیکن اکثر پسند کریں تو اس کی امامت جائز ہوگی۔ ② دوسرے بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اعتبار علماء اور صلحاء کا ہے۔ کہ اگر علماء اور صلحاء اس کو پسند نہیں کرتے تو اس شخص کا امامت کرانا مکروہ ہے۔ لیکن علماء صلحاء پسند کریں۔ تو وہ مستحق لعنت نہیں اگر چہ جاہل مقتدی اس کو ناپسند کریں۔ ③ معارف السنن میں تیسرا قول منقول ہے اس کو فقہاء احناف نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ جن باتوں کی وجہ سے اس کو ناپسند کریں۔ ان باتوں کو دیکھیں گے۔ اگر وہ اس کے دین کے نقصان کی وجہ سے ناپسند کریں۔ مثلاً جاہل ہے یا فاسق ہے یا دوسرے افعال بد کا مرتکب ہے۔ تو ایسے شخص کی امامت مکروہ ہے۔ لیکن ایک آدمی متبع سنت ہے۔ بدعت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اس کے بدعتی مقتدی اس کو ناپسند کرتے ہوں۔ یہ آدمی اس حدیث کا مصداق نہیں۔ ④ چوتھا قول یہ ہے کہ وہ جو کراہت دینی ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔ لیکن ناپسندیدگی کی وجوہ دنیوی ہوں۔ مثلاً ذاتی عداوت ہو۔ تو ایسی وجوہ کا اعتبار نہیں۔ یہ وجوہ کراہت سارے اتفاقی ہیں۔

تیسری بات: "وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط" اگر شوہر اس وجہ سے ناراض ہے کہ عورت ناجائز امور کا ارتکاب کرتی ہے۔ یا اس کا حق زوجیت ادا نہیں کرتی یہ عورت مستحق لعنت ہے۔ لیکن شوہر کی ناراضگی کاموں کی وجہ سے ہو۔ مثلاً ایسے کہے کہ میرے ساتھ بے پردہ پھرو اور وہ ایسا نہ کرے تو وہ لعنت میں داخل نہیں بلکہ لعنت کی مستحب تب ہوگی جب معروف میں شوہر کی نافرمانی کرے۔

چوتھی بات: "رجل سمع حي على الفلاح ثم لم يجب" اجابت سے اجابت فعلی مراد ہے۔ کیونکہ اجابت قولی واجب نہیں۔ اس لئے اجابت فعلی مراد ہے کہ جو اجابت فعلی نہ کرے وہ مستحق لعنت ہے۔

پانچویں بات: "العبد الابق حتى يرجع" کیونکہ عبد ابق بھی گنہگار ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے۔

چھٹی بات: آخر حدیث میں ہے "ثلاثة لاتجاوز صلاتهم اذانهم" یہ کنایہ ہے عدم قبولیت سے لیکن اب ان کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں ہوگی۔ تو فرماتے ہیں کہ نماز صحیح ہوگی اور فرض ساقط ہو جائے گا۔ لیکن نماز قبول نہیں ہوگی۔ یعنی اس پر جو درجات ملتے ہیں وہ نہ ملیں گے یعنی قبول حسن نہ ہوگا۔

باب ماجاء اذا صلى الامام قاعداً فصلوا قعوداً باب منه

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے سے گر گئے۔ آپ زخمی ہو گئے آپ نے بیٹھ کر نماز ادا کی ہم نے بھی ان کے پیچھے بیٹھ کر نماز ادا کی۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ امام اس لئے بنایا گیا ہے تا کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ اور جب وہ سر اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ۔ جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔

دوسرے باب میں مرض الوفات کا واقعہ ہے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کھڑے ہو کر اقتداء کی۔

اختلاف: مسئلہ یہ ہے کہ امام عذر کی وجہ سے قادر علی القیام نہیں اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہے۔ تو اس کے مقتدی جو قادرین علی القیام

ہیں۔وہ کھڑے ہوکر اقتداء کر سکتے ہیں یا امام کی متابعت میں بیٹھ کر پڑھیں۔اس میں اختلاف ہے۔

❶ پہلا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض فقہاء کا ہے۔کہ جو امام قادر علی القیام نہ ہو اور مقتدی قادر ہوں تو ایسے مقتدیوں کے لئے ،ایسے امام کی اقتداء جائز نہیں۔

❷ دوسرا قول احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ،اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل ظواہر کا ہے۔ان کے یہاں اگر امام قادر علی القیام نہیں تو مقتدیوں کے لئے بھی بیٹھ کر اس کے پیچھے نماز پڑھنا ہوگی۔اگرچہ مقتدی قادر علی القیام ہوں۔امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ تفصیل ہے۔ایک قول یہ ہے کہ مقتدیوں کیلئے بیٹھنا واجب ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ وجوب نہیں بلکہ استحباب۔دوسرا امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قول کے کچھ شرائط ہیں ① یہ عذر نماز کے دوران لاحق نہ ہوا ہو۔بلکہ پہلے سے لاحق ہوا ہو۔لیکن اگر نماز کے درمیان لاحق ہوا تو مقتدی اس صورت میں کھڑے ہوکر اقتداء کریں گے ② یہ امام راتب ہو ③ مرض مرجوّ الزوال ہو۔توان شروط کا پایا جانا ضروری ہے۔

❸ تیسرا قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ،امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ،سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ ،ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء ومحدثین کا ہے ان کے یہاں اگر امام قادر علی القیام نہیں تو بہتر یہ ہے کہ امامت نہ کرائے۔لیکن اگر امامت کرائے تو بیٹھ کر پڑھا سکتا ہے۔لیکن مقتدیوں کے لئے کھڑا ہونا ضروری ہے۔جب وہ قادر علی القیام ہوں۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل باب اول کی حدیث ہے۔کہ "اذا صلی قاعداً فصلوا قعوداً اجمعون"

جمہور کی دلیل دوسرے باب کی حدیث ہے۔اس میں مرض الوفات کا واقعہ ہے۔جو آپ ﷺ کا آخری عمل ہے۔ مرض الوفات کے متعلق دو قسم کی روایات ہیں ① صلی خلف ابی بکر ② امام نبی اکرم ﷺ تھے۔لیکن آپ کی آواز پست تھی۔ اس لئے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی آواز پہنچا رہے تھے۔یہاں نبی ﷺ بیٹھ کر پڑھا رہے تھے صحابہ کھڑے تھے۔تو یہ احادیث کا جو اختلاف ہے یہ تعدد ایام کی وجہ سے ہے کہ کسی دن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے نماز ادا کی ،کسی دن خود پڑھائی۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور کوکب الدری میں گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ احوال کا اختلاف ہے۔شروع میں آپ آئے تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء کی ،جب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم ہوا ،تو وہ پیچھے ہٹ گئے تو نبی ﷺ آگے بڑھ گئے اور نماز پڑھائی۔بعض راویوں نے پہلی حالت دیکھی وہ نقل کردی بعض نے دوسری حالت دیکھی وہ نقل کردی۔اس لئے یہاں کوئی تعارض نہیں۔جمہور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی مستدل کے دو جواب دیتے ہیں۔

❶ جمہور حدیث اول کو منسوخ مانتے ہیں۔کیونکہ وہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔جب کہ دوسرا واقعہ مرض الوفات کا ہے۔اس لئے یہ ناسخ ہے۔

❷ دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلے باب کی حدیث نوافل پر محمول ہے کہ نبی ﷺ مسجد میں نہیں آسکتے تھے۔ایک دفعہ صحابہ نے ظہر ادا کی حضور ﷺ کی عیادت کے لئے گئے۔آپ ﷺ ظہر ادا فرما رہے تھے۔صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نفل کی نیت سے شریک ہوگئے وہاں فرمایا کہ بیٹھ کر پڑھو۔اور نفل میں ایسا ہی کرنا چاہئے۔کیونکہ نفل میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔اس لئے اس میں بیٹھنا چاہئے تاکہ انتشار نہ ہو کہ آدھے کھڑے ہوں۔آدھے بیٹھے ہوں۔

باب ماجاء فی الامام ینهض فی الرکعتین ناسیاً

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ امام دو رکعتوں کے بعد قعدہ اولیٰ بھول گیا اور تیسری رکعت کی طرف اٹھ گیا تو اس کے لئے کیا حکم ہے۔کیا وہ واپس لوٹ آئے۔یا کھڑا رہے نماز جاری رکھے اور آخر میں سجدہ سہو کرلے۔معارف السنن میں ہے کہ اس مسئلے میں ائمہ اور جمہور فقہاء اور

محدثین کا اتفاق ہے کہ اگر امام قعدہ اولیٰ بھول گیا اور تیسری رکعت کی طرف اٹھ گیا۔ اب اگر اس کو اس وقت یاد آیا جب وہ اقرب الی القعود تھا تو وہ بیٹھ جائے اور سجدہ سہو لازم نہ ہوگا۔ اب اقرب الی القعود کا کیا مطلب ہے؟ احناف کے فقہاء نے اس کے دو مطلب لکھے ہیں۔ ① سرین اٹھالے اور رکبتین ابھی تک زمین پر لگے ہوئے ہو۔ ② دوسری تعریف یہ ہے کہ نصف اسفل سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو۔ اس وقت تک اقرب الی القعود شمار ہوگا۔ لیکن نصف اسفل مکمل سیدھا کھڑا ہو جائے تو وہ اقرب الی القیام شمار ہوگا اقرب الی القعود نہ ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اقرب الی القیام تھا۔ یا پورا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یاد آیا کہ میں نے قعدہ اولی نہیں کیا۔ تو یہ نماز جاری رکھے واپس نہ بیٹھے اخیر میں سجدہ سہو کرلے یہ سجدہ سہو جبیرہ ہوگا۔ یہ سجدہ سہو ان کے ہاں بھی جبیرہ ہوگا۔ جو قعدہ اولیٰ کو فرض قرار دیتے ہیں۔ جیسے حنابلہ اور یہ احناف کا بھی قول ہے جو قعدہ اولیٰ کو واجب کہتے ہیں۔ اور شوافع کا بھی یہی قول ہے جو قعدہ اولیٰ کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ تو ان سب کے ہاں سجدہ سہو جبیرہ ہوگا۔

دوسری بات: فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی قعدہ اولیٰ بھول کر سیدھا کھڑا ہو گیا قیام کی بعد یاد آیا۔ اس کو کھڑا ہی رہ کر نماز ادا کرنی چاہئے۔ لیکن اگر وہ پھر بھی بیٹھ جائے تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے۔ عام فقہاء احناف نے اس صورت میں فساد کا قول اختیار کیا ہے۔ کیونکہ تیسری رکعت کا قیام فرض ہے اور قعدہ اولیٰ فرض نہیں اور یہ فرض شروع کر چکا ہے۔ اور فرض چھوڑ کر واجب یا سنت کی طرف لوٹنا وجہ فساد ہے۔ لیکن احناف میں سے ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ واپس نہیں آنا چاہئے۔ لیکن اگر آ گیا اور آخر میں سجدہ سہو کر لیا تو اس کی نماز ہو جائے گی فاسد نہیں ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے فرض جو چھوڑا ہے، یہ اصلاح صلاۃ کے لئے چھوڑا ہے اور جس فرض کو چھوڑا ہے اس کو دوبارہ ادا بھی کر لیا ہے۔ اس لئے وجہ فساد یہاں کوئی نہیں معارف السنن میں اس قول کو پسند کیا گیا ہے۔

تیسری بات: سجدہ سہو قبل السلام ہے یا بعد السلام ہے اس میں اختلاف ہے۔ اس کا مستقل باب آگے آرہا ہے۔

باب ماجاء فی مقدار القعود فی الرکعتین الاولیین

پہلی بات: دو رکعتوں کے بعد قعدہ کی مقدار کتنی ہونی چاہئے۔ اس کا یہاں بیان کیا جارہا ہے۔

دوسری بات: الرکعتین الاولیین کا مطلب کیا ہے؟ اس کے مصداق میں اختلاف ہے۔ مرقات میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علامہ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رکعتین اولیین سے مراد رکعت اول اور رکعت ثالث ہے۔ وبناء علی ہذہ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جلسہ استراحت کی نفی کے لئے کہ نبی اکرم ﷺ رکعتین اولیین یعنی رکعت اولیٰ اور رکعت ثالث کے بعد نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ بہت جلدی اٹھتے تھے۔ گویا گرم پتھر پر بیٹھے ہوں۔ لیکن عام شارحین کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اس محمل پر حمل کرنا جائز نہیں۔ عام شارحین اس کا وہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ رکعتین اولیین سے رکعت اولیٰ اور رکعت ثانیہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ قعدہ اولیٰ میں زیادہ دیر نہیں بیٹھتے تھے۔ تو اس پر جمہور کا اجماع ہے کہ تشہد کے اختتام تک بیٹھتے تھے۔ اس کی بعد بیٹھنا جائز نہیں۔

تیسری بات: کوئی آدمی تشہد ختم کرنے کے بعد بھول کر درود پڑھنے لگ گیا۔ تو اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں۔ تو اس میں احناف کے متعدد اقوال ہیں۔ ① **اللھم صلی** کہا تو اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا۔ ② تام جملہ پڑھے یعنی "**اللھم صلی علی محمد**" پھر سجدہ سہو لازم ہوگا۔ ③ عام علماء احناف نے اس قول کو ترجیح دی ہے جو قاضی خان نے ذکر کیا ہے کہ **اللھم صلی علی محمد وعلی آل محمد** تک پڑھے تو سجدہ سہو لازم آئے گا۔ ④ **انک حمید مجید** تک پڑھے پھر سجدہ لازم ہوگا۔ اس سے کم پڑھے تو لازم نہ ہوگا۔

كانهٗ علی الرضف: شعبہ کہتے ہیں کہ علی الرضف تک میں نے اپنے استاد سعد سے حدیث سنی۔ اس کے بعد انہوں نے ہونٹ ہلائے مگر سمجھ نہ آیا کہ لفظ کیا کہا۔ میں نے گمان کیا کہ کانہ علی الرضف حتی یقوم کہا ہوگا۔ بعد میں جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حتیٰ یقوم ہی کہا تھا۔

باب ماجاء فی الاشارة فی الصلاة

پہلی بات: یہ باب اشارہ فی الصلاۃ کے بارے میں قائم کیا ہے۔ اور باب میں جتنی احادیث نقل کی ہیں۔ اس سے اشارہ فی الصلوٰۃ لرد السلام کی تخصیص معلوم ہوتی ہے۔ کہ اشارہ سے مراد عام اشارہ نہیں بلکہ اشارہ لرد السلام مراد ہے۔

دوسری بات: اگر کوئی آدمی نماز کی حالت میں ہو اور کسی نے اس کو سلام کیا۔ اب سلام کا جواب بالاصالہ یعنی زبان سے جواب دینا تمام آئمہ کے ہاں جائز نہیں۔ اور اگر کسی نے زبان سے سلام کا جواب دے دیا تو بالاتفاق اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ سعید بن المسیب رحمہ اللہ تعالیٰ، حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ، اور قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ یہ تینوں اس کے قائل ہیں کہ زبان سے جواب دینا جائز ہے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

تیسری بات: سلام کا جواب اگر اشارے سے دیا اور اس کا مقصد سلام کا جواب دینا ہے۔ تو اس کا کیا حکم ہے؟ ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بغیر کراہت کے جائز ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رد سلام کے لئے اشارہ کرنا مفسد صلاۃ تو نہیں۔ مگر مکروہ ہے یعنی نماز مع الکراہۃ ادا ہو جائے گی۔ احناف کی دلیل ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ کہ جب وہ حبشہ سے آئے تو فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔ یعنی نہ زبان سے نہ اشارے سے۔ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ دیکھا تو شبہ ہوا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں۔ نماز سے فراغت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ناراضگی کی بات نہیں "ولکن اللّٰہ یحدث فی امرہ مایشآء" کہ اللہ جو چاہے امر نازل کر دیں۔ اس لئے اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم نماز میں باتیں مت کرو۔

باقی احناف باب کی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ پہلے اشارے سے جواب دینا جائز تھا۔ اب اس واقعہ کے بعد یہ بات منسوخ ہوگئی۔

باب ماجاء ان التسبیح للرجال والتصفیق للنساء

پہلی بات: نماز میں ایسی حالت پیش آئے کہ امام کو تنبیہ کرنا مقصود ہو تو مردوں کے لئے تنبیہ کا طریقہ تسبیح ہے۔ اور عورتوں کے لئے تصفیق کا حکم ہے۔ مثلاً امام نے ایک رکعت پڑھ کر قیام کے بجائے قعدے میں بیٹھ گیا۔ یا دو رکعت کے بعد قعدہ نہیں کیا اور کھڑا ہو گیا۔ تو اس کو تنبیہ کرنے کے لئے مرد تسبیح یعنی سبحان اللّٰہ کہیں تاکہ امام کو معلوم ہو جائے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اور عورتیں اس کو متنبہ کرنا چاہیں تو تصفیق کریں۔

دوسری بات: اس مسئلے میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہی ہے کہ مردوں کے لئے تنبیہ کا طریقہ تسبیح ہے اور عورتوں کے لئے تصفیق ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عورتوں کے لئے بھی تسبیح ہے۔ عورتوں کے لئے تصفیق جائز نہیں۔ باقی باب کی حدیث میں "والتصفیق للنساء" ہے۔ یہ شرعی حکم نہیں۔ بلکہ عورتوں کی عادت بیان کی جارہی ہے کہ ان کی عادت مذمومہ یہ ہے کہ وہ تالی بجاتی ہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ یہ تاویل غلط ہے کیونکہ حدیث کے پہلے جملے میں حکم کا بیان ہے تو دوسرے جملے میں بھی حکم ہی کا بیان ہوگا۔

قال علی اذا استأذنت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ یہ بات نوافل کی ہے۔ نوافل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو تسبیح پڑھتے۔ اور یہ اب بھی جائز ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة التثاوب فی الصلاہ

پہلی بات: تثاوب کا معنی ہے جمائی لینا۔ نیند کا غلبہ ہو سونے کی خواہش ہو یا سوکر اٹھے تو آدمی منہ کھول کر سانس لیتا ہے۔ اس کو جمائی کہتے ہیں۔ جمائی ان اعمال میں سے ہے جس میں انسان کے فعل کا دخل نہیں۔ اب جب اس میں انسان کے عمل کا دخل نہیں تو اس کی کراہت کا کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کیفیت سستی کی وجہ سے طاری ہوتی ہے۔ اور سستی اس لئے آتی ہے کہ انسان فضولیات میں مشغول ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ گویا یہ خود تو غیر اختیاری ہے مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں۔

دوسری بات: یہاں جو شیطان کی طرف نسبت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان ہی انسان کو اس کیفیت تک پہنچاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اسباب اکثر بیہودہ ہوتے ہیں۔ اور ان بے ہودہ افعال میں شیطان مشغول رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف نسبت کی۔

تیسری بات: اس کی کراہیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ منافقین کے بارے میں ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اب جب یہ نماز میں جمائی لے رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز دل سے نہیں پڑھ رہا ہے۔ اس لئے منافقین سے مشابہت لازم آتی ہے۔

چوتھی بات: معارف السنن میں اس کا علاج یہ لکھا ہے کہ جب جمائی آئے تو دل میں خیال کرے کہ نبی ﷺ اور دیگر انبیاء کو یہ پیش نہیں آتی تھی جب یہ خیال کرے گا تو اس کو بھی جمائی نہ آئے گی۔

باب ماجاء فی ان صلاۃ القاعد علی النصف من صلاۃ القائم

پہلی بات: باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے اس کا ثواب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے ثواب سے کم اور نصف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثواب ملتا ہے بقدرِ مشقت اور قیام میں مشقت زیادہ ہے اور قاعدہ کی مشقت کم ہے۔ اس لئے قائم کو زیادہ ثواب ملے گا اور قاعد کا ثواب کم ہے۔

دوسری بات: معارف السنن میں مولانا انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اعتراض نقل کیا ہے کہ یہاں فرائض مراد ہیں یا نوافل؟ اگر فرائض مراد ہوں تو قیام فرض ہے۔ اور عذر کی وجہ سے کوئی قیام نہ کر سکے تو اس کو شریعت نے بیٹھنے کی اجازت دی ہے۔ اس لئے اس کو پورا ثواب ملے گا آدھا نہ ملے گا۔ اگر نوافل مراد ہوں، تو بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملے گا۔ لیکن یہاں حدیث میں ہے کہ لیٹ کر پڑھنے والے کو قاعد کی بنسبت نصف ثواب ملتا ہے جب کہ نوافل کا لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔

علامہ انور شاہ صاحب نے یہ جواب دیا ہے کہ باب کی حدیث میں فرائض مراد ہیں۔ اب معذور کی دو صورتیں ہیں۔ ① اس کا عذر ایسا ہے کہ شرعاً اس کے لئے قعود جائز ہے۔ لیکن یہ شرعی معذور آدمی باوجود شرعی اجازت کے تکلیف برداشت کر کے قیام کرتا ہے۔ ② اور دوسرا وہ معذور ہے جو شریعت کی اجازت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تو ان کا تقابل مراد ہے کہ جس نے رخصت کا فائدہ اٹھایا اس کو پورا ثواب ملے گا۔ لیکن جس نے رخصت پر عمل نہیں کیا بلکہ مشقت برداشت کی، تو اس کو ڈبل ثواب ملے گا۔ کیوں کہ مشہور قاعدہ ہے **"العطایا علی متن البلایا"**

معارف السنن میں ہے۔ کہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی بحث کا خلاصہ بھی یہی نکلتا ہے کہ اس سے فرائض مراد ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ تفصیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور نبی ﷺ جب مدینہ میں ہجرت کر کے آئے۔ تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بخار لگ گیا۔ اس وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھنے لگ گئے۔ تو نبی ﷺ نے حدیث بیان کی تو صحابہ نے مشقت برداشت کر کے قیام شروع کر دیا۔

تیسری بات: **"ومن صلاھا نائما فلہ نصف اجر القاعد"** احناف کی کتابوں میں ہے کہ اگر فرائض میں بیٹھ بھی نہ سکے۔ تو لیٹ کر

نماز پڑھ سکتا ہے۔اب کس طرح لیٹے۔تو جمہور کا قول یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹے گا۔یہ آئمہ ثلاثہ کا قول ہے اور احناف کا بھی ایک یہی قول ہے۔لیکن احناف سے مشہور طریقہ یہ منقول ہے کہ چت لیٹ جائے۔پاؤں قبلہ کی طرف کرے اور اشارہ سے نماز ادا کرے۔

چوتھی بات: باقی نوافل لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔یا نہیں۔تو جمہور کے جائز ہاں نہیں لیکن حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں نوافل لیٹ کر پڑھنا جائز ہیں۔اسی طرح متاخرین میں سے علامہ خطابی کا بھی یہی مسلک ہے۔

باب فيمن يتطوع جالسًا

نوافل کی نماز قائماً بھی جائز ہے قاعداً بھی جائز ہے باوجود قدرت علی القیام کے۔البتہ قاعداً پڑھنے کا ثواب قائماً پڑھنے کے ثواب سے نصف ہے۔تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ جمہور کے ہاں نوافل میں قیام فرض نہیں۔باقی جمہور کے ہاں لیٹ کر نوافل جائز نہیں۔اور حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے۔کمامر۔

باب ماجاء ان النبی ﷺ قال انی لاسمع الخ

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے نماز میں تخفیف کرنا یا تطویل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق احناف کے ائمہ ثلاثہ سے ایک قول منقول ہے۔وہ یہ کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اخاف علیه امراً عظیماً" کہ اس آدمی کے متعلق امر عظیم کا خوف ہے۔اب امر عظیم سے کیا مراد ہے۔اس سے یا کفر مراد ہے یا ریاء مراد ہے جو کہ شرک خفی ہے تو گویا امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے لئے نماز میں تطویل یا تخفیف کرنا جائز نہیں۔

لیکن باقی احناف کہتے ہیں کہ یہاں احوال مختلف ہیں۔مثلاً کسی آدمی کو جانتا ہے۔اس کی وجہ سے تخفیف یا تطویل کرتا ہے یہ جائز نہیں۔لیکن امام کسی کو جانتا نہیں ویسے کسی عارض کی وجہ سے تطویل یا تخفیف کرتا ہے یہ جائز ہے چنانچہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو تخفیف کرتا ہوں تا کہ اس کی ماں فتنے میں نہ پڑ جائے۔اور یہاں معلوم نہیں کس کا بچہ ہے۔اس کی ماں کون سی ہے۔تو بغیر تعارف کے تخفیف کی گئی ہے۔معلوم ہوا کہ تطویل یا تخفیف تعارف کی بناء پر نہ ہو تو جائز ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں تخفیف قبل الشروع مراد ہے۔کہ نبی ﷺ کا ارادہ تطویل کا ہوتا۔لیکن بچے کی آواز سنتے تو ارادہ ترک کر دیتے تطویل کا،اور تخفیف کرتے۔مگر معارف السنن میں ہے کہ صحیح یہ ہے کہ تخفیف فی الصلاۃ مراد ہے۔

باب ماجاء لاتقبل صلاة الحائض الابخمار

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ عورت بالغہ ہو اس کے متعلق آئمہ کا اس بات پر اتفاق ہے۔کہ اس کا پورا بدن عورت ہے۔البتہ یہ کہ جواز صلاۃ کے لئے کچھ اعضاء مستثنیٰ ہیں۔قرآن میں استثناء کو "الاماظهر منها" سے ذکر کیا ہے۔نبی ﷺ نے اس ماظہر کی تشریح کی کہ اس سے وجہ،کفین اور قدمین مراد ہیں کہ چہرہ قدمین اور کفین کھلے ہوئے ہوں۔اور اسی حالت میں نماز پڑھے تو جائز ہوگا۔یہ اعضاء صرف جواز صلاۃ کے لئے مستثنیٰ ہیں ورنہ باقی حالات میں پورا بدن عورت ہے اس لئے اجنبی کے لئے اس کے چہرے،قدمیں،کفین کی طرف دیکھنا جائز نہیں۔

دوسری بات: جب صرف کفین،قدمین اور وجہ نماز میں مستثنیٰ ہیں۔باقی بدن عورت ہے۔تو اگر نماز کی حالت میں بال ظاہر ہو جائیں تو اس کی نماز نہ ہوگی۔یہ مسئلہ اجماعی اور اتفاقی ہے۔"لاتقبل ای لاتصح".

باب ماجاء فی کراهیة السدل فی الصلاۃ

پہلی بات: ترجمۃ الباب اور باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ نبی ﷺ نے سدل سے منع کیا ہے۔یعنی سدل نماز میں مکروہ ہے۔ سدل کا مکروہ ہونا بالاتفاق اور بالاجماع ہے۔

دوسری بات: سدل کے مکروہ ہونے میں تو اتفاق ہے مگر سدل کی تعریف میں اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں کہ سدل سے مراد شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ہے۔دوسری تعریف یہ ہے کہ گلے میں کپڑا اڈالے اور دونوں طرف سامنے سینے کی طرف لٹکا دے یہ یہود کا خصوصاً ان کے علماء کا طریقہ تھا۔جیسا کہ آج کل بعض کرتے ہیں۔تیسری تعریف احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔کہ اس پر ایک ہی کپڑا ہو اس کو بدن پر اس طرح لٹکا دے۔کہ اگر ہاتھ نکالے تو ستر کھل جائے۔تو احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر کپڑوں کے اوپر سدل کرے تو جائز ہوگا۔جب کہ جمہور کے ہاں کپڑوں کے اوپر بھی سدل مکروہ ہے۔بہر حال تینوں تعریفوں کے اعتبار سے سدل نماز کے اندر مکروہ ہے۔ البتہ نماز کے علاوہ سدل کا کیا حکم ہے۔تو پہلی اور دوسری تعریف کے مطابق سدل نماز کے علاوہ بھی ممنوع ہوگا۔البتہ تیسری تعریف کے مطابق نماز سے باہر سدل جائز ہوگا۔

باب ماجاء فی مسح الحصی فی الصلاۃ

پہلی بات: ترجمۃ الباب اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کبھی آدمی زمین پر سجدہ کرتا ہے۔تو زمین پر جو کنکریاں ہوتی ہیں وہ اس کے پیشانی پر لگیں یا اس کے لئے کنکریوں پر بیٹھنا ممکن نہیں۔وہ ہاتھ سے کنکریاں برابر کرتا ہے۔اس کو مسح الحصی کہتے ہیں۔اب ایسا کر سکتا ہے یا نہیں۔تو حدیث سے ممانعت معلوم ہوتی ہے۔باب کے آخر میں حدیث نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر برابر کرنا بھی ہو تو ایک مرتبہ برابر کر سکتے ہو بار بار نہیں کر سکتے۔کیونکہ بار بار کرنے سے یہ عمل کثیر بن جائے گا اور عمل کثیر مفسد صلاۃ ہے۔

دوسری بات: اگر ضرورت نہ ہو ویسے کنکریوں کے ساتھ کھیل رہا ہو یہ عبث کہلاتا ہے۔یہ کبھی آدمی کی عادت بن جاتی ہے اور انسان جب بار بار کرتا ہے تو کثرت تک پہنچ جاتا ہے جو مفسد صلاۃ ہوتا ہے،اگر چہ بعض حضرات نماز میں خشوع اور خضوع کو مستحب کہتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خشوع وخضوع واجب ہے۔

ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ کپڑوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جوارح میں بھی ہوتا۔کپڑوں سے کھیلنا در حقیقت اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی کا دل نماز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

باب ماجاء فی کراهیة النفخ فی الصلاۃ

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ نماز کے دوران کوئی شخص پھونک مارتا ہے۔تو احناف کہتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں۔ایک صورت یہ ہے کہ ایسی پھونک مارے کہ اس سے حروف پیدا ہوں۔یہ مسئلہ مفسد صلاۃ ہے لیکن ایسی پھونک مارے کہ اس سے آواز پیدا نہ ہو اور نہ حروف پیدا ہوں۔تو یہ بھی مکروہ ہے مگر مفسد نہیں۔

ترب وجھک نہ چہرے کو خاک آلود کرو یعنی ایسی جگہ سجدہ کرو کہ جہاں مٹی ہو کہ چہرے کے ساتھ لگے۔

باب ماجاء فی النهی عن الاختصار فی الصلاۃ

پہلی بات: ترجمۃ الباب اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے اندر اختصار ممنوع ہے۔

دوسری بات: اختصار کسے کہتے ہیں۔ ❶ اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے اختصار فی القرأۃ مراد ہے کہ مقدار مسنون سے اختصار کرے۔

❷ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اختصار سے اختصار فی القرأت مراد ہے مگر اس طریقے سے کہ ہر رکعت میں سورت کی آخری آخری چند آیات پڑھے۔

❸ تیسری تفسیر یہ ہے کہ وضع الید علی المخصرة مراد ہے۔ کہ آدمی نماز کی حالت میں عصا پر ٹیک لگائے۔

❹ چوتھی تفسیر یہ ہے کہ وضع الیدعلی الخاصرة۔ اختصار ان سب تفسیروں کے اعتبار سے مکروہ ہے۔ البتہ کراہت میں فرق ہے۔ وضع الیدین علی الخاصرة میں کراہت زیادہ ہے۔ اس سے کم کراہت وضع الیدعلی المخصرة کی ہے۔ اس سے کم کراہت آخری آیات پڑھنے میں ہے۔ اور سب سے کم کراہت قرأت مسنونہ میں اختصار کرنے میں ہے۔ کراہت سب میں ہے مگر کراہت میں تفاوت ہے۔

تیسری بات: اختصار آخری تفسیر کے اعتبار سے داخل صلاۃ بھی مکروہ وممنوع ہے اور خارج صلاۃ بھی ممنوع ہے داخل صلاۃ اس لئے منع ہے کیونکہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے۔ جب کہ نماز میں خشوع ہونا چاہئے دوسرا نماز میں قیام کا جو طریقہ مسنون ہے یہ طریقہ اس کے خلاف ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ شیطان کی ہیئت ہے۔ جب اس کو جنت سے اتارا گیا تو ایک ہاتھ سر پر دوسرا ہاتھ کمر کے پاس رکھا ہوا تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختصار کی آخری تعریف ذکر کی ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة کف الشعر فی الصلاۃ

پہلی بات: بالوں کو گردن پر باندھ دینا تاکہ نماز میں جب سجدہ کرے تو بالوں کے ساتھ مٹی نہ لگ جائے۔ یہ طریقہ مکروہ ہے بلکہ نماز کے دوران کپڑوں کو لپیٹنا بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ انسان جب سجدہ کرتا ہے تو ساری چیزیں سجدے میں شریک ہوتی ہیں۔ تو ان چیزوں کو سجدے سے روکنا ہے۔ دوسرا ساتھ یہ نیت بھی ہو کہ بال یا کپڑے خراب نہ ہوں یہ تکبر بھی ہے جب کہ نماز میں خشوع کا حکم ہے۔ کف الشعر کی کراہت اتفاقی اور اجماعی ہے۔

دوسری بات: حدیث میں ہے کہ ابورافع نے حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بال کھولے اور فرمایا "ذالک کفل الشیطان حاشیے میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ نصب یعنی یہ گناہ میں شیطان کا حصہ ہے۔ اگرچہ کفل نصیب کے معنے میں آتا ہے۔ مگر مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہاں کفل کا معنی نصیب سے صحیح نہیں۔ کفل اصل میں کہتے ہیں کہ جب آدمی اونٹ پر سوار ہوتا ہے تو کوہان پر کپڑا ڈالتا ہے۔ اور یہاں مراد مقعد ہے کہ یہ شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔

باب ماجاء فی التخشع فی الصلاۃ

مسئلہ: باب میں خشوع کا مسئلہ ہے عام طور پر خشوع اور خضوع یہ دونوں مشہور ہیں۔ اب خشوع اور خضوع کسے کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور معنی ہے عاجزی اور بندگی۔ بعض کہتے ہیں کہ خشوع کا تعلق صورت اور بدن سے ہے۔ اور خضوع کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ قرآن میں خشوع کا لفظ صورت، بصر اور قلب تینوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ تو خشوع کا تعلق تینوں کے ساتھ ہے۔ اسی طرح خضوع کا تعلق بھی بدن کے ساتھ قرآن میں موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خشوع وخضوع کا استعمال کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ ان میں عموم ہے۔ مقصد یہ ہے

کہ خشوع وخضوع دو قسم کے ہیں۔ایک وہ جس کا تعلق قلب کے ساتھ ہے۔یہ خشوع وخضوع مستحب ہے کیونکہ قلب کے افعال اختیاری نہیں۔دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق جوارح کے ساتھ ہے۔یہ انسان کے اختیار میں ہے۔اس لئے اس قسم کا خشوع وخضوع واجب ہے۔

خشوع وخضوع کی پہلی قسم کو صوفیاء ذکر کرتے ہیں۔فقہاء دوسری قسم کو ذکر کرتے ہیں۔جس کا تعلق جوارح کے ساتھ ہے۔کیونکہ اس کے ساتھ احکام کا تعلق ہوتا ہے۔اور احکام کا بیان کرنا فقہاء کا کام ہے۔

تقنع یدیک نکہ ہاتھ بلند کر کے یارب یارب کہے۔یہ نماز کے بعد ہے۔ورنہ نماز کے اندر اس طرح ہاتھ اٹھانا صحیح نہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة التشبیک بین الاصابع فی الصلاۃ

پہلی بات: تشبیک کا مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔تشبیک کسے کہتے ہیں۔تو فرماتے ہیں کہ تشبیک ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنے کو کہتے ہیں۔

دوسری بات: تین مواقع میں تشبیک بین الاصابع جائز نہیں ① ایک حدیث میں مذکور ہے کہ جب وضوء کر کے مسجد کی طرف نماز کے ارادے سے چلے۔② جب مسجد کے اندر نماز کی انتظار میں بیٹھا ہو اس وقت بھی تشبیک جائز نہیں۔③ نماز کے اندر تشبیک بین الاصابع جائز نہیں۔کیونکہ پہلی دو صورتوں میں یہ حکماً نماز میں ہے۔اور تیسری صورت میں حقیقۃً نماز میں ہے۔اور حقیقۃً نماز میں ہو یا حکماً نماز میں ہو تشبیک جائز نہیں لیکن نماز میں نہ حقیقۃً ہو نہ حکماً ہو بلکہ خارج صلاۃ ہو تو تشبیک جائز ہے۔اور نبی ﷺ سے ثابت ہے۔

تیسری بات: تین مواضع مذکورہ میں تشبیک کی کراہیت اتفاقی ہے۔

چوتھی بات: اس کراہت کی وجہ اور سبب کیا ہے؟ اس کے متعلق متعدد باتیں ہیں جو محدثین نے ذکر کی ہیں۔

① تشبیک اختلاف کی علامت ہے۔اس لئے تین مواضع میں منع کیا۔کیونکہ یہ مواضع ائتلاف اور اتفاق کے ہیں۔② دوسری وجہ یہ ہے کہ تشبیک جالب نوم ہے اس لئے منع فرمایا۔③ یہ عمل انگلیوں کو چٹخانے کے لئے کیا جاتا ہے۔اور نماز میں انگلیوں کو چٹخانہ ممنوع ہے۔اس لئے نبی ﷺ نے نماز کی حالت میں حقیقۃً ہو یا حکماً ہو تشبیک سے منع فرمایا۔

باب ماجاء فی طول القیام فی الصلاۃ

باب ماجاء فی کثرۃ الرکوع والسجود

اختلاف: ان ابواب میں ایک اختلافی مسئلہ مذکور ہے۔یہ اختلاف جواز یا عدم جواز کا نہیں۔بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے۔وہ اختلاف یہ ہے کہ نوافل میں طول قیام افضل ہے یا مختصر قرأت کے ساتھ زیادہ رکعات پڑھنا افضل ہے۔اس بات پر تو اتفاق ہے کہ طول قیام بھی ہو اور کثرت رکوع اور سجود بھی ہو یہ افضل ترین صورت ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ طول قیام ہو۔تیسری صورت یہ ہے کہ کثرت رکوع وسجود ہو۔ان دو میں افضل کون سا ہے۔اس میں اختلاف ہے۔

❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہ ہے کہ طول قیام افضل ہے۔امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کثرت رکوع اور سجود کا قول بھی افضلیت کے بارے میں منقول ہے۔

❷ دوسرا قول امام شافعی، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ان کے ہاں کثرت رکوع وسجود افضل ہے۔اور ایک قول میں

ان کے ہاں بھی طول قیام افضل ہے۔

❸ تیسرا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے ان کے ہاں دونوں برابر ہیں۔

❹ چوتھا قول اسحٰق کا ہے۔ان کے ہاں دن میں کثرت رکوع وسجود افضل ہے اور رات میں طول قیام افضل ہے۔گویا انہوں نے تطبیق دی ہے۔اور احادیث دونوں قسم کی صورتوں کی افضلیت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔اس لئے کبھی طول قیام پر عمل کرنا چاہئے اور کبھی کثرت رکوع وسجود پر عمل کرنا چاہئے۔اسی طرح اگر حافظ ہو تو طول قیام پر عمل کرے۔اور اگر حافظ نہ ہو تو کثرت رکوع وسجود پر عمل کرے۔

الا ان یکون له جزء باللیل :یعنی رات کو کسی کا خاص معین وظیفہ ہو مثلاً یہ کہ رات کو سو رکعات نفل پڑھتا ہو اب طول قیام کے ساتھ سو رکعات ادا نہیں کر سکتا۔اس لئے ایسے آدمی کے لئے کثرت رکوع وسجود افضل ہوگا۔

باب ماجاء فی قتل الاسودین فی الصلاۃ

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ نماز کے دوران مصلی کے قریب سانپ یا بچھو آجائے۔تو نماز کے دوران یہ ان کو قتل کرسکتا ہے یا نہیں؟ اسکے متعلق ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ نماز کے دوران ان کو قتل کرنا جائز نہیں۔البتہ اگر ضرر کا اندیشہ ہو تو نماز توڑ دے اور قتل کردے۔

جمہور فقہاء ومحدثین کا قول یہ ہے کہ باب کی حدیث خلاف القیاس وارد ہوئی ہے۔اس لئے اسودین کا قتل نماز کے اندر بھی جائز ہے۔

بعض احناف نے ایک قید لگائی ہے کہ عمل قلیل کے ساتھ قتل کرسکتا ہے۔عمل کثیر کے ساتھ قتل نہیں کرسکتا۔لیکن محقق قول یہ ہے کہ عمل قلیل ہو یا عمل کثیر ہو قتل کرسکتا ہے۔باقی اگر یہ اشکال کوئی کرے کہ عمل کثیر تو مفسد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صورت بنص الشرع مستثنیٰ ہے۔

جس طرح کسی کا وضوء ٹوٹ جائے تو نص شرعی کی وجہ سے خلاف القیاس چلنا پھرنا، انصراف عن القبلة جائز ہے۔اسی طرح یہاں بھی اگرچہ اسودین کے مارنے میں عمل کثیر لازم آئے گا مگر یہ مفسد نہ ہوگا نص کی وجہ سے۔لیکن یہ تب ہے کہ جب ضرر کا خطرہ ہو، لیکن ضرر کا خطرہ نہ ہو، دور سے سانپ جارہا ہو، اس کے پیچھے دوڑ کر اس کو مارنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی سجدتی السھو قبل السلام

وباب فی سجدتی السھو بعد السلام

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ نماز میں غلطی ہوجائے۔اگر سنت یا مستحب ترک ہوجائے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں۔اسی طرح فرض ترک ہوگیا۔تو سجدہ تو اس پر نہیں اس پر اعادہ فرض ہوگا۔واجب رہ جائے یا فرض میں تاخیر ہوجائے تو سجدہ سہو لازم ہوگا۔جو نقصان کا جبیرہ ہوگا۔

دوسری بات: سجدہ سہو کب کیا جائے گا۔تو اس میں اتفاق ہے کہ سجدہ سہو نماز کے آخر میں کیا جائے گا۔اب آخر میں قبل السلام ہے یا بعد السلام میں اختلاف ہے۔یہ اختلاف بھی افضل اور غیر افضل کا ہے۔جواز اور عدم جواز کا نہیں۔بلکہ جواز دونوں کا ہے۔

تیسری بات: ❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہاء کوفہ کے ہاں سجدہ سہو مطلقاً بعد السلام ہے۔

❷ دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ان کے ہاں سجدہ سہو مطلقاً قبل السلام ہے۔

❸ تیسرا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ کہتے ہیں "القاف بالقاف و الدال بالدال" یعنی اگر نماز میں زیادتی کردے تو بعد السلام سجدہ کرے گا۔اگر نقصان کیا ہو تو قبل السلام سجدہ سہو کرے گا۔

❹ چوتھا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔یہ فرماتے ہیں کہ ایسی غلطی ہو جو نبی ﷺ سے منقول ہے۔اس قسم کا سہو ہو تو حدیث میں

اگر اس غلطی کے ازالے کے لئے نبی ﷺ نے قبل السلام سجدہ کیا ہو تو یہ بھی قبل السلام کرے۔ اگر وہاں بعد السلام ہو تو بعد السلام کرے۔ لیکن ایسی صورت پیش آجائے کہ حدیث میں وہ صورت منقول نہیں تو قبل السلام کرے۔

❺ پانچواں قول امام اسحٰق کا ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ایسی غلطی ہو جس کی نظیر حدیث میں موجود ہو تو اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اگر نظیر موجود نہ ہو اور حدیث میں جو چار صورتیں ہیں۔ ان کے علاوہ صورت ہو تو پھر مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کی طرح انکا مذہب ہے۔ یعنی نقصان کی صورت میں قبل السلام اور زیادتی کی صورت میں بعد السلام سجدہ سہو کرے۔

یہاں اس مسئلے میں جو فعلی احادیث منقول ہیں۔ ان میں سجدہ سہو قبل السلام و بعد السلام دونوں کا ذکر ہے مگر احناف نے بعد السلام کو دو وجہ سے ترجیح دی ہیں۔ ① ایک وجہ یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قولی حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی بھول جائے یا یاد نہ رہے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو تحری کرے اور آخر میں سلام پھیرے اور پھر سجدہ سہو کرے۔ اسی طرح ابوداؤد رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ "لکل سھو سجدتین بعد السلام" ② اکابر صحابہ نے سجدہ سہو بعد السلام کو اختیار کیا ہے۔ ان میں سے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ بھی ہیں، ترمذی نے شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ کہ نبی ﷺ کا آخری عمل سجدہ سہو قبل السلام کا ہے۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ آخری عمل نبی ﷺ کا سجدہ سہو بعد السلام کا ہے۔ جو ذوالیدین کی حدیث میں مذکور ہے۔

باب فیمن یشک فی الزیادة و النقصان

مسئلہ: اس باب میں جو مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے یہ اختلافی ہے۔ صورت مسئلہ یہ ہے کہ نماز کے دوران کسی کو شک ہوا کہ اس نے ایک رکعت پڑھی ہے یا دو رکعت پڑھی ہیں۔ اسی طرح اس کو شک ہوا کہ یہ میری دوسری رکعت ہے یا تیسری رکعت تو اس صورت میں کیا کرے۔ اس میں اختلاف ہے۔

❶ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض تابعین کا قول یہ ہے کہ اس کو ایک یا دو میں شک ہوا تو ایک سمجھ کر پڑھ لے اور چاہے تو دو سمجھ کر باقی نماز پوری کرے۔ اور آخر میں سجدہ سہو کرلے۔ جب آخر میں سجدہ سہو کرلیا تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔

❷ دوسرا قول امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض دوسرے حضرات کا ہے۔ کہ جب بھی شک ہو جائے تو تعداد رکعات میں تو وہ نماز توڑ کر اعادہ کرے اور ان کے ہاں اعادہ واجب ہے۔

❸ تیسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحاق کا ہے یہ فرماتے ہیں۔ کہ ہر صورت میں بنا علی الاقل لازم ہے۔ مثلاً دو یا تین میں شک ہو تو دو سمجھ کر نماز کو پوری کرے۔

❹ چوتھا قول احناف کا ہے۔ ان کے ہاں اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ ① اس آدمی کو یہ شبہ عمر میں پہلی مرتبہ پیش آیا ہو۔ یا اس نماز میں پہلی مرتبہ شک ہوا ہو۔ یا اس کی عادت تو نہیں لیکن کبھی اس کو شک ہو جاتا ہو۔ تو ان تینوں صورتوں میں اعادہ واجب ہے۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو عادت ہے۔ کہ شبہ ہو جاتا ہے تو تحری کرے۔ اور تحری سے جو جانب راجح ہو اس کو لے لے۔ لیکن اگر کوئی جانب راجح نہ ہو تو بنا علی الاقل کرے گا۔ اور آخری میں سجدہ سہو کرے گا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے بارے میں فرماتے ہیں۔ یہ اعدل الاقوال ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق تمام احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے۔ کہ "اما انا فاعیدہا" دوسری روایت ترمذی نے نقل کی ہے۔ اس میں بناء علی الاقل کا ذکر ہے۔ تیسری

قسم کی روایت میں ہے فلیتحری الصواب تو امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا ہے۔ اور تعارض کو ختم کیا ہے۔ کہ اگر پہلی مرتبہ شک ہوا ہو تو بناء علی الاقل کرے۔ تو اس قول کے مطابق تمام روایات معمول بہا بن جائیں گی۔ بخلاف باقی اقوال کے کہ اگر ان کو لیا جائے تو بعض احادیث پر عمل ہو سکے گا۔ بعض پر عمل نہیں ہو سکے گا۔

باب ماجاء فی الرجل یسلم فی الرکعتین من الظهر و العصر

پہلی بات: یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو رکعت پر کوئی سلام پھیر لے ان نمازوں میں جو چار رکعات والی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مقتدیوں نے لقمہ دیا اور امام مقتدی کی تنبیہ پر بغیر کلام کے اٹھا۔ اور دو رکعت مزید پڑھ لیں۔ اور آخر میں سجدہ سہو کر لیا۔ تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔

دوسری بات: یہاں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے دو رکعات پر سلام پھیرا تو ذوالیدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بات کی کہ "اقصرت الصلاة ام نسیت یارسول الله" آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا اور بات کی کہ "اصدق ذوالیدین" پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بات کی کہ "نعم" اس کے بعد آپ ﷺ نے دو مزید رکعات ملا کر نماز پوری کی۔ یہاں جو مسئلہ ہے کہ نماز میں کلام جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور فقہاء کوفہ کا ہے کہ نماز کے دوران کلام مفسد صلاۃ ہے۔ کلام ناسیاً ہو یا جاہلاً عن الحکم ہو یا اصلاح صلاۃ کے لئے ہو۔ تمام صورتوں میں مفسد صلاۃ ہے۔ اگر امام نے بات کی تو سب کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر مقتدیوں میں سے کسی نے بات کی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ دوسرا قول امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ ناسیاً کلام مفسد نہیں عمداً مفسد ہے۔ ان پر اشکال ہوتا ہے کہ یہاں ذوالیدین نے عمداً کیا تھا۔ تو شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جاھلاً عن الحکم ہو تو مفسد نہیں۔ لیکن ان پر اشکال ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بھی بات کی جبکہ ان کو حکم معلوم تھا۔ اس لئے یہ لوگ دوسری قید لگاتے ہیں کہ اصلاح صلاۃ کے لئے ہو تو جائز ہے۔ اور کبھی یہ شرط لگاتے ہیں کہ کلام قلیل مفسد نہیں کثیر مفسد ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کئی اقوال ہیں۔ صحیح قول ان کا احناف کے ساتھ ہے۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے زمانے میں احتمال تھا کہ نماز میں کمی زیادتی ہو جائے۔ اس لئے ذوالیدین نے بات کی۔ مگر آج کل احکام میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس لئے اب کلام جائز نہ ہوگا۔

اس مسئلے میں ذوالیدین کی جو حدیث ہے۔ اس سے شوافع اور مالکیہ استدلال کرتے ہیں۔ مگر احناف اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ ابتدائے اسلام کی بات ہے اور ابتدائے اسلام میں دوران نماز کلام جائز تھا۔ چنانچہ آگے آئے گا کہ پہلے ہم نماز میں کلام کرتے تھے جب "وقوموا لله قانتین" والی آیت اتری تو "فامرنا بالسكوت ونهينا عن الكلام" معلوم ہوا اب نماز میں کلام ممنوع ہے۔

شوافع کہتے ہیں کہ ذوالیدین کی حدیث منسوخ نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ ان سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "بینما نحن نصلی مع رسول الله ﷺ" اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب جب وہ اس واقعہ میں موجود تھے۔ تو یہ اول اسلام کا واقعہ نہ ہوگا۔ اخیر زمانے کا ہوگا۔ اس لئے یہ حدیث منسوخ نہ ہوگی۔ دوسرا ذوالیدین کی ملاقات عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ثابت ہے۔ اور بدر میں جو شہید ہوئے وہ ذوالشمالین تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث آخری زمانے کی ہے، منسوخ نہیں۔

احناف اس بارے میں کہتے ہیں۔ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ میں شریک نہ تھے۔ کیونکہ ذوالیدین بدر میں شہید ہوئے تھے جب کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بعد میں مسلمان ہوئے تھے۔ باقی انہوں نے جو "کنا نصلی" کہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طحاوی

رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت سارے شواہد پیش کئے ہیں۔ کہ کبھی متکلم ساتھ نہیں ہوتا مگر وہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور مراد یہ ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ساتھ نہ تھے۔ مگر "نحن نصلی" کہہ دیا۔ اور یہ مرسل صحابی ہے جو کہ قابل قبول ہے۔ اس لئے یہ واقعہ ابتدا کا ہے جب نماز میں کلام ممنوع نہ تھا، جائز تھا۔ مگر بعد میں منسوخ ہو گیا۔ باقی ذوالیدین اور ذوالشمالین الگ نہیں ایک ہی آدمی ہے جو بدر میں شہید ہوا۔

باب ماجاء فی الصلاة فی النعال

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ صلاۃ فی النعال کا کیا حکم ہے۔ نعال نعل سے ہے۔ اس سے مراد جوتا ہے جو نبی ﷺ کے زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ چپل کی طرح ہوتا ہے۔ اب اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں احناف کے تین اقوال ہیں۔

① جائز ہے۔ ② مستحب ومسنون ہے۔ ③ مکروہ ہے۔ صاحب کبیری نے استحباب کے قول کو ترجیح دی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ یہود کی مخالفت کرو اور جوتوں میں نماز پڑھو۔ کیونکہ وہ جوتوں میں نماز نہیں پڑھتے۔ اس لئے یہوں کی مخالفت کی وجہ سے استحباب کا قول راجح ہے۔ قرآن میں ہے "خذوا زینتکم عند کل مسجد" بعض نے اسکی تفسیر میں لکھا کہ نعال کا پہننا بھی زینت کے اتمام میں سے ہے اصل قول یہ ہے کہ احناف کے ہاں فقط جواز راجح ہے مگر یہ جواز مشروط ہے شرائط کے ساتھ۔
① جوتا ایسا ہو کہ وہ انسان کے انگوٹھے کو زمین پر لگنے سے مانع نہ ہو۔ ② جوتوں سے مسجد ملوث نہ ہو۔ ③ جوتے ناپاک نہ ہوں۔ بلکہ پاک وصاف ہوں۔

معارف السنن میں علامہ زاہد الکوثری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ہے۔ کہ نبی ﷺ کے زمانے میں مساجد میں کنکریاں ہوتی تھیں۔ جب کہ آج کل فرش ہوتا ہے۔ اس لئے اگر جوتوں سے مسجد کی تلویث کا خطرہ ہو تو جائز نہ ہوگا۔

دوسرا اگر یہ حکم مخالفت یہود کی وجہ سے تھا۔ تو اب ان کی مخالفت جوتا اتارنے میں ہے۔ کیونکہ اب یہود اپنے معبد میں جوتے پہن کر عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت جوتے اتار کر نماز پڑھنے میں ہے۔ باقی اس حدیث کے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ احناف بھی جواز کے قائل ہیں۔ باقی علامہ خطابی نے لکھا ہے۔ کہ استحباب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

باب ماجاء فی القنوت فی صلاة الفجر وباب ترک القنوت

پہلی بات: ان دو ابواب میں قنوت کا مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔ قنوت کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ علامی عراقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے معارف السنن میں اس کے دس معانی مذکور ہیں۔

دوسری بات: قنوت کی تین قسمیں ہیں۔ ① قنوت فی الوتر اس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔ ② قنوت نازلہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے حالات پیش آئیں جو مصیبت کے ہوں۔ تو اس مصیبت کے وقت فجر کی نماز میں رکوع کے بعد مسلمانوں کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ قنوت نازلہ جمہور کے ہاں جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور امام احمد کے ہاں فجر میں بعد از رکوع ہے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب نمازوں میں قبل الرکوع ہے۔ تیسرا قول بھی احناف کا ہے۔ کہ تمام جہری نمازوں میں بعد از رکوع پڑھی جائے گی۔

③ تیسری قسم قنوت فی الفجر ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فجر کی نماز میں قنوت پڑھی جائے گی۔ شوافع کے پھر تین قول ہیں۔ مشہور قول یہ ہے کہ پورے سال پڑھی جائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صرف رمضان

میں پڑھی جائے گی۔ تیسرا قول یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں پڑھی جائے گی۔ ان کی دلیل باب کی حدیث میں ہے۔

دوسرا قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری، ابن المبارک اور صاحبین کا ہے۔ وہ یہ کہ فجر کی نماز میں دائما قنوت نہ ہوگی۔ البتہ مصیبت کے وقت جائز ہے۔ ان کی دلیل ابو مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جو باب ثانی میں ہے۔ انہوں نے بیٹے کے دریافت کرنے پر فرمایا۔ کہ اے بیٹے یہ محدث عمل ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دائما قنوت فجر میں نہیں پڑھی ہے۔ ہاں صرف مصیبت کے وقت پڑھ سکتے ہیں۔

باب اول کی حدیث کا جواب احناف یہ دیتے ہیں۔ کہ یہ قنوت نازلہ پر محمول ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس میں مغرب کی نماز کا بھی ذکر ہے۔ جب کہ مغرب کی نماز میں آپ کے ہاں بھی دائمی قنوت نہیں ہے۔ اس لئے یہ قنوت نازلہ پر محمول ہے۔

دوسری بات احناف یہ کرتے ہیں کہ کبار صحابہ کہتے ہیں کہ فجر میں دائما قنوت نہیں۔ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق جو قنوت منقول ہے وہ قنوت نازلہ پر محمول ہے۔ چنانچہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ میں تھے ان کی ہمیشہ لڑائیاں رہیں۔ اس لئے وہ قنوت پڑھتے تھے، قنوت نازلہ کے طور پر نہ کہ قنوت دائمہ کے طور پر۔ اور دارقطنی کی ایک روایت ہے "مازال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم يقنت حتى لقى اللّٰه" کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فجر میں قنوت پڑھتے تھے۔ مگر محدثین کے ہاں یہ حدیث صحیح ثابت نہیں۔ صحیح انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک پڑھی پھر چھوڑ دی۔

باب ماجاء فی الرجل يعطس فی الصلاة

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو نماز کے باہر چھینک آئے تو تعلیم یہ ہے۔ کہ عاطس الحمدللّٰه کہے۔ سننے والا یرحمک اللّٰه کہے۔ پھر عاطس "یھدیک اللّٰه ویصلح بالک" کہے۔ لیکن اگر کوئی نماز کے اندر ہو اور اس کو چھینک آئے تو وہ کیا کرے گا؟

معارف السنن میں ہے۔ کہ اگر کسی کو نماز میں چھینک آئے۔ اور وہ الحمدللّٰه کہے یا پوری دعاء "الحمدللّٰه حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه مباركاً عليه يحب ربنا ويرضى" پڑھے۔ تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ گویا یہ دعاء جائز ہے۔ البتہ اس کے استحباب کا کوئی بھی قائل نہیں۔ جب کہ حدیث میں اس دعاء کی مدح وارد ہوئی ہے۔ مگر مدح کے باوجود کوئی بھی دوران نماز اس کے استحباب کا قائل نہیں۔ معلوم ہوا فقیہ و مجتہد کی نظر میں صرف ظاہری الفاظ نہیں ہوتے۔ بلکہ دین کے دوسرے قواعد اور اصول پر بھی نظر ہوتی ہے۔

اب جب اس کا جواز ہے تو سراً کہے جہراً نہ کہے۔ باقی باہر کسی کو چھینک آئی اور اس نے الحمدللہ کہا اور نمازی نے جواب دیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ کلام الناس میں داخل ہے۔ اس لئے کہ یہ خطاب ہے۔

باب ماجاء فی الصلاة عندالتوبة

پہلی بات: توبہ کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ گناہ اگر سرزد ہوا ہو اور گناہ پر جب متنبہ ہو تو وضوء کرے۔ دو رکعات نماز پڑھے پھر گناہ سے توبہ کرے یہ ارجیٰ للقبول ہے۔ تاب کا لغوی معنے رجع ہے۔ اور توبہ کو توبہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسکے ذریعے انسان گناہ سے رجوع کر لیتا ہے۔ توبہ کی چند رکن ہیں۔ ① جو گناہ کیا ہے اس پر نادم ہو۔ ② یہ عزم کرے کہ آئندہ یہ گناہ نہ کروں گا۔ ③ معافی مانگے۔ ان تین ارکان کے ساتھ توبہ کی جائے اللہ اس کو قبول کرتا ہے۔ توبۃً نصوحاً یہی ہے۔

دوسری بات: حقوق اللہ میں توبہ فائدہ دیتی ہے۔ لیکن حقوق العباد صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے۔ جب تک کہ حق ادا نہ کر دے۔ یا صاحب حق سے معاف نہ کرا لے۔

باب ماجاء متی یؤمر الصبی بالصلاۃ

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ بچے پر نماز کب فرض ہوتی ہے۔ ① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کے ہاں بچے پر نماز تب فرض ہوتی ہے۔ جب وہ بالغ ہو جائے۔ بالغ تب ہوگا جب بلوغ کی علامات (احتلام احتبال) وغیرہ ظاہر ہوں۔ لیکن اگر بلوغ کی علامتیں ظاہر نہ ہوں۔ تو جمہور کے ہاں مدت بلوغ پندرہ سال ہے۔ اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سترہ سال ہے۔ ② امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ بچے پر نماز تب فرض ہوتی ہے۔ جب وہ دس سال کا ہو جائے۔ اگر دس سال کے بعد اس کی کوئی نماز رہ جائے تو اس پر قضاء واجب ہوگی۔ جمہور باب کی حدیث کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ یہ اعتیادی حکم ہے کہ بچہ عادی ہو جائے۔

دوسری بات: حدیث میں ہے کہ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر مارو۔ یہ ضرب تادیبی نہیں بلکہ ضرب تعزیری ہے۔ ضرب تعزیری کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عضو نہ ٹوٹے اور جسم پر اثر نہ پڑے۔ اگر اس سے زیادہ مارا تو ضارب کو گناہ ہوگا۔

باب ماجاء فی الرجل یحدث بعد التشهد

مسئلہ: کسی آدمی کو اس حالت میں حدث لاحق ہو جائے کہ وہ آخری قعدہ میں ہو۔ تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ وضوء کرے اور سابق نماز پر بنا کرے۔ لیکن اگر اس پر حدث خود لاحق نہ ہوا ہو بلکہ یہ خود حدث لاحق کرے تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر گناہ ہوگا۔ اور اس کی نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ البتہ نفس فرض ادا ہو جائے گا۔ کیونکہ احناف کے ہاں سلام فرض نہیں۔

باب کی حدیث سے احناف کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ کہ سلام رکن نہیں۔ اگر چہ حدیث ضعیف ہے دوسرا مال کے اعتبار سے اختلاف نہیں رہتا۔ کیونکہ جمہور کے ہاں بھی اعادہ واجب ہے بوجہ فساد کے کیونکہ اس نے سلام چھوڑ دیا۔ جو کہ رکن ہے اور احناف کے ہاں بھی اعادہ واجب ہے بوجہ کراہت تحریمی کے۔

باب ماجاء اذا کان المطر فالصلاۃ فی الرحال

پہلی بات: اس باب میں اور باب کی حدیث میں اس بات کا بیان ہے۔ کہ وہ اعذار جن کی وجہ سے ترک جماعت جائز ہے ان میں سے ایک مطر بھی ہے کہ اس کی بنا پر جماعت ترک کرنا اور گھر میں نماز پڑھنا جائز ہو جاتا ہے۔ گذر چکا ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترک جماعت کے بیس اعذار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مطر بھی ہے۔

دوسری بات: جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مطر ترک جماعت کے اعذار میں سے ہے۔ لیکن بارش کتنی ہو تو ترک جماعت جائزء ہوگا۔ معارف السنن میں ہے۔ کہ فقہاء سے اس قسم کا کوئی پیمانہ منقول نہیں۔ اس لئے صحیح تر بات یہ ہے۔ کہ یہ مبتلا بہ کی رائے کی طرف مفوض ہے کہ اتنی بارش ہو کہ مبتلا بہ سمجھے کہ مسجد میں جانا مشکل ہے تو ترک جماعت جائز ہوگا۔ لیکن وہ یہ سمجھے کہ جانا مشکل نہیں تو ترک جماعت کے لئے وہ مطر عذر نہیں ہوگی۔ بعض احادیث میں معمولی بارش کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک جماعت کی اجازت دی ہے چنانچہ معارف السنن میں حدیث ہے کہ صحابی فرماتے ہیں کہ ہم سفر میں تھے بارش اتنی تھی کہ جوتوں کا نچلا حصہ بمشکل تر ہوتا تھا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا "الصلاۃ فی الرحال" اس وجہ سے مقولہ مشہور ہو گیا کہ "اذا ابتلت النعال فالصلاۃ فی الرحال" یہ جملہ حدیث کا نہیں۔ مگر اس کا مفہوم احادیث سے منقول ہے۔

باب ماجاء فی التسبیح فی ادبار الصلاۃ

یہاں یہ حدیث نقل کی ہے فقراء صحابہ نے نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ جسمانی اعمال میں مالدار صحابہ ہم سے بڑھ نہیں سکتے ہمارے برابر اعمال کرتے ہیں۔لیکن ان کے پاس مال ہے۔وہ غلام آزاد کرتے ہیں۔صدقہ دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ ہم سے اجر میں بڑھ جاتے ہیں۔آپ ﷺ نے تسبیحات بتائیں۔کہ نماز کے بعد (۳۳) مرتبہ الحمد للہ (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر (۱۰) مرتبہ لاالہ الا اللہ پڑھو۔تو جو تم سے سبقت کر گئے ہیں ان کو پالو گے۔اور دوسرے لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکتے۔

دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ حدیث ہے۔اس میں ہے کہ مالدار صحابہ کو علم ہوا تو انہوں نے بھی پڑھنا شروع کیا۔انہوں نے پھر شکایت کی۔آپ ﷺ نے فرمایا "ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"

ان تسبیحات کا حکم استحباب کا ہے۔اور ان کو فرائض کے بعد پڑھنا چاہئے جن کے بعد سنن نہ ہوں لیکن جن کے بعد سنن ہیں تو پھر سنن کے بعد پڑھے جائیں گی۔تاکہ فرائض اور سنن میں فاصلہ لازم نہ آئے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ علی الدابۃ فی الطین و المطر

پہلی بات: بارش اور کیچڑ میں سواری پر نماز پڑھنے کا جواز بیان فرما رہے تھے۔

دوسری بات: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نوافل سواری پر جائز ہیں۔اس جواز کے لئے زمین کا پاک ہونا بھی ضروری نہیں۔فرائض سواری پر پڑھنا اس کے متعلق احناف اور جمہور فرماتے ہیں کہ خائف مطلوب کے لئے جائز ہے لیکن اس کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔قرآن میں جو "فرجالاً أو رکباناً" فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔باقی یہاں حدیث میں جو مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے دابہ پر نماز پڑھائی۔اس کے متعلق احناف اور جمہور فرماتے ہیں کہ اگر ایسی صورت بوجہ عذر جائز بھی ہو تو انفراداً جائز ہوگا۔جماعت کے ساتھ جائز نہ ہوگا۔باقی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے جماعت کرائی تھی کیونکہ یہاں ہے "فتقدم علی راحلۃ" جمہور اس کا جواب دیتے ہیں۔کہ نبی اکرم ﷺ امام نہ تھے بلکہ تعظیم کی وجہ سے آگے کیا تھا۔یہ تقدم برائے امامت نہ تھا۔جس طرح معارف السنن میں مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے آیت سجدہ پڑھی تو سب مجلس والوں پر سجدہ لازم ہو جائے گا۔اس میں بہتر یہ ہے کہ امام پہلے سجدہ کرے یعنی آگے کرے۔تو اس صورت میں بھی امام کا تقدم برائے جماعت نہیں ہے۔بلکہ برائے تعظیم ہے اسی طرح یہاں بھی آپ ﷺ کا تقدم برائے تعظیم تھا۔کیونکہ جماعت کے لئے اتحاد مکان شرط ہے۔جب کہ یہاں ہر ایک کا دابہ الگ تھا۔

تیسری بات: نبی ﷺ کے بارے میں منقول ہے "فاذن" اسکے متعلق کلام کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے اذان دی ہے۔مگر جمہور کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ سے کسی موقع پر اذان دینا ثابت نہیں۔اس لئے "فاذن" کا مطلب ہوگا "فامر بالتاذین" تو آپ کی طرف امر کی وجہ سے نسبت کی۔

باب ماجاء فی الاجتھاد فی الصلاۃ

پہلی بات: ترجمۃ الباب کا مسئلہ ہے اجتہاد فی الصلاۃ۔اس کا مطلب ہے ادائیگی عبادت میں مشقت برداشت کرنا، اپنے آپ کو تھکا دینا۔جس طرح کہ نبی ﷺ نوافل میں اتنا قیام کرتے کہ پاؤں مبارک میں ورم آجاتا، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں ثواب مشقت کی مناسبت سے ملتا ہے۔

دوسری بات: وقد غفر الله لک ماتقدم من ذنب النبی ﷺ کی طرف ذنب کی نسبت کی گئی ہے۔ اسکی علماء نے کئی توجیہات کی ہیں۔ اہلسنت والجماعت، اشاعرہ، ماتریدیہ کا مسلک یہ ہے کہ بعداز نبوت کسی نبی سے گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا۔ صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو۔ اشاعرہ قبل از نبوت صغیرہ کے ثبوت کے قائل ہیں مگر وہ صغیرہ جو مروت کے خلاف نہ ہو لیکن بعداز نبوت کسی کے ہاں گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا لیکن یہاں آپ کی طرف نسبت کی گئی۔ اسکا بعض نے جواب یہ دیا ہے کہ اس ذنب سے ذنب امت مراد ہے کہ آپ کی شفاعت کی وجہ سے امت کے ذنوب معاف فرمادیئے۔ اور اس مقام سے بھی شفاعت کے ثبوت کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض نے جواب یہ دیا ہے کہ ذنب سے خلاف اولیٰ بات مراد ہے۔ جس طرح جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے "حسنات الابرار سیئات المقربین"

باب ماجاء ان اول مایحاسب به العبد یوم القیامة الصلاة

پہلی بات: باب کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے نماز کا محاسبہ کیا جائے گا۔

دوسری بات: باب کی حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے نماز کا محاسبہ ہوگا۔ جب کہ دوسری حدیث میں ہے کہ "اول مایقضی بالدماء" تو بعض نے تطبیق یہ دی ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اولیت مراد ہے۔ حقوق العباد میں دماء کو اولیت حاصل ہوگی۔ اور حقوق اللہ میں پہلے نماز کا محاسبہ ہوگا۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہاں "اول مایحاسب" ہے۔ اور دوسری حدیث میں "اول مایقضی" ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اس لئے محاسبہ پہلے نماز کا ہوگا۔ اور قضاء پہلے دماء کا ہوگا اس لئے تعارض نہیں۔

تیسری بات: باب کی حدیث میں ہے کہ بندے کے فرائض میں کمی ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے نوافل ہیں یا نہیں تو نوافل سے فرائض کی تکمیل ہوگی اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی نے فرائض نہ پڑھے ہوں تو نوافل سے اس کی تکمیل ہوجائے گی۔ بلکہ علامہ عراقی اور علامہ بیہقی نے لکھا ہے کہ تکمیل کا یہ مطلب ہے کہ فرائض میں کچھ نقصان ہوا ہو تو نوافل سے تکمیل ہوگی۔

دوسرا مطلب ابن العربی نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ رحیم ذات ہے۔ اس لئے اگر کسی نے فرائض نہ پڑھے ہوں۔ تو نوافل سے اس کی تکمیل ہوجائے گی۔ لیکن ایک فرض کا بدل سات ۷۰۰ سو مقبول نوافل بنیں گے۔

تیسرا مطلب ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فرائض کے ترک کی دو صورتیں ہیں۔ ① عمداً ترک کیا ہو تو اس کی تکمیل نوافل سے نہ ہوگی۔ لیکن نسیاناً ترک کیا ہو تو نوافل سے تکمیل ہوگی۔ یہی حکم صوم اور زکوٰۃ کا بھی ہے کہ نفلی صدقات اور صوم سے ان کی تکمیل ہوگی۔

باب ماجاء فی من صلی فی یوم ولیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة ماله من فضل

مسئلہ: کسی نے فرائض کے ساتھ بارہ رکعات نماز ادا کی تو اس کے فضائل بیان کئے ہیں۔ بارہ رکعات سے سنن موکدہ مراد ہیں۔ احناف حنابلہ اور جمہور کے ہاں اس کی تعداد بارہ ہے۔ شوافع کے ہاں اس کی تعداد دس ہے۔ کیونکہ ظہر سے پہلے ان کے ہاں صرف دو رکعت ہیں۔

یہ بارہ رکعات نوافل ہیں۔ مگر عام نوافل سے ان کی تاکید زیادہ ہے۔ بلکہ بعض حضرات سے تو فجر سے پہلی والی دو رکعت کے بارے میں وجوب کا قول بھی منقول ہے۔ اور امام صاحب سے بھی ایک قول وجوب کا منقول ہے۔

باب ماجاء فی رکعتی الفجر من الفضل

پہلی بات: یہاں سے رکعتین فجر کا ذکر چند ابواب میں کیا ہے۔ آگے ظہر اور عشاء وغیرہ کی سنتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں یہ ماقبل باب میں "من ثابر علی ثنتی عشرہ رکعة من السنة" کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔

دوسری بات: فجر کی سنتوں کے بارے میں عام سنتوں کے مقابلے میں احادیث میں زیادہ فضائل اور تاکید منقول ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فجر کی سنت مت چھوڑ و اگر چہ گھوڑے تمہیں پامال کر دیں۔ اس تاکید کی وجہ سے حسن بن زیاد نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے وجوب کا قول نقل کیا ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی وجوب کا قول منقول ہے۔ اگر چہ حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وجوب کی وہ اصطلاح نہیں جو احناف کے ہاں ہے۔ بہر حال وجوب کا قول ان سے منقول ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے۔ اگر چہ اس کی تاکید عام سنن کی بنسبت زیادہ ہے۔

یہاں حدیث میں جو "خیر من الدنیا و مافیها" ہے۔ اس سے وہ تمام مادی اشیاء مراد ہیں جن سے تصدیق کیا جاتا ہے کہ یہ رکعتین ان سے بہتر ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ "الدنیا و مافیها" سے ذہب اور فضہ مراد ہیں۔ کہ ان کو خرچ کریں تو رکعتین اس سے افضل ہیں۔

باب ماجاء فی تخفیف رکعتی الفجر والقرأة فیهما

پہلی بات: عام احادیث میں نبی اکرم ﷺ سے رکعتین قبل الفجر کی تخفیف کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں تک کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ فقط فاتحہ پڑھتے تھے۔ اس وجہ سے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض فقہاء مدینہ کہتے ہیں کہ فجر کی سنتوں میں صرف فاتحہ پڑھی جائے گی، ضم سورت نہیں۔ اس کے مقابلے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ فجر کی سنتوں میں بھی باقی سنتوں کی طرح ضم سورت ہوگا۔ باب کی حدیث جمہور کی متدل ہے۔ کیونکہ اس سے ضم سورت کا ثبوت ملتا ہے۔ باقی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ضم سورت تو کرتے تھے لیکن بہت مختصر کرتے تھے۔ تو یہ مبالغہ فی التخفیف۔ کہ [illegible] فرمایا کہ ایسا لگتا تھا کہ آپ نے فقط فاتحہ پڑھی ہے۔

دوسری بات: نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے۔ کہ فلاں نماز میں آپ نے فلاں سورت پڑھی۔ معارف السنن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے۔ کہ ان احادیث کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں نمازوں میں فلاں سورت کا پڑھنا افضل ہے منقول ہونے کی وجہ سے باقی کبھی کبھی دوسری سورت بھی پڑھ لینی چاہئے۔ تا کہ تخصیص کا شبہ نہ ہو۔ دوسرا اگر ہمیشہ منقولہ سورتیں پڑھے گا تو باقی قرآن کا متروک ہونا لازم آئے گا۔

تیسری بات: فکان یقرأ فی الرکعتین قبل الفجر الخ فجر کی سنتوں میں سراً قرأت ہوتی ہے۔ مگر صحابہ مقدار قرأت سے اندازہ لگایا کرتے تھے۔ دوسرا کبھی آپ تعلیماً جہر کر لیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوجاتا تھا کہ کون سی سورت پڑھ رہے ہیں۔

باب ماجاء فی الکلام رکعتی الفجر

مسئلہ: اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ فجر کی سنتیں پڑھ لینے کے بعد بات چیت جائز ہے۔ فجر کی سنتوں کے بعد فرائض کے فراغت تک بات کرنے میں اختلاف ہے۔

❶ بعض محدثین کہتے ہیں کہ فجر کی سنتوں کے بعد بات کی تو سنت ختم ہوجائیں گے۔

❷ دوسرا قول یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کے بعد فرائض کے اختتام تک بات کرنا ممنوع تو ہے مگر اس سے سنتیں ختم نہ ہوں گی۔

❸ تیسرا قول جمہور کا ہے۔ان کے ہاں فجر کی سنتوں کے بعد سکوت محض عبادت نہیں۔جس طرح باتیں کرنا عبادت نہیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ سنتوں کے بعد آدمی ذکر میں مشغول رہے۔لیکن اگر کوئی ضروری بات کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔باقی بلاضرورت بات کرنا خلاف اولیٰ اور نامناسب ہوگی۔باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے۔

باب ماجاء لاصلاۃ بعد طلوع الفجر الار کعتین

مسئلہ: طلوع فجر کے بعد نوافل کے متعلق ائمہ مجتہدین کے اقوال اتفاقی ہیں۔صرف امام مالک کا قول یہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد سنت فجر پڑھنے تک نفل پڑھ سکتا ہے۔خصوصاً اگر رات کا کوئی وظیفہ رہ گیا ہو تو پڑھ سکتا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد سنتوں کے بعد بھی نوافل پڑھ سکتا ہے۔جب تک کہ فرائض نہ شروع کرلے۔مگر جمہور کے نزدیک سنتوں کے علاوہ طلوع فجر کے بعد نوافل جائز نہیں۔نہ سنتوں سے پہلے نہ سنتوں کے بعد۔باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے کہ "لاصلاۃ بعد الفجر الاسجدتین ای رکعتین"

باب ماجاء فی الاضطجاع رکعتی الفجر

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ رکعتین بعد الفجر کے بعد نبی ﷺ نے لیٹنے کا حکم دیا۔اب اس کا حکم کیا ہے؟ معارف السنن میں آٹھ اقوال نقل کئے ہیں۔① سنت ہے۔② مستحب ہے۔③ ابن حزم کے نزدیک لیٹنا صحت فجر کے لئے شرط ہے۔④ جن لوگوں نے رات کو نوافل پڑھی ہوں ان کے لئے مستحب ہے۔⑤ گھر میں نوافل پڑھے ہوں تو لیٹ سکتا ہے۔⑥ بدعت ہے۔⑦ خلاف اولیٰ ہے عند الحسن البصری۔⑧ انھا لیس مقصودۃ لذاتھا۔

احناف کہتے ہیں یہ عمل نبی ﷺ سے ثابت ہے۔کیونکہ نبی ﷺ کبھی پوری رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔اس لئے استراحت کے لئے لیٹ جاتے تھے۔یہ عبادت کے قبیل سے نہیں بلکہ عادت کے قبیل سے ہے۔اس لئے کوئی پوری رات نوافل پڑھ کر تھک گیا ہو تو وہ لیٹ جائے تو استراحت بھی ہوجائے گی اور نبی ﷺ کی اتباع کا ثواب بھی مل جائے گا۔باقی صحت صلاۃ کے لئے شرط ماننا یا مطلقاً مستحب کہنا غلط ہے۔

دوسری بات: "قال رسول اللہ ﷺ اذا صلی احدکم الخ" محدثین کہتے ہیں۔سنداً یہ حدیث صحیح ہے مگر حقیقت میں معلول ہے۔صحیح یہ ہے کہ یہ قولی حدیث نہیں بلکہ فعلی ہے۔مگر راوی کی غلطی کی وجہ سے قولی بن گئی۔اس لئے معلول ہے۔

باب ماجاء اذا أقیمت الصلاۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں جماعت کھڑی ہے تو اس صورت میں کسی آدمی کے لئے نوافل یا سنن یا قضاء نمازوں کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔تو اس پر اتفاق ہے کہ جماعت کھڑی ہو تو عام نوافل کا، قضاء نمازوں کا۔اور فجر کی سنتوں کے علاوہ سنن کا پڑھنا جائز نہیں۔اختلاف صرف فجر کی سنتوں میں ہے کہ فجر کی نماز کھڑی ہو ایک آدمی آئے اور اس نے سنت نہیں پڑھی ہیں۔تو وہ کیا کرے؟ اس میں اختلاف ہے۔① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ پہلے سنت فجر پڑھ لے جب جماعت کے مل جانے کا امکان ہو۔اب سنت گھر میں پڑھ لیں۔اور اگر مسجد میں آئے اور جماعت کھڑی تھی تو مسجد کے باہر اگر دروازے کے پاس جگہ ہو تو وہاں پڑھ لے وہاں جگہ نہ ہو۔تو جماعت جہاں ہو رہی ہو وہاں کے علاوہ

کسی جگہ میں پڑھ لے جہاں امام کی آواز نہ آئے۔ ② دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ان کے ہاں فجر کی اقامت ہوگئی تب اب سنت یا فرض پڑھنا جائز نہیں۔ان کی دلیل باب کی حدیث ہے "اذا اقیمت الصلاۃ فلاصلاۃ الا المکتوبۃ".

احناف کی دلیل ایک تو وہ احادیث ہیں۔جن میں سنت فجر کی تاکید منقول ہے۔دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض کبار صحابہ سے منقول ہے۔مثلاً ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق منقول ہے۔کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوموسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے دیکھا تو فجر کی نماز شروع ہے ابوموسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز میں مل گئے لیکن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دروازے پر سنت ادا کئے پھر شریک ہوئے۔اسی طرح عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے جماعت کھڑی تھی انہوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سنتیں پڑھیں پھر جماعت میں شریک ہوئے۔

باقی باب والی حدیث کا جواب یہ ہے کہ مسجد کے اندر جہاں جماعت ہو رہی ہو وہاں سنت جائز نہیں۔اور معارف السنن میں ہے کہ بعض روایات میں فی المسجد کی قید بھی ہے۔اور مسجد کے اندر ہمارے ہاں بھی جائز نہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول شوافع کے ساتھ نقل کیا ہے۔مگر صحیح یہ ہے کہ وہ احناف کے ساتھ ہے۔اور ممکن ہے ان کے دو قول ہوں۔

باب ماجاء فیمن تفوته الرکعتان قبل الفجر الخ

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھی اب فجر کی نماز کے بعد قبل طلوع الشمس ان سنتوں کو پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔اس میں اختلاف ہے۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء و محدثین کا مسلک یہ ہے۔کہ طلوع الشمس سے پہلے بعد الفرائض ان کا پڑھنا جائز نہیں۔یہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول قدیم بھی ہے۔دوسرا قول عطاء بن ابی رباح اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول جدید ہے۔وہ یہ ہے کہ فرض کے بعد سنتیں قبل طلوع الشمس پڑھ سکتا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ حدیث میں ہے "لااذا" اس کا معنی ہے کہ "فلابأس اذا" کہ طلوع شمس سے پہلے فرض کے بعد سنتوں کا پڑھنا جائز ہے۔جمہور "فلا اذا" کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رکعتین نہیں پڑھے تو "فلایصلی اذا" کہ اب سنتیں پڑھنا جائز نہیں۔

دوسری بات: جمہور کی دلیل وہ حدیث جو تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ "نهی رسول اللہ ﷺ عن الصلاۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس"۔

تیسری بات: تو جمہور کا مسلک یہ ہوا کہ طلوع شمس تک نماز فجر کے بعد رکعتین جائز نہیں۔لیکن طلوع شمس کے بعد ان کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔تو امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ طلوع شمس کے بعد قضاء مستحب ہے۔دلیل اگلے باب کی حدیث ہے۔اس میں ہے "من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلهما بعد ماتطلع الشمس" اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "نهی رسول اللہ ﷺ عن الصلاۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس" میں جو نہی ہے۔یہ طلوع شمس تک ہے۔طلوع شمس کے بعد مباح وقت شروع ہوگیا۔نہی کا وقت ختم ہوگیا اس لئے پڑھ سکتا ہے۔

سنت کی قضا ہے یا نہیں۔اس کا مسئلہ آگے آئے گا۔مشہور یہ ہے کہ سنتوں کی منفرداً قضاء نہیں۔البتہ فجر کی سنتیں فرض کے تابع ہو کر قضاء کی جائیں گی۔مگر معارف السنن میں ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ سنتوں کی قضاء نہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ قضاء جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قضاء فرض نہیں ورنہ جواز موجود ہے۔فرائض کی قضاء فرض واجبات کی قضا واجب اور سنن کی قضاء سنت ہے۔

باب ماجاء فی الاربع قبل الظھر وباب ماجاء فی الرکعتین بعد الظھر

اختلاف: ظہر کے بعد کی دو رکعتوں میں ائمہ کا اتفاق ہے۔ظہر سے قبل کتنی سنتیں ہیں۔اس میں اختلاف ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے دو قول ہیں۔

❶ ظہر سے قبل چار سنتیں ہیں۔دو سلاموں کے ساتھ۔

❷ دوسرا قول یہ ہے کہ ظہر سے قبل بھی دو رکعت ہیں۔دوسرا قول جمہور کا ہے۔ان کے ہاں سنن قبلیہ چار رکعات ہیں۔باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے۔کیونکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ظہر سے قبل چار رکعات اور ظہر کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔

"یصلی قبل الظھر اربعا" اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ظہر سے قبل والی چار رکعات ایک سلام کے ساتھ ہیں۔کیونکہ دو سلام کے ساتھ ہوتیں تو اس کا ضرور ذکر ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل باب ثانی کی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔کہ ظہر سے قبل نبی اکرم ﷺ نے دو رکعت پڑھیں مگر جمہور اس کے چار جواب دیتے ہیں۔① حضور ﷺ کی عادت تھی کہ جب زوال ہو جاتا تو آپ دو رکعت نفل پڑھتے تھے۔یہاں وہ نفل مراد ہیں سنن قبل الظہر مراد نہیں۔② نبی ﷺ نے چار رکعات دو سلام کے ساتھ پڑھے ہوں گے۔تو دو دو پڑھی ہوں گی اس لئے راوی نے دو کہدیا ③ پہلے دو پڑھتے تھے پھر چار پڑھنا شروع کر دیا۔④ آپ ﷺ کو دو اور چار میں اختیار تھا۔

باب آخر

اگر کسی کی ظہر کی چار سنتیں رہ جائیں۔تو ظہر کے بعد ان کو پڑھا جائے گا۔اس کی قضا سنت ہے۔لیکن پڑھنے کا طریقہ کیا ہے۔اس میں دو قول ہیں۔امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چار رکعات پہلے پڑھے پھر دو پڑھے۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے دو پڑھے پھر چار پڑھے یعنی قضا کرے۔

باب ماجاء فی الاربع قبل العصر الخ

عصر سے پہلے جو چار رکعات علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہیں یہ سنن موکدہ نہیں سنن زوائد میں سے ہیں"یفصل بینھن بالتسلیم" اس سے تشہد مراد ہے کہ چار سنتوں کے درمیان دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھے۔

باب ماجاء فی الرکعتین بعد المغرب والقرأۃ فیھما الخ

پہلی بات: یہاں حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ مغرب اور فجر کی سنتوں میں پہلی رکعت میں سورۃ کافرون اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص پڑھتے تھے۔یہ افضلیت کا بیان ہے ضروری نہیں کہ صرف یہی پڑھے۔کیونکہ اس میں تخصیص کا شبہ لازم آئے گا۔دوسرا قرآن کی باقی حصے کا متروک ہونا لازم آئے گا۔

دوسری بات: مغرب کی سنتوں کے بارے میں منقول ہے کہ آپ اکثر ان کو گھر میں پڑھتے تھے۔ایک دو مرتبہ مسجد میں پڑھنے کا ثبوت ہے اس وجہ سے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سنت بعد المغرب مسجد میں پڑھنا جائز نہیں۔مگر جمہور کہتے ہیں کہ افضل تو یہ ہے کہ گھر میں پڑھے۔لیکن اگر مسجد میں پڑھ لی تو جائز ہے۔علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ

یہ ہے کہ آج کل دووجوہ سے مسجد میں سنت پڑھنا افضل ہوگا۔
ایک وجہ یہ ہے کہ تکاسل کا دور ہے۔لوگ کام کاج میں مشغول رہتے تھے۔اب مسجد میں اگر سنت نہ پڑھے ممکن ہے گھر میں کام پیش آجائے تو بالکل نماز ہی رہ جائے۔دوسرا یہ روافض کا شعار بن گیا ہے۔کہ وہ گھر میں پڑھتے ہیں اس لئے ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے مسجد میں پڑھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی فضل التطوع ست رکعات بعد المغرب

پہلی بات: مغرب کے بعد نبی اکرم ﷺ سے سنتوں کے علاوہ چار رکعات نوافل کا پڑھنا ثابت ہے۔اسی طرح چھ رکعات کی فضیلت بھی ثابت ہے۔اور بیس رکعات کی فضیلت بھی ثانت ہے۔معارف السنن میں ہے کہ چار رکعات اور بیس ۲۰ رکعات کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے۔ان احادیث میں ضعف ہے لیکن فضائل میں ضعیف روایت چل جاتی ہے۔
دوسری بات: نماز مغرب کے بعد چھ رکعات کو صلاۃ اوابین کہا جاتا ہے۔مگر معارف السنن میں ہے کہ حدیث میں چاشت کی نماز کو تو اوابین کہا گیا ہے۔مگر مغرب کے بعد چھ رکعات پر احادیث میں اوابین کا اطلاق کرنا ثابت نہیں۔البتہ لوگوں میں نماز اوابین کے نام سے مشہور ہے۔

باب ماجاء ان صلاۃ اللیل مثنٰی مثنٰی

اختلاف: دن اور رات کے نوافل ایک سلام سے کتنے پڑھنا افضل ہے ① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دن کو چار رکعات ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔اور رات کو بھی دن پر قیاس کرتے ہیں۔کہ رات کو بھی چار رکعات ایک سلام کے ساتھ افضل ہیں۔② صاحبین رحمہ اللہ تعالیٰ قیاس نہیں کرتے۔یہ کہتے ہیں کہ رات کو دو دو افضل ہیں۔③ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رات کو دو دو رکعات پڑھنا افضل ہے۔اور دن کو رات کی نماز پر قیاس کر کے فرماتے ہیں کہ دن کو بھی دو رکعات افضل ہیں۔
احناف کہتے ہیں کہ گزر چکا ہے کہ آپ نے عصر سے پہلے چار رکعت پڑھیں۔اور سلام نہیں پھیرا۔اس لئے دن میں چار رکعات افضل ہیں۔آگے امام صاحب رحمہ اللہ رات کو دن پر قیاس کرتے ہیں۔مگر صاحبین فرماتے ہیں کہ رات کو دو دو رکعات پڑھنا افضل ہے۔صاحبین رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بہتر ہے۔

باب ماجاء فی وصف صلاۃ النبی ﷺ

نبی اکرم ﷺ سے رات کو تیرہ رکعات بھی منقول ہیں کہ پہلے دو رکعت نفل پھر آٹھ رکعت تہجد پھر تین وتر۔اسی طرح پندرہ بھی منقول ہیں۔اس صورت میں دو رکعات تین وتر کے بعد پڑھتے تھے۔اسی طرح گیارہ ۱۱ رکعات بھی منقول ہیں۔جن میں دو نوافل چھ تہجد اور تین وتر ہوتے تھے۔اسی طرح نو ۹ بھی منقول ہیں۔اس کی تفصیل ابواب الوتر میں آئے گی۔باقی اس حدیث سے غیر مقلدین کا استدلال برائے تراویح صحیح نہیں کیونکہ یہ تہجد کی نماز کے بارے میں ہے۔
ثم یصلی ثلاثا: یہ احناف کی دلیل ہے کہ وتر تین رکعت ہیں۔

باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالٰی الی سماء الدنیا الخ

پہلی بات: باب میں جو حدیث منقول ہے۔اس کا تعلق صفات کے مسئلے کے ساتھ ہے۔عقائد کی کتابوں میں ہے۔کہ اللہ تعالیٰ کی

صفات دو قسم کی ہیں۔ ① صفات ذاتی یہ اشاعرہ، ماتریدیہ اور جمہور کے نزدیک قدیم ہیں۔ اشاعرہ نے ان کی تعداد سات لکھی ہے۔ ماتریدیہ نے ایک صفت یعنی صفت تکوین کا اضافہ کیا ہے۔ ② صفات فعلیہ جو اللہ کی قرآن یا حدیث میں موجود ہیں۔ یہ ماتریدیہ کے نزدیک صفت تکوین میں داخل ہیں اور قدیم ہیں۔ اشاعرہ کے ہاں قدیم نہیں۔

دوسری بات: اللہ صفات کے متعلق کچھ آیات اور احادیث ایسی ہیں۔ جن میں مثلاً فرمایا ہے "یوم یکشف عن ساق" اسی طرح "ید اللّٰه فوق ایدیهم" اسی طرح "ویبقٰی وجه ربک ذو الجلال و الاکرام" اسی طرح احادیث میں ان صفات کا ذکر ہے۔ اس مذکورہ روایت میں اللہ کی صفت نزول کا ذکر ہے۔ نزول کا لغوی معنی ہے وہ چیز جو جسم ہو اور اوپر سے نیچے اترے اب اللہ تعالیٰ جسم اور مکان سے منزہ ہے۔ اسی طرح انتقال من مکان الی مکان سے بھی منزہ ہے۔ اب نزول جو انتقال من مکان الی مکان کہلاتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اس قسم کی صفات کے متعلق متعدد اقوال ہیں۔

❶ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث اسی طرح دوسری صفات جن پر اعتراض ہوتا ہے۔ یہ حدیثیں صحیح نہیں مگر یہ قول غلط ہے۔ کیونکہ یہ مذکورہ حدیث بھی سنداً صحیح ہے اور دوسری احادیث بھی صحیح ہیں۔

❷ بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسی صفات میں تاویل کریں گے۔ پھر ان میں سے بھی دو طبقے ہیں ایک وہ طبقہ ہے جو ایسی تاویل کرتا ہے جو تحریف تک پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جو کلام عرب کے تحت تاویل کرتے ہیں۔

❸ بعض علماء اس کو بالکل ظاہر پر حمل کرتے ہیں۔ جیسے مشبہ مجسمہ وغیرہ یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے نزول، ساق، ید، وجہ ثابت ہے۔ یہ عام جسم کی طرح ہے۔ ان کا اہل سنت سے تعلق نہیں۔ اسی طرح معتزلہ وخوارج جو بالکل صفات کے منکر ہیں۔ اور تعطیل کے قائل ہیں۔ ان کا بھی اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

عام اہل سنت دو قسم کے ہیں۔ ① متقدمین یعنی امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اعظم، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، لیث رحمہ اللہ تعالیٰ اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ یہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اس قسم کی تمام آیات یا احادیث جن میں ایسی صفات آئی ہیں۔ ہم ان صفات پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان صفات مثلاً نزول کا کون سا معنی مراد ہے۔ صفت نزول کیسا ہے۔ تو "کما یلیق بشانه" اسی طرح صفت ید پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ ید کیسا ہے "کما یلیق بشانه" عقیدۃ الطحاوی میں اہل سنت کے متقدین حضرات کا یہی مسلک نقل ہے۔ اور فقہ اکبر میں امام صاحبؒ کا یہی مسلک نقل کیا گیا ہے یہ مسلک اسلم ہے۔

② متاخرین متکلمین اس میں تاویل کرتے ہیں معتزلہ، مجسمہ، خوارج وغیرہ کے اعتراض سے بچنے کے لئے۔ مثلاً ید کی تاویل قدرت سے کرتے ہیں۔ نزول کی تاویل رحمت سے کرتے ہیں یا یہ کنایہ ہے اجابت سے۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ صفات اور عقائد کے متعلق متقدمین کا مسلک اسلم بھی ہے اور وہی اہل سنت کا مسلک ہے۔ متاخرین نے جو تاویل کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس سے اللہ کی بعض صفات کا انکار لازم آتا ہے، تعطیل لازم آتی ہے۔ مثلاً ید کی تاویل قدرت سے کرتے ہیں۔ جب کہ ید مستقل صفت ہے قدرت مستقل صفت ہے۔ اس لئے متقدمین کا مسلک اسلم ہے۔ متقدمین اور مشبہ یا مجسمہ کے مذہب میں فرق ہے۔ متاخرین نے اس میں جو مباحث نقل کئے ہیں۔ یہ فلاسفہ سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ خصوصاً فلاسفہ نے جو الٰہیات کا علم لکھا ہے۔ یہ دراصل ظنیات ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر متکلمین اور متاخرین نے جو تاویلات کی ہیں۔ یہ تعطیل تک پہنچتی ہیں۔ اس لئے یہ مناسب نہیں۔ البتہ وہ تاویلات جو کلام عرب سے ثابت ہیں۔ ان میں تعطیل لازم نہیں آتا وہ صحیح ہوں گے۔

باب ماجاء فی القرأة باللیل

مسئلہ: صلاۃ اللیل کے متعلق یہ حدیث نقل کی ہے کہ اس میں قراءت سراً ہوگی یا جہراً۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک وہ ہے جو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دوسری حدیث میں منقول ہے۔ کہ نبی ﷺ کبھی آہستہ پڑھتے کبھی جہراً پڑھتے۔ اس لئے امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ دن کے نوافل میں اخفاء افضل ہے۔ رات کے نوافل میں جہراً افضل ہے اور سر بھی جائز ہے۔ یہی دوسرے حضرات کا بھی مسلک ہے۔ لیکن رات کو جہرا فضل تب ہے جب کسی نائم یا مریض کے آرام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ اگر کسی کے آرام میں خلل واقع ہوتا ہوتو پھر سراً پڑھنا افضل ہوگا۔

قام النبی ﷺ بآیۃ من القرآن الخ نوافل میں وسعت ہوتی ہے۔ اس لئے ان میں ایک آیت بار بار پڑھ سکتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے ایک آیت بار بار پڑھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ اس لئے نوافل میں ایسا کیا۔

باب فی فضل التطوع فی البیت

ولا تتخذوھا قبورًا: ① گھروں میں قبریں نہ بناؤ۔ کیونکہ شرک کا اندیشہ ہے۔ پھر دو حکم ہوں گے یعنی دونوں جملوں میں الگ الگ حکم ہوگا۔ کہ گھروں میں نماز پڑھو۔ دوسرا یہ کہ قبریں گھروں میں مت بناؤ۔ قبریں دو مقامات پر بنانا جائز ہے۔ ایک وقف شدہ قبرستان۔ دوسرا کوئی اپنی مملوکہ زمین میں بنائے۔ مساجد اور مدارس میں قبریں بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ زمین جس کے لئے وقف ہوتو واقف کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے۔ اس لئے واقف کی نیت کو بدلنا جائز نہیں۔

② دوسرا مطلب یہ کہ گھروں کو قبروں کی طرح بلا عبادت نہ بناؤ کہ وہاں عبادت نہ ہو۔

ابواب الوتر

باب ماجاء فی فضل الوتر

وتر کا لغوی معنی طاق ہے۔ اصطلاح میں وتر کی نماز وہ ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ **علی اختلاف الاقوال کما سیاتی.**

اس باب میں وتر کی فضیلت بیان کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کی زیادتی کی ہے۔ **جو حمر النعم** سے بہتر ہے۔ وتر کے متعلق بہت سارے مسائل اختلافی ہیں۔ مثلاً وتر کا کیا حکم ہے؟ وتر کی کتنی تعداد ہے؟ وتر کتنے سلاموں کے ساتھ ہے؟ اسی طرح وتر میں قنوت قبل الرکوع ہے یا بعد الرکوع ہے؟ ان سب مسائل کے متعلق ترمذیؒ نے مستقل ابوب قائم کئے ہیں۔

مذکورہ باب میں صرف وتر کی فضیلت بیان کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نماز کا اضافہ کیا ہے جو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور اس وقت عرب میں سرخ اونٹوں کو بہترین اموال میں شمار کیا جاتا تھا۔ **ان اللہ امدکم بصلاۃ الخ** اس لفظ سے احناف استدلال کرتے ہیں کہ وتر واجب ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں آئے گا۔ دوسرے حضرات وتر کو سنت کہتے ہیں، اگر چہ وہ اس کے ساتھ معاملہ واجب والا کرتے ہیں۔ لیکن احناف وجوب کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل میں سے فی الجملہ ایک دلیل یہ لفظ بھی ہے۔ احناف کا طریقہ استدلال یہ ہے کہ مزید مزید علیہ کی جنس سے ہوتا ہے۔ اب واجب فرض کی جنس میں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ واجب عملاً فرض ہوتا ہے۔ لیکن

اگر وتر سنت ہوں تو "امدکم" کا مطلب صحیح نہ بنے گا۔ کیونکہ سنت فرض کی جنس میں سے نہیں۔

باب ماجاء ان الوتر لیس بحتم

وتر کا حکم: اس باب میں وتر کا حکم بیان کیا جارہا ہے۔ کہ وتر کا فقہی حکم کیا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ① بعض شوافع جیسے قاضی حسین وغیرہ کے ہاں وتر فرض ہے۔ ② امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض فقہاء کوفہ کے ہاں وتر واجب ہے۔ ③ جمہور یعنی ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک وتر سنت ہیں۔

قول اول والوں کی دلیل کسی مرفوع حدیث میں نہیں۔ قول ثالث والے یعنی جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ علیؓ فرماتے ہیں۔ کہ "الوتر لیس بحتم کصلا تکم المکتوبة ولکن سن رسول الله ﷺ" دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے وتر سواری پر پڑھنا منقول ہے۔ جب کہ فرائض سواری پر نہیں پڑھے جاتے۔ اب اگر وتر واجب اور قطعی ہوتے تو سواری پر جائز نہ ہوتے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل حدیث ہے "الوتر حق واجب علی کل مسلم" تو حدیث میں حق کا لفظ بھی ہے واجب کا لفظ بھی ہے۔ دوسری دلیل صحیح ابن حبان میں ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من نسیه، او نام عنه فلیصله اذا اصبح" یہاں نبی ﷺ نے وتر کی قضاء کا حکم دیا۔ جب کہ نوافل یا سنن کی قضاء کا حکم نبی ﷺ نے نہیں دیا۔ اس لئے قضاء کا حکم وجوب کا قرینہ ہے۔ تیسری دلیل گذشتہ باب کی حدیث ہے کہ "ان اللّٰه امدکم بصلاة" یہاں زیادت کا ذکر ہے۔ اور مزید مزید علیہ کی جنس سے ہوتا ہے اب وتر کو واجب مانیں تو مزید علیہ (فرائض) کی جنس سے ہوگا۔ جب کہ اگر سنت مانیں تو سنت مزید علیہ (فرض) کی جنس سے نہیں۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ سے وتر کے ترک پر وعید ثابت ہے فرمایا "من لم یوتر فلیس منا" وعید ترک واجب پر ہوتی ہے۔ سنت یا نوافل کے ترک پر نہیں ہوتی۔ تو ان قرائن کی وجہ سے امام صاحبؒ وجوب کے قائل ہیں۔

شوافع کے اعتراضات: حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "خمس صلوات فی الیوم واللیلة" قصہ یہ ہے کہ اہل نجد کا آدمی آیا کہنے لگا آپ کا قاصد آیا۔ اس نے یہ بات کی۔ ان میں سے یہ بات بھی کی کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ آپ نے فرمایا 'صدق' اس نے کہا مجھ پر اور بھی ہیں آپ ﷺ نے فرمایا "لا الا ان تطوع" اب شوافع کہتے ہیں کہ اگر وتر واجب ہوں۔ تو نمازیں پانچ نہ رہیں گی۔ دوسرا اس نے کہا "هل علیّ غیرها"۔ آپ نے فرمایا "لا الا ان تطوع" اس کے جواب کے متعلق احناف کہتے ہیں۔ کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث ہے کہ "الوتر لیس بحتم" یہ حدیث ہمارے خلاف تب ہوگی جب ہم وتر کو فرض کی طرح قطعی مانیں۔ جب کہ ہم وتر کو واجب کہتے ہیں فرض نہیں کہتے۔ احناف کے ہاں واجب اور فرض میں فرق ہے۔ فرض کا منکر کافر ہے جب کہ واجب کا منکر کافر نہیں۔ اسی طرح "خمس صلوات فی الیوم واللیلة" بھی ہمارے خلاف تب ہوگی۔ جب ہم وتر کو فرض مانیں جب کہ یہ واجب ہے اس لئے صحیح تربات یہ ہے کہ نبی ﷺ سے جو الفاظ منقول ہیں۔ وہ وجوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ مثلاً "الوتر حق واجب" اسی طرح نبی ﷺ نے زندگی میں کبھی ترک نہیں کیا۔ اسی طرح آپ نے اس کے قضاء کا حکم دیا ہے۔ اس لئے یہ قرائن وجوب کو ترجیح دیتے ہیں۔ فاوتروا یا اهل القرآن الخ. اہل قرآن سے کیا مراد ہے؟ حاشیے والے نے لکھا ہے کہ اس سے مؤمنین مراد ہیں۔ لیکن معارف السنن میں شاہ صاحبؒ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ اس سے حفاظ مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة النوم قبل الوتر

و باب ماجاء فی الوتر من اول الخ

پہلی بات: یہ دو باب بھی وتر کے متعلق ہیں۔ ایک وتر کا وقت جواز ہے۔ دوسرا وقت افضل ہے۔ دوسری نمازوں کی طرح اس کا وقت جواز عشاء کی نماز کے بعد سے طلوع فجر تک ہے۔ باقی وقت افضل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے رات کے آخری حصے میں پڑھنے کو پسند فرمایا ہے۔ تو وقت افضل رات کا آخری تیسرا حصہ ہے۔ باقی نفس جواز اول لیل میں بھی ہے وسط اللیل اور اخیر رات میں بھی ہے۔ وقت افضل اور وقت جواز دونوں اتفاقی ہیں۔

دوسری بات: وتر کے لئے جو وقت شریعت نے مقرر کیا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ وتر کے لئے وقت کا مقرر کرنا وجوب کا قرینہ ہیں۔

تیسری بات: یہاں ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے اول لیل میں وتر پڑھے۔ وہ رات کی آخری حصے میں بیدار رہوا۔ اب یہ تہجد پڑھنا چاہتا ہے۔ تو تہجد پڑھنے سے نقض وتر ہوگا یا نہیں۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس کا مستقل باب آگے آئے گا۔ جمہور کا مسلک عدم نقض وتر کے ہے۔

باب ماجاء فی الوتر بسبع و بخمس و بثلاث و برکعة

پہلی بات: نبی اکرم ﷺ سے وتر کی تعداد کے بارے میں کئی روایات منقول ہیں۔ جن میں ۱۳، ۱۱، ۹، ۷، ۵، ۳، اور ایک رکعت کا ذکر ہے۔ تو نبی ﷺ سے وتر کے متعلق سات قسم کی روایات منقول ہیں۔

دوسری بات: ❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، فقہائے کوفہ کا قول یہ ہے۔ کہ رکعات وتر کی تعداد تین ہے۔

❷ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے موطا میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وتر برکعۃ کی روایت نقل کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ مدینہ میں ایک رکعت وتر نہیں، کم از کم تین ہیں۔ اس سے ان کا مسلک معلوم ہوتا ہے۔

❸ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی مختلف روایات ہیں۔ ابن قدامہ نے المغنی میں ان کی طرف تین رکعت کا قول منسوب کیا ہے۔

❹ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک قول کے مطابق وتر برکعۃ کے قائل ہیں۔ لیکن ایک رکعت پڑھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ① صرف اکیلی ایک رکعت پڑھے۔ اس سے پہلے یا بعد میں نماز نہ پڑھے۔ اس کے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی قائل نہیں۔ بلکہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ ② رکعۃ واحدہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھے پھر سلام پھیرے پھر تیسری رکعت پڑھی جائے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی صورت کے قائل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ایک قول یہ ہے۔ یہ حقیقت میں ایک رکعت نہیں بلکہ تین رکعت ہیں۔ لیکن دو سلاموں کے ساتھ ہیں۔

❺ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ ان کے ہاں تعداد مقرر نہیں ۹، ۷، ۵، ۳، اسب پڑھ سکتا ہے لیکن اگر ۹ یا ۷ یا ۵ پڑھے گا تو درمیان میں قعدہ نہ کریگا مثلاً نو پڑھنی ہوں تو آٹھویں پر بیٹھے پھر نویں ملادے اس طرح سات پڑھنی ہوں تو چھ کے بعد بیٹھے۔ پھر ساتویں کے لئے بیٹھے۔ معارف السنن میں ہے کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا احناف کی طرح تین رکعات کا قول ہے۔ اس لیے یا تو ان کے دو قول ہوں گے۔ یا ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو نسبت کی ہے یہ غلط ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جمہور کے ہاں وتر تین رکعت ہیں۔ البتہ ایک قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک

رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سلام سے پڑھے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی دوسری روایت اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق کے ہاں دو سلاموں کے ساتھ پڑھے گا۔

احناف کی دلیل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت مستدرک حاکم اور سنن نسائی میں ہے۔ مستدرک حاکم کے الفاظ یہ ہیں "کان یوتر بثلاث لا یسلم الا فی آخرھن" سنن نسائی میں بھی مختلف الفاظ سے ثابت ہے۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی انہیں الفاظ کے ساتھ ثابت ہے۔ تیسری دلیل طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کی ہے۔ کہ "وتر اللیل کوتر النھار" اور وتر نہار مغرب کی نماز ہے۔ اس کی حدیث میں تصریح ہے۔ اب مغرب کے ساتھ تعداد اور کیفیت میں تشبیہ دی۔

معارف السنن نے پچیس آثار نقل کئے ہیں۔ جن میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل ہیں کہ یہ حضرات تین رکعات بسلام واحد پڑھتے تھے۔

تیسری بات: قعدہ جو کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ احناف کہتے ہیں، صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے "علی کل رکعتین التحیۃ" اس لئے اس قاعدے کے مطابق یہاں بھی دو رکعت کے بعد قعدہ ہوتا ہے تو اس میں بھی ہوگا۔ اسی طرح آثار صحابہ سے بھی منقول ہے۔ اس لئے تین رکعات ایک سلام کے ساتھ ہوں گے۔ اور دو رکعت کے بعد قعدہ بھی ہوگا۔

چوتھی بات: روایات میں وتر کے متعلق کئی عدد منقول ہیں۔ اس کے متعلق احناف دو باتیں ذکر کرتے ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ وتر کے بارے میں ابتداء حکم اتر امگر تعداد رکعات کی تعین نہ ہوئی تھی۔ بعد میں حکم میں تبدیلی آئی۔ اور وتر بثلاث کا حکم دیا گیا۔ دلیل یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تین ہی رکعت نقل کرتے ہیں۔ دوسری بات احناف یہ کرتے ہیں۔ مثلاً "یوتر بثلاث عشرۃ رکعۃ" کا اصل مطلب وہ ہے جو اسحٰق نے نقل کیا ہے کہ یہاں صلاۃ اللیل اور وتر کو جمع کر کے اس کی طرف وتر کی نسبت کی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ سارے وتر تھے۔ اب تیرہ رکعت میں آٹھ صلاۃ اللیل دو فجر کی رکعتیں خفیفتین اور تین وتر ہوں گی۔ اسی طرح باقی میں بھی جہاں "یوتر برکعۃ" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھتے پھر تیسری ملا کر وتر بنا دیتے۔

باب ماجاء مایقرأ فی الوتر

اس بات میں پہلی بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی رکعات میں مختلف سورتیں ثابت ہیں دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث احناف کی مستدل ہے کہ وتر تین رکعت ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ وتر میں جو سورتیں منقول ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ اس لئے یہ افضل ہیں۔ باقی لازم نہیں کیونکہ اگر اس کو لازم مانیں تو ایک تخصیص کا شبہ ہوگا۔ دوسرا باقی قرآن کا متروک ہونا لازم آئے گا۔

باب ماجاء فی القنوت فی الوتر

پہلی بات: وتر میں قنوت ہے یا نہیں؟ تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کے ہاں وتر کی آخری رکعت میں قنوت پڑھی جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ پورے سال پڑھی جائے گی یا نہیں؟ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ پورا سال پڑھی جائے گی۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پورے رمضان میں پڑھی جائے گی۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان کے نصف اخیر میں دعا قنوت پڑھی جائے گی۔ باب کی حدیث سے احناف کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری بات: کونسی قنوت پڑھی جائے گی۔ شوافع کے ہاں "اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت الخ" یہ افضل ہے۔ اور احناف کے ہاں "اللّٰھم انا نستعینک الخ" افضل ہے۔ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔ کہ یہ منزل ہے۔ قرآن کی سورت تھی پھر تلاوت منسوخ ہوگئی۔

تیسری بات: قنوت میں رفع الیدین ہوگا یا نہیں احناف کے ہاں رفع الیدین ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جزء رفع یدین میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رفع الیدین ہوگا۔ تو احناف کے ہاں جس طرح تکبیر تحریمہ میں رفع الیدین ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دعا کی طرح رفع الیدین ہوگا۔

چوتھی بات: قنوت قبل الرکوع ہے یا بعد الرکوع۔ احناف کا قول یہ ہے۔ جس طرح ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ قبل الرکوع ہے۔ شوافع کے ہاں بعد الرکوع ہے۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ سنن ابن ماجہ میں ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔ الفاظ یہ ہیں۔ "کان یقنت قبل الرکوع"۔

باب ماجاء فی الرجل ینام عن الوتر او ینسی

پہلی بات: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ کوئی سو گیا یا بھول گیا۔ اور وتر نہ پڑھ سکا تو اس پر وتر کی قضاء ہے یا نہیں؟ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث نقل کی ہے۔ جس میں ہے کہ جب یاد آئے یا جب بیدار ہو جائے تو وتر پڑھے۔

دوسری بات: اس مسئلے کا تعلق اس بات سے ہے کہ وتر کی قضاء ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔

❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کے ہاں وتر کی قضاء ہے۔ اس لئے کوئی رات کو نہ پڑھ سکا کسی عذر کی بناء پر یا سو گیا۔ تو فرائض کی طرح صبح اس کی قضاء کرے گا۔

❷ دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ایک روایت میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ان کے ہاں صبح صادق تک کوئی وتر نہ پڑھ سکا۔ تو فجر کی نماز سے پہلے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن فجر پڑھ لی اب قضاء نہیں کر سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا قول احناف کی طرح ہے۔ کہ طلوع شمس کے بعد بھی قضاء ہے۔ باب کی احادیث ان کی مستدل ہیں جو مطلقا وتر کی قضاء کے قائل ہیں۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقا قضاء کا حکم دیا ہے۔ اس لئے صحیح تر قول یہ ہے کہ وتر کی قضاء علی الاطلاق واجب ہے۔

تیسری بات: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وتر کی قضاء کا حکم دیا۔ اس سے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ جو وتر کے وجوب کے قائل ہیں۔ کیونکہ علی الاطلاق سنت یا نوافل کی قضاء نہیں ہوتی۔

چوتھی بات: حدیث میں ہے "فلیصل اذا ذکر" اذا عموم کے لئے آتا ہے۔ یہاں بھی اذا عموم کے لئے ہے مگر اوقات ممنوعہ اور اوقات مکروہ اس عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی ان اوقات میں وتر کی قضاء جائز نہیں۔

باب ماجاء فی مبادرۃ الصبح بالوتر

حدیث کا مفہوم: اس باب کی احادیث سے امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ بظاہر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وتر کی قضاء نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فجر سے پہلے وتر پڑھو۔ معلوم ہوا فجر کے بعد وتر نہیں۔ اس لئے پہلے پڑھنے کا حکم دیا۔ احناف اور وہ فقہاء جو وجوب قضائے وتر کے قائل ہیں۔ وہ ان احادیث کا یہ جواب دیتے ہیں۔ کہ یہاں جو فجر سے پہلے وتر پڑھنے کا حکم ہے۔ یہ وجوب کے لئے ہے کہ وتر کو وقت کے اندر پڑھنا واجب ہے۔ دوسرا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تاکید کر رہے ہیں کہ وتر کو وقت کے اندر ادا کرنا چاہئے۔ باقی یہ جو کہا کہ فجر کے بعد وتر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی نماز فجر کے بعد ادا نہیں۔ باقی قضاء ہے یا نہیں اس کے ساتھ اس حدیث کا تعلق نہیں۔ یہ بات ماقبل

والے باب سے معلوم ہوتی ہے کہ فجر کے بعد پڑھیں گے۔اور وہ پڑھنا قضاء کہلائے گا۔اس صورت میں دونوں بابوں کی احادیث میں تضاد اور تعارض نہ رہے گا۔

وبہ یقول الشافعی و احمد و اسحق الخ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک قول ہے۔کہ وتر کی قضاء فجر کی نماز کے بعد نہیں۔لیکن دوسرا قول ان کا احناف کی طرح ہے کہ وتر کی قضاء علی الاطلاق ہے۔

باب ماجاء لا وتران فی لیلة

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے رات کے اول حصے میں وتر پڑھ لئے۔ پھر رات کے آخری حصے میں بیدار ہوا، اور اُٹھ کر تہجد پڑھے۔تو دوبارہ وتر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وتر ایک دفعہ ہو چکے ہیں۔یہ مسلک جمہور فقہاء ومحدثین کا ہے۔

دوسرا قول امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل ظواہر کا ہے۔ان کے ہاں اگر پہلے وتر پڑھے پھر رات کو تہجد پڑھنا چاہے۔تو اس کے پہلے والے وتر ختم ہو جائیں گے کیونکہ حدیث میں ہے "اجعلوا آخر صلا تکم باللیل وترًا" اب اگر وتر تہجد کے بعد نہیں پڑھے گا تو وتر آخری نماز نہ ہوگی۔اس لئے یہ آدمی ایسا کرے کہ اس نے جو وتر پڑھے ہیں، اب آخر رات میں تہجد پڑھنا چاہتا ہے تو یہ ایک رکعت پڑھ کر ان وتر کے ساتھ ملائے جو اول لیل میں پڑھے تھے تو وہ وتر ختم ہو جائیں گے۔ پھر تہجد پڑھے گا اور آخر میں وتر ادا کرے گا۔ یہ صورت اس لئے اختیار کرتے ہیں کیونکہ اس بارے میں احادیث دو قسم کی ہیں۔ایک میں ہے "لا وتران فی لیلة" دوسری میں ہے "اجعلوا آخر صلا تکم الوتر" اب ایک رکعت ملا کر تین رکعت وتر کا نقض کریں گے کیونکہ اگر نقض نہ کریں تو دو وتر بن جائیں گے جو ممنوع ہے۔اور اگر آخر میں وتر نہ پڑھیں تو آخری نماز وتر نہ ہوگی۔اس لئے ایک رکعت ملا کر نقض وتر کریں گے اور آخر میں دوبارہ وتر پڑھیں گے۔تا کہ سب احادیث پر عمل ہو جائے۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور جمہور یہ کہتے ہیں۔کہ تمہیں اشکال اس لئے ہوا کہ تم کہتے ہو کہ وتر آخری نماز ہونی چاہئے۔اور وتر کے بعد نوافل جائز نہیں۔ یہ صحیح نہیں۔بہتر تو یہی ہے کہ وتر آخری نماز ہونی چاہئے جیسا کہ "اجعلوا اخر صلا تکم الوتر" میں حکم ہے۔باقی یہ کہنا کہ وتر کے بعد نوافل نہیں۔یہ بات غلط ہے۔نبی ﷺ سے وتر کے بعد صحیح اسناد کے ساتھ نفل پڑھنا ثابت ہے۔عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث مستدرک حاکم میں موجود ہے کہ نبی ﷺ وتر کے بعد دو رکعت قاعدًا ادا کرتے تھے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ شریعت میں نظیر نہیں کہ آدمی تین رکعت پڑھے اس کے بعد کھائے پیئے سوئے وضوء کرے اور پھر کئی گھنٹوں بعد ایک رکعت ملا دے اس کی شریعت میں نظیر نہیں اور نہ نبی ﷺ سے ثابت ہے۔

باب ماجاء فی الوتر علی الدابة

مسئلہ یہ ہے کہ وتر کی نماز راحلہ پر جائز ہے یا نہیں۔یعنی اس میں قیام ضروری ہے اور وتر کی نماز اتر کر پڑھی جائے گی اس میں اختلاف ہے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فقہائے کوفہ، اور وہ فقہاء جو وجوب وتر کے قائل ہیں۔ان کے ہاں بغیر عذر کے راحلہ پر وتر جائز نہیں بلکہ راحلہ سے اتر کر پڑھے جائیں گے۔امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ کے یہاں وتر سواری پر پڑھنا جائز ہیں۔ان کی دلیل باب مذکورہ والی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو راحلہ پر وتر پڑھتے ہوئے دیکھا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کی مستدل بھی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔امام طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ وتر پڑھنے کے لئے سواری سے نیچے اترتے تھے۔اسی طرح طحاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور تابعین کے کچھ آثار نقل

کئے ہیں۔ کہ وہ حضرات اتر کر وتر پڑھتے تھے۔ باب کی حدیث کے متعلق احناف چند باتیں ذکر کرتے ہیں۔

❶ ایک بات تو یہ ہے کہ وتر پر کئی ادوار گزرے ہیں۔ پہلے وتر کا حکم اتر امگر تعداد نہ اتری تھی اسی طرح ابتداء میں اس کا حکم وجوب کا بھی نہ تھا۔ اس لئے نبی ﷺ راحلہ پر پڑھتے تھے۔ لیکن جب وتر کے حکم میں تشدید آئی۔ تو پھر نبی اکرم ﷺ سواری سے اتر کر پڑھتے تھے۔ اس لئے باب کی حدیث اول زمانے کی ہے۔ اور طحاوی نے جو نقل کیا ہے۔ وہ نبی ﷺ کا آخری عمل ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی پر عمل کرتے تھے۔

❷ دوسری بات یہ ہے کہ وتر کا اطلاق صلاۃ اللیل پر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں ہے یوتر علی راحلۃ اس سے صلاۃ اللیل مراد ہے۔ اصطلاح وتر مراد نہیں اصطلاح وتر کے لئے اترنا ضروری ہوگا۔ ہاں اگر کوئی عذر ہو تو الگ بات ہے۔

باب ماجاء فی الصلاۃ عند الزوال

طلوع الشمس کے بعد زوال تک کا وقت مہمل ہے۔ اس کا اختتام ہوتا ہے استواء شمس تک۔ استواء شمس سے زوال کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے مکروہ وقت کے بعد نبی ﷺ چار رکعات پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل سب سے پہلے دروازے کھلتے ہی چڑھے۔ یہ چار رکعات مستحب ہیں۔ یہ وہ چار رکعات نہیں جو ظہر کی نماز سے پہلے پڑھی جاتی ہیں جو سنن قبلیہ کہلاتی ہیں بلکہ یہ اس کے علاوہ ہیں۔

باب ماجاء فی صلاۃ الحاجۃ

مسئلہ: صلاۃ الحاجۃ یعنی انسان اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو اس کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے وضوء کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے پھر دعا کرے۔ یہ طریقہ باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ کیونکہ فائد بن عبد الرحمٰن راوی ضعیف ہے۔ لیکن دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی کام پیش آئے تو نبی ﷺ نماز کی طرف جلدی کرتے تھے۔ جس طرح صحیح حدیث میں ہے کہ "اذا فزعہ الا مر بادرًا الی الصلاۃ" اسی طرح قرآن میں ہے "واستعینوا بالصبر والصلاۃ" اس کی تشریح میں لکھا گیا ہے کہ کوئی حاجت پیش آجائے تو نماز پڑھے اور دعا کرے۔ اس لئے قرآن وحدیث سے صلاۃ حاجت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح احناف اور شوافع کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

باب ماجاء فی صلاۃ الاستخارۃ

پہلی بات: استخارے کی نماز کو بھی فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ یہ ان نمازوں میں سے ہے جو مستحب ہیں۔

دوسری بات: استخارے کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ امور جو شرعاً فرض یا واجب ہوں۔ ان کے کرنے یا نہ کرنے کے لئے استخارہ نہ کیا جائے گا۔ اسی طرح وہ امور جو معصیت کے قبیل سے ہوں یعنی حرام ہوں یا مکروہ تحریمی ہوں ان کا ترک واجب ہے۔ ان کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی استخارہ نہیں۔ البتہ امور مباحہ کے بارے میں استخارہ کیا جاتا ہے۔

تیسری بات: استخارے کا طریقہ ایک تو باب کی حدیث میں ہے یہ مسنون طریقہ ہے۔ دوسرا وہ طریقہ ہے جو صوفیاء کے تجربے سے ثابت ہے کہ ان کے ہاں کچھ چیزیں زائد بھی ہیں۔ اب جو امور تجربے سے ثابت ہیں ان کو مستحب نہ سمجھے تو جائز ہے۔ لیکن اگر تجربہ سے ثابت امور کو مستحب یا مسنون سمجھے تو جائز نہیں ہوگا۔

چوتھی بات: استخارے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ خواب نظر آئے۔ کیونکہ استخارہ طلب خیر کو کہتے ہیں۔ اب طلب خیر کی دعا کر دی تو اب

دل جس جانب پر جم جائے اُس کو کرلیں۔ اس لئے خواب کا آنا ضروری نہیں۔ بلکہ دل کا جس طرف میلان ہو اس کو کرے بشرطیکہ دل کا میلان خواہشات کی وجہ سے نہ ہو۔

باب ماجاء فی صلاۃ التسبیح

پہلی بات: ہمارے بہت سارے فقہاء نے صلاۃ التسبیح کو بھی صلوات مستحبہ میں ذکر کیا ہے۔
دوسری بات: صلاۃ التسبیح کے دو طریقے ہیں۔ ان میں سے جس طریقے سے پڑھے صحیح ہوگا۔
تیسری بات: فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ باعث خیر و برکت ہے۔ مجرب ہے انسان کی حاجات کے پورا کرنے کے لئے۔
چوتھی بات: اس کے متعلق جو حدیث ہے اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔
① احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ضعیف ہے۔ ② ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ابن تیمیہ کے ہاں موضوع ہے۔ ③ یک قول یہ ہے کہ یہ صحیح روایت ہے۔ ④ ایک رائے یہ ہے کہ یہ حسن ہے۔ لیکن معتدل قول یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے اور ضعیف فضائل میں چل جاتی ہے۔

باب ماجاء فی صفة الصلاۃ علی النبی ﷺ

درود کا حکم: مطلقاً صلاۃ علی النبی ﷺ کا کیا حکم ہے۔ تو صحیح قول یہ ہے کہ زندگی میں ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ اور مجلس میں نام آجائے تو درود پڑھنا مستحب ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب بھی نام آجائے درود پڑھنا واجب ہے۔ یہ تو عام حالات میں سے ہے۔ مگر نماز کے اندر درود کا کیا حکم ہے؟ تو احناف اور شوافع کے ہاں نماز کے اندر سنت ہے۔ "اذا قلت ھذا او فعلت ھذا فقد تمت صلاتک" کی وجہ سے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب اور ایک روایت امام مالکؒ کی یہ ہے کہ نماز میں درود پڑھنا فرض ہے۔

ابواب الجمعة

باب فضل الجمعة

جمعہ سے یوم الجمعہ مراد ہے۔ جاہلیت کے دور میں اس کا م نام یوم العروبہ تھا۔ اسلام میں اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔ اس کے فضائل بہت سارے ہیں۔ مثلاً آدمؑ جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ نوح علیہ الصلاۃ والسلام کی کشتی جمعہ کے دن رکی تھی۔ اسی طرح قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی۔ اسی طرح جنت میں آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو جمعہ کے دن داخل کیا گیا۔ اور جمعہ کے دن جنت سے نکالا گیا۔

جمعہ کی فرضیت کب ہوئی؟ احناف کے ہاں جمعہ کی فرضیت مکہ میں ہوئی تھی۔ مگر مکہ میں نبی ﷺ قادر نہیں تھے کہ ادا کریں۔ اس لئے جب ہجرت کی تو قباء کے بعد جب مدینہ پہنچے تو جمعہ مدینہ کے مضافات میں پڑھی۔ شوافع کے ہاں اس کی فرضیت مدینہ میں ہوئی جمعہ کے کچھ مسائل اختلافی ہیں جو اپنی جگہ پر آئیں گے۔

وفیہ اخرج منہ الخ اب جنت سے نکالا جانا کوئی فضیلت کی چیز نہیں۔ اس لئے حدیث میں جمعہ کی فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے۔

باب ماجاء فی الساعة التی ترجٰی فی یوم الجمعة

حدیث میں ہے کہ جمعہ کے دن ایک وقت ایسا ہے جس کو ساعت اجابت کہتے ہیں۔ اب وہ وقت کون سا ہے اس میں متعدد اقوال

ہیں۔صحیح دواقوال ہیں۔ ❶ امام جب خطبے کے لئے منبر پر بیٹھے تو وقت اجابت شروع ہوجاتا ہے۔اس وقت تک کہ امام اتر نہ جائے۔ ❷ عصر سے لے کرغروب تک کاوقت ساعت اجابت ہے۔

باب ماجاء فی الاغتسال فی یوم الجمعة

وباب فی فضل غسل یوم الجمعة الخ.

مسئلہ: نبی اکرم ﷺ نے جمعہ کے دن غسل کاحکم دیاہے۔جس طرح باب اول کی حدیث میں موجود ہے۔اسی طرح بعض دوسری احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے تاکیدی حکم دیاہے۔مگرفقہی حکم کے اعتبار سے تمام ائمہ کے نزدیک جمعہ کے لئے غسل کاحکم استحباب کا ہے۔ابتداءً وجوب تھا پھرمنسوخ ہوگیا۔اس کی تفصیل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے کہ پہلے زمانے میں لوگ خودکام کرتے تھے۔نوکروغیرہ نہ تھے۔جب اذان ہوجاتی تواسی وقت کام چھوڑ کرمسجد میں آجاتے۔اور مسجد کھجور کی چھال اور پتوں کی تھی ہوا آنے کا کوئی منفذ نہ تھا۔اورگرمی بہت تھی۔اس وجہ سے پسینہ کی بدبوپھیلتی تولوگوں کوتکلیف ہوتی۔اس لئے نبی ﷺ نے غسل کاحکم دیا۔اسی طرح جمعہ کے دن خوشبوکاحکم دیااس کی بھی یہی وجہ تھی۔لیکن بعد میں حالات اچھے ہوگئے۔اس لئے غسل یوم الجمعہ کاوجوب ختم ہوگیا۔اسی وجہ سے نبی ﷺ نے بعد میں فرمایا"من توضأ یوم الجمعة فبھا ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل" اس لئے اب اس کاحکم استحباب کاہے کسی نے نہیں کیاتوپھربھی جائز ہے۔فقط وضوءکافی ہےاورغسل افضل ہے۔باب اول کی حدیث میں اگرچہ امر کاصیغہ ہے اورامر وجوب کے لئے آتا ہے۔مگر قرینہ صارفہ عن الوجوب موجود ہوتوامر وجوب کے لئے نہیں آتا۔اور یہاں دوسرے دوابواب کی احادیث قرینہ صارفہ عن الوجوب ہیں۔

بکر وابتکر الخ بکر کامعنی ہے خودجلدی گیا۔ ابتکر کامعنی ہے دوسروں کوجلدی جانے کاحکم دیا۔یابکر کامعنی ہے خودجلدی گیااورابتکر کامعنی ہے خطبے کاابتدائی حصہ پالیا۔یاابتکر بکر کے لئے تاکید ہے۔

باب ماجاء فی التبکیر الی الجمعة

پہلی بات: یہ باب ان احادیث کے بیان میں ہے جوجمعہ کی طرف۔پہلے جانے کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

دوسری بات: ایک جمعہ کاوقت جواز ہے دوسراوقت افضل ہے۔جمعہ کے وقت جواز کے متعلق امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ،امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اورجمہور فقہاء کامسلک یہ ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ کی اذان دینایاجمعہ اداکرنازوال سے پہلے جائز نہیں۔امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جمعے کی نماز قبل الزوال بھی جائز ہے۔ان کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ ہم دوپہر کاکھانااور قیلولہ جمعہ کے بعدکرتے تھے۔صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بعض آثاربھی منقول ہیں۔مگرجمہور کہتے ہیں کہ نبی ﷺ سے یاخلفاء راشدین میں سے کسی سے قبل الزوال جمعہ پڑھنا ثابت نہیں۔دوسرایہ جمعہ خلیفہ ہے ظہر کااورظہر کی نماز قبل الزوال جائز نہیں تواس کاخلیفہ جمعہ بھی قبل الزوال جائز نہ ہوگا۔باقی حدیث میں یہ جوآیاہے "ما کنا نقیل او نتغدی الا بعد الجمعة" اس کامطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اول وقت میں جمعہ اداکرتے تھے۔توزوال کے فوراً بعد جمعہ پڑھ کردوپہر کاکھاناکھاتے تھے۔اورقیلولہ کرتے تھے توجمعہ کے جلدی اداکرنے کوبیان کرنامقصود ہے۔اوراحناف کے ہاں بھی جمعہ اول وقت میں پڑھناافضل ہے یہ وقت جواز تھا۔دوسراہے وقت افضل یہ بالاتفاق اول وقت ہے۔

باب ماجاء من كم يوتى الى الجمعة

پہلی بات: اس باب کے تحت شارحین نے دو مسئلے بیان کئے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ آدمی کتنے دور سے جمعہ کے لئے حاضر ہو۔ اس کے لئے ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب قائم کیا ہے۔ دوسرا مسئلہ جمعہ فی القریٰ کا ہے کہ عام قریہ کے اندر جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

پہلا مسئلہ: پہلے مسئلے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جمعہ ان پر واجب ہے جو شہر میں رہتے ہوں۔ اور جمعہ کی اذان سنتے ہوں۔ اور جو لوگ جمعہ کی اذان نہیں سنتے یعنی اہل شہر سے نہیں ہیں ان پر جمعہ نہیں۔ باقی یہ جو حدیث ہے کے "**تجب الجمعة على من اواه الليل الى منزله**" اس کے متعلق احمد بن حسن فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بحث ہوئی، انہوں نے کوئی حدیث ذکر نہیں کی۔ معلوم ہوا ان کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں تھی۔ احمد بن حسن کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مرفوع حدیث منقول ہے کہ "**تجب الجمعة على من اواه الليل الى منزله**" احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ سن کر ان کو ڈانٹا اور کہا کہ اللہ سے معافی مانگو کیونکہ اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن سعید المقبری ہیں جو ضعیف ہے۔

دوسرا مسئلہ: دوسرا مسئلہ جمعہ فی القریٰ کا ہے۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فقہاء احناف کہتے ہیں۔ کہ صلاۃ الجمعہ کے لئے جو شرائط ہیں ان میں ایک شرط شہر اور مصر کا ہونا ہے۔ اس لئے جب مصر کا ہونا شرط ہے تو اس بناء پر احناف کے ہاں دیہاتوں میں جمعہ کی نماز جائز نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول مضطرب ہے۔ مگر کتاب الام میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مصر میں اور بڑے گاؤں میں جائز ہے چھوٹے دیہاتوں میں جائز نہیں۔ مگر عام شوافع شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے جمعہ فی القریٰ کا جواز نقل کرتے ہیں۔ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک ہے۔ دلیل آیت ہے "**اذا نودی للصلاة من یوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله**" یہاں مصر کی شرط نہیں لگائی گئی۔ احناف کہتے ہیں یہاں صراحۃً مصر کی شرط نہیں ہے مگر اشارۃ النص سے یہ شرط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آیت میں ہے "**وذروا البيع**" اور بیع وشراء شہر کی منڈی میں ہوتی ہے۔ دوسری دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ "**اول جمعة جمعت بعد جمعة جمعت فی مسجد النبی صلى الله عليه وسلم بجواثی**" اور جواثی کے متعلق مشہور ہے کہ "**هی قرية من قرى البحرين**" احناف کہتے ہیں۔ ① قریہ کا اطلاق دیہات پر بھی ہوتا ہے مگر بڑے شہر پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "**لولا انزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم**" یہاں قریتین سے مراد مکہ اور طائف ہیں جو شہر تھے۔ سورۃ یوسف میں ہے "**واسأل القرية التی کنا فيها**" یہاں اس قریہ سے مراد مصر ہے جو شہر ہے۔ اس لئے قریہ کا اطلاق شہر پر بھی ہوتا ہے ② دوسرا جواثی بحرین کی تجارتی منڈی اور فوجی چھاؤنی تھی۔ اس لئے یہ کوئی چھوٹا دیہات نہ تھا۔ ③ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیرۃ العرب تقریباً فتح ہو گیا تھا۔ مگر جمعہ صرف تین جگہوں پر پڑھا جاتا تھا۔ مدینہ، مکہ، اور جواثی میں۔ اگر ہر قریہ میں جائز ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریوں میں پڑھنے کا حکم دیتے۔ ④ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موقوف حدیث ہے "**لا جمعة ولا تشريق الا فی مصر جامع**" یہ سنداً بالکل صحیح ہے۔ مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہے۔ مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہونا خلل واقع نہیں کرتا کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ نہیں اور غیر اجتہادی مسائل میں صحابی کا قول مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ ⑤ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں تقریباً ۳۶ ہزار علاقے فتح ہوئے تھے مگر جمعہ صرف ۹۰۰ مقامات پر ہوتا تھا۔ اب ظاہر ہے ہر علاقے میں مسجد ہوگی۔ مگر جمعہ صرف ۹۰۰ مقامات پر ہوتا تھا۔

دوسری بات: مصر کی تعریف کیا ہے۔ تو احناف کے کئی اقوال ہیں۔ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ جس

گاؤں کی آبادی تقریباً ڈیڑھ ہزار ہو، اسکول ہو ہسپتال ہو، اور انسانی ضروریات کی چیزیں وہاں موجود ہوں۔ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ یہ ہے کہ کسی گاؤں میں جمعہ کی شرائط نہ ہوں لیکن لوگوں نے شروع کر دیا ہو تو اس کے بعد بند نہ کرنا چاہئے۔ اس سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔

باب ماجاء في الجلوس بين الخطبتين

مسئلہ: جلوس بین الخطبتین کے متعلق امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول فرضیت کا ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قرآن میں جہاں خطبے کا ذکر ہے۔ وہاں "فاسعوا الی ذکر اللّٰه" اس کو ذکر اللہ کہا ہے۔ اس لئے خطبہ میں دو چیزیں فرض ہوں گی۔ ایک یہ کہ جمعہ کا وقت ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہو۔ باقی جلوس وغیرہ خبر واحد سے ثابت ہے یہ سنت ہوگا۔ اگر اس کو بھی فرض مانیں۔ تو قرآن سے جو چیز جس درجہ میں ثابت ہوئی ہے۔ اسی درجہ میں وہ چیز خبر واحد سے کچھ ثابت کر کے قرآن پر زیادتی جائز نہیں۔

باب ماجاء في قصر الخطبة

پہلی بات: خطبے کے متعلق ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ خطبہ نماز سے لمبا ہونا چاہئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ طوال مفصل کی جو سورتیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سورت کے برابر ہونا چاہئے۔ اس سے زیادہ اگر ہو تو وہ سنت کے خلاف ہوگا۔

دوسری بات: خطبہ کن چیزوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ تو احناف کہتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ اس میں ذکر اللہ ہو، درود ہو، وعظ ہو بشارت و انذار ہو، لوگوں کو تقویٰ کی وصیت ہو، اور ایک دو آیت ہوں۔ یہ سب مسنون و مستحب ہے۔ باقی فرض چند الفاظ سے ادا ہو جاتا ہے۔

باب في استقبال الامام اذا خطب

مسئلہ: امام جب خطبہ دے تو لوگوں کا چہرہ امام کی طرف ہونا چاہئے یہ مستحب ہے مگر ان کے لئے جن تک خطبہ کی آواز پہنچ رہی ہو لیکن جن تک آواز نہ پہنچے اور وہ خطبہ سمجھ نہ سکیں تو ان کے لئے امام کی طرف متوجہ ہونا مستحب نہیں۔ اس لئے قبلہ رخ بیٹھیں۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ آج کل قبلہ رخ بیٹھنا چاہئے۔ کیونکہ استقبال امام کا مقصد یہ تھا کہ اس کی بات سنے اور سمجھے لیکن آج کل لوگ عربی سمجھتے نہیں اس لئے استقبال امام کا کوئی فائدہ نہیں۔

باب ماجاء في الركعتين اذا جاء الرجل والامام يخطب

مسئلہ: یہاں ایک اختلافی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ امام جمعہ کے دن خطبہ میں مشغول ہو اور کوئی آئے اس آنے والے کے لئے اس وقت تحیۃ المسجد جائز ہے یا نہیں ① امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں ② امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے۔ یہ حضرات باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ نبی ﷺ نے اس آدمی کو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا جس نے رکعتیں نہیں پڑھی تھیں۔

قول اول والوں کی دلیل ① صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن نبی ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اعرابی آیا اور کہا کہ ہمارے اموال ہلاک ہو گئے۔ عیال بھوکے ہو گئے۔ اس لئے بارش کی دعا کریں۔ آپ ﷺ نے دعا کی یہاں صراحت ہے کہ وہ آدمی خطبے کے دوران داخل ہوا۔ مگر اس کو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ دلیل ② عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ دے رہے تھے۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے۔ عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "اية ساعة هذه" انہوں نے کہا وضوء کیا اور آ گیا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکیر کی کہ دیر بھی کی اور صرف وضوء پر اکتفاء کیا۔ وہاں نہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکعتیں پڑھیں اور نہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھنے کا حکم دیا۔

دلیل ③ معجم طبرانی کی حدیث ہے کہ "اذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام" ان احادیث کی وجہ سے احناف اور مالکیہ ان رکعتین کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ باقی باب کی حدیث کا مطلب احناف ایک تو یہ ذکر کرتے ہیں۔ کہ وہ آدمی ایسی حالت میں تھا۔ کہ پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ اور صدقہ کا مستحق تھا۔ تو نبی ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کی حالت دیکھ کر مدد کریں۔ پھر آپ نے اس کے لئے چندے اپیل کی۔ دوسری تاویل یہ کرتے ہیں کہ دارقطنی کی حدیث میں ہے کہ جب اس کو رکعتیں کا حکم دیا تو اس میں یہ الفاظ ہیں۔ "ثم سكت النبی ﷺ عن الخطبة" تو اس کی حالت ظاہر کرنے کے لئے اس کی رعایت کی اور خطبہ دینا روک دیا۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ سنن نسائی کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ منبر پر بیٹھے تھے اور ابھی تک خطبہ شروع نہ ہوا تھا کہ یہ آدمی آیا۔ آپ نے اس کی حالت دیکھ لی تو خطبہ روک دیا یعنی شروع نہیں کیا۔ باقی سنن نسائی اور دارقطنی کی حدیث میں تعارض بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ خطبہ شروع نہ کیا تھا۔ اور جہاں فرمایا کہ خطبہ سے خاموش ہوگئے۔ مطلب یہ کہ خطبہ شروع کرنے سے خاموش ہوگئے۔

باب ماجاء فی کراهية الكلام والامام يخطب

خطبہ کے دوران کلام کرنا ناجائز اور مکروہ ہے۔ نبی ﷺ نے کلام کو جمعہ کے ثواب کے لغو ہونے کا سبب بتایا ہے۔ باقی سلام کا جواب اور چھینک کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے۔ اور احناف، اوزعی، شافعیہ اور مالکیہ کے ہاں جائز نہیں۔

باب ماجاء فی کراهية الاحتباء

خطبہ کے وقت احتباء کی حالت میں بیٹھنا ممنوع ہے۔ اس کی ایک علت بعض نے یہ لکھی ہے کہ یہ جالب نوم ہے۔ بعض نے علت لکھی ہے کہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کشف عورت ہو جائے۔

باب فی الصلاة قبل الجمعة وبعدها

مسئلہ: احناف کے ہاں جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت ہیں۔ یہ کسی مرفوع حدیث میں نہیں ہاں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کا ثبوت ہے۔ جمعہ کے بعد احناف کے ہاں چھ رکعات ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک قول چار کا ہے۔ مگر ان کا دوسرا قول ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرح چھ رکعات کا ہے جس پر فتویٰ ہے۔ چاہے پہلے دو رکعات پڑھے اور اگر چاہے تو پہلے چار پڑھے۔ دونوں کی اجازت ہے۔

جمعہ سے پہلے چار کی دلیل ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ اور بعد میں چھ رکعات کی دلیل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ انہوں نے پہلے دو رکعات پھر چار رکعات پڑھنے کا حکم دیا۔

باب فیمن یدرک الجمعة رکعة

مسئلہ: یہاں یہ مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جمعہ کی نماز میں کوئی ابتداء سے شریک نہ ہو سکا بلکہ مسبوق رہا تو اس کو کس وقت مدرک جمعہ شمار کیا جائے گا۔ اس مسئلے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ ① امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق

رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری ابن المبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ کسی کو جمعہ کی ایک رکعت مل گئی تو وہ مدرک جمعہ شمار ہوگا۔ لیکن اگر دوسری رکعت نہ ملی تو وہ مدرک جمعہ شمار نہ ہوگا۔ ② احناف کے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے اگر اس نے شرکت کی تو یہ مدرک جمعہ ہوگا۔

قول اول والوں کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ "من ادرک عن الصلاة رکعة فقد ادرک الصلاة" احناف اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ نبی ﷺ نے جو فرمایا کہ جس کو ایک رکعت ملی اس کو نماز مل گئی۔ لیکن اگر کسی کو ایک رکعت سے کم ملی تو اس کا کیا حکم ہے۔ حدیث اس سے ساکت ہے۔ اور دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تشہد سے پہلے کوئی امام کے ساتھ مل گیا۔ اس نے نماز پالی اس لئے ان احادیث کی وجہ سے یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ اگر رکعت سے کم ملا۔ اس نے بھی گویا نماز پالی۔

باب ما جاء فی السفر یوم الجمعة

جمعہ کے دن سفر کرنا بعض ائمہ کا قول یہ ہے کہ جائز نہیں۔ کیونکہ جمعہ فوت ہونے کا خطرہ ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ زوال سے پہلے سفر کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ لیکن زوال کے بعد سفر کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ زوال کے بعد جمعہ کا وقت شروع ہوگیا۔ اس پر جمعہ واجب ہوگیا۔ اب بغیر پڑھے سفر کرنا جائز نہیں۔ البتہ زوال سے پہلے جاسکتا ہے۔ اور نبی ﷺ نے کئی مرتبہ صحابہ کے سرایا کو جمعہ کے دن زوال سے پہلے بھیجا تھا۔ امام مالک اور اوزاعی سے ایک قول جواز کا بھی ہے۔

ابواب العیدین

عیدین تثنیہ ہے عید کی اس کی جمع اعیاد آتی ہے۔ یہ عاد یعود سے ہے۔ اس کو تفاؤلاً عید کہتے ہیں تاکہ بار بار لوٹ کر آئے۔ عید کے مسائل ابواب میں آجائیں گے۔ اکثر مسائل مستحب اور مسنون ہے۔ اس لئے وہ مختلف فیہا نہیں۔ البتہ تکبیرات عیدین میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ اس کے لئے ترمذی نے مستقل باب باندھا ہے۔

باب فی المشی یوم العیدین

عیدین کے لئے چلنا مسنون اور مستحب ہے۔ بشرطیکہ راستہ زیادہ نہ ہو کہ عیدگاہ میں چل کر جانا مشکل ہو جائے لیکن عیدگاہ قریب ہو تو پیدل چل کر جانا بہتر ہے، اگرچہ سوار ہو کر جانا بھی جائز ہے۔

و ان تأکل شیئا قبل ان تخرج الخ عید الفطر کے اندر مسنون یہ ہے کہ کچھ کھا کر نکلے۔ لیکن عید الاضحیٰ میں بغیر کھائے نکلے۔

عن علی قال من السنة: صحابی کا من السنة کہنا مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور سنت سے سنت نبوی ﷺ مراد ہوتی ہے۔

باب فی صلاة العید قبل الخطبة

مسئلہ: عید کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔ جب کہ جمعے کا خطبہ پہلے ہوتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عید کا خطبہ نماز سے پہلے شروع کردیا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں مروان چونکہ خطبوں میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے اس لئے لوگوں نے ان کا خطبہ سننا چھوڑ دیا اور نماز پڑھ کر چلے جاتے اس لئے اس نے عید کا خطبہ نماز سے پہلے کردیا تاکہ لوگ جا نہ سکیں۔

اب مسنون تو یہ ہے کہ نماز کے بعد ہو لیکن اگر کسی نے پہلے دے دیا تو احناف کے ہاں خطبہ ہو جائے گا البتہ گنہگار ہوگا۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر نماز عید سے پہلے خطبہ دیا تو خطبہ ہوگا ہی نہیں۔

باب فی التکبیر فی العیدین

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ عید کی نماز میں زائد تکبیرات کتنی ہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ ① امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عیدین میں زائد تکبیرات بارہ ہیں۔ ② امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے احناف کا مذہب جو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ تکبیرات عیدین چھ ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے، تین دوسری رکعت میں قرات کے بعد رکوع سے پہلے۔ جب کہ قول اول والوں کے ہاں دونوں رکعتوں میں بعد القرأت ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ تکبیرات زوائد کے بارے میں تین قسم کی روایات ہیں۔ ۶، ۹، ۱۲۔ احناف کہتے ہیں کہ ابتداء بارہ تھیں پھر کم ہو کر نو ہو گئیں۔ پھر کم ہو کر چھ رہ گئیں۔ مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں اختلاف جواز اور عدم جواز کا نہیں۔ بلکہ افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے۔ احناف کے ہاں بارہ بھی جائز ہیں۔ البتہ چونکہ چھ عدد اقل ہے اور متیقن ہے۔ اس لئے احناف نے اس کو ترجیح دی ہے۔

باب لاصلاۃ قبل العیدین ولا بعد ھا

عیدین کے دن عید گاہ میں نہ نماز عید سے پہلے نوافل جائز ہیں اور نہ بعد میں جائز ہیں۔ لیکن گھر میں پڑھنا چاہے تو عیدین سے پہلے نہیں پڑھ سکتا البتہ بعد میں پڑھ سکتا ہے۔ بعض حضرات کے ہاں عیدین سے پہلے بھی جائز ہیں اور بعد میں بھی، لیکن گھر میں نہ کہ عید گاہ میں۔

باب فی خروج النساء فی العیدین

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ اس لئے خواتین کو عید گاہ جانے کی ترغیب دی۔ یہاں مقصود نماز عید پڑھنا نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی کثرت اور شوکت کا اظہار تھا۔ اس لئے ان عورتوں کو بھی نکلنے کی ترغیب دی گئی۔ جن پر نماز ہی نہیں۔ یعنی حائضہ اور نفساء۔ اس لئے آج کل نکلنا جائز نہ ہوگا کیونکہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لئے عام نمازوں کی طرح اب ان کے لئے نکلنے کی اجازت نہ ہوگی۔

باب ماجاء فی خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی العید فی الطریق و رجوعه الخ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز کے لئے ایک راستے سے جاتے تھے۔ اور واپسی پر دوسرے راستے سے آتے تھے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ آثار گواہی دیں۔ دوسرا مسلمانوں کی شوکت کا اظہار مقصود تھا۔ تیسرا یہ کہ فقراء پر تصدق کرتے تھے۔ اس لئے مختلف راستوں سے جاتے تاکہ تمام اطراف کے فقراء پر صدقہ کر سکیں۔

ابواب السفر

باب التقصير في السفر

یہاں ایک اختلافی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ سفر میں چار رکعتی نمازوں میں قصر کرنا رخصت ہے یا عزیمت بالفاظ دیگر قصر ضروری ہے یا قصر اور اتمام دونوں کر سکتا ہے ① امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ قصر کرنا ضروری ہے اتمام کرنا جائز نہیں۔اور اگر کسی نے اتمام کر دیا اور دو رکعت کے بعد قعدہ نہ کیا تو اس کی نماز بالکل نہ ہوگی۔ ② امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ایک قول میں امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک روایت میں امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ قصر اور اتمام دونوں کر سکتا ہے۔ان حضرات کی دلیل وہ حدیث ہے۔جس میں نبی ﷺ سے قصر کے متعلق پوچھا گیا۔آپ نے فرمایا "صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته" اس کو صدقہ کہا گیا۔اس لئے اس کے کرنے کیا نہ کرنے میں اختیار ہے۔دوسری دلیل یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی ﷺ کی وفات کے بعد جب سفر کرتی تو اتمام کرتی تھیں۔تیسری دلیل یہ ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خلافت کے آخری دور میں جب سفر کرتے تو اتمام کرتے تھے۔معلوم ہوا اتمام جائز ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی باب والی حدیث ہے۔فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ سفر کیا۔پھر ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ،عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ساتھ سفر کیا۔یہ حضرات ظہر اور عصر کی نماز دو دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔معلوم ہوا نبی ﷺ نے اپنی مدت عمر میں کبھی اتمام نہیں کیا۔اسی طرح ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اتمام نہیں کیا۔ان حضرات کا اتمام نہ کرنا دلیل ہے اتما کے عدم جواز پر۔کیونکہ اتمام جائز ہوتا تو یہ حضرات ایک دفعہ بیان جواز کے لئے اتمام کرتے۔

احناف کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نماز ابتداءً دو دو رکعت فرض ہوئی۔پھر حضر کی نماز کو چار رکعت کر دیا۔اور سفر کی نماز اسی طرح دو دو رکعت باقی رہی۔معلوم ہوا سفر کی نماز فرض ہی دو رکعت ہوئی ہے۔اب حضر میں مثلاً عصر کی نماز چار رکعات تھی۔اس پر اضافہ جائز نہیں اسی طرح سفر کی نماز دو رکعت ہے اس پر اضافہ جائز نہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصر کا حکم دیا ہے کہ قصر کرو۔اگر اتمام جائز ہوتا تو اتمام کا ذکر ہوتا۔اب مقام بیان میں عدم ذکر اس چیز کے عدم کی دلیل ہے ائمہ ثلاثہ کی دلیل اول کا جواب یہ ہے کہ "فاقبلوا صدقته" میں امر کا صیغہ لایا ہے۔اس لئے قصر لازم ہے۔دوسرا یہ اللہ کی طرف سے صدقہ ہے۔عام آدمیوں کا صدقہ نہیں۔اللہ کے صدقے میں رد کا احتمال نہیں۔اور جس میں رد کا احتمال نہ ہو تو اس کا قبول کرنا لازم ہوتا ہے۔باقی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح تاویل کرتی تھیں۔بعض روایات میں ہے کہ وہ یہ تاویل کرتی تھی کہ میں ام المؤمنین ہوں اس لئے جہاں جاؤں میرا اپنا گھر ہوگا۔احناف کے فقہاء نے اس سے استدلال کو رد کیا ہے۔ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس تاویل کی بنا اس پر ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ام المؤمنین ہیں۔اور نبی ﷺ تو ابو المؤمنین تھے جب انہوں نے قصر کیا تو ام المؤمنین پر بھی قصر ہوگا۔نبی ﷺ نے ابو المؤمنین ہونے کی وجہ سے اتمام نہیں کیا تو عائشہ کس طرح کر سکتی ہے۔

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاویل کیا تھی اس میں مختلف روایات ہیں۔ ① انہوں نے مکہ میں گھر خریدا اور شادی کی تھی ② طائف میں

انہوں نے زمینیں خریدی تھیں ③ حج کے سفر میں ایک مرتبہ دور دراز کے لوگ آئے تھے۔انہوں نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دو رکعت پڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھے کہ شاید نماز دو رکعت ہی ہے۔اسلئے ہم بھی دو پڑھیں گے۔عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے تعلیم کے لئے اقامت کی نیت کی اور اتمام کیا۔

باب ماجاء فی کم تقصر الصلاۃ

پہلی بات: اس باب میں دو احتمال ہیں۔ ① مراد اس سے مدت سفر ہے کہ آدمی کسی مقام پر کتنے دن ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مسافر رہے گا۔اور کتنی مدت ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مقیم شمار ہوگا۔ ② مقدار سفر مراد ہے کہ کتنی مقدار دور ہو تو قصر کرے گا۔دونوں مسئلوں میں اختلاف ہے۔

دوسری بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مسئلے کے متعلق ائمہ کے اقوال نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقصود بھی احتمال اول ہے۔وہ اختلاف یہ ہے کہ ① سفیان ثوری، امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ کسی جگہ پندرہ دن ٹہرنے یا اس سے زائد ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مقیم شمار ہوگا۔اس سے کم ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مسافر ہی رہے گا۔ ② امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بارہ یا زائد دن ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مقیم شمار ہوگا۔ ③ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں چار دن یا زائد ٹھہرنے کا ارادہ کرلے تو مقیم ہوگا۔اس سے کم ہو تو مسافر شمار ہوگا۔ ④ امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انیس یا زائد دن ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو مقیم شمار ہوگا ورنہ مسافر شمار ہوگا۔نبی ﷺ سے مختلف اسفار میں مختلف دن ٹھہرنے کا ذکر ہے ۴۰،۱۲،۱۵،۱۹ دن سب منقول ہیں لیکن نبی ﷺ سے صراحت سے یہ ثابت نہیں کہ کتنے دن ٹھہرے تو مقیم شمار ہوگا۔اس لئے فقہاء میں اختلاف ہوا۔کسی نے ایک عمل کو بنیاد بنایا اور کسی نے دوسرے عمل کو لے لیا ابن عمرؓ کی روایت جس میں پندرہ دن کا ذکر ہے۔انیس دن کی روایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، چار کی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، اور بارہ کی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

تیسری بات: ایک آدمی کسی جگہ کئی سال سے رکا ہوا ہے مگر ارادہ اقامت کا نہیں ہے بلکہ آج کل کر رہا ہے تو یہ مسافر ہی شمار ہوگا، مقیم شمار نہ ہوگا۔اختلاف تب ہے جب کسی جگہ ٹھہرنے کا ارادہ کرے۔

چوتھی بات: قصر کی مقدار سفر کتنی ہے۔اس میں کچھ اختلاف ہے۔مگر معارف السنن میں ہے کہ مآل کے اعتبار سے سب کے ہاں ۴۸ میل ہے۔احناف کا قول یہ ہے کہ تین دن یا زائد کا سفر ہو تو قصر کرسکتا ہے۔اس سے کم ہو تو نہیں کرسکتا۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے برید کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔اور وہ ۴۸ میل بنتا ہے۔اور وہ ۴۸ میل سے شرعی میل مراد نہیں بلکہ انگریزی میل مراد ہے۔اور احناف نے تین دن کا سفر مراد لیا ہے۔اس کی مقدار بھی ۴۸ میل ہی بنتی ہے۔

باب ماجاء فی صلاۃ الا ستسقاء

پہلی بات: اس کے متعلق اتنی بات میں اختلاف ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں استسقاء کے لئے نماز شرط نہیں۔اگر چہ جواز ہے۔دلیل آیت ہے ﴿فقلت استغفروا ربکم انه کان غفارًا یرسل السماء علیکم مدرارًا﴾ یہاں صرف استغفار کا ذکر ہے نماز کا ذکر نہیں۔اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ اعرابی آیا اور آپ ﷺ سے کہا کہ مال وعیال ہلاک ہوگئے۔آپ نے خطبے کے دوران دعا کی معلوم ہوا نماز شرط نہیں۔باقی مذکورہ باب کی حدیث امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف نہیں۔کیونکہ ان کے خلاف تب ہوتی

جب وہ اس کا انکار کرتے۔ لیکن امام صاحب کے ہاں نماز بھی جائز ہے۔ البتہ نماز شرط نہیں، فقط دعا کرنا بھی کفایت کر جائے گا۔

دوسری بات: نماز استسقاء ہو یا صلاۃ کسوف ہو۔ یہ دن کی نمازیں ہیں۔ تو ان میں امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرأت بالسر ہے۔ صاحبین اور دوسرے بعض حضرات کے ہاں قرات جھراً ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

تیسری بات: تحویل رداء بھی امام اعظم کے ہاں ضروری نہیں۔ بلکہ صرف علامت کے طور پر ہے۔ مقنع بکفیه ای رافع یدیه۔

باب فی صلاة الکسوف و کیف القرأة فی الکسوف

پہلی بات: یہاں کسوف الشمس کا ذکر ہے۔ چاند کو گرہن لگے اس کو خسوف کہتے ہیں اور سورج کو گرہن لگے تو اس کو کسوف کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کسوف اور خسوف میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔

دوسری بات: مسئلہ یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسوف الشمس کے لئے جماعت کے ساتھ نماز ہے مگر چاند کو گرہن لگنے کی صورت میں جماعت کے ساتھ نماز نہیں بلکہ ہر آدمی انفراداً نماز پڑھے۔ جمہور کہتے ہیں کہ سورج کی طرح چاند کو گرہن لگنے کی صورت میں بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے گی۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دلیل یہ ہے کہ چاند کو گرہن لگنے کی صورت میں نبی ﷺ سے جماعت کے ساتھ نماز ثابت نہیں البتہ سورج گرہن کے وقت جماعت سے نماز ثابت ہے۔

تیسری بات: نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ۱۰ھ میں ایک دفعہ کسوف الشمس کا واقعہ پیش آیا۔ حضور ﷺ کی نماز کی کیفیت میں کافی اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور بعض فقہاء کے ہاں دو رکعت نماز پڑھی جائے گی عام نمازوں کی طرح یعنی قرأت ہوگی۔ سورت فاتحہ ہوگی۔ پہلی رکعت میں سورت بقرہ کے برابر قرأت ہوگی۔ دوسری رکعت میں سورت ال عمران کی بقدر قرأت ہوگی۔ اور ہر رکعت میں ایک رکوع ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسوف کی نماز میں ہر رکعت میں دو رکوع ہوں گے۔ امام فاتحہ اور قرأت طویل کرے۔ پھر طویل رکوع کرے۔ پھر اٹھ کر فاتحہ پڑھے گا پھر طویل قرأت کرے گا پھر رکوع کرے گا اسی طرح دوسری رکعت میں فاتحہ اور سورت پڑھے گا۔ پھر رکوع کرے گا پھر فاتحہ اور سورت پڑھے گا پھر رکوع کرے گا۔

ان کا استدلال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں۔ کہ نبی ﷺ نے چار رکوع کئے چار سجدے کئے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کی دلیل وہ حدیث ہے جو صلاۃ کسوف کی روایت جس میں تعدد رکوع کا ذکر نہیں۔ دوسرا اس کو بھی عام نمازوں پر قیاس کیا جائے گا۔ عام نمازوں میں چاہے فرائض ہوں یا نوافل یا واجبات کسی میں ایک رکعت میں دو رکوع نہیں۔ باب کی حدیث کا احناف ایک الزامی جواب دیتے ہیں کہ بعض روایت میں تین رکوع کا ذکر ہے بعض میں میں چار کا ذکر ہے۔ اب اگر زائد رکوع والی روایت کو لینا ہے تو چار رکوع والی روایت کو لو۔ لیکن تم تین یا چار رکوع والی روایات کو نہیں لیتے ہو۔ جب کہ وہ سنداً صحیح ہیں۔ اب تین یا چار رکوع والی روایات کا جواب جو تم دوگے۔ وہی جواب ہم دو رکوع والی روایت کا دیں گے۔

دوسری بات بعض نے یہ کی ہے کہ نبی ﷺ نے صلاۃ کسوف میں بہت لمبا رکوع کیا۔ بعض صحابہ تھک جاتے۔ وہ اٹھ جاتے جب دیکھتے کہ نبی ﷺ رکوع میں ہیں تو پھر نیچے ہو جاتے۔ پیچھے والوں نے اس کو تعدد رکوع سمجھ لیا۔

علامہ کاسانی کے حوالے سے اسی طرح شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے معارف السنن میں منقول ہے کہ نبی ﷺ سے صلاۃ کسوف میں تین یا چار رکوع منقول ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی ﷺ پر خاص کیفیت طاری تھی اس نماز میں اور باتیں بھی آپ ﷺ سے منقول ہیں۔ مثلاً آپ آگے بڑھے پیچھے ہٹے بعد میں فرمایا مجھے جنت اور جہنم دکھائی گئی۔ اس

لئے ان پر خاص کیفیت طاری تھی۔ جب نماز پڑھی تو خطبہ دیا فرمایا کہ جب تمہیں یہ صورت پیش آ جائے تو "صلوا کأحدث صلاتکم صلیتموھا" اور اس وقت فجر کی نماز پڑھی تھی۔ اب نبی ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ "صلوا کما رایتمونی اصلی" معلوم ہوا آپ نے جو نماز پڑھی وہ خاص کیفیت کی وجہ سے پڑھی۔ آپ نے امت کو اس خاص کیفیت کے ساتھ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

چوتھی بات: اس میں قرأت سراً ہوگی یا جہراً ہوگی؟ ① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرأت سراً ہوگی۔ کیونکہ دن کی نمازوں میں سراً قرأت ہوتی ہے۔ دوسرا صحابہ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی " لانسمع له صوتاً"

② امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جہراً قرأت ہوگی۔ ایک تو اس لئے کہ نبی ﷺ سے منقول ہے کہ قریب کے صحابہ سے جہر منقول ہے۔ دسرا اس کو دن کے ان نمازوں پر قیاس کریں گے۔ جو کبھی کبھی ہوتی ہیں۔ جیسے جمعہ اور عیدین کی نماز جو کبھی کبھی ہوتی ہیں۔ ان میں قرأت جہراً ہوتی ہے اور مفتیٰ بہ احناف کے ہاں دوسرا قول ہے۔ کیونکہ اس میں قرأت لمبی ہوتی ہے۔ اب اگر جہراً قرأت نہ ہوگی تو مقتدی اکتا جائیں گے۔ لیکن اگر جہراً پڑھے گا تو مقتدی قرأت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اس لئے زیادہ تنگ نہ آئیں گے۔ باقی روایت میں جو ہے کہ "لا نسمع له صوتا" اسکا جواب یہ ہے کہ جو صحابہ دور تھے ان تک آواز نہ پہنچ سکی اس لئے انہوں نے " لا نسمع له صوتا" کہہ دیا۔ باقی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جہراً کی روایت منقول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صفوف النساء میں نہ تھی بلکہ اپنے حجرے میں تھیں اس لئے انہوں نے قرأت سن لی۔

باب ماجاء فی صلاۃ الخوف

پہلی بات: صلاۃ الخوف میں ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک وہ مخصوص طریقہ ہے جو یہاں منقول ہے۔ یہ نبی ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے "اذا کنت فیھم الخ " اور آج نبی ﷺ نہیں۔ اس لئے دو الگ الگ جماعتیں ہوں الگ امام ہوں۔ مگر جمہور امت کے ہاں جس کیفیت کے ساتھ نبی ﷺ کے زمانے میں پڑھی گئی ہے آج بھی پڑھی جائے گی۔

دوسری بات: احادیث میں صلاۃ الخوف کے متعدد طریقے منقول ہیں۔ سب سے زیادہ سنن ابی داؤد کی روایت میں مذکور ہیں دو طریقے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک کو احناف نے اختیار کیا ہے اور ایک کو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس طریقے کو لیا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ مجاہدین دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں۔ ایک دشمن کے سامنے رہے۔ دوسرا امام کے ساتھ کھڑا رہے۔ امام ایک رکعت پڑھائے اور انتظار کرے۔ اب یہ لوگ دوسری رکعت پڑھ کر سلام پھیر کر دشمن کے سامنے چلے جائیں۔ دوسرا طائفہ آ جائے امام ایک رکعت ان کو پڑھائے اور سلام پھیر لے۔ دوسری جماعت دسری رکعت پڑھ کر چلے جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ امام طائفہ اولیٰ کو ایک رکعت پڑھائے یہ چلا جائے امام کھڑا رہے۔ دوسرا طائفہ آئے امام اس کو ایک رکعت پڑھا لے۔ اور بیٹھا رہے۔ یہ لوگ ایک رکعت پڑھ کر امام کے ساتھ سلام پھیر لیں۔ پھر پہلے والے آئیں اور اپنی رکعت پوری کر لیا۔

تیسرا طریقہ جو احناف نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام پہلی جماعت کو ایک رکعت پڑھائے۔ یہ طائفہ دشمن کے سامنے چلا جائے طائفہ ثانیہ آئے اور امام ان کو ایک رکعت پڑھائے، یہ دشمن کے سامنے جائے اور طائفہ اولیٰ آ کر اپنی ایک رکعت پورے کر کے چلا جائے۔ پھر دوسرا طائفہ آ کر اپنی رکعت پڑھ لے اور چلا جائے۔ جمہور کہتے ہیں کہ سارے طریقے جائز ہیں۔ اختلاف صرف افضیلت میں ہے۔ احناف نے تیسرے طریقے کو پسند کیا ہے۔ کیونکہ پہلا طریقہ جو شوافع نے لیا ہے۔ اس میں مقتدی کا امام سے پہلے فارغ ہونا

لازم آتا ہے۔ اوراس کی نظیر کہیں نہیں کہ امام سے مقتدی پہلے فارغ ہوا ہو۔ جب کہ احناف نے جوطریقہ اختیار کیا ہے۔ اس میں مقتدی کا امام سے پہلے فارغ ہونا لازم نہیں آتا۔

باب ماجاء فی سجود القرآن

پہلی بات: سجود القرآن کے متعلق ایک اختلاف وجوب اور عدم وجوب کا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں واجب ہے۔ جمہور کے ہاں سنت ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قران میں جہاں سجدوں کا ذکر ہے وہاں کسی جگہ امر کا صیغہ ہے۔ امر وجوب کے لئے آتا ہے کہیں اس بات کا ذکر ہے کہ پہلی قوموں کو سجدے کا حکم ملا، انہوں نے سجدہ نہیں کیا، اب ان کی مخالفت ہم پر واجب ہے۔ یا انبیاء سابقین کے سجدے کا ذکر ہے۔ اور انبیاء کی اقتداء ہم پر واجب ہے کیونکہ " **فبھدا ھم اقتدہ** "۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں آیت پڑھی اور سجدہ نہیں کیا۔ شوافع وغیرہ اس سے عدم وجوب پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر احناف اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ نے فوراً سجدہ نہیں کیا اور علی الفور ہمارے ہاں بھی واجب نہیں۔ اس لئے یہ احادیث ہمارے خلاف نہیں۔ ہمارے خلاف تب ہوتی جب ہم وجوب علی الفور کے قائل ہوتے۔ باقی ان روایات میں اس بات کا ذکر کسی جگہ نہیں۔ کہ آپ نے یا صحابہ نے بھی بعد میں سجدہ نہ کیا ہو۔

دوسری بات: مفصلات میں سجدہ ہے یا نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں جمہور کے ہاں ہے۔

تیسری بات: سورہ حج میں کتنے سجدے ہیں۔ احناف کے ہاں ایک سجدہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو سجدے ہیں۔ کماسیأتی۔

باب ماجاء فی السجدۃ فی النجم

پہلی بات: سورت النجم کے سجدے میں اختلاف ہے کہ اس میں سجدہ ہے یا نہیں؟ ① امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مفصل کی سورتوں میں سجدہ نہیں۔ اور نجم مفصل سورتوں میں سے ہے اس لئے اس میں سجدہ نہیں۔ ② جمہور یعنی اسحٰق، ابن المبارک، سفیان ثوری، ائمہ ثلاثہ وغیرہ کے ہاں سجدہ ہے۔ باب ثانی کی حدیث مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل ہے۔ اور باب اول کی حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ جمہور باب ثانی کی حدیث میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس وقت فوراً سجدہ نہیں کیا عذر کی وجہ سے۔ ممکن ہے باوضوء نہ ہو۔ اور جمہور کے ہاں ویسے بھی علی الفور سجدہ نہیں ہے ممکن ہے بعد میں کیا ہو۔

دوسری بات: پہلے باب کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ، مسلمان، مشرکین، جنات، انسان سب نے سجدہ کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک مخلوط مجلس تھی۔ نبی کریم ﷺ نے سورت النجم کی تلاوت کی۔ اس میں آپ کی زبان پر جاری ہوا "**تلک الغرانیق العلی و ان شفاعتھن لترتجی**"، مشرکین سمجھے کہ آپ ﷺ نے ہمارے الہٰ کی تعریف کی۔ اس لئے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ مفسرین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ مگر عام محدثین اور ابن حجر وغیرہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پورا واقعہ جھوٹا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ نبی ﷺ نے مکہ کے لوگوں کو دعوت دی ان کے رؤسا نہ تھے۔ اس لئے عام لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہوئے کچھ مسلمان ہوئے کچھ نہ ہوئے۔ اس لئے جب وہ متاثر ہوئے تو انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ لیکن جب ان کے رؤسا آئے تو انہوں نے دوبارہ ان کو گمراہ کر دیا۔ اور اپنی طرف پھیر لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ "**تلک الغرانیق العلی الخ**" یہ آیات تھیں۔ مگر اس سے فرشتے مراد تھے۔ کفار مکہ ان آیات کا مصداق اپنے الہٰ پھر یہ آیات منسوخ ہو گئیں۔

وانما ترک النبی ﷺ السجود الخ بعض کہتے ہیں کہ اگر قاری سجدہ نہ کرے تو سامع پر بھی سجدہ نہ ہوگا۔ یہاں چونکہ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سجدہ نہ کیا تھا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے سجدہ نہیں کیا۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض حضرات کا مذہب ہے۔ جمہور کے ہاں قاری سجدہ کرے یا نہ کرے سامع پر سجدہ واجب ہے۔

باب ماجاء فی السجدة فی ص

مسئلہ:۔ سورت ''ص'' کے سجدے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سجدہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ص میں سجدہ ضروری نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو قول ہیں۔ ایک احناف کی طرح دوسرا شوافع کی طرح۔

احناف کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس میں سجدہ کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ''سجدھا داؤد توبة ونسجد ھا شکرًا'' اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اس میں سجدہ ہے۔ صحابہ میں سے ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سجدے کا حکم منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو قول ہے کہ سورۃ ص کا سجدہ لازم نہیں یہ ان کی رائے ہے۔ اس کے خلاف حدیث بھی موجود ہے اور ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال بھی موجود ہیں۔

باب ماجاء فی السجدة فی الحج

اختلاف:۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری کے ہاں سورۃ الحج میں سجدہ صرف ایک ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد اور اسحاق کے ہاں دو سجدے ہیں شوافع کا مستدل باب کی حدیث ہے کہ سورۃ الحج کو فضیلت حاصل ہے اس لئے کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ معارف السنن میں ہے کہ احناف کے ہاں صحیح یہ ہے کہ سورۃ الحج کے دو سجدے ہیں۔ لیکن دوسرا سجدہ نماز میں ادا نہ کیا جائے گا۔ البتہ خارج صلاۃ پڑھے تو سجدہ کرے گا۔ مولانا شبیر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول معارف السنن میں ہے کہ سورۃ الحج کا سجدہ صلاتیہ نہیں خارج صلاۃ ادا کیا جائے گا۔ ھذا حدیث لیس اسنادہ بالقوی الخ یہ حدیث ضعیف ہے اس میں دو راوی ضعیف ہیں۔ ① عبداللہ بن لہیعہ ② مشرح بن ہاعان۔

باب ماذکر من فاته حزبه من اللیل فقضاهُ بالنهار

مسئلہ:۔ کسی کا رات کو وظیفہ تھا۔ مثلاً وہ رات کو اٹھ کر آٹھ رکعت پڑھتا تھا۔ مگر کسی رات کو عذر کی وجہ سے رہ جائے۔ تو وہ اس کو دن میں پڑھے۔ اس کو وہی ثواب ملے گا جو رات کو پڑھنے میں ملتا ہے۔

فقضاہ بالنہار:۔ قضاء کا یہ معنیٰ نہیں کہ اس کی قضاء واجب ہے۔ بلکہ سنت کی قضاء سنت اور نفل کی قضاء نفل ہے۔ باقی دن کو پڑھنے کی ترغیب اس لئے دی تا کہ دوام باقی رہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ کوئی عمل کرتے تو اس میں دوام اختیار کرتے۔ اسی طرح فرمایا بہترین عمل وہ ہے جس پر دوام کیا جائے۔

باب ماجاء فی الذی یصلی الفریضة ثم یؤم الناس بعد ذلک

مسئلہ:۔ اس باب میں اقتداء المفترض خلف المتنفل کا مسئلہ مذکور ہے۔ اس مسئلے میں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مفترض کی اقتداء متنفل کے پیچھے جائز نہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام اور مقتدی کی نیت برابر ہو یا

امام کی نیت قوی ہے پھر تو اقتداء جائز ہے۔ مگر مقتدی کی نیت قوی ہو۔ یا امام اور مقتدی کی نیت الگ الگ ہو تو اقتداء جائز نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اقتداء المفترض خلف المتنفل جائز ہے۔ ان کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے پھر وہی نماز جا کر قوم کو پڑھاتے تھے۔ اب فرض پڑھ چکے ہوتے تھے اور جا کر قوم کی امامت نفل کی نیت سے کرتے تھے۔

احناف کی دلیل ہے "الامام ضامن" یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن اور شامل ہوتی ہے۔ یہ تب ہو سکتا ہے کہ جب امام کی نماز مقتدی کی نماز کے برابر ہو یا اس سے قوی تر ہو۔ لیکن اگر اس سے کم ہو تو متضمن نہ ہوگی۔ احناف باب کی حدیث کی تاویلات کرتے ہیں ① معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب پڑھتے پھر بیٹھے رہتے احادیث سنتے۔ جب عشاء کا وقت ہوتا تو چلے جاتے اور قوم کو عشاء پڑھاتے۔ مگر اس پر اعتراض ہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے پھر قوم کے پاس جاتے "یصلی بھم تلک الصلاۃ" مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ② اقتداء المفترض خلف المتنفل تب ہو سکتا ہے جب معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے فرض کی نیت کرتے ہو ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نفل پڑھتے ہوں اور قوم کو فرض پڑھاتے ہوں۔ اس لئے نیت دل کی بات ہے۔ اس کی تصریح موجود نہیں کہ ان کی نیت کیا ہوتی۔

③ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود اس کی ممانعت ثابت ہے۔ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات نہ تھی۔ سلیمی آدمی آیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی کہ ہم زمیندار لوگ ہیں دن کو کام کرتے ہیں تھک جاتے ہیں۔ رات کو معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا۔ اور فرمایا "اما ان تصلی معی واما ان تخفف" یا میرے ساتھ پڑھو یا اگر قوم کو پڑھانا ہو تو تخفیف کرو۔ معلوم ہوا یہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہ تھا جب علم ہوا تو منع کر دیا۔ ④ ممکن ہے یہ اس وقت کی بات ہو جب فرض نماز دن میں دو مرتبہ پڑھنا جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

باب ماذكر من الرخصة فى السجود على الثوب فى الحر والبرد

پہلی بات: کپڑے پر سجدہ کرنا جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ سجدہ زمین پر ہو یا جنس زمین پر ہو۔ جمہور کہتے ہیں کہ زمین پر بھی سجدہ کرنا جائز ہے۔ اور غیر زمین پر بھی جائز ہے۔ چاہے لکڑی ہو یا کپڑا ہوا، زمین کی جنس سے ہو یا نہ ہو۔ جمہور کی مستدل باب کی حدیث ہے جس میں انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے تو گرمی سے بچنے کے لئے ہم اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے۔

دوسری بات: کپڑے کی دو صورتیں ہیں۔ ① ثوب منفصل جیسے رومال اور چادر وغیرہ اس پر سجدہ بالاتفاق جائز ہے۔ ② ثوب متصل۔ مثلاً آستینیں چوڑی ہو ان کو پھیلا کر ان پر سجدہ کرے۔ اس پر سجدہ جائز ہے یا نہیں امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کے ہاں جائز ہے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں۔ باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے۔ اگر چہ اس میں ثوب متصل یا منفصل کا ذکر نہیں۔ مگر بظاہر ثوب متصل معلوم ہوتا ہے۔

باب ماذكر فى الالتفات فى الصلاة

مسئلہ:۔ اس باب میں چند احادیث نقل کی ہیں۔ ایک میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گوشہ چشم سے التفات کرتے تھے۔ دوسری حدیث میں ہے

کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ التفات نماز میں باعث ہلاکت ہے اگر ضرورت بھی ہو تو فرائض میں نہ کرو نوافل میں کرو۔

علماء نے لکھا ہے کہ التفات تین قسم پر ہے ❶ گوشہ چشم سے التفات کرنا۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ یہ التفات نوافل میں ضرورۃً جائز ہے۔

❷ رخسار کو تھوڑا سا موڑ کر دیکھنا یہ مکروہ ہے۔ ❸ سینہ موڑ کر دیکھنا یہ مفسد صلاۃ ہے۔ پہلی قسم جو ہے کہ گوشہ چشم سے التفات کرنا حدیث سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ضرورت کہ بنا پر صرف نوافل میں جائز ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جواز والی روایت منسوخ ہے ممانعت والی روایت سے۔ اور ویسے بھی محرم اور مباح میں تعارض آ جائے تو محرم کو ترجیح ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قسم کا التفات جائز نہیں۔

باب ماذكر فی الرجل يدرک الا مام ساجداً كيف يصنع

مسئلہ:۔ مقتدی امام کو سجدے میں پالے تو یہ بھی سجدہ کرے یا امام کا انتظار کرے پھر شریک ہو۔ اس مسئلے کے متعلق فقہاء کا اجماعی قول یہ ہے کہ امام کا انتظار نہ کرے۔ بلکہ جس رکن میں امام کو پالے اس کے ساتھ شریک ہو جائے۔ البتہ مدرک رکعت تب ہوگا جب قیام یا رکوع میں امام کو پالے۔ سجدے میں پایا تو اس سجدے میں امام کے ساتھ شریک ہو جائے لیکن وہ مدرک کعت نہ ہوگا۔

باب كراهية ان ينتظر الناس الا مام وهم قيام عند افتتاح الصلاة

مسئلہ:۔ نماز کے لئے امام کا انتظار کھڑے ہو کر نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر امام پیچھے کی جانب سے آئے تو جس صف سے گزرے وہ کھڑے ہو جائیں۔ اور قبلہ کی جانب سے آئے تو دیکھتے ہی سارے کھڑے ہو جائیں۔ باقی بعض نے لکھا ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کے وقت کھڑا ہونا چاہئے۔ اس کے متعلق درمختار کی شرح طحطاوی میں لکھا ہے کہ یہ ''الاحتراز عن التاخیر لاعن التقدیم'' کہ اس کا مطلب یہ کہ حی الفلاح کے بعد بھی نہ اٹھنا اور بیٹھے رہنا باعث گناہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے اٹھنا جائز نہیں بلکہ پہلے اٹھنا چاہئے۔ لیکن اگر دیر ہو جائے تو حی علی الفلاح کے وقت ضرور کھڑے ہوں۔

باب مايجوز من المشی والعمل فی صلاة التطوع

مسئلہ:۔ نماز میں مشی ضرورۃ جائز ہے بشرطیکہ بدون توالی قدمین ہو۔ جیسے اگلی صف میں جگہ خالی ہو تو جا سکتا ہے۔ لیکن توالی قدمین کے ساتھ چلا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اسی طرح عمل قلیل بھی جائز ہے لیکن عمل کثیر جائز نہیں۔

عمل کثیر کی مختلف تفسیر ہیں۔ ① ایسا عمل کرے کہ دوسرا دیکھنے والا گمان کرے کہ یہ نماز میں نہیں۔

② قلیل وکثیر میں رائے مبتلابہ کا اعتبار ہوتا ہے۔ وہ جس کو قلیل سمجھے وہ قلیل ہوگا اور وہ جس کو کثیر سمجھے ہو کثیر ہوگا۔

باب ماذكر فی قرأة سورتين فی الركعة

جمہور کے ہاں دو سورتوں کو ایک رکعت میں ملا کر پڑھنا جائز ہے۔ البتہ احناف کے ہاں ایسی دو سورتوں کو ملائے جن میں فصل نہ ہو۔ اگر درمیان میں کسی سورت کا فصل ہو تو پھر ملانا مکروہ ہوگا۔

ابواب الزکوٰۃ

باب ماجاء عن رسول اللہ ﷺ فی منع الزکوٰۃ من التشدید

پہلی بات: امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ ابواب کے لفظ کو کتاب کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے لوگ کتاب الزکوٰۃ کہتے ہیں۔ جب کہ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابوب الزکوٰۃ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

دوسری بات: عن رسول ﷺ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ زکوٰۃ کے متعلق جو احادیث آئیں گی۔ وہ اکثر مرفوعہ ہوں گی۔

تیسری بات: زکوٰۃ کا لغوی معنی نما بھی آیا ہے طہارت بھی آیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہو تو یہ شرعی اور اصطلاحی معنی میں مستعمل ہوگا۔ لغوی معنی میں استعمال نہ ہوگا۔ اور شرعی معنی یہ ہے کہ مال کا وہ مقدار اور معین حصہ جو مالدار آدمی پر شریعت کے حکم کے مطابق واجب ہوتا ہے۔ اس صاحب نصاب پر جس کے مال پر حولان حول ہو چکا ہو۔ اور وہ مال قرضہ وغیرہ سے بھی فارغ ہو۔

چوتھی بات: زکوٰۃ کی فرضیت کب ہوئی؟ اکثر کی رائے یہ ہے کہ دو ہجری کو ہوئی، صدقہ فطر کی وجوب کے بعد اور رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے۔ ② علامہ انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول معارف السنن میں ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کا حکم، جمعہ اور عید کے وجوب کا حکم یہ سارے ہجرت سے پہلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورت مزمل کی آیت، اقیموا الصلاۃ واتوا الزکوٰۃ

''اس پر دلالت کرتی ہے۔ مگر مکہ میں قوت نہ تھی اس لئے تنفید نہ ہوسکی۔ لیکن مدینہ میں جب آئے تو قوت نافذہ حاصل ہوگئی۔ تو ان چیزوں کو مدینہ میں نافذ کیا گیا۔ غرض ان کی فرضیت قبل الہجرت ہوئی۔ باقی زکوٰۃ کی تفصیل ممکن ہے بعد الہجرت ہوئی۔

پانچویں بات: منع الزکوٰۃ میں جو تشدید وارد ہوئی ہے اس کو ترمذی نے لکھا ہے۔ اور حدیث میں ابوذرؓ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ قبل الہجرت کا ہے یہ بھی موید ہے اس بات کا کہ زکوٰۃ کی فرضیت ہجرت سے پہلے ہوئی تھی باب کی حدیث میں جو واقعہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لئے یہ عذاب ہوگا جو حدیث میں مذکور ہے۔ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے جو لوگ زکوۃ نہ دیں ان کی دو سزائیں ہیں۔ ① ایک آخرت میں ② دوسری دنیا میں۔ تفصیل یہ ہے کہ اموال دو قسم کے ہیں۔ ① اموال ظاہرہ جن کی تفتیش کے لئے اس کی گھر میں داخل نہ ہونا پڑے جیسے اونٹ وغیرہ۔ ② اموال باطنہ جیسے سونا چاندی وغیرہ اب حکومت کا حق اموال ظاہرہ میں ہے۔ اگر کوئی شخص اموال ظاہرہ میں زکوٰۃ نہ دے تو حکومت زبردستی لے گی اور اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اگرچہ زکوٰۃ عبادت ہے، عبادت میں جبر نہیں، مگر چونکہ حکومت کو ولایت عامہ حاصل ہے۔ اس لئے آدمی کی نیت نہ ہو تو حکومت کی نیت کا اعتبار کر کے زکوٰۃ کا فریضہ اس سے ساقط ہو جائے گا اموال باطنہ میں حکومت زکوٰۃ حاصل کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ چنانچہ عمرؓ نے لوگوں میں بیت المال سے وظائف تقسیم کئے۔ اور حکم دیا کہ وظائف سے زکوٰۃ وصول کرو۔ تو حکومت وصول کر سکتی ہے۔ مگر زبردستی نہیں لے سکتی۔ یہ تو دنیاوی حکم تھا۔ اخروی سزا کیا ہوگی اس کو مذکورہ حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔

قال الاکثرون اصحاب عشرۃ الاف: ضحاک نے جو اکثرون کی تفسیر کی ہے وہ یہ کہ جس کے پاس دس ہزار درہم ہوں۔ یہ دوسری حدیث کی وجہ سے کیا۔ جس میں ''من قرأ الف ایۃ کتب من المکثرین المقنطرین'' باقی جمہور فرماتے ہیں کہ اکثرون سے مراد وہ آدمی ہیں۔ جن کے پاس نصاب زکوٰۃ کی مقدار مال ہو۔

باب ماجاء اذاادیت الزکوٰۃ فقدقضیت ماعلیک

پہلی بات:۔ ترجمۃ الباب اس فائدے کے لئے قائم کیا ہے کہ جب آپ زکوٰۃ ادا کردیں۔ تو آپ پر جو حق تھا وہ آپ نے ادا کردیا مزید تم پر کوئی لازم نہیں۔ اس کا تعلق مال کے ساتھ ہے یعنی زکوٰۃ کو جب تم نے ادا کردیا تو دوسرا کوئی مالی حق تم پر لازم نہیں رہا۔

دوسری بات:۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدقہ فطر واجب ہے۔ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے کہ جب زکوٰۃ ادا کردی تو تم نے حق ادا کردیا اب کوئی چیز لازم نہیں۔ جب کہ تم صدقہ فطر کو بھی واجب کہتے ہو۔

جواب:۔ زکوٰۃ فرض ہے اور صدقہ فطر واجب ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ جب تم نے زکوٰۃ ادا کردی۔ تو اس نوع (فرض) کا حق تم پر کوئی باقی نہیں رہا۔ جب کہ صدقہ فطر کی نوع (واجب) الگ ہے۔

تیسری بات: انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث ہے۔ اس میں ہے "کنا نتمنی ان یبتدی الخ" اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ جو مسائل پوچھتے کبھی صحابہؓ غیر مناسب بات پوچھ لیتے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سلونی" ایک آدمی اٹھا اور کہا "من ابی" آپ نے بتادیا۔ مگر یہ سوال غیر مناسب تھا تو اللہ تعالیٰ نے سوال سے منع کردیا "لاتسئلو اعن اشیاء ان تبدلکم تسؤ کم" اس آیت کے بعد صحابہ نے پوچھنا بند کردیا کہ ممکن ہے ہم سوال کو معقول سمجھیں اور وہ غیر مناسب ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گراں گزرے۔ اس لئے صحابہ فرماتے ہیں ہم خود سوال نہ کرتے تھے۔ لیکن تمنا ہوتی تھی کہ کوئی سمجھدار اعرابی آئے سوال کرے تا کہ ہمیں بھی معلوم ہو جائے۔

اذا أتاہ اعرابی الخ. یہ اعرابی کون ہے۔ اس میں کئی اقوال ہیں۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہ ضمام بن ثعلبہ کا واقعہ ہے۔ یہ کئی دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا۔ ایک دفعہ ابتداء میں، اور ایک دفعہ سنۃ الوفود میں آیا تھا۔ یہاں دوسری مرتبہ آنا مراد ہے کیونکہ یہاں حج وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ جب کہ حج آخر میں فرض ہوا تھا۔

لا ادع منھن شیئاً ولا اجاوز ھن الخ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ نمازوں سے تجاوز نہ کروں گا تو کیا وتر نہ پڑھے گا اور سنن نہ پڑھے گا۔

جواب نمبر ①: مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے تجاوز نہ کروں گا۔ ہاں اگر شریعت کی طرف سے زیادتی ہو تو ٹھیک ہے۔

جواب نمبر ②: یہ اس اعرابی کی خصوصیت تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنن وغیرہ کا مکلف نہیں بنایا۔

باب ماجاء فی زکوٰۃ الذھب والورق

پہلی بات: پہلا جملہ ہے "قد عفوت عن صدقۃ الخیل" اب گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ مگر اختلاف سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ گھوڑوں کی کئی قسمیں یعنی صورتیں ہیں۔ بعض اتفاقی ہیں اور بعض اختلافی ہیں ① اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی کے ایک یا دو گھوڑے ہوں ذاتی استعمال کے لئے یا جہاد کے لئے تو ایسے گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ② کسی نے تجارت کے لئے گھوڑے رکھے ہوں۔ تو بالاتفاق یہ سامان تجارت کے حکم میں ہوں گے۔ اس لئے ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ③ کسی کے پاس گھوڑے ہوں پالنے کے لئے تا کہ نسل بڑھائے اسکی پھر تین صورتیں ہیں۔ ① صرف مذکر گھوڑے ہوں۔ اس میں باقی ائمہ کے یاں زکوٰۃ نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے دو قول ہیں۔ صحیح تر اور مفتیٰ بہ قول وجوب زکوٰۃ کا ہے۔ ③ گھوڑے گھوڑیاں مخلوط ہوں۔ حقیقت میں اختلافی صورت جو مشہور ہے وہ یہی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ یعنی جمہور کے ہاں اس میں زکوٰۃ نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ

کے ہاں واجب ہے قاضی خان نے فقہائے احناف میں سے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔مگر شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔عدم جوب کے قائلین باب کی حدیث کے مذکورہ ٹکڑے سے استدلال کرتے ہیں کہ "قد عفوت عن صدقة الخيل"۔

ہمارے محدثین کہتے ہیں کہ مذکورہ جملہ دوسرے ائمہ کے ہاں بھی اطلاق پر محمول نہیں۔کیونکہ اگر تجارت کے لئے ہوں تو دوسرے ائمہ کے ہاں بھی زکوٰۃ ہوگی۔اس میں بعض مستثنیات ہیں۔اس لئے یہاں "قد عفوت عن صدقة الخيل" سے وہ گھوڑا مراد ہے۔جو جہاد کے لئے رکھا ہو یا ذاتی استعمال کے لئے ہو۔تجارت کے گھوڑے آپ کے ہاں بھی مستثنیٰ ہیں۔اور ہم نسل بڑھانے والے گھوڑوں کو بھی مستثنیٰ کرتے ہیں اور استثناء کی دلیل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ہے۔کہ عمر گھوڑوں کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔یہ عمل صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔

ایک تابعی اپنے والد کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ میرے والد گھوڑوں کی قیمت لگاتے تھے پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑے بہت قلیل تھے یا جہاد اور ذاتی استعمال کے لئے تھے۔اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کی زکوٰۃ نہیں لی گئی۔امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول انفع للفقراء کی وجہ سے بہتر ہے۔

دوسری بات: دوسرا جملہ "والرقيق" ہے۔رقیق سے بالاتفاق رقیق خدمت مراد ہے۔احناف کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں رقیق خدمت مراد ہے اسی طرح خیل سے بھی ذاتی استعمال کا خیل مراد ہے۔غلاموں میں زکوٰۃ نہیں لیکن ایک صورت میں زکوٰۃ آئے گی۔وہ صورت یہ ہے کہ کوئی غلاموں کی تجارت کرتا ہو تو تمام ائمہ کے ہاں وہ غلام سامان تجارت کے حکم میں ہوں گے۔اس لئے شرائط کے ساتھ ان پر زکوٰۃ ہوگی جو شرائط سامان کے لئے ہیں۔

تیسری بات: سونے چاندی کے نصاب کا ذکر حدیث میں نقل کیا ہے کہ چالیس درہم میں ایک درہم ہے۔یہ نصاب اتفاقی اور اجماعی ہے جو باب کی حدیث میں مذکور ہے۔سونا چاندی اور اموال تجارت میں نصاب مقدار ہے دوسو درہم یا اس کی قیمت۔اگر دوسو درہم سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں۔دراہم و دنانیر میں یا سامان تجارت میں زکوٰۃ تب ہے جب اس میں شرائط پائی جائیں۔① حاجات اصلیہ سے فارغ ہو ② نصاب فارغ عن الدین ہو۔③ حولان حول ہو چکا ہو۔④ نصاب نامی ہو حقیقتاً یا حکماً۔

چوتھی بات: خچر اور گدھے اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں۔لیکن اگر تجارت کے لئے ہوں تو یہ سامان تجارت کے حکم میں ہوں گے اور زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال كلاهما عندي صحيح عن ابي اسحق الخ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابواسحٰق اس کو حارث سے بھی نقل کرتے ہیں اور عاصم سے بھی نقل کرتے ہیں۔یہ صحیح ہے کیونکہ ممکن ہے دونوں سے سنا ہو۔یہ مطلب نہیں کہ عاصم والی سند بھی صحیح ہے۔اور حارث والی سند بھی۔کیونکہ حارث اعور ضعیف ہے مقدمہ مسلم میں اس کو کذاب لکھا ہے۔

باب ماجاء في زكوة الابل والغنم

پہلی بات: باب کی حدیث ام المقادیر ہے یعنی نصاب زکوٰۃ میں یہ حدیث اصل الاصول ہے۔اونٹوں کے متعلق یہ نصاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۲۰ تک ذکر کی ہے۔یہ ائمہ مجتہدین کے ہاں بالکل اتفاقی اور اجماعی ہے۔اختلاف ۱۲۰ کے بعد ہے۔خلاصہ اسکا یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں ۱۲۰ کے بعد استیناف کامل ہوگا دوسرے ائمہ کے ہاں ۱۲۰ کے بعد ہر چالیس میں ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ واجب ہوگا۔جس طرح حدیث میں قانون موجود ہے۔

دوسری بات: بکریوں کا جو نصاب مذکور ہے یہ بھی اتفاقی اور اجماعی ہے۔

تیسری بات..... لا یجمع بین متفرق ولا یفترق بین مجتمع: اس میں خطاب یا تو مالک کو ہے۔ یا عامل کو ہے:
اگر مالک کو خطاب ہو تو پھر "لا یجمع بین متفرق ولا یفترق" کا مطلب یہ ہوگا کہ مثلاً دو آدمی ہیں۔ ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ اب انہوں نے مشورہ کیا کہ جب مصدق آئے گا تو کہیں گے کہ یہ ۸۰ بکریاں ایک کی ہیں اور دوسرا نوکر ہے۔ اب صدقہ کی ڈر کی وجہ سے مال متفرق کو جمع نہ کیا جائے گا کہ پہلے دو بکریاں آرہی تھیں۔ جمع کے بعد ایک بکری آئے گی۔ "لا یفرق بین مجتمع" اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی ستر بکریاں ہیں اس پر ایک بکری آئے گی اب مالک نے اپنے نوکر سے کہا کہ ہم کہیں گے کہ ۳۵ میرے ہیں اور ۳۵ اس کی ہیں تو کچھ صدقہ نہیں آئے گا۔ تو صدقہ دینے کی ڈر سے مجتمع مال کو متفرق کر یا۔

اگر خطاب ساعی اور عامل کو ہو تو پھر بھی دو صورتیں ہوں گی۔ ① "لا یجمع بین متفرق" اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر ۷۰ بکریاں ہیں۔ ۳۵ ایک کی ۳۵ دوسرے کی۔ اب عامل آیا اور کہنے لگا کہ تم غلط کہتے ہو یہ بکریاں ایک کی ہیں۔ اس لئے ایک بکری زکوٰۃ میں دو۔ تو اس سے منع کیا کہ قلت صدقہ کے خوف سے لوگوں کے اموال کو جمع نہ کرو۔ ② "لا یفرق بین مجتمع" اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کی ۱۲۰ بکریاں تھیں۔ اس پر ایک بکری زکوٰۃ کی ہے۔ اب عامل کہنے لگا کہ یہ تین آدمیوں کی ہیں تین بکریاں لے لیں کہ یہ جائز نہیں کہ تم قلت صدقہ کی وجہ سے مجتمع مال کو متفرق نہ کرو۔

چوتھی بات: وما کان من الخلیطین فانها الخ اس کی صورت یہ ہے کہ شرکت کی دو قسمیں ہیں۔ فقہا اس کو خلط کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ① خلطۃ شیوع ② خلطۃ الجوار۔

خلطۃ الشیوع یہ ہے کہ دو آدمیوں کو کسی نے سو ۱۰۰ بکریاں عطیہ میں دے دیں یا میراث میں مل گئیں یا مشترکہ تجارت میں خرید لیں۔ یا کسی نے ھبہ کر دیں۔ تو یہ خلطۃ الشیوع ہے۔ کیونکہ ہر ہر بکری میں دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔

خلطۃ الجوار کی صورت یہ ہے کہ دونوں کا مال الگ ہے مگر چراگاہ قریب ہیں۔ اور ان کے مویشی ایک ساتھ چرتے ہیں۔ اب وجوب زکوٰۃ میں خلطہ کا اعتبار ہے یا نہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ خلطۃ الشیوع کا اعتبار ہے اور نہ خلطۃ جوار کا اعتبار ہے ہر آدمی پر اپنی ملک کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس کا مال نصاب کی بقدر ہو تو زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہ ہوگی۔

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں خلطہ شیوع اور خلطہ جوار دونوں کا اعتبار ہوگا۔ مثلاً ایک کا مال نصاب زکوٰۃ تک نہیں پہنچتا تو دونوں کے مال کو ملایا جائے گا۔ اور زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

خلطہ جوار میں جمہور کے ہاں شرائط ہیں۔

① مرعیٰ ایک ہو ② پانی پینے کا گھاٹ ایک ہو ③ حفاظت کا کتا ایک ہو۔ تو تقریباً دس شرائط لگائی ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر الگ الگ ان کا مال نصاب تک نہ پہنچتا ہو تو دونوں کے مال کو ملائے اور نصاب تک پہنچے تو زکوٰۃ لازم آئے گی۔ مگر احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں خلطہ کا اعتبار تب ہوگا جب دونوں کا مال الگ الگ نصاب کی حد تک پہنچتا ہو۔ اگر الگ الگ ان کا مال نصاب کی مقدار کو نہ پہنچے تو خلطہ کا اعتبار نہ ہوگا۔

فانها یتراجعان بالسویة الخ اس کی صورت یہ ہے کہ ۶۱ اونٹ ہیں۔ ۲۵ ایک کے ہیں۔ اور ۳۶ دوسرے کے ہیں۔ اب احناف کے ہاں ہر ایک آدمی کی اپنی مال سے زکوٰۃ دی جائے گی۔ ۲۵ والا بنت مخاض دے گا ۳۶ والا بنت لبون دے گا۔ اب عامل آیا اس نے ایک بنت مخاض (۲۰۰) کا لیا۔ دوسرا بنت لبون (۳۰۰) کا لیا۔ دونوں کی قیمت پانچ سو بنتی ہے۔ اب یہ نہ ہوگا کہ (۲۵۰) ہر ایک

کے ذمہ آئے۔ بلکہ ہر ایک کے مال کے اعتبار سے آئے گا۔ اب اگر عامل نے دونوں اونٹ پچیس والے سے لے لئے۔ تو اب ۲۵ والا ۳۶ والے سے بنت لبون کی قیمت (۳۰۰) کا رجوع کرے گا۔

پانچویں بات: اگلا جملہ ہے کہ "ھرمۃ" یعنی بوڑھا اور کمزور جانور نہ لیا جائے اور نہ عیب دار لے گا۔ کیونکہ گزر چکا ہے کہ حکومت اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ لے سکتی ہے۔ اب عامل آیا اگر وہ عمدہ بکری لے تو اس میں صاحب مال کا نقصان ہے۔ اگر بالکل بے کار بکری لے تو فقراء کا نقصان ہے۔ اسلئے کہا جائے گا کہ عامل جب آئے تمام بکریوں کے تین حصے بنائے۔ ایک اعلیٰ ایک اوسط اور ایک ادنیٰ کی پھر عامل درمیانی قسم کی بکریوں کو زکوٰۃ میں لے گا۔

باب ماجاء فی زکوٰۃ البقر

پہلی بات: جس مسئلہ کیلئے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اس کا ذکر ہے۔ نبی ﷺ سے منقول ہے کہ تیس ۳۰ گائیوں میں ایک تبیع یا تبیعہ ہے۔ جب چالیس ہو جائیں تو اس میں ایک مسن یا مسنہ ہوگا۔ اگر تیس سے کم ہوں تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی تبیع وہ ہوتا ہے جو ایک سال مکمل کر چکا ہو۔ اور دوسرے سال میں چل رہا ہو۔ مسن وہ ہے جو دو سال پورا کر چکا ہو اور تیسرے سال میں چل رہا ہو۔

دوسری بات: گائے کے نصاب کے متعلق باب کی حدیث میں جو صورت منقول ہے یہ اجماعی اور اتفاقی ہے۔ کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

تیسری بات: گائے کے متعلق زکوٰۃ کے جس کا جو حکم ہے۔ تو یہ زکوٰۃ تب واجب ہوگی جب مذکر اور مونث مخلوط ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ سائمہ ہوں۔ سائمہ نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی بات: زکوٰۃ کے لئے یہاں گائے کا نصاب مذکور ہے۔ یہ تب ہے جب گائے تجارت کے لئے نہ ہوں اگر تجارت کے لئے ہو تو پھر یہ عروض تجارت کے حکم میں ہوں گی۔ اس کی قیمت لگا کر ہر دو سو درہم پر پانچ درہم واجب ہوں گے۔

پانچویں بات: معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے "ومن کل حالم دینارًا" کہ ہر بالغ آدمی سے ایک دینار بطور جزیہ لینے کا حکم دیا۔ احناف کہتے ہیں۔ جزیہ دو قسم پر ہے۔

❶ صلح کا جزیہ اس کی صورت یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کے پاس آئیں اور کہیں کہ آپ حملہ نہ کریں ہم جزیہ دیں گے۔ اب جزیہ کی صورت صلح کی صورت میں یہ ہوگی کہ غریب پر بارہ درہم متوسط پر چوبیس درہم اور مالدار پر ۴۸ درہم واجب ہوں گے۔

❷ مسلمانوں نے کسی علاقے پر حملہ کر کے فتح کر دیا۔ اب لوگوں پر جزیہ مقرر کریں تو شرعاً اس کی کوئی تحدید نہیں۔ مسلمان حاکم جتنا مقرر کرے وہ اتنا دیں گے۔ جزیہ بوڑھوں، بچوں، عورتوں، بیماروں اور معذوروں پر نہیں ہوتا۔ بلکہ کمانے والوں پر ہوتا ہے۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ ہر بالغ سے ایک دینار جزیہ لو یہ جزیہ صلح کی صورت میں تھا۔ اور ایک دینار دس درہم کا بھی ہوتا ہے اور بارہ درہم کا بھی ہوتا ہے۔

چھٹی بات: معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ جو موجود ہے کہ "او عدله معافر" کہ دینار لو یا اس کے برابر معافری کپڑا لو۔ معافری یمن کا بنا ہوا کپڑا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں عین کا وصول کرنا بھی جائز نہیں۔ مثلاً بکریوں کی زکوٰۃ بکری لی اور اونٹوں کی زکوٰۃ اونٹ لئے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی قیمت لے لیں۔ مثلاً بکریوں کی زکوٰۃ میں ایک بکری کی قیمت لے لیں۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک صدقات میں اس کی قیمت کا وصول کرنا جائز نہیں۔ جب کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قیمت کا لینا بھی جائز ہے۔ مذکورہ الفاظ سے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة اخذ خیار المال فی الصدقة

پہلی بات: مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عامل نہ بالکل گھٹیا مال لے کہ فقراء کا نقصان ہو۔ اور سب سے عمدہ مال بھی نہ لے کہ صاحب مال کا نقصان ہو۔ امام زہری کا قول ہے کہ اگر بکریوں کی زکوٰۃ لینی ہے۔ تو بکریوں کے تین حصے کیے جائیں ایک میں اعلیٰ نوع کی بکریاں رکھے دوسرے میں ادنیٰ نوع کی اور تیسرے میں متوسط نوع کی بکریاں رکھے۔ اب عامل متوسط نوع سے زکوٰۃ لے لے۔ تاکہ فقراء یا صاحب مال کا نقصان نہ ہو۔ حدیث کا جملہ "ایاک و کرائم اموالھم" ہی مسئلے پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری بات: نبی اکرم ﷺ نے معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا کہ تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو۔ اس لئے پہلے کلمہ طیبہ کی دعوت دو پھر نماز کی۔ اہل کتاب کی قید احترازی نہیں کہ اہل کتاب کو اس طرح دعوت دو دوسرے لوگوں کو دوسری طرح دعوت دو حدیث میں ہے کہ کلمہ کے بعد نماز کی دعوت دو یہ توضیح ہے۔ آگے ہے نماز پڑھے تو زکوٰۃ کی دعوت دو۔ اب جب مسلمان ہوا تو اس پر تمام احکام لازم ہو گئے۔ پھر زکوٰۃ کو مؤخر کیوں کیا۔ جواب دعوت اور تعلیم کی تربیت بتلانی مقصود ہے کہ جب دعوت دو تو ایک دم سارے احکام اس کے سر پر نہ دے مرو بلکہ آہستہ آہستہ بتاتے جاؤ۔

تیسری بات: توخذ من اغنیاء ھم وترد علی فقرائھم: ۔ یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک جگہ سے زکوٰۃ لی اب اس کو دوسرے علاقے کے فقراء پر خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے ① امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے۔ لیکن اس علاقے والوں کو ضرورت ہو تو یہ فعل پھر خلاف اولیٰ ہوگا۔ لیکن اگر ان کو ضرورت نہ ہو تو بلا کراہت جائز ہے۔ ② امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور دوسرے فقہاء کے نزدیک ایک علاقے والوں کی زکوٰۃ دوسرے علاقے کے فقراء کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں۔ یہ لوگ مذکورہ حدیث کے اس ٹکڑے سے استدلال کرتے ہیں۔ احناف جواب دیتے ہیں کہ یہاں اغنیائھم اور فقرائھم کی ضمیریں مسلمانوں کی طرف راجع ہیں کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر مسلمانوں کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی۔ چاہے وہ اسی علاقے کے ہوں یا دوسرے علاقے کے۔

باب ماجاء فی صدقة الزرع والثمر والحبوب

مسئلہ: باب کی حدیث کے تین جملے ہیں۔ ① پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہ جملہ ائمہ کے درمیان اتفاقی اور اجماعی ہے۔
② دوسرا جملہ یہ ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ تو پانچ اوقیہ دو سو درہم ہو گئے۔ یہ حکم بھی اجماعی اور اتفاقی ہے۔ ③ تیسرا جملہ یہ ہے کہ پانچ وسق سے کم غلہ میں صدقہ نہیں۔ یہ حکم اختلافی ہے۔ پہلے یہ سمجھو کہ ایک وسق ساٹھ ۶۰ صاع کا ہوتا ہے۔ ایک صاع ائمہ ثلاثہ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں سوا پانچ رطل کا ہوتا ہے۔ احناف کے ہاں آٹھ ۸ رطل کا ہوتا ہے۔ تو اس حساب کے مطابق تین سو صاع سے کم مقدار میں غلہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ آئمہ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "کل ما اخرجتہ الارض" اس پر زکوٰۃ واجب ہے قلیل ہو یا کثیر ہو۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ سے زکوٰۃ الزرع کے متعلق جو احادیث مروی ہیں۔ اس سے علی الاطلاق صدقہ کے وجوب کا ثبوت ہوتا ہے۔ جیسے آیت میں ہے۔ "واتوا حقہ یوم حصادہ" احناف باب کی حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہاں حکومت کو لینے کا حق نہیں۔ بلکہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس پر دلیل آیات اور احادیث کا اطلاق ہے۔ جن میں مطلقاً "ما اخرجہ الارض" پر وجوب صدقہ کا ذکر ہے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول انفع للفقراء ہے۔ بخلاف دوسرے ائمہ کے اقوال کہ اس کو لیا جائے۔ تو لوگ زکوٰۃ سے بچنے کے لئے حیلے کریں گے۔ مثلاً کسی کی زمین زیادہ ہو تو وہ اپنے بچوں پر زمین تقسیم کریں گے۔ اور سب کی الگ الگ ملک سے پانچ وسق غلہ نہ آئے گا۔ وہ زکوٰۃ سے بچ

جائے گا۔اللہ کے حق کو ساقط کرنے کے لئے حیلہ کرنا، یا بندوں کے حقوق کو ساقط کرنا، یا حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنا یہ قطعاً حرام ہے۔ البتہ کسی کے ظلم سے بچنے کے لئے حیلہ کرنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی الزکوٰۃ فی العسل

مسئلہ: اس باب میں یہ مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔ کہ شہد میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ اور اہل کوفہ کے ہاں شہد میں زکوٰۃ واجب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض محدثین کے ہاں شہد میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ ان کی دلیل کوئی مرفوع حدیث یا کسی صحابی کے اثر سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ باقی قول اول والوں کے پاس احادیث موجود ہیں۔ جیسے باب میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ مگر ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کی سند میں صدقہ بن عبداللہ ہے جو متکلم فیہ ہے۔ مگر معارف السنن میں ہے کہ صدقہ مختلف فیہ راوی ہے۔ بعض نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ بعض نے جیسے ابو حاتم، ابوزرعہ رازی نے اس کو ثقہ لکھا ہے۔ اس لئے اس کی حدیث حسن ہوگی۔ دوسرا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ دوسرے حضرات سے بھی احادیث ثابت ہیں۔ ابو سیارہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سنداً بالکل صحیح ہے۔ ابو سیارہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس شہد کے چھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ادالعشور" کہ اس کا عشر ادا کرو۔ ابوسیارہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ اس زمین کو جہاں شہد ہے میری جاگیر بنادیں۔ آپ نے اس کے لئے اس کو جاگیر بنادیا۔ تو اس حدیث کی بنا پر اکثر علماء مثلاً ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ مالکی نے لکھا کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول راجح ہے۔ اور انفع للفقراء ہے فتح الباری میں ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابو سیارہ کی حدیث پر اعتراض نقل کیا ہے۔ کہ آپ نے جو فرمایا کہ عشر دو یہ شہد کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس زمین کو ابوسیارہ کے لئے جاگیر بنادیا اس لئے عشر مقرر کردیا۔ مگر معارف السنن میں ہے کہ ابن حجر کی یہ توجیہ غلط ہے۔ جاگیر بنانے کی بات تو بعد میں کی اور "ادالعشور" پہلے کہا تھا۔ جب اس نے کہا "ان لی نخلاً" تو آپ نے فرمایا "ادالعشور" تمہاری توجیہ تب صحیح ہوتی جب "ادالعشور" کا ذکر جاگیر بنانے کے بعد کہتے۔ اس لئے شہد میں زکوٰۃ ہوگا۔ اس نصاب کے اندر جو حدیث میں مذکور ہے۔

باب ماجاء لا زکوٰۃ علی المال المستفاد حتی یحول علیہ الحول

پہلی بات: یہ باب مال مستفاد کے متعلق ہے۔ مال مستفاد اس کو کہتے ہیں کہ کوئی صاحب نصاب تھا، اب سال کے درمیان اس کو اور مال مل گیا۔ یہ مال مستفاد کہلاتا ہے۔

دوسری بات: مال مستفاد کی تین صورتیں ہیں۔ دو اتفاقی ہیں اور ایک اختلافی ہے۔

❶ پہلی صورت یہ ہے کہ کسی کے پاس سال کے شروع میں ایک ہزار روپے تھے۔ سال کے دوران اس نے ۵۰۰ روپے کمالئے۔ یا پانچ اونٹ کمالئے۔ تو مال مستفاد کا سبب مال سابق ہوا۔ تو یہ مال مستفاد مال سابق کی جنس میں سے ہو یا نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں حساب کتاب ایک ساتھ ہوگا یعنی مال سابق پر جب سال گزرا تو مال مستفاد پر بھی وہ سال شمار کیا جائے گا۔ دونوں کی اکٹھی زکوٰۃ دی جائے گی۔

❷ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کے پاس پہلے سے مال موجود تھا سال کے درمیان اور مال مل گیا۔ اب مال مستفاد کا سبب نہ مال سابق ہے اور نہ مال مستفاد مال سابق کہ جنس میں سے ہے۔ مثلاً کسی کے پاس ایک ہزار روپے تھے۔ سال کے درمیان کسی نے اس کو سو ۱۰۰ اونٹ ھبے میں دے دیئے۔ تو یہ مال نہ مال سابق کی جنس سے ہے اور نہ مال سابق اس کا سبب ہے۔ تو اس صورت میں مال مستفاد کے لئے الگ حولان حول شرط ہوگا۔

❸ تیسری صورت یہ ہے کہ سال کے دوران مال حاصل ہوا۔ جو مال سابق کی جنس میں سے ہے۔ مگر مال مستفاد کا سبب مال سابق نہیں۔ مثلاً کسی کے پاس ہزار روپے تھے۔ سال کے دوران کسی نے ۵۰۰ روپے ھبہ کر دیئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہاں دونوں کی زکوٰۃ اکٹھی ادا کی جائے گی۔ یا دونوں پر الگ الگ حولان حول شرط ہے۔ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ مال مستفاد پر الگ حولان حول شمار کیا جائے گا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فقہائے کوفہ کے ہاں اس صورت میں یہ مال سابق مال کے ساتھ ملحق ہوگا۔ اور مال سابق کا حولان حول اس کے لئے معتبر ہوگا۔

اس مسئلے کے متعلق مرفوع حدیث کوئی بھی صحیح نہیں۔ باب کی حدیث ائمہ ثلاثہ کی مستدل ہے مگر یہ سند اضیف ہے۔ البتہ آثار صحابہ موجود ہیں۔ مثلاً ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ "من استفاد مالاً فلا زكوٰة فيه حتىٰ يحول عليه الحول عند ربه" احناف استدلال کرتے ہیں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر سے۔ ان کا قول ہے کہ مال مستفاد کو مال سابق سے ملایا جائے گا۔ اور مال مستفاد پر مال سابق کا حولان حول معتبر ہوگا۔

احناف کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ کا جو اثر ہے۔ یہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں بھی ظاہر پر محمول نہیں۔ کیونکہ اگر مال مستفاد کے لئے مال سابق سبب ہو اس کی جنس میں سے ہو یا نہ ہو یہ بھی مال مستفاد ہے۔ مگر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر سے مستثنیٰ ہے۔ اس لئے ائمہ ثلاثہ اس پر مستقل حولان حول شرط قرار نہیں دیتے۔ احناف کہتے ہیں۔ یہاں تیسری صورت بھی مستثنیٰ ہو گی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کی وجہ سے۔

باب ماجاء ليس على المسلمين جزية

پہلی بات: یہاں جزیہ کا مسئلہ ہے۔ جزیہ کا ثبوت قرآن سے بھی ہے ﴿حتىٰ يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون﴾ معارف السنن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ شاہ صاحب کے زمانے میں کسی نے جزیہ کا انکار کر دیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کیا کہ یہ کیسے انکار کر رہا ہے۔ جب کہ قرآن اور احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

دوسری بات: کافر سے جزیہ لینا یہ اس سے امتیازی سلوک نہیں کیونکہ مسلمان سے اس سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ اور عشر کی صورت میں۔ اگرچہ اس کا نام الگ ہے۔

تیسری بات: حکومت اسلامیہ کفار کو جو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ان کی خدمت کرتی ہے۔ یہ اس کا معاوضہ ہے۔ محض ذلت کے لئے نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ جنگ ہو تو مسلمان جہاد کرتے ہیں کافر نہیں کرتے۔ اس لئے اگر ان سے ان کے تحفظ کے بدلے میں جزیہ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

چوتھی بات: مسلمان پر ابتداءً بالاتفاق جزیہ نہیں۔ اگر پہلے کوئی آدمی ایسا کافر تھا جس پر جزیہ مقرر کیا جاتا ہو۔ اب ایسے آدمی پر کئی سال کا جزیہ تھا۔ کہ یہ مسلمان ہو گیا۔ تو اس سے جزیہ لیا جائے گا یا نہیں تو ائمہ ثلاثہ اور جمہور کی ہاں سابقہ جزیہ ساقط ہو جائے گا امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سابقہ جزیہ قرض ہے وہ اس سے لیا جائے گا۔ ساقط نہیں ہوگا۔ باب کی حدیث جمہور کی موئید ہے "ليس على المسلمين جزية" اس میں سابقہ یا آئندہ کا ذکر نہیں۔

بنوامیہ کے خلفاء میں عبدالملک کی اولاد میں یہ قانون تھا کہ جو مسلمان ہو جاتا اس سے جزیہ معاف نہ کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ جزیہ دینے کی ڈر سے مسلمان ہوئے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے بنوامیہ کے ان برے احکامات کو ختم کر دیا۔ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے بنوعباس کے ساتھ مل کر بنوامیہ کی ساتھ لڑنے کا فتویٰ دیا تھا۔ ان کی وجوہات میں سے ایک

وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مسلمانوں پر جزیہ نہیں اور یہ لوگ جزیہ لیتے ہیں۔

پانچویں بات: بعض احادیث میں ہے کہ "لیس علی المسلمین جزیة عشور" امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عشور کے لفظ سے یہ شبہ نہ ہو کہ نبی ﷺ عشر ساقط کر رہے ہیں۔ بلکہ عشور سے بھی جزیہ مراد ہے جزیہ عشور سے جزیہ رقبہ مراد ہے۔ اس پر امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کا ٹکڑا بطور استدلال کے ذکر کیا ہے۔ باقی جزیہ کی مقدار کیا ہے۔ تو اگر صلحاً علاقہ فتح ہو تو مالدار پر ۴۸ درہم متوسط پر ۲۴ درہم اور فقیر پر ۱۲ درہم آئیں گے۔ اور اگر عنوۃً فتح ہوا ہو تو امیر المؤمنین جتنا جزیہ مقرر کرے کر سکتا ہے۔

چھٹی بات: جزیہ کا حکم اہل عرب کے لئے نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جزیرہ عرب کے لئے یا اسلام ہے یا تلوار ہے۔ اس لئے جزیہ جزیرہ عرب کی حدود سے باہر والوں سے لیا جائے گا۔ جب وہ اہل کتاب ہوں اگر اہل کتاب نہ ہوں تو ان پر جزیہ ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ لا یصلح قبلتان فی ارض واحدة الخ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب میں دو دین نہیں رہ سکتے۔ اس لئے یہاں صرف اسلام ہوگا اگر کوئی اسلام نہ لائے تو اس کے لئے تلوار ہوگی۔

باب ماجاء فی زکوٰۃ الحلی

مسئلہ: باب میں جو مسئلہ ہے یہ اختلافی ہے۔ وہ یہ کہ سونا چاندی کسی کے پاس ویسے فارغ ہو تو زکوٰۃ اس پر ہوگی۔ لیکن کسی عورت کے اس استعمال کے لئے سونا چاندی کے زیور ہوں تو اس پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں۔ تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، صاحبین، ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نصاب زکوٰۃ یعنی ساڑھے باون تولے چاندی اور ساڑھے سات تولے سونے کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ائمہ ثلاثہ کے ہاں استعمال کے زیورات میں زکوٰۃ نہیں۔ باب کی حدیث احناف کی متدل ہیں باب کے احادیث سنداً ضعیف ہے مگر سنن ابو داؤد میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے۔ کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی۔ اس کے پاس ایک بچی تھی اور بچی کے ہاتھ میں دو موٹے سونے کے کنگن تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا زکوٰۃ ادا کرتی ہو اس نے کہا نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تمہیں پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ آگ کے کنگن پہنا دے۔ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر زکوٰۃ دیا کرو، اس نے کنگن اتار کر نبی اکرم ﷺ کو دے دیئے۔ یہ حدیث سنداً بالکل صحیح ہے۔ آئمہ ثلاثہ کے پاس کوئی حدیث نہیں۔ وہ ثیاب پر قیاس کرتے ہیں۔ اس لئے صحیح تر احناف کا قول ہے کیونکہ ایک تو حدیث سے ثابت ہے دوسرا انفع للفقراء ہے۔

منزری کا قول ہے کہ کہ ترمذی نے فرمایا "لا یصح فی هذا عن النبی ﷺ شی" شاید اس سے مذکورہ باب کے دو طریق مراد ہوں گے۔ ورنہ سنن ابی داؤد کا طریق بالکل صحیح ہے۔ اور یا ترمذی نے اپنے علم کی بناء پر کہا ہوگا۔

باب ماجاء فی الزکوٰۃ فی الخضروات

پہلی بات: سبزیوں میں زکوٰۃ ہے یا نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یمن سے نبی اکرم ﷺ کو خط لکھ کر یہ مسئلہ پوچھا آپ نے جواب دیا کہ سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں۔ یہاں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ، امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا قول یہ ہے کہ پھلوں اور سبزیوں وغیرہ میں عشر نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سبزیوں، پھلوں اور پھولوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔ امام

اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث کے عمومات سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً "انفقوا مما اخرجنا لکم من الارض" واتوا حقه یوم حصاده" اسی طرح وہ احادیث جن میں اطلاق ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ "ما اخرجته الارض ففیه العشر فیما سقت السماء والعیون العشر و فیما سقی بالنضح نصف الحشر" امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ان روایات کے عمومات سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان میں کسی چیز کی تقیید نہیں کی بلکہ جو چیز زمین سے پیدا ہواس میں عشر ہوگا۔

دوسری بات: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ جو فرماتے ہیں کہ سبزیوں یا پھلوں میں عشر ہے یہ تابعین میں مجاہد، ابراہیم نخعی، عمر بن عبدالعزیز سے بھی منقول ہے۔ یہ مسلک انفع للفقراء ہونے کی وجہ سے قوی ہے۔

جمہور باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ احناف اس کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ بلکہ بقول امام ترمذی کے ایسی حدیث جو خضروات کی زکوۃ کے متعلق نفیاً یا اثباتاً صریح ہو ایسی حدیث صحیح نہیں باقی امام اعظم رحمہ اللہ کے دلائل قوی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا قول ہیکہ اس باب میں صحیح روایت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی روایت نہیں جو صحیح اور صریح ہوں۔ باقی احناف کی روایت صحیح ہیں صریح نہیں۔ احناف دوسری تاویل یہ کرتے تھے کہ "لیس فیها شئ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ عامل کا حق نہیں کہ وہ ان سے زکوۃ لے۔ بلکہ لوگ خود ادا کریں گے۔ قرینہ یہ ہے کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر تھے انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا اس میں کچھ نہیں یعنی تمہارا حق نہیں کیونکہ سبزیاں جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔ حکومت جمع کر کے صحیح خرچ نہیں کر سکتی اس لئے مالک خود ادا کرے گا۔

باب ماجاء فی الصدقة فیما یسقیٰ بالانهار وغیرها

پہلی بات: اس باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمینیں عشر یا نصف عشر میں مختلف ہیں۔ معارف السنن میں یہاں شاہ صاحب کے حوالے سے ایک قاعدہ نقل کیا ہے کہ اسلام نے صدقے کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ جہاں مشقت زیادہ ہوں وہاں صدقے کی مقدار کم رکھی ہے۔ اور جہاں مشقت کم ہو وہاں صدقے کی مقدار زیادہ رکھی ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا کہ زمین میں دفینہ مل جائے تو اس میں خمس آئے گا۔ کیونکہ اس میں مشقت نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ زمینیں جو آسمانی پانی یا چشمے وغیرہ سے سیراب کی جائے تو اس میں مشقت کم ہے اس لئے اس میں عشر ہے۔ لیکن آدمی خود پانی نکال کر سیراب کرتا ہو تو مشقت زیادہ ہے۔ اس لئے نصف عشر مقرر کیا۔ اسی طرح تجارت میں سو۱۰۰ روپے میں ڈھائی روپے مقرر کئے۔ غرض اسلام نے جو صدقہ رکھا ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ جہاں مشقت زیادہ ہو تو صدقہ کم ہوگا۔ اگر مشقت نہ ہو تو صدقہ زیادہ رکھا۔

دوسری بات: باب کی حدیث میں جو قانون ہے کہ جو زمین ڈول کے ذریعے سیراب ہو اس میں نصف عشر ہے۔ اور جو زمین بارش یا چشمے کے پانی سے سیراب ہو اس میں عشر آئے گا یہ قانون ائمہ کے درمیان اتفاقی ہے۔ مگر یہ قانون عشری زمینوں کا ہے خراجی زمین کا قانون الگ ہے۔

او کان عشریًا: ایک نسخے میں عثریا لفظ بھی آیا ہے یعنی "فاسقی بالعاثور" اور عاثور چھوٹی نہر اور نالی کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ زمین جو نالیوں سے سیراب کی جائے تو اس میں عشر ہے۔

باب ماجاء فی زکوٰةمال الیتیم

اختلاف:۔ یتیم کے مال میں صدقہ ہے یا نہیں۔ مگر پہلے یہ سمجھ لیں کہ یتیم اس نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کے والد کا انتقال ہوا ہو۔ اگر بالغ ہو جائے تو وہ یتیم نہیں کہلائے گا۔ ورنہ دنیا کے سارے بوڑھے یتیم کہلائیں گے اب مسئلہ یہ ہے کہ یتیم مالدار ہے۔ وہ کسی کی ولایت میں ہے۔ تو اس کے مال میں زکوۃ ہوگی یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سفیان ثوری، ابن مبارک، صحابہ میں

سے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے قائل ہیں کہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحابہ میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ ان کے ہاں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ان کی دلیل باب کی حدیث ہے، امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل مشہور حدیث ہے اور صحیح اسانید کے ساتھ منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتی یستیقظ وعن المجنون حتی یفیق وعن الصبی حتی یحتلم" اب جب بچہ نابالغ ہو تو وہ مکلّف ہی نہیں۔ اور وجوب یا عدم وجوب مکلّف کی صفت ہے۔ نیز مکلّف پر کس طرح صدقہ واجب ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اس پر نہ نماز فرض ہے نہ روزہ نہ حج۔ تو جب ان عبادات میں یہ مرفوع القلم ہے۔ اور باقی احکام اس سے ساقط ہیں۔ تو زکوٰۃ کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا۔ اس لئے کہ یہ وجوب کا اہل ہی نہیں۔ کیونکہ وجوب کا اہل مکلّف ہے۔ جب کہ بچہ غیر مکلّف ہے۔ جمہور اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہم بچے پر زکوٰۃ واجب نہیں کرتے بلکہ اس کے مال پر واجب کرتے ہیں۔ مگر یہ بات غلط ہے کیوں کہ دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ دوسرا جب بچہ مکلّف نہیں تو مال کہاں مکلّف ہے کہ تم اس پر زکوٰۃ واجب کر رہے ہو۔

احناف کی دلیل ایک ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صریح اثر بھی ہے "لیس فی مال الصبی زکوٰۃ" باقی باب کی حدیث جو جمہور کی مستدل ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ خود کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ "حتیٰ لا تاکله الصدقة" میں صدقہ سے زکوٰۃ مراد نہیں۔ بلکہ صدقہ فطر مراد ہے اور صدقہ فطر کے لئے مکلّف ہونا شرط نہیں۔ تیسری تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہاں تحریف ہوئی ہے۔ اصل الفاظ یہ تھے کہ "فلیتجر فیه ولا یترکه حتیٰ لاتاکله النفقة"۔

باب ماجاء ان العجماء جرحها جبار وفی الرکاز الخمس

پہلی بات: "العجماء جرحها جبار" اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جانور کسی کو زخمی کر دے یا کسی کے مال کو تلف کر دے۔ تو جانور یا جانور والے پر اس کا ضمان واجب نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک قول میں احناف کا قول ہے۔ کہ دن کو عام عادت جانوروں کے کھلا چھوڑنے کی ہے۔ اس لئے دن کو اصحاب الاموال کے ذمے ہے کہ وہ اپنے مال کی حفاظت کریں۔ اس لئے دن کو جانور مال کو ضائع کر دے تو جانور والے پر ضمان نہیں۔ لیکن رات کو عام عادت جانور باندھنے کی ہے۔ اس لئے رات کو جانور نے کسی کے مال کو تلف کر دیا۔ تو جانور والے پر ضمان آئے گا۔

احناف کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ اگر جانور کے پاس قائد ہو یا سائق ہو یا اس پر راکب ہو۔ پھر جانور کسی کو نقصان پہنچائے تو جانور والا ذمہ دار ہے۔ لیکن جانور کا نہ قائد ہو، نہ سائق ہو، نہ راکب ہو تو پھر جانور والے پر ضمان نہ آئے گا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اصل اعتبار عرف کا ہے۔ اگر کسی جگہ عرف ایسا ہو جیسا کہ شوافع کا مسلک ہے تو اسی پر عمل ہوگا۔ اور اگر کسی جگہ عرف ایسا ہو جیسا کہ احناف کا مسلک ہے۔ تو احناف کا مذہب معتبر ہوگا۔ الغرض اصل بناء عرف پر ہے۔

دوسری بات: دوسرا جملہ ہے "المعدن جبار" معدن کان کو کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی آدمی کان میں گر کر مر گیا۔ تو معدن کے مالک پر تاوان نہ ہوگا۔ چاہے مزدور ہو یا باہر آدمی کھڑا تھا اور گر کر مر گیا۔

تیسری بات: تیسرا جملہ "والبئر جبار" یعنی کنواں کھودتے ہوئے مزدور گر کر مر جائے یا کوئی اور آدمی گر کر مر جائے تو کنویں کے مالک پر اس کا ضمان نہ ہوگا۔ لیکن یہ تب ہے۔ جب آدمی نے اپنی ملک میں کنواں کھودا ہو۔ لیکن کسی نے راستے میں یا دوسرے کی ملک میں کنواں کھودا، اس میں کوئی گر کر مر گیا تو کھودنے والے پر ضمان آئے گا۔

چوتھی بات: چوتھا جملہ ہے "وفی الرکاز الخمس" اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام

احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معدن اور رکاز میں فرق ہے۔ معدن وہ ہے جو خلقی طور پر ہو اور آدمی کو مل جائے۔ المعدن جبار کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کا اپنا حق ہے۔ حکومت کو کچھ نہ ملے گا۔ اور رکاز کہتے ہیں دفینہ جاہلیت کو۔ اس میں بیت المال کا حصہ بھی ہوگا۔ یعنی خمس دیا جائے گا۔ باقی ماندہ مال اس کا ہوگا جس کو ملا ہے۔ تو ائمہ ثلاثہ کے ہاں رکاز اور معدن میں فرق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ ذکر کر کے قال بعض الناس کہہ کر احناف پر رد کیا ہے۔ یہ پہلا مسئلہ ہے جس پر انہوں نے اعتراض کیا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ معدن اور رکاز دونوں ایک ہیں۔ کیونکہ بعض صحابہ سے رکاز کی وہی تعریف منقول ہے جو تم معدن کی کرتے ہو ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "المعدن جبار وفي الركاز الخمس قيل وما الركاز يا رسول الله قال هو الذهب والفضة التي خلقها الله في الارض يوم خلق السموات والارض" تو رکاز کی تعریف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی منقول ہے جو تم معدن کی کرتے ہو۔ معلوم ہوا دونوں ایک ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ آپ ﷺ نے جب فرمایا کہ المعدن جبار تو شبہ ہو سکتا تھا کہ جس طرح معدن میں کوئی گر کر مر جائے اس کا ضمان نہیں تو شبہ ہو سکتا تھا کہ اس سے جو مال ملے گا خمس بھی نہ ہوگا۔ بلکہ معاف ہوگا۔ اس لئے آپ نے الگ ذکر کر دیا۔ کہ وفي الركاز الخمس کو معاف نہیں کیا بلکہ اس میں خمس ہے۔

باب ماجاء في الخرص

مسئلہ:۔ صورت مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً کسی کا انگور یا کھجور کا باغ ہے اب جب باغ میں پھل لگے گا تو کاٹنے تک اکثر لوگ کھا جاتے ہیں۔ یا کسی کو ہدیہ دے دیتے ہیں۔ تو پورے باغ کے مکمل پھل کو جمع کر کے اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے اس کا موقع ہی نہیں آتا۔ بلکہ درخت پر لگے ہوئے ہی کھا لیتے ہیں۔ اس لئے شریعت نے اجازت دی ہے کہ بیت المال کی طرف سے عامل جائے گا۔ وہ اندازہ کرے گا کہ مثلاً اس باغ میں دس من کھجور ہیں تو اس اندازے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ پرندے بھی کھا سکتے ہیں۔ اس لئے عامل ایک ثلث اندازے سے کم کر دے اور کہے کہ اس میں ساڑھے چھ من کھجور کی اتنی زکوٰۃ ہے۔ خرص کی یہ صورت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح تمر میں خرص کی صورت جائز ہے۔ انگوروں میں بھی خرص جائز ہے احناف کے دو قول نقل کئے جاتے ہیں۔ ایک جمہور کی طرح ہے۔ مگر دوسرا قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ انگور میں خرص جائز نہیں کیونکہ انگور کی زکوٰۃ انگور کی صورت میں اور کھجور کی زکوٰۃ کھجور کی صورت میں تب واجب ہوتی ہے جب وہ درخت پر لگے ہوئے ہوں۔ اس کو مالک کو دے دیا جائے اور اس سے تیار شدہ تمر یا زبیب لیا جائے۔ یہ بیع کی صورت بنتی ہے۔ اور بیع کی یہ صورت ممنوع ہے۔

باب ماجاء في العامل على الصدقة بالحق

مسئلہ:۔ "عامل على الصدقه بالحق" کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی حکومت کی طرف سے صدقے پر عامل مقرر ہوا۔ اب اس کی چند صورتیں ہیں۔ (۱) وہ مال والوں کو تنگ کرتا ہے اور حکومت کو فائدہ پہنچاتا ہے (۲) حکومت کا نقصان کرتا ہے اور اصحاب المال کو فائدہ پہنچاتا ہے کہ حق کم لیتا ہے (۳) نہ حکومت کا نقصان کرتا ہے اور نہ اصحاب اموال کا۔ بلکہ جو حق بنتا ہے وہی لیتا ہے۔ اب اصحاب الاموال کو تنگ کرنے والا معتدی ہے اور حکومت کو نقصان پہنچانے والا بھی معتدی ہے۔ یہ دونوں صورتیں اعتداء کی ہیں۔ (۴) اصحاب الاموال سے کم حق وصول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بھی کچھ دو (۵) یہ صورت سد الذرائع منع کی گئی ہے۔ مثلاً ایک آدمی نہ اصحاب الاموال کا نقصان کرتا ہے نہ حکومت کا۔ لیکن لوگ اس کو الگ ہدیہ دے دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نے اور لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچایا مگر پھر بھی نبی صلی اللہ علیہ

وسلم نے اس کو منع کر دیا سد اللذ رائع۔ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس نے بطور رشوت لیا ہے۔ یا اس کو بغیر رشوت کے کسی نے ہدیہ دیا ہے اس لئے آپ نے منع فرمایا۔ جس طرح دوسری روایت میں ہے کہ عامل آیا اور کہا کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور فرمایا "هلا جلس فی بيت ابيه و امه فيرى أيهدىٰ اليه ام لا"۔

صحیح صورت تیسری ہے کہ جتنا حق مال والوں پر بنتا ہے۔ وہی لے اور اپنے لئے کچھ نہ لے ایسے عامل کو اتنا ثواب ملے گا جتنا غازی فی سبیل اللہ کو ملتا ہے۔ کیونکہ غازی کا عمل سبب ہوتا ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا۔ اور یہ آدمی بھی صدقہ جمع کرتا ہے۔ اس سے بیت المال مضبوط ہوتا ہے۔ فقراء کو اس میں سے ملے گا۔ جہاد کی تیاری ہوگی تو اس کا فعل بھی اعلاء کلمۃ اللہ کا سبب ہے۔

باب فی المعتدی فی الصدقة

جو آدمی زکوٰۃ لینے میں اعتداء کرتا ہے۔ یعنی اعتداء کی چار صورتیں جو گزری ہیں ان میں سے کوئی صورت اختیار کرتا ہے۔ تو یہ معتدی فی الصدقہ کمانعہا ہے۔ یعنی جتنا گناہ زکوٰۃ نہ دینے والے کو ہوگا۔ اتنا ہی گناہ معتدی فی الصدقہ کو بھی ہوگا کیونکہ یہ سبب بنا ہے اس کے زکوٰۃ نہ دینے کا، کیونکہ اس کی زیادتیوں سے تنگ آیا ہے۔ اس لئے زکوٰۃ دینے سے اس نے انکار کر دیا۔

باب ماجاء فی رضی المصدق

مسئلہ:۔ زکوٰۃ کی وصول یابی کا جو نظام ہے۔ اس کی بناء تین چیزوں پر ہے ① عامل الصدقہ ② اصحاب الاموال ③ وہ مال جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اس سے زکوٰۃ لی جائے۔ اب مال تو غیر مکلف ہے۔ تو اس نظام کی بناء دو چیزوں پر رہ جائے گی نبی ﷺ نے احادیث میں اصحاب الاموال کے لئے بھی قوانین بیان کئے ہیں۔ کہ وہ عامل کی توہین نہ کریں۔ اس کی تعظیم کریں اگر وہ ظلم بھی کرے تو اس وقت نہ لڑیں بلکہ صدقہ دے دیں۔ بعد میں ظلم کا دعویٰ قاضی اور حاکم کے پاس دائر کریں۔ لیکن عامل سے نہ لڑیں کیونکہ اگر شریعت عامل سے لڑنے کی اجازت دے دے۔ تو لوگ اس اجازت کا غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ اس لئے شریعت نے یہ حکم دیا کہ اصحاب الاموال عامل سے نہ لڑیں بلکہ اس کو راضی کریں۔ اور اگر اس نے ظلم کیا تو قاضی سے رجوع کریں۔

دوسری طرف عامل پر بھی شریعت نے احکامات جاری کئے ہیں۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ کبھی جب عامل آجائے تو لوگ دور بھاگ جاتے ہیں، تاکہ عامل کو تکلیف ہو۔ اور کبھی عامل دوسرے شہر میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ دوسرے شہر والے آکر زکوٰۃ دیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں صورتوں کو منع کر دیا۔ اس لئے یہاں فرمایا کہ عامل صدقہ سے جدا ہو تو رضامندی کے ساتھ اگرچہ عامل ظلم بھی کرے۔ جس طرح دوسری حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ تم پر ظلم کریں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک ہے کہ عامل ظلم کرلے پھر بھی زکوٰۃ دو۔

بیہقی وغیرہ نے حدیث ذکر کی ہے کہ جس میں ہے۔ اگر عامل ظلم کرے تو اس کو زکوٰۃ نہ دو۔ اسی وجہ سے بیہقی اور نووی فرماتے ہیں کہ اگر وہ ظلم کرے اور حق زیادہ مانگے تو اس کو نہ دے۔ جمہور احناف کا بھی یہی مسلک ہے کہ شریعت کے دائرے کے اندر اگر ہو تو اس کو خوش رکھے۔ لیکن اگر وہ بہت زیادہ تجاوز کرتا ہے تو اس کو خوش کرنا ضروری نہیں۔

باب ماجاء ان الصدقة تؤخذ من الاغنياء فترد على الفقراء

مسئلہ:۔ مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی وصول یابی اغنیاء سے کی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کی جائے گی یہ مسئلہ اجماعی اور اتفاقی ہے۔ لیکن

یہاں دوسرا مسئلہ ہے جو اختلافی ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً کراچی کے اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کی۔ اب یہیں کے فقراء پر خرچ کرنا لازمی اور ضروری ہے، یا لاہور کے فقراء پر بھی خرچ اور تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس مسئلے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت اختلافی اور ایک اتفاقی، اتفاقی صورت یہ ہے کہ کراچی کے اغنیاء سے لی اور کراچی میں فقراء بالکل نہیں تو اس صورت میں بالاتفاق لاہور کے فقراء میں تقسیم کرنا جائز ہے۔ اگرچہ ایک قول امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس میں بھی منع کا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کراچی کے اغنیاء سے زکوٰۃ لی اور یہاں فقراء بھی ہیں تو لاہور کے فقراء کو دینا جائز ہے یا نہیں۔ تو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں۔ احناف اور حنابلہ کے ہاں جائز ہے۔ اگر دوسرے علاقے میں رشتہ دار ہوں تو بلا کراہت منتقل کرنا جائز ہے۔ لیکن اگر وجہ ترجیح کوئی نہ ہو دوسری جگہ رشتہ دار نہ ہوں۔ پھر اولیٰ تو یہی ہے کہ اس شہر میں تقسیم کیا جائے مگر پھر بھی منتقل کرنا جائز ہے۔ باقی باب کی حدیث میں جو ہے کہ **تؤ خذ من اغنیائھم و ترد علی فقراء ھم**۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے لے کر مسلمانوں کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا جس علاقے کے بھی ہوں۔

باب من تحل له الزكوٰة

پہلی بات: یہاں مسئلہ یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ زکوٰۃ کن لوگوں کے لئے لینا جائز ہے کن کے لئے جائز نہیں تو فرماتے ہیں کہ آپ کسی کو کوئی چیز دیں تو اس کی چند صورتیں ہیں۔

❶ آپ نے کسی کو کوئی چیز بطور ھبہ اور عطیہ کے دی۔ صدقہ اور ھبہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ میں ابتداء ثواب کی نیت ہوتی ہے۔ جب کہ ھبہ میں ابتداءً دوسرے کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ مآل کے اعتبار سے ثواب مل جاتا ہے۔ اس صورت میں ھبہ اور عطیہ مال دار اور غریب دونوں کو دے سکتے ہیں۔ اور انکو بھی دینا جائز ہے جن کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

❷ کسی کو کوئی چیز دیں بطور صدقہ نافلہ کے صدقہ نافلہ بھی غریب، مالدار اور ان رشتہ داروں کو دینا جائز ہے جن کو شرعاً زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

❸ کسی کو کوئی چیز دیں بطور صدقہ واجبہ کے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ غریب کو دینا جائز ہے غنی کو دینا جائز نہیں۔ معارف السنن میں شاہ صاحبؒ کے حوالے سے منقول ہے کہ غنی کی تین صورتیں ہیں ① اس کے پاس مال نامی نصاب کے بقدر ہو اس کو صدقات واجبہ دینا جائز نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ خود اس پر واجب ہے۔ ② غنی کے پاس نصاب کے بقدر مال ہو مگر وہ مال نامی نہ ہو۔ تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ لیکن اس کو زکوٰۃ دینا بھی جائز نہیں۔ ③ وہ غنی جس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کو غنی بنا دے۔ اس کی تفسیر نبی ﷺ نے کی ہے کہ جس پاس پچاس درہم ہوں۔ یا اس کی مالیت کا سونا ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ کیونکہ یہ صاحب نصاب نہیں اور اس زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ لیکن اس قسم کے آدمی کے لئے سوال کرنا جائز نہ ہوگا۔ امام غزالیؒ کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ کوئی اکیلا آدمی ہو اس کے پاس ایک دن کا خرچہ ہو تو اس کے لئے سوال جائز نہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بغیر مانگنے کے دے دے تو اس کے لئے لینا جائز ہے یا نہیں۔ تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ پھر بھی نہیں لے سکتا۔ لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اگر خود نہ مانگے اور کوئی خود دے دے اور مال لینے سے اس کی عادت بھی خراب نہ ہو تو لینا جائز ہے۔ اگرچہ پچاس درہم موجود ہوں۔

دوسری بات: مصارف زکوٰۃ جو قرآن میں موجود ہیں وہ سب اپنی جگہ باقی ہیں صرف مؤلفۃ القلوب میں اختلاف ہے۔ اس کی بحث آگے آئے گی۔ یہاں صرف یہ اصول سمجھ لیں کہ مصرف کی بنیادی دو چیزیں ہیں۔

① فقر و حاجت ② سفر ان دو چیزوں کی وجہ سے آدمی مستحق زکوٰۃ ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء من لا تحل له الصدقة

مسئلہ: فقیر کے لئے صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں لینا جائز ہیں۔لیکن کوئی ذومرۃ وسوی ہو یعنی طاقتور اور صحیح الاعضاء ہو تو اس کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں۔جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "لاتحل له الصدقة" لیکن یہ نہی محمول ہے خلاف اولیٰ پر۔لیکن اگر مراد سوال ہو تو ظاہر یہ ہوگی کہ ایسے آدمی کے لیئے سوال کرنا جائز نہیں جس طرح دوسری حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ "لاتحل له المسألة"۔

باب من تحل له الصدقة من الغارمين وغيرهم

مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے جہاں مصارف زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے اس میں والغارمین کا ذکر بھی ہے۔ غارم کسے کہتے ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی جو مقروض ہو قرضہ جیسا بھی ہو۔اس کے پاس ادا کرنے کے لئے مال نہ ہو یہ غارم ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غارم وہ ہے جو دوسروں کی دیت اور ضمان کو اپنے ذمے لے لے۔مثلاً دو آدمیوں میں صلح کرائی اور کہا کہ دیت میں دوں گا۔

اب کسی آدمی کے پاس پیسے موجود ہیں مثلاً ایک لاکھ موجود ہیں اور اس پر قرض دو لاکھ ہے۔تو امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر زکوٰۃ نہیں۔کیونکہ زکوٰۃ اس پر آتی ہے جو قضاء دین سے زائد اور فارغ ہو اور اس کا مال زائد نہیں۔امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔کیونکہ مال موجود ہے۔دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں۔یا اس کیلئے زکوٰۃ مانگنا جائز ہے یا نہیں۔تو امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔اور مانگنا بھی جائز ہے۔باب کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں کسی نے پھل خریدے۔اس کو نقصان ہوا جس کی وجہ سے مقروض ہو گیا۔آپ ﷺ نے فرمایا اس پر صدقہ کرو لوگوں نے صدقہ کیا۔ مگر اس کے قرض کے برابر نہ ہو سکا تو آپ نے غرماء کو فرمایا "ليس لكم الا ذلك" اب اس کا کیا مطلب ہے تو فرماتے ہیں۔کہ یہ بطور صلح فرمایا۔کہ تمہارے لئے یہی کچھ ہے باقی معاف کرو۔دوسرا مطلب نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔کہ اس وقت تمہارے لئے یہی ہے۔تمہیں اس وقت اور نہیں ملے گا۔اور یہ معسر ہے اور اس کے بارے میں حکم ہے کہ "فنظرة الى ميسره" اس لئے جب تک مال نہ آجائے اس کے پاس اس وقت تک تم مطالبہ نہیں کر سکتے۔

باب ماجاء فى كراهية الصدقة للنبى صلى الله عليه وسلم واهل بيته ومواليه

پہلی بات: نبی اکرم ﷺ کے لئے صدقہ واجبہ اور نفلیہ دونوں انواع حلال نہیں نہ آپ کے لئے نہ آپ کے اہل بیت اور موالی کے لئے۔اس لئے جب آپ کے پاس کوئی چیز لائے جاتی تھی تو آپ پوچھتے تھے اگر صدقہ ہوتا تھا تو نہیں کھاتے اور اگر ہدیہ ہوتا تو کھا لیتے تھے۔باقی صدقہ اور ہدیہ میں فرق پہلے گزر چکا ہے۔اب یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ سیدوں کے لئے صدقہ کھانا جائز نہیں بعض فقہاء احناف کی رائے یہ ہے کہ صدقات واجبہ یا نافلہ سے ان کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز نہیں۔صدقہ کا عدم جواز نبی اکرم ﷺ اور آپ کے آل کے اعزاز کی وجہ سے ہے۔کیونکہ حدیث میں ہے کہ یہ اوساخ الناس میں سے ہیں۔اس لئے یہ محمد ﷺ اور اس کے آل کے لئے جائز نہیں۔

دوسری بات: اہل بیت سے آل جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آل عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آل عقیل، آل حارث بن عبدالمطلب

مراد ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے جواز کا قول ہے۔ اسی طرح طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابو یوسف سے جواز کا قول نقل کیا ہے۔ مگر صحیح عدم جواز ہے۔ البتہ بعض متأخرین کہتے ہیں کہ ان کو بیت المال سے حصہ ملتا تھا اور اب بیت المال نہیں رہا اس لئے اب جواز کی صورت نکالنی چاہئے۔ مگر بعض کہتے ہیں اب بھی جائز نہیں۔

باب ماجاء فی الصدقة علیٰ ذی القرابة

گزر چکا ہے کہ صدقہ دو قسم کا ہے ایک صدقہ واجبہ اور ایک صدقہ نافلہ۔ صدقہ نافلہ سب کو دینا جائز ہے اور رشتہ داروں کو دینے میں ڈبل ثواب ہے۔ باقی صدقہ واجبہ ان کو دینا جائز نہیں جن کے ساتھ زوال یا ولاد کا تعلق ہو۔ اس لئے اپنے اصول اور فروع کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ بعض فقہاء نے اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی جن کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ باقی دوسرے رشتہ دار اگر مستحق ہوں تو ان کو دینا جائز ہے۔

باب ماجاء فی حق السائل

پہلی بات: باب کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن نے ذکر کیا ہے ﴿وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم﴾ اس حق کو حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ سائل کو لوٹانا نہیں چاہئے۔ اگر اور کچھ نہ ہو تو بکری کا جلا ہوا کھر ہو وہی دو۔ یہ کنایہ ہے قلت سے اور کنایہ ہے بے قیمت سے کہ کوئی چیز زیادہ نہ ہو یا قیمتی نہ ہو تو کم ہو یا بے قیمت ہو وہی دو۔

دوسری بات: باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہئے۔ اگر کوئی سائل گھر کے دروازے پر آئے اب اگر سائل ایسا ہو کہ صحیح سالم ہو اس کے لئے مانگنا جائز نہ ہو۔ تو ایسے آدمی کو لوٹانا جائز ہے۔ مگر یہ تب جب اس کی عادت بن گئی ہو۔ لیکن اگر وقتی ضرورت ہو تو پھر اس کو واپس نہیں کرنا چاہئے۔ اگرچہ وہ سالم الاعضاء ہو۔ اور اگر سائل ایسا ہو کہ اس کے لئے مانگنا جائز ہو مثلاً بوڑھا ہو یا سالم الاعضاء نہ ہو تو ایسے آدمی کا حکم یہاں مذکور ہے کہ ایسی آدمی کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہئے۔ باقی سائل کسی قسم کا بھی ہو اس کو جھڑکنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی اعطاء المؤلفة قلوبهم

مسئلہ: یہ مسئلہ مولفۃ القلوب کو صدقہ دینے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں مصارف زکوٰۃ ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مولفۃ القلوب کو بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا مشہور معنی یہ ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو کفار میں سے تھے۔ یا ظاہری طور پر مسلمانوں کے قریب ہو گئے تھے تو نبی ﷺ ان کو اموال دیتے رہے یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئے یا وہ لوگ جو ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کا اسلام مضبوط نہ تھا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو ملا دیا یہاں تک کہ ان کا ایمان پکا ہو گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کمزور تھا۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو طاقت دی تو یہ مصرف ساقط ہو گیا۔ یہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ، اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مصرف باقی ہے مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول معارف السنن میں نقل کیا ہے کہ مولفۃ القلوب کی کئی انواع تھیں۔ ان میں سے بعض منسوخ ہیں اور بعض اب بھی باقی ہیں۔

❶ ایک تو وہ کفار تھے جن سے اسلام کو نقصان کا خطرہ تھا۔ ان کو مال دیتے تھے نقصان سے بچنے کے لیے یہ منسوخ ہو گیا ہے۔

❷ وہ کفار جو اسلام کی طرف راغب تھے مزید ترغیب کے لیے ان کو مال دیا جاتا تھا۔ یہ بھی منسوخ ہو گیا ہے۔

❸ یا وہ بڑے سردار تھے جو اسلام لا چکے تھے ان کو مال دیتے تھے تاکہ دوسرے بھی مسلمان ہو جائیں کہ مسلمان تو خوب مدد کرتے ہیں۔ یہ مصرف اس معنی کے اعتبار سے اب بھی باقی ہے۔

❹ یہ کہ سرحد کے قریب کوئی آدمی ہوتا تھا جو لشکر والوں کا تعاون کرتا تھا اس کو نبی ﷺ مال دیتے تھے تاکہ لشکر والوں کی مدد کرے اس معنے کے اعتبار سے یہ مصرف اب بھی باقی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بھی اسی پر محمول ہے کہ بعض اقسام کے اعتبار سے منسوخ ہے اور بعض اقسام کے اعتبار سے موجود ہے۔

باب ماجاء فی المتصدق یرث صدقة

پہلی بات: بریدۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی پاس بیٹھا تھا ایک عورت آئی کہنے لگی کہ میں نے والدہ کو لونڈی دی تھی۔ اب میری ماں مرگئی تو لونڈی کے ساتھ کیا کروں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں اجر بھی مل گیا اور لونڈی بھی واپس مل گئی بطور میراث کے۔ یہ پہلا مسئلہ ہے جس کیلیے ترمذی نے باب قائم کیا ہے کہ کوئی چیز کسی کو صدقہ میں دی اب وہ مرگیا اور میراث میں وہ چیز اس کو مل گئی تو اس کو اجر بھی ملے گا اور واپس لینا جائز ہے۔ یہ مسئلہ اتفاقی ہے۔

دوسری بات: دوسرا مسئلہ یہ کہ اس عورت نے کہا میری والدہ پر ایک ماہ کے روزے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا "صومی عنها اب مسئلہ یہ ہے کہ عبادت میں نیابت ہوسکتی ہے یا نہیں۔ عبادت تین قسم کی ہیں۔

❶ عبادت مالیہ محضہ اس میں نیابت جائز ہے کہ کوئی اس چیز کے کرنے پر قادر ہو یا نہ ہو جیسے زکوٰۃ آپ ادا کرسکتے ہیں۔ مگر پھر بھی نائب مقرر کریں تو جائز ہے۔

❷ مالی عبادت اور بدنی عبادت جیسے حج اس میں نیابت عجز کی صورت جائز ہے بدون عجز نیابت جائز نہیں۔

❸ عبادت بدنیہ محضہ جیسے نماز، روزہ وغیرہ اس میں نیابت جائز ہے یا نہیں۔ تو امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مشہور قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ عبادت بدنیہ میں نیابت جائز نہیں۔ دوسرا قول امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ عبادات بدنیہ محضہ میں بھی نیابت جائز ہے۔ تیسرا قول امام احمد رحمہ اللہ کا ہے فرماتے ہیں کہ صوم فرض میں نیابت جائز نہیں صوم نذر وغیرہ میں جائز ہے۔ ان کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ جو عبادات بدنیہ محضہ میں نیابت کے قائل ہیں۔ احناف کی دلیل مشہور حدیث ہے "لا یصلی احد عن احد ولا یصوم احد عن احد" یہ کئی طرق سے ثابت ہے۔ اس لئے۔ باب کی حدیث جمہور کے ہاں منسوخ ہے یا "صومی عنها" کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف سے روزے کا کفارہ ادا کرو۔

باب ماجاء فی کراهیة العود جی الصدقة

مسئلہ:۔ عود فی الصدقہ کی صورت یہ ہے کہ آدمی صدقہ کرے پھر پشیمان ہو کہ اس کو واپس لے لے حدیث نقل کی ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی کو گھوڑا دیا، اب وہ آدمی فروخت کرنے لگا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خریدنا چاہا تو نبی اکرم ﷺ نے عود سے منع کیا۔ یہ حدیث دوسری حدیث کے خلاف ہے کہ جب فرس کسی کے ملک میں آگیا تو اب وہ فروخت کررہا ہے تو ہدیہ کرنے والا آدمی بھی لے سکتا ہے۔ دوسرا بھی لے سکتا ہے۔ کیونکہ متصدق بھی اجنبی کی طرح ہے پھر نبی اکرم ﷺ نے منع کیوں کیا؟ جواب اس منع کی علت یہ نہ تھی کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خریدنا جائز نہیں بلکہ اس میں یہ ممکن تھا کہ وہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احسان کی وجہ سے ان سے قیمت میں رعایت کرے اور ان کا نقصان ہو بالفاظ دیگر یہ حقیقۃً عود نہیں بلکہ صورۃً عود ہے۔ اس لیے نبی ﷺ نے صورت عود سے منع کردیا۔

باب ماجاء فی الصدقة عن المیت

مسئلہ: یہاں ایصال ثواب کا مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔ قرآن میں ہے ﴿لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ وأن لیس للانسان الا ماسعی﴾ ان سے بظاہر معلوم ہوتا کہ دوسرے کے عمل سے مردے کو نہ ثواب ملتا ہے نہ گناہ پہنچتا ہے۔ مگر احادیث سے ثابت ہے کہ زندہ آدمی کے عمل کا ثواب مردے کو ملتا ہے۔ جیسا کہ باب کی حدیث میں صدقہ مالیہ کے ثواب کے پہنچنے کا ذکر ہے۔ یہ حدیث سنداً احسن

ہے۔اس کے علاوہ کئی احادیث سے ثابت ہے۔آج کل منکرین حدیث اس کے منکر ہے۔وہ انکار حدیث پر آمادہ کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔مثلاً عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شادی کے متعلق یا ایصال ثواب کے متعلق شکوک پیدا کرتے ہیں۔ آخر میں جا کر حدیث کا بالکل انکار کر دیتے ہیں۔یہ مسئلہ بھی ایسا ہے کہ منکرین حدیث اس کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس باب کی احادیث ساری غلط ہیں۔جب کہ احادیث متواترہ سے ایصال ثواب ثابت ہے۔''

لیس للانسان الا ماسعیٰ'' کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے پوری احادیث نقل کی ہیں۔اس مسئلے کا حاصل یہ ہے کہ صدقات مالیہ کا ثواب بالاتفاق میت کو پہنچتا ہے تلاوت قرآن کے متعلق شوافع کے دوقول ہیں جواز کا بھی اور عدم جواز کا بھی۔احناف کے ہاں عبادات بدنیہ اور مالیہ دونوں کا ثواب ملتا ہے۔مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ ''لیس للانسا ن الا ماسعی'' سے سعی ایمانی مراد ہے کہ خود ایمان لایا تو فائدہ ہوگا۔ورنہ دوسرے کے ایمان کا اس کو فائدہ نہ ہوگا۔باقی سعی عملی مراد نہیں کیونکہ سعی عملی احادیث سے ثابت ہے۔

باب ماجاء فی صدقة الفطر

پہلی بات: صدقہ فطر کے بہت سارے مسائل ہیں۔جو اختلافی ہیں۔پہلا اختلاف اس کے حکم میں ہے۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں واجب ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد اور اسحٰق کے ہاں فرض ہے۔یہ فرض لے لئے رسول اللہ ﷺ کے الفاظ سے استدلال کرتے ہیں۔مگر احناف کہتے ہیں کہ فرض بمعنی قدر کے ہے۔باقی وجوب کی دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ''صدقۃ الفطر واجب علی کل مسلم'' اگر چہ احادیث میں واجب یا فرض کا لفظ ہو تو اس سے فقہاء کی اصلاح حدیثہ مراد نہیں ہوتیں۔بہر حال وجوب کا لفظ ملتا ہے۔

دوسری بات: صدقہ فطر کس پر واجب ہے۔احناف کے ہاں ہر مسلمان پر اپنا بھی اور نابالغ اولاد، غلام سب کا صدقہ واجب ہے چاہے غلام مسلمان ہو یا کافر۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف مسلمان غلام کا صدقہ واجب ہے۔احادیث دونوں قسم کی ہیں بعض میں ''من المسلین'' کی قید ہے اور بعض میں نہیں۔

تیسری بات: بیوی کا صدقہ فطر احناف کے ہاں خود اس پر واجب ہے۔شوافع کے ہاں بیوی کا صدقہ زوج پر واجب ہے۔

چوتھی بات: صدقہ فطر کھجور کشمش اور شعیر میں ایک صاع ہے۔اور گندم سے جمہور کے ہاں نصف صاع ادا کرے گا۔اس بارے میں دو قسم کی احادیث ہیں۔ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ہم طعام سے ایک صاع نکالتے تھے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مدینہ آئے فرمایا کہ گندم سے نصف صاع دیا جائے گا۔صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو قبول کر لیا۔بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ گندم کا نصف صاع خود نبی ﷺ سے منقول ہے طعام سے گندم مراد نہیں۔چنانچہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے حدیث منقول ہے۔جس میں ہے ''صدقة الفطر واجب علی کل مسلم ذکر او انثی حر او عبد صغیر او کبیر مدان من قمح او سواہ صاع من طعام'' معلوم ہوا گندم کی نصف صاع نبی ﷺ نے مقرر کی ہے۔دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ گندم اس طعام میں داخل نہیں جس کا حدیث میں ذکر ہے۔کیونکہ یہاں دونوں کو الگ ذکر کیا ہے۔

باب ماجاء فی تقدیمها قبل الصلاة

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ صدقہ فطر کو نماز عید سے پہلے ادا کرنا مستحب ہے۔یہ مسئلہ اس حد تک اتفاقی ہے کہ نماز عید سے پہلے ادا کرنا مستحب ہے لیکن کتنی تقدیم جائز ہے یہ اختلافی مسئلہ ہے۔① امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سال بلکہ دو سال پہلے بھی صدقہ فطر ادا کرنا

جائز ہے۔ (۲) امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تین قول ہیں۔ (۱) ایک سال پہلے ادا کر سکتا ہے۔ (۲) رمضان کا چاند نظر آ گیا تو صدقہ فطر دے سکتا ہے۔ (۳) صدقہ فطر کی ادائیگی رمضان کے پہلے روزے کے طلوع فجر کے بعد جائز ہے طلوع فجر سے پہلے جائز نہیں (۴) امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دو دن تقدیم مستحب ہے اس سے زیادہ جائز نہیں۔

باب ماجاء فی تعجیل الزکوٰۃ

مسئلہ:۔ یہاں تعجیل زکوٰۃ کا مسئلہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ سے سال یا چھ ماہ پہلے کوئی زکوٰۃ دے دے تو یہ جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے (۱) سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تعجیل زکوٰۃ جائز نہیں۔ (۲) امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تعجیل سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ مگر تعجیل مکروہ ہے۔ (۳) جمہور یعنی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور صاحبین رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تعجیل زکوٰۃ بغیر کراہت کے جائز ہے۔ بشرطیکہ آدمی نصاب کا مالک ہو۔ جمہور باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی کی اجازت دی تھی۔ اسی طرح عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ نہیں دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم نے ان سے ایک سال پہلے زکوٰۃ لے لی ہے۔ یہاں اختصار ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن جمیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کی تھی الخ جمہور کہتے ہیں کہ نفس وجوب الگ ہے اور وجوب ادا الگ ہے۔ جب انسان نصاب کا ملک ہو جائے تو نفس وجوب ہو گیا۔ کیونکہ نفس وجوب کا سبب مالک ہے۔ اور وجوب ادا کا سبب حولان حول ہے۔ اب کوئی حولان حول کے بعد زکوٰۃ دے تو وہ وجوب کے بعد دے رہا ہے۔ بغیر وجوب کے نہیں دے رہا۔

باب ماجا فی النھی عن المسئلۃ

پہلی بات: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ سوال کرنے کا حکم کیا ہے؟ فقہاء کہتے ہیں کہ بلاضرورت سوال کرنا حرام ہے اور اگر ضرورت ہو تو تین شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ (۱) ایسے طریقے سے نہ مانگے کہ اس کی ذلت ظاہر ہو۔ (۲) الحاح نہ کرے (۳) مسئول عنہ کو بار بار مانگ کر تکلیف نہ پہنچائے۔

دوسری بات: ضرورت کیا ہے جس کی وجہ سے مانگنا جائز ہے۔ صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ جس کے پاس ایک دن کا کھانا موجود ہو اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں۔ چاہے ایک دن کا کھانا پینا بالفعل موجود ہو یا بالقوۃ ہو یعنی تندرست آدمی ہے کما کر ایک دن کا کھانا بنا سکتا ہے۔ اس لئے اگر کسی مدرسہ میں ایک دن کا کھانا موجود ہو تو مہتمم صاحب کے لئے مانگنا جائز نہیں۔

تیسری بات: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فانا الید العلیا خیر من الید السفلی" معارف السنن میں اس کی تفسیر میں سات اقوال نقل کئے ہیں۔ (۱) راجح یہ ہے کہ ید علیاء سے ید منفقہ مراد ہے اور ید سفلیٰ سے ید سائلہ مراد ہے۔ (۲) بعض نے کہا ہے کہ ید علیا سے منفقہ اور ید سفلیٰ سے ید مانعہ مراد ہے۔ (۳) بعض نے کہا ہے کہ ید علیا سے وہ مراد ہے جو زیادہ خرچ کرے اور ید سفلیٰ سے وہ ید مراد ہے جو کم خرچ کرتا ہے۔ (۴) بعض نے کہا ہے کہ ید علیا سے ید منفقہ مراد ہے اور سفلیٰ سے ید آخذہ مراد ہے۔

ابواب الصوم

پہلی بات: صوم کا لغوی معنی مطلقاً امساک ہے۔ اصطلاح شرع میں صوم اس کو کہتے کہ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک نیت

کے ساتھ مفطرات ثلاث سے اجتناب کرنا۔

دوسری بات: صوم کی مشروعیت کب ہوئی، معارف السنن میں ہے کہ صحیح قول کے مطابق اس کی مشروعیت ۲ھ میں شعبان میں ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے پہلے ایام بیض (۱۳،۱۴،۱۵) کے روزے فرض تھے۔

اسی طرح یوم عاشورا کا روزہ بھی تھا۔ مگر رمضان کے روزے کی فرضیت کے بعد ایام بیض اور یوم عاشوراء کی فرضیت ختم ہوگئی۔ لیکن استحباب اب بھی باقی ہے۔ معارف السنن میں ایک بحث کی ہے کہ مہینوں کے جو نام ہیں۔ ان کو شہر کے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ مگر یہ لغوی بحث ہے۔ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں۔

پہلے باب میں رمضان المبارک کی فضیلت کا بیان ہے۔ اور اس کی فضیلت بالکل واضح ہے۔ باقی یہاں حدیث میں ہے کہ شیطانوں کو بند کیا جاتا ہے۔ بعض کے ہاں یہ ظاہری معنی پر محمول ہے۔ بعض کہتے ہیں ''صفدت الشیاطین ومردة الجن'' یہ کنایہ ہے رمضان کے کثرت ثواب سے کہ اس ماہ میں ثواب بھی زیادہ ملتا ہے اور ثواب کے مواقع بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ جب کہ گناہوں کے مواقع کم ہوتے ہیں۔

اشکال:۔ جب شیطان بند ہوتے ہیں تو آدمی گناہ کیوں کرتا ہے؟

جواب:۔ گناہوں کے کئی اسباب میں صرف شیاطین نہیں بلکہ نفس بھی ایسی چیز ہے جو برائی کا حکم دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اسباب ہیں۔

باب ماجاء لاتتقدموا الشهر بصوم

باب کی حدیث کا مقصود یہ ہے کہ کوئی آدمی نفل روزہ رکھنے کا عادی نہیں۔ لیکن رمضان کے مہینے کی وجہ سے رمضان کی تعظیم کے لئے ایک دو دن پہلے سے روزہ شروع کرتا ہے یا شک کی وجہ سے رکھتا ہے۔ اس کو نبی اکرم ﷺ نے منع کیا۔ بلکہ بعض احادیث میں شعبان میں اور بعض میں پندرہ شعبان کے بعد روزہ سے منع کیا ہے۔ کیونکہ بعض کمزور ہوتے ہیں۔ وہ ابھی سے رکھیں تو رمضان تک تھک جائیں گے پھر فرض نہ رکھ سکیں گے۔ اگر کسی آدمی کی عادت تھی کہ وہ مخصوص دنوں میں روزے رکھتا تھا اب اس کے وہ مقرر دن شعبان میں آگئے یعنی شعبان کے آخری دنوں میں آگئے تو پھر ایسا آدمی رکھ سکتا ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة صوم یوم الشک

پہلی بات: یوم الشک کس دن کو کہتے ہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ شعبان کی تیسویں تاریخ کو عموماً شک ہوتا ہے کہ یہ شعبان کی آخری تاریخ ہے یا رمضان کی پہلی تاریخ ہے۔ یہ یوم الشک ہے۔ دوسرا یہ کہ تیس تاریخ کو یوم الشک تب ہوگا جب آسمان بھی صاف ہو اور چاند بھی نظر نہ آئے۔ لیکن اگر بادل ہیں اور چاند نظر نہ آیا۔ تو حدیث کے مطابق شعبان کی تیس تاریخ ہوگی۔ کیونکہ حدیث میں ہے ''صوموا الرؤیته وافطروا لرؤیته وان غمّ علیکم فعدوا ثلثین''۔

دوسری بات: یوم الشک کے روزے کا کیا حکم ہے؟ معارف السنن میں ہے کہ جمہور صحابہ، ائمہ اربعہ، تابعین فقہاء ومحدثین اس کی کراہت پر متفق ہیں۔ بعض فقہاء نے تفصیل بیان کی ہے کہ یوم الشک کی چند صورتیں ہیں۔

❶ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی یوم الشک کو رمضان کے فرض روزے کی نیت سے روزہ رکھے یہ مکروہ ہے۔

❷ دوسری صورت یہ ہے کہ نفل کی نیت کرے پھر دیکھیں گے کہ اس سے پہلے روزہ رکھنے کی عادت تھی یا نہیں۔ اگر اس خاص دن روزہ

رکھنا اس کی عادت ہو تو اس میں کراہت نہ ہوگی۔

③ شک کے ساتھ نیت کرے کہ اگر آج رمضان ہوا تو میرا روزہ فرض ہے اور اگر تیس شعبان ہے تو میرا نفلی روزہ ہے۔ باب کی حدیث سے یہی صورت مراد ہے۔ یہ بالا جماع ممنوع اور مکروہ صورت ہے۔ بعض حضرات نے اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ عوام کے لئے روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ عام طور پر روزے میں شک پڑتا ہے۔ لیکن علماء وغیرہ کو اس دن میں شک نہیں ہوتا بلکہ علم ہوتا ہے یا کسی کی پہلے سے عادت ہو تو اس کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی احصاء هلال شعبان لرمضان

پہلی بات: مہینے کے ثبوت کے کئی طریقے ہیں۔ ① رویت ہلال کی گواہی ثابت ہو جائے۔ ② دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گزرے ہوئے مہینہ کے تیس دن پورے ہو جائیں۔ اب شعبان کے مہینہ کو جب گنیں گے تو شعبان کا مہینہ گواہی سے ثابت ہوا ہو تو شعبان کے تیس دن پورے ہو جائے گے تو اگلے دن شہادت ملے یا نہ ملے رمضان کی پہلی تاریخ ہوگی۔ باب کی حدیث میں دوسرا طریقہ بیان کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات: باب کی حدیث کا مقصد اہتمام رمضان ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ رمضان کے مہینے کے ثبوت کے لئے شعبان کے دنوں کو گنا جائے۔ ثبوت شہر کا دوسرا طریقہ دوسرے باب میں ذکر کیا ہے کہ چاند کو دیکھ لو تو روزہ رکھو۔ دوسرے باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ بعض لوگ جو لمبا حساب لگاتے ہیں کہ فلاں دن فلاں تاریخ تھی اور فلاں دن فلاں تاریخ تھی۔ تو شکوک و شبہات میں نہیں پڑنا چاہیئے، بلکہ عام مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھو اور افطار کرو۔

باب ماجاء فی الصوم بالشهادة

مسئلہ: رمضان المبارک کا ثبوت شہادت کے ذریعے سے ہو اس کے بارے میں یہ باب قائم کیا جا رہا ہے۔ ثبوت الشہر بالشہادۃ ہو تو فقہ حنفی میں لکھا ہے کہ اگر مطلع ابر آلود ہو تو ثبوت رمضان ایک آدمی کی شہادت سے ہو جائے گا۔ بشرطیکہ قبولیت شہادت کی شرائط اس میں موجود ہوں۔ اور اگر مطلع صاف ہو اور بادل آسمان میں نہیں تو پھر ایک یا دو آدمیوں کی گواہی کافی نہیں بلکہ جم غفیر کا ہونا ضروری ہے۔ اور فطر کے ثبوت کی صورت یہ ہے کہ اگر مطلع ابر آلود ہو تو دو آدمیوں کی گواہی سے فطر ثابت ہوگا۔ اگر بادل نہ ہو تو پھر جمع غفیر ضروری ہے۔ آگے ایک حدیث آرہی ہے۔ اس میں آپ ﷺ نے فطر کا ثبوت ایک آدمی کی گواہی سے کیا ہے بادل کے دن۔ تو یہ اشکال ہوتا ہے۔

شاہ صاحب: رحمہ اللہ تعالیٰ نے شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ابتداء فطر کا ثبوت ایک آدمی کی گواہی سے ہو یہ جائز نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ رمضان کا ثبوت ایک آدمی کی گواہی سے ہوا۔ پھر رمضان کے دن گزرے اور آخر میں تیس دن کے بعد عید الفطر منائی گئی تو مآل کے اعتبار سے فطر کا اثبات ایک آدمی کی گواہی سے ہوا یہ صورت جائز نہیں۔

اگر دن کے وقت دو تین آدمی آکر گواہی دیں کہ آج ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ لیکن اگر وہ یہ گواہی دیں کہ ہم نے کل شام کو چاند دیکھا ہے تو ان کی گواہی قبول ہوگی۔

باب ماجاء شهر اعید لا ینقصان

مسئلہ: باب کی حدیث محدثین کے ہاں مشکل ہے۔ کیونکہ اس کا ظاہری مطلب حس کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دو مہینے ناقص نہیں ہوتے۔ جب کہ کبھی دونوں ۲۹ دن کے ہوتے ہیں۔ معارف السنن میں اس

حدیث کے مفہوم کے متعلق ۱۹ اقوال نقل کئے ہیں۔ صحیح تر دو ہیں۔ (۱) امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ "لا ینقص فی الاجر" کہ اجر میں دونوں مہینے کم نہیں ہوتے۔ یعنی ۲۹ دن کے رمضان میں اتنا اجر ملے گا۔ جو تیس دن کے رمضان سے ملتا ہے۔ اسیطرح ذی الحجہ مخصوص عبادت (حج) کا مہینہ ہے۔ تو اگر وہ ۲۹ کا ہو جائے۔ تو اس سے ثواب پر اثر نہیں پڑے گا۔ مگر اس قول پر اشکال ہوتا ہے کہ رمضان میں تو یہ جواب چل سکتا ہے۔ ذی الحجہ میں تو ۱۳ تاریخ کو وہ مخصوص عبادت ختم ہو جاتی ہے۔ چاہے مہینہ تیس کو ہو یا انتیس کا۔ (۲) امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بیہقی نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "لا ینقصن فی الا احکام" کہ اس مہینے میں جو احکام ہیں وہ کامل ہیں مہینے کی ۲۹ یا ۳۰ ہونے سے فرق نہیں آتا حکم کامل شمار ہوگا۔ یہ قول زیادہ راجح۔ بعض نے اور کئی اقوال نقل کئے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ دونوں مہینے کبھی ناقص نہیں ہوتے مگر غلط ہے۔ بعض نے مطلب یہ لکھا ہے کہ ایک سال میں دونوں ناقص نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک ناقص ہو تو دوسرا کامل ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی مشاہدے کے خلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بظاہر ۲۹ دن کے آئیں گے مگر حقیقۃً کم نہیں ہوتے۔ غرض کئی اقوال ہیں مگر صحیح پہلے دو ہیں۔

باب ماجاء لکل اھل بلدرؤ یتھم

مسئلہ:۔ اس باب کے مسئلے کا عنوان یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ اس میں ائمہ کے تین قول ہیں (۱) اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔ اس لئے اگر مشرق میں چاند نظر آیا تو اہل مغرب کے لئے بھی وہ معتبر ہوگا۔ و کذلک بالعکس یہ احناف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مالکیہ اور حنابلہ کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ باب کی حدیث بظاہر احناف کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ اس میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام والوں کا دیکھنا مدینہ والوں کے لئے معتبر نہیں سمجھا (۲) یہ شہر والوں کا دیکھنا صرف انہیں کے لئے معتبر ہوگا دوسروں کے لئے نہیں یہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ (۳) بعض نے تیسرے قول کو اجماع قرار دیا۔ محققین احناف نے بھی اس کو اختیار کیا ہے کہ بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع معتبر ہے۔ لیکن بلاد قریبہ میں اختلاف مطالع معتبر نہیں۔ اب بلاد قریبہ اور بعیدہ میں فرق کا پیمانہ کیا ہوگا تو زیلعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ان کے دیکھنے کو معتبر قرار دیں تو ہمارا مہینہ اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہ بنے تو وہ بلاد قریبہ ہوں گے۔ اور اگر ۲۸ یا ۳۱ دن کا بنے تو یہ بلاد بعیدہ ہوں گے۔ جیسے ہند اور قسطنطنیہ۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل شام کے دیکھنے کو اہل مدینہ کے لئے معتبر اس لئے نہیں سمجھا کیونکہ یہ بلاد بعیدہ تھے۔

باب ماجاء مایستحب علیہ الا فطار

اس باب میں فقہی مسئلہ نہیں بلکہ استحبابی حکم ہے کہ افضل یہ ہے کہ کھجور سے افطار کیا جائے۔ لیکن اگر نہ ہوں تو پھر پانی سے افطار کرے وجہ اس کی یہ ہے کہ آدمی روزہ رکھے تو پیاس لگ جاتی ہے اور معدہ خالی ہوتا ہے۔ اور خالی معدہ میں میٹھی چیز پہلے چلی جائے تو معدہ خراب نہیں ہوتا۔ اور اس زمانے میں میٹھی چیزوں میں سے زیادہ کھجور ہی ملتی تھی۔ اس لئے اس سے افطار کا حکم دیا۔

باب ماجاء ان الفطر یوم تفطرون والا ضحی یوم تضحون

اس ترجمۃ الباب کا مقصد ازالہ شبہات ہے۔ بعض حضرات کے دلوں میں ہمیشہ یہ شبہ رہتا ہے کہ مثلاً ہم نے روزہ رکھا تو واقعۃً یہ روزہ کا دن تھا یا نہیں۔ اسی طرح افطار کر کے عید کریں تو شبہ رہتا ہے کہ آج افطار کا دن ہے یا نہیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شبہات کا ازالہ کیا کہ جس دن عام مسلمان عید الفطر منائیں یا روزہ رکھیں یا عید قربان منائیں تو تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو شبہات میں نہ پڑو۔

باب ماجاء فی تعجیل الا فطار وتأخیر السحور

مسئلہ:۔ ائمہ مجتہدین کے نزدیک بالا جماع سحور میں تاخیر مستحب ہے اور افطار میں تعجیل مستحب ہے۔ مگر تعجیل سے بعد دخول وقت مراد ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سحری آخری وقت میں کریں گے۔ تو دن بھر قوت رہے گی۔ اور افطار میں تعجیل اس لئے مستحب ہے کہ آدمی دخول وقت کے بعد ناحق بھوک و پیاس میں مبتلا نہ رہے۔

باب ماجاء فی بیان الفجر

صبح کے طلوع ہونے کا منظر یوں ہوتا ہے کہ مشرق سے مغرب تک طولاً روشنی نمودار ہوتی ہے۔ یہ فجر کاذب کہلاتی ہے۔ پھر دوبارہ روشنی عرضاً افق میں پھیلتی ہے۔ یہ فجر صادق ہے۔ نہار شرعی کی ابتداء صبح صادق کے طلوع کے بعد سے ہوتی ہے۔ اور صبح کاذب لیل میں داخل ہے۔

باب ماجاء فی التشدید فی الغیبة للصائم

اختلاف: امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں روزہ دار غیبت کرے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ جس طرح عمداً کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ جمہور فقہاء اور محدثین کے ہاں غیبت روزے اور غیر روزے دونوں حالتوں میں ممنوع ہے اور حرام ہے۔ اور روزے کی حالت میں اس کی تشدید زیادہ ہے۔ لیکن اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ البتہ روزے کے ثواب اور برکات سے محروم ہو جائے گا۔ تو قبول حسن کا درجہ اور مرتبہ حاصل نہ ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ روزہ تین قسم کا ہے ایک روزہ عوام کا ہوتا ہے عوام کا روزہ یہ ہے کہ مفطرات ثلاثہ سے بچیں۔ اور دوسرا روزہ خواص کا ہے وہ ہے منع الحواس عن الشھوات کہ شہوات سے اپنے حواس کو روکے اور مباحات میں زیادہ منہمک نہ ہو۔ تیسرا روزہ اخص الخواص کا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہیں۔

باب ماجاء فی کراھیة الصوم فی السفر

مسئلہ: سفر میں روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں افطار بہتر ہے اور روزہ مکروہ ہے۔ دوسرے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک روزہ رکھنا عزیمت ہے اور بلا کراہت جائز ہے۔ اور افطار رخصت ہے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ نوجوان کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے۔ اور کمزور کے لئے نہ رکھنا افضل ہے۔ تاکہ دوسروں کے لئے بوجھ نہ بنے۔ اور احادیث میں جہاں آیا ہے کہ "لیس من البر الصیام فی السفر" یہ اس پر محمول ہے کہ وہ آدمی کمزور ہو اب روزہ رکھے گا تو دوسروں کے لئے مصیبت بنے گا۔ باقی جمہور کی دلیل دوسرے باب کی حدیث ہے جس میں ہے" ان شئت فصم وان شئت فافطر" امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ احادیث میں جو ہے کہ جنہوں نے افطار نہ کیا تھا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" اولئک العصاة" یہ محمول ہے اس پر کہ آدمی اللہ کی رخصت کو دل سے قبول نہ کرے اور روزہ رکھے یہ نافرمان ہیں۔ لیکن کوئی آدمی فطر کو مباح سمجھے اور روزہ رکھنے کی طاقت ہو تو روزہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة للمحارب للافطار

پہلی بات: آگے ابواب قائم کئے ہیں جن میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ رمضان میں کن کن آدمیوں پر افطار جائز ہے۔ان میں سے ایک مسافر ہے۔ جو سفر شرعی پر جارہا ہو۔ دوسرا آدمی بیمار ہے کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں تیسرا مرضعہ اور حاملہ عورت ہے جب یہاں بھی نقصان کا اندیشہ ہوتو یہ افطار کرسکتی ہے۔لیکن جو روزے نہ رکھے ہوں ان کی قضاء واجب ہوگی۔ہاں اگر بعد میں بھی روزے کی قضاء پر قادر نہ ہوتو اس کا فدیہ دیں گے۔

دوسری بات: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی سفر کرنا چاہے تو گھر سے اس کو افطار کی اجازت نہ ہوگی۔بعض حضرات کے ہاں اجازت ہے۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں باوجود اس کے کہ گھر سے افطار کرلیا پھر بھی قضاء واجب ہوگی، کفارہ نہ ہوگا۔بعض احادیث میں اس کی اجازت ہے۔

تیسری بات: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی نے روزہ رکھا پھر سفر درمیان میں شروع کیا تو اب افطار نہیں کرسکتا الا کہ بہت مشکل سفر ہوتو افطار کرسکتا ہے۔شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔کہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں لکھا ہے کہ ہمارے ہاں مجاہدین کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ شروع کرنے کے بعد سفر کریں تو افطار کرسکتے ہیں۔جس طرح نبی اکرم ﷺ نے افطار کیا تھا۔لیکن عام آدمیوں کے لئے اجازت نہیں کہ وہ روزہ شروع کرکے سفر کریں تو روزہ توڑ دیں۔

باب ماجاء فی الصائم یذرعه القئی وباب فی من استقاء عمداً

پہلی بات: مسئلہ یہ کہ کسی کو صوم کی حالت میں قئی لاحق ہوجائے۔تو اس کا روزہ قئی سے افطار ہوجاتا ہے۔یا نہیں؟ بالفاظ دیگر قئی اسباب افطار میں سے ہے یا نہیں۔ائمہ کا تقریباً اتفاقی قول ہے کہ اگر قئی خود بخود ہوجائے اور وہ قئی واپس بھی نہ ہوتو وہ قئی باعث افطار نہ ہوگی۔ چاہے منہ بھر کر ہو یا منہ بھر کر نہ ہو۔لیکن اگر قئی آئی اور اس نے اس کو واپس کردیا تو پھر باعث افطار ہوگی

دوسری بات: اگر کوئی عمداً قئی کرے تو باب کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ استقاء باعث افطار ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ قئی سبب افطار نہیں استقاء سبب افطار ہے یہی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے۔

تیسری بات: حجامت باعث افطار نہیں یہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حجامت باعث افطار ہے چنانچہ بعض احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حجامت کرائی اور افطار کردیا۔جمہور اس کا جواب دیتے ہیں کہ نفس حجامت باعث افطار نہیں۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حجامت کے بعد کمزوری لاحق ہوتو افطار کردیا جائے۔

چوتھی بات: تیسری حدیث میں ہے کہ احتلام بھی باعث افطار نہیں یہ اتفاقی ہے۔

باب ماجاء فی الصائم یا کل ویشرب ناسیًا

اختلاف: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ ناسیاً اگر کوئی کھاپی لے تو روزہ افطار نہ ہوگا۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک نفل روزے کے متعلق تو جمہور والا ہے۔لیکن فرض روزے میں کوئی ناسیاً کھاپی لے تو اس پر قضاء لازم ہوگی۔باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے رزق ہے

جواسے دیا گیا ہو۔اس لئے جوناسیا کھالے تو اس کا روزہ افطار نہ ہوگا۔اس میں فرض یا نفل کی قید نہیں بلکہ عام ذکر کیا ہے فرض ہو یا نفل ہو۔

باب ماجاء فی الا فطار متعمداً

اگر کوئی جان بوجھ کر افطار کردے تو اس کا کیا حکم ہے۔باب کی حدیث میں ہیں کہ کسی نے بغیر رخصت یا مرض کے روزے کو افطار کر دیا تو اگر پورا زمانہ روزہ رکھے تو اس سے پھر بھی قضاء نہ ہوگی۔یہاں دوصورتیں ہیں۔ایک صورت یہ ہے کہ اگر کسی نے جان بوجھ کر رات سے روزے کی نیت کی اور دن کو کھاتا رہا تو اس صورت میں صرف قضاء ہے کفارہ نہیں۔دوسری صورت یہ ہے کہ کسی نے رات کو نیت کی پھر دن کو عمداً کھاتا رہا تو اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے باقی حدیث میں جو فرمایا " لم یقض عنه صوم الدهر کله الخ" اس کا مطلب جمہور کے ہاں یہ ہے کہ پورا زمانہ اگر وہ روزہ رکھ لے تو رمضان کے روزے کا جو ثواب ہے وہ ثواب حاصل نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی کفارۃالفطر فی رمضان

پہلی بات: اس باب کی حدیث میں کفارہ کی جو ترتیب ہے کہ پہلے غلام ہو وہ آزاد کرے وہ نہ ہو تو دوماہ کے مسلسل روزے رکھے یہ نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔جمہور کے ہاں یہی ترتیب کفارہ میں ہوگی۔

دوسری بات: یہاں ایک اختلاف ہے وہ یہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو کفارہ حدیث میں موجود ہے یہ متعمداً جماع کی صورت میں ہوگا۔لیکن کوئی متعمداً کھاپی لے تو اس پر کفارہ نہ ہوگا۔احناف کے ہاں متعمداً جماع کرے، کھائے یا پیئے تینوں صورتوں میں کفارہ ہوگا۔

حذہ فاطعمه اهلک الخ باب کی حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اس سے کفارہ ساقط نہیں کیا۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابھی یہ کھاؤ جب قادر ہو جاؤ تو کفارہ ادا کرو۔

باب ماجاء فی الکحل للصائم

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صائم کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے دن کو لگائے یا رات کو لگا کر سو جائے یا نہ سوئے صبح لگائے یا شام کو لگائے۔امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری اور ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صائم کے لئے سرمہ مکروہ ہے۔باب کی حدیث جمہور ائمہ کی متدل ہے۔

باب ماجاء فی القبلة للصائم

مسئلہ: صائم کے لئے قبلہ جائز ہے بعض نے تخصیص کی ہے کہ بڑی عمر کے لوگ تقبیل کر سکتے ہیں۔نوجوان نہیں کر سکتے کیونکہ بڑی عمر والے اپنے اوپر قابو رکھ سکتے ہیں اس لئے وہ اگلے مرحلے میں نہیں جائیں گے جو باعث افطار ہو۔لیکن نوجوان قابو نہیں رکھ سکتے ہیں۔اس لئے ممکن ہے اگلے مرحلے یعنی جماع میں مبتلا ہو جائیں گے جو باعث افطار ہے۔

باب ماجاء لا صیام لمن لم یغرم من اللیل

اختلاف: کسی نے رات سے روزے کی نیت نہیں کی اب طلوع فجر کے بعد نیت کرے تو اس کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں۔اس میں اختلاف ہے۔اتنی بات پر اتفاق ہے کہ کوئی روزہ بھی بغیر نیت کے نہیں ہوتا۔لیکن نیت رات سے ضروری ہے۔یا طلوع فجر کے بعد

بھی جائز ہے تو امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے روزے کے لئے تبییت نیت ضروری ہے یعنی رات سے نیت کرنا شرط ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں نفل روزے کے علاوہ تبییت نیت ضروری ہے لیکن نفل روزے میں بعد الفجر نیت صحیح ہے۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صوم رمضان،صوم نفل اور نذر معین ان تین قسموں کے روزوں کے لئے رات سے نیت شرط نہیں۔بلکہ نصف نہار شرعی سے پہلے کسی وقت بھی نیت کرسکتا ہے۔البتہ نصف نہار شرعی کے بعد نیت صحیح نہیں۔صورت یہ ہے کہ مثلاً صبح صادق سے غروب آفتاب تک بارہ گھنٹے بنتے ہیں۔تو چھ گھنٹوں کے اندر اندر ان تین قسم کے روزوں کی نیت کرسکتا ہے البتہ قضاء،کفارے اور نذر مطلق کے روزوں کے لئے تبییت نیت صحت صوم کے لئے شرط ہے۔باب کی حدیث امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظاہر پر ہے۔باقی ائمہ کے ہاں کچھ نہ کچھ استثناء ہے شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں صوم نفل مستثنیٰ ہیں۔احناف کے ہاں صوم رمضان،صوم نفل،صوم نذر مستثنیٰ ہیں۔

احناف کی دلیل ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ اعرابی نے رؤیت ہلال کی گواہی دی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔جس نے ابھی تک کھایا پیا ہے تو اس کے بعد امساک کرے اور تشبیہ بالمصلین کرے اور فرمایا ”من لم یاکل فصم“ معلوم ہوا فرض روزے میں تبییت شرط نہیں اور صوم نذر معین بھی فرض کے حکم میں ہے۔اور نفل روزے کی دلیل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ گھر تشریف لائے کھانا طلب کیا کچھ نہ ملا تو آپ نے فرمایا ”انی اذاً لصائم“۔

باب ماجاء فی افطار الصائم المتطوع وقضاء

پہلی بات: کسی نے روزہ رکھا: اب روزہ پورا نہیں کرنا چاہتا اور افطار کرلیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے اس پر قضاء لازم ہوگی یا نہیں ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس پر دو باب قائم کئے ہیں۔اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ایک روایت میں امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ کسی نے نفل روزہ توڑ دیا تو اس پر قضاء واجب ہوگی۔دوسرا قول امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ،امام اسحق رحمۃ اللہ تعالیٰ،سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ایک روایت میں احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ نفلی روزہ کسی نے توڑا تو اس کی قضاء واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔دلیل ان کی باب اول کی روایت ہے کہ ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ نے بچا ہوا پانی دیا انہوں نے پی لیا پھر کہا کہ میرا تو روزہ تھا آپ نے فرمایا قضاء کا روزہ تھا انہوں نے کہا نہیں نفلی روزہ تھا آپ نے فرمایا ”لا یضرک“ اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔”الصائم المتطوع امین نفسہ او امیر نفسہ“ جب نفس کا امیر ہے تو اس کا اختیار ہے رکھے یا توڑے احناف کی دلیل باب ثانی کی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے فرماتی ہے کہ میں نے اور حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نفلی روزہ رکھا تھا کھانا آیا ہم نے کھالیا۔نبی اکرم ﷺ آئے تو حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا ”اقضیا یوماً آخر مکانہ“۔

دوسرا احناف اس کو حج پر قیاس کرتے ہیں کہ کسی نے نفلی حج کا احرام باندھا پھر توڑ دیا تو یہ عمل ہے اور عمل کو باطل کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔باب اول کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ توڑنے پر گناہ نہیں باقی قضاء ہے یا نہیں یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا۔بلکہ دوسرے باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسری بات: پہلے باب کی حدیث سے احناف ایک مسئلہ ثابت کرتے ہیں کہ عذر کی وجہ سے روزہ توڑنا جائز ہے۔علامہ انور شاہ نے لکھا ہے کہ ضیافت بھی عذر ہے اس لئے نفلی روزہ توڑنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی صوم یوم الجمعة

مسئلہ:۔ جمعہ کے دن روزے کی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔اور بعض احادیث میں ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ان میں تطبیق یہ ہے کہ جو جمعہ کی تخصیص کرتا ہو اس کے لئے جائز نہیں یعنی ممانعت ہے۔اور کوئی تخصیص نہ کرے کبھی کسی دن رکھے اور کبھی کسی دن اور ان میں کبھی جمعہ بھی آجائے تو یہ ممنوع نہیں کیونکہ شرعاً اعمال دو قسم کے ہیں۔بعض کے لئے وقت مقرر ہے۔ان کے وقت میں تصرف کرنا جائز نہیں۔بعض کے لئے شریعت نے کوئی وقت مقرر نہیں کیا ہے۔ان کے لئے اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی یوم عاشوراء ای یوم هو

پہلی بات: عاشوراء کونسا دن ہے۔آیا دس تاریخ کو ہے یا نو تاریخ کو۔یہاں باب میں دو احادیث نقل کی ہے۔دونوں ابن عباسؓ کی ہیں۔ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم عاشورہ نو تاریخ کو ہے۔دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ دس تاریخ کو ہے۔اصل بات یہ ہے کہ عاشوراء دس تاریخ کو ہے۔باقی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو منقول ہے کہ نو تاریخ کو عاشوراء ہے یہ دراصل راوی کی غلطی ہے۔راوی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سمجھنے میں غفلت کی۔اصل بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا۔کہ یوم عاشوراء سے ایک دن پہلے روزہ رکھو یا ایک دن بعد رکھو تاکہ یہود کی مخالفت ہو ابن عباسؓ بھی یہی بتانا چاہتے ہیں کہ دس تاریخ کے ساتھ نو تاریخ کو بھی رکھو۔اور راوی نے بات کا غلط مطلب سمجھا۔

دوسری بات: حدیث میں ہے کہ راوی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح روزہ رکھا۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہاں۔اب نبی اکرم ﷺ نے خود یوم التاسع کو روزہ نہیں رکھا۔لیکن ان کو یہ بات پسند تھی کہ دس تاریخ کے ساتھ نو کو بھی رکھا جائے اور اس کا حکم بھی دیا۔اس کو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی تعبیر راوی نے دوسری طرح کردی۔

باب ماجاء فی صیام العشر

یہاں ذی الحجۃ کے دس دن کے روزوں کی فضیلت بیان کی جارہی ہے۔ان کی فضیلت قرآن سے بھی ثبت ہے ﴿والفجر ولیال عشر والشفع والوتر﴾ اسی طرح احادیث سے بھی اس کی فضیلت ثابت ہے۔باقی دس ذی الحجہ کو عید الضحیٰ کا دن ہے اور عیدین کا روزہ رکھنا جائز نہیں۔اس لئے ذی الحجہ کے نو روزے رکھے جائیں گے باقی دس تغلیباً کہہ دیا۔

باب ماجاء فی صیام ستة ایام من شوال

مسئلہ:۔ کسی نے رمضان کے روزے رکھے پھر شوال کے چھ روزے رکھے تو یہ ثواب میں صیام الدھر کی طرح ہے۔یہ چھ روزے حکم کے اعتبار سے مستحب ہیں۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ایک قول یہ منقول ہے کہ یہ حضرات شوال کے چھ روزوں کے استحباب کے قائل نہیں۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ سے ایک قول یہ منقول ہے کہ شوال کے چھ روزے پے در پے رکھنا مستحب نہیں البتہ ایک دن چھوڑ کر رکھنا مستحب ہے۔تیسرا قول جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ بعض احناف نے اس مسئلے میں تحقیق کی اور یہ ثابت کردیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی جمہور کی طرح شوال کے چھ روزے پے در پے رکھنا مستحب ہے۔اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک ہے باقی رمضان کا مہینہ اور شوال کے چھ دن کے روزے صوم الدھر کے قائم مقام اس لئے ہیں کہ قاعدہ ہے کہ "کل حسنة بعشر امثلها" تو رمضان کا مہینہ ثواب کے اعتبار سے دس

ماہ کے روزوں کے برابر ہے۔ اور چھ دن شوال کے ثواب کے اعتبار سے دو ماہ کے روزوں کے قائم مقام ہے۔ دونوں مل کر ثواب کے اعتبار سے بارہ ماہ کے روزوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔

باب ماجاء فی صوم الدهر

صوم الدھر کا لغوی مطلب یہ ہے کہ آدمی پورے سال کے تمام دنوں میں روزے رکھے۔ تو اس میں ایام ممنوعہ اور ایام مکروہہ بھی داخل ہوں گے۔ اس قسم کا صوم الدھر مکروہ ہے۔ صوم الدھر کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی ایام مکروہہ اور ایام ممنوعہ کو مستثنیٰ کر کے روزے رکھے۔ اگر یہ صورت اختیار کرے تو حقیقۃً یہ صوم الدھر نہیں۔ کیونکہ ایام ممنوعہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور باقی فقہاء سے یہ منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صوم الدھر کی ممانعت فرمائی۔ کیونکہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کو اس سے ضعف لاحق نہیں ہوتا۔ ان کے لئے اجازت ہے۔ لیکن جن کو ضعف لاحق ہو اور وہ دوسرے اعمال میں ست ہو جائیں تو ان کے لئے کراہت ہوگی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مسلسل روزے رکھے گا تو اس کی عادت بن جائے گی ایسا کرنے سے اسکو مشقت نہ ہوگی اس لئے اس کی عبادت عادت بن جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ سے بھی منقول ہے کہ کبھی تو وہ مسلسل کافی عرصہ تک روزے رکھتے تھے اور کافی عرصہ تک کبھی نہ رکھتے۔ اگرچہ آپ نے صوم داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پسند فرمایا ہے کہ ایک دن روزہ رکھا جائے اور ایک دن افطار کیا جائے۔

باب ماجاء فی کراهیة الوصال فی الصیام

پہلی بات: صوم وصال کی ایک صورت یہ ہے کہ دن رات مسلسل روزے رکھے اور افطار بالکل نہ کرے۔ اس کا کیا حکم ہے تو فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ اس کے متعلق ائمہ کے تین قول ہیں۔

❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکروہ ہے۔ اب کراہیت کونسی ہے تو تحریمی اور تنزیہی دونوں کے اقوال ہیں۔

❷ دوسرا قول جو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب ہے کہ صوم وصال کا حکم حرمت کا ہے۔

❸ تیسرا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب ہے کہ مباح ہے۔ حدیث میں آپ نے فرمایا "لاتواصلو" صحابہ نے فرمایا آپ کیوں رکھتے ہیں آپ نے فرمایا میری طرح کون ہوسکتا ہے مجھے اللہ کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے کیونکہ آپ نے حرمت کی وجہ سے منع نہیں کیا۔ بلکہ امت پر شفقت کے طور پر منع کیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ افطار کے وقت معمولی چیز سے افطار کرے اس کی اجازت ہے نبی اکرم ﷺ نے اس کی تعلیم دی ہے تاکہ نفس مشقت برداشت کرے یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری بات: ان ربی یطعمنی ویسقینی الخ اس سے کیا مراد ہے۔ ① بعض محدثین کے ہاں یہ ظاہر پر محمول ہے کہ واقعۃً اللہ نبی کریم ﷺ کو کھلاتے پلاتے تھے۔ اشکال کھانا پینا تو روزے میں ممنوع ہے کھایا پیا جائے تو صوم وصال نہ ہوگا۔

جواب: معارف السنن میں انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ یہ کھانا پینا اس عالم کا نہ تھا دوسرے عالم کا تھا۔ اور منافی صوم اس عالم کا کھانا پینا ہے۔

❷ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہیں۔ ❸ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ کنایہ ہے اعانت سے کہ اللہ بغیر کھلائے پلائے مجھے طاقت

اور قوت بخشتے ہیں۔ ● چوتھا قول یہ کہ یہ کنایہ ہے مشاہدہ حق سے کہ نبی اکرم ﷺ حق کا مشاہدہ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اتنی قوت حاصل ہوتی تھی جتنی کھانے پینے سے حاصل ہوتی ہے۔

باب ماجاء في الجنب يدركه الفجر وهو يريد الصوم

مسئلہ:۔ اگر کوئی آدمی بوقت صبح صادق جنبی ہو جائے تو اس کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں۔ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ امام اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا روزہ صحیح ہے یہی قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کیونکہ صوم کے لئے طہارت شرط نہیں۔ جس طرح صحت صلاۃ اور صحت حج کے لئے شرط ہے۔ اس لئے کئی دفعہ آپ روزے کا ارادہ کرتے صبح صادق ہوتی تو آپ جنبی ہوتے۔ اس کے باوجود روزہ رکھتے۔ بعض تابعین سے منقول ہے کہ ان کے ہاں روزہ صحیح نہیں ہوگا۔ مگر جمہور کے ہاں صحیح ہوگا۔ کیونکہ صحت صوم کے لئے نہ طہارت صغریٰ شرط ہے اور نہ طہارت کبریٰ شرط ہے۔

باب ماجاء في اجابة الصائم الدعوة

مسئلہ:۔ صائم دعوت کو قبول کر سکتا ہے۔ یہاں صائم سے مراد وہ آدمی ہے جو نفلی روزہ رکھے ہوئے ہو تو دعوت کو قبول کرلے پھر اگر میزبان اس کے نہ کھانے سے ناراض ہو تو اس کے لئے کھانا جائز ہے۔ کیونکہ ضیافت نفلی روزے کے افطار کرنے کے اعذار میں سے ایک عذر ہے۔ لیکن اگر وہ اس کے نہ کھانے سے ناراض نہ ہو تو نہ کھائے بلکہ اس کے لئے دعا کرے۔ فلیصل سے دعا مراد ہے۔

باب ماجاء في الاعتكاف

پہلی بات: اعتکاف عکف سے ہے بمعنی کسی جگہ جم کر بیٹھ جانا۔ شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف کی تین قسمیں ہیں۔ ① اعتکاف واجب جیسے نذر مانی ہو یا نفلی اعتکاف شروع کر کے توڑ دیا ② اعتکاف مسنون یہ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف ہے۔ ③ اعتکاف مستحب یعنی مسجد میں آدمی آئے بیٹھے اور نیت اعتکاف کی کرلی۔ باب کی حدیث سے سنت اعتکاف کا ذکر ہے۔ یہ سب ائمہ کے ہاں سنت مؤکدہ ہے مگر سنت علی الکفایہ ہے۔ اس لئے اگر بعض نے کرلیا تو باقیوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اس اعتکاف میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ بیس تاریخ کی مغرب کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے غروب الشمس سے پہلے مسجد میں پہنچنا ضروری ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اعتکاف سنت میں حوائج ضروریہ کے علاوہ نکلنا جائز نہیں۔ اگر چہ اعتکاف کرتے وقت یہ شرط بھی لگائی ہو کہ فلاں فلاں کام کروں گا۔ اب جنازے کی نماز کے لئے جا سکتا ہے یا نہیں تو احناف فرماتے ہیں کہ جنازے کے لئے نکلنا جائز نہیں، ہاں اگر اپنی ضروری حاجات کی غرض سے نکلا اور نماز بھی پڑھ لی جائے تو جائز ہے۔

دوسری بات: کسی نے سنت اعتکاف کو توڑ دیا تو احناف اور مالکیہ کے ہاں قضاء واجب ہے۔ احناف کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ فقط ایک دن کی قضاء واجب ہوگی کیونکہ ہر دن کا اعتکاف الگ اور مستقل ہے۔

باب ماجاء وعلى الذين يطيقونه

اس کے سمجھنے میں لمبی چوڑی بحثیں ہیں۔ مختصر طور پر دو باتیں سمجھیں۔

پہلی بات: اس آیت کا تعلق صوم فرض سے ہے یا کسی اور صوم سے۔ عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق صوم فرض سے ہے۔ اسی

کے متعلق بعد میں نسخ کا حکم آیا معارف السنن میں انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ اس کا تعلق صوم فرض سے نہیں۔لیکن معارف السنن میں ہے کہ عام روایات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق صوم فرض سے ہے کسی اور سے نہیں۔

دوسری بات: اس آیت کا حکم باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے ① جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ شروع میں جب صوم کا حکم اترا تو اس میں کچھ آسانی تھی اس لئے طاقتور آدمی بھی فدیہ دے کر روزہ نہ رکھیں تو اس کو اجازت تھی۔لیکن جب ﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾ یہ آیت اتری تو اس نے ''وعلى الذين يطيقون الخ'' والے حکم کو منسوخ کر دیا البتہ تلاوت اب بھی باقی ہے ② شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق صوم کی کسی قسم سے نہیں بلکہ اس کا تعلق صدقہ فطر سے ہے مطلب یہ ہے کہ جن کو اللہ نے طاقت دی ہے ان پر صوم کے ساتھ طعام مسکین یعنی صدقہ فطر بھی ہے۔③ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یطیقون باب افعال سے ہے اور افعال کی خاصیت سلب ماخذ ہے۔تو مطلب یہ ہے کہ جن سے روزے کی طاقت سلب ہوگئی ہے ان پر فدیہ ہے ان دونوں صورتوں میں یہ آیت منسوخ ہوگی۔

باب ماجاء فی من اکل ثم خرج یرید سفراً

اختلاف:۔کوئی آدمی سفر پر جانا چاہتا ہے مگر ابھی تک روانہ نہیں ہوا تو یہ اپنے گھر سے افطار کر سکتا ہے یا نہیں۔باب کی روایت سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔کیونکہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گھر سے افطار کیا تھا۔اس مسئلے میں اختلاف ہے۔① ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کے ہاں یہ صورت جائز نہیں۔کہ آدمی سفر پر جا رہا ہو تو گھر ہی سے افطار کر لے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مسافر کو اجازت دی ہے۔اور سفر کا تحقق تب ہوتا ہے۔جب آدمی اپنے شہر یا گاؤں سے نکل جائے۔اس سے پہلے آدمی مسافر نہیں کہلاتا۔جیسے نماز میں قصر کا مسئلہ ہے کہ کوئی سفر کا ارادہ رکھتا ہو مگر سفر شروع نہیں کیا۔تو اس کے لئے قصر جائز نہیں۔

باب ماجاء فی قیام شھر رمضان

پہلی بات: یہ مسئلہ تراویح کا مشہور اختلافی مسئلہ ہے احناف اور جمہور امام مالک امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سارے اس کے قائل ہیں کہ صلوۃ اللیل الگ چیز ہے اور قیام اللیل الگ چیز ہے۔امام بخاری نے تہجد کی نماز کیلئے الگ باب قائم کیا ہے اور قیام اللیل کے لئے الگ باب قائم کیا ہے تو عام محدثین کے ہاں بھی یہ دونوں الگ ہیں۔گیارہ رکعات جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں اس سے ہمیشہ صلوۃ اللیل مراد ہے جن میں آٹھ تہجد ہوتے تھے اور تین رکعت وتر۔

دوسری بات: نبی کریم ﷺ سے تراویح کی نماز پڑھنا ثابت ہے لیکن تعداد رکعات صحیح روایت میں نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔مذکورہ حدیث میں بھی صرف اتنا ہے کہ پہلی رات ثلث اللیل تک پڑھی دوسری رات نصف اللیل تک پڑھی اور تیسری رات اتنی دیر کی کہ راوی کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہوا کہ سحری فوت نہ ہو جائے۔

تیسری بات: عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کو اس پر جمع کیا کہ ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تراویح پڑھائیں گے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بیس رکعت پڑھی گئیں اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔باقی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کہا کہ نعمت البدعة هذه یہ اجتماع کو بدعت حسنہ کہا ورنہ ثبوت تو نبی کریم ﷺ سے ہے اسی اجماع صحابہ کی وجہ سے ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام بھی بیس رکعت سے کم کا قائل نہیں۔امام مالک سے چھتیس کا قول بھی ہے مگر بیس سے کم کسی کا قول نہیں۔

ابواب الحج

عن رسول اللہ ﷺ

حج کالغوی معنی ہے قصد کرنا بعض نے معنی کیا ہے کہ القصد مراراً اصطلاح میں حج کہتے ہیں بیت اللہ کا قصد کرنا مخصوص افعال کے ساتھ۔ حج کی فرضیت ۶ ھ میں ہوئی۔ مگر مکہ کفار کے قبضے میں تھا۔ اسلئے حج نہ کر سکے۔ ۸ ھ کو مکہ فتح ہوا مگر چونکہ حج کا وجوب علی الفور نہیں اسلئے اس سال ادا نہ کیا۔ باقی حج میں استطاعت ضروری ہے۔ استطاعت سے کیا مراد ہے تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو چیزیں۔ :ا۔ استطاعۃ البدن ۲۔ استطاعۃ المال (زاد اور راحلہ) فقہاء ساتھ تیسری چیز کو بھی ذکر کرتے ہیں کہ راستہ بھی مامون ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ استطاعت بدن کو شرط قرار دیتے ہیں۔ استطاعت مال (زاد و راحلہ) انکے ہاں شرط نہیں بلکہ پیدل جائے اور راستے میں مزدوری کر کے زاد راہ بنائے یا لوگوں سے مانگے۔

باب ماجاء فی حرمۃ مکۃ

پہلی بات: حدیث کا مفہوم۔ حدیث میں واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف یزید لاؤ لشکر بھیج رہے تھے۔ عمرو بن سعید مدینہ کا امیر تھا اور مکہ پر حملہ کیلئے ۶۱ ھ میں لشکر بھیج رہا تھا۔ حضرت ابوشریح نے اسکو حدیث سنائی کہ فتح مکہ کے صبح نبی اکرم ﷺ نے خطبہ فرمایا کہ مکہ حرم ہے، اللہ نے اسکو حرم قرار دیا ہے اور لوگوں نے اسکو حرم قرار نہیں دیا پھر فرمایا۔ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسکے لئے جائز نہیں کہ مکہ میں خون بہائے یا درخت کاٹے اور اگر میرے واقعہ سے کوئی استدلال کرنا چاہے تو اس سے استدلال صحیح نہیں، اللہ تعالیٰ نے طلوع آفتاب تک حرم کو میرے لئے حلال کیا تھا، اس کے بعد اسکی حرمت پھر لوٹ آئی پھر فرمایا کہ حاضر لوگ ان احکام کو غائبین تک پہنچائیں۔ اسلئے میں تمہیں حدیث سنا رہا ہوں تا کہ میری ذمہ داری پوری ہو جائے۔ لوگوں نے ابوشریح سے پوچھا کہ عمرو نے کیا جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ اس نے جواب دیا کہ اے ابوشریح میں تم سے زیادہ جانتا ہوں حرم عاصی کو پناہ نہیں دیتا اور قاتل کو پناہ نہیں دیتا اور اسی طرح فسادی کو پناہ نہیں دیتا۔

دوسری بات: مکہ مکرمہ حرم ہے یا نہیں؟ تو ائمہ مجتہدین کا اسپر اتفاق ہے کہ مکہ حرم ہے اسکے حرم ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اب جب مکہ حرم ہے تو اسکے مسائل یہ ہیں کہا اسمیں لڑنا جائز نہیں یہ بھی اجماعی حکم ہے الا یہ کہ حرم کے اندر کسی مفسد کا غلبہ ہو جائے تو اس سے لڑنا جائز ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسکا درخت کاٹنا جائز نہیں۔ ہمارے فقہاء نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ کہ مکہ کے درخت دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم وہ جنکو لوگ اگاتے ہیں ایسے درختوں کا کاٹنا جائز ہے، دوسرے قسم کے درخت وہ ہیں جو خود بخود اگتے ہوں۔ تو خود رو چیزوں میں سے ایک نبی اکرم ﷺ نے صرف ''اذخر'' کو مستثنیٰ کیا ہے کہ اسکا کاٹنا جائز ہے۔ اسی طرح سوکھے ہوئے یا ٹوٹے ہوئے درخت کا کاٹنا جائز ہے اسکے علاوہ باقی درخت یا گھاس کاٹنا جائز نہیں، اگر کوئی کاٹے تو اسپر جزاء آئے گی۔

تیسری بات: کوئی آدمی حرم کے اندر جرم کرے مثلاً کسی نے حرم کے اندر قتل کیا۔ تو اس سے قصاص لیا جائے گا، اسی طرح کسی نے ایسا جرم کیا جس سے حد یا قصاص لازم آئے تو حرم کے اندر اس سے قصاص لیا جائے گا اسپر حد جاری ہوگی اور اگر کوئی باہر جنایت کرے اور حرم میں چلا جائے تو اسپر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ تو احناف کہتے ہیں کہ مادون النفس کسی نے جرم کیا ہو تو حدود حرم کے اندر ہی اسپر حد جاری ہوگی کیونکہ

مادون النفس کی سزا احوال کے درجے میں ہے اسلئے حرم کے اندر جاری کرنے میں حرج نہیں، لیکن اگر اس نے قتل کیا اور پھر حرم میں چلا گیا تو احناف کے ائمہ ثلاثہ، ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ، ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حرم کے اندر قصاص نہ لیں گے بلکہ باہر نکلنے پر مجبور کیا جائے گا، باقی سزا اندر نہ دی جائے گی۔ کیونکہ "من دخلہ کان آمناً" امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ اسکو حرم ہی میں قصاصاً قتل کیا جائیگا کیونکہ عمرو بن سعد کا قول ہے کہ ان الحرم لایعیذ عاصیاً۔ احناف کہتے ہیں کہ عمرو کی بات نبی اکرم ﷺ کی حدیث کے مطابق یعنی برابر کہاں ہوسکتی۔ اسی طرح ومن دخلہ کان آمناً کے بھی خلاف ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ شوافع کا قول کتاب اللہ، احادیث اور اقوال صحابہ کے خلاف ہے۔

چوتھی بات: مدینہ حرم ہے یا نہیں؟ تو اتنی بات پر اتفاق ہے کہ مدینہ حرم ہے لیکن احناف کہتے ہے کہ مدینہ حرم ہے مگر اسکے لئے وہ احکام نہیں جو حرم مکہ کیلئے ہیں، اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حرم مدینہ کے لئے وہ احکام ثابت نہیں کئے جو مکہ کے حرم کیلئے ثابت کئے ہیں۔ باقی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو شکار کرنے والے کا سامان چھین لیتے تھے اسپر ناراض ہوتے تھے۔ احناف کے ہاں یہ زجر پر محمول ہے اور شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کے ہاں بھی حرم مدینہ کے وہ احکام نہیں جو حرم مکہ کے ہیں۔

کما ینفی ا لکیر کیر اس مشکیزے کو کہتے ہیں جسکے ذریعے لوہار کوئلے کو ہوا دیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کیر اس بھٹی کو کہتے ہیں جسمیں لوہار لوہا اور کوئلہ ڈالتا ہے۔ مگر معارف السنن میں لکھا ہے کہ کیر لوہار کے مشکیزے کو کہتے ہیں اور بھٹی کو "کور" کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی ایجاب الزادو الراحلة

وجوب حج کیلئے اصل سب کے ہاں یہ آیت ہے۔ ﴿وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا﴾ اب استطاعت سے کیا مراد ہے؟ تو ابھی حدیث میں گزرا ہے کہ اس سے زاد اور راحلہ مراد ہے۔ فقہاء اسکی تعبیر کرتے ہیں کہ ایک استطاعت بدن ہونا چاہئے، دوسرا استطاعت مال ہو اس سے زاد اور راحلہ مراد ہے۔ اور تیسری چیز امن طریق ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔ **وراحلة تبلغها الی بیت اللہ** اب وہ راحلہ بیت اللہ تک تب پہنچائے گی۔ جب راستہ پر امن ہو۔ اگر کسی کے پاس مال ہو لیکن اسکے بدن میں استطاعت نہیں تو اس سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی کیونکہ اسکا خود جانا لازم نہیں، حج بدل اسکے ذمے لازم ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں استطاعت سے استطاعت بدن مراد ہے، زاد اور راحلہ ضروری نہیں لیکن احناف اور جمہور کی مستدل وہ حدیث ہے جسمیں ہے کہ صحابہ نے پوچھا کہ **مایوجب الحج**؟ آپ نے فرمایا **الزاد و الراحلة**.

باب ماجاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مسئلہ: نبی اکرم ﷺ نے کتنے حج کئے تو فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زندگی کے تین دور تھے: ا۔ قبل نبوت ۲۔ قبل ہجرت ۳۔ بعد ہجرت۔ تبوک سے پہلے بھی نبی اکرم ﷺ سے حج ثابت ہیں، قریش جو حمس کہلاتے ہیں۔ یہ عرفات میں نہ جاتے تھے مگر ایک آدمی کہتا کہ ہم نے نبی ﷺ کو عرفات میں دیکھا تو تعجب ہوا کہ یہ حمس میں سے ہیں مگر عرفات میں کیسے آئے۔ معلوم ہوا حج کیلئے آئے تھے، پھر نبوت کے بعد مکہ میں بھی حج کئے، حج کے موسم میں حج بھی کرتے تھے اور تبلیغ بھی کرتے تھے لیکن حج کتنے کئے انکی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں لیکن بظاہر یہ لگتا ہے کہ ہر سال حج کیا ہوگا اور ہجرت کے بعد آپ نے ایک ہی حج کیا ہے اس پر اتفاق ہے۔ باقی حدیث میں ہے کہ ہجرت کے بعد آپ نے دو حج کئے تھے یہ اس اعتبار سے کہا کہ ان دو حجوں میں انصار نے بیعت کی تھی اسلئے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو کا ذکر کیا۔

باب ماجاء کم اعتمر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

مسئلہ: نبی اکرم ﷺ نے چار عمرے کئے ہیں۔ اصل میں آپ نے تین عمرے کئے تھے لیکن جو لوگ چار عمروں کے بارے میں کہتے ہیں وہ عمرۃ القضاء کو مستقل عمرہ شمار کرتے ہیں اور صلح حدیبیہ کے سال جب عمرہ کیلئے گئے تھے اور حدیبیہ میں حلال ہو گئے تھے اسکو بھی مستقل عمرہ شمار کرتے ہیں، جبکہ اس سال عمرہ ہوا ہی نہیں تھا بلکہ اسکی قضاء دوسرے سال کی تھی۔

باب ماجاء فی ای موضع احرم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

مسئلہ: بعد الہجرت نبی اکرم ﷺ نے ایک حج کیا تھا۔ اس حج میں آپکے ساتھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک جم غفیر تھا، کچھ لوگ قریب رہتے تھے۔ انکو آپکے افعال واقوال پر اطلاع رہتی تھی۔ کچھ لوگ کثرت کی وجہ سے دور رہتے تھے۔ انکو آپکے افعال اور اقوال پر اطلاع نہ رہتی تھی۔ اسلئے حضور اکرم ﷺ سے حج کے افعال واقوال نقل کرنے میں اختلاف واقع ہوا۔ سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ کے احرام کے متعلق صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اختلاف کیوں ہے۔ تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ انی لاعلم الناس بذالک کہ نبی کے حج کے افعال اور اقوال کا مجھے سب سے زیادہ علم ہے کیونکہ میں نبی اکرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیادہ قریب تھا لوگ دور تھے اسلئے انکو صحیح علم نہ ہو سکا اور اختلاف واقع ہوا۔ احرام کے اندر اختلاف کی بھی یہی وجہ ہے، اصل میں آپ ﷺ نے ذو الحلیفہ میں دو رکعت پڑھنے کے فوراً بعد تلبیہ پڑھ کر احرام باندھ لیا تھا جو لوگ وہاں قریب تھے انکو اطلاع ہوگئی دور والوں کو اطلاع نہیں ہوئی، جب آپ ﷺ سواری پر سوار ہوئے تو بعض نے تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا، وہ سمجھے شاید ابھی آپ نے احرام باندھا ہے۔ اسلئے انہوں نے اس کو نقل کر دیا، کچھ لوگوں نے ''بیداء'' میں آپ ﷺ کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا تو وہ سمجھے شائد آپ نے یہاں سے احرام باندھا ہے اسلئے انہوں نے اسکو نقل کر دیا۔

باب ما جاء فی حج الا فراد
وباب فی الجمع بین الحج والعمرۃ وفی التمتع

پہلی بات: حج کی تین قسمیں ہیں:

① ۔ بوقت احرام حج کی نیت کرے اور حج کے اختتام تک احرام باقی رکھے اور جب احرام ختم ہو تو اسکو کھول دے یہ حج افراد کہلاتا ہے۔ اسکا طریقہ یہ ہے کہ تجاوز عن المیقات کے وقت جب حج کی نیت کی تو جب مکہ میں داخل ہونگے تو طواف قدوم کریں گے۔ حج افراد میں آدمی سعی کو مقدم کر سکتا ہے۔ اسلئے جب طواف قدوم کیا تو حج کی نیت سے سعی کو مقدم کر سکتا ہے۔ یہ راحت کا باعث ہے کیوں کہ ایام حج میں سعی مشکل ہوتی ہے۔ آٹھ ذی الحجہ کو یوم الترویہ کہتے ہیں۔ آٹھ تاریخ کو لوگ منیٰ جاتے ہیں وہ ظہر سے عشاء تک چار نمازیں پڑھتے ہیں پھر سو جاتے ہیں، پھر نو تاریخ کو فجر کی نماز پڑھ کر پھر عرفات وقوف کیلئے جاتے ہیں، وقوف کا اصل وقت زوال کے بعد ہوتا ہے وہاں ظہر اور عصر کو جمع کیا جاتا ہے اگر امام کے ساتھ پڑھے پھر لوگ دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ وقوف عرفہ کا وقت غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ غروب کے بعد روانہ ہوتے ہیں۔ مغرب نہ راستے میں پڑھ سکتے ہیں اور نہ عرفات میں۔ بلکہ مزدلفہ میں جا کر مغرب اور عشاء کو جمع کرتے ہیں رات کو آرام کرتے ہیں، چونکہ مفرد پر دم نہیں اسلئے وہ رمی کے بعد حلق کریگا۔ اسکے بعد سلے ہوئے کپڑے جائز ہوتے ہیں۔ اسکو ناقص حلت حاصل ہو جاتی ہے، پھر طواف زیارت کرتا ہے، پھر کامل طور پر حلال ہو جاتا ہے۔ گیارہ اور

بارہ تاریخ کو تینوں جمروں کی رمی کرے گا، تیرہ تاریخ کی رمی اختیاری ہے۔

② تجاوز عن المیقات کے وقت آدمی عمرہ کی نیت کرے، مکہ میں عمرہ ادا کرے یعنی طواف سعی کر کے حلق کے بعد حلال ہو جائے۔ پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھے پھر مذکورہ ترتیب کے ساتھ منیٰ جائے صرف دس تاریخ کو جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد ذبح کریگا، پھر حلق کریگا۔ احناف کے ہاں یہ ترتیب واجب ہے، اگر خلاف ترتیب کیا تو دم لازم آئیگا، اس حج کو تمتع کہتے ہیں۔

③ تجاوز عن المیقات کے وقت حج اور عمرے دونوں کی نیت کرے اب یہ آدمی مکہ جب جائیگا تو عمرے کے افعال کرے گا، مگر حلق نہ کریگا۔ اور حلال نہ ہوگا پھر آٹھ تاریخ کو حج کے افعال شروع کریگا، دس تاریخ کو یہ بھی رمی کرے گا، پھر ذبح شکر پھر حلق کریگا۔ اب اسکو حلت ناقص حاصل ہوگی۔ پھر طواف فرض کریگا اور حلت کامل حاصل ہو جائے گی۔ اسکو حج قران کہتے ہیں۔

دوسری بات: اس بات پر اتفاق ہے کہ حج کے تینوں طریقے جائز ہیں۔ اختلاف اسمیں ہے کہ افضل کونسا طریقہ ہے۔

❶ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قران افضل ہے کیونکہ اسمیں مشقت زیادہ ہے اور ثواب بناء ہے مشقت پر۔ دوسرا یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا اپنا احرام قران کا تھا۔ چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نے جب عمرہ ادا کیا تو حلال نہیں ہوئے بلکہ افعال حج کے بعد حلال ہوئے۔

❷ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ و مالک کے نزدیک افراد افضل ہے۔

❸ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمتع بغیر سوق الہدی افضل ہے۔

فان عمر بن الخطاب قد نهى عن ذلك۔ یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جو صحابہ مدینہ سے آئے تھے ان سب نے حج کا احرام باندھا تھا۔ مکہ میں جب پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے نقض احرام کا حکم دیا اور فرمایا عمرہ ادا کرو اور حلال ہو جاؤ پھر حج کا احرام باندھو۔ اب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو منع کرتے تھے وہ معروف تمتع سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ مذکورہ طریقے یعنی نقض احرام کے ذریعے سے تمتع اختیار کرنا اس سے منع کرتے تھے کیونکہ وہ فرماتے تھے۔ کہ نقض احرام کے ذریعے سے تمتع کرنا نبی ﷺ اور صحابہ کی خصوصیت تھی۔ بعض نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منع کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگ حج کے دنوں میں عمرہ بھی کر لیتے تھے، پھر پورا سال نہ آتے تھے تو مسجد حرام خالی رہتی تھی۔ تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ منع کرتے کہ ایام حج میں صرف حج ادا کرو۔ اور عمرہ بعد میں کیا کرو تا کہ مسجد حرام پورا سال آباد رہے۔

باب ماجاء في مواقيت الا حرام لاهل الافاق

پہلی بات: مواقیت میقات کی جمع ہے بمعنی وہ مقام جہاں سے حج یا عمرہ کا ارادہ کرنے والا بغیر احرام کے نہیں گزر سکتا۔

دوسری بات: باب کی حدیث میں نبی ﷺ نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ اہل شام کیلئے جحفہ اہل نجد کیلئے قرن اور اہل یمن کیلئے یلملم کا ذکر کیا ہے، دوسری حدیث میں نبی ﷺ نے اہل مشرق کے لئے عقیق کا ذکر کیا، تو کل پانچ میقات ذکر کئے ہیں۔ یہ میقات ان کے لئے ہیں جنکا حدیث میں ذکر ہے۔ اسی طرح ان کے لئے بھی ہیں جو ان علاقوں کی جہت میں رہتے ہیں مثلاً ذوالحلیفہ اہل مدینہ کا میقات بھی ہے اور انکا میقات بھی جو مدینہ کی جہت میں ہیں۔ اسی طرح یہ میقات انکے لئے بھی ہے جو ان راستوں سے گزرتے ہیں۔

تیسری بات: چار میقات جو پہلی حدیث میں ہیں اسمیں اتفاق ہے کہ یہ چاروں نبی ﷺ کے مقرر کردہ ہیں، پانچواں میقات جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے اسکے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ نبی اکرم کا مقرر کردہ نہیں بلکہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب عراق کو فتح کیا تو انہوں نے میقات مقرر کیا، مگر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے جمہور کی تائید

ہوتی ہے کہ اہل عراق کیلئے عقیق کو نبی ﷺ نے مقرر کیا ہے اگر چہ اسوقت عراق فتح نہ ہوا تھا مگر وحی کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بتادیا تھا کہ عراق فتح ہوگا، لوگ حج کے لئے آئیں گے اسلئے نبی ﷺ نے مقرر کردیا لیکن نبی ﷺ کے زمانے میں اہل عراق مسلمان نہ تھے اسلئے اس میقات کو نبی ﷺ کے زمانے میں شہرت نہ ہوسکی اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا لوگ وہاں سے آنے لگے تو اس میقات کو شہرت انکے دور میں ہوئی۔

چوتھی بات: میقات سے بغیر احرام کے کوئی گزر جائے تو اسکا کیا حکم ہے جمہور اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ یہ آدمی واپس میقات پر چلا جائے یا دوسرے آفاقی میقات پر جائے اور احرام باندھ کر دوبارہ داخل ہو تو دم ساقط ہو جائے گا، لیکن اگر کوئی آفاقی میقات پر نہ گیا تو اس سے دم ساقط نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی مالا یجوز

پہلی بات: ایک آدمی نے بنی کریم ﷺ سے پوچھا کہ ماذا یلبس المحرم تو نبی کریم ﷺ نے ان اشیاء کو ذکر کردیا جنکا استعمال جائز نہیں یہ نہیں بتایا کہ کیا پہنے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ جنکا پہننا جائز ہے انکے انواع اتنے کثیر تھے کہ تھوڑے وقت میں انکا حصر اور انکا گننا ممکن نہ تھا۔ اسلئے آپ نے ناجائز چیزوں کو بتادیا کہ انکا پہننا جائز نہیں اسکے علاوہ جائز ہیں۔

ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ کپڑا اس وضع کے مطابق سلا ہوا ہو جس وضع کے مطابق لوگ استعمال کرتے ہیں ایسے کپڑے کا استعمال جائز نہیں لیکن اگر اس وضع کے مطابق سلے ہوئے نہ ہوں جو عام طور پر لوگ استعمال کرتے ہیں تو پھر پہننا جائز ہوگا۔ مثلاً دو ٹکڑوں کو ملا کر سی لیا تاکہ اس سے ازار بنالے تو یہ جائز ہے۔ اگلے باب میں آئے گا کہ اگر کسی کے پاس چادریں نہ ہو تو شلوار پہنے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شلوار کو پھاڑ کر عام چادر کی طرح بنالے، اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اسی وضع پر پہنے جس وضع پر لوگ استعمال کرتے ہیں تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دم لازم آیگا اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد کے ہاں دم لازم نہ آیگا۔ کیونکہ پھاڑنا فساد ہے اور فساد ممنوع ہے اسلئے ضرورۃً بغیر پھاڑے شلوار یا قمیض پہن سکتا ہے۔

دوسری بات: اگر کسی کے پاس ایسے جوتے ہوں کہ انکا استعمال کرنا جائز نہیں۔ مثلاً ان سے ہڈی چھپ جاتی ہے، اب اگر اسکے پاس اسکے علاوہ جوتا نہ ہو تو اسکو اسطرح کاٹے کہ وسط قدم کی ہڈی ظاہر رہے، یہ کاٹنا جمہور کے ہاں واجب اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے مستحب ہے۔

تیسری بات: عورت کیلئے ارشاد فرمایا کہ عورت نقاب نہ ڈالے۔ ائمہ اربعہ کے ہاں یہ اتفاقی حکم ہے کہ عام حالت میں نقاب نہ ڈالے مگر بے پردگی کا خطرہ ہو مثلاً اجنبی لوگ ساتھ ہوں تو نقاب مستحب ہے۔ لیکن اسطرح ڈالے کہ وہ ملصق بالوجہ نہ ہو۔

چوتھی بات: قفازین' قفاز کی تثنیہ ہے بمعنی دستانہ یہ احرام کی حالت میں عورت کیلئے پہننا جائز نہیں، عورت کا احرام وجہ میں ہے، کفین کو بعض احرام میں داخل مانتے ہیں، بعض نہیں مگر قفازین کا استعمال سب کے ہاں مکروہ ہے۔

باب ماجاء فی الذی یحرم وعلیه قمیص او جبته

مسئلہ: کسی نے نیت کی اور تلبیہ پڑھ کر محرم بن گیا۔ اس نے قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اسکو مسئلے کا علم نہ تھا جب علم ہوا تو اب یہ قمیص کسطرح اتارے گا۔ معتاد طریقے سے اتارے گا یا پھاڑ کر۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اسکو پھاڑ کر نکالے گا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتاد طریقے کے مطابق نکالے۔ باب کی حدیث جمہور کی مستدل ہے۔

باب ماجاء مایقتل المحرم من الدواب

مسئلہ: حدیث میں پانچ چیزوں کوفواسق کہا ہے۔انکے کثرت ضرراور کثرت خبث کی وجہ سے انکومحرم بھی قتل کرسکتا ہے۔اور حلال کیلئے بھی حرم کے اندر انکا قتل جائز ہے اور حل میں بھی۔انکے علاوہ کسی جانور کا قتل جائز نہیں اگر قتل کیا تو جزاء لازم آئے گی۔الا یہ کہ کوئی درندہ حملہ آور ہو جائے تو اسکو قتل کرسکتا ہے۔کیونکہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھیوں کے ساتھ تھے ایک درندے کوانہوں نے قتل کردیا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم اسکی جزاء دیں گے۔کیونکہ ہم نے اسپر حملے کی ابتداء کی ہے۔اس سے احناف استدلال کرتے ہیں کہ اگر وہ حملہ کردے تو اسکا قتل جائز ہوگا۔الکلب العقور۔احناف اور جمہور کے ہاں اس سے عام کتا مراد ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اس سے شیر مراد لیتے ہیں۔

باب ماجاء فی کراھیة تزویج المحرم

اختلاف: محرم حالت احرام میں نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔حالت احرام مین جماع بالا تفاق جائز نہیں،اختلاف اسمیں ہے کہ حالت احرام میں عقد کرنا جائز ہے یا نہیں۔

● ائمہ ثلاثہ کے ہاں عقد کرنا بھی جائز نہیں۔یہ حضرات باب اول کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔المحرم لا ینکح ولا ینکح۔یہاں نکاح سے عقد نکاح مراد لیتے ہیں۔

❷ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ،سفیاں الثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ،فقہاء کوفہ کے ہاں محرم کے لئے عقد کرنا جائز ہے۔انکی دلیل باب ثانی کی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحیح حدیث ہے جسکو بخاری نے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے حالت احرام میں میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا۔

میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کرنے کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔بعض میں ہے کہ آپ نے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے،بعض میں ہے کہ آپ حلال تھے۔احناف کہتے ہیں کہ وہ روایت صحیح ہے جسمیں حالت احرام میں نکاح کا ذکر ہے۔کیونکہ جن سے حلال ہونے کی حالت میں نکاح کرنا مقبول ہے وہ صحیح صورت حال سے واقف نہیں تھے۔جبکہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ صورت حال سے زیادہ واقف تھے۔کیونکہ نکاح کے وقت انکے والد عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود موجود تھے۔دوسرا جن روایات میں ہے کہ نکاح حالت حلال میں ہوا اسکا مطلب یہ ہے کہ عقد حالت احرام میں ہوا،مگر انکی تزویج کا امر حالت حلال میں ظاہر ہوا۔

باقی باب اول کی حدیث کی تاویل یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے۔اور حالت احرام میں جماع ہمارے ہاں بھی جائز نہیں۔شوافع نے احناف کی حدیث کی تاویل کی ہے کہ وظھر امر تزویجھما وھو محرم مگر یہ تاویل غلط ہے کیونکہ آپ جب گھر آئے تو حالت احرام میں تھے بغیر حالت احرام کے نہیں تھے کہ حالت احرام کے بغیر آئے ہوں اور شادی کرکے بعد میں محرم ہوگئے ہوں اور پھر نکاح کا امر ظاہر ہوگیا۔آپ نے نکاح ہی حالت احرام میں کیا تھا۔

باب ماجاء فی اکل الصید للمحرم

محرم کیلئے شکار کے گوشت کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟۔تین صورتوں میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے:① محرم خود شکار نہیں کرسکتا،اگر کرلیا تو خود اسکے لیئے کھانا جائز نہیں۔② وہ شکار جو محرم کے امر سے کیا گیا ہو اسکا کھانا اسکے لیے جائز نہیں۔③ وہ شکار جو محرم کی اعانت یا اشارے سے کیا گیا ہو،اسکا کھانا بھی محرم کیلئے ناجائز ہے۔④ چوتھی صورت اختلافی ہے کہ اگر حلال آدمی نے شکار کیا لیکن دل میں یہ

بات تھی کہ میں خود بھی اس شکار سے کھاؤں گا اور محرم کو بھی کھلاؤنگا تو یہ شکار کھانا محرم کیلئے جائز ہے یا نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام احمد اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محرم کیلئے اس شکار کا کھانا جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محرم کیلئے یہ شکار کھانا جائز ہے۔

باب ماجاء فی استلام الحجر والرکن الیمانی الخ

مسئلہ: بیت اللہ کے چار کونے ہیں، استیلام صرف دو یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کا ہے، حجر اسود کا بوسہ دے گا۔ اگر نہ دے سکے تو ہاتھ لگائے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دور سے اشارہ کر کے ہاتھوں کی تقبیل کرے۔ رکن یمانی کا صرف استیلام ہوگا اور اگر استیلام ممکن نہ ہو تو چھوڑ دے اشارے کی بھی ضرورت نہیں۔ باقی دو ارکان رکن عراقی اور رکن شامی کا نہ تو استیلام ہوتا ہے اور نہ تقبیل یہ جمہور کا مسلک ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انس بن رضی اللہ تعالیٰ عنہ مالک: کا مذہب یہ تھا کہ تمام ارکان کا استیلام ہوگا جیسے باب کی حدیث میں معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔ رکن عراقی اور رکن شامی کا استیلام کیوں نہیں تو معارف السنن میں لکھا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ حجر اسود اور رکن یمانی حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی بنیاد پر قائم ہیں جبکہ رکن شامی اور رکن عراقی کے کونے ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی بنیادوں پر قائم نہیں۔

باب ماجا فی تقبیل الحجر

پہلی بات: حجر اسود کے بوسے کا کیا حکم ہے۔؟۔ چنانچہ ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اہل علم سے اسکے استحباب کا قول نقل کیا ہے کیونکہ عمرۃ القضاء اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے حجر اسود کا بوسہ لیا، تقبیل کی صورت یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اسپر رکھے اور اس طرح بوسہ لے کہ منہ اور پیشانی لگے لیکن منہ سے آواز نکالنا مکروہ ہے، یہ تقبیل اسوقت ہے جب کسی مسلمان کو بغیر تکلیف دینے کے ممکن ہو، اگر بدون ایذاء مسلم ممکن نہ ہو تو پھر تقبیل کرنا جائز نہیں کیونکہ ایذاء مسلم حرام ہے، استحباب کیلئے حرام کا ارتکاب جائز نہیں۔

دوسری بات: اعلم انک حجر۔ ایک روایت میں ہے لاتنفع ولا تضر اس قول کا مقصد فقط تعلیم دینا تھا کہ جو لوگ قریب العہد بالاسلام تھے چونکہ وہ زمانہ جاہلیت میں حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے کے بزرگوں اور انبیاء کے صورتوں کے بت بنا کر انکی عبادت کرتے تھے تو فرمایا کہ ہماری تقبیل اس اعتبار سے نہیں جس اعتبار سے تم کرتے تھے بلکہ ہم تو نبی کریم ﷺ کی اتباع میں کرتے ہیں۔

اب آپ نے تقبیل کیوں کی؟ یہ جنت کا پتھر ہے اور یہ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ بالکل سفید رنگ میں اترا تھا کیونکہ آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو جنت کی یاد ستاتی تھی، وہ سکون حاصل کرنے کے لئے اسکا بوسہ لیتے تھے، تعمیر کعبہ کے وقت اسمیں رکھا گیا، اسلئے آپ بوسہ لیتے تھے۔

❷ حدیث میں اسکو یمین اللہ فی الارض کہا گیا ہے جس نے اسکی تقبیل کی تو گویا اس نے یمین اللہ کی تقبیل کی اور جس نے استیلام کیا تو گویا اس نے اللہ کا استیلام کیا، شیعوں میں سے ابو ہارون ایک شیعہ راوی ہے اس نے ایک روایت گھڑی ہے کہ جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا کہ۔ اعلم انک حجر تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یا امیر المومنین یہ تو نفع ونقصان پہنچاتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وجہ پوچھی تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جس نے اسکی تقبیل کی یہ قیامت کے دن شفاعت کریگا، تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اس قوم سے پناہ مانگتا ہوں جسمیں ابوالحسن ہو۔ معارف السنن میں اس روایت کے راوی ابو ہارون کو شیعہ کذاب، وضاع کہا ہے اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی ازالۃ الخفاء میں اسکو موضوع قرار دیا ہے۔

باب ماجاء انه يبدأ بالصفاء قبل المروة

پہلی بات: سعی بین الصفاء والمروۃ کا کیا حکم ہے؟ اسمیں ائمہ مجتہدین کے تین قول ہیں۔ ① امام شافعی اور امام اسحٰق اور ایک روایت میں امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سعی حج کے ارکان اور فرائض میں سے ہے اگر کسی نے اسکوترک کیا تو اسکا حج ادانہیں ہوگا۔ ② امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ ابوسفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ایک روایت کے مطابق فرماتے ہیں کہ سعی واجب ہے اگر یہ ترک ہوجائے تو اگر انسان قریب ہوتو اسکوادا کرے اور اگر گھر چلا جائے تو دم واجب ہوگا۔ ③۔امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔احادیث سے قول ثانی کے قائلین کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری بات: سعی کے متعلق اس بات پر اتفاق ہے کہ سعی کی ابتداء صفا سے ہوگی اور یہ صحت سعی کے لئے شرط ہے، اگر کسی نے سعی کی ابتداء مروۃ سے کی اور صفاء پر ختم کی تو یہ سعی شمار نہیں ہوگی۔

تیسری بات: سعی کرتے وقت صفا سے ابتدا ہوگی اور مروۃ پر ختم ہوگی۔یہ حجر اسود کے استیلام کی طرح نہیں کہ حجر اسود سے ابتداء ہواور حجر اسود ہی پر انتہا ہو۔

چوتھی بات: صفا اور مروۃ کے درمیان میلین اخضرین ہیں، ان کے پاس پہنچنے پر مردوں کے لئے دوڑنا مستحب ہے اور عورتوں کی طرف سے خود حضرت ھاجرہ علیہا السلام ادا کرگئی ہیں کیونکہ اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ اس جگہ ان کے لئے پانی لانے کیلئے دوڑی تھی۔

من مقام ابراهيم: مقام بضم المیم عارضی رہنے کی جگہ اور بفتح المیم مستقل رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

باب ماجاء في الطواف راكبًا

مسئلہ: راکباً طواف کرنے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سواری پر طواف کرنا بغیر عذر کے جائز نہیں اور اگر بغیر عذر کے سواری پر طواف کیا تو اسپر دم واجب ہوگا، گویا پیدل کرنا واجب ہے۔اسلئے کہ حج کے احکام میں دم واجب کے ترک پر لازم آتا ہے۔
② امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ افضل تو یہ ہے کہ طواف ماشیاً کرے لیکن اگر کسی نے راکباً طواف کیا تو بھی جائز ہے، دم واجب نہیں ہوگا۔قول ثانی والوں کی متدل باب کی حدیث ہے، احناف اور مالکیہ فرماتے ہیں کہ سنن ابوداؤد میں حدیث ہے کہ قدم النبی ﷺ مكة وهو يشتكي تو اس عذر بیماری کی وجہ سے راکباً طواف کیا، سنن ابوداود کی حدیث سنداً ضعیف ہے کیونکہ اسمیں یزید بن ابی زیاد ضعیف راوی ہے۔دوسری وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ آپ کے راکباً طواف کی علت یہ ہے کہ یہ بعد النبوۃ پہلا اور آخری حج تھا، اسلئے لوگوں کی تعداد کثیر تھی اور مقصد یہ تھا کہ لوگ احکام حج سیکھ لیں اسلئے کئی مقامات پر آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ احکام سیکھ لو، لہذا یہ راکباً طواف تعلیم فعلی کیلئے کیا جو کہ اوقع فی النفس ہے تو طواف راکباً آپکے لئے عذر تھا اسلئے کیا۔

باب ماجاء في الصلاة بعد العصر وبعد الصبح

مسئلہ: کسی نے صبح یا عصر کے بعد طواف کیا اب رکعتین طواف پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اسمیں اختلاف ہے۔ ①۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فجر کے بعد

طلوع تک اور عصر کے بعد غروب تک رکعتین طواف پڑھنا جائز نہیں۔ ② امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں طلوع الشمس سے پہلے اسی طرح غروب شمس سے پہلے رکعتین طواف جائز ہیں۔قول ثانی والوں کی دلیل باب کی حدیث ہے کہ لاتمنعو اأ احدً ا طاف بهذا اً لبيت وصلى أيةساعة من ليل أو نهار

احناف کی دلیل ①۔وہ احادیث ہیں جن میں ان اوقات میں نماز کی ممانعت وارد ہوئی مثلاً نھی رسول اللہ ﷺ عن الصلاة بعد الفجر حتی تطلع الشمس وبعد العصر حتی تغرب الشمس۔② دوسری دلیل ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فجر کے بعد طواف کیا اور طلوع الشمس تک نماز نہیں پڑھی اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فجر اور عصر کے بعد طواف ہی نہیں کرتے تھے اسلئے کہ ان اوقات میں رکعتین طواف جائز نہیں۔ ③ تیسری دلیل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل ہے کہ انہوں نے فجر کے بعد طواف کیا رکعتین طواف ادا نہیں کیئے ذی طوی مقام پر پہنچے تو طلوع کے بعد دو رکعت ادا کیں اب اگر فجر کے بعد رکعتین جائز ہوتیں تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھتے کیونکہ انکا احرام میں پڑھنا افضل تھا، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عمل پر کسی نے نکیر نہیں کی۔④ چوتھی دلیل جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔⑤ پانچویں دلیل ام سلمہ کا عمل ہے، عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق بھی یہی منقول ہے۔

احناف باب کی حدیث میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حدیث کا یہ مفہوم نہیں کہ اوقات مکروہہ میں رکعتین طواف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اس موضوع سے اسکا تعلق نہیں، اصل بات یہ تھی کہ بیت اللہ کے ارد گرد بنی عبد مناف کے گھر تھے، رات کو وہ دروازے بند کر دیتے تھے اسلئے لوگوں کو پریشانی ہوتی تو نبی ﷺ نے منع کیا کہ لوگوں کو بیت اللہ جانے سے دروازہ بند کر کے نہ روکو۔

باب ماجاء فی کراهية الطواف عريانًا

پہلی بات: سورت براۃ جب نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے ۹ھ کو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور فرمایا کہ اس سورت میں جو اعلان ہے یہ تم کر دو، بعد میں کسی نے مشورہ دیا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی کی جانب سے اعلان ہو تو اسکا نسبی اعلان کرتا ہے، اسلئے نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور چند اور آدمی بھیجے، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی طرف سے چار باتوں کا اعلان کیا۔

دوسری بات: ننگے بدن طواف کرنے کا کیا حکم ہے؟ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہا کوفہ کے ہاں عند الطواف ستر عورت واجب ہے اسلئے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی نے عریاناً طواف کیا پھر ستر عورت کر کے طواف کا اعادہ کر دیا تو صحیح ہے لیکن اگر اعادہ نہیں کیا بلکہ عریاناً ہی طواف کیا تو اسپر دم لازم ہوگا کیونکہ نفس طواف تو فرض ہے۔﴿ولیطوفوا بالبیت العتیق﴾ آیت کی وجہ سے لیکن اخبار آحاد سے جو امور ثابت ہوتے ہیں۔مثلاً ستر عورت یہ واجب ہونگے، اگر یہ بھی فرض ہو جائیں تو قطعی الثبوت اور ظنی الثبوت سے ثابت ہونے والے امور میں فرق نہ رہیگا، حالانکہ انمیں فرق بدیہی ہے۔

اعتراض: معارف السنن میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے مذکور ہے کہ ستر عورت عام حالات میں فرض ہے۔ جب عام حالات میں فرض ہے تو طواف میں واجب کیسے ہوا؟ **جواب:** کسی چیز کی مختلف حیثیات ہوتی ہیں۔ان مختلف حیثیات کی وجہ سے اس سے مختلف احکام ثابت ہوتے ہیں۔یہاں بھی ستر عورت کی حیثیتیں ہیں۔ایک حیثیت عام حالت کی ہے اور ایک حیثیت خاص طواف کی حالت کی ہے۔اب کسی نے ننگے طواف کیا تو دونوں حیثیتوں کو دیکھیں گے۔عام حالات میں فرض ہے اسکی اگر خلاف ورزی کی تو مرتکب کبیرہ ہونے کی وجہ سے گنہگار رہوگا۔اور طواف میں ستر عورت واجب ہے اسکی بھی اگر خلاف ورزی کی تو دم

لازم آئیگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ستر عورت طواف میں شرط ہے اور فرض ہے، اسلئے کوئی ننگے طواف کرے تو اسکا طواف نہ ہوگا۔ دلیل باب کی حدیث ہے مگر احناف جواب دیتے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے۔ اسلئے اس سے وجوب ثابت ہوگا فرضیت ثابت نہ ہوگی کیونکہ فرض قطعی الثبوت دلیل سے ثابت ہوتا ہے۔

باب ماجاء في دخول الكعبة

پہلی بات: دخول کعبہ کا کیا حکم ہے؟ عمدۃ القاری میں شرح مسلم کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ بغیر کسی اعتراض کے دخول کعبہ مستحب ہے۔ ائمہ اربعہ کا اسپر اتفاق اور اجماع ہے کہ دخول کعبہ حج کے ارکان میں سے نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے عام حالات میں ہو یا موسم حج میں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ دخول کعبہ ارکان حج میں سے ہے مگر غلط ہے۔

دوسری بات ① کعبہ کے اندر نبی اکرم ﷺ نے نماز پڑھی ہے یا نہیں؟۔ اسکے متعلق دو روایات ہیں۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسامہ بن زید سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے بیت اللہ میں نماز نہیں پڑھی ہے۔ بعض نے تطبیق یہ دی ہے۔ ① کہ نفی اور اثبات میں تعارض ہو تو اثبات کو ترجیح ہوتی ہے کیونکہ مثبت کے پاس اضافہ ہوتا ہے، جو نفی کے پاس نہیں ہوتا۔ ② بعض کہتے ہیں کہ اسامہ اور بلال دونوں اندر گئے تھے اور یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے، نبی اکرم ﷺ نے داخل ہونے سے پہلے باہر کے بت گرائے۔ ایک بت بیت اللہ کے اوپر تھا، نبی کریم ﷺ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کندھے پر کھڑے ہوئے مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بوجھ برداشت نہ کر سکے۔ اسلئے نبی اکرم ﷺ نیچے ہوئے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کندھے پر کھڑے ہو کر بت کو توڑ دیا۔ پھر اندر آئے تو تصویریں بنی ہوئی تھیں، نبی کریم ﷺ نے اسامہ کو پانی لانے کیلئے بھیجا تا کہ صاف کریں۔ اسامہ پانی لائے اور تصویریں صاف کیں، جب نماز پڑھی تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا اور اسامہ اسوقت پانی لانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ③ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسکو پسند کیا ہے جو زرقانی نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ دو مرتبہ داخل ہوئے ایک مرتبہ نماز پڑھی اور ایک مرتبہ نہیں پڑھی۔

تیسری بات: اب نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض حضرات کے ہاں بیت اللہ کے اندر مطلقاً نماز جائز نہیں کیونکہ اگر اسکے اندر پڑھے تو بعض حصہ کی طرف استدبار ہوتا ہے۔ جمہور کے ہاں جائز ہے، پھر جمہور کا آپس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نماز جائز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ایک روایت میں انکے ہاں نوافل جائز ہیں۔ فرائض۔ وتر۔ رکعتین طواف اور رکعتین فجر جائز نہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ نماز کی صحت کے اعتبار سے فرائض اور نوافل کا ایک حکم ہے۔

چوتھی بات: حطیم جو کعبہ سے باہر ہے، حقیقۃً کعبہ کی بنا میں داخل ہے۔ یہ تقریباً ۳۲ اور ۳۸ ذراع کی جگہ ہے اسمیں چھ ذراع یقیناً بیت اللہ کا حصہ ہے باقی کے اندر شبہ ہے کہ یہ اندر کا حصہ ہے یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اندر کا حصہ ہے، لیکن احتیاط اسمیں ہے کہ طواف اسکے باہر سے ارد گرد کیا جائے، اور اگر کسی نے فقط اسکی طرف نماز پڑھی تو اسکی نماز نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکا کعبہ ہونا یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ انی اخاف ان اکون اتعبت امتی اسکا مطلب یہ ہے کہ میں داخل ہوا ہوں اب بعد میں لوگ سمجھیں گے کہ شائد داخل ہونا رکن ہے۔ اور بھیڑ کی وجہ سے اگر داخل نہ ہو سکے یا حکام نے داخل نہ ہونے دیا تو لوگ پریشان ہونگے کہ ہمارا حج ہی نہیں ہوا۔ اسلئے آپ نے فرمایا کہ میں نے امت کو تھکا دیا۔

باب ماجاء فی فضیل الحجر الاسود والرکن والمقام

پہلی بات: حجر اسود۔ مقام ابراہیم اور رکن یمانی کی فضیلت مسلم ہے۔ اسمیں کوئی کلام نہیں۔

دوسری بات: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ جنت سے جب لایا گیا تو دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ انسان کے گناہوں نے اسکو سیاہ کر دیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ ملحدین کا یہ اعتراض ہے کہ جب اسکو گناہوں نے کالا کر دیا تو نیکیوں نے سفید کیوں نہیں کیا؟ جواب: شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نتیجہ اخص ارزل کے تابع ہوتا ہے اور نیکیوں اور گناہوں میں اخص ارذل گناہ ہے۔ جواب: سفید رنگ پر کالا رنگ جلدی اثر کرتا ہے لیکن کالے کو سفید کرنا ہو تو یہ مشکل ہے۔ اگر صاف بھی ہو جائے تو دھبے باقی رہتے ہیں۔ جواب: اصل مقصود عبرت ہے کہ یہ پتھر سفید تھا تو میرے گناہوں نے کالا کر دیا تو عبرت اسکے کالا رہنے میں ہے۔ جواب: دنیا میں کثرت گناہوں کی ہے کیونکہ صرف مسلمان کی بات نہیں بلکہ خطایا نبی آدم کا ذکر ہے اور کثرت گناہوں کی ہے۔

تیسری بات: ایک روایت میں اسکو یمین اللہ کہا گیا ہے کہ اس کے مصافحے اور استلام کے علت یہ ہے کہ یہ اللہ کا یمین ہے، اسلئے اسکو چومتے ہیں کیونکہ اسوقت عام عادت تھی کہ کسی بڑے آدمی سے ملتے تو اس کے ہاتھ چومتے تھے اور یہ اللہ کا یمین ہے اسلئے اسکو چوما جاتا ہے۔

تیرے بوسے پہ ہم نے بوسہ دیا حجر اسود کو۔ وگرنہ کام کیا تھا ہم مسلمانوں کو پتھر سے

باب ماجاء ان منی مناخ من سبق

مسئلہ: مطلب یہ ہے کہ جو جہاں خیمہ لگائے تو دوسرا اسکو ہٹا نہیں سکتا، اس سے احناف نے ایک اختلافی مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ ارض مکہ کا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ احناف اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں کیونکہ یہ ارض موقوفہ ہے، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ارض مکہ کی بیع وشراء جائز ہے۔ باب کی حدیث میں ہے کہ المنی مناخ من سبق کہ کسی کی ملکیت نہیں، اسلئے جو جہاں خیمہ لگائے، وہ اسکی جگہ ہے۔ یہ احناف کی دلیل ہے۔

باب ماجاء فی تقصیر الصلاۃ بمنٰی

مسئلہ: حاجی اگر مکہ جائیں اور پندرہ دن یا اس سے زائد دن کی اقامت کا ارادہ نہ کریں تو وہ بالاتفاق قصر کریں گے لیکن مکہ، منی اور عرفات کے رہنے والے یہ قصر کریں گے۔ اسمیں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ صحیح قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا قول یہ ہے کہ مسافر تو قصر کریں گے جو مسافر نہیں وہ نہیں کریں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ منی عرفات، مزدلفہ میں قصر مناسک میں ہے اس لئے وہاں کے رہنے والے بھی قصر کریں گے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں قصر کیا ہے نبی اکرم ﷺ نے خود قصر پڑھی مگر اہل مکہ کیلئے اتمام کا اعلان کیا، اگر ان کے لئے اتمام ہوتا تو اعلان کرتے۔ اسلئے کہ قصر مناسک میں سے ہے۔ جمہور یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے اعلان کیا ہو لیکن راویوں نے نقل نہ کیا ہو کیونکہ وہ حج کے مناسک نقل کر رہے تھے اسلئے غیر مناسب بات نقل نہیں کی۔ مگر صحابہ کا عمل اسپر تھا کہ وہ اعلان کرتے تھے، جسطرح عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلان کیا تھا کہ اتموا یا اھل مکۃ اور صحابہ میں سے کسی نے نکیر نہیں کی اسی طرح عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اتمام کرتے تو تاویل کرتے تھے۔

باب ماجاء فی الوقوف بعرفات والدعاء فیھا

پہلی بات: ترجمۃ الباب میں دو چیزیں ہیں۔ایک وقوف عرفہ اور دوسرا اسمیں دعا کرنا۔تمام ائمہ کا اسمیں اتفاق ہے کہ وقوف عرفات حج کے ان ارکان میں سے ہے جنکے بغیر حج ادا نہیں ہوتا بلکہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے بعض حضرات کے ہاں وقوف اور طواف زیارت فرائض حج میں سے ہے۔حدیث میں ہے الحج العرفۃ کہ حج وقوف عرفہ کا نام ہے یعنی وقوف عرفہ حج کا رکن اعظم ہے۔

دوسری بات: عرفات کے وقوف کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔۹ ذوالحجہ کے دن زوال کے فوراً بعد اذان ہوتی ہے اور امام دو نمازوں یعنی ظہر اور عصر کو جمع کرتا ہے پھر خطبہ دیتا ہے اور مسائل سمجھاتا ہے خطبے کے بعد لوگ وقوف شروع کرتے ہیں۔

وقوف کا لغوی معنی ہے کھڑا ہونا اور ٹھہرنا مگر حج کے دوران وقوف کی اصطلاح اس معنی میں ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر دعا و ذکر میں مشغول رہے۔اسکا بہتر موقف جبل رحمت کے پاس ہے، یہ وقوف غروب آفتاب تک رہتا ہے۔غروب کے بعد مغرب نہیں پڑھتے بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کو جمع کیا جاتا ہے۔

تیسری بات: عام ایام میں رات مقدم ہوتی ہے دن مؤخر ہوتا ہے۔مثلاً کل اکیس تاریخ ہے تو آج رات سے اکیس تاریخ شروع ہو جاتی ہے، مگر ایام حج میں رات دن کے تابع ہوتی ہے گویا جو عام طور پر اکیس تاریخ کی رات ہوتی ہے وہ بیس تاریخ کی شمار ہوگی اسلئے وقوف عرفہ تاریخ کے زوال کے بعد سے طلوع تک رہتا ہے اور وقوف مزدلفہ طلوع فجر کے بعد شروع ہوتا ہے۔پھر طلوع شمس سے پہلے منیٰ چلے جاتے ہیں، اگر کسی نے فجر تک وقوف عرفہ نہ کیا ہو تو اس کا حج فوت ہو جائے گا۔

چوتھی بات: وقوف کا مقام عرفات کا میدان ہے۔عرفات سارا موقف ہے سوائے وادی عرنہ کے۔

باب ماجاء ان عرفة کلھاموقف

پہلی بات: باب کی حدیث کا مطلب اور مقصد مقام وقوف اور مکان وقوف بتانا ہے۔گزر چکا ہے کہ وقوف کا مقام عرفہ ہے۔عرفہ پورا موقف ہے، عرفات کے حدود کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔صرف وادی عرنہ عرفات اور مزدلفہ کے درمیان واقع ہے، اسمیں اگر وقوف کسی نے کر لیا تو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول اور صاحب ہدایۃ نے امام صاحب کا ایک قول نقل کیا ہے کہ عرنہ میں کسی نے وقوف کر لیا تو اسکا حج ادا ہو جائے گا۔مگر امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول اور جمہور فقہاء کا مسلک ہے کہ وقوف ادا نہ ہوگا۔اور حج صحیح نہ ہوگا الا یہ کسی نے عرفہ میں ایک لمحہ کیا ہو پھر حج ہو جائے گا۔

دوسری بات: عرفات کے اندر ظہر اور عصر کو جمع کیا جاتا ہے، امام صاحب کے ہاں جمع بین الصلاتین عرفات کے اندر کرنے کیلئے چند شرائط ہیں: (۱) تقدیم احرام ہو یعنی جمع الصلاتین سے پہلے اس نے احرام باندھا ہو۔ (۲) مقام شرط ہے کہ مقام عرفہ ہو۔ (۳) زمان شرط ہے یعنی ۹ تاریخ کے بعد کا وقت ہو۔ (۴) ظہر عصر سے مقدم ہو۔ (۵) امام یا امام کا نائب ہو۔ (۶) جماعت شرط ہے۔ان چھ شرائط میں سے اگر ایک شرط بھی نہ ہو تو عرفات میں جمع صحیح نہ ہوگا۔

تیسری بات: عرفات میں جو جمع کرتے ہیں یہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ہے، یہ ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی ہے، انکا دوسرا قول امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بغیر اذان کے دو اقامتوں کے ساتھ جمع ہوگی۔امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو اذان اور اقامتین ضروری ہیں۔

چوتھی بات: دوسری جمع مزدلفہ میں کی جاتی ہے۔ راستے میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اگر فوت ہونے کا خطرہ ہو مثلاً یہ خطرہ ہو کہ فجر تک مزدلفہ نہیں پہنچ سکے گا۔ پھر راستے میں پڑھ سکتا ہے، ورنہ رات کو جس وقت بھی پہنچ سکتا ہو پہنچے اور راستے میں نہ پڑھے۔

اسمیں جمع کیلئے بھی کچھ شرائط ہیں ① وقوف عرفات پہلے کر چکا ہو۔ ② زمان شرط ہے یعنی ۹ تاریخ کی ہو۔ ③ مکان شرط ہے کہ آدمی مزدلفہ میں ہو۔ اسمیں امام یا اسکا نائب شرط نہیں۔ یہ جمع تاخیر امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ ہوگی لیکن اگر فصل طویل ہو جائے تو پھر ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ہوگی۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فقط دو اقامتوں کے ساتھ ہوگی۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو اذانوں اور دو اقامتوں کے ساتھ ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ یہ جمع تاخیر ہوگی۔

پانچویں بات: مزدلفہ کے وقوف کا حکم احناف کے ہاں وجوب کا ہے، اگر فوت ہو گیا تو اسکا جبیرہ دم سے ہوگا، اور عذر کی وجہ سے ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ جسطرح آگے آئیگا کہ نبی ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو رات کو بھیج دیا تھا۔ مزدلفہ پورا موقف ہے سوائے وادی محسر کے، یہ مزدلفہ کے حدود میں داخل نہیں۔ اسلئے اسمیں وقوف صحیح نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وادی محسر میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کو تباہ کیا تھا۔ مگر بعض مفسرین نے اسکو رد کیا ہے کیونکہ یہ حرم میں داخل ہے۔ جبکہ ابرہہ حرم کی حدود میں داخل نہ ہو سکا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ یہود کا موقف ہے اسلئے مسلمانوں کا موقف اسمیں نہیں ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ وادی نار ہے کہ کسی شکاری نے شکار کیا تھا اوپر سے آگ آئی اور شکار اور آدمی دونوں کو جلا دیا اسلئے یہ موقف ہونے سے خارج ہے۔ اس سے نبی اکرم ﷺ بہت جلدی گزرتے تھے۔

چھٹی بات: افعل و لاحرج: دس تاریخ کی صبح کو مزدلفہ کو وقوف کے بعد کچھ احکام ہیں۔

① پہلا امر یہ ہے کہ منیٰ میں رمی کرنا ہے، رمی کے بعد اگر مفرد ہو تو حلق کرتا ہے اور حلق یا قصر کے ساتھ حلال ہو جاتا ہے، پھر نحر اور پھر حلق کرتا ہے حلق کے بعد حل ناقص کے ساتھ حلال ہو جاتا ہے پھر طواف زیارت کر کے مکمل حلال ہو جاتا ہے۔ یہ ترتیب مسنون ہے مگر طواف زیارت کو ان تینوں پر مقدم کر سکتے ہیں، بلکہ اسمیں آسانی بھی ہوتی ہے کہ عام لوگ منیٰ میں ہوتے ہیں۔ بیت اللہ خالی ہوتا ہے اسلئے طواف زیارت آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ پہلے تین رمی نحر اور حلق میں احناف کے ہاں ترتیب واجب ہے، جمہور کے ہاں مستحب ہے۔ جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے افعل و لا حرج۔ امام صاحب کی دلیل ایک تو نبی کریم ﷺ کا فعل ہے۔ مگر اصول یہ ہے کہ فعل سے وجوب ثابت نہیں ہوتا مگر ہم کہتے ہیں کہ وجوب ثابت نہ بھی ہو تو نبی کریم ﷺ کا مسنون طریقہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ترتیب ہونی چاہئے۔ دوسری دلیل ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موقوف روایت ہے۔ من قدم أو أخر شيئاً فليذبح۔ جمہور کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ صحابہ کا پہلا حج تھا۔ اسلئے انکی خصوصیت تھی کہ انکو عفو تھا۔ اسلئے نبی کریم ﷺ نے انکی آسانی کیلئے فرمایا کہ اگر تقدیم یا تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ دوسری تاویل ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کا۔ لا حرج کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہ ہوگا۔ باقی دم سے اسکا کوئی تعلق نہیں دم ضرور لازم آئے گا۔

باب ماجاء فی تقدیم الضعفة من جمع بلیل

پہلی بات: مزدلفہ کے وقوف کا وقت طلوع فجر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اگر چہ لوگ رات کو آجاتے ہیں۔ اب کوئی بیمار ہو یا بوڑھا ہو کہ ازدحام کی وجہ سے اسکو تکلیف ہو تو رات کو یہ منیٰ جا سکتا ہے یا نہیں۔ یعنی وقوف مزدلفہ عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں۔ تو ائمہ اربعہ جمہور فقہاء اور محدثین کے ہاں ساقط ہو جاتا ہے۔ معذور افراد رات کو منیٰ جا سکتے ہیں۔

دوسری بات: رات کولوگ جب منی پہنچ جائیں تو رمی جو دس تاریخ کی ہے وہ رات کو کرسکتا ہے یا نہیں۔ تو اکثر ائمہ کی رائے یہ ہے کہ طلوع شمس سے پہلے انکے لئے رمی جائز نہیں۔ بلکہ طلوع شمس کا انتظار کریں۔ اور طلوع کے بعد رمی کریں۔

تیسری بات: وقوف مزدلفہ کا کیا حکم ہے۔ تو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سنت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول وجوب کا بھی ہے۔ بعض تابعین اسکے رکن ہونے کے قائل ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں چونکہ واجب ہے اسلئے بالا عذر ترک پر دم لازم آئے گا حج فاسد نہیں ہوگا۔

باب

مسئلہ: اس باب میں رمی کا زمان بتایا جارہا ہے کہ پہلے دن کی رمی زوال سے پہلے مسنون ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کی رمی زوال کے بعد مسنون ہے۔ البتہ تیرہ تاریخ کی رمی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں استحسانا زوال سے پہلے جائز ہے۔ باقی حضرات کے ہاں تیرہ تاریخ کی رمی بھی زوال کے بعد ہے۔ اگر کسی نے تینوں دن ترک کردی یا ایک ترک کردی تو اسپر دم آئے گا۔ اسی طرح زیادہ کنکریاں ترک کردیں۔ مثلاً تین کنکریاں ماری باقی چار رہ گئیں پھر بھی اسپر دم آئے گا۔ لیکن اگر اکثر کنکریاں ماردی ہوں اور کم باقی ہوں تو ہر کنکری کے بدلے میں ایک صاع صدقہ کرنا پڑے گا۔ بعض نے امام صاحب کا قول یہ نقل کیا ہے کہ اگر ایک کنکری رہ گئی تو نصف صاع اور اگر دو رہ گئیں تو دو صاع آئیں گے اور اگر تین کنکریاں رہ گئیں۔ تو بعض کے ہاں تین صاع اور بعض کے ہاں دم لازم ہوگا۔ اور اگر ایک ہی ہاتھ سے اکٹھی سات کنکریاں ماریں تو وہ ایک کنکری شمار ہوگی۔ لیکن امام صاحب کا صحیح قول اوپر والا ہے۔

باب ماجاء فی الاشتراک فی البدنة والبقرة

مسئلہ: ائمہ مجتہدین کا قول یہی ہے کہ گائے اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں۔ فقط امام مالک کا قول ہے کہ دس آدمی شریک ہوسکتے ہیں۔ یہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں دس کی شرکت کا ذکر ہے۔ جمہور اس حدیث میں چند تاویلات کرتے ہیں۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ یہ سفر کا واقعہ ہے۔ اور حالت سفر میں مسافر پر قربانی واجب نہیں ہوتی۔ اور دم قران تو واجب ہے۔ (۲) بعض حضرات کہتے ہیں کہ دس آدمی صرف کھانے میں شریک تھے۔ ملکیت میں سب شریک نہیں تھے (۳) بعض کہتے ہیں کہ ابتداء میں دس آدمیوں کی شرکت جائز تھی اور بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ازواج مطہرات کی طرف سے ایک بدنہ ذبح کیا۔ (۴)۔ معارف السنن میں شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ واقعة حال لا عموم لها کہ یہ واقعہ جزئیہ ہے کلیہ قاعدہ نہیں۔ ویسے تو حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایک بکری ایک گھر والوں کی طرف سے کافی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ تو یہاں بھی کفالت کا یہی مطلب ہے کہ بکری میں ایک گھر والے کھانے میں شریک ہوسکتے ہیں۔

باب ما جاء فی اشعار البدن

پہلی بات: اشعار کی کیفیت کیا ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ اسکی کیفیت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے قبائل میں عام طور پر لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ راستے میں مال لوٹ لیتے تھے۔ لوگ جب ہدی کا جانور کعبہ بھیجتے تھے۔ تو اشعار کرتے تھے یعنی کوہان کے دائیں

جانب زخم کر کے خون لگاتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ھدی کا جانور ہے۔ اسلئے لوگ اسکو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے اسلام کے بعد اسکو باقی رکھا اور ھدی کے لئے دو علامتیں مقرر فرمائیں: ① ۔ ھدی کے جانور کے گلے میں پرانے جوتوں کا ہار ڈالا جائے۔ ② ۔ بڑے جانور کا اشعار کیا جائے۔ آپ جب حجۃ الوداع میں تشریف لے جارہے تھے تو یہی طریقہ اختیار کیا تھا

دوسری بات: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ اشعار مثلہ ہے۔ اس بنا پر امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وکیع کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً اشعار کو مثلہ قرار نہیں دیا بلکہ اشعار کی دو صورتیں ہیں۔ ① ۔ جانور کی صرف نفس جلد یعنی کھال پر زخم لگائے۔ اس قسم کے اشعار کو امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مثلہ قرار نہیں دیا۔ ② ۔ جانور کو اتنا زخمی کر دیا جائے جس سے اسکی جان کا خطرہ ہو۔ کہ چمڑے تک محدود نہ ہو بلکہ گوشت تک تجاوز کر جائے۔ اس قسم کے اشعار کو امام صاحب نے مثلہ قرار دیا ہے اور حدیث کے خلاف نہیں۔

تیسری بات: اشعار کا حکم استحباب کا ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ کے پاس حجۃ الوداع کے موقع پر ایک روایت کے مطابق ۶۳ اور دوسری روایت کے مطابق ۶۷ اونٹ تھے۔ انمیں سے فقط ایک اونٹ کا اشعار کیا اسی طرح روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان کچھ اور جانور بھی خریدے اور انکا آپ نے اشعار نہیں کیا۔ اسی طرح جو اونٹ حضرت علی کرم اللہ وجہہ لائے تھے۔ انکا بھی اشعار نہیں کیا تھا۔

چوتھی بات: امام وکیع رحمہ اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے استاد تھے۔ ان کے متعلق تراجم میں لکھا ہے۔ کان یفتی بقول ابی حنیفہ معارف السنن میں لکھا ہے کہ محدثین کے متعلق اس قسم کے جملوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی تقلید عام لوگوں کی تقلید کی طرح نہیں ہوتی تھی۔ یعنی منصوص احکام میں تقلید نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ غیر منصوص احکام میں وہ بھی کسی نہ کسی کی تقلید کرتے تھے۔ تو وکیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر براہ راست مطلقاً تردید نہیں کی ہے۔ بلکہ فقط اشعار کے مسئلے میں تردید کی ہے۔

لا تنظروا إلى قول اهل الرای اہل رائے سے فقہاء مراد ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ فقہاء کے لئے علم ہے۔ جیسے حافظ ابن عبدالبر مالکی نے تمام فقہاء کو اہل رائے کہا ہے جیسے امام مالک کے استاد ربیعہ الرائے اور امام احمد کے استاد ہلال الرائے مشہور ہیں تو مقصود یہ ہے کہ یہ لفظ فقہاء کے لئے ہے خواہ احناف ہوں یا غیر احناف ہوں اور یہ لفظ مدح کیلئے ہے اس سے مذموم رائے مراد ہیں۔

پانچویں بات: امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے کہ وہ قلادہ ڈالنے سے منع کرتے تھے۔ اسکے متعلق یہ سمجھو کہ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ جانور دور سے لایا جائے اور اسکے گلے میں جوتوں کا ہار ہو تو سفر اسکے لئے مشکل ہو جائے گا اور یہ بکری کے متعلق ہے ورنہ نفس قلادہ کو وہ منع نہیں کرتے تھے۔

باب ماجاء اذا عطب الهدى مايصنع

ھدی کا جانور کوئی لیکر ساتھ گیا۔ اب وہ زخمی ہو گیا یا مر گیا تو اسکا کیا حکم ہے؟۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہدی تطوع ہو تو اسکو ذبح کر دیں اور اسکے ہار اور پاؤں کو خون سے رنگ دیں۔ تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ ہدی ہے اسلئے غریب لوگ کھائیں گے غنی لوگ نہیں کھائیں گے۔ خود بھی نہ کھائے اور اسکے ساتھی بھی نہ کھائیں اور اگر ہدی واجب ہو تو نئی ہدی خریدے باقی وہ ھدی جو مالک کی ہے اسکے ساتھ جو چاہے کرے۔ یہ قول احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ہے۔ شافعی کا قول اسکے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ھدی نفل ہو تو خود کھا سکتا ہے۔ اور واجب ھدی ہو تو خود نہیں کھا سکتا بلکہ وہاں ہی چھوڑ دے۔ اسکے بدلے میں دوسرا جانور ھدی ضروری نہیں۔

باب ماجاء بأی جانب الرأس یبدأ فی الحلق

مسئلہ: اتنی بات پر تو اتفاق ہے کہ جانب یمین سے سر کے حلق کی ابتداء کی جائے یہ مستحب ہے لیکن یہ کس کی یمین مراد ہے۔ حالق کا یمین مراد ہے یا محلوق کا یمین مراد ہے۔ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے دو قول ہیں: ا۔ محلوق کا یمین مراد ہے۔ ② حالق کا یمین مراد ہے۔ لیکن امام صاحب اور جمہور کا صحیح تر قول یہ ہے کہ محلوق کا یمین مراد ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک حکایت منقول ہے کہ میں مکہ کی طرف حج کے لئے گیا۔ تو میں نے حجام سے تین سنتیں سیکھیں۔ ①۔ میں غیر قبلہ رخ ہو کر بیٹھا۔ اس نے مجھے کہا قبلہ رخ ہو کر بیٹھو۔ ②۔ میں نے الٹی یعنی بائیں جانب آگے کی تو اس نے کہا کہ سیدھی جانب آگے کرو۔ ③۔ جب میں جانے لگا تو اس نے کہا ان بالوں کو دفن کر کے جاؤ۔

باب ماجاء متی یقطع التلبیة فی الحج

مسئلہ: تلبیہ کب منقطع کریگا؟ اسمیں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ حاجی دس ذی الحجہ کو منی پہنچ کر جمرہ عقبہ کی رمی کے ساتھ تلبیہ منقطع کرے گا۔ اب یہ ہے کہ تلبیہ کا انقطاع پہلی کنکری کے ساتھ ہوگا یا آخری کنکری کے مارنے کے بعد ہوگا۔ تو بعض نے کہا ہے کہ آخری کنکری مارنے کے بعد تلبیہ منقطع ہوگا۔ لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ پہلی کنکری کے مارنے کے ساتھ تلبیہ منقطع ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ امام اوزاعی اور لیث بن سعد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نو تاریخ کو عرفات میں زوال کے وقت کے شروع ہونے سے تلبیہ منقطع ہوگا۔ لیکن معارف السنن میں لکھا ہے۔ کہ قول ثانی کے قائلین کا صحیح تر قول یہ ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ اب تلبیہ جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کے دوسرے افعال کے شروع ہونے کی وجہ سے تلبیہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ویسے انکے نزدیک بھی تلبیہ جمرہ عقبہ کی رمی تک رہتا ہے۔ اس تفصیل؛ کے مطابق جمہور اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول میں فرق نہیں۔ تو سب کے نزدیک جمرہ عقبہ تک رہتا ہے۔

باب ماجاء متی یقطع التلبیة فی العمرة

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ عمرے میں استلام حجر کے ساتھ تلبیہ منقطع کریگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتب میں لکھا ہے کہ طواف کے شروع میں تلبیہ منقطع کریگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پہلے اور دوسرے قول میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا کیونکہ طواف کے ساتھ ہی استلام حجر ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ اگر آدمی نے عمرے کا احرام میقات سے باندھا ہے تو حدود حرم میں پہنچنے پر تلبیہ منقطع کریگا۔ اور اگر احرام جعرانہ یا مسجد عائشہ یعنی تنعیم سے باندھا ہے۔ تو پھر ایک قول میں مکہ کے مکانات پر تلبیہ منقطع کریگا۔ اور ایک قول میں مسجد حرام میں پہنچنے پر تلبیہ منقطع کریگا۔ باب کی حدیث جمہور کا مستدل ہے۔

باب ماجاء فی طواف الزیارة الی اللیل

پہلی بات: حج کے ارکان میں سے ایک رکن طواف زیارت ہے اگر یہ فوت ہو جائے تو حج بھی فوت ہو جائے گا۔

دوسری بات: طواف زیارت کا وقت کیا ہے؟۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف زیارت کے متعلق دو قسم کی روایات ہیں ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس تاریخ کو رمی کیا، نحر کیا، حلق کیا پھر حلال ہو گئے، پھر ظہر کے بعد طواف زیارت کیا اور ظہر کی نماز واپس منی میں

آ کر ادا کی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ظہر کی نماز آپ نے مکہ ہی میں ادا کی۔ تیسری قسم کی روایت میں ہے کہ آپ نے طواف زیارت رات تک مؤخر کی۔ محدثین کے ہاں یہ بات صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ نے دن کو طواف زیارت کیا ہے۔ اور ظہر کی نماز مکہ ہی میں پڑھی۔ باقی جس روایت میں رات تک مؤخر کرنے کا ذکر ہے۔ یہ قوت کا اعتبار مرجوح ہے۔ یا جن روایات میں رات کے وقت طواف کا ذکر ہے اس سے طواف زیارت مراد نہیں۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ جتنے دن منی میں رہے۔ تو آپ سے منقول ہے کہ آپ رات کو نفلی طواف کرتے رہے۔ تو یہ نفلی طواف مراد ہے۔ راوی نے غلطی سے طواف زیارت کہدیا۔

تیسری بات: طواف زیارت کا مستحب وقت دس تاریخ کے دن کو ادا کرنا ہے مگر حج کے ایام میں آنے والی راتیں گزرے ہوئے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ اسلئے دس تاریخ گزرنے کے بعد رات کو طواف کیا تو وہ بھی ادا ہو جائے گا۔ بلکہ تیرھویں تاریخ تک طواف جائز ہے۔ اگر اس سے بھی تاخیر ہوئی تو دم واجب ہوگا۔

چوتھی بات: کوئی طواف زیارت نہ کرے تو ہمیشہ کیلئے جب تک طواف زیارت نہ کرے تو بیوی سے جماع نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ارکان میں سے ہے۔

باب ماجاء فی نزول الابطح

پہلی بات: الابطح۔ اسکو محصب بھی کہتے ہیں۔ یہ مکہ اور منی کے درمیان ایک نالہ تھا۔ جسمیں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی تھیں۔ آپ بارہ تاریخ کو جب منی سے واپس آئے تو آپ نے یہاں پر پڑاؤ ڈالا تھا۔

دوسری بات: اس ابطح مقام پر اترنے کا حکم کیا ہے؟ اور آپ نے نزول کیوں کیا؟ معارف السنن میں لکھا ہے کہ احناف، مالکیہ اور شافعیہ کی کتب میں صحیح تر قول یہ ہے کہ اس مقام محصب پر قیام کرنا مستحب ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی کا اس مقام پر پڑاؤ کا ارادہ نہ بھی ہو تو اتر کر پڑاؤ کرے یہ مستحب ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ مناسک حج میں سے نہیں۔ تو یہ قول سب ائمہ کا ہے کہ پڑاؤ مستحب ہے۔

تیسری بات: نبی اکرم ﷺ نے اس مقام پر پڑاؤ کیوں کیا۔ اسکے متعلق دو باتیں ہیں ① حدیث عائشہ میں ہے کہ آپ اسلئے ٹھہرے تھے کہ جب آپ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہاں سے مدینہ کا راستہ آسان تھا اسلئے یہاں اترے ② آپ شکر کیلئے اس مقام پر اترے تھے یہ وہی مقام ہے۔ جس جگہ مشرکین مکہ نے بنو ہاشم سے بائیکاٹ کیا تھا۔ جسکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں ہے۔ مختصراً یہ سمجھیں کہ نبوت کے ساتویں سال مسلمانوں نے جب حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ تو نجاشی نے ان کو ٹھکانہ دیا۔ جس سے مکہ کے مشرکین بڑے غمگین ہوئے تھے اور جمع ہوئے اور بنو ہاشم کے سردار ابو طالب سے مطالبہ کیا۔ کہ حضور ﷺ کو ہمارے حوالے کرو۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ تو اسکے نتیجے میں مشرکین مکہ نے بنو ہاشم کا بائیکاٹ کیا۔ اور اسی مقام میں انہوں نے معاہدہ لکھا۔ جس وجہ سے بنو ہاشم شعب ابی طالب میں بند ہو گئے۔ تقریباً تین سال وہاں پر بند رہے۔ اور بہت تکالیف اٹھائیں۔ نبوت کے دسویں سال نبی کریم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کو بتلا دیا کہ مشرکین مکہ نے معاہدہ لکھا تھا اسمیں ظلم و جبر کی تمام لکھی ہوئی باتوں کو کیڑوں مکوڑوں نے کھالیا سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے۔ کہ وہ اب بھی باقی ہے۔ تو آپ کے چچا ابو طالب نے مشرکین مکہ کو کہا کہ میرے بھتیجے نے یہ خبر دی ہے اگر وہ سچا ہے تو ہمیں چھوڑ دو۔ تو مشرکین مکہ نے جب دیکھا تو وہ آپ کے بتلانے کے مطابق تھا۔ چنانچہ انہوں نے بنو ہاشم کو چھوڑ دیا۔ تو پھر وہ مکہ میں رہنے لگے۔ تو آپ کا یہاں پر اترنا بطور شکر کے تھا کہ ایک وقت وہ تھا کہ ہمیں یہاں بند کیا تھا اور اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے غلبہ دیا اس پر شکر ادا کیا۔

باب ماجاء فی حج الصبی

مسئلہ: ائمہ مجتہدین کا اسپر اتفاق ہے کہ بچے کا حج کرنا صحیح ہے۔ ① اگر بچہ احرام باندھنے پر قادر ہو تو خود احرام باندھے اور اگر خود قادر نہ ہو تو اسکا ولی اسکو احرام بندھوالیگا اور پھر اس بچے کو احرام کے محظورات اور ممنوعات سے بچائے گا۔ ② اگر بچہ احرام کے محظورات میں واقع ہو جائے تو اسپر دم نہیں ہوگا۔ ③ اس بچے کے حج کے صحیح ہونے پر اجماع ہے اور حج کرانے والوں کو اسکا ثواب ملے گا۔ ④ اہل ظواہر کے علاوہ ائمہ اربعہ کا اسپر اتفاق ہے کہ بچے کے بچپن کا حج فرض نہیں ہے۔ بالغ ہونے پر اگر مالدار ہو تو حج فرض دوبارہ ادا کریگا۔ کیونکہ بچے پر بچپن میں وجوب یا فرضیت ثابت ہی نہیں ہوتی۔ ⑤ اگر کوئی بچہ احرام باندھتے وقت نابالغ تھا۔ پھر افعال حج کے دوران وہ بالغ ہوگیا تو کیا اس حج سے اسکے حج کی فرضیت ساقط ہوگی یا نہیں؟ تو ہماری فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس سے حج فرض ساقط نہیں ہوگا۔ جب تک وہ دوبارہ احرام باندھ کر حج ادا نہ کرے۔

فکنا نلبی عن النساء: عورتوں کی طرف سے مراد تلبیہ پڑھیں یہ کسی کا مذہب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جہرا اور عورتیں بلا جہر پڑھتی تھیں۔

و ترمی عن الصبیان: رمی میں بچوں اور معذوروں (جو کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں) کی طرف سے نیابت جائز ہے۔

باب ماجاء فی الحج عن الشیخ الکبیر و المیت

پہلی بات: یہاں نیابت فی الحج کا مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عبادات تین قسم کی ہیں۔ ① عبادات بدنی انمیں کسی کے ہاں نیابت جائز نہیں۔ ② عبادات مالیہ میں نیابت مطلقاً جائز ہے عذر ہو یا نہ ہو۔ ③ عبادات مالی و بدنی اسمیں عذر ہو تو نیابت جائز ہے۔ مثلاً شیخ فانی ہے اسکی طرف سے حج ادا کیا جائیگا یہ حج بدل کہلاتا ہے۔

دوسری بات: کسی کے ذمے حج واجب ہوا تھا کہ وہ مرگیا۔ اس نے مرتے وقت وصیت کردی تو اسکے ورثاء اسکے ثلث مال سے کسی کو حج کیلئے بھیجیں۔ یہ بھی حج بدل کی صورت ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی پر حج واجب ہوا مگر وہ بغیر وصیت کے مرگیا۔ یا اسپر حج واجب ہی نہ ہوا تھا اور ورثاء اسکی طرف سے حج کریں۔ یہ حقیقت میں حج بدل نہیں حج نفل ہوگا۔ حج بدل کی پہلی دو صورتیں ہیں اور فقہاء فرماتے ہیں کہ حج بدل حج افراد کی صورت میں کیا جائیگا نہ کہ تمتع یا قران کی صورت میں۔ مگر متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے حج تمتع کی بھی اجازت دی ہے۔

باب ماجاء فی العمرۃ أواجبۃ ھی أم

مسئلہ: عمرہ واجب ہے یا نہیں اسمیں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کے ہاں عمرہ سنت ہے واجب نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا قول وجوب کا ہے۔ اگرچہ امام شافعی کے ہاں واجب سے وہ اصطلاح مراد نہیں جو احناف کے ہاں ہے مگر ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ واجب سمجھتے ہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ عمرہ سنت ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ کسی نے اسکے ترک کی اجازت دی ہو۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی وجوب کا قول منقول ہے۔ باب کی حدیث میں ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں پھر فرمایا۔ و ان یعتمر و ھو افضل۔ جمہور کی دلیل ہے کہ واجب نہیں۔

باب ماجاء فی الذی یهل بالحج فیکسر أیعرج

پہلی بات: کسی نے حج کیلئے احرام باندھا۔ اسکے بعد کسی کا عضو ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو اسکا حکم کیا ہوگا؟ تو حدیث میں ہے کہ ایسا آدمی حلال ہو جائے اور حج کی قضاء کرے۔

دوسری بات: اس باب اور آئندہ دو بابوں کا تعلق ایک ہی مسئلے سے ہے۔ اور اس مسئلے کو احصار کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی نے احرام باندھا مگر کوئی ایسی صورت پیش آگئی کہ وہ مکہ نہیں جا سکتا۔ مثلاً دشمن روک دے یا ڈاکوؤں کا خطرہ ہو تو یہ احصار ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسکو ایسی بیماری لاحق ہو جائے کہ وہ جا نہیں سکتا یا ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی کہ چل ہی نہیں سکتا۔ احصار کس صورت میں متحقق ہوگا کس میں نہیں ہوگا۔ اسمیں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ابو سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ احصار دشمن کی طرح مرض کی صورت میں بھی ثابت ہوگا۔ دشمن روک دے اسکا جو حکم ہوگا وہی حکم مریض کا بھی ہوگا۔ اسلئے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ احرام باندھتے وقت شرط لگانا ضروری نہیں کہ محرم احرام کے وقت یہ کہے کہ جہاں سے آگے بیماری کی وجہ سے نہ جا سکا وہاں حلال ہو جاؤنگا۔ اسکی ضرورت نہیں۔ اسلئے احناف کی ہاں مرض کی وجہ سے بھی احصار ہوتا ہے۔ دشمن روک دے تو اسکو حصر کہتے ہیں اور اگر مرض کی وجہ سے نہ جا سکے تو اسکو احصار کہتے ہیں۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدمی کو دشمن روک دے تو اسکا حکم قرآن میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہدی کو حرم بھیج دے پھر جب ہدی ذبح ہو جائے تو حلال ہو جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں احصار عدو کے ساتھ خاص ہے مرض احصار نہیں۔ اگر حج کا احرام باندھتے وقت اس نے شرط ذکر کی ہو تو جہاں بیمار ہو وہاں حلال ہو سکتا ہے۔ لیکن شرط نہ لگائی ہو تو پھر حلال نہیں ہو سکتا بلکہ اسی جگہ ٹھہرا رہے جب تک صحیح اور تندرست نہ ہو جائے۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ محصر کسی طرح کوشش کر کے ہدی کو کعبہ بھیجے گا۔ اور جب وہاں ذبح ہو جائے پھر حلال ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی کسی آدمی کے ذریعے ہدی کو حرم میں بھیجا تھا پھر حلال ہوئے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جہاں احصار ہوا ہے وہاں ہی ذبح کرے ہدی کا حرم بھیجنا ضروری نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مرض کی وجہ سے احصار نہیں ہوتا۔ اسلئے انکو مشکل پیش آگئی تو انہوں نے اشتراط فی الحج کا مسئلہ نکال کر مشکل حل کر لی کہ احرام باندھتے وقت اگر نیت کرے جہاں بیمار ہوا وہاں حلال ہو جاؤں گا۔ اب جہاں بھی بیمار ہو جائے تو حلال ہو سکتا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اشتراط فی الحج کا اعتبار نہیں ہے۔ احناف کی دلیل تیسرے باب میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ وہ اشتراط فی الحج کو معتبر نہیں قرار دیتے اور احصار کا تعلق صرف دشمن کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کسر اور عرج کی صورت میں بھی احصار ہوگا۔ اسکی دلیل باب اول کی حدیث ہے دوسرے باب کی حدیث سے شوافع کا قول ثابت ہوتا ہے کہ اشتراط فی الحج معتبر ہے۔ احناف اسکا جواب یہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں صرف عورت کی تطییب قلب کیلئے شرط جائز قرار دی تھی۔ ابن قدامہ کے المغنی کے حوالے سے معارف السنن میں ہے کہ احناف کے ہاں اگر چہ اشتراط موثر نہیں لیکن یہ بے فائدہ بھی نہیں کہ اگر کسی نے احرام کے وقت شرط لگائی تھی تو بغیر دم کے اس کیلئے حلال ہونا جائز ہے شرط نہ بھی لگاؤ پھر بھی اگر بیمار ہو گیا۔ تو احصار ہوگا اور آدمی محصر کہلائے گا۔

باب ماجاء فی المرأة تحیض بعد الافاضة

پہلی بات: حج کے اندر تین طواف ہوتے ہیں ① طواف قدوم کہ حاجی جب مکہ آتا ہے۔ تو پہلے طواف قدوم کرتا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور اکثر ائمہ کے ہاں یہ طواف قدوم سنت ہے ② طواف زیارت یا طواف افاضہ یا طواف فرض یہ دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ ③ حج ختم کر کے جب وطن لوٹتے وقت کرتا ہے، یہ طواف وداع کہلاتا ہے۔ یہ واجب ہے۔ طواف وداع صرف حج میں ہے۔ عمرے میں نہیں۔ جمہور کے ہاں طہارت شرط ہے اسلئے (حائضہ) وہ طواف نہیں کر سکتی۔ اگر بلا عذر کسی نے ترک کر دیا تو اسپر دم لازم آئے گا لیکن عذر لاحق ہو جائے تو عذر کی بناء پر شریعت نے طواف وداع کو ساقط کر دیا اگرچہ امام صاحب کے ہاں واجب ہے۔

دوسری بات: طواف فرض کو ترک کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اگر حیض آ گیا تو انتظار کرے اب اس نے انتظار کیا مگر پاک نہیں ہوئی تو پھر کیا کرے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عورت حیض ہی کی حالت میں طواف فرض ادا کرے اور پھر بدنہ بطور دم کے دیدے تو اسکا حج صحیح ہو جائے گا۔

تیسری بات: طواف فرض کسی نے کر لیا پھر نفلی طواف کیا، ابھی تک طواف وداع نہ کیا تھا کہ کوئی عذر لاحق ہو گیا اور طواف وداع کا وقت نہیں ملا۔ تو احناف کے ہاں نفلی طواف طواف وداع کے قائم مقام بن جائیگا۔ شوافع کے مذہب میں سختی ہے انکے ہاں طواف وداع وہ ہوگا جو بالکل آخر میں ہو۔ اسلئے اگر کسی نے طواف وداع کیا پھر بازار گیا اور کچھ خرید لیا تو طواف ختم ہو جائیگا۔

باب ماجاء ان القارن يطوف طوافا واحدا

مسئلہ: کسی آدمی نے قران کا احرام باندھا اب اسپر دو طواف اور دو سعی ہیں یا ایک طواف ایک سعی اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان الثوری رحمہ اللہ تعالیٰ امام اوزاعی رحمہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ہاں قارن پر دو طواف اور دو سعی ہیں۔ ایک طواف اور ایک سعی عمرے کی اور ایک طواف اور ایک سعی حج کی۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک طواف اور ایک سعی ہے۔ یہ طواف اور سعی طواف قدوم اور طواف وداع کے علاوہ ہے احناف کی دلیل صبی بن معبد تغلبی کی روایت ہے کہ اس نے عیسائیت چھوڑ دی اسلام لائے۔ قران کا احرام باندھا دو طواف اور دو سعی کئے اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

هديت لسنة نبيك دوسری دلیل عمران بن حصین کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے آپ نے دو طواف اور دو سعی کئے۔ تیسری دلیل ابراہیم بن محمد بن علی کی روایت ہے کہتے ہیں کہ محمد کے ساتھ انہوں نے قران کیا۔ انہوں نے دو طواف اور دو سعی کئے اور کہا کہ میں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قران کیا تو انہوں نے دو طواف اور دو سعی کئے۔ چوتھی دلیل ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے اور پانچویں دلیل ابن مسعود کی روایت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ اسمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے۔

طاف طوافًا واحدًا: باب کی حدیث کے بارے میں احناف کہتے ہیں۔ ا۔ آپ نے طواف وداع کے علاوہ دو طواف کئے اور طواف وداع سمیت تین طواف کئے۔ ابتداء میں جو طواف کیا تھا یہ طواف قدوم بھی تھا اور عمرے کا طواف بھی تھا۔ باقی طواف واحد سے فقط حج کا طواف مراد ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ طواف واحد سے طواف وداع مراد ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس طواف واحد سے وہ طواف مراد ہے جسکے بعد آدمی حلال ہو جاتا ہے اور وہ طواف زیارت ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے ایک طواف کیا۔

باب ماجاء فی المحرم یموت فی احرامه

مسئلہ: یہاں مسئلہ یہ ہے کہ محرم حالت احرام میں انتقال کر جائے تو اس کے سر کو ڈھانپیں گے یا نہیں ① امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ۔ امام احمد رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ اور امام اسحاق رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر محرم حالت احرام میں انتقال کر جائے تو اسکا سر نہیں ڈھانپیں گے۔ کیونکہ یہ محرم کے حکم میں ہے۔ ② امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ اور امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب محرم حالت احرام میں انتقال کر جائے تو اسکا احرام ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا جس طرح عام مردوں کو کفن دیا جاتا ہے ویسے ہی محرم کو دیا جائیگا۔ قول اول کے قائلین باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ احناف کی دلیل وہ حدیث ہے جسمیں فرمایا۔ اذا مات الا نسان انقطع عمله الا من ثلثة (مسلم ۲-۴۱) عمل کے منقطع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل باقی نہیں رہتا۔ لہذا محرم کا احرام انتقال کے بعد منقطع ہو گیا۔ اسلئے یہ حلال کے حکم میں ہے۔ باب کی حدیث کے متعلق احناف کہتے ہیں۔ کہ یہ اس صحابی کی خصوصیت تھی۔ اسکی دو دلیلیں ہیں ① ایک دلیل یہ ہے کہ ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ ولا تخمروا وجهه حالانکہ قول اول کے قائلین کے نزدیک بھی چہرے کو ڈھانپا جائیگا احناف کہتے ہیں کہ جس طرح کہ تم چہرے کے ڈھانپنے کو خصوصیت پر محمول کرتے ہو اس طرح ہم بھی سر کے ڈھانپنے کو خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ ② دوسری دلیل یہ ہے کہ احرام کی حالت میں بیری کے پتوں سے غسل دینا جائز نہیں حالانکہ آپ ﷺ نے بیری کے پتوں سے غسل دینے کا حکم دیا تھا۔ تو جسطرح خوشبودار پتوں سے غسل دینا جائز ہے۔ جبکہ حالت احرام میں یہ ممنوع ہے تو یہ اسکی خصوصیت تھی۔ اسی طرح سر کا نہ ڈھانپنا بھی خصوصیت پر محمول ہوگا۔

باب ماجاء ان المحرم یشتکی عینیه فیضمد ها بالصبر

مسئلہ: یہاں مسئلہ یہ ہے کہ محرم کیلئے اس قسم کا سرمہ یا دوا استعمال کرنا جائز نہیں۔ جسمیں خوشبو ملی ہوئی ہو۔ بغیر خوشبو والا سرمہ لگانے سے اگر تزیین مقصود ہو تو یہ بھی ممنوع ہے۔ بطور دوا کے سرمے کا استعمال جائز ہے یہ سب ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اضمدها۔ اسپر باندھو۔ الصبر بمعنی ایلوا۔

باب ماجاء فی المحرم یحلق رأسه فی احرمه ماعلیه

مسئلہ: محرم آدمی کو حالت احرام میں حلق کی ضرورت پیش آجائے۔ تو اسکا کیا حکم ہے۔ اتنی بات تو اتفاقی ہے کہ عذر کے بغیر جسم کے کسی حصے کے بالوں کا حلق جائز نہیں، اور اگر عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر احرام میں عذر کی بنا پر کوئی چیز جائز ہو جائے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہیں ہوگا۔ باقی اس جواز سے کفارے کا وجوب ساقط نہیں ہوتا۔ باب کی حدیث میں ہے کہ آپ نے حلق کی اجازت دی لیکن باوجود جواز کے کفارہ ساقط نہیں ہوا۔ باب کی حدیث میں جو کفارہ مذکور ہے۔ ان تین چیزوں میں ترتیب ضروری نہیں جسکو چاہے ادا کرے۔ باب کی حدیث میں جو کفارہ ہے یہ سر کے بالوں کیلئے ہے اور جسم کے دوسرے حصے کے بالوں کے لئے بھی ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة للرعاة ان یرموایوما ویدعوا یوما

مسئلہ: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ چرواہوں کیلئے رمی میں تاخیر کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی دس تاریخ کی جمرہ عقبہ کی رمی کر کے اپنے اونٹوں کو چرانے کیلئے لے گیا اور پھر گیارہ تاریخ کو رمی کیلئے نہیں آیا۔ اور گیارہ اور بارہ تاریخ کی رمی بارہ تاریخ کو

آ کر کر دی تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ، اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ، فرماتے ہیں کہ یہ تاخیر جائز ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، کے نزدیک اس مذکورہ صورت کے مطابق تاخیر جائز نہیں۔ ہاں صرف اس وقت جائز ہے جبکہ مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔ اور باب کی حدیث کے متعلق بھی احناف کہتے ہیں کہ آپ نے اجازت اسلئے دی تھی کہ اونٹوں کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔

❷ یا یہ بھی نماز کی طرح جمع صوری تھی کہ حج میں آنے والی راتیں گزرنے والے دن کے تابع ہوتی ہیں۔ چنانچہ گیارہ تاریخ کے رات کے آخری حصے میں گیارہ تاریخ کی رمی اور بارہ تاریخ کی رمی زوال سے قبل کی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ، سے ابن زیاد نے ایک قول نقل کیا ہے کہ بارہ تاریخ کی رمی قبل الزوال جائز ہے۔ اور یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ گیارہ تاریخ کی رات کے آخری حصے میں رمی کی اور بارہ تاریخ کی رمی بعد الزوال کی۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، اور اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ ایام منیٰ کے اندر منیٰ میں رات گزارنا واجب و فرض نہیں ہے۔ بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔ اسلئے بلا عذر تو ترک نہیں کرنا چاہئے اور اگر عذر ہو تو ترک کرنا جائز ہے۔ باقی بارہ تاریخ کی رمی گیارہ تاریخ کو کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں۔

ابواب الجنائز

باب ماجاء فی ثواب المریض

جنازہ کسی چیز کے چھپا دینے کے معنی میں ہے۔ میت کو جنازہ اسلئے کہتے ہیں کہ اسپر کپڑا ڈال دیتے ہیں اور پھر مکمل طور پر مٹی میں چھپا دیتے ہیں۔ یہ لفظ بکسر الجیم اور بفتح الجیم دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ بفتح الجیم میت کو کہتے ہیں۔ اور بکسر الجیم میت کی چارپائی کو کہتے ہیں۔ بعض نے اسکے برعکس کہا ہے۔ میت کی چارپائی کو "الة الحدباء" بھی کہتے ہیں۔

وکل ابن انثی وان طالت سلامته فیو ماًعلی الة الحدباء محمول.

اگر چہ یہ باب جنائز کے متعلق ہے لیکن پہلے باب میں مریض کا ثواب ذکر کر دیا۔ تو اصل بات یہ ہے کہ عموماً مرض وغیرہ موت کے مقدمات میں سے ہے۔ اسلئے مریض کے متعلق پہلا باب قائم کیا۔ باب کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان کے لئے تکلیف باعث اجر اور برکت ہے۔

مامن شیئی یہ تکلیف سے کنایہ ہے۔ "نصب" بمعنی تھکاوٹ جسکا تعلق بدن سے ہو۔ حزن وہ تکلیف جسکا تعلق انسان کے دل سے ہو وصب دائمی بیماری۔ **الھمہ مایصیب القلب من الالم بفوت المحبوب**

باب ماجاء فی عیادۃ المریض

مسئلہ: مریض کی عیادت ان حقوق میں سے ہے جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حدیث میں مذکور ہیں۔ عیادت کرنا مسنون اور مستحب ہے۔ عیادت کے چند آداب ہیں۔ حدیث میں ہے کہ **العیادته فواق الناقة** " فواق" اونٹنی کے پہلی اور دوسری دفعہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عیادت مختصر ہونی چاہئے تاکہ مریض طویل گفتگو اور طویل جلوس سے اکتا نہ جائے الا یہ کہ مریض بیٹھنے پر اصرار کرے۔ آپ ﷺ جب کسی مریض کے عیادت کیلئے تشریف لے جاتے۔ تو مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھتے۔ **لابأس طھور انشاء اللّٰہ.**

خرقة الجنة: وہ پھل جو جنت سے چنا جائے یہ کنایہ ہے باغیچے سے جنا ھا۔ جنت کے پھل۔

باب ماجا فی النھی عن التمنی للموت

مسئلہ: باب کی حدیث میں موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ موت کی تمنا کیوں نہیں کرنی چاہئے۔ اگر لقاء اللہ کیلئے موت کی تمنا ہو تو ٹھیک ہے لیکن اگر دنیا کی مصیبتوں کی وجہ سے ہو تو پھر جائز نہیں کیونکہ معلوم نہیں کہ کہاں سے چلا جائے اور وہاں گرفت اور گرفتاری ہو جائے۔ جیسا کسی شاعر کا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
لیکن مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جب یہ موت کی تمنا کرتا ہے۔ تو گویا یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی نہیں

حالانکہ مریض کو رضا بالقضاء کا حکم ہے اسکو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

اکتوی: داغ لگانا۔ بعض احادیث میں اسکی ممانعت آئی ہے۔ اور بعض احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے۔ محدثین نے تطبیق کی تین صورتیں ذکر کی ہیں۔ (۱) ابتداء میں یہ ممانعت تھی بعد میں یہ ممانعت منسوخ ہوگئی۔ (۲) یہ نہی شفقۃً ہے یہ شرعی نہی نہیں ہے۔ (۳) مشرکین کا یہ عقیدۃ تھا کہ ''الشفاء فی الکی'' اس لئے آپ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اب یہ جائز ہے۔ یضر نزل بہ اس سے اس اعتراض کا خاتمہ ہوگیا جو یہ کہتے ہیں کہ بعض بزرگوں نے موت کی تمنا کی تھی جیسے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ کیونکہ وہ اللہ کی ملاقات کے لئے موت کی تمنا کرتے تھے۔

باب ماجاء فی التعوذ للمریض

مسئلہ: مریض کے لئے دوائی استعمال کرنا جائز ہے۔ اسکی دوصورتیں ہیں (۱) ظاہری دوا۔ (۲) روحانی دوا جیسے دم کرنا۔ تعویذ کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر تعویذ کے الفاظ ایسے واضح ہیں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں تو انکا تعویز بنانا جائز ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حدیث میں منقول ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حدیث کے کلمات سکھاتے تھے اور جو بچے نہیں سیکھ سکتے تھے۔ ان کے گلے میں وہ الفاظ لکھ کر لٹکا دیتے تھے۔ فتح المجید شرح کتاب التوحید میں لکھا ہے کہ کئی صحابہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔ البتہ جو الفاظ منقول نہیں ہیں اور شرکیہ ہیں تو انکا تعویذ بنانا جائز نہیں۔ باقی تعویذ پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسکے متعلق باب قائم کیا ہے کہ قرآن کریم بطور علاج ہو تو اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صحابہ نے دم کر کے بکریاں لیں تھیں۔

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

مسئلہ: وصیت کے متعلق مختصر طور پر پانچ باتیں سمجھنی چاہئیں۔ (۱) امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ جمہور فقہاء ومحدثین فرماتے ہیں کہ وصیت مستحب ہے، صرف داؤد ظاہری کے نزدیک وصیت واجب ہے۔ (۲) اگر کوئی شخص قرض لینے والا یا دینے والا ہے تو پھر وصیت واجب ہے کیونکہ اسکا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ (۳) جمہور کے نزدیک مال کے ثلث میں وصیت جائز ہے اس سے زائد مین جائز نہیں۔ الا یہ کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا شخص ہو جسکا کوئی وارث نہ ہو یا ورثاء سب بالغ اور راضی ہیں۔ تو پھر ثلث مال سے زائد میں بھی وصیت جائز ہے۔ (۴) ثلث میں وصیت جائز تو ہے مگر بہتر یہ ہے کہ ثلث سے کم میں وصیت کرے۔ (۵) جائز وصیت قابل اعتبار ہے، ناجائز وصیت جاری نہیں ہوگی۔ مثلاً کوئی کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے اتنے مال سے فلاں کو شراب پلانا۔ والثلث کثیر: مطلب یہ ہے کہ یہ زیادہ ہے اس سے بھی کم وصیت کرو۔ دوسرا یہ ہے کہ ثلث ثواب کے اعتبار سے بڑا ہے۔

باب ماجاء فی تلقین المریض عندالموت والدعاء لہٗ

پہلی بات: لقنوا موتاکم لاالٰہ الااللّٰہ سب شارحین اس موتیٰ سے وہ آدمی مراد لیتے ہیں۔ جو قریب الموت ہو یعنی مجازی معنی مراد ہے حقیقی معنی مراد نہیں۔

دوسری بات: تلقین کی حقیقت وکیفیت کیا ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ قریب الموت آدمی جس پر موت کے آثار ظاہر ہوجائیں تو اس کے پاس کوئی شخص بیٹھ کر لاالٰہ الا اللّٰہ کا ورد کرے۔ تاکہ مریض بھی سن کر پڑھے لیکن اسکو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ پڑھو کیونکہ ممکن ہے

وہ موت کی شدت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اسکا انکار کردے۔ اگرچہ وہ انکار کرنے سے مسلمان ہی رہے گا اور مسلمان کے احکام جاری ہونگے لیکن لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا ہونگے۔ جب وہ ایک بار بھی پڑھ لے گا تو اسکا آخری کلمہ شمار ہوگا۔ اور حدیث میں ہے۔ من کان آخر کلامہ لاالہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ (ابوداؤد۲۔۸۸) اگرچہ وہ کچھ دیر کے بعد انتقال کر جائے۔

تیسری بات: موت کے بعد تلقین کا کیا حکم ہے؟۔ چنانچہ سب ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تلقین مستحب ہے۔

چوتھی بات: موت کے بعد تلقین کا کیا حکم ہے۔ اسکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دفن کے بعد کوئی شخص کہتا ہے کہ جب تجھ سے کوئی سوال ہو کہ "من ربک تو کہدے "ربی اللّٰہ" اور جب کہے کہ "ماتقول فی ھذا الرجل" تو کہہ دے۔ نبی اور رسول اور جب کہے "ما دینک" تو کہدے۔ "دینی الاسلام"۔ بعض علاقوں میں یہ مروج بھی ہے۔ اور بعض فقہ کی کتب میں بھی مذکور ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام، تابعین اور سلف سے یہ منقول نہیں۔ اسلئے یہ ناجائز ہے اور قبل الموت تلقین جائز ہے کیونکہ یہ امت کو توارث سے ثابت ہے۔

پانچویں بات: یہاں پر اشکال یہ ہے کہ تلقین کے وقت حدیث میں لا الہ الا اللّٰہ کے الفاظ منقول ہیں پورا کلمہ منقول نہیں۔ حالانکہ جیسے اقرار توحید کی ضرورت ہے اسی طرح رسالت کے اقرار کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ شارحین میں سے ابن المنیر کہتے ہیں۔ کہ جن احادیث میں لا الٰہ الا اللّٰہ ۔ کے الفاظ منقول ہیں یہ عنوان ہے۔ مراد اس سے پورے کلمہ طیبہ کی تلقین ہے فقولوا خیرا ① اسکے لئے دعا کرو۔ ② اسکی تعریف کرو کہ اچھا آدمی تھا۔ ③ لا الہ الا اللّٰہ کا کلمہ سامنے کہو۔

باب ماجاء فی التشدید عندالموت

مسئلہ: باب کی پہلی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خروج الروح کے وقت آدمی کو شدت محسوس ہوتی ہے۔ ۲۔ موت کے وقت کی شدت کسی کے برے ہونیکی دلیل نہیں۔ عام طور پر خروج روح کے وقت جب شدت ہو تو لوگ اس کو اس شخص کے برا ہونے کی دلیل بناتے ہیں دوسرے باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے اسکی تردید ہوتی ہے

(باب)

المؤمن یموت بعرق الجبین. اس جملے کے شارحین نے چار مفہوم بیان کئے ہیں۔ ① یہ کنایہ ہے شدت موت سے کہ موت کی اتنی شدت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔ ② یہ موت کی آسانی سے کنایہ ہے ③ موت کے وقت جب عالم آخرت کا انکشاف ہوتا ہے اور بندہ جب اپنی تقصیر اور اللہ کی مہربانیوں کو دیکھتا ہے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے پسینہ آجاتا ہے۔ ④ مومن رزق حلال کی طلب میں مرتا ہے۔

(باب)

کیف تجدک اسکا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا جسمانی حال کیا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کا حال کیا ہے۔ چنانچہ حدیث کے اگلے الفاظ اسپر دلالت کرتے ہیں۔

انی ارجو اللّٰہ وانی اخاف ذنوبی۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایمان خوف اور رجاء کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تبشیر یا صرف انذار سے کام نہیں لیا بلکہ دونوں کو ذکر کیا ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة النعی

مسئلہ: موت کی اطلاع دینے کو ''نعی'' کہتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ اپنے قریبی رشتے داروں کو موت کی اطلاع دینا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کی موت کی اطلاع صحابہ کرام کو دی تھی۔ اسی طرح جنگ موتہ میں شہید ہونے والوں کی اطلاع آپ نے مسجد میں دی۔ اسی طرح مسجد کی صفائی کرنے والی عورت کا جب رات کو انتقال ہوا تو صحابہ نے آپکو اطلاع دیئے بغیر اسکو دفن کر دیا۔ جب آپ کا گذر اسکے قبر کے پاس سے ہوا تو آپ نے پوچھا یہ کس کی قبر ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتلا دیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اسکی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ اسلئے یہ نعی ممنوع کے قبیل سے نہیں نعی ممنوع کیا ہے؟ تحفۃ الاحوذی میں اسکی دو صورتیں ذکر کی ہیں۔ ① زمانہ جاہلیت میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو جاتا اور مختلف قبائل اور مجالس میں جا کر چکر لگاتا اور موت کی خبر دیتا۔ یہ ممنوع ہے۔ ② جب کسی کا انتقال ہوتا تو کچھ رونے والی عورتوں کو اجرت پر رکھتے تھے وہ اپنے گریبان چاک کر کے مرنے والے کے مناقب بیان کر کے روتی تھیں یہ نعی بھی ممنوع ہے۔

باب ماجاء فی تقبیل المیت

باب کی حدیث میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی بات۔ میت کو چومنا جائز ہے بشرطیکہ یا تو میت کی بزرگی کی بنا پر ہو۔ جیسا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کا بوسہ لیا۔ یا شدت تعلق کی بنا پر ہو جیسے نبی کریم ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بوسہ لیا یہ آپکے رضاعی بھائی تھے۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اور یہ ان لوگوں میں ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت سے اپنے اوپر شراب کو حرام کر دیا تھا۔ مہاجرین میں سب سے پہلے مدینہ میں ہجرت کے تیس ماہ بعد انتقال ہوا۔ اور بقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والے صحابی ہیں۔ دوسری بات۔ موت سے انسان ناپاک نہیں ہوتا بلکہ پاک رہتا ہے اور غسل برائے طہارت نہیں ہوتا بلکہ برائے نظافت ہوتا ہے،

باب ماجاء فی غسل المیت

پہلی بات: غسل میت کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے میت کو استنجاء سمیت وضو کرایا جائے۔ پھر میت کی دائیں جانب سے غسل کی ابتداء کی جائے۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ تین دفع پانی بہائے۔ پہلی مرتبہ بیری کے پتوں میں اُبلا ہوا پانی استعمال کرے دوسری دو مرتبہ نظافت کیلئے خالص پانی ڈالے۔ اگر زیادہ مرتبہ پانی ڈالنے کی ضرورت ہو تو طاق عدد کی رعایت رکھی جائے۔

دوسری بات: احناف کے نزدیک میت کے لٹانے کے دو طریقے مسنون ہیں۔ ① سر جنوب کی جانب ہو پاؤں شمال کی طرف ہوں۔ ② سر مشرق کی جانب ہو اور قدم قبلہ کی جانب ہو۔ یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔

تیسری بات: توفیت احدی بنات النبی ﷺ ...... الخ بنت سے مراد کون ہیں اسمیں دو قول ہیں۔ ① زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا مراد ہیں۔ ② اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا مراد ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ بعض محدثین کے حوالے سے منقول ہے کہ دونوں مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اکثر غسل دیا کرتی تھی۔ اسلئے ممکن ہے دونوں کی وفات کے وقت حاضر ہوں۔

چوتھی بات: عورت کے بال کس طرح رکھے جائیں؟۔ تو احناف کے ہاں مسنون یہ ہے کہ بالوں کے دو حصے کر کے سینے کے دونوں جانب ڈالے جائیں۔ تین حصے بنا کر ایک حصہ پیٹھ کی طرف رکھنا یہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں بلکہ عورتوں نے

اپنے رائے سے کیا تھا۔

الفقهاء اعلم بمعاني الحديث اسپر تحفۃ الاحوذی والے نے کہا ہے کہ اس سے فقہاء محدثین مراد ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہیں کیا ہے لیکن امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام کا نہ ذکر کرنا اور اسکو ائمہ ثلاثہ پر منحصر کرنا فضول بات ہے۔

باب ماجاء فی المسک للمیت

مسئلہ: میت کے اعضاء سجود پر مشک لگانا مستحب ہے اگر مشک نہ ہو تو دوسری خوشبو لگانا بھی جائز ہے۔ لیکن آج کل کی خوشبو جسمیں الکحل ملا ہوتا ہے۔ اس سے بچنا چاہئے اگر چہ نجس نہیں لیکن اس سے احتراز اولیٰ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشک لگانا صحیح نہیں۔ شروح میں لکھا ہے کہ معلوم نہیں یہ بعض کو ہوسکتا ہے وہ اسلئے منع کرتے ہوں کہ یہ خون سے بنتا ہے اور خون ناپاک ہوتا ہے۔ لیکن اسکا جواب یہ ہے کہ خون اگر چہ ناپاک ہے مگر جب اسکی ماہیت بدل جائے تو حکم بھی بدل جاتا ہے۔

باب ماجاء فی الغسل من غسل المیت

مسئلہ: میت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم استحبابی ہے۔ اور اب بھی موجود ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم ابتداء میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اب استحباب بھی باقی نہیں۔ چنانچہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو انکی بیوی نے غسل دیا۔ اور صحابہ سے پوچھا کہ میں روزے سے ہوں۔ اور سردی بھی ہے کیا میں غسل کروں تو صحابہ نے بالاتفاق منع کیا۔ تحفۃ الاحوذی میں شوکانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس سے عدم وجوب اور عدم استحباب دونوں معلوم ہوئے۔ تمام مشہور فقہاء کا یہی قول ہے۔ اور شارحین نے علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لا اعلم أحداً من الفقهاء من يوجب الغسل میت کو غسل دینے کے بعد بھی وضو کرنا مستحب ہے۔ امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک واجب ہے۔

باب ماجاء فی کم کفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مسئلہ: باب کی حدیث میں ہے کہ آپ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ جو قمیص آپ پہنا کرتے تھے وہ بھی کفن میں تھی۔ باب کی حدیث میں عائشہ سے منقول ہے کہ آپ کے کفن میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔ اور بعض نے اس کو ترجیح دی لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کفن کا معاملہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد نہیں تھا بلکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا وہ دونوں حضرات قمیص کا ذکر کرتے ہیں بعض نے باب کی حدیث کو احناف کے خلاف پیش کیا ہے کہ احناف کے نزدیک تین کپڑے ہیں ① قمیص ② ازار ③ لفافہ ویسے ازار بھی لفافے کی شکل کا ہوتا ہے۔

اب اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں قمیص کی نفی ہے اور احناف کے ہاں قمیص ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احناف کے ہاں سلی ہوئی قمیص مراد نہیں بلکہ اس سے مراد وہ قمیص ہے جو لفافے کی طرح ہوتی ہے صرف اس میں سر نکالنے کیلئے سوراخ ہوتا ہے تو احناف کے نزدیک دو لفافے اور ایک قمیص او دوسرے ائمہ کے نزدیک تین لفافے ہیں۔

باب کی حدیث میں ہے کہ آپ کے کفن میں عمامہ نہیں تھا چنانچہ عمامہ باندھنا جائز نہیں۔ لیکن ہماری بعض فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر میت اشراف الناس میں سے ہو تو عمامہ باندھنا چاہئے لیکن یہ بدعت ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون شخص اشراف الناس

میں سے ہوسکتا ہے۔اور آپ کے کفن میں عمامہ کا ذکر نہیں۔

باب ماجاء فی الطعام یصنع لاھل المیت

مسئلہ: میت کے گھر والوں کیلئے مستحب ہے کہ انکو کھانا دیدینا چاہئے۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ایسے مواقع پر لوگ غم یا حیاء کی وجہ سے کھاتے نہیں۔ اسلئے اصرار کر کے انکو کھلانا چاہئے۔ تین دن تک یہ استحباب ہے۔ اسکے بعد یہ حکم نہیں۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ میت کے گھر والے کھانا پکا کر لوگوں کو کھانے کی طرف بلاتے ہیں۔ تمام فقہاء نے اسکو ناجائز لکھا ہے، ایسے لوگ اسکے جواز کیلئے دلیل کے طور پر مشکوۃ شریف کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا تو تدفین کے وقت رسول کریم ﷺ قبر کھودنے والوں کو فرمارہے تھے کی جانب یمین ویسار کو وسیع کرو۔ اسکے بعد روایت میں ہے کہ استقبلہ داعی امرأتہ۔ ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''میت کی بیوی کی طرف سے بلانے والا آیا''۔ لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ مشکوۃ میں ابوداؤد شریف کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ جبکہ ابوداؤد کے تمام نسخوں میں نیز مسند احمد اور شعب الایمان للبیھقی میں بھی داعی امراتہ کے الفاظ ہیں۔ بلکہ یہ الفاظ بھی غلط ہیں کیونکہ مسند امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ میں منقول ہے کہ داعی کوئی اور آدمی تھا۔ مذکورہ روایت میں ناقل سے غلطی ہوئی ہے۔ بعض نے بخاری کی تلبینہ والی روایت سے میت کے گھر میں حلوہ پکانے پر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی بدعت ہے۔ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ کنا نعدہ من النیاحۃ اسلئے یہ رسوم بدعت ہیں۔ لاعلی التعیین اگر کچھ پکا کر صدقہ کرے تو جائز ہے۔

باب ماجاء فی النھی عن ضرب الخدود وشق الجیوب

مسئلہ: عرب میں یہ دستور تھا کہ لوگ مصیبت کے وقت اپنے گریبان پھاڑ دیتے تھے اور چہرے پر مارتے تھے۔ تو باب کی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کیا۔ لیس منا۔ عام طور پر محدثین اسکا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ہماری سنت پر نہیں۔ لیکن بعض محدثین اس تاویل کو ناپسند کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ باب یا اس قسم کی احادیث کا مقصد زجر اور توبیخ ہوتا ہے۔ تاکہ لوگ سن کر اس فعل سے رک جائیں۔ تو پہلی تاویل سے حدیث کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ اسلئے اسکو اپنے ظاہری معنی پر چھوڑ اجائے تو مفہوم یہ ہوگا۔ کہ مسلمانوں کے اندر جو کمال کی صفات موجود ہیں وہ اسمیں نہیں ہیں۔ اس صورت میں اشکال ہے کہ اس سے خوارج اور معتزلہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ کہ مرتکب کبیرہ معتزلہ کے ہاں ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ اور عندالخوارج کفر میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس لئے عام محدثین تاویل کرنے میں مجبور ہیں۔

باب ماجاء فی کراھیۃ النوح

پہلی بات: میت پر نوحہ کرنا بالاتفاق حرام ہے۔ کیونکہ اسکی حرمت کثیر احادیث سے ثابت ہے۔

دوسری بات: نوحہ کی ہیئت کیا ہے؟ عرب میں دستور تھا کہ جب کسی کا انتقال ہوتا۔ تو رونے والی عورتیں جمع ہو کر میت کی صفات ممدوحہ کا تذکرہ کر کے خود بھی روتی اور دوسروں کو بھی رلاتی اور یہ عورتیں اجرت پر مقرر کی جاتی تھیں، نبی کریم ﷺ نے اسکی ممانعت فرمائی۔ دوسرے باب میں میت پر رونے کی ممانعت کا ذکر ہے اور تیسرے باب میں میت پر رونے کی رخصت کا ذکر ہے۔ ان دو بابوں میں محدثین نے جمع کرنے کی مختلف صورتیں ذکر کی ہیں:

❶ وہ رونا جسمیں صرف دل غمگین ہو اور بکا بلاصوت ہو تو یہ بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔ اسمیں کسی کا اختلاف نہیں جیسا کہ نبی کریم

ﷺ کے متعلق منقول ہے کہ جب آپ کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو عیناہ تـزرفان۔ اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی خبر سن کر آپ ﷺ ان کے ہاں تشریف لے جا کر انکو بوسہ دیا اور آپکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ کے بیٹے حضرت ابراہیم کی انتقال پر آپکے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

❷ بکاء بالصوت کے متعلق صحیح تر قول یہ ہے کہ اگر بکاء بالصوت میں اس قسم کے الفاظ نہ ہوں۔ جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق شکوہ ہو اور میت کے موت کو بے وقت بتلایا گیا ہو تو یہ بھی جائز ہے۔

❸ بکاء بالصوت جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق شکوہ ہو اور میت کے موت کو بے وقت بتلایا گیا ہو یا ظلم کا اظہار ہو مثلاً واجبلاہ وغیرہ کہے تو یہ ممنوع ہے اور یہ نوحہ کے قبیل سے ہے۔ دوسرے باب میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ. تیسرے باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ کسی آدمی کے عمل سے دوسرے کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ قرآن کریم کی آیت ہے ﴿ولا تزر وازرۃ وزر اخری﴾ محدثین نے اسمیں بھی تطبیق کی چند صورتیں ذکر کی ہیں۔ ① ۔ کوئی شخص اپنے مرنے سے پہلے اپنی زندگی میں گھر والوں کو وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد مجھ پر رویا جائے۔ تو پھر میت کو ان کے گھر والوں کے رونے پر عذاب دیا جائیگا ورنہ نہیں۔ ② ۔ اگر کسی کو یہ معلوم تھا کہ اس علاقے یا خاندان میں رونے کا رواج ہے۔ اسکے باوجود گھر والوں کی تربیت نہیں کی۔ اور انکو روکا نہیں۔ تو پھر اسکو عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ انکو روکنا اسکی ذمہ داری تھی اور اس نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔

③ ۔ یعذب ببکاء اھلہ اس عذاب سے مراد یہ ہے کہ جب گھر والے میت پر روتے ہیں تو قبر میں فرشتہ اسکو کچوکے لگاتا ہے کہ واقعی تو ایسا تھا۔ تو گویا عذاب سے مراد توبیخ ہے ④ اس سے خاص واقعہ مراد ہے کہ ایک کافر مر گیا تھا، اسکے اہل اسپر رور ہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ اسپر رور ہے ہیں اور اسکو عذاب دیا جا رہا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث بھی صحیح ہے۔ لیکن عائشہ کا یہ کہنا کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سماع میں غلطی ہوئی۔ اس بات کو محدثین نے قبول نہیں کیا ہے اور اسکے خلاف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کثیر صحابہ سے مروی ہے۔ اسلئے ان کو مذکورہ توجیہات پر حمل کیا جائیگا۔

والعدوی: اسمیں شبہ نہیں کہ بعض امراض متعدی ہوتے ہیں۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ امراض متعدی نہیں ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ امراض بنفسہ متعدی نہیں ہوتے اور عقیدہ یہ ہو کہ امراض کے متعدی کرنے میں مؤثر حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ باقی اول مریض بمنزلہ سبب کے ہے۔

ورنۃ الشیطان: بعض کہتے ہیں کہ اس سے بھی مراد رونے کی آواز ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد گانے کی آواز ہے۔

باب ماجاء فی المشی امام الجنازۃ وغیرہ

مسئلہ: سب ائمہ کا اسپر اتفاق ہے کہ جنازے کے آگے اور پیچھے چلنا جائز ہے۔ البتہ افضل کیا ہے؟۔ اسمیں اختلاف ہے۔

① سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنازے کے آگے پیچھے چلنا فضیلت وجواز دونوں برابر ہیں۔ ② امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پیدل چلنے والے کیلئے آگے چلنا افضل ہے اور سوار کیلئے پیچھے چلنا افضل ہے۔ ③ امام مالک اور امام شافعی کے ہاں مطلقاً جنازے کے آگے چلنا افضل ہے۔ ④ ۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلقاً جنازے کے پیچھے چلنا افضل

ہے۔احادیث اس سلسلے میں مختلف ہیں لیکن احناف دو باتیں کرتے ہیں۔
① ۔طحاوی شریف میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنازے کے پیچھے چل رہے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنازے کے آگے چل رہے تھے تو ایک آدمی نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ جنازے کے آگے چلنا افضل ہے، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ پیچھے چلنا افضل ہے۔تو اس شخص نے پوچھا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو آگے چل رہے ہیں۔حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ دونوں جانتے ہیں کہ پیچھے چلنا افضل ہے۔لیکن یہ دونوں لوگوں کی آسانی کیلئے آگے چل رہے ہیں۔تو افضل تو پیچھے چلنا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر مشقت کی وجہ سے آگے ہوگئے تھے۔② ۔احناف دوسری بات یہ کرتے ہیں کہ احادیث میں جنازے کی اتباع کا ذکر ہے۔جیسا کہ یہاں دوسرے باب کی حدیث میں ہے اور اتباع آگے چلنے کو نہیں کہتے بلکہ پیچھے چلنے کو کہتے ہیں۔اگرچہ آگے چلنے کے متعلق بھی احادیث صریح موجود ہیں۔

طائر طار. یعنی یہ راوی مجہول ہے لیکن کوکب الدری میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ تابعی ہیں اور تابعی مجہول بھی ہوں تو یہ مضر نہیں کیوں کہ اس زمانے میں کذب عام نہیں تھا۔اور بعض کے ہاں اگر مجہول سے ایک آدمی ناقل ہو تو راوی جہالت سے نکل جاتا ہے اور یہاں ان سے یحییٰ ناقل ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة الرکوب خلف الجنازة

مسئلہ: جنازے کے ساتھ سوار ہو کر چلنے کے متعلق احادیث مختلف ہیں۔پہلے باب میں کراہیت کا ذکر ہے، دوسرے باب کی حدیث میں رخصت کا ذکر ہے۔اسلئے محدثین کہتے ہیں کہ اگر قبرستان سے واپسی ہو تو بالاتفاق سواری پر لوٹنا جائز ہے۔چنانچہ ابن الدحداح کے جنازے سے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے۔باقی اگر جنازے کے ساتھ چل رہا ہو تو سوار ہو کر چلنا جائز مع الکراہت ہے، اور افضل یہ ہے کہ بلا عذر سوار نہ ہو، اور اگر سوار ہوتا ہے تو جنازے کے پیچھے چلنا چاہئے آگے چلنا نہیں چاہئے۔اگر قبرستان دور ہو تو یہ بھی عذر ہے اس لئے سوار ہو کر جانا جائز ہے۔اگر کوئی یہ کہے کہ آپ سوار ہو کر گئے تھے تو اسکا پہلا جواب یہ ہے کہ آپ عذر کی وجہ سے سوار تھے، بیمار تھے، گھوڑے سے گر کر چوٹ آئی تھی۔دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ واپسی پر سوار ہو کر آئے تھے۔

باب ماجاء فی الاسراع بالجنازة

مسئلہ: اسراع بالجنازہ کے دو مفہوم ہیں۔اسراع فی المشی یعنی قبرستان کی طرف لیجاتے وقت جلدی لیکر چلے، عام فقہاء نے یہی معنی مراد لیا ہے۔صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ انسان عام طور پر جس حالت میں چلتے ہیں۔جنازے کے ساتھ اس سے کچھ تیز چلے اور وہ "مادون الخبب" ہو کہ دوڑ سے کم ہو۔② ۔اسراع بالجنازہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جنازہ تیار کرنے میں جلدی کرنا، تجہیز و تکفین میں کچھ دیر لگتی ہے اس سے زیادہ تاخیر کرنا مکروہ و ناجائز ہے۔دونوں سے اسراع مطلوب ہے۔

باب ماجاء فی الجلوس قبل ان توضع

مسئلہ: ابتداء یہ حکم تھا کہ جب تک جنازہ نہ رکھا جائے، اس وقت تک نہ بیٹھے۔ایک جنازے میں یہود کا ایک عالم تھا، اس نے یہ منظر دیکھ کر کہا "ھکذا نضع"، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے بعد حکم دیا کہ تم بیٹھ جایا کرو اور یہود کی مخالفت کرو۔باب کی حدیث اگرچہ قوی نہیں لیکن علماء فرماتے ہیں کہ قبرستان میں جنازے کو رکھے جانے سے پہلے بیٹھنا جائز ہے۔

باب ماجاء فی التکبیر علی الجنازة

پہلی بات: جنازے پر کتنی تکبیرات پڑھی جائیں گی؟ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں تکبیر علی الجنازہ کے متعلق آپکا عمل مختلف رہا ہے۔ چار تکبیرات سے لیکر نو تکبیرات تک منقول ہیں۔ اسکے بعد صحابہ کرام میں بھی اختلاف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں چار تکبیرات پر اتفاق ہوا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپکے آخری عمل کو دیکھو۔ چنانچہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپکا آخری عمل چار تکبیرات پر تھا، انہوں نے چار تکبیرات کا حکم دیا اور اسی پر عمل شروع ہوا۔ جمہور فقہاء اور محدثین کا اسپر اتفاق ہے۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کسی امام نے جنازے میں پانچ تکبیرات پڑھیں تو مقتدی کو بھی اسکی اتباع کر کے پانچ تکبیریں پڑھنی چاہئیں لیکن جمہور کے ہاں زائد تکبیرات میں اتباع نہیں کریں گے کیونکہ یہ منسوخ ہو چکی ہیں۔

دوسری بات: نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ مسلمان ہوئے۔ جب انکی وفات کی اطلاع آپ کو ملی تو آپ نے صحابہ کرام کو جمع کر کے مصلی میں انکی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ اس سے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ غائبانہ نماز جنازہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں جبکہ احناف کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں۔ اور جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ بھی قیود لگاتے ہیں۔ ① جس شخص کا جہاں انتقال ہوا ہو وہاں پر کوئی مسلمان اسکی نماز جنازہ پڑھنے والا نہ ہو جیسے نجاشی کا نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ② جسکی نماز جنازہ پڑھی جا رہی ہے اسکی قبر جانب قبلہ ہو، اگر امام کی جانب قبلہ میں نہ ہو تو جائز نہیں۔ ③ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ تدفین میں زیادہ مدت نہ گذری ہو تو پھر پڑھنا جائز ہے۔ ④ باقی "صلی علی النجاشی" میں یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہاں صلاۃ سے دعا مراد ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے پوری حیات مبارکہ میں صرف دو شخصوں کی نماز جنازہ غائبانہ طور پر پڑھی ہے۔ ① نجاشی۔ ② معاویہ المزنی کہ آپ کسی غزوے میں تھے۔ اور انکا انتقال مدینہ میں ہوا تھا۔ احناف اسکو خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ ورنہ بہت سارے صحابہ کرام کے انتقال کی آپ کو خبر ملی۔ آپ نے ان دو کے علاوہ کسی اور کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اگر یہ مستقل عمل ہوتا تو آپ سب کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے۔

باب ماجاء فی القرأة علی الجنازة بفاتحة الكتاب

مسئلہ: اس باب میں یہ مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جنازے کی نماز میں سورت فاتحہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اسمیں اختلاف ہے ①۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام مالک اور سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سورت فاتحہ نہیں پڑھی جائے گی۔ ② امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلی اور دوسری تکبیر کے وقفے میں سورت فاتحہ پڑھی جائے گی۔ اسکے متعلق کوئی مرفوع حدیث نہیں۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے آثار ہیں۔ جواز کے متعلق ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر منقول ہے۔ احناف عدم جواز کے لئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آثار سے استدلال کرتے ہیں۔ اور بعض اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ "اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء" امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں فقط دعا کا حکم ہے۔ دوسرا استدلال امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ قیاس کا تقاضا ہے کی

جیسے نماز میں ہر رکعت میں سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔اسی طرح پھر تو نماز جنازہ میں بھی تکبیر کے ساتھ سورت فاتحہ پڑھی جائے گی۔نسائی میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کے ساتھ فاتحہ کے علاوہ اور سورت اور جہر کا بھی ذکر ہے۔

فائدہ: احناف کے ہاں نماز جنازہ میں بقصد دعاء سورت فاتحہ کا پڑھنا بغیر کراھیت کے جائز ہے

كيف الصلاة على الميت والشفاعة له

مسئلہ: جزاهم ثلاثه أجزاء ۔اس جملے کا اصل اور عام مفہوم یہی ہے کہ نماز جنازہ میں تین صفیں بنائی جائیں۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسکے دو مفہوم اور بیان کیے ہیں۔ ① کہ لوگوں کے تین طبقات بنائے جائیں، پہلی صف میں بوڑھے ہوں اور دوسری صف میں کہول کھڑے ہوں اور تیسری صف میں نوجوان کھڑے ہوں۔ ② کہ پہلی صف میں علماء کھڑے ہوں۔اور دوسری صف میں صلحاء کھڑے ہوں اور تیسری صف میں عوام الناس کھڑے ہوں۔

باب ماجاء فى كراهية الصلوة على الجنازة عند طلوع

مسئلہ: اوقات ثلاثہ میں نماز جنازہ بالاتفاق ممنوع ہے۔او نقبر فيهن موتانا اس سے مراد نماز جنازہ ہے اور بعض روایات میں اسکی تصریح بھی ہے۔کہ ان اوقات میں دفن کرنا منع ہے۔

وقال الشافعی: امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک قول یہ ہے۔دوسرا امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ممانعت کا ہے۔احناف سے ایک قول یہ منقول ہے کہ اگر ان اوقات میں جنازہ حاضر ہو جائے تو پھر پڑھنا جائز ہے۔

باب فى الصلاة على الاطفال

پہلی بات: بچے کی پیدائش کے بعد دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ بچہ تام الخلقة ہے لیکن اسپر زندگی کے آثار نہیں بلکہ مردہ ہے۔ اس بچے کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب بچہ تام الخلقت ہو اور چار ماہ بعد پیدا ہوا ہو۔تو چونکہ حدیث میں آتا ہے کہ چار ماہ بعد اسمیں روح ڈالی جاتی ہے تو اسکی نماز جنازہ پڑھی جائیگی اگرچہ زندگی کے آثار نہ ہوں۔امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اگر بچے پر پیدائش کے وقت زندگی کے آثار ہوں اور بعد میں انتقال کر جائے۔تو اسکی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔لیکن اگر زندگی کے آثار نہیں ہیں تو اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک استدلال پہلے باب کی حدیث سے ہے۔لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اس سے وہ طفل مراد ہے جس پر زندگی کے آثار ہوں اور اسکی دلیل دوسرے باب کی حدیث ہے۔جس میں حتى يستهل کے الفاظ ہیں۔استہلال کے معنی پیدائش کے بعد پہلی آواز کے آتے ہیں۔یا پہلی مرتبہ چاند دیکھنے کے بعد "هذا هلال" یہاں یہ زندگی کے آثار سے کنایہ ہے۔

دوسری بات: لايرث ولايورث یعنی استہلال کے بعد اگر ماں کا انتقال ہوا تو بچہ وارث ہوگا اگرچہ بچے کا بعد میں انتقال ہو جائے لیکن اگر استہلال نہ ہو تو وارث نہیں بنے گا۔اور لا یورث کی صورت یہ ہے کہ کسی نے دوران حمل بچے کے لئے صدقہ یا ہبہ کیا اور استہلال کے بعد انتقال ہوا تو وہ چیز بچے کے ورثاء کو ملے گی۔لیکن قبل الاستہلال کوئی بھی اسکا وارث نہیں بنے گا۔

باب ماجاء فی الصلاۃ علی المیت فی المسجد

مسئلہ: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے یعنی پڑھنا جائز ہے یا نہیں ۔تو فرماتے ہیں کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کی دوصورتیں ہیں ۔ایک صورت بالاتفاق جائز ہے اور دوسری صورت میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ ① مسجد میں کسی عذر کی بنا پر نماز جنازہ پڑھنا مثلاً بارش ہے مسجد کے علاوہ اور کوئی جگہ موجود نہیں ،اس صورت میں مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ ② دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد سے باہر نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ موجود ہے۔اسمیں اختلاف ہے: ① امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ۔ ② امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ، امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی مسجد میں نماز جنازہ جائز ہے۔

قول ثانی کے قائلین باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ۔قول اول کے قائلین سنن ابی داود کی ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ۔① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **ومن صلی الجنازۃ فی المسجد فلاشیٔ له** ای **فلاشیٔ له من الثواب** ۔ایک روایت میں **فلاشیٔ علیه** ہے لیکن محدثین نے لہ کو صحیح قرار دیا ہے۔اگرچہ قیل وقال ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ قابل استدلال ہے۔ ② نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل ابن بیضاء کے علاوہ کسی کی نماز جنازہ مسجد میں نہیں پڑھائی۔نجاشی کا جنازہ سامنے موجود نہیں تھا۔پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلی میں نماز جنازہ پڑھائی۔ ③ نماز جنازہ کے لئے مسجد کے علاوہ مستقل جگہ بنائی گئی تھی ۔یہ بھی مسجد میں ناجائز ہونے کی دلیل ہے۔ ④ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہ نے لوگوں سے فرمایا کہ جنازہ مسجد میں لاؤ۔تاکہ ہم بھی جنازے میں شریک ہوسکیں تو لوگوں نے اسپر تعجب کیا۔تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تم بھول گئے۔سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ عام صحابہ کرام کا مسلک عدم جواز کا تھا باقی سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ آپ نے مسجد میں عذر کی وجہ سے پڑھی تھی یا آپ معتکف تھے، امام مالک سے اہل مدینہ کا عمل بھی یہی منقول ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ جائز نہیں یہ عمل متوارث ہے۔بعض نے یہ صورت اختیار کیا ہے کہ میت وامام اور بعض مقتدی مسجد سے باہر ہوں اور باقی لوگ مسجد کے اندر ہوں تو جائز ہے لیکن شامی وغیرہ میں ہے کہ یہ صورت بھی ناجائز ہے۔

باب ماجاء این یقوم الامام من الرجال والمرأۃ

مسئلہ: امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ، امام احمد اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مرد کا جنازہ ہو تو امام میت کے سر کے برابر کھڑا ہو اور اگر عورت کا جنازہ ہو تو امام وسط چارپائی میں کھڑا ہو۔ایک قول امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی منقول ہے امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہ ہے کہ امام میت کے سینے کے برابر کھڑا ہونا چاہیے میت مرد ہو یا عورت ہو۔صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے کہ باب کی حدیث میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایک قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی ہے۔اگر مشہور قول کو لیا جائے تو وہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے آثار سے ثابت ہے کہ وہ میت کے سینے کے برابر کھڑے ہوتے تھے۔ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وسط چارپائی اور میت کے سینے میں فرق نہیں اسلئے کہ اسمیں اتنا فاصلہ نہیں ہوتا کہ آدمی محسوس کرسکے۔اسلئے احناف کا قول باب کی حدیث کے خلاف ہے۔

باب ماجاء فی ترک الصلوۃ علی الشھداء

مسئلہ: شہید وہ ہے جو ظلماً قتل کر دیا جائے یا دشمن کے ساتھ معرکہ میں شہید ہو جائے اسکا حکم یہ ہے ① اگر وہ وہیں مرجائے منتقل نہ ہو سکے ایسے شہید کو بالاتفاق غسل نہیں دیا جائے گا۔ ② بالاتفاق اسکو انہیں کپڑوں میں دفن کیا جائیگا۔ ③ اختلافی صورت یہ ہے کہ نماز پڑھیں گے یا نہیں؟ فقہائے کوفہ اور احناف کے ہاں نماز جنازہ پڑھی جائیگی۔ شوافع اور حنابلہ کے ہاں نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی، جس طرح غسل نہیں دیا جاتا یہ لوگ باب کی حدیث "لم یصل علیھم" سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر احناف کہتے ہیں کہ دوسری روایات سے ثابت ہے کہ انکی نماز جنازہ پڑھی گئی اور حضور اکرم ﷺ نے حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ کئی آدمیوں کے ساتھ پڑھائی۔ باقی جن روایات میں ہے کہ "لم یصل علیھم" انکا جواب یہ ہے کہ ابتداء کفار کو شکست ہوئی مگر جب کفار نے پلٹ کر حملہ کیا تو مسلمان کچھ بھاگ گئے کچھ شہید ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ دس یا بارہ آدمی رہ گئے۔ اسلئے جب شہداء کی تدفین ہو رہی تھی۔ اسوقت بہت سارے صحابہ موجود نہ تھے اسلئے نماز کا علم کچھ کو تو ہو سکا۔ جن کو علم نہ ہوا انہوں نے سمجھا کہ شائد جس طرح غسل نہیں دیا گیا اسی طرح نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی گئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے ابتداء میں نہیں پڑھی بعد میں پڑھ لی۔ اسلئے احناف کے ہاں شہداء پر نماز جنازہ واجب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحب ہے کوکب الدری میں لکھا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو نفی منقول ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سب صحابہ اپنے رشتہ داروں کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ اسلئے انکو نماز جنازہ کی اطلاع نہیں ہو سکی۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شہید تو مغفور ہے اسکی نماز جنازہ پڑھ کر اسکے لئے استغفار کا کیا مطلب؟۔ احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جس طرح بچہ مغفور ہے لیکن اسپر نماز جنازہ اسکے رفع درجات کیلئے پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح شہید کی نماز جنازہ بھی رفع درجات کیلئے پڑھی جائیگی۔

باب ماجاء فی الصلوۃ علی القبر

مسئلہ: امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ، امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ قبر پر نماز جنازہ پڑھنا چند صورتوں میں جائز ہے۔ ا۔ مثلاً میت کو بغیر جنازہ کی نماز کے دفن کیا تھا۔ میت کو دفن کئے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا ہو۔ یعنی وہ گل سڑ نہ گیا ہو۔ اسکے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔ غالب گمان سڑنے کا نہ ہو تو پڑھ سکتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر صورت میں قبر پر نماز جنازہ جائز ہے۔ باب کی حدیث انکا مستدل ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ باب کی حدیث آپ کی خصوصیت پر محمول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تک میں نماز جنازہ نہ پڑھوں قبروں میں ظلمت رہتی ہے۔ ورنہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام کی عام عادت یہ نہ تھی۔

صلی علی قبر ام سعد بن عبادۃ بعد شھرا ۔ احناف کہتے ہیں کہ آپ کو وحی کے ذریعے سے اطلاع ہو گئی ہو گی۔ کہ بدن گلا سڑا نہیں۔

فلہ قیراط ۔ قیراط نصف دانق کا ہوتا ہے اور ایک دانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی القیام للجنازۃ وغیرہ

مسئلہ: ان دو ابواب میں مسئلہ یہ ہے کہ جنازے کو دیکھ کر انسان کو کھڑا ہونا چاہیئے یا نہیں؟ تو ابتداء یہ حکم تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا سنت یا مستحب نہیں۔ ویسے اگر کوئی کھڑا ہوتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق فرماتے

ہیں کہ یہ حکم جنازہ کے ساتھ جانے والوں کیلئے ہے۔ سامنے والوں کیلئے ان کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں۔

باب ماجاء فی الثوب الواحد یلقی تحت المیت

مسئلہ: قبر میں میت کے نیچے ایک کپڑے سے زائد ڈالنا تو بالاتفاق ناجائز ہے لیکن ایک کپڑا بھی ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟ نبی اکرم ﷺ کے نیچے ان کے غلام شقران نے آپکے وصال کے بعد ایک قطیفہ آپکے جسد اطہر کے نیچے ڈالا تھا لیکن ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ ڈالنا جائز نہیں۔ باقی شقران نے جو آپ ﷺ کے نیچے قطیفہ رکھا تھا، یہ صحابہ کرام کے علم میں نہ تھا۔ الکوکب الدری میں لکھا ہے کہ آپکے دفن سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان اختلاف ہوا۔ انمیں سے ہر ایک کہتا تھا کہ یہ قطیفہ میں لونگا تو نبی اکرم ﷺ کے غلام شقران نے جب یہ اختلاف دیکھا تو اس نے آپ کے نیچے رکھ دیا بعد میں انہوں نے تلاش کیا تو انکو نہیں ملا۔ اسلئے کہ یہ تکوینی امر تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ آپکی خصوصیت ہو۔

باب ماجاء فی الرخصۃ فی زیارۃ القبور

پہلی بات: یہاں سے آگے تین ابواب میں زیارت قبور کا مسئلہ بیان کیا جارہا ہے۔ شروع میں آپ ﷺ نے زیارت قبور سے ممانعت فرمائی تھی لیکن جب لوگوں کی تربیت ہوگئی تو پھر انکو اجازت دے دی بلکہ اپنے گاؤں کے قبرستان میں مردوں کیلئے ہفتہ میں ایک بار جانا مستحب ہے۔ لیکن صلحاء کی قبور کی زیارت کیلئے سفر کرنا۔ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اپنی ممانعت پر ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت کیلئے سفر کرنا مستحب ہے۔

دوسری بات: یہ اجازت مردوں کیلئے ہے یا عورتوں کیلئے بھی ہے۔ تو بعض کہتے ہیں کہ یہ اجازت صرف مردوں کیلئے ہے، عورتوں کے لئے ممانعت باقی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے پہلے ممانعت تھی اور یہاں اجازت بھی دونوں کیلئے ہے۔ البتہ ہمارے فقہاء نے عورتوں کو زیارت قبور سے منع کیا ہے سداً للذرائع کیونکہ عورتوں میں علم کی کمی ہوتی ہے۔ اور جزع فزع بھی زیادہ کرتی ہیں۔

تیسری بات: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب اپنے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبر پر گئیں تو اشعار پڑھے جنکا ترجمہ یہ ہے۔
ہم جزیمہ بادشاہ کے ہم مجلسوں کی طرح تھے (اکٹھے تھے) طویل عرصہ تک۔ یہاں تک کہ دیکھنے والے کہتے تھے کہ یہ دونوں کبھی الگ نہ ہونگے لیکن جب ہم الگ ہوگئے گویا کہ میں (شاعر) اور مالک (شاعر کا بھائی) طویل زمانہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک رات بھی ایک ساتھ نہیں ٹھہرے ہیں۔

باب ماجاء فی الشھداء من ھم

مسئلہ: شہداء تین قسم پر ہیں۔ ① جو عنداللہ اور عندالناس شہید ہو یہ وہ شہید ہے۔ جو بغیر کسی ریا اور بغیر کسی دنیاوی مقصد کے اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں نکلا اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے شہید ہوگیا۔ ② جو عندالناس تو شہید ہے عنداللہ شہید نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جو قومی تعصب کی وجہ سے جہاد کیلئے نکلا اور اعلاء کلمۃ اللہ اسکا مقصد نہیں تھا۔ ③ جو عنداللہ تو شہید ہو عندالناس شہید نہ ہو۔ جیسا کہ مذکورہ حدیث میں چھ سات افراد کا ذکر ہے۔ جیسے کسی کا طاعون میں انتقال ہوگیا یا حاملہ عورت کا وضع حمل کے وقت انتقال ہوگیا۔ وغیرہ۔

باب ماجاء فی عذاب القبر

مسئلہ: اہل سنت والجماعت کے نزدیک عذاب قبر قرآن کریم کے اشارۃ النص سے بھی اور احادیث مبارکہ سے بھی ثابت ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہے۔ اسلئے اسکا منکر کافر ہے۔ پھر اہلسنت والجماعت کے نزدیک یہ عذاب روح مع الجسد کہلاتا ہے۔ اور اگر جسم محفوظ نہ ہو تو صرف روح کو عذاب ہوتا ہے۔ روح کا جسد کے ساتھ تعلق ہوتا ہے کہ جس سے مردہ عذاب کا درد محسوس کرتا ہے اور وہ تعلق مستلزم حیات نہیں ہوتا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے روح کے جسم کے ساتھ تعلق کی پانچ قسمیں ذکر کی ہیں۔ جن میں سے ایک یہی ہے۔

ابواب النکاح

نکاح کی تعریف: نکاح لغت میں ضم کو کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں دو تین قول ہیں۔ ① حقیقۃً نکاح کا اطلاق جماع پر ہوتا ہے۔ اور مجازاً اسکا اطلاق عقد پر ہوتا ہے۔ ② حقیقۃً نکاح کا اطلاق عقد پر ہوتا ہے۔ اور مجازاً اسکا اطلاق جماع پر ہوتا ہے۔ ③ دونوں پر حقیقی اطلاق ہوتا ہے۔ اور فرق سیاق وسباق سے معلوم کریں گے۔ اس باب سے معلوم ہوا کہ نکاح انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہے لیکن یہ کل انبیاء کی سنت نہیں کیونکہ بعض نے شادی نہیں کی تھی جیسے حضرت یحییٰ علیہ الصلاۃ والسلام۔ عام حالات میں نکاح سنت ہے۔ لیکن جب انسان کا کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر اسکا حکم وجوب کا ہے۔

علیکم الباء ۃ۔ باءۃ سے مراد جماع ہے اگرچہ اسکا استعمال جماع وشہوت دونوں میں ہوتا ہے۔ یا اخراجات نکاح نفقہ اور سکنی مراد ہے۔

باب ماجاء فی النهی عن التبتل

مسئلہ: تبتل۔ انقطاع کو کہتے ہیں۔ کہ نکاح نہ کرے۔ بتول اس عورت کو کہتے ہیں جو نکاح سے منقطع ہو۔ جیسے حضرت مریم کی صفات بتول ذکر کی جاتی ہے۔ عام حالات میں نکاح مسنون ہے لیکن اگر زنا کا خطرہ ہو تو واجب ہوگا۔ لاختصینا۔ یہ مبالغہ فی التبتل ہے۔ اگرچہ انسان کو خصی کرنا جائز نہیں ہے جمہور کے صحیح تر قول کے مطابق جانوروں کا خصی کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خصی کئے ہوئے مینڈوں کو ذبح کیا۔ یہ خصی کرنا تب جائز ہے جب جانور چھوٹا ہو۔ اگر بڑا ہو جائے تو پھر خصی کرنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فیمن ترضون دینه فزوجوه

مسئلہ: لوگ جب عورت سے نکاح کرتے ہیں صفات کو دیکھتے ہیں۔ احادیث میں وہ صفات مذکور ہیں۔ مثلاً مال۔ حسب ونسب اچھا ہو یا دیندار ہو۔ تو آپ نے حکم دیا کہ دیندار عورت کو ترجیح دو۔ اسی طرح مردوں میں بھی دینداری کو ترجیح دینی چاہئے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ جمال یا حسب ونسب یا مال یہ صفات ایسی ہیں، جن سے فقط اس شخص کی ذات کا فائدہ ہے دوسروں کو نہیں۔ جبکہ دینداری ایسی صفات ہے۔ جسکا دوسروں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ وہ دینداری کی وجہ سے دوسروں (عورت) پر ظلم نہیں کریگا۔

مسئلہ: نکاح کے اندر کفو کا جو حکم ہے یہ استحکام نکاح میں معاون ہوتا ہے۔ اور نکاح سے مقصود استحکام ہی ہوتا ہے۔ اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفو کا حکم دیا۔ یہاں دیندار کو ترجیح دی کفو کی وجہ سے اگر کفو نہ ہو تو اسکو ترجیح دینا لازم نہیں۔

﴿الاتفعلوه تکن فتنة فی الارض وفساد عریض﴾ اسکا مطلب یہ ہے کہ نکاح نہیں کراؤ گے اور مالدار کو دیکھتے رہو گے۔ تو ہر آدمی مالدار تو نہیں ہوتا۔ جب مالدار نہ ملا تو عورتیں بغیر نکاح کے رہ جائیں گی۔ تو زنا عام ہوگا۔ جب زنا عام ہو تو

قتل اور غارت گری ہوگی جو فساد ہی ہے۔

باب ماجاء فی النظر الی المخطوبة

پہلی بات: باب کی حدیث میں ہے کہ مخطوبہ کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ جب واقعتہً نکاح کا ارادہ ہو۔ مستدل وہ حدیث ہے جسمیں ہے کہ ایک صحابی نے عورت کی طرف نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اسکو دیکھا ہے۔ اس نے کہا نہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھ لو کیونکہ ان فی اعین الانصار شیئا۔ باقی حدیث میں دیکھنے کی علت یہ بیان کی ہے فانہ احری ان یؤدم بینکما کیونکہ پہلے اگر نہ دیکھا ہو اور بعد میں پسند نہ آئے تو جدائی تک نوبت آجائے گی۔

دوسری بات: مخطوبہ کے کن حصوں کو دیکھنا جائز ہے؟ عام فقہا فرماتے ہیں کہ چہرہ، ہاتھوں اور پاؤں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ باقی حصوں کو دیکھنا جائز نہیں۔ مخطوبہ کی طرف دیکھنے کیلئے اجازت شرط ہے یا نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرط ہے۔ جمہور کے ہاں اجازت شرط نہیں۔

باب ماجاء فی اعلان النكاح

پہلی بات: شریعت کی نظر میں نکاح کا محمود طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان اسکی شہرت ہو۔ تاکہ لوگوں کو ان دونوں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں۔ مگر اسکے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جمہور کے ہاں یہ اعلان بعد النکاح ہے اور مستحب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گواہ نہ ہوں صرف شہرت ہو تو کافی ہے۔ مگر جمہور کہتے ہیں کہ عقد کے وقت گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ گواہ نہ ہوں تو نکاح نہ ہوگا۔ باقی شہرت تو نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔

دوسری بات: فصل مابین الحلال والحرام الدف والصوت۔ دف وہ ڈھول ہے جسمیں ایک طرف چمڑا لگا ہوتا ہے۔ دوسری طرف خالی ہوتا ہے۔ صوت سے صوت دف یا صوت غناء مراد ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی خوشی کے موقع پر بچیاں گائیں یا دف بجائیں مباح ہے لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ دف سے وہ خاص دف مراد ہے۔ جو حجام کسی کے بچے کی پیدائش پر یا کسی کی شادی پر دوسرے رشتہ داروں کو مطلع کرنے کیلئے بجاتے تھے۔ اس سے وہ خاص دف مراد ہے۔ جسکو پشتو میں "ڈمامہ" کہتے ہیں

تیسری بات: یندبن من قتل من آبائی ندبہ کہتے ہیں کہ مرے ہوئے آدمی کو محاسن کو ذکر کر کے اسکو یاد کرنا۔ الادب المفرد میں امام بخاری نے ایک روایت نقل کی ہے۔ کہ کسی آدمی کے پاؤں میں موچ آجائے تو عرب کا دستور تھا کہ وہ اسکو کہتے تھے۔

اذکر احب الخلق الیک کہ اپنے محبوب آدمی کو یاد کرو درد ختم ہوجائے گا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو موچ آئی کسی نے کہا۔ اذکر احب الخلق الیک۔ تو اس نے کہا۔ واہ محمد۔ بریلوی اس سے استدلال کرتے ہیں کہ غیر اللہ کو ندا کرنا جائز ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ یہاں نداء نہیں بلکہ ندبہ ہے اور ان دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔

باب ماجاء فی الوليمة

مسئلہ: صحیح تر قول کے مطابق جن کو ولیمہ کرنے کی استطاعت ہو اپنی استطاعت کے مطابق ولیمہ کرنا مستحب ہے۔ یہ جمہور ائمہ کا مسلک ہے وجوب کا قول کسی کا نہیں۔ بعض اہل ظواہر کا قول وجوب کا ہے۔

ولیمہ ولم سے ہے بمعنی ضم یا جماع، میاں بیوی کے ملاقات کے بعد خوشی پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اسکو ولیمہ کہتے ہیں، عرب میں

دستور تھا کہ کئی کئی دن تک ایک آدمی کا ولیمہ چلتا تھا اور تفاخر کے طور ایسا کرتے تھے تو آپ نے پہلے یا دوسرے دن کے ولیمے کو جائز قرار دیا اور باقی کو ناجائز قرار دیا۔

وطعام یوم الثانی سنة جیسے فرض کا تکملہ سنت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر پہلے دن کچھ کمی رہ گئی ہو تو دوسرے دن اسکی تکمیل ہو جائے گی۔

باب ماجاء لانکاح الابولی

مسئلہ: یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے کہ عورت اپنا نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔ عورت کے ایجاب اور قبول سے نکاح منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہاء کوفہ فرماتے ہیں کہ اگر ولی عورت کا نکاح کرے تو اسکی اجازت سے منعقد ہو جاتا ہے۔ اور اگر عورت عاقلہ بالغہ ہو تو خود نکاح کرنے سے بھی منعقد ہو جائے گا جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عورت اپنا نکاح خود منعقد نہیں کر سکتی۔ یہ حضرات باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

احناف اپنے مذہب کیلئے مختلف استدلالات پیش کرتے ہیں۔ ① قرآن کی آیت **فاذا بلغن اجلهن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسهن** یہاں **فیما فعلن** میں عورتوں کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ اگر عورتوں کا خود نکاح کرنا منعقد نہ ہوتا تو پھر یہاں عورتوں کی طرف نسبت صحیح نہیں۔ ② حدیث میں ہے کہ جب ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ نے نکاح کا پیغام دیا تو ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میرے اولیاء میں سے کوئی حاضر نہیں تھا، تو میں نے اپنے ایک رشتہ دار نابالغ بچے عمر بن ابی سلمہ سے کہا کہ تم کھڑے ہو کر آپ ﷺ سے میرا نکاح کرادو اور ظاہر ہے۔ کہ نابالغ بچے کے قول وفعل کا شریعت میں اعتبار نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ نکاح ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عبارت سے منعقد ہوا تھا۔ ③ آپ ﷺ نے فرمایا **الایم أحق بنفسها من ولیها** اور بالغہ سے اجازت طلب کی جائے گی۔ **فاذنها سکوتها** ۔ الا یہ کہ عورت اپنا نکاح غیر کفو میں کرے تو احناف کا پہلا قول یہ ہے کہ نکاح ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نکاح منعقد تو ہو جائے گا۔ لیکن ولی کو فسخ کا اختیار ہوگا لیکن متاخرین [illegible]ناف نے لکھا ہے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ولی حاکم تک نہیں پہنچ سکتا یا بات نہیں کر سکتا اسلئے اب فتویٰ اس پر ہے کہ یا تو ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔ یا نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا۔ باب کی حدیث اس تفصیل کے اعتبار سے مضطرب ہے۔ پہلا اضطراب اتصال میں ہے۔ ② ۔ دوسرا اضطراب ارسال اور عدم ارسال میں ہے۔ ③۔ تیسرا اضطراب مرفوع اور موقوف ہونے میں ہے اس لئے یہ قابل استدلال نہیں۔ بعض نے "لانکاح" میں لا کو نفی کمال پر محمول کیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حدیث اضطرابات کی وجہ سے قابل استدلال نہیں۔

فان شجروا فالسلطان ۔ یہ اسوقت ہے کہ جب ایک درجہ کے اولیاء میں اختلاف ہو۔ اسلئے کہ اگر ولی اقرب اور ابعد میں اختلاف ہو تو ولی اقرب کی بات قبول ہوگی۔ باب کی حدیث احناف کے ہاں غیر کفو میں نکاح پر محمول ہے۔

باب ماجاء فی استمار البکر والثیب

مسئلہ: ولی کو ولایت اجبار حاصل ہے۔ ولایت اجبار کی علت کیا ہے؟ احناف کے نزدیک صغر ہے یہ ولایت باپ اور دادا کو ہے۔ شوافع کے نزدیک ولایت اجبار کی علت بکر ہے۔ جسکی تفصیل دوسرے باب کی حدیث میں ہے۔ باب کی جدیث احناف کی متدل ہے کہ "**لاتنکح البکر حتی تستأذن**" اگر باکرہ بالغہ ہے تو اجازت ضروری ہے۔ اگر ولایت کی علت

بکر ہوتی تو اجازت کی شرط نہ لگاتے۔ باکرہ اور ثیبہ کے استیذان میں فرق ہے۔ ثیبہ کے تکلم باللسان کے لئے حیا مانع نہیں ہوتی لیکن باکرہ چونکہ اس مرحلے سے گزری نہیں ہوتی ہے۔ اسلئے اسکے لئے حیا مانع ہوتی ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے سکوت کو اجازت قرار دیا ہے۔

باب ماجاء فی مهور النساء

مسئلہ: شوافع حنابلہ وغیرہ کے ہاں اکثر مہر کی کوئی حد مقرر نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں قنطار کا لفظ مذکور ہے۔ اقل مہر کیلئے بھی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں۔ جس پر زوجین راضی ہوجائیں وہی مہر ہوگا۔ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ اقل مہر دس درہم ہیں۔ اسکا ثبوت ان بعض روایات سے ہے جن کو فقہاء نے ذکر کیا ہے لیکن سنداً ان میں سے کوئی روایت انفراداً صحیح نہیں۔ البتہ قرآن کریم میں ہے "ان تبتغوا باموالكم" اہل اصول نے اس سے اخذ کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں کوئی حد مقرر ہے۔ وہ مقدار کیا ہے۔ تو وہ ان روایات کے مجموعے سے استدلال کرتے ہیں۔ جن میں ہے "لامهر اقل من عشرة دراهم" لیکن اکثر مہر کے لئے کوئی حد مقرر ہے یا نہیں۔ تو فرماتے ہیں کہ اکثر حد مقرر نہیں۔ لیکن مغالات فی المہر شرعاً مذموم ہے۔

زوجتكها بما معك من القران یہ احناف کے ہاں آپ ﷺ کی خصوصیت پر محمول ہے۔ یا مطلب یہ تھا کہ مہر تیرے ذمہ قرض ہوگا لیکن قرآن کریم کی برکت سے ابھی بغیر مہر کے نکاح کرتا ہوں لیکن یہ تاویل احناف اسوقت کرتے تھے۔ جبکہ تعلیم قرآن پر اُجرت لینا جائز نہیں تھا لیکن اب اس تاویل کی ضرورت نہیں کہ اب تعلیم قرآن مہر بن سکتا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یعتق الامة ثم یتزوجها

مسئلہ: کوئی آدمی باندی کو آزاد کر کے اسکی آزادی کو مہر بناتا ہے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ ① ۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ ② ۔ باقی ائمہ جواز کے قائل ہیں۔ باب کی حدیث قول ثانی والوں کا مستدل ہے، احناف کے نزدیک باب کی حدیث کی مختلف تاویلات ہیں۔ ① یہ اس معنی پر محمول ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ اختیار دیا تھا۔ کہ وہ بغیر مہر کے نکاح کرسکتے تھے۔ یہ آپکی خصوصیت ہے۔ مگر عام لوگ یہ سمجھتے کہ آپ نے عتق کو مہر مقرر کردیا۔ ② دوسرا معنی یہ ہے کہ عتق کے وقت یہ شرط لگائی گئی تھی کہ وہ آپ کے ساتھ نکاح قبول کریگی۔ اس شرط کو ذکر کیا گیا ہے، باقی مہر مقرر نہ کرنا یا تو آپکی خصوصیت ہے یا اسوقت اسکا تذکرہ نہیں ہوا بعد میں آپ نے مہر ادا کردیا ہوگا۔ تو گویا یہاں نفی مہر معجّل کی ہے نہ کہ مہر مؤجل کی۔ ③ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا مہر معاف کردیا تھا۔ ④ اپنے نفس کو ہبہ کیا تھا جیسا کہ قرآن میں ہے۔ ان وهبت نفسها للنبى ۔

باب ماجاء فی الفضل فی ذلک

مسئلہ: باب کی حدیث پر یہ اشکال ہے کہ جن لوگوں کے دگنے اجر کا ذکر ہے تو ان کے عمل بھی دو ہیں تو دوہرے عمل کی خصوصیت نہیں کیونکہ ہر عمل کا الگ اجر ہے۔ مثلاً غلام کے لئے مولا کے حق کا الگ اجر ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حق کا الگ اجر ہے۔ اسی طرح باقی دو شخص ہیں۔ الكوكب الدری میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر عمل پر دو دو اجر ملیں گے۔ مثلاً

غلام کے حق کی ادائیگی میں دو اجر ملیں گے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں بھی دو اجر ملیں گے۔ اسی طرح باندی کے تین عمل ہیں تو اسکو چھ اجر ملیں گے۔

باب ماجاء فی من یطلق امرأته ثلاثًا

مسئلہ: جمہور کے نزدیک اگر کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو وہ بیوی مغلظہ ہو جائے گی، چاہے وہ تین طلاقیں متفرق دی ہوں یا مجتمع طور پر دی ہوں، چاہے ایک لفظ کے ساتھ دی ہوں یا کئی الفاظ کے ساتھ چاہے ایک مجلس میں دی ہوں یا کئی جلسوں میں، بہر حال رجوع کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب یہ بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔ جب دوسرے شوہر سے نکاح کیا تو پھر دو صورتیں ہیں۔ ① دوسرے شوہر نے بعد الدخول طلاق دی یا بعد الدخول فوت ہوگیا۔ تو یہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائے گی۔ ② دوسرے شوہر نے قبل الدخول طلاق دی یا قبل الدخول وہ فوت ہوگیا تو حلال نہیں ہوگی۔ اس صورت کے متعلق باب کی حدیث سے معلوم ہوا کہ حلت کے لئے دخول شرط ہے یہ جمہور کا مذہب ہے۔

باب ماجاء فی المحل والمحلل له

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ① پہلی بات یہ ہے کہ بشرط حلالہ نکاح کرنا بالاتفاق مذموم ہے اسمیں کسی کا اختلاف نہیں۔ ② اگر اسطرح کا نکاح کسی نے کرلیا تو اسکی دو صورتیں ہیں۔ ① بغیر شرط حلالہ کے نکاح کیا صرف اسکے دل میں تھا کہ میں دخول کے بعد طلاق دوں گا۔ احناف کی کتب میں لکھا ہے کہ یہ صورت مذموم نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ شاید اسپر ثواب بھی مل جائے۔ ② اگر بشرط حلالہ نکاح کیا کہ دخول کے بعد اسکو طلاق دو گے۔ اس صورت میں اختلاف ہے کہ یہ نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ پھر اگر نکاح منعقد ہوگیا تو یہ شوہر اول کیلئے حلال ہو جائے گی یا نہیں؟ احناف کے ہاں یہ نکاح منعقد ہو جائے گا۔ اگر چہ یہ شرط باطل ہے، اگر شوہر ثانی نے دخول کر کے طلاق دیدی یا فوت ہوگیا۔ تو یہ عورت شوہر اول کے لئے حلال ہو جائے گی۔ اسکی دو دلیلیں ہیں۔ ① پہلی دلیل باب کی حدیث ہے کہ اگر نکاح ثانی منعقد نہ ہوتو نا کح ثانی محل اور شوہر اول محل لہ نہیں بنے گا ② مصنف عبد الرزاق میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے بشرط حلالہ نکاح کیا حضرت عمر کو جب علم ہوا تو فرمایا کہ تم اس نکاح پر قائم رہو اور طلاق نہ دو ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ استدلال یہ ہے کہ جب دوسرے آدمی کو نکاح پر قائم رہنے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس نکاح کو جائز سمجھتے تھے۔ تو اس عورت سے وطی بھی جائز ہے۔ تو طلاق دینے سے یہ زوج اول کیلئے حلال بھی ہو جائے گی۔

لعن المحل والمحلل له: زوج ثانی ملعون اسلئے ہے کہ وہ بے غیرت اور تیس مستعار ہے اور زوج اول اسلئے کہ وہ اس بے حیائی کا سبب بنا۔

باب ماجاء فی نکاح المتعة

مسئلہ: نکاح متعہ کی حرمت تو احادیث میں منقول ہے لیکن روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ خیبر کے موقع پر اسکو حرام قرار دے دیا اور بعض روایات میں ہے کہ اوطاس کے موقعہ پر اسکو حرام قرار دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اسکو حرام قرار دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حرام قرار دیا۔ ① علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے

ہیں کہ جس معنی میں روافض متعہ کے قائل ہیں یہ اسلام میں کبھی بھی نہیں ہوا۔ البتہ اسلام کی ابتدائی زمانہ میں نکاح موقت جائز تھا پھر اسکو منسوخ کیا گیا۔ تو راویوں نے اس کی تعبیر متعہ سے کی۔ ④ الکوکب الدری وغیرہ میں منقول ہے کہ نکاح متعہ ابتداء جائز تھا۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ اسلام نے جائز قرار دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت سے چلا آرہا تھا۔ جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں زمانہ جاہلیت کے چار نکاحوں کا ذکر ہے۔ اسکی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ چنانچہ جنگ خیبر اور اوطاس کے موقع پر جیسے خنزیر۔ دم مسفوح اور میتة کی حرمت کا حکم ہوا۔ اسی طرح نکاح متعہ کی حرمت کا حکم بھی فرمادیا لیکن حالت اضطرار میں اسکی رخصت تھی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر منقول ہے کہ بعض صحابہ نے نکاح متعہ کیا تھا تو یہ حالت اضطرار میں تھا لیکن فتح مکہ کے خطبہ میں اسکی حرمت مؤبد ہوگئی۔ یعنی حالت اضطرار میں بھی اسکی حرمت ہوگئی۔ تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسکا علم ہوا اور بعض کو نہیں ہوا۔ اسلئے حجة الوداع میں اس کا دوبارہ اظہار فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم نہ ہوا تھا۔ بعد میں جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اطلاع دی تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے رجوع کرلیا تھا۔ گویا امت کا اسکی حرمت پر اجماع ہے۔ (حتی اذا نزلت الایة الاعلی ازواجھم) یہاں پر یہ اعتراض ہے کہ اس آیت میں حرمت متعہ کا ذکر ہے اور یہ سورت مکی ہے حالانکہ حرمت میتة کا حکم ۷ء میں نازل ہوا تو اسکا کیا مطلب ہے۔ تو الکوکب الدری میں لکھا ہے کہ یا تو اسکا مطلب یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے۔ لیکن یہ آیت مدنی ہے جیسا کہ قرآن کریم کی بہت ساری سورتوں میں ایسا ہی ہے۔ یا یہ سورت تو مکی ہی ہے لیکن اس آیت کے نکاح متعہ پر اطلاق کے متعلق آپ کو بعد میں بتلایا گیا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اصل ناسخ آیت سورت مومنون کی ہے کہ الاعلی ازواجھم میں سے حرمت متعہ کا حکم نازل ہوا۔

باب ماجاء فی النھی عن نکاح الشغار

پہلی بات: باب کی حدیث تین جملوں پر مشتمل ہے۔ ① پہلا جملہ ہے۔ لاجلب ولاجنب۔ اسکا ایک معنی سباق کے اندر آتا ہے۔ دوسرا معنی زکوٰۃ کے اندر آتا ہے۔ دونوں میں الگ الگ معنی ہوگا۔ ① جلب فی الزکوٰة یہ ہے کہ عامل شہر سے دور کسی جگہ پر اپنا پڑاؤ ڈالے اور لوگوں کو کہے کہ تم اپنا مال یہاں لاکر زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جنب فی الزکوٰة یہ ہے کہ جب کوئی عامل صدقہ کسی گاؤں میں زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے گیا تو مالکوں نے اپنے مویشیوں کو اپنے مقام سے دور لیجا کر عامل صدقہ کو کہا کہ وہاں آکر ہم سے زکوٰۃ وصول کرو تو نبی ﷺ نے اس سے منع کیا۔ ② جلب فی السباق یہ ہے کہ آدمی ایک گھوڑے پر سوار ہوا، اور دوسرے آدمی کو کہا کہ تم میرے گھوڑے کو پیچھے سے دوڑاتے رہو۔ جنب فی السباق یہ ہے کہ گھوڑ دوڑ میں جس گھوڑے پر سوار تھا۔ اسکے ساتھ ایک دوسرا گھوڑا رکھا تاکہ اس گھوڑے کے تھکنے کے بعد اس دوسرے گھوڑے پر سوار ہوجائے۔ اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

دوسری بات: حدیث کا دوسرا جملہ ہے "لاشغار فی الاسلام" شغر کتے کے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے کو کہتے ہیں نکاح فی الشغار کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح کسی سے اس شرط پر کرتا ہے کہ وہ شخص اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کرادے، اگر دونوں کا مہر مقرر کیا ہو تو شغار نہیں ہوگا۔

تیسری بات: نکاح شغار کی مذکورہ صورت کے مذموم ہونے میں سب ائمہ متفق ہیں۔ یہ زمانہ جاہلیت کا طریقہ تھا، اسلام نے اس سے منع کردیا۔

چوتھی بات: نکاح شغار منعقد ہوگا یا نہیں؟ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور صحیح تر قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا۔ اور دونوں کیلئے مہر مثل واجب ہوگا۔ اس لئے کہ مہر کا ذکر انعقاد نکاح کیلئے ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ترمذی نے مذکورہ قول کے برعکس ذکر کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو قول ترمذی نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے یہ صحیح نہیں۔

پانچویں بات: حدیث کا تیسرا جملہ ہے "ومن انتهب نهبة" انتہاب اچک لینے کو کہتے ہیں، اگر کسی نے ڈاکہ ڈالا یا ظلماً کسی سے کوئی چیز لی تو اس کے بارے میں آپ نے فرمایا "لیس منا" کسی کا مال ظلماً لینا حرام ہے۔

باب ماجاء فی الشرط عند عقد النكاح

مسئلہ: نکاح کے وقت شرط کی تین قسمیں ہیں۔ ① ایسی شرط جو عقد نکاح یا مقتضائے نکاح کا بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عورت یہ کہے کہ میں تم سے اس شرط پر نکاح کرتی ہوں کہ تم میرے قریب نہیں آؤ گے۔ تو سب ائمہ کے نزدیک اسکا اعتبار نہیں۔ ② ایسی شرط جو عقد نکاح اور مقتضائے نکاح سے خود بخود ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً عورت کہے کہ تمہارے ذمہ میرا نان نفقہ اور سکنی ہے۔ انکا ذکر کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ ③ ایسی شرط جو نہ قسم اول کے قبیل سے ہو اور نہ قسم ثانی کے قبیل سے ہو۔ بلکہ مباح شرط ہے۔ اور باب کی حدیث میں اس تیسری قسم کی شرط کا ذکر ہے۔

باب ماجاء فی الرجل يسلم وعنده عشرة نسوة

پہلی بات: اس بات پر اتفاق ہے کہ بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں۔ سوائے شیعوں کے زیدیہ فرقہ کے جسکے امام شوکانی ہیں۔ انکے نزدیک نو بیویاں رکھنا جائز ہیں۔ اختیار کے طریقے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی دس بیویاں تھیں پھر وہ آدمی مسلمان ہوگیا۔ تو ان دس بیویوں میں سے جن چار بیویوں کو چاہے پسند کرلے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابتدائی چار کو اختیار کرے۔ لیکن اگر سب کا اکٹھا نکاح کیا تھا تو پھر جن چار کو چاہے اختیار کرے۔

دوسری بات: ابورغال یہ قوم ثمود میں سے تھا۔ جب قوم ثمود پر پتھر پڑے تو یہ بیت اللہ میں داخل ہو کر بچ گیا تھا۔ جب باہر نکلا تو اس پر پتھر برسے۔ اسکی قبر مکہ میں ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کو اسکی قبر دکھائی۔ یا اس سے وہ شخص مراد ہے کہ جس نے اصحاب الفیل کو راستہ بتایا تھا۔ جب وہ کعبہ پر حملہ کر رہے تھے۔ تباین دارین کی وجہ سے نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ اسلئے وطی جائز ہے جبکہ استبراء رحم ہو جائے۔

باب ماجاء فی كراهية البغی

مسئلہ: زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ جن کے پاس باندیاں ہوتی تھیں۔ وہ ان کو کمائی پر لگاتے تھے۔ پھر وہ اجرت لے کر مالکوں کو دیتی تھیں۔ اسلام نے اس سے منع کیا۔ یہاں پر مشہور اعتراض یہ ہے کہ ہمارے فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ زانیہ کی اجرت جائز ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے عورت کو خدمت کیلئے رکھا۔ مثلاً کپڑے یا برتن دھونے کیلئے رکھا۔ پھر اس سے زنا کراتا ہے تو یہ اجرت

جائز ہے۔ کیونکہ یہ اجرت زنا کی نہیں بلکہ عقد کی ہے جو اس نے کپڑے دھونے وغیرہ کیلئے کیا تھا۔

حلو ان الکلب: اس سے عام کتے کا ثمن مراد ہے۔ کلب صید اور کلب ماشیہ اسمیں داخل نہیں۔

باب ماجاء فی العزل و کراھیۃ العزل

مسئلہ: عزل کے متعلق نبی کریم ﷺ سے دو قسم کی حدیثیں منقول ہیں۔ ① بعض علماء فرماتے ہیں کہ آپ نے پہلے عزل کی اجازت دی تھی۔ لیکن بعد میں اسکی ممانعت فرمادی۔ ② بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرورۃً عزل جائز ہے اور بلاضرورت جائز نہیں۔ ③ اگر یہ اعتقاد ہو کہ پیدائش اور رزق کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے تو پھر عزل کرنا جائز ہے۔ اگر عقیدہ خراب ہو تو عزل کرنا جائز نہیں۔ آجکل جو منصوبہ بندی کی تحریک چلی ہے یہ ناجائز ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ عزل میاں بیوی کے درمیان ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اگر بیوی بیمار ہے یا ابھی بچہ چھوٹا ہے تو عزل کرنا جائز ہے۔ **العزل ھو نزع الذکر من الفرج قبیل الانزال.**

باب ماجاء فی القسمۃ للبکر والثیب

مسئلہ: اگر کسی آدمی کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان عدل اور تسویہ واجب ہے لیکن یہ عدل ظاہری امور میں واجب ہے قلبی میلان میں عدل واجب نہیں۔ تسویہ اور عدل کن امور میں واجب ہے تو ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ مطعم، ملبس اور سکنی میں عدل واجب ہے۔ وطی میں عدل واجب نہیں کیونکہ یہ طبعیت کے نشاط پر موقوف ہوتا ہے۔

پہلے باب کی حدیث میں جو حکم مذکور ہے اسپر اتفاق ہے کہ اگر نئی شادی باکرہ سے کی ہو تو پہلے سات دن باکرہ کے پاس رہیگا۔ پھر تسویہ شروع ہوگا۔ اور نئی شادی ثیبہ سے کی ہے تو تین دن اس کے پاس رہیگا۔ پھر تسویہ شروع ہوگا۔ اختلاف اس میں ہے کہ یہ سات یا تین دن نمبر میں شمار ہونگے یا نہیں۔ شوافع کے ہاں یہ نمبر میں شمار نہیں ہونگے جبکہ احناف کے نزدیک نمبر میں شمار ہونگے۔

باب ماجاء فی الزوجین المشرکین یسلم احدھما

مسئلہ: ترجمۃ الباب اور اسکے تحت حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں کافر تھے۔ اور دونوں دارالحرب میں تھے، دونوں میں سے ایک مسلمان ہوگیا۔ تو اب ان دونوں میں تفریق کی صورت کیا ہوگی۔ کیونکہ احناف کے نزدیک اسلام سبب فرقت نہیں بن سکتا۔ چنانچہ اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں: ① میاں بیوی دونوں دارالحرب میں تھے ان میں سے کوئی مسلمان ہوگیا۔ تو اب عورت کی عدت گزرنے تک اگر دوسرا مسلمان نہیں ہوا تو یہ عدت کا گزرنا سبب فرقت بنے گا۔ ② اگر زوجین دارالسلام میں تھے انمیں سے ایک مسلمان ہوگیا تو دوسرے پر اسلام پیش کیا جائیگا۔ اگر اس نے انکار کیا تو اعراض سبب فرقت بنے گا۔ ③ اگر زوجین دارالحرب میں تھے اور انمیں سے کوئی مسلمان ہوکر دارالسلام میں آگیا تو تباین دارین سبب فرقت بنے گا۔ باب کی دوسری حدیث جو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اسپر اعتراض ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بیٹی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ابوالعاص بن ربیع کے نکاح میں تھیں اور ابوالعاص بدر کے قیدیوں میں تھے۔ جب مکہ والوں نے اپنے قیدیوں کے چھڑوانے یعنی رہائی کے لئے فدیہ بھیجا تو حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا وہ زیور جو انکی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انکو دیا تھا، وہ ابوالعاص کی رہائی کیلئے بھیجا۔ جب نبی کریم ﷺ نے وہ زیور دیکھا تو صحابہ سے سفارش کر کے بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا اور ساتھ یہ شرط لگائی کہ جب تم مکہ

پہنچو گے تو حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مدینہ بھیج دینا۔ انہوں نے اس عہد کے مطابق اپنے بھائی یا حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مدینہ بھیجا۔ تو راستے میں کسی مشرک نے انکو نیزہ مارا جس سے وہ گر گئیں اور حمل ساقط ہو گیا۔ ابو العاص مکہ میں چھ سال رہے پھر مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کیا۔ اب اشکال یہ ہے کہ حضرت ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں چھ سال رہے۔ تو تباین دارین بھی ہوا اور ظاہر بات ہے کہ چھ سال کی مدت میں حضرت زینب کی عدت بھی گزر گئی تھی تو آپ نے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نکاح اول کے ساتھ کیسے لوٹایا۔ احناف اسکے متعلق دو باتیں کرتے ہیں۔

پہلی بات: یہ ہے کہ باب کی حدیث جو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے منقول ہے اسمیں نکاح جدید کا ذکر ہے اس حدیث میں سنداً اگر چہ کلام ہے کہ عمرو سے نقل کرنے والا حجاج بن ارطاۃ ہے جو کہ مدلس ہیں انکا سماع عمرو سے ثابت نہیں۔ اسلئے یہ حدیث منقطع ہے جبکہ باب کی دوسری ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جسمیں نکاح اول کا ذکر ہے یہ قوی ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اگر چہ قوی تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے مگر امت کا تعامل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث پر ہے جو اس سے قوی تر ہے۔

دوسری بات: یہ ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں جو نکاح اول الفاظ ہیں ان کے متعلق کوکب الدری میں منقول ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے بسبب النکاح الاول۔ معنی یہ ہوا کہ حضرت ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دوبارہ دیا کسی اور کے نکاح میں نہیں دیا کیونکہ ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وعدہ پورا کیا تھا۔ اور حسن سلوک کیا تھا۔ اور آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ وہ مسلمان ہو کر آئیں گے۔ باقی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں جو ولم یحدثہا کے الفاظ ہیں ان کا یہ معنی نہیں کہ ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نیا نکاح نہیں کرایا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس چھ سال کے عرصے میں کسی دوسرے آدمی سے نکاح نہیں کرایا۔ باب کی تیسری حدیث کا مسئلہ اتفاقی ہے کہ زوجین میں سے کوئی مسلمان ہوا۔ مثلاً عورت مسلمان ہوئی۔ اب اسکی عدت نہیں گزری تھی کہ مرد بھی مسلمان ہو گیا تو انکو اسی نکاح پر برقرار رکھا جائیگا۔ جیسے اگر زوجین ایک ساتھ مسلمان ہوں تو نکاح باقی رہتا ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یتزوج المرأۃ فیموت عنھا

مسئلہ: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے عورت سے نکاح کر لیا اور اسکا مہر مقرر نہیں کیا اور اسکے ساتھ دخول کئے بغیر فوت ہو گیا۔ تو یہ عورت مہر مثل اور میراث دونوں کی مستحق ہوگی۔ اسپر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ فقط امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک قول اسکے خلاف تھا۔ اسلئے کہ انکو باب کی حدیث کی صحت پر شک تھا۔ چنانچہ کتاب الام میں انہوں نے لکھا ہے کہ اگر باب کی حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو میرا قول بھی جمہور کے قول کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ بعد میں شوافع کے علماء نے اس کی صحت کو تسلیم کیا۔ لہٰذا اب اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ فقط حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض تابعین کا قول یہ تھا کہ عورت کو مہر مثل تو ملے گا میراث کی مستحق نہیں ہوگی۔

باب ماجاء فی لبن الفحل

مسئلہ: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ جس دودھ کا سبب کوئی آدمی بنا ہو وہ بھی رشتے میں شامل ہوگا۔ مثلاً کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو اب ظاہر ہے کہ وہ عورت کسی آدمی سے حاملہ ہوئی ہوگی۔ تو وہ شخص اس عورت کے دودھ اترنے کا

سبب بنا۔ اگر چہ وہ دودھ عورت کا ہے لیکن مرد اسکے اترنے کا سبب بنا ہے۔ لہٰذا جس طرح وہ عورت اس بچے کی رضاعی ماں بنے گی۔ اسی طرح وہ مرد بھی اس بچے کا رضاعی باپ ہوگا۔ اور اس بچے کی حرمت رضاعت اس مرد کے ساتھ بھی ثابت ہوگی۔ اور اس مرد کا بھائی اس بچے کا چچا ہوگا۔ اسپر جمہور ائمہ کا اتفاق ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اسکے متعلق اختلاف تھا۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی ایک قول جمہور ائمہ کے خلاف ہے۔

باب ماجاء لاتحرم المصة ولا المصتان

پہلی بات: حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوتی ہے۔ کہ جب بچہ مدت رضاعت میں دودھ پیئے۔ مدت رضاعت کے بعد دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اسکے متعلق آگے باب آئیگا۔

دوسری بات: کتنی دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے؟ اسکے متعلق ائمہ مجتہدین کے چار قول ہیں۔ ① ایک قول حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے جس میں عشر رضعات کا ذکر ہے۔ ② دوسرا قول عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا خمس رضعات معلومات کا ہے، اسکو امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے۔ ③ تیسرا قول ہے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ تین رضعات سے حرمت ثابت ہوگی۔ ④ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ۔ عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اوزاعی۔ وکیع رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک قول میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب بچہ مدت رضاعت میں دودھ پی لے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی۔ چاہے تھوڑا پیئے یا زیادہ پیئے۔ جو خمس رضعات کے قائل ہیں۔ وہ باب کی حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے استدلال کرتے ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ خمس رضعات سے کم میں حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ تین رضعات کے قائلین بھی باب کی پہلی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور ایک تو قرآن کریم کی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ ﴿وامهاتكم اللاتي ارضعنكم﴾ طریقہ استدلال یہ ہے کہ یہاں مطلق رضاعت کا ذکر ہے۔ ②۔ وہ احادیث جس میں آپ نے فرمایا یحرم من الرضاع مایحرم من النسب اس سے طریقہ استدلال یہ ہے کہ آپ نے مطلق رضاعت کے ساتھ حرمت کو متعلق کر دیا۔ تین پانچ یا دس کی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا۔ لہٰذا قلیل وکثیر دونوں سے حرمت ثابت ہوگی۔ باب کی دونوں حدیثوں کے متعلق احناف اور جمہور یہ فرماتے ہیں کہ اس سے خود بخود یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے دس رضعات کا حکم تھا وہ منسوخ ہوگیا۔ پھر پانچ رضعات کا حکم ثابت ہوا۔ پھر وہ بھی منسوخ ہوگیا۔ پھر تین رضعات کا حکم ثابت ہوگیا پھر وہ بھی منسوخ ہوگیا۔ لہٰذا اب قرآن کریم کی آیت کے مطلق ہونے کی وجہ سے حرمت رضاعت کا حکم قلیل اور کثیر دونوں سے ثابت ہوگا۔

باب ماجاء في شهادة المرأة الواحدة في الرضاع

باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ ثبوت رضاعت کیلئے کتنے آدمیوں کی گواہی ضروری ہے۔ ① ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کی گواہی سے حرمت رضاعت کا حکم ثابت ہوجاتا ہے لیکن اسکے ساتھ اس عورت سے قسم بھی لی جائے گی۔ ② امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی سے رضاعت کا حکم ثابت ہوجائے گا۔ ③ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ چار عورتوں کی گواہی سے رضاعت کا حکم ثابت ہوگا۔ ④ احناف کا مسلک یہ

ہے کہ دومردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواھی سے رضاعت کا حکم ثابت ہوگا جیسا کہ دوسرے احوال میں دومردوں کی گواہی معتبر ہے۔ احناف کہتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بندے کا حق متعلق ہوجاتا ہے۔مثلاً شادی کرنے سے بندے کا حق ثابت ہوگیا۔اسلئے نصاب شہادت ضروری ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔باب کی حدیث میں احناف۔مالکیہ۔اور شافعیہ تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ الکوکب الدری میں لکھا ہے کہ بعض احناف قبل الدخول اور بعد الدخول میں فرق کرتے ہیں۔کہ قبل الدخول ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہے۔اور بعد الدخول نصاب شہادت ضروری ہے۔اور باب کی حدیث قبل الدخول پر محمول ہے لیکن یہ جمہور احناف کا قول نہیں۔لہٰذا صحیح تر قول اور تاویل جو سب ائمہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ باب کی حدیث کا حکم احتیاط کی بنا پر تھا۔قضاء نہیں تھا۔دوسری تاویل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اگرچہ خبر دینے والی ایک عورت تھی۔لیکن آپکو بذریعہ وحی پتہ چل گیا تھا کہ ایک دوسرے کی رضاعی بہن بھائی ہیں۔

باب ماجاء ان الرضاعة لاتحرم الافی صغر

مسئلہ: حرمت رضاعت کا ثبوت کب تک ہوتا ہے۔احناف کے تین قول ہیں۔① ۔بچے کا جب دودھ چھڑایا جائے اور عام کھانا شروع کرے اگرچہ ایک سال ہوا ہو۔اسکے بعد حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔② ۔دوسال کے عرصہ میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوگی۔اس سے زیادہ مدت میں حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔یہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا قول ہے۔③ ۔اڑھائی سال کی مدت میں حرمت رضاعت ثابت ہوگی اس سے زیادہ مدت میں حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوگی، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔باب کی حدیث میں مدت کا ذکر نہیں۔اور حدیث میں فی الثدی سے مراد مدت رضاعت ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔کہ قرآن کریم میں مدت رضاعت اور مدت حمل تیس ماہ یعنی اڑھائی سال ذکر کی ہے کہ ﴿وحملہ وفصالہ ثلثون شہرا﴾ اور قاعدہ ہے کہ دونوں کے لئے ایک مدت کا ذکر ہو تو دونوں کیلئے پوری مدت ہوگی۔اسلئے مدت رضاعت تیس ماہ ہوگی۔

الافتق الامعاء: یعنی وہ دودھ غذا بنے۔اور یہ اسوقت ہوگا جب بچے نے دوسری غذا شروع نہ کی ہو۔

باب ماجاء فی الامة تعتق ولها زوج

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ اگر باندی آزاد ہو اور اسکا شوہر زندہ ہو تو اسکو اختیار ہوگا۔① امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ باندی کا شوہر آزاد ہو یا غلام ہر صورت میں باندی کو اختیار ہوگا۔امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر باندی کا شوہر آزاد ہو تو اسکو اختیار نہیں ملے گا۔اور اگر غلام ہو تو اختیار ملے گا۔اس مسئلہ میں بریرہ کی حدیث ہے۔اس حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کرنے والے تین شخص ہیں۔ہشام بن عروہ ان سے دونوں طرح روایات منقول ہیں کہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر آزاد تھا اور یہ بھی منقول ہے کہ انکا شوہر غلام تھا۔② حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دوسرے ناقل اسود ہیں یہ جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا شوہر آزاد تھا۔③ تیسرے ناقل قاسم بن عبدالرحمٰن ہیں۔ان سے بھی دونوں قسم کی احادیث مروی ہیں۔احناف کہتے ہیں کہ بریرہ کے شوہر کے متعلق تین قسم کی روایات ہیں جن میں ہشام اور قاسم بن عبدالرحمٰن کی روایات مضطرب ہیں اور اسود جزم کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔اسلئے یہ ثابت ہوگا کہ شوہر آزاد ہو پھر بھی اختیار ہوگا۔

الکوکب الدری میں لکھا ہے کہ یہ اختلاف ایک اور مسئلہ پر بنا ہے۔وہ یہ ہے کہ خیار کی علت کیا ہے؟ شوافع کے نزدیک علت عدم کفو ہے اور یہ شوہر کے غلامی کی صورت میں متحقق ہوگی احناف کے نزدیک علت ہے کہ باندی کا شوہر دو طلاق کا مالک

تھا، آزادی کے بعد تین طلاق کا مالک ہوگا کیونکہ احناف کے نزدیک طلاق کا تعلق عورتوں سے ہے۔ حدیث میں ہے طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان اس لئے احناف کے ہاں شوہر دو طلاق کا مالک ہوگا تو اب تین طلاق کا مالک بنانا عورت کا حق ہے چاہے وہ مالک بنائے یا نہ بنائے۔

ولو كان حرًا لم يخيرها یہ عروہ کا قول ہے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نہیں کیونکہ نسائی میں صراحت ہے قال عروة۔

باب ماجاء في الرجل يرى المرأة فتعجبه

مسئلہ: باب کی حدیث کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا وساوس میں پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انسان جب اجنبی عورت کو دیکھتا ہے تو وہ اسکو پسند آتی ہے اسکی شہوت بیدار ہوتی ہے تو اسکا گناہ میں واقع ہونے کا خطرہ ہے۔ اسلئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ اپنے گھر جا کر اپنی بیوی سے اپنی حاجت پوری کرے۔

الکوکب الدری میں باب کی حدیث پر اعتراض نقل کیا ہے کہ آپ تو گناہوں سے معصوم تھے اور آپ ہر لحاظ سے کامل تھے تو آپ کو یہ ضرورت کیونکر پیش آئی؟ جواب: جب انسان اس حاجت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسکی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) کہ انسان محل حرام میں اپنی شہوت کو پورا کرے۔ یہ صورت بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔ (۲) انسان اپنی شہوت کو محل حلال میں پورا کرے یہ بالاتفاق جائز ہے۔ (۳) اپنی شہوت پورا کرنے کا ارادہ ہو محل حلال میں اور حرام کی تقیید نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ آپ کو جو صورت پیش آئی تھی، وہ پہلی صورت نہیں تھی۔ بلکہ محل حلال میں شہوت پوری کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی اور یہ مقام نبوت کی منافی نہیں۔

باب ماجاء في حق الزوج على المرأة

مسئلہ: مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ ان میں سے بعض حقوق عامہ کہلاتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حق المسلم على المسلم خمس اور بعض حقوق خاصہ کہلاتے ہیں، یعنی جو کسی نسبت کی وجہ سے ہوتے ہیں، اگر وہ نسبت ہو تو وہ حق ثابت ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ جیسے حق جوار۔ اسی طرح بعض حقوق رشتہ داری کی وجہ سے ثابت ہوتے ہیں جیسے حقوق الوالدین اور حقوق الزوجین، چنانچہ یہاں حق الزوج علی المرأة کا ذکر ہے۔ باب کی پہلی حدیث سے شوہر کے حق کی اہمیت ثابت ہے۔

فلتأته وان كانت على التنور: اس جملہ کے متعلق تین باتیں ہیں۔ (۱) الکوکب الدری میں ہے کہ جب عورت تنور پر روٹی پکار ہی ہو اور اس وقت اسکو اسکا شوہر بلا رہا ہو، اب اگر یہ عورت شوہر کی اطاعت کرتی ہے تو تنور پر لگی ہوئی روٹیاں ضائع ہونگیں، اور اگر شوہر کے بلانے پر نہ جائے تو شوہر کا حق ضائع ہوگا، تو اب شریعت میں اھون البلیتین کا حکم ہے کہ عورت کو روٹی کے ضائع ہونے کا خیال نہیں رکھنا چاہئے بلکہ عورت کو شوہر کے بلانے پر جانا چاہئے۔ (۲) بعض نے کہا ہے کہ اس جملے کا معنی ہے کہ عورت کا شوہر کے بلانے پر جانا چاہئے، اگرچہ عورت پر اتنی مشقت ہو جتنا کہ تنور کے پاس روٹی پکانے کے وقت ہوتی ہے۔ (۳) ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرقاۃ میں ابن الملک کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ شوہر کے بلانے پر جانے کا حکم اس وقت ہے جبکہ شوہر کا مال ہو، اگر شوہر کا مال نہ ہو تو اسکو چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے۔

باب ماجاء في كراهية ان تسافر المرأة وحدها

مسئلہ: اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سفر جس میں قصر کرنا جائز ہے عورت کیلئے وہ سفر بغیر محرم کے کرنا جائز نہیں، چاہے خوف فتنہ ہو یا نہ ہو۔ اور وہ سفر جس میں قصر کرنا جائز نہیں وہ سفر عورت ضرورت کے تحت کر سکتی ہے بشرطیکہ خوف فتنہ نہ ہو۔ اگر فتنے کا خوف ہو تو یہ سفر بھی محرم کے بغیر جائز نہیں۔ حج کا سفر عورت کیلئے بغیر محرم کے احناف کے ہاں اور جمہور کے ہاں جائز نہیں۔ احناف کے نزدیک عورت کے لئے محرم کا ہونا استطاعت سبیل میں شامل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر راستہ محفوظ ہو تو ایسے قافلے میں نکلنا جائز ہے جس میں بوڑھی عورتیں ہوں لیکن احناف عمومی احادیث کی وجہ سے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاتِ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

ابواب الطلاق واللعان

باب ماجاء في طلاق السنة

مسئلہ: ہماری فقہ کی کتابوں مثلاً ہدایہ وغیرہ میں لکھا کہ طلاق کی تین قسمیں ہیں: ① ۔طلاق احسن ② ۔طلاق حسن ③ ۔طلاق بدعی۔

❶ طلاق احسن یہ ہے کہ انسان ایسے طہر میں اطلاق دے جسمیں جماع نہ کیا ہو۔اور پھر عورت کو چھوڑ دے۔ یہاں تک کہ وہ عدت گزار دے تو اس کو طلاق سنت کہتے ہیں۔

❷ طلاق حسن یہ ہے کہ انسان ہر طہر میں ایک ایک طلاق دے۔

❸ طلاق بدعی یہ ہے کہ انسان حالت حیض میں یا اکٹھی ایک ساتھ تین طلاق دے، حالت حیض میں اگر چہ طلاق ممنوع ہے لیکن اسکے باوجود اگر کسی نے حالت حیض میں طلاق دے دی تو واقع ہو جائیگی، اسی طرح بیک وقت تین طلاق دینا بھی ممنوع ہیں لیکن ایسا کرنے سے طلاق واقع ہو جائیں گی۔ بخاری شریف کی حدیث میں فتغیر وجه رسول الله ﷺ کے الفاظ ہیں۔محدثین کہتے ہیں کہ آپکا غصہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس حالت میں طلاق دینا حرام ہے لیکن اسکے باوجود طلاق واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ اسکے بعد "ان یر اجعھا" کے الفاظ ہیں۔

باب ماجاء فی الرجل يطلق امرأة البتة

مسئلہ: اگر کسی شخص نے طلاق کو البتہ کی قید کے ساتھ مقید کیا۔تو اس صورت میں ایک طلاق واقع ہوگی یا دو یا تین یا یہ کہ آدمی کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ اسمیں اختلاف ہے۔ ① عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے طلاق البتہ کو ایک قرار دیا۔ ② حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسکو تین طلاقیں قرار دیا۔ ③ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ آدمی کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ جتنی طلاقوں کی نیت کی ہوگی اتنی ہی واقع ہونگی۔باب کی حدیث قول ثالث کے قائلین کا مستدل ہے۔اب شوافع اور احناف کا اسپر اتفاق ہے کہ آدمی کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ دو کی نیت میں اختلاف ہے۔شوافع کے نزدیک دو کی نیت کرے تو وہ واقع ہونگی۔ جبکہ احناف کے نزدیک اگر دو کی نیت کرے تو تین واقع ہوگی۔ کیونکہ مصدر جمع (تین) یا مفرد پر تو دلالت کرتا ہے، دو پر نہیں کرتا۔

باب ماجاء فی امرک بیدک

مسئلہ: باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے امرک بیدک کہے، تو اسکو کتنی طلاق کا اختیار ہوگا؟ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ ① حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں عورت کو ایک طلاق کا اختیار ہوگا۔ ایک سے زیادہ کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔اس قول کو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہاء کوفہ نے اختیار کیا ہے۔ ② حضرت عثمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ القضاء ماقضت مطلب یہ ہے کہ معاملہ عورت کے اختیار میں ہے جتنی وہ واقع کرنا چاہے واقع ہونگی۔ اسی قول کو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے۔امام اسحٰق کا بھی یہی قول ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اگر شوہر انکار کردے تو اس کا قول مع الیمین معتبر ہوگا۔احناف کے ہاں ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔ ③ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

کہ اگر عورت نے تین طلاقیں واقع کردیں اور شوہر انکار کرتا ہے کہ میرا ارادہ تین طلاق کا نہیں تھا بلکہ میرا ارادہ ایک طلاق کا تھا۔ تو اس صورت میں شوہر کا قول مع الیمین معتبر ہوگا۔

باب ماجاء فی الخیار

مسئلہ: ① حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر عورت نے اپنے شوہر کو اختیار کیا تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی اور اگر عورت نے اپنے آپ کو اختیار کیا تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔ ② انہی حضرات سے دوسرا قول یہ ہے کہ اگر عورت نے اپنے آپ کو اختیار کیا تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اس قول کو جمہور فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ ③ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر عورت نے اپنے شوہر کو اختیار کیا تو ایک طلاق واقع ہوگی۔ اور اگر اپنے آپ کو اختیار کیا تو تین طلاقیں واقع ہونگی۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں اکثر ائمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ باب کی حدیث سے جمہور کی تائید ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی المطلقة ثلاثاً لاسکنیٰ لها و لانفقة

مسئلہ: یہاں پر مسئلہ یہ ہے کہ وہ عورت جسکو شوہر نے تین طلاقیں دیدی تو جب یہ عورت عدت گزارے گی تو اس کے لئے نفقہ اور سکنیٰ ہوگا یا نہیں؟ اسمیں ائمہ مجتہدین کے تین قول ہیں۔ ① امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ عدت کے زمانے میں عورت کے لئے نفقہ بھی ہوگا اور سکنیٰ بھی ہوگا۔ ② امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس عورت کیلئے سکنیٰ تو ہوگا لیکن نفقہ نہیں ہوگا۔ ③ امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سکنیٰ اور نفقہ دونوں نہیں ہونگے۔

قول ثالث کے قائلین باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نفقہ کیلئے تو باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور سکنیٰ کے لئے قرآن کریم کی آیت ﴿لاتخرجو هن من بيوتهن ولا يخرجن الا ان ياتين بفاحشة مبينة﴾ سے استدلال کرتے ہیں۔ احناف ایک تو قرآن کریم کی آیات (اسکنوهن من حيث سكنتم) اور ﴿ولا تخرجوهن من بيوتهن﴾ سے سکنیٰ کیلئے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب فاطمہ بنت قیس کی حدیث ذکر کی گئی تو انہوں نے فرمایا "لاندع كتاب ربنا ولاسنة نبينا صلی اللہ علیہ وسلم بقول امرأة لاندری أحفظت ام نسيت فكان عمر يجعل لها السكنیٰ و النفقة"۔

سنن ابن ماجہ میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لها النفقة والسكنیٰ باقی فاطمہ بنت قیس کو سکنیٰ سے اسلئے محروم کیا تھا کہ وہ زوج کے گھر والوں سے لڑتی تھی۔

باب ماجاء فی لاطلاق بعد النكاح

مسئلہ: باب کی حدیث تین جملوں پر مشتمل ہے۔ ① انسان کی نذر اس چیز میں منعقد نہیں ہوتی جسکا انسان مالک نہ ہو۔ ② جس غلام کا انسان مالک نہ ہو اس کی عتق کا کوئی اعتبار نہیں۔ ③ جس عورت کی عصمت کا انسان مالک نہ ہو اسکی طلاق کا اعتبار نہیں۔ بعض فقہاء اور محدثین باب کی حدیث کو ایک مسئلہ میں احناف کے خلاف مانتے ہیں۔ اور بحث کرتے ہیں کہ وہ شخص جس نے تعلیق الطلاق کی کہ اگر میں نے فلاں عورت سے نکاح کیا تو اس کو طلاق۔ یا تعلیق بالعتق کی کہ اگر میں فلاں کا غلام خریدوں تو وہ آزاد ہے تو یہ تعلیق صحیح ہے یا نہیں؟ تو احناف کے نزدیک یہ تعلیق صحیح ہے، عورت سے نکاح کرنے کے بعد طلاق واقع ہوجائے گی اور غلام کا مالک بن

جانے کے بعد عتق واقع ہو جائیگا شوافع کے نزدیک طلاق اور عتق کی تعلیق صحیح نہیں۔ اور باب کی حدیث انکا مستدل ہے۔ احناف باب کی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہاں طلاق تنجیزی اور عتق تنجیزی مراد ہے۔ اگر فی الفور طلاق اور عتق واقع کرنا چاہتا ہے تو اسکے لئے ملک ضروری ہے۔ باقی تعلیق کی صورت کا باب کی حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ اس صورت کا جواز عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے الگ ثابت ہے۔

باب ماجاء ان طلاق الامة تطليقان

مسئلہ: یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے کہ طلاق کا تعلق مرد کے ساتھ ہوتا ہے یا عورت کے ساتھ۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ طلاق کے وقوع کا اختیار مرد کو ہوتا ہے۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے الطلاق لمن اخذ بالساق امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ طلاق کا تعلق عورت کے ساتھ ہوتا ہے، اگر عورت آزاد ہے تو مرد کو تین طلاق کا حق ہوگا، اور اگر عورت باندی ہے تو مرد دو طلاق کا مالک ہوگا اور اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اصل میں طلاق اور حیض آدھے ہونے چاہیں لیکن ڈیڑھ طلاق اور ڈیڑھ حیض نہیں ہوتا ہے، اسلئے دو طلاق اور دو حیض ہونگے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک قرار دیا ہے لیکن شوافع کے نزدیک طلاق کا تعلق مرد سے ہے، اگر مرد غلام ہے تو دو طلاق کا مالک ہوگا اور اگر آزاد ہے تو تین کا مالک ہوگا۔ احناف باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور سنن ابن ماجہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان اگر چہ اسپر سنداً کلام ہے اور باب کی حدیث پر بھی مظاہر بن اسلم کی وجہ سے کلام ہے لیکن تعدد طرق کی وجہ سے یہ قابل استدلال ہے۔

باب ماجاء فی الخلع

خلع کی تعریف: "تفريق الرجل امرأته بالعوض" خلع اور طلاق بالمال میں فرق یہ ہے کہ طلاق بالمال میں طلاق کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور خلع میں طلاق کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے لیکن دونوں کے حکم میں فرق نہیں۔ جتنا مہر مرد نے عورت کو دیا تھا اتنے پر خلع کرنا صحیح ہے اور اس سے کم پر بھی خلع کرنا صحیح ہے۔ اس سے زائد پر خلع کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تو شوافع وغیرہ کے نزدیک جائز نہیں۔ احناف کے نزدیک جائز تو ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ اب یہ خلع فسخ ہے۔ یا طلاق؟ تو احناف کے نزدیک خلع فسخ نہیں بلکہ طلاق بائن واقع ہوگی اور عدت بھی پوری ہوگی کہ حیض والی کی تین حیض عدت ہوگی، اگر آئسہ ہے تو تین مہینے عدت ہوگی، اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل عدت ہوگی۔

ان تعتد بحيضة کے متعلق الکوکب الدری میں لکھا ہے کہ یہ تاء وحدت کی نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ عدت بالحیض گزارے۔ اب کہ جہاں پر صراحۃً واحدۃً کا لفظ ہے تو وہاں یہ تاویل نہیں چل سکتی۔ تو پھر جمہور اسکو منسوخ مانتے ہیں۔

عدة المختلعة حيضة شوافع کے نزدیک خلع فسخ ہے تو استبراء رحم میں ایک حیض کافی ہے۔

باب ماجاء فی عدة المتوفى عنها زوجها

مسئلہ: متوفی عنہا زوجہا کی دو حالتیں ہیں۔ ① حاملہ ہو تو جمہور کے نزدیک اس کی عدت وضع حمل ہے چاہے وہ چار ماہ دس دن سے پہلے ہو یا بعد میں ہو۔ بعض صحابہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک قول کے مطابق ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ ابعد الاجلین کے قائل تھے۔ مطلب یہ ہے۔ اگر وضع حمل چار ماہ دس دن سے پہلے ہو تو عدت چار ماہ دس دن ہوگی اور اگر وضع حمل چار ماہ دس دن کے بعد ہو تو عدت وضع حمل ہوگی۔ جمہور فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت ﴿والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجاً

یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشراً ﴾ پہلے نازل ہوئی تھی۔اور ﴿ واُولات الاحمال اجلھن أن یضعن حملھن ﴾ یہ بعد میں نازل ہوئی۔لہٰذا یہ بعد والی آیت پہلے والی آیت کے لئے ناسخ ہے۔ ② دوسری صورت یہ ہے کہ متوفی عنہا زوجہا حاملہ نہ ہو تو اسکی عدت چار ماہ دس دن ہوگی، کیوں کہ قرآن کریم کی آیت ہے ﴿ والذین یتوفون منکم ﴾

باب ماجاء فی المظاهر یواقع قبل ان یکفر

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظہار کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے محرمات سے کسی عضو کے ساتھ مشابہ کردے۔جیسے أنت علی کظھر امی. احناف کے نزدیک محرمات میں کسی کے عضو کے ساتھ ظہار واقع ہوتا ہے۔جبکہ شوافع کے نزدیک فقط ماں کے ساتھ مشابہ کرنے سے ظہار واقع ہوتا ہے۔دوسرا یہ کہ کسی عضو کے ساتھ تشبیہ سے تو احناف کے ہاں ظہار واقع ہوجائیگا۔جبکہ شوافع کے نزدیک صرف ظہر کے ساتھ مشابہ کرنے سے ظہار واقع ہوگا۔اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ ظہار کیا تو اب جب تک کفارہ ادا نہ کرے اپنی بیوی کے پاس جانا حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص کفارہ ظہار ادا کرنے سے قبل اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تو اس پر ایک کفارہ ہوگا یا دو کفارے ہونگے؟۔جمہور کے نزدیک اسپر ایک کفارہ ہوگا۔اور امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن مھدی کے نزدیک دو کفارے ہونگے۔ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین کفارے ہونگے۔باب کی حدیث احناف کا مستدل ہے۔

باب ماجاء فی کفارة الظهار

کفارہ ظہار کے متعلق سب سے پہلے یہ ہے کہ غلام آزاد کرے [illegible] اختلاف ہے۔احناف کے ہاں اسکے لئے مؤمنہ ہونا شرط نہیں جبکہ شوافع وغیرہ کے نزدیک کفارہ قتل پر قیاس کرتے ہوئے رقبہ مؤمنہ شرط ہے۔اگر غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے۔اور اگر روزے رکھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کا کھانا کھلادے۔اب اس کے متعلق دو باتوں میں اختلاف ہے۔

① شوافع کے نزدیک ساٹھ الگ الگ آدمیوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔جبکہ احناف کے نزدیک ایک آدمی کو بھی ساٹھ مرتبہ کھلا سکتے ہیں۔
② شوافع کے نزدیک اس کی مقدار ایک مد ہے احناف کے نزدیک گندم میں ایک صاع اور گندم کے علاوہ میں نصف صاع۔

باب ماجاء فی الایلاء

ایلاء کی تعریف: ایلاء کی تعریف یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے بارے میں قسم اٹھائے کہ میں چار ماہ اسکے قریب نہیں جاؤں گا۔اب اگر کسی نے اپنی بیوی سے چار مہینے کا ایلاء کیا۔اور چار ماہ گزر گئے تو اب کیا حکم ہے۔تو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب توقف کریگا۔یا تو کفارہ ادا کرکے رجوع کرے یا چاہے تو طلاق دیدے۔امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ فرماتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے بعد ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔یہ قول حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔اب یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو آتا ہے کہ آپ نے اپنی بیویوں سے ایلا کیا تھا۔تو وہ شرعی ایلاء نہیں تھا بلکہ لغوی ایلاء (ایک ماہ کا) تھا۔اسکی وجہ یہ تھی کہ آپ نے حضرت حفصہ کو کوئی راز کی بات بتلائی تھی۔تو جب انہوں نے اس کا افشاء کردیا، تو آپ نے سب بیویوں سے تادیباً ایلاء کیا۔یا مغافر کا قصہ ہے کہ آپ نے کسی

بیوی کو بتایا تھا تو اس نے اس کا افشاء کر دیا۔ تو اس پر آپ نے ان سے ایلاء کیا۔ یا آپ نے ماریہ قبطیہ سے عدم قربان کی قسم کھائی تھی۔

باب ماجاء فی اللعان

لعان لعن سے ہے طرد کے معنی میں ہے، یعنی کسی چیز کو دور کرنا۔ لعان اسلئے کہتے ہیں کہ اس میں اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا ہوتی ہے۔ لعان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگا دے یا بچے کی نسبت کا اپنی طرف سے انکار کر دے تو اپنی بیوی سے لعان کرنا پڑتا ہے۔ لعان کا طریقہ وہی ہے جو قرآن کریم کے سورت نور کے پہلے رکوع میں مذکور ہے۔ اختلاف اسمیں ہے کہ لعان کے بعد خود بخود تفریق واقع ہوگی یا قاضی کی تفریق کی ضرورت ہوگی۔ احناف کے ہاں لعان کے بعد تفریق قاضی کی ضرورت ہوگی کمافی حدیث الباب امام زفر رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خود بخود تفریق ہو جائے گی۔ قاضی کی تفریق کی ضرورت نہیں۔ مفترش بروعہ۔ زمین کو فراش بنائے ہوئے تھے۔

ابواب البیوع

باب ماجاء فی ترک الشبہات

بیوع بیع کی جمع ہے۔ بیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی کو کہتے ہیں۔ باب کی حدیث دین کی احکام کے بارے میں وہ حدیث ہے جس پر دین کا مدار ہے۔ جیسے کہ **انما الاعمال بالنیات** پر دین کا مدار ہے۔ **الحلال بیّن والحرام بیّن**۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ قرآن واحادیث میں کسی چیز کی حلت وحرمت کا صراحۃً بیان ہوگا۔ اگر ان میں نہ ہو تو بھی ائمہ مجتہدین نے اسکی حلت یا حرمت بیان کی ہوگی۔ لیکن بہت سارے احکام نصوص میں نہیں۔ اور ائمہ مجتہدین کے زمانے میں بھی انکا تقاضا نہیں تھا۔ لیکن ائمہ مجتہدین نے جو قواعد کلیہ بیان کئے ہیں۔ اُنہیں اسکا حکم موجود ہوتا ہے۔ بہت سارے لوگ اس کے بارے میں نہیں جانتے کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اب وہ امور چار قسم کے ہیں ① کسی چیز کی دلیل واضح بھی ہے اور اقرب الحلال بھی ہے تو یہ حلال ہوگا۔ ② اور اگر دلیل واضح ہے اور اقرب الحرام ہے تو وہ چیز حرام ہے۔ ③ دلیل حرمت بھی نہ ہو اور دلیل حلت بھی نہ ہو تو وہ امر مباح ہے۔ ④ جہاں حلت اور حرمت کی دلیل میں تعارض ہو تو یہ امور مشتبہ ہیں۔

باب ماجاء فی اکل الربوا

ربوا کی تعریف: ربوا فقہاء کی اصطلاح میں اس زیادتی کو کہتے ہیں جو بغیر معاوضہ کے ہو۔ زمانہ جاہلیت میں ربوا نسیہ اور ربوا اضعافا مضاعفۃ دونوں جاری تھیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں "**احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا**" کے ذریعے حرام قرار دیا۔ باب کی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے چار آدمیوں پر لعنت فرمائی ① آکل الربوا ② موکلہ ③ شاہداہ ④ کاتبہ۔

الکوکب الدری میں منقول ہے کہ جیسے ان کے حکم میں تفاوت ہے ویسے وعید میں بھی فرق ہے۔ مثلاً آکل الربوا کیلئے زیادہ لعنت ہوگی۔ اور شاہد یہ پر کم لعنت ہوگی اور کاتب پر اس سے بھی کم ہوگی۔

سماسرہ: یہ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بیع وشرا کرتا ہو، آپ ﷺ نے انکو تجار کے نام سے موسوم کیا۔

فشوبوا بیعکم بالصدقة: مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان گناہ سے بچنے کی کوشش کرے مطلب یہ نہیں کہ گناہ کر کے صدقہ کرو ہاں اگر بیع کے بعد تمہیں گناہ کا شبہ ہو تو صدقہ کرو۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشراء الی الاجل

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ کسی وقت مقرر تک کوئی چیز ادھار خریدنا جائز ہے۔ اسکی تین صورتیں ہیں۔ دو جائز ہیں اور ایک ناجائز ہے۔ ① بائع اور مشتری نے ایجاب اور قبول کرلیا لیکن قیمت کے موجل یا معجّل ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ تو اسکا حکم یہ ہے کہ قیمت فی الفور واجب ہے۔ ② لیکن اگر مشتری نے بیع کے بعد کہا کہ میں پیسے بعد میں دونگا۔ تو اس صورت میں اجل معین ہو یا غیر معین ہو دونوں صورتوں میں بیع صحیح ہوگی۔ اسلئے کہ عقد کے ضمن میں یہ بات نہیں تھی، اب اجل کو معین کرنا یا غیر معین کرنا بائع کا احسان ہے۔ اسلئے بیع پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ ③ بیع کے ضمن میں اجل کی بات کرے تو اس صورت میں اگر اجل معین ہے تو بیع صحیح ہے اور اگر اجل غیر معین ہے تو بیع فاسد ہوگی۔

اهاله سخنة: بدبودار چربی۔

ماجاء فی بیع من یزید

بیع من یزید وہی ہے جسکو آجکل بولی کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص کوئی چیز بیچتا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں بیس روپے میں لیتا ہوں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں تیس میں لیتا ہوں تیسرا کہتا ہے کہ میں چالیس میں لیتا ہوں۔ تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسمیں ائمہ مجتہدین کے تین قول ہیں۔ ① ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناجائز ہے۔ ② امام اوزاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ، ابن ابی رباح کے نزدیک مال میراث اور مغانم میں بیع من یزید جائز ہے۔ باقی میں ناجائز ہے۔ ③ جمہور فقہاء اور محدثین ائمہ اربعہ کے نزدیک بیع من یزید مطلقاً جائز ہے۔ بیع کا حکم ہر صورت میں ایک ہی ہے۔ باقی ایک حدیث میں جو آتا ہے لایسوم احدکم علی سوم اخیه تو جمہور اسکے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت اس وقت ہے کہ جب بائع اور مشتری آپس میں بیع پر راضی ہوگئے ہوں۔ تو تیسرا آدمی آکر اسکی بیع کو خراب نہ کرے اور بیع من یزید میں یہ صورت نہیں۔

باب ماجاء فی بیع المدبر

مسئلہ: باب کی حدیث سے مدبر غلام کی بیع کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مدبر کی تعریف یہ ہے کہ مولی اپنے غلام سے کہے کہ تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے۔ اب مدبر کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ تو مدبر کی دو قسمیں ہیں مدبر مطلق۔ مدبر مقید۔ ① مدبر مقید یہ ہے کہ مولیٰ کہے کہ اگر میں اس مرض سے فوت ہوگیا تو تو آزاد ہے اس کی بیع بالاتفاق جائز ہے۔ ② مدبر مطلق یہ ہے کہ مولیٰ کہے کہ تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے۔ اب اسکو مولیٰ فروخت کرسکتا ہے یا نہیں۔ اور مولیٰ کی موت کے بعد اسکو کوئی فروخت کرسکتا ہے یا نہیں۔ تو امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدبر مطلق کی بیع جائز ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ، امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدبر مطلق کی بیع جائز نہیں۔ کیونکہ احادیث میں مدبر کی بیع کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ باقی باب کی حدیث کو احناف اور مالکیہ مدبر مقید پر محمول کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة تلقی البیوع

مسئلہ: تلقی البیوع کی تعریف یہ ہے کہ مثلاً شہر سے باہر کوئی تجارت کے مال کا قافلہ آرہا تھا۔ تو شہر کے تاجروں نے سوچا کہ اگر قافلہ شہر

میں آ کر خود فروخت کریں گے تو شہری لوگ اس سے سستے داموں خرید لیں گے۔ تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ تاجر شہر سے باہر جا کر قافلہ والوں سے مال خریدتے ہیں۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔

① تاجر شہر سے باہر جا کر قافلہ والوں سے شہر کے نرخ کے مطابق خریدتے ہیں اور ان سے کوئی دھوکہ نہیں کرتے تو احناف اور جمہور کے نزدیک اس صورت میں کوئی کراھیت نہیں۔ ② تاجروں نے جا کر قافلہ والوں کو دھوکہ دیا کہ تمہارا یہ مال شہر میں نہیں بکے گا۔ یا یہ کہ بک تو جائیگا لیکن سستا بکے گا، تم ہمیں مہنگا دے دو۔ تو سب ائمہ کے نزدیک یہ صورت ممنوع اور ناجائز ہے۔ باب کی حدیث کا مصداق بھی یہی دوسری صورت ہے۔ اب جب قافلہ والے شہر میں آئے تو معلوم ہوا کہ انکے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ تو باب کی حدیث میں ہے کہ مالک کو اختیار ہے۔ احناف کے نزدیک دو صورتیں ہیں۔ ① بیع کے وقت حق خیار رکھ چکا ہے۔ ② بیع کے وقت شرط نہیں لگائی تھی لیکن قاضی کے پاس جا کر دھوکہ کو ثابت کیا۔ تو ان دو صورتوں میں قاضی بیع کو فسخ کر دیگا۔

باب ماجاء فی النهی عن المحاقلة والمزابنة

مسئلہ: بیع المحاقلہ کی تعریف یہ ہے کہ بیع الزرع بالحنطۃ کہ ایک طرف تیار غلہ ہے اور دوسری طرف خوشوں میں غلہ کھڑا ہے۔ تو ان دونوں کی آپس میں بیع جائز ہے یا نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے اسکی ممانعت فرمائی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ مجہول کی بیع ہے جو کہ ناجائز ہے۔ اور بیع مزابنہ کی تعریف یہ ہے کہ ایک طرف تیار پھل یا کھجور ہو تو اسکو اس پھل یا کھجور کے بدلے میں بیچتا ہے جو ابھی درخت پر موجود ہے۔ تو یہ بھی ممنوع قرار دی گئی۔ اسکی ممانعت کی ایک علت تو یہ ہے کہ یہ مجہول کی بیع ہے اور دوسری علت یہ ہے کہ یہ جنس واحد ہے اور واحد کی بیع مثلاً بمثل اور یداً بید ہونی چاہیئے اور یہاں ایسا نہیں السلت: بمعنی جو، اسکو پیغمبری جو کہتے ہیں۔

باب کراهية بيع الثمر قبل ان يبدی صلاحها

مسئلہ: بیع ثمر بدو صلاح سے پہلے سب کے نزدیک ممنوع ہے۔ اسکی تعریف میں اختلاف ہے۔ ① امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسکی تعریف یہ ہے کہ جب تک وہ انسانوں کے کھانے کے قابل نہ ہو۔ ② احناف کے نزدیک اسکی تعریف یہ ہے کہ جب تک وہ استعمال کے قابل نہ ہو۔ خواہ وہ انسانوں یا جانوروں کے کھانے کے قابل نہ ہو۔ لیکن پھل پکنے کے بعد اسکی بیع جائز ہے۔ یہ بیع تب جائز ہے جبکہ مشتری نے درخت پر رہنے کی شرط نہ لگائی ہو۔ اگر مشتری نے یہ شرط لگائی ہو تو بیع ناجائز ہوگی۔

باب ماجاء فی کراهية بيع الغرر

مسئلہ: اس باب کی حدیث میں دو قسم کے بیوع کا ذکر ہے جو کہ زمانہ جاہلیت میں جاری تھیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیع غرر کی صورت یہ منقول ہے کہ مچھلی کی بیع کرنا جبکہ وہ پانی میں ہو۔ اسی طرح بھاگے ہوئے غلام کی بیع کرنا اور فضا میں اڑتے ہوئے پرندے کی بیع کرنا۔

② بیع الحصاۃ اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ بائع مشتری کو کہدے کہ جس چیز پر میں کنکری پھینک دوں گا وہ مبیعہ بن جائے گی۔ تیسری صورت یہ ہے کہ بائع مشتری کو کہتا ہے کہ میں کنکری پھینکتا ہوں جہاں تک یہ کنکری پہنچ گئی۔ وہاں تک یہ زمین مبیعہ ہوگی۔ یہ تمام صورتیں دھوکے کی وجہ سے اور مبیع ملک میں نہ ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔

باب ماجاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة

مسئلہ: ایک بیع میں دو بیع کرنا منع ہے۔ امام ترمذی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ نے اسکی صورت یہ ذکر کی ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں تمہیں یہ چیز فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ تم مجھے اپنی فلاں چیز فروخت کرو۔ ② دوسری صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہتا ہے کہ میں تم پر یہ چیز نقد دس روپے میں اور ادھار میں بیس روپے میں فروخت کرتا ہوں۔ اب اسمیں نقد یا ادھار کو متعین کئے بغیر بیع کرنا ناجائز ہے۔ ان دونوں صورتوں کو زیادہ الثمن لزیادۃ الاجل کہتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں۔ احناف کا صحیح تر قول یہ ہے کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں زیادتی جائز ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں ہماری فقہ کی کتابوں مثلاً ہدایہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ۔ الاتری یزاد فی الثمن للاجل۔ باب کی صورت مجہول ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔ ہاں اگر مشتری کہتا ہے میں ادھار اس قیمت سے خریدتا ہوں اور بائع کہدے کہ اسکی اصل قیمت تو یہ ہے لیکن ادھار کی وجہ سے اسکی قیمت یہ ہوگی اور مشتری بھی راضی ہو تو یہ بیع جائز ہے۔

باب ماجاء فی شراء العبد بالعبدین

مسئلہ: باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام کو دو غلاموں کے بدلے خریدنا جائز ہے۔ لیکن احناف باب کی حدیث میں تاویل کرتے ہیں کہ یہ حقیقۃً بیع کی صورت نہیں تھی بلکہ وہ مسلمان ہوا تھا اور کافر کا غلام تھا۔ اور حقیقۃً آزاد کے حکم میں تھا۔ اسلئے آپ نے دو غلاموں کے بدلے میں لیا تو یہ صورۃً بیع تھی۔ اسکی تاویل یہ کی ہے کہ اسکا مفہوم یہ نہیں تھا کہ ایک غلام کے بدلے دو غلاموں کی بیع ہوئی۔ بلکہ مقصود یہ تھا کہ مسلمان غلام کو اسکی ملکیت سے آزاد کر کے دو غلام اسکی ملکیت میں دیدیئے۔ اس صورت میں یہ صورۃً بیع ہے۔ امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کے نزدیک ایک غلام کو دو غلاموں کے بدلے میں خریدنا جائز ہے۔ اور یہ باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

باب ماجاء البیعان بالخیار مالم یتفرقا

مسئلہ: باب کی حدیث میں مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ کہ بائع اور مشتری نے ایجاب اور قبول کر لیا۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوا۔ تو ان دونوں میں سے کسی کو بیع کے فسخ کا اختیار ہوگا یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی ایک کے لئے خیار متعین نہ ہو۔ تو کسی کو بیع کے فسخ کا اختیار نہ ہوگا۔ خواہ دونوں ایک ہی مجلس میں بیٹھے ہوں۔ امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ کسی ایک کے لئے خیار متعین ہو یا نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں بیع کے فسخ کا اختیار ہوگا۔ امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں ولم یتفرقا سے تفرق بالابدان مراد ہے۔ امام مالک کا مذہب بھی احناف کی طرح ہے۔ احناف کے ہاں کوئی صریح حدیث تو نہیں۔ لیکن بیع وشراء کا جو قانون ہے کہ بیع ایجاب اور قبول کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسلئے احناف کے ہاں ایجاب اور قبول سے بیع تام ہو جاتی ہے۔ اسلئے بیع کے فسخ کا کسی کو اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ باقی باب کی حدیث کے متعلق احناف کہتے ہیں۔ کہ اسمیں مالم یتفرقا سے تفرق بالاقوال مراد ہے نہ کہ تفرق بالابدان۔

باب فیمن یخدع فی البیع

مسئلہ: مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو بیع میں دھوکہ لگتا ہے تو اسکا حکم کیا ہے؟۔ باب کی حدیث میں ایک صحابی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ کا ذکر ہے۔ کہ اسکو دھوکہ لگتا تھا۔ اسکی صورت یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے یہ سمجھ کر کہ یہ چیز مجھے سو روپے میں ملی ہے۔ اب اس نے ڈیڑھ سو روپے

میں بیع کرلی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے پچاس روپے کمالئے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میں نے پچاس روپے نقصان کرلیا۔ تو اب اگر آدمی آزاد عاقل بالغ ہو تو کیا اسپر بیع کی پابندی لگائی جاسکتی ہے یا نہیں ۔ باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیع کی پابندی لگانا جائز ہے ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور فرماتے ہیں کہ آزاد عاقل بالغ پر پابندی لگانا جائز نہیں ۔ باب کی حدیث کے متعلق احناف، شوافع اور جمہور فرماتے ہیں کہ آپ نے پابندی اس صحابی پر نہیں لگائی تھی یہ گھر والوں کا اپنا خیال تھا کہ پابندی لگانا جائز ہے ۔ اب اگر کسی کو بیع میں دھوکہ پڑتا ہے اور بعد میں معلوم ہوتا ہے تو اب اسکو خیار ہوگا یا نہیں؟ احناف اور جمہور کے ہاں خیار نہیں ہوگا ۔ ہاں اگر خیا کا شرط رکھ چکا ہو تو پھر خیار ہوگا ۔

باب ماجاء فی المصراة

مسئلہ: اگر کسی نے بکری ۔ اونٹ یا گائے بیچنے کا ارادہ کیا ۔ اور دو تین دن تک اسکا دودھ نہیں نکالا تاکہ مشتری دیکھ کر سمجھے کہ اسکا دودھ زیادہ ہے ۔ اور مشتری نے اسکو خرید لیا ۔ اب مشتری کو پہلی مرتبہ دودھ زیادہ ملا ۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ اسکا دودھ تو کم ہے ۔ تو اب مشتری کو اختیار ہوگا یا نہیں ۔ اور مشتری اگر جانور واپس کریگا ۔ تو کس کیفیت کے ساتھ واپس کریگا ۔ تو باب کی حدیث میں ایک تو "فھو بالخیار" کے الفاظ ہیں ۔ اور دوسرا یہ کہ جب واپس کریگا ۔ تو ایک صاع کھجور اس جانور کے ساتھ بائع کو دے گا ۔ اور یہ صاع کھجور مشتری کے استعمال شدہ دودھ کا بدلہ ہے ۔ اب اس میں اختلاف ہے ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ اس صورت میں خیار نہیں ہوگا ۔ الا یہ کہ مشتری نے بیع کے وقت خیار کی شرط لگائی ہو اور جب واپس کریگا ۔ تو ایک صاع کھجور بھی دینا ضروری نہیں ۔ اس بارے میں احناف کے پاس کوئی مخصوص دلیل تو نہیں ۔ لیکن حدیث میں ایک قاعدہ عامہ ہے کہ الغرم بالغنم کہ جس چیز کا جتنا فائدہ اٹھایا ہے اتنا نقصان بھی اٹھانا ہوگا ۔ باب کی حدیث میں ایک صاع کا ذکر ہے ۔ جبکہ دودھ کی مقدار مختلف بھی ہوسکتی ہے ۔ اسلئے یہ حدیث قاعدہ کلیہ نہیں ۔ باب کی حدیث میں مذکور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے ۔

باب الانتفاع بالرھن

مسئلہ: رھن حقیقت میں وثیقہ ہوتا ہے ۔ مثلاً زید عمرو سے کچھ قرض لیتا ہے ۔ پھر زید عمرو کے اعتبار کے لئے اپنی کوئی چیز عمرو کے پاس رھن رکھتا ہے ۔ تو اب زید راھن ہے اور عمرو مرتہن ہے ۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مرتہن کیلئے اس مرھونہ چیز سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ مرتھن کے لئے مرھونہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ۔ اگرچہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ہدایہ میں لکھا ہے ۔ بشرط اذن الراھن نفع اٹھانا جائز ہے ۔ لیکن ہمارے دوسرے فقہاء علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ مفتی بہ قول یہ ہے کہ بشرط اذن راھن و بدون شرط اذن راھن ۔ دونوں صورتوں میں نفع اٹھانا جائز نہیں ۔ اسلئے کہ اجازت کے بعد بھی ربوا ہے کہ یہ قرض کے بدلے میں ہے ۔ اور حدیث میں یہ قاعدہ مذکور ہے ۔ کل قرض جر نفعاً فھو ربوا ۔ باب کی حدیث سے جواز ثابت ہوتا ہے ۔ جو کہ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے ۔ لیکن الکوکب الدری میں حافظ ابن عبدالبر کے حوالے سے مذکور ہے کہ باب کی حدیث عام قواعد دین کے خلاف ہے ۔ اسلئے حنفیہ ۔ شافعیہ ۔ اور مالکیہ اسکو قبول نہیں کرتے ۔

باب ماجاء اذا افلس الرجل غریم فیجد عندہ متاعہ

صورت مسئلہ: مسئلے کی صورت یہ ہے کہ مثال کے طور پر کسی نے زید کو کوئی چیز قرض فروخت کردی ۔ پھر زید مفلس ہوگیا ۔ پھر بائع کو اپنی

چیز زید کے پاس مل گئی۔ تو کیا زید سے وہ اپنی چیز لے سکتا ہے۔ یا وہ اسوۃ للغرماء ہوگا تو احناف کا مسلک یہ ہے کہ اسوۃ للغرماء ہوگا۔ بائع کو وہ چیز نہیں ملے گی۔

مسئلہ: مسلمان نہ تو ذمی کی طرف سے شراب کو فروخت کرے۔ اسی طرح نہ تو مسلمان ذمی کو شراب فروخت کرنے کیلئے دے۔

مسئلہ: اگر ذخیرہ اندوزی سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو تو ناجائز ہے ورنہ جائز ہے۔

مسئلہ: جب بائع اور مشتری کا اختلاف ہو جائے تو اگر گواہ موجود ہوں تو گواہوں کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ لیکن اگر گواہ موجود نہ ہوں تو بائع کا قول معتبر ہوگا۔ اور مشتری کیلئے خیار ثابت ہوگا۔

مسئلہ: زائد پانی کی بیع جائز نہیں۔ الا یہ کہ پانی کو اپنی ملکیت میں منتقل کر چکا ہو تو پھر بیچنا جائز ہے۔

مسئلہ: عسب الفحل یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے کی بکریوں کو حاملہ کرنے کیلئے بکرا دیتا ہے۔ تو اس پر اجرت لینا ناجائز اور مکروہ ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص اپنی باندی کو باندی کی حیثیت سے بیچتا ہے تو جائز ہے۔ اور اگر مغنیہ کی حیثیت سے بیچتا ہے۔ تو پھر جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی عورت اور اسکا بالغ بچہ ونابالغ بھائی کسی کے غلام ہوں تو انکو الگ الگ بیچنا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بالغ ہو تو بیچنا جائز ہے۔

مسئلہ: کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اسکو آگے بیچنا جائز نہیں۔ اور قبضہ اس اصطلاح کے مطابق مراد ہے جو بازار میں رائج ہو۔

فائدہ: بیع میں کسی مجہول کے مستثنیٰ کرنے کو ثنیا کہتے ہیں۔ مجہول چیز کو مستثنیٰ کرنا جائز نہیں۔ اگر وہ چیز معلوم ہو تو پھر بیع کرنا جائز ہے۔

ابواب الاحکام

باب ماجاء عن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القاضی

شرح حدیث۔ یہاں پر یہ حدیث مختصر ہے۔ منذری کی الترغیب والترھیب میں مسند ابویعلی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اس حدیث میں تین شخصوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے دو جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا۔ ① وہ شخص جس نے جہل سے فیصلہ کیا وہ جہنم میں جائے گا۔ ② رشوت یا سفارش کے ساتھ ظلماً فیصلہ کیا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ ③ جس نے عدل کے ساتھ صحیح فیصلہ کیا وہ جنت میں جائیگا۔ یہاں باب کی حدیث میں تیسرے شخص کا ذکر ہے۔

باب ماجاء فی التشدید من یقضی له

باب کی حدیث میں مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ مثلاً قاضی نے مدعی یا مدعی علیہ میں سے کسی کے بارے میں فیصلہ کر دیا بعد میں پتہ چلا کہ مدعی کے گواہ حقیقت میں جھوٹے تھے۔ قاضی کو فیصلے سے پہلے اسکا علم نہ ہوسکا۔ یا مدعی علیہ کے بارے میں اسکی جھوٹی قسم کی وجہ سے فیصلہ ہوگیا۔ تو اب کیا حکم ہے؟ چنانچہ جو چیزیں اموال کے قبیلے سے ہیں۔ ان میں سے سب ائمہ کے نزدیک قضاء قاضی سے وہ چیز اسکے حق میں حلال نہیں ہوگی۔ البتہ نکاح میں اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسکو قابل بعض الناس سے ذکر کیا ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ اگر قاضی نے نکاح کے متعلق (مذکورہ صورت والا) فیصلہ کرلیا۔ تو وہ بدلہ نکاح کے ہوگا۔ اور نکاح ہو جائے گا۔ اسکی دلیل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ۔شاھداک زوجاک

باب ماجاء فی الیمین مع الشاھد

اختلاف: امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حدود اور قصاص کے علاوہ میں اگر مدعی کے پاس ایک گواہ ہو تو قاضی اس ایک سے قسم لیکر اسکے حق میں فیصلہ کردے، باب کی حدیث انکا مستدل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر مدعی کے پاس ایک گواہ ہو تو اس سے قسم نہیں لی جائے گی۔ بلکہ مدعی علیہ سے قسم لی جائیگی۔ حدیث میں ہے۔ البینة علی المدعی والیمین علی مدعی علیہ ومن منکر۔ باب کی حدیث کا مفہوم یہ کہ مدعی کے پاس ایک گواہ موجود تھا۔ اسکے باوجود نبی کریم ﷺ نے مدعی علیہ کی قسم پر مدعی کے حق میں فیصلہ کیا۔

باب ماجاء فی العمریٰ والرقبیٰ

عمریٰ اسکو کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو کہے کہ عامرتک خدا الشیٔ ہمیشہ کے لئے یہ چیز تیری ہوگئی۔ تو اسکا کیا حکم ہے؟۔ تو فرماتے ہیں کہ وہ چیز ہمیشہ کے لئے اسکی ہو جائے گی اور اسکی موت کے بعد اسکے ورثاء کو ملے گی بشرطیکہ اس آدمی نے یہ نہ کہا ہو کہ تیرے مرنے کے بعد یہ چیز میری طرف لوٹ کر آجائے گی۔ اگر شرط لگائی ہو تو اسکے مرنے کے بعد چیز اس کی طرف لوٹ آئے گی۔ رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو یہ کہے کہ اگر تیرا انتقال پہلے ہو گیا تو تیری فلاں چیز میری ہو جائے گی۔ اور اگر میرا انتقال پہلے ہو گیا تو میری فلاں چیز تمہاری ہو جائے گی۔ احناف اور جمہور کے ہاں عمریٰ تو جائز ہے۔ رقبیٰ میں اختلاف ہے۔ جمہور کے ہاں رقبیٰ بھی جائز ہے۔ جبکہ احناف کے نزدیک جائز نہیں۔ کیونکہ ہر ایک دوسرے کی موت کا انتظار کرتا۔

ابواب الدیات

باب الحکم فی الدماء

مسئلہ: باب کی حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے خون کا حساب ہوگا۔ اور ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔ محدثین نے اسمیں تطبیق کی صورتیں ذکر کی ہیں۔ ① بعض نے کہا کہ سب سے پہلے نماز کی پوچھ گچھ ہوگی۔ اور فیصلہ سب سے پہلے دماء کا ہوگا۔ ② بعض نے انواع کے اعتبار سے فرق کیا ہے کہ حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔ اور حقوق العباد میں سب سے پہلے دماء کا فیصلہ ہوگا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ باب کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہابیل اور قابیل کے قتل کا فیصلہ ہوگا جو کہ سب سے پہلا قتل تھا۔ باپ اگر اپنے بیٹے کو قتل کردے تو باپ پر قصاص نہیں آئیگا۔

ابواب الحدود

باب ماجاء فی ذرء الحدعن المعترف اذا رجع

اگر کوئی شخص زنا کرنے کا اعتراف کرنے کے بعد رجوع کرے تو اسکا رجوع معتبر ہوگا۔ ھلا ترکتموہ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ صرف بھاگنا رجوع ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اسکو چھوڑ دے تاکہ واضح ہو جائے کہ واقعی رجوع کر دیا ہے یا نہیں۔ ہماری فقہ کی کتب میں

لکھا ہے۔ ① امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ تعالیٰ اور فقہائے کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر زانی چار دفعہ اقرار کردے تو حد جاری ہوگی ② امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے کہ ایک دفعہ اقرار کافی ہے۔ قول اول کے قائلین باب کی پہلی دونوں احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ قول ثانی کے قائلین باب کی آخری حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اسمیں۔ فان اعترفت فارجمها کے الفاظ ہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ اگرچہ اسمیں چار دفعہ اقرار کا ذکر نہیں۔ لیکن اس سے مراد معہود اعتراف ہے۔

مسئلہ: حد زنا کا معاملہ قاضی کے پاس پہنچنے سے پہلے پہلے حد کو ساقط کرنے کیلئے سفارش جائز ہے۔ لیکن قاضی کے پاس پہنچنے کے بعد سفارش کرنا مکروہ ہے۔

باب ماجاء فی حد السكران

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک قول کے مطابق، امام احمد، داؤد ظاہری اور ابو ثور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ شراب کی حد چالیس کوڑے ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ امام مالک اور صحیح تر قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ شراب کی حد اسی کوڑے ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور اسپر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع منعقد ہے۔

باب ماجاء فی كم يقطع السارق

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے دینار کے چوتھائی حصے کی مقدار کی کوئی چیز چوری کی۔ تو اسکا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ اور یہ حضرات باب کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک دینار یا دس درہم کی مقدار کی کوئی چیز محفوظ جگہ سے چوری کی تو پھر اسکا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ اگر سارق کا اس میں حصہ ہے تو قطع ید نہیں۔ احناف کی مستدل سنن نسائی کی روایت ہے جس میں تین (ڈھائی) کے ثمن میں قطع ید ہے اسکے بعد فرمایا۔ و کان ثمنه دیناراً و عشرة دراهم

ابواب الصيد

باب فی ذكوة الجنين

باب کی حدیث میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی نے حاملہ گائے یا بکری کو ذبح کردیا اور اسکے پیٹ میں اتنی عمر کا بچہ تھا کہ اس میں روح پڑ چکی ہو۔ تو امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد فرماتے ہیں۔ کہ فقط ماں کا ذبح کرنا۔ اسکے بچے کے ذبح کے لئے کافی ہے۔ جبکہ امام اعظم نعمان بن ثابت رحمہ اللہ تعالیٰ الکوفی فرماتے ہیں کہ بچے کے ذبح کے لئے اسکی ماں کا ذبح کافی نہیں۔ بلکہ اس بچے کو الگ ذبح کیا جائے گا۔ باب کی حدیث قول اول کے قائلین کا مستدل ہے۔ احناف باب کی حدیث میں تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد تشبیہ ہے کہ ماں کی طرح اسکے بچے کو بھی مستقل ذبح کیا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَجْمَعُ الْبَحْرَیْن

(جلد ثانی)

افادات

استاذ محترم حضرت مولانا محمد زیب صاحب دامت برکاتہم

مرتب

محمد فیصل

فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

ناشر

مکتبہ الحبیب

جامعہ عربیہ اسلامیہ

اسکاؤٹ کالونی

اسکیم 33 کراچی

کتاب	مجمع البحرین
افادات	حضرت مولانا محمد زیب صاحب دامت برکاتہم
مرتب	محمد فیصل
ناشر	مکتبہ الخبیب 0333-3422703
کمپوزنگ	آربو گرافکس ARBO Graphics

- ادارۃ الانور — 021-4914596
- مکتبہ عمر فاروق — 021-4594144
- طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز — 0300-9233714, 0321-9233714

فهرست جلد ثانی

تمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابواب الاطعمہ

باب ماجاء علیٰ ماکان یاکل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اطعمہ میں آداب کھانے کا ذکر ہے کہ کس طرح کھانا چاہئے اور حلال وحرام اور مکروہ کا بھی ذکر ہوگا۔ پہلے باب میں طعام کے احترام کا ذکر ہے کہ یہ اللہ کی نعمت ہے اس کو زمین پر بغیر دسترخوان کے اور متکبرین کی طرح نہیں رکھنا چاہئے۔

اس سند میں یونس سے مراد یونس اسکاف ہے۔ ابن حبان نے اسے مجہول کہا ہے، باقی سب ان کو ثقہ کہتے ہیں،

''خوان'' اخوان بعض کے ہاں یہ معرب ہے اور بعض نے کہا کہ اس کی جمع قلت ''اخونہ''

اور جمع کثرت ''خوون'' ہے اس لئے یہ عربی لفظ ہے۔ خوان تانبے کی چوکی کو کہتے تھے جس کے چار پاؤں ہوتے تھے۔

مائدہ وخوان میں فرق:

اگر طعام رکھا جائے تو مائدہ اور بغیر طعام کے خوان کہلاتا ہے ''سکرجہ'' فارسی کا لفظ ہے بمعنی چھوٹا برتن اس میں کھانا اس لئے نہیں کھایا کہ چھوٹے برتن اسوقت نہیں بنتے تھے یا بنتے تھے لیکن اجتماعی کھانے کی رواج کی وجہ سے اناء صغیر کو استعمال نہیں کیا تیسری وجہ یہ ہے کہ اناء صغیر میں عموماً ہاضم اشیاء رکھی جاتی ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تھا اس لئے ہاضم اشیاء کی ضرورت ہی نہ تھی۔

''مرقق'' مراد اس سے ملین ہے کہ نرم روٹی نہیں بنائی گئی تھی کہ گھی تیل نہیں لگایا یا آٹا چھنا نہیں جاتا تھا کہ روٹی نرم ہو، یا مرقق ترقیق سے ہے جب روٹی کو باریک کرکے بڑھا دیا جائے یہ اس لئے نہیں ہوتا کیونکہ اسوقت ایسے آلات نہیں تھے۔

فعلیٰ ماکانوا، حرف جر ما استفہامیہ پر داخل ہو تو میم کے ساتھ الف نہیں لکھتے علیٰ کے ساتھ الف لکھتے ہیں مگر یہاں قلت کے ساتھ میم الف کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

''السفر'' سفرۃ کی جمع ہے بمعنی طعام السفر اور مسافر چمڑے میں روٹی رکھتے تھے اسلئے اسپر بھی سفرۃ کا اطلاق ہونے لگا۔

باب ماجاء فی اکل الارنب

''ارنب دویبۃ صغیرۃ'' ارنب اسم جنس ہے، ذکور اناث دونوں پر اطلاق ہوتا ہے، بعض نے کہا کہ ذکور کو خزز اور اناث کو عکرشہ اور چھوٹوں کو خرنق کہا جاتا ہے۔ ارنب ایک سال مذکر اور ایک سال مؤنث رہتا ہے۔

''انفجنا'' کسی چیز کو بھگانا اٹھانا، مرالظہران مکہ سے چندمیل کے فاصلے پر ہے ''قال قبلہ'' اس روایت میں لینے کا ذکر ہے کھانے کا نہیں اسلئے اہل علم میں اختلاف ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے ارنب کا کچھ حصہ رکھا اور فرمایا آپ کیلئے چھپا کر رکھا تھا معلوم ہوا خود بھی کھایا ہوگا بعض نے کہا یہ روایت ضعیف ہے، لیکن صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھایا اس لئے حلال ہے، ابن ابی لیلیٰ اور بعض حضرات نے مکروہ کہا کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ نہ میں کھاتا ہوں

اور نہ حرام کرتا ہوں۔اسکوحیض بھی آتا ہے لیکن یہ وجہ کراہت نہیں ہے۔

باب ماجاء فی اکل الضب

''ضب'' ایک حیوان کا نام ہے اس کو گوہ بھی کہتے ہیں ''ضب'' مذکر اور ''ضبة'' مؤنث کو کہتے ہیں، اس کی چند خصوصیات ابن حجر نے بیان کی ہیں، یہ پانی نہیں پیتا ہے اسی طرح اس کے دانت نہیں گرتے تیسرا انکے دانت الگ نہیں ہوتے ایک ہی قطعہ ہوتا ہے اور ضب مذکر کے دو ذکر ہوتے ہیں کوئی کام نہ کرتا ہو تو کہتے ہیں لا افعل حتی یرد الضب اور ضب پانی پیتا ہی نہیں اس لئے یہ تعلیق بالمحال ہے۔ یہ چالیس دن کے بعد ایک قطرہ پیشاب کرتا ہے، مشہور ہے کہ جو اس کا گوشت کھائے اس کو پیاس نہیں لگے گی حدیث میں ہے کہ لا اکله ولا احرمه تو بظاہر حلت معلوم ہوتی ہے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ اس کا کھانا جائز ہے، یہ شافعی احمد و مالک کا قول ہے۔ امام اعظم وصاحبین کے ہاں اس کا کھانا مکروہ ہے ابن عباس کا قول ذکر کر کے پہلے قول کو ترجیح دینا چاہتے ہیں دوسری وجہ حضور اکرم ﷺ نے نہ کھانے کی یہ بتائی کہ آپ کی طبعیت اس سے نفرت کرتی تھی اس لئے نہیں کھایا ورنہ حرام نہ تھا اسلئے ان کے مائدہ پر کھایا گیا ائمہ ثلاثہ کی دلیل جو کتاب میں مذکور ہے یہی ہے،

ائمہ احناف کی دلیل:

امام محمد نے اس روایت سے دلیل پکڑی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ کسی نے بھنا ہوا ضب لایا آپ نے نہیں کھایا سائل نے مانگا میں نے دینا چاہا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کو خود پسند نہیں کرتی دوسروں کو کیوں دیتی ہو یہ کراہت کی دلیل ہے، طحاوی نے یہ وجہ بتائی ہے کہ ناپسندیدہ چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام پر بھی نہیں دینا چاہئے، دوسری حدیث میں ہے کہ ہم ایسے جگہ گئے جہاں ضب زیادہ تھے لوگ کھاتے تھے اور نبی اکرم ﷺ بھی ہمارے ساتھ موجود تھے ہم نے پکانا شروع کیا پھر حضور ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے منع کیا کہ پہلی ایک امت کی شکل مسخ ہوئی خطرہ ہے یہ وہی قوم نہ ہو پھر گرانے کا حکم دیا، عبدالرحمٰن حسنہ کی روایت میں بھی ممانعت صراحۃً مذکور ہوئی ہے۔ اب بعض رویات میں نہی ہے، اور بعض میں نہی نہیں کی جبکہ انکے سامنے کھایا گیا، اسمیں تعارض ہوا، ابن حجر کہتے ہیں کہ عدم نہی والی احادیث صحیح ہے، نہی والی احادیث سے کراہت ثابت ہوتی ہے کیونکہ پہلے حضور اکرم ﷺ کے علم میں تھا کہ مسخ شدہ قومیں باقی ہیں اسلئے منع کیا اور بعد میں وحی سے معلوم ہوا کہ مسخ شدہ اقوام باقی نہیں رہی تو پھر آپ نے اجازت دیدی امام اعظم وصاحبین نے اس طرح جمع کیا ہے کہ حلال ہے مگر کراہت کے ساتھ۔ فقہاء کہتے ہیں کہ مکروہ تحریمی ہے محدثین کہتے ہیں کہ مکروہ تنزیہی ہے۔

باب جاء فی اکل الضبع

یہ مشہور حیوان ہے اسکے بارے میں دو قول ہیں ① یہ وہ حیوان ہے جس کو بجو کہتے ہیں ② غیاث الغاب میں ہے کہ اردو میں اسکو ڈنڈار کہتے ہیں یہ بجو نہیں کوئی اور جانور ہے لیکن عام لوگ بجو ہی معنی کرتے ہیں، یہ خبیث حیوان ہے ایک سال مذکر اور ایک سال مؤنث رہتا ہے مذکر اور مؤنث دونوں کا کام کرلیتا ہے اور یہ خبیث مردے بھی کھاتا ہے، امام ترمذی نے پہلے حدیث نقل کی ہے اس میں بجو کا حلال ہونا معلوم ہوتا ہے اس حدیث میں سوال کی دو انواع ہیں ① یہ شکار ہے ② کیا میں کھا سکتا ہوں؟ جواب دیا شکار ہے اور کھا سکتے ہو، کتاب الحج میں ضبع کے بارے میں سوال ہوا کہ شکار ہے فرمایا شکار ہے محرم شکار کر کے تو کبش دم دے گا وہاں کھانے کے بارے میں سوال نہیں۔ دوسری روایت میں سوال ہے کہ ضبع کو کھا سکتے ہیں؟ جواب دیا گیا بجو کو کوئی کھاتا ہے؟ ذئب کے بارے میں سوال ہوا تو جواب دیا یہ بھی کوئی کھاتا ہے جس میں خیر ہو؟ تو اس سے ان دونوں کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ مگر مصنف کہتے ہیں کہ اسمیں ضعف ہے

کیونکہ اس کے دوراوی اسماعیل اور عبدالکریم بن قیس یہ ضعیف ہیں، روایت کی اختلاف کی وجہ سے ائمہ میں اختلاف ہوا ہے کہ احمد واسحاق اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بجو حلال ہے احناف امام مالک کے ہاں اس کا کھانا مکروہ ہے دلیل خزیمۃ بن الجزری والی روایت ہے جو باب میں دوسری حدیث ہے پہلی روایت صحیح ہے امام احمد نے اسی سے استدلال کیا ہے، طحاوی نے فرمایا کہ پہلی روایت میں سوال صید کا تھا آگے جابر نے اس سے استدلال کیا کہ جب صید تھا تو کھانا بھی جائز ہوگا۔

اقالہ رسول اللہ ﷺ کا تعلق اصید ہی کے ساتھ متعلق ہے کہ اس کا صید ہونا حضور ﷺ نے بتایا: باقی احناف کی روایت حسن ہے اور اسکے کئی متابع ہیں، جب حسن کا متابع آجائے تو وہ صحیح بن جاتی ہے، اور حسن یعنی قابل احتجاج ہے بالاتفاق، دوسرا حلت اور حرمت میں جب تعارض آجائے تو حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ابن العربی مالکی نے ترمذی کی شرح میں لکھا ہے کہ ان پر تعجب ہے جو ثعلب کو حرام کہتے ہیں وہ ضبع کو حلال کس طرح کہتے ہیں جبکہ ثعلب جانور کا شکار کرتا ہے لیکن بجو تو انسان کو قتل کرتا ہے یہ حلال کس طرح ہے؟ جبکہ یہ انسان کا دشمن ہے۔ ابن العربی نے فرمایا کہ بجو حرام ہے، احناف کی دوسری دلیل کل ذی ناب من السباع والی روایت کے تحت یہ حرام ہے اور یہ روایت تواتر کے درجے میں ہے اور ضبع بھی سباع میں سے ہے بلکہ سباع سے بھی بدتر ہے، لیکن نص قطعی سے چونکہ حرمت ثابت نہیں ہے اسلئے احناف صراحۃً حرمت کا حکم نہیں لگاتے بلکہ مکروہ کا قول اختیار کرتے ہیں شوافع کل ذی ناب کا جواب دیتے ہیں کہ سباع حرام ہے مگر بجو مستثنیٰ ہے، احناف جواب دیتے ہیں کہ حدیث میں کسی جگہ الاضبع کا استثناء نہیں اس لئے اس کی تخصیص کی دلیل کیا ہے؟۔

باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل

خیل کی جمع ''خیول'' آتی ہے زمانہ قدیم میں جہاد کا مدار اسی پر تھا اور سواری کی کام میں بھی آتا تھا اسلئے اس کے حلال اور حرام ہونے میں اختلاف ہے حدیث مذکور کے اندر **اطعمنا رسول اللہ ﷺ لحوم الخیل** اور دار قطنی میں ''امرنا'' کا لفظ ہے بخاری میں ''رخص لنا'' اور مسلم میں ''اذن لنا'' کے الفاظ ہیں مطلب سب کا ایک ہے کہ گھوڑا حلال ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے کھانے سے روک دیا تھا فرمایا **نھی رسول اللہ عن لحوم الخیل و البغال و الحمیر**، تو روایت کے اختلاف کی وجہ سے ائمہ میں اختلاف ہوا ایک قول امام اعظم و مالک کا ہے ان سے کراہت منقول ہے اور امام مالک سے ایک قول حرمت کا بھی منقول ہے اور ایک غیر مشہور قول حلت کا بھی ہے۔ امام اعظم کے ہاں مکروہ تنزیہی ہے اور امام صاحب سے رجوع بھی ثابت ہے امام شافعی، احمد واسحاق بن راہو یہ صاحبین کے ہاں حلال ہے جمہور کی دلیل باب والی حدیث ہے وما فی الباب والی بھی انکی تائید کرتی ہے۔ امام مالک کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے ﴿**والانعام خلقھا**........**والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ**﴾ ہے پہلے حیوانات کے تین فوائد بیان ہوئے لباس، طعام، سواری، لیکن خیل وغیرہ کے صرف دو فوائد ذکر کئے رکوب اور زینت۔ اب اگر انکا حکم بھی حلت کا ہوتا تو پہلے حیوانات کے ساتھ ہی ذکر کر دیا جاتا یا یہاں بھی تیسرا فائدہ اُکل کو ذکر کیا جاتا، باقی جواز والی احادیث تمام خیبر کے بارے میں ہیں کہ وہاں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھوکے تھے وہاں بہت کچھ مباح ہوا تھا پھر حرام ہوا تو یہ وقتی اباحت تھی اور دوسری جگہ جو واقعات ہیں وہ جزئی ہیں نہ کہ کلی۔

امام صاحب نے بھی ایک اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ اللہ بادشاہ ہے جب بندوں پر انعام کرتے ہیں تو بڑی نعمت سے انعام کرتے ہیں اب بڑا انعام طعام ہے جب اس کو ذکر نہیں کیا تو یہ اسکی دلیل ہے کہ اسکا طعام ہی جائز نہیں، دوسرا خیل، حمار، بغال تینوں کو اکھٹا کیا ان میں رکوب اور زینت مشترک ہے تو حرمت میں بھی تینوں مشترک ہونگے۔

دلیل نمبر ۲: خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے خیبر کے بارے میں اس میں نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن لحوم الخیل ولحوم الحمر الاھلیۃ فرمایا اور یہ روایت حسن ہے بعض نے صحیح کہا ہے۔
دلیل نمبر ۳: یہ آلۃ الجہاد ہے اگر کھانے کا حکم دیں تو اسمیں کمی آجائے گی۔

باب ماجاء فی لحوم الحمر الاھلیۃ

''اھلیۃ'' کی قید احترازی ہے اس سے حمر وحشیۃ سے احتراز کیا جسکا کھانا جائز ہے۔
اس حدیث میں دو مسئلے ہیں ① متعۃ النساء ② لحوم الحمر الاھلیۃ۔ متعۃ النساء کا مسئلہ نکاح میں آئے گا، یہ ایک وقتی اجازت تھی پھر قیامت تک کیلئے حرام ہوگیا، اسپر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ متعہ حرام ہے اسکی حرمت اور اسکے زنا ہونے میں کوئی شک نہیں، شیعہ کے ہاں جائز ہے لیکن انکا کتاب وسنت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اسلئے جائز سمجھتے ہیں، دوسرا جملہ ہے لحوم الحمر الاھلیۃ، یہ بھی حرام ہے خیبر کے دن انکو حرام قرار دیا گیا ہے ''مجثمہ'' جثوم الطیر سے ہے بمعنی جب پرندہ بیٹھ جائے، مراد یہ ہے کہ جانور کو باندھ کر نشانہ لگایا جائے اور وہ بغیر ذبح مرجائے، امام مالک سے حمر اہلیہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔
نمبر ①: مشہور یہ ہے کہ یہ حرام ہے، نمبر ②: مباح ہے کیونکہ حرمت کی علت حدیث میں یہ ہے کہ یہ سواری کیلئے ہے۔ ایک آدمی نے پوچھا کہ موٹے گدھے ہیں کھانے کو کچھ نہیں اور آپ ان کے کھانے سے منع کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اسلئے منع کیا تھا کہ یہ گندگی کھاتا ہے جب یہ علت نہ ہو تو حلال ہے لیکن ایک اور علت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ''انھا رجس'' اسلئے مالکیہ کا راجح قول حرمت کا ہے جس طرح جمہور کا قول ہے باقی جن روایات میں کھانے کا ذکر ہے وہ خیبر سے پہلے کے واقعات ہیں وہ بھی عام اجازت نہ تھی خاص واقعات میں اضطراری حالت میں اجازت دی۔

باب ماجاء فی آنیۃ الکفار

مناسبت یہ ہے کہ برتنوں میں طعام پکایا جاتا ہے عام طور پر ایسا ہوتا ہے تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ کافروں کے برتنوں کو طعام کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ کفار کے ہاں پاکی کا انتظام نہیں ہوتا، امام بخاری نے باب باندھا ہے باب ماجاء فی آنیۃ المجوس جبکہ آگے حدیث میں اہل کتاب کا ذکر ہے لیکن امام ترمذی نے عام رکھا ہے تاکہ سب کو شامل ہو اور سب کا حکم معلوم ہو جائے ''قدور'' قدر کی جمع ہے قُدَیر تصغیر ہے چھوٹی ہنڈیوں سے لیکر دیگ تک اس کا اطلاق ہوتا ہے یعنی وہ برتن جسمیں طعام پکایا جاتا ہے تو مجوس کے برتن کا سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوب دھولو جب تسلی ہو جائے تو اسمیں پکا سکتے ہو،
''ذی ناب'' بمعنی درندے اور ہمیشہ ذی ناب کا سینگ نہیں ہوتا اور جسکا سینگ ہو وہ سبع کہلاتا ہے، اور یہ دونوں بالاتفاق حرام ہیں، اب ذی ناب اور ذی سبع کا اطعمہ سے تعلق تھا اسلئے مکمل حدیث لے آئے،
امام مالک فرماتے ہیں کہ مجوس کے برتن کا استعمال جائز نہیں کیونکہ وہ انمیں مردار پکاتے ہیں باقی اہل کتاب کے برتن کا استعمال جائز ہے کیونکہ یہ لوگ مردار اشیاء نہیں کھاتے۔ امام مالک نے تیسرا مسئلہ یہ بتایا کہ اہل کتاب کے برتن کے علاوہ نہ ملے تو ان کو دھو کر استعمال کریں۔ مگر باقی جمہور کے ہاں مجوس کے ہوں یا اہل کتاب کے ہوں انمیں فرق نہیں کیونکہ اہل کتاب اور مجوس حکماً ایک ہیں تو برتنوں کا حکم بھی ایک ہے اس لئے امام بخاری نے عنوان قائم کیا ہے ماجاء فی آنیۃ المجوس اور حدیث میں اہل کتاب کا ذکر ہے تو اسمیں اشارہ ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ جب دھولیا جائے تو پاک ہو جائے گا، بعض نے کہا کہ بظاہر نجاست نہ ہو اور یقین ہو

کہ نجاست نہ ڈالی ہوگی تو بغیر دھونے کے بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن دھونا افضل ہے لیکن اگر مسلمانوں کے برتن موجود نہ ہو۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ ایک شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کے برتن نہ ہو دوسرا دھویا جائے پھر جائز ہے، لیکن اگر مسلمانوں کے برتن موجود ہو تو پھر انکا برتن استعمال کرنا جائز نہیں۔ بعض نے کہا کہ عام برتن جسمیں پکایا نہیں جاتا انکا استعمال جائز ہے باقی جن میں پکایا جاتا ہے یا نجس چیز کو اسمیں ڈالا جاتا ہے جیسے شراب کا برتن تو اس کا دھونا ضروری ہے، اور بعض نے کہا کہ بعض برتن دھونے کے باوجود بھی اسمیں کراہت موجود رہتی ہے، جیسے شراب کے برتن یا اسمیں خنزیر یا میتہ پکایا ہو، لیکن عام برتنوں میں دھونے سے پاکی حاصل ہو جائے گی، اور بعض نے کہا کہ جو نجس نہیں اور نہ اسمیں نجس پکاتے ہیں وہ برتن بغیر دھوئے بھی پاک ہیں۔

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

چوہا اگر گھی میں گر کر مر جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ چوہا اور اسکے ارد گرد گھی پھینک دو باقی کھا سکتے ہو لیکن یہ حکم تب ہے جب گھی منجمد ہو۔ اگر گھی مائع ہو تو سارا خراب ہو جائے گا۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ چوہا پاک ہے یہاں حدیث میں جو حکم ہے یہ مرنے کے بعد کا ہے کہ مر کر نجس ہو گیا اگر زندہ نکلے تو پاک ہے، جمہور کے ہاں ناپاک ہے مائع چیز کے ساتھ لگ جائے تو وہ چیز ناپاک ہو جائے گی اگر منجمد ہو تو اس کے ارد گرد چیز ہٹا دے باقی کو استعمال کریں۔

باب ماجاء فی النھی عن الاکل والشرب بالشمال

کھانے کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہئے کیونکہ اس ہاتھ کو استعمال کرنا چاہئے جو اچھے کاموں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور جو گندے کاموں کیلئے استعمال ہوتا ہے اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس نعمت میں استعمال کرنا اسکی عظمت کے خلاف ہے، اس پر مصنف نے حدیث ذکر کی ہے کہ کوئی بائیں ہاتھ سے نہ کھائے پیئے یہ شیطان کا کام ہے وہ بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے۔

لایأکل میں نہی ہے یہ کراہت پر دال ہے، اکل بالیمین واجب ہے یا مستحب؟ تو بعض اہل علم کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ سے کھانا حرام ہے اور وہ اس نہی کو تحریمی سمجھتے ہیں، اسطرح ایک دوسری روایت میں امر ہے دائیں ہاتھ سے کھانے کا تو دائیں ہاتھ سے کھانا واجب ہے۔

عمر بن ابی سلمہ: حضور ﷺ کے گود میں پلا ہے آپ کھانے میں ساتھ بٹھاتے تھے یہ خود واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں کھانا کھا رہا تھا حضور اکرم ﷺ ایک جگہ سے کھاتے تھے اور میرے ہاتھ تھال میں گردش کرتے تھے، نبی ﷺ نے فرمایا **کل بیمینک وکل ممایلیک** تو اس امر سے معلوم ہوا کہ وہ وجوب پر دال ہے، ابن ابی سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر کھجور کا تھال آیا میں انکے حکم کی وجہ سے اپنے سامنے سے کھاتا حضور ﷺ مختلف انواع کو اٹھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا جب مختلف انواع کی چیز ہو تو اسمیں ادھر ادھر سے کھا سکتے ہو، اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا آپ ﷺ نے فرمایا کل بیمنک اس نے جواب دیا ”لا استطیع“ یہ تکبرا کہا۔ تو آپ نے فرمایا ”لا استطعت“ تو روایت میں ہے کہ اس بددعا کی وجہ سے ہاتھ اٹھا ہی نہ تھا، اب یہ وعید ہے اگر دائیں ہاتھ سے کھانا واجب نہ ہوتا تو وعید نہ ہوتی۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں سیدھے ہاتھ سے کھانا مسنون ہے بائیں ہاتھ سے کھانا مکروہ ہے۔

فان الشیطان یأکل بشماله ویشرب بشماله، اسمیں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں ① یہ حقیقت پر محمول ہے، یمین افضل ہے اسمیں برکت ہے شمال میں نحوست ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیطان کو برکت سے محروم کیا ہے اسکے دونوں ہاتھ شمال ہیں یمین اسکا ہے ہی نہیں اسلئے کھاتا پیتا شمال سے ہے، ابن العربی نے مبتدعین کا ایک قول نقل کیا ہے کہ شیطان کھاتا پیتا نہیں بلکہ سونگھتا ہے، مگر ابن العربی فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جاہل ہیں ان کو علم کی بو بھی نہیں لگی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کھاتا پیتا ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کے قول کی مخالفت

کرتے ہیں۔ (۲) یہاں شیطان کی اتباع مراد ہیں انکا یہ کام ہے کہ وہ کھاتے پیتے بائیں ہاتھ سے ہیں، جیسے کہ آج کل کے جاہل تعلیم یافتہ بائیں ہاتھ سے کھاتے پیتے ہیں یہ شیطان کی اتباع ہے۔

دونوں قول جمع ہوسکتے ہیں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے اور انکے اتباع کا بھی یہی طریقہ ہے۔

باب ماجاء فی لعق لاصباع

یہ بھی آداب رزق میں سے ہے اور ہاتھوں کی بھی نظافت ہے کیونکہ کھانے میں برکت ہے شروع کرتے وقت یا درمیان میں یا ہاتھوں سے جو لگا ہے اسمیں یا برتن کے ساتھ جو لگا ہے اسمیں برکت ہے، مگر اس کا علم نہیں اسلیئے ہاتھ بھی صاف کرنے چاہئے شاید برکت حاصل ہوجائے برکت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے استعمال سے طاقت حاصل ہوگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضیات کے کاموں کی توفیق ملے گی اسلیئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم دیا کہ انگلیوں کو بھی چاٹنا چاہئے اور کھانا جہاں لگا ہے اسکو صاف کرے برکت کے حصول کیلئے۔ تین انگلیوں سے کھانا مسنون ہے اور چاٹتے وقت پہلے وسطی پھر سبابہ پھر ابہامہ کو چاٹے کیونکہ اسمیں دائیں جانب سے شروع ہوگا۔

باب ماجاء فی اللقمة تسقط

کبھی کھاتے وقت اگر لقمہ گر جائے تو حضور ﷺ نے اپنی تعلیم سے سمجھایا کہ اس کو بھی ضائع نہ کریں اگر مٹی وغیرہ لگی ہو اسکو صاف کرکے کھالے شیطان کیلئے نہ چھوڑے کیونکہ ایک تو طعام ضائع ہوجائیگا اور پھر آپ کا کھانا شیطان کو مل جائے گا، اسی طرح برتن کو بھی چاٹنا چاہئے کیونکہ برتن اسکے لئے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ عرب میں مختلف قسم کے برتن تھے اُنمیں سب سے بڑا برتن ''جفنہ'' تھا اسمیں بیس افراد کھاتے تھے پھر ''قصعہ'' اسمیں دس افراد پھر ''صحفہ'' اسمیں پانچ افراد پھر ''مکیلہ'' اسمیں دو یا تین پھر ''صحیفہ'' ہے اسمیں ایک ہی آدمی کھاسکتا ہے، برتن جو بھی ہو مقصد اس کو صاف کرنا ہے تاکہ برکت حاصل ہو، دوسرا برتن اس کیلئے استغفار کریگا یہ حقیقت پر محمول ہے یا مجاز اً ہے کہ اسمیں کبر ختم ہوگا جو کہ اسکے لئے مغفرت کا باعث بن سکتا ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة الاکل من وسط الطعام

یہ بھی آداب طعام میں سے ہے کہ درمیان سے نہ کھائے بلکہ کنارے سے کھائے کیونکہ برکت درمیان میں اترتی ہے اگر درمیان سے شروع کیا تو برکت ختم ہوجائے گی اس لئے حضور ﷺ نے درمیان سے کھانے کو منع کیا ترمذی نے کراہیۃ کا لفظ لاکر اشارہ کیا کہ درمیان سے کھانا مکروہ ہے لیکن بعض علماء کے نزدیک نہی کیوجہ سے درمیان سے کھانا حرام ہے روٹی کے بارے میں بھی بعض علماء کی رائے یہی ہے البتہ ضرورت ہوتو کاٹ سکتا ہے بغیر ضرورت کے نہ توڑے کیونکہ وہ بھی طعام ہے اور اس حدیث کے تحت داخل ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة اکل الثوم والبصل

کھانے کے انواع میں بعض مباح اشیاء ہیں مگر اسکے کھانے سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے جیسے بعض سبزیاں کہ انکے کھانے سے بو آتی ہے تو حضور ﷺ نے ایسی چیزوں کے کھانے سے خاص حالات میں منع کیا ہے مثلاً اجتماع گاہ میں جانا ہو یا مسجد میں جانا ہو، لیکن خود حضور ﷺ ایسی اشیاء نہ کھاتے تھے۔

''فلا یقربنا فی مساجدنا'' ایک روایت میں ہے فلا یقربن مسجدی تو بعض اہل علم نے کہا یہ حضور ﷺ کی مسجد میں جاتے وقت نہ کھائے لیکن مذکورہ روایت میں مساجد جمع لایا ہے اسلیئے ہر مسجد کا یہی حکم ہے بعض حضرات کہتے ہیں یہ سبزیاں حرام ہیں کیونکہ جماعت

انکے ہاں فرض ہے اور یہ چیزیں کھا کر مسجد نہیں جاسکتا تو جماعت رہ جائے گی اور جو فرض سے مانع ہو وہ حرام ہوگی۔ جمہور کہتے ہیں کہ حلال ہے حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا آپ کھاتے نہیں تو کیا حرام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں ان چیزوں کو حرام نہیں کرتا جن کو اللہ نے حلال کیا ہے لیکن میں اس لئے نہیں کھاتا تھا کہ میرے صاحب (جبرائیل امین) کو تکلیف نہ ہو، معلوم ہوا کہ حلال ہے مگر بعض حالات میں منع کیا تا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہواب اذیت کی علت عام ہے لیکن بعض اہل علم کہتے ہیں کہ عبادات کی جگہ نہ جائے باقی عام حالات اور بازار وغیرہ میں کھاسکتے ہیں اگر پیاز اور لہسن وغیرہ مطبوخ ہو تو عام حالات میں بھی کھانا جائز ہے کیونکہ اس کی بدبو ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح ان پر کوئی چیز ڈال دیں جس سے بدبو ختم ہو تو پھر استعمال کرسکتے ہیں جیسے سرکہ وغیرہ ڈال کر۔

باب ماجاء فی کراھیة القران بین التموتین

حضور ﷺ نے مجمع میں ساتھیوں کی اجازت کے بغیر دو دو کھجوریں اٹھانے سے منع کیا ہے اگر کسی نے دعوت کی اور آدمی ان میں سے دو دو کھجوریں اٹھانا چاہتا ہے تو مالک سے اجازت لینا ضروری ہے اور اگر سب کی مشترکہ چیز ہے تو ساتھیوں سے اجازت لینا ضروری ہے اور اگر خود مالک ہو اور دوسروں کے ساتھ کھانا چاہتا ہے تو دو دو اٹھا سکتا ہے مگر مجلس کے آداب کے خلاف ہے۔

باب ماجاء فی استحباب التمر

ربط: پہلے والے باب میں قناعت کا ذکر تھا کہ دو کے بجائے ایک پر قناعت کرنا چاہئے اور اگر گھر میں تمر ہو تو باقی طعام سے قناعت ہوجاتی ہے اسی کو اس باب میں ذکر کردیا۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور وہ شہر جن میں تمر زیادہ ہوتے تھے ان کا زیادہ مال تمر تھا اب جس کے گھر میں تمر ہو وہ بھوکے نہیں ہونگے اور جن کے گھر میں نہ ہو تو وہ بھوکے ہوسکتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس روایت میں قناعت اور صبر کی تلقین ہے کہ کھجور ہو یہی کافی ہے اس پر قناعت کریں ہاں کھجور نہ ہو پھر کہہ سکتے ہیں کہ بھوکے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کھجور کی فضیلت مراد ہے کہ یہ عمدہ رزق ہے اور احادیث میں بھی اسکی فضیلت بیان کی ہے فرمایا ''المؤمن الذی لایقرء القرآن کالنخل'' کہ مؤمن جو قرآن نہ پڑھے وہ کھجور کی طرح ہے اور کھجور میں خوشبو نہیں ہوتی تو مؤمن سے اسکو تشبیہ دی، اس کے علاوہ نخل کی بڑی خصوصیات ہیں اس میں جو طاقت ہے وہ دوسری چیز میں نہیں، ایک روایت میں ہے کہ عوالی عجوہ کے کوئی سات دانے بھی کھالے تو دن بھر سحر اور دوسری زہریلی چیزوں سے محفوظ رہے گا۔

باب ماجاء فی الاکل مع المجزوم

اس باب میں دو روایات ہیں ایک جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ مرفوع ہے اور دوسری شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ موقوف ہے اور یہ ترمذی کے نزدیک زیادہ راجح ہے، پہلی روایت میں ہے کہ مجزوم کو حضور ﷺ نے پکڑا اپنے ساتھ بیٹھا کر کھلایا شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طرح کیا تو دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیماریوں میں تعدی نہیں ہے، اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا ایک جزامی مولا تھا وہ ہمارے ساتھ کھاتا پیتا تھا ہمارے بستروں پر لیٹ جاتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسکو ساتھ بٹھا سکتے ہیں دوسری روایت میں ہے ''فر من المجزوم کما تفر من الاسد'' یہاں بھاگنے کا حکم ہے اسی طرح بنو ثقیف سے لوگوں کو روکا تھا تو ان روایات میں تعارض ہوا۔ علماء نے اس تعارض کو دور کرنے کیلئے تطبیق اس طرح دی ہے کہ جو مصائب برداشت کرسکے اور اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کامل ہو ''لاعدو'' پر یقین کامل ہو اور عقیدہ درست ہو ان کو بھاگنے کا حکم نہیں بلکہ وہ مجزوم کو اپنے ساتھ شریک کرسکتے ہیں کیونکہ اگر بیماری لگ بھی گئی تو اسکا یقین ہوگا کہ اس سے بیماری نہیں لگی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی سے لگی

ہے جس طرح اونٹوں کے بارے میں آدمی کو جواب دیا تھا ''فمن اجرب الاول'' اور ایک وہ آدمی ہے جس میں صبر وتحمل نہیں ممکن ہے اسکو بیماری لگے اسکا عقیدہ خراب ہوجائے تو وہ بیماری کی تعدی کا قائل ہوجائے گا جو حدیث کے خلاف ہے اسلئے اس قسم کے لوگوں کو بھاگنے کا حکم ہے تاکہ عقیدہ خراب نہ ہو اور حدیث کی مخالفت کر کے گنہگار نہ ہوجائے۔

باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معی واحد

کافر سات امعاء میں کھاتا ہے یعنی سات کو بھرلیتا ہے اور مؤمن ایک کو بھرتا ہے اسکی تشریح میں اختلاف ہے ① بعض ظاہر پر عمل کرتے ہیں اور بعض ظاہر پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اس میں مؤمن کی شان بتائی کہ کم کھاتا ہے عبادت وفکر آخرت کی وجہ سے اور کافر کو فکر نہیں اسلئے وہ زیادہ کھاتا ہے ② مؤمن کو ترغیب ہے کہ کم کھانا چاہئے ③ حلال وحرام کی طرف اشارہ ہے کہ مؤمن حلال کھاتا ہے اور حلال کم ہوتا ہے اور کافر حرام کھاتا ہے اور حرام زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر ظاہر مراد لیا جائے ① تو پھر اس سے خاص اس کافر کا واقعہ ہے جو یہاں مذکور ہے کہ یہ جب کافر تھا تو اتنا کھایا کہ گویا سات امعاء میں ڈالا اب مسلمان ہوا تو کم پیا گویا ایک آنت بھری مگر اسکو بعض نے رد کیا ہے کیونکہ حدیث میں عموم ہے۔ ② بعض نے کہا کہ اسمیں مؤمن کی شان بیان کی گئی ہے کہ مؤمن میں حرص ولالچ نہیں ہوتی اسلئے کم کھاتا ہے اور کافر حریص ولالچی ہوتا ہے اس لئے زیادہ کھاتا ہے۔ ③ بعض نے کہا کہ سبعۃ امعاء سے سات برے صفات مراد ہیں۔ امل، حسد، طمع، سوء طبع وغیرہ یہ کافر میں ہیں اور مسلمان میں صرف ایک ہے وہ سد الخلۃ ہے۔ بعض نے کہا کہ شہوات مراد ہیں، شہوۃ البطن، شہوۃ السمع، شہوۃ البصر وغیرہ یہ کفار میں موجود ہیں اور مسلمان میں صرف ایک ہی ہے سد الخلۃ۔

باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین

ربط: پہلے باب میں ترغیب تھی کہ کم کھانا چاہئے جو ضرورت پوری کرے شہوات پوری نہیں کرنی چاہئے، اس باب میں بھی سد الخلۃ کا ذکر ہے کہ کم کھانا چاہئے کہ ایک کھانا دو کیلئے کافی ہوجائے وہ دونوں کھالیں یعنی ایک اگر پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو جب اسکو دو کھائیں گے تو دونوں کا پیٹ نہیں بھرے گا مگر بھوک ختم ہوجائی گی یہ معنی ہے یکفی کا۔

باب ماجاء فی اکل الجراد

''جراد'' بمعنی ٹڈی، ابن العربی فرماتے ہیں کہ اسکی کئی انواع ہے ان میں سے جو حجاز کی ٹڈیاں ہیں یہ بڑی ہوتی ہے ان میں ضرر نہیں یہ مباح ہیں اور اندلس کی ٹڈیوں میں ضرر ہیں اور چھوٹی بھی ہیں اسلئے یہ نہیں کھانے چاہئے اسمیں جانوروں کے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''لا اکلہ ولا احرمہ'' اور بعض روایات میں نأکل معہ کے الفاظ آتے ہیں اسلئے جو لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے نہیں کھایا وہ معیت سے معیت فی السفر مراد ہے اگر معیت فی الاکل مراد ہو تو حضور ﷺ کا کھانا بھی ثابت ہوگا باقی اسکا ذبح امام مالک کے ہاں ہے باقیوں کے ہاں ذبح نہیں۔

باب ماجاء فی اکل لحوم الجلالۃ والبانہا

''جلالہ'' وہ حیوان جو گندگی کھاتے ہیں الجلۃ بمعنی البعرہ مینگنی کچھ حیوانات ایسے ہوتے ہیں کہ کوڑا کرکٹ اور گندگی کھاتے ہیں، اگر غالب غذا گندگی ہو اور گندگی کے اثار اسکے جسم اور لبن میں ہوجائیں احناف وشوافع رحمہم اللہ کے ہاں اس کا گوشت مکروہ ہے بعض نے تحریمی کہا ہے بعض نے تنزیہی۔ اب اسکی پاکی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو باندھ لیا جائے کئی دنوں تک اسکی غذا گندگی ختم ہوجائے اور وہ

صرف گھاس ہی کھانے لگے پھر کھانا جائز ہے، اسکے لئے وقت مقرر کیا ہے کہ بڑے حیوان کو چالیس دن تک باندھا جائے پھر لحم اور لبن کھانا جائز ہے اوسط جانور (بھیڑ، بکری) کو پانچ دن تک اور چھوٹا جانور (مرغی وغیرہ) کو تین دن تک باندھا جائے۔

''جلالۃ'' جلہ سے ہے بمعنی روثۃ الغنم والابل، شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک استدلال کیا ہے ابواب مایوکل لحمہ احناف کے ہاں ناپاک ہے اسکی ناپاکی پر اس جلالہ والی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ روث وغیرہ کھانے والے جانور کا کھانا جائز نہیں۔ تو بول اور روث وغیرہ کب جائز ہونگے۔

باب ماجاء فی اکل الدجاج

''دجاج'' دال کے تینوں حرکتوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے البتہ دال کے ضمہ کے ساتھ قلیل ہے، بعض نے کہا ''دجاج'' اناث کیلئے ہے اسکی مفرد دجاجۃ ہے اور دجاج مذکر کیلئے ہے اور اسکی مفرد دایک ہے ادن فکل شائدز ھدم الجری اس کے کھانے کو پسند نہ کرتے تھے کہ یہ جلالہ کی طرح پھرتی ہے تو ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھانے کا کہا کہ حضور ﷺ بھی کھاتے تھے۔

باب ماجاء فی اکل الحباریٰ

''حباریٰ'' ایک پرندے کا نام ہے بعض نے کہا اسکی جمع حباریات ہے بعض نے کہا حباریٰ قلیل، کثیر، مؤنث، مذکر، سب پر اسکا اطلاق ہوتا ہے، حباریٰ ایک طویل العنق خاکستری رنگ کا پرندہ ہے، بعض نے اسکی تعبیر سرخاب سے کی ہے بعض نے مرغ فیل مرادلیا ہے، اسکے بارے میں ضرب المثل مشہور ہے کہ ہر چیز اولاد سے محبت رکھتی ہے (کل شیٔ یحب ولدہ حتی الحباریٰ) یہ اسلئے کہ مشہور ہے کہ اسمیں عقل نہیں احمق ہے تو احمق پرندہ اولاد سے محبت کرے تو باقی چیزیں بھی محبت کریں گی، اور یہ پرندہ بالاتفاق مباح ہے۔ بریہ بعض نے کہا کہ یہ ابراہیم کی تصغیر ہے بعض۔ نے کہا کہ یہ انکا لقب تھا نام ابراہیم تھا۔

باب ماجاء فی الشواء

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ لحم مشوی کھائی ہے جبکہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نہ آپ ﷺ نے نرم روٹی کھائی نہ آپ کیلئے شاۃ کو بھنا گیا ہے تو بظاہر روایت میں تعارض ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا مطلب ہے کہ پوری بکری نہیں بھنی گئی اور کتاب کی روایت سے جنب یا بعض روایات میں ذراع وغیرہ کا ذکر ہے کہ کھایا ہے مگر پوری بکری نہیں کھائی، بعض نے کہا کہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے علم کے مطابق کہا ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے علم کے مطابق کہا اور جنکو علم ہے وہ حجت ہے انکے لئے جن کو علم نہیں تو انکے لئے لحم مشوی جائز ہے، اب بہتر کیا ہے تو کہتے ہیں کہ لحم مشوی لذیذ تو ہوتا ہے لیکن مفید اور بہتر شوربہ والا ہے کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ جب گوشت پکاؤ تو شوربہ زیادہ رکھو اور شوربے کو احد اللحمین کہا گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ اس روایت میں ہے کہ وضو مما مستہ النار کا کیا حکم ہے؟ بعض کے ہاں وضو لازم ہے اور بعض کے ہاں وضو لازم نہیں دیکھئے باب کی روایت ہے، بعض نے کہا جہاں وضو کا ذکر ہے تو اس سے وضو لغوی مراد ہے کہ ہاتھ دھو کر کلی کریں اسی پر وضو کا اطلاق کیا گیا ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ الاکل متکئًا

اما انا فلا اکل متکئًا، اہل علم کہتے ہیں اس روایت کا شان ورود یہ ہے کہ اعرابی کہتے ہیں کہ میں نے گوشت کا ہدیہ کیا آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے جبرائیل نے اشارہ کیا آپ ﷺ فوراً سیدھے ہوگئے بعض نے کہا کہ جبرائیل امین آئے اور کہا کہ اللہ

تبارک وتعالیٰ نے اختیار دیا کہ دنیا میں نبی بادشاہ بنیں یا عبد اور نبی بن جائیں اور ساتھ مشورہ بھی دیا کہ تواضع کو اختیار کریں تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا میں عبد و نبی بننا چاہتا ہوں اور عبدیت میں ہر اس چیز کو چھوڑنا ہے جو متکبرین کا طریقہ ہے اس میں سے تکیہ لگا کر کھانا بھی متکبرین کا طریقہ ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ حکم خاص حضور ﷺ کیلئے تھا، مگر جمہور کہتے ہیں کہ یہ حکم سب کیلئے ہے۔

تکیہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دیوار وغیرہ سے ٹیک لگائے یا بائیں ہاتھ پر سہارا لگا کر کھائیں سب مکروہ ہے کیونکہ اسمیں کھانے کی بے حرمتی ہے۔

باب ماجاء فی فضل الثرید

"ثرید" کی چند خصوصیات ① یہ طاقتور اور جلد ہاضم ہے ② اس میں اجتماعیت زیادہ ہوتی ہے کہ سب مل کر کھاتے ہیں "کمل من الرجال کثیر" تو یہاں کمال سے مراد ایک تو کمال نبوت اور اسکے نیچے درجات ہیں، جیسے صدیقیت، شہادت، وغیرہ۔ جمہور کہتے ہیں کہ مردوں کے جو کمالات ہیں نبوت، صدیقیت، شہادت ان کو بہت سے مردوں نے حاصل کیا ہے اور عورتوں کے جو کمالات ہوتے ہیں ان کو عورتوں میں بہت کم عورتوں نے حاصل کیا۔ اشعری کہتے ہیں کہ ۶ عورتوں کو نبوت ملی ام موسیٰ، مریم، حوا، سارہ، آسیہ اور ھاجرہ ② بعض لوگوں سے نبوت مراد ہے کہ مردوں میں بہت کو نبوت ملی عورتوں میں کم کو ملی تو ان کے ہاں عورتیں بھی نبی تھیں کیونکہ انکی طرف وحی آئی، جمہور کے ہاں عورتوں کو نبوت نہیں ملی دلیل پیش کرتے ہیں ﴿وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم﴾ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ یہاں رسالت کی عورتوں سے نفی ہے نبوت کی نہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ مردوں کے بعض خاص امور ہیں جیسے نبوت اور حاکمیت لیکن عورتوں کی الگ خصوصیات اور ذمہ داریاں ہیں۔

اس حدیث کا صحیح مطلب کمالات سے مراد مطلق کمالات ہیں صرف نبوت مراد نہیں۔ "فضل عائشة علی النساء" نساء سے مراد سارے زمانے کی نساء مراد ہیں ② اسی زمانے کی نساء مراد ہیں ③ اس امت کی عورتیں مراد ہیں۔ اور فضل سے فی الجملہ فضیلت مراد ہے جس طرح ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہر اعتبار سے نہیں اسی طرح بعض کے ہاں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت ہر عورت پر ہر اعتبار سے نہیں بلکہ فی الجملہ فضیلت مراد ہے۔

باب ای اللحم کان احب الی رسول اللہ ﷺ

"الذراع" کے پسندیدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو جلدی پک جاتا ہے دوسرا لذیذ ہوتا ہے تیسرا یہ گندگی کی جگہوں سے دور ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الخل

"نعم الادام الخل" اَدَم یا دِم جس چیز کے ساتھ روٹی کھائی جائے، ادام یہاں مفرد ہے اُدم جمع ہے اور اُدُم یہ بھی مفرد ہے، اسکا ترجمہ ہوا کہ بہتر سالن سرکہ ہے۔ اسکا مقصد کیا ہے؟ ① امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے تقلیل فی انواع الاطعمہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تکلف نہیں کرنا چاہئے کم سے کم چیز پر بھی قناعت کرنا چاہئے ② بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے بھی آیا کہ معمولی چیز پر قناعت کرنا چاہئے یہاں اور آگے اس باب کی احادیث میں خل کی فضیلت کا بیان ہے کہ سرکہ بہترین سالن ہے اسلئے اس کو ادام کے طور پر استعمال کریں اس کو چھوڑ کر دوسرے ادام کی طرف نہ جاؤ اور دونوں اقوال جمع بھی ہو سکتے ہیں کہ خل کی فضیلت بھی ہے اور تقلیل بھی، کہ جب یہ مل جائے تو دوسری اشیا کی طرف مشغول ہونے کی ضرورت نہیں یہی کافی ہے۔

"ما اقفر بیت" قفر بمعنی چٹیل میدان، جوگھر سالن سے خالی ہوتو اسکو چٹیل میدان سے تشبیہ دی گئی۔

باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرطب

دونوں کو ملا کر کھانے کی اجازت دی ہے، اسکے دو فوائد ہیں، ایک تو یہ کہ کھجور گرم ہوتی ہے اور خربوزہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو دونوں کے ملنے سے اعتدال پیدا ہوتا ہے ② زیادہ پھل ہوں تو مختلف انواع کا استعمال جائز ہے، بطیخ کے بارے میں اختلاف ہے بعض کے ہاں بمعنی خربوزہ اصفر اور بعض کے ہاں خربوزہ بھی گرم ہے اسلئے اس سے تربوزہ اصفر مراد ہے جو ٹھنڈا ہوتا ہے لیکن لغت میں سب نے معنی خربوزہ کیا ہے اور اسمیں گرمی کم ہوتی ہے اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور پکنے سے پہلے کھانا مراد ہے اسوقت یہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

حضور اکرم ﷺ نے ابوال ابل کے پینے کا حکم دیا تھا اسلئے اسکو ابواب الاطعمہ والاشربہ میں لائے اسکی تفصیل جزء اول میں گزر چکی ہے، امام صاحب کے نزدیک یہ ناپاک ہے اسکا پینا جائز نہیں شوافع اور امام محمد کے ہاں پاک ہے اور ابو یوسف کے ہاں بطور دوائی کے استعمال جائز ہے۔

باب الوضوء قبل الطعام وبعده

یہاں وضو سے لغوی مراد ہے اصطلاحی وضو مراد نہیں اصطلاحی وضو صرف عبادات کیلئے ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا انما امرت بالوضوء اذا قمت الی الصلوٰۃ ، باقی کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا مستحب ہے بعض کے ہاں مکروہ ہے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہ نجاست لگی ہو تو ضروری ہے ورنہ مستحب نہیں۔

باب ماجاء فی اکل الدباء

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے کدو اسلئے پسند ہے کیونکہ حضور ﷺ اس کو پسند کرتے تھے کیونکہ ایک تو نرم غذا ہے اور بدن کیلئے بھی مفید ہے، طب کے لحاظ سے اسمیں کوئی ضرر بھی نہیں دوسرا عرب میں اسوقت اسکی پیداوار بھی زیادہ تھی "تتبع فی الصحفه" حضور ﷺ نے تو منع کیا تھا کہ اپنے سامنے سے کھانا چاہیئے، خود حضور ﷺ کیوں تلاش کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے سامنے کدو تلاش کر رہے تھے۔

جواب نمبر ❷: ممانعت تب ہوتی ہے جب ساتھیوں کو کراہیت محسوس ہو، یہاں کراہت تو کیا صحابہ کرام یہ پسند کرتے تھے کہ حضور ﷺ ہمارے سامنے سے کھائیں تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو اسلئے ساتھیوں کے اصرار پر حضور ﷺ نے انکے سامنے سے کھایا ہو، یہ تو حضور ﷺ کا معاملہ ہے عام لوگوں کی بات نہیں۔

باب ماجاء فی الاکل مع المملوک

اسلامی تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غلام کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤ یہ جبابرہ اور متکبرین کے خلاف ہے "فان ابی" ① اگر خادم ساتھ نہ کھائے تو اسکو ایک دو لقمے دے دے جب کھانا کم ہو ② جب مالک ساتھ بٹھانے سے انکار کر دے تو اسکو ایک دو لقمے تو دیدے یہ اسلامی اخلاق میں سے ہے۔

باب ماجاء فی فضل العشاء

''عشاء'' شام کا کھانا، اسمیں عشاء کی فضیلت بیان کی جارہی ہے کہ عشاء کھاؤ اگر چہ ایک کف کی مقدار ردی کھجور ہی کیوں نہ ہو ''حشف'' ردی، بے کار، سوکھی ہوئی سب کو شامل ہے، عشاء کو چھوڑنا کمزوری ہے ''مھر مۃ'' ھرم ہے بمعنی بڑھاپا، یہ جملہ عرب میں مشہور ہے لیکن یہ تحقیق نہیں کہ اس جملے کو حضور اکرم ﷺ نے کہا ہو یا پہلے بھی لوگ کہتے تھے کہ ترک العشاء مھر مۃ کھانا کھائے تو معدہ کھانے کے ہضم میں مشغول رہتا ہے لیکن معدہ خالی ہو تو وہ باقی قوتوں کی طرف مشغول ہو جاتا ہے جو انسان کی کمزوری کا باعث ہے۔

باب ماجاء فی تسمیة علی الطعام

تسمیہ ابتداء میں کہنا چاہئے اگر بھول جائے تو درمیان میں کہہ دے وہ برکت حاصل ہو جائے گی جو شروع میں پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے ''ابوذر'' گوشت کے ٹکڑے جن میں ہڈی نہ ہو۔ حدیث میں بسم اللہ کا ذکر ہے تو کیا بسم اللہ ہی پڑھی جائیگی یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تو جمہور اہل علم کے ہاں بسم اللہ پڑھے۔ امام نووی فرماتے ہیں بسم اللہ کافی ہے اور افضل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے لقمے پر یعنی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے دوسرے لقمے میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے تیسرے میں بسم اللہ پڑھے تا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر سے کبھی غفلت نہ ہو۔

ابواب الاشربہ

اطعمہ کے بعد اشربہ کو لایا کیونکہ آپس میں گہرا تعلق ہے اشربہ میں تو بعض اشربہ محرمہ ہیں انکا ابتداء میں ذکر کیا جس طرح ان اطعمہ کو پہلے لایا جن میں اختلاف ہو یا وہ مکروہ ہو اسی طرح اشربہ محرمہ میں بھی اختلاف ہے اسلئے اس کو پہلے ذکر کیا جارہا ہے، ''لم یشربھا فی الآخرۃ'' اس جملے کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے ① بعض کے ہاں یہ جملہ لم یدخل الجنۃ سے کنایہ ہے کیونکہ جنت میں چلا جائے تو ہر چیز ملے گی اسلئے یہ جنت میں جائیگا ہی نہیں، کیونکہ جب مسلسل پیتا رہا تو یہ دلیل ہے کہ حلال سمجھتا تھا اور تحلیل الحرام کفر ہے اور کافر جنت میں نہ جائیگا ② حدیث ظاہر پر ہے کہ جنت میں جائیگا مگر اسکو پینے سے محروم کردیا جائے گا، بعض نے کہا کہ وہاں بھول جائے گا اسلئے مانگے گا ہی نہیں بعض نے کہا یاد تو ہوگا مگر خواہش نہ ہوگی اسلئے نہ ملے گا، بعض نے کہا کہ اللہ نے وقت مقرر کیا تھا کہ دنیا میں نہ ملے گا لیکن اس نے وقت سے پہلے پی لیا اسلئے اب آخرت میں نہیں ملے گا جس طرح باپ مرجاتا ہے تو بیٹا وارث ہوتا ہے لیکن اگر بیٹے نے باپ کو قتل کردیا تو اس کو میراث نہیں ملے گی کیونکہ اس نے وقت سے پہلے میراث کے حصول کی کوشش کی، یہ گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں لیکن اگر توبہ نہیں کی تو لم یشربھا فی الآخرہ۔

من شرب الخمر لم تقبل له صلوٰة اربعين صباحا شراب کی اتنی نحوست ہے کہ اسکے پینے کے بعد چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوگی، لم تقبل کے دو معنی ہیں ① نماز ہی قبول نہ ہوگی فریضہ ہی ادا نہ ہوگا ② فریضہ ادا ہوگیا مگر اسپر ثواب مرتب نہ ہوگا، اور دوسری عبادات قبول ہوگی بعض نے کہا کہ نماز ام العبادات ہے اور شراب ام الخبائث ہیں تو جب ام العبادات ہی قابل قبول نہیں تو پھر دیگر عبادات کیسے قبول ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ نماز ہی کہ وجہ سے شراب حرام کیا گیا ہے اسلئے نماز کا ذکر کیا ورنہ قبول باقی عبادات بھی نہ ہوگی ''صباحا'' بعض نے اس قید سے کہا کہ صبح کی نماز قبول نہ ہوگی تو صبح کی نماز کی اہمیت بتائی لیکن عام لوگ کہتے ہیں کہ صباح سے یوم مراد ہے کہ ۴۰ دن تک قبول نہ ہوگی چالیس دن اسلئے کہا کہ کیونکہ تغیر ۴۰ دن میں ہوتی ہے تو شراب کے اثرات بھی چالیس دن تک رہتے ہیں اور چالیس دن کے بعد اس کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں۔

''فان تاب لم يتب الله عليه'' چوتھی مرتبہ پیئے اللہ سے توبہ کرے تو توبہ قبول نہ ہوگی لیکن عام تو یہ ہے کہ توبہ قبول ہوتی ہے غرغرے سے پہلے لیکن یہاں زجراً فرمایا کہ اسکا جرم بڑا ہے کہ یہ توبہ کرکے توڑ دیتا ہے تو زجر کی بناء پر کہا کہ اب تمہیں توبہ کا موقع نہیں ملے گا۔ ابن العربی نے وجہ لکھی ہے کہ حدیث میں ہے ما احر من استغفر اسپر لکھا ہے بعض گناہ کی نحوست سے دل بند ہوجاتا ہے مہر جباریت لگ جاتی ہے پھر دل میں ندامت ہی نہیں رہتی، جب ندامت ہی نہ ہو تو وہ توبہ نہیں کرتا ہے بلکہ توبہ کی توفیق ہی نہیں ملتی۔

باب ماجاء كل مسكر حرام

خمر کی تعریف میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ خمر کس کو کہتے ہیں؟ جمہور ائمہ ثلاثہ اور امام محمد کے نزدیک ہر مسکر خمر ہے دلیل ہے ''کل مسکر خمر'' اسی طرح وہ روایت بھی ہے کہ ''الخمر من ھاتین الشجرتین'' امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی، سفیان ثوری کے نزدیک خمر خاص ہے، ھـو النی من ماء العنب اذا اشتدو قذف بالزبد۔ تو خمر صرف یہی ہے باقی اشربہ حرام ہیں مگر خمر نہیں۔

احناف کی دلیل نمبر ②: اس پر تمام اہل لغت کا اتفاق ہے کہ خمر کا اطلاق انگور کے کچے پانی پر ہوتا ہے جب اسمیں جوش آئے اور وہ گاڑھا ہوجائے، صاحب کشاف نے بھی اسکی صراحت کی ہے۔

''عصیر''انگور کا پانی دوثلث سے کم پکایا جائے''نقیع الذبیب''مسکر جو تمر سے بنتا ہے۔یہ تینوں تب حرام ہونگی جب نشہ آئے لیکن اگر نشہ نہ آئے تو حرام نہیں،یہ احناف کا مسلک ہے،صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ خمر میں دس (۱۰) چیزوں میں بحث ہے پہلی بات تعریف ہے کمامر اسکی نجاست غلیظہ ہے،اسکا قلیل وکثیر سب حرام ہے اسکی حرمت قطعی ہے اسکا مستحل کافر ہے،اس سے انتفاع حرام ہے اگر پکایا جائے تو اسکی حرمت ختم نہیں ہوگی البتہ سرکہ بنایا جائے تو پاک ہوجائے گا کیونکہ تبدیل ہوگیا۔جبکہ باقی مشروبات کی حرمت قطعی نہیں اسلئے امام صاحب دونوں میں فرق کرتے ہیں،روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کو نبیذ پیش کیا گیا حضور اقدس ﷺ نے سونگھا تو جب شدت محسوس کی تو پانی ڈالا اور جب پتلا ہوگیا تو استعمال کیا اسلئے باقی نبیذ وغیرہ مطلقاً حرام نہیں بلکہ جب مسکر ہو تب حرام ہوگا مسکر نہ ہو تو جائز ہے لیکن تب جب تقویت کیلئے ہو تلھی کیلئے پینا ہمارے ہاں بھی جائز نہیں۔شاہ صاحب فرماتے ہیں آج کل لوگ اسکو بطور تلہی کے استعمال کرتے ہیں اسلئے آج کل فتویٰ امام محمد کے قول پر دیا جاتا ہے کیونکہ اگر قلیل میں نشہ نہ ہو تو قلیل داعی ہے کثیر کا تو وہ زیادہ پی لیگا ممکن ہے نشہ آجائے تو حد آجائے گی۔

خمر کو خمر کیوں کہتے ہیں اسمیں اختلاف ہے امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تخمیر سے ہے یعنی کسی چیز کو نچھوڑ دیں کہ اسمیں تبدیلی آجائے،شوافع کہتے ہیں کہ یہ مخامرۃ العقل سے ہے اسلئے اسکو خمر کہتے ہیں یہ دونوں معنی لغت میں موجود ہیں اور دونوں اوصاف اسمیں موجود ہیں کہ نچھوڑا بھی جاتا ہے اور عقل بھی زائل کردیتا ہے۔

باب ماجاء ما اسکر کثیره فقليله حرام

اگر کوئی چیز زیادہ پی جائے اور اس سے نشہ آجائے تو اسکا قلیل بھی حرام ہے کیونکہ قلیل سبب اور داعی ہے کثیر کیطرف اس لئے اس کا قلیل بھی حرام ہے یہ احتیاط کی باب سے ہے کہ جس کے کثیر سے نشہ آجائے اس کا قلیل بھی استعمال نہ کریں تاکہ حرمت کی حد تک نہ پہونچ جائے اور حرام کا مرتکب نہ ہوجائے تو یہ سدالذرائع کے ابواب میں [illegible] ہیں،باقی امام صاحب کا فتویٰ اپنے زمانے کے حوالے سے تھا۔

باب ماجاء فی نبیذ الجر

یہاں سے برتنوں کے استعمال کے بارے میں ترمذی بحث کررہے ہیں،''الجر'' کی جمع جرار بمعنی مٹکا جس کو مٹی سے بنایا جاتا ہے اسمیں لوگ شراب بناتے تھے،تو جس مٹکے میں شراب بنایا جائے اسکا کیا حکم ہے؟ کسی نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ کیا حضور اقدس ﷺ نے نبیذ الجر سے منع کیا تھا جواب دیا نعم جی ہاں منع کیا ہے۔کیونکہ یہ برتن شراب کیلئے استعمال ہوتے ہیں اور اگر آپ نبیذ بنائیں گے تو اس برتن میں نبیذ بہت جلد شراب بن جاتا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ نبیذ سمجھ کر استعمال کیا جائے اور وہ شراب ہو تو حرام کے مرتکب ہوجائیں اور اگر معلوم ہوجائے تو گرانا پڑے گا جو کہ مال کا نقصان ہے۔

باب ماجاء فی كراهية ان ينتبذ فی الدباء

''الحنتم''،بمعنی الجرۃ،اس سے مراد کیا ہے اسمیں مختلف اقوال ہیں ① خاص قسم کا سبز مٹکا ہے ② جو بھی مٹی سے بنایا جائے ③ اس سے مقیر مراد ہے کہ جنکے اندر سے تارکول وغیرہ لگایا جائے ④ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اس سے وہ مٹکے مراد ہیں جو مصر سے لائے جاتے ہیں جو سرخ رنگ کے ہوتے تھے اور دستہ کنارے پر ہوتا تھا ⑤ طاؤس فرماتے ہیں کہ وہ مٹکے مراد ہیں جن کے پانی نکالنے کی جگہ کنارے پر ہوتی ہے ⑥ اس سے وہ مٹکے مراد ہیں جن کو گارے،اون اور بالوں سے بنایا جاتا ہے۔

حنتم، دباء اور نقیر میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی علت بعض نے لکھی ہے کہ یہ بالکل بند برتن ہوتے ہیں ہوا کے نکلنے کی جگہ نہیں ہوتی اس لئے نبیذ کا شراب میں تبدیل ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ ملا علی قاری کہتے ہیں کہ ممانعت کی علت یہ ہے کہ ابتداءً جب کسی چیز کی ممانعت ہوتی تو تشدید کا پہلو اختیار کیا جاتا تاکہ لوگ اس عادت کو چھوڑ دیں، جیسے پہلے زیادہ قبور سے منع کیا جب شرک کا خطرہ ختم ہوگیا تو قبرستان جانے کی اجازت دیدی اسی طرح جب شراب حرام کیا گیا تو یہ عادت ختم کرنے کیلئے ان برتنوں سے بھی منع کیا جس میں یہ بنایا جاتا تھا کہ انکو مکمل نفرت ہو جائے پھر جب نفرت مکمل ہوگئی تو ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی اجازت دیدی جس طرح اگلے باب میں ہے ''ان ظرفا لایحل شیئا ولا یحرمہ'' ① اس روایت سے پہلا حکم منسوخ ہوگیا ② یا آپ نے اجتہاد کیا پہلے حرمت کا حکم دیا جب برتن کم ہونے کی شکایت کی تو حرج کی وجہ سے اجازت دیدی ③ یا پہلے جو حکم دیا تھا سد اللذ رائع کے قبیل سے تھا۔

باب ماجاء فی الانتباذ فی السقاء

پہلے بھی ان برتنوں کا ذکر کیا جس میں نبیذ بنانے سے منع کیا گیا تھا مگر ان برتنوں میں سقاء کی وہاں بھی اجازت تھی۔ ''نبیذ'' بمعنی پھینکنا اور نبیذ میں بھی پانی کے اندر کھجور پھینکی جاتی ہے تاکہ پانی کا کھارا پن دور ہو جائے۔ ''یوکاءِ'' ایکاء سے ہے بمعنی باریک رسی، مسلم میں بھی مہموز العین کا ذکر ہے، نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ تصحیف ہے صحیح یوکیٰ ہے ناقص یائی ''غرلاء'' ٹوٹی وغیرہ جو مشکیزے کے نیچے سوراخ رکھا جاتا ہے۔

اشکال: یہاں پر یہ ہے کہ رات کا نبیذ صبح پیتے تھے صبح کا رات کو جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ تین دن تک رکھتے تھے؟ جواب: یہ اختلاف ازمنہ کے اعتبار سے ہے سردیوں میں تین دن تک رکھتے تھے مگر گرمیوں میں جلدی تبدیلی آجاتی تھی اس لئے ایک دن سے زیادہ نہیں رکھتے تھے باقی سقاء میں اجازت دی کیونکہ اسمیں جلدی تبدیلی نہیں آتی ہے اور اگر تبدیل آبھی جائے تو معلوم ہو جائے گا کیونکہ وہ مشکیزہ فوراً پھٹ جاتا ہے اسلئے اس میں شروع سے اجازت دی۔

باب ماجاء فی الحبوب التی یتخذ منھا الخمر

خمر کا اطلاق دو قسم پر ہے ایک عمومی دوسرا خصوصی، عمومی اطلاق مسکر پر ہوتا ہے باقی خصوصی اطلاق النّئی من ماء العنب الخ پر ہوتا ہے اور یہاں خمر کا اطلاق عمومی ہے، جمہور کے نزدیک خمر کا شرعی معنی کل مسکر حرام ہے امام صاحب فرماتے ہیں عام طور پر عصیر سے بنایا جاتا تھا مگر بعض لوگ عسل، گندم، اور جو وغیرہ سے بھی بناتے تھے اور کسی چیز پر بھی اکثریت کی وجہ سے اس پر حکم لگایا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں یہ چیزیں خمر نہیں اکثریت کی وجہ سے اس پر خمر کا اطلاق ہوا لیکن فتویٰ جمہور کے قول پر ہے۔

باب ماجاء فی خلیط البسر والتمر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسر اور تمر کو ملا کر نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، یہ ممانعت اب بھی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے ① احمد و اسحاق بن راہویہ اور امام مالک کا ایک قول ہے کہ دونوں کو ملا کر نبیذ بنانا حرام ہے دلیل باب والی روایت ہے باقی الگ الگ بنا سکتا ہے ② امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں دو چیزوں کا نبیذ بنانا مکروہ تنزیہی ہے امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے ③ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز ہے کہ جب ایک ہو تو جائز ہے تو دونوں کو ملانے سے کیا خرابی آگئی؟ امام نووی نے اس پر رد کیا ہے کہ امام صاحب کا قول حدیث کے مقابلے میں ہے۔ عینی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کی ذاتی رائے ہو تو نووی کی بات صحیح ہے

لیکن امام صاحب نے تو حدیث لیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کیلئے تمر اور بسر کو ملا کر نبیذ بناتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک اور روایت میں بسر اور تمر کے ملانے کا ذکر ہے، زیاد کے واقعہ میں لکھا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے نبیذ پلایا مجھے نشہ ہو گیا صبح دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے زبیب اور عجوہ کا نبیذ پلایا تھا۔ اسلئے امام صاحب نے ان روایات کی وجہ سے جواز کا قول اختیار کیا باقی ممانعت کی علت یہ تھی کہ لوگوں کے پاس مال کم تھا مقصد یہ تھا کہ ملانے کے بجائے دوسرے بھائی کو دیدیں مگر جب مال کی وسعت ہوگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا جمہور کہتے ہیں کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کو ملانے میں تبدیلی جلدی ہوتی ہے اسلئے اسکار کا خطرہ ہے۔

باب ماجاء فی کراهية الشرب فی آنية الذهب والفضه

چونکہ یہ ابوب الاشربہ ہیں اسلئے ترجمۃ الباب میں کراہیۃ الشرب کہا ورنہ اس میں پینے کی طرح کھانا بھی جائز ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گورنر بنایا تھا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت تک مدائن کے گورنر بھی رہے یہ صاحب سر رسول اللہ ﷺ تھے انہوں نے مدائن میں کسی سے پانی مانگا ''فاتاہ انسان'' بخاری میں ہے ''دھقان'' ایک روایت میں مجوسی ہے تو تعارض نہیں ہوسکتا، وہ دھقان مجوسی بھی ہو اور انسان بھی ہوگا یہ چاندی کے برتن میں پانی لے آئے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو پھینک دیا، اسی پر فرمایا کہ میں نے اسکو بار بار اس کے استعمال سے منع کیا لیکن اس نے بات نہ مانی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کے برتن میں شرب سے منع کیا ہے اور دیباج اور ریشم کے پہننے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ یہ کفار کیلئے دنیا میں ہے اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں۔ دیباج بھی ریشم کی ایک قسم ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جو لوگ دنیا میں سونے چاندی کے برتن میں کھاتے پیتے ہیں تو انکے پیٹ میں قیامت کو آگ کے شعلے ہونگے اور انکے لئے آواز ہوگی۔ جمہور بلکہ پورے امت کے نزدیک سونے چاندی کا برتن کا استعمال اکل و شرب میں حرام ہے مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے، البتہ عورتیں زیورات میں استعمال کرسکتی ہیں اسی طرح عورتیں ریشم بھی استعمال کرسکتی ہیں، اسی طرح [illegible] رات وغیرہ بھی اسی پر قیاس کیا ہے ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک اگر برتن چھوٹے ہوں جن کو کھانے پینے کیلئے استعمال نہ کیا جائے تب بھی سونے چاندی کے برتنوں سے انتفاع مطلقا ممنوع ہے۔ بعض حضرات جیسے شوکانی اور سبل السلام نے لکھا ہے کہ حدیث میں اکل و شرب کا ذکر ہے وہ ممنوع ہے مگر باقی استعمالات حدیث میں ممنوع نہیں اسلئے جائز ہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ ممانعت عام ہے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کسی جگہ بھی باقی [illegible] ثابت نہیں دوسرا اسلئے کہ حلت و حرمت کا مسئلہ ہو ترجیح احتیاطا حرمت کو دیجاتی ہے۔

باب ماجاء فی النهی عن الشرب قائماً

آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا ہے کسی نے اکل کے بارے میں سوال کیا تو جواب دیا ''ذاک اشد'' بعض میں اشر اور بعض میں اخبث ہے، ''ضالۃ المسلم حرق النار'' اس روایت کا باب سے تعلق نہیں اب امام ترمذی نے اسکو کیوں لایا؟ پہلی حدیث میں قتادہ نے ابی مسلم سے بلا واسطہ نقل کیا جبکہ ضالۃ المسلم والی یزید بن عبداللہ کا واسطہ ہے تو اس حدیث کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ قتادہ اور ابی مسلم کے درمیان واسطہ بھی ہے اور بلا واسطہ بھی روایات ہیں، حدیث کے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز گم ہوگئی دوسرا اٹھائے تعریف کیلئے نہیں بلکہ مال غنیمت سمجھے تو اس کو بدلے میں آگ ملے گی۔

باب ماجاء فی الرخصة

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم چلتے ہوئے کھاتے تھے اور کھڑے ہو کر پیتے تھے تو مطلب یہ ہوا کہ پہلے کی ممانعت منسوخ ہوگئی، باقی اس حدیث سے جو رخصت سمجھ میں آتی ہے اس سے آخری لقمہ مراد ہے کہ منہ میں ڈالا اور چل پڑے یہ جائز ہے اگر کوئی اور عذر ہو تب بھی جائز ہے ورنہ صحابہ کرام کا عام معمول بیٹھ کر کھانے پینے کا تھا جہاں قیام کا ذکر ہے وہ صرف بیان جواز یا عذر کی وجہ سے ہے باقی زمزم اور وضوء کا بچا ہوا پانی بالاتفاق کھڑے ہو کر پینا جائز ہے لیکن عام پانی کھڑے ہو کر پینا مکروہ تنزیہی ہے۔

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

یہ بھی آداب شرب میں سے ہے کہ پانی ایک سانس میں نہ پیئے بلکہ تین سانسوں میں پیئے تا کہ معدے پر بوجھ نہ پڑے اور نقصان پہونچنے کا اندیشہ نہ ہو یہ حکم شفقت پر محمول ہے، ایک روایت میں ہے "ہو امرأ واروی وابرأ" "مَرِ ءَ الطعام سے ہے بمعنی خوشگوار "اروی" سیراب ہونا "کشرب البعیر" اونٹ پانی کے اندر سانس لیتا ہے تو حکم دیا کہ برتن کے اندر سانس نہ لو بلکہ برتن دور کر کے سانس لیا کرو یہ مطلب ہے کہ اونٹ کی طرح ایک سانس میں نہ پیئیں۔

باب ماذکر فی الشرب بنفسین

اس حدیث میں دو سانسوں کا ذکر ہے تو یہ رخصت ہے کہ دو سانسوں میں پینے کی اجازت ہے اور تین دفعہ سانس لے کر پینا حضور اقدس ﷺ کا معمول تھا تو اسمیں بظاہر تعارض ہے تو اس تعارض کو اس طرح دور کیا کہ دو دفعہ جائز ہے اور تین دفعہ عام معمول تھا دوسرا یہ کہ اصل تین سانس ہے یہاں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پانی کے درمیان کے سانسوں کا ذکر کیا جو آخری سانس ہوتا ہے اس کو شمار نہیں کیا کیونکہ اس کے بعد آدمی پانی نہیں پیتا۔ دوسرا رشدین بن کریب اور محمد بن کریب دونوں بھائی ضعیف ہیں اب ان دونوں میں بہتر کون ہے دارمی نے فرمایا اقرب تھا لیکن اگر موازنہ کیا جائے تو رشدین ابن کریب بہتر ہے، یہی سوال بخاری سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ محمد بن کریب بہتر ہے اب ترمذی نے اپنا فیصلہ ذکر کیا کہ میرا فیصلہ امام دارمی والا ہے کہ رشدین بن کریب بہتر ہے۔

باب ماجاء فی کراهیة النفخ فی الشرب

پانی پیتے وقت نہ پھونکے کیونکہ اس میں تھوک وغیرہ گرنے کا خطرہ رہتا ہے بعد میں کوئی پیئے تو کراہت محسوس ہوگی یا وہ بالکل ہی نہ پیئے "فانی لا اروی من نفس واحد" ایک سانس میں پینا مشکل ہے اور سانس لینا پڑے گا اور سانس لینا برتن کے اندر نفخ کی طرح ہے اسلئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سانس لیتے وقت برتن منہ سے دور کرے برتن کے اندر سانس لینا ممنوع ہے۔

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیه

"اختناث" کسی چیز کے منہ کو کھول کر باہر کی طرف جھکانا "قعب" کہتے ہیں جب منہ کو اندر کی طرف کھولا جائے تو مطلب یہ ہے کہ مشکیزے کے منہ کو کھول کر اس پر منہ لگا کر پانی نہ پیئے اسکی کئی [illegible] ات ہیں۔

① پانی تیزی سے آئے گا تو نقصان کا خطرہ ہے ② کپڑے خراب ہو جائیں گے ③ ممکن ہے اسمیں کوئی موذی چیز حشرات میں سے ہو اور پیٹ میں جا کر نقصان کرلے یہ ممانعت بھی بطور شفقت کے ہیں، دوسرے باب میں اختناث کی اجازت معلوم ہوتی ہے،

تو اسکی تطبیق یہ ہے کہ بعض نے کہا بڑا ہو تو نہ پیئے اور چھوٹا ہو تو پی لے اور بعض نے کہا کہ پیاس لگی ہو اور پاس میں چھوٹا برتن بھی نہ ہو تو پھر چونکہ عذر ہے اسلئے منہ لگا کر پی سکتے ہیں۔

باب ماجاء ان الایمنین احق بالشرب

یہاں بھی ایک ادب بیان کیا جا رہا ہے کہ بڑا ہو اس کو پینے کیلئے پہلے دیا جائے اس کے بعد کہا کہ جہت کا اعتبار کریں گے اور دائیں طرف سے شروع کیا جائے گا لیکن دوسرے معاملات جیسے عبادات وغیرہ میں یا خلافت میں افضلیت کا اعتبار ہے لیکن شرب وغیرہ میں یمین سے شروع کیا جائے گا جس طرح یہاں حدیث میں ابو بکر شمال میں تھے انکے بجائے جانب یمین میں اعرابی کو دیا۔
''قد شیب بالماء'' پانی اسمیں ملایا گیا تھا اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ دودھ گرم ہوتا ہے تو اسمیں پانی ڈالا جاتا ہے تاکہ گرمی کی تاثیر ختم ہو جائے، یا تکثیر مقصود ہے کہ آدمی زیادہ ہیں اور دودھ کم تو پانی ڈال کر زیادہ کر لیا جائے لیکن پانی ڈال کر فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ ایک تو دوسروں کی حق تلفی ہے اور عقیدے کا فساد بھی ہے ''ثم اعطی الاعرابی'' ایک روایت میں ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ کیا کہ ابو بکر کو دیا جائے ابن العربی نے لکھا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوب جانتے تھے بعض روایت میں ہے کہ اعرابی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ حق تو آپ کا ہے مگر آپ ابو بکر کو دینا چاہیں گے اس نے کہا کہ نہیں آپ کا جھوٹا کسی کو نہیں دونگا۔ اشکال: بعض روایات میں ہے کہ کبّر کبّر بڑے کو پہلے دے دو اسی طرح مسواک کے بارے میں بھی ہے ایک جگہ مشروب کا بھی ذکر ہے کہ بڑے کو پہلے دے دو اور یہاں ایمن کا ذکر ہے تو بظاہر تعارض آ گیا؟ جواب: دائیں بائیں دونوں طرف آدمی ہو تو الایمن فالایمن کا اعتبار ہے لیکن اگر صرف بائیں طرف ہو یا سب سامنے ہو تو اس صورت میں بھی بڑے کو مقدم رکھا جائے گا۔

باب ماجاء ان ساقی القوم آخرھم

پلانے والا سب سے آخر میں پیئے، اب ساقی خادم ہوگا یا مخدوم، اگر خادم ہے تو اسکے لئے مناسب ہے کہ وہ مؤخر رہے پہلے مخدوموں کو پلائے اور اگر ساقی مخدوم ہے اور مہمانوں کو پلا رہا ہے تو اس صورت میں، پہلے پینا حرص و لالچ پر دال ہے اور دوسروں کو پلانا تواضع کی علامت ہے لیکن اگر اس نے پہلے خود پی لیا تو یہ اس کی شان کے خلاف ہے کہ پہلے تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر خود حرص کر کے اپنے آپ کو مقدم رکھا، اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کوئی قوم کا امیر ہو تو وہ ہمیشہ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دے۔

باب ماجاء ای الشراب کان احب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا میٹھا پانی پسند تھا ''احب'' اس کو رفع و نصب دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے والنصب احب، اور الحلو البارد میں بھی رفع و نصب جائز ہے مگر الرفع ارفع۔ بعض روایات میں ہے کہ دودھ کو پسند کرتے تھے، بعض میں ہے کہ عسل کو پسند کرتے تھے تو بظاہر تعارض ہے جواب اسکا یہ ہے کہ الحلو البارد عام ہے اسمیں دودھ ڈالو وہ ٹھنڈا اور میٹھا ہو جائے گا اسی طرح شہد ڈالو تو وہ ٹھنڈا اور میٹھا ہو جائے گا اسی طرح کھجور ڈالنے سے بھی ٹھنڈا اور میٹھا ہو جاتا ہے۔

ابواب البر والصلۃ

''البر'' اچھے اخلاق، ''البر ھین خلق طیب وکلام لین''، بعض نے کہا کہ البر شی ھین وجہ طلق وکلام لین ''الصلۃ'' بر عموم کے اعتبار سے

سب کو شامل ہے رشتہ دار ہو یا نہ ہو الصلۃ کو الگ لایا کہ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے کہ عام احسان اچھی چیز ہے اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی بھی اچھی چیز ہے، حقوق العباد میں والدین کو مقدم رکھا کیونکہ حقوق اللہ کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے اسلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حقوق کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر کیا فرمایا ﴿ان اشکرلی ولو الدیک﴾ اور والدین انسان کے وجود کے ظاہری سبب بھی ہیں اور والدین نے اسوقت خدمت کی جب کہ یہ اپنے آپ کسی حاجت کو پورا نہیں کرسکتا تھا اور اسکی کفالت کی اسلئے بچہ جب بالغ ہوجائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد ان والدین کا حق ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو اصل محسن ہیں اس کے بعد والدین نے جو احسانات کئے ہیں یہ وہ پورا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھرانا سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے اس کے بعد عقوق الوالدین سب سے بڑا گناہ ہے، حدیث میں والدہ کو تین درجات مقدم رکھا چوتھے درجے میں باپ کا ذکر کیا ہے کیونکہ والدہ تین کاموں میں تکلیف اٹھاتی ہے، حمل، وضع حمل، اور رضاعت یہ سب سے بڑی تکالیف ہیں اسمیں والدہ اکیلی ہوتی ہے اس کے بعد دوسرے تکالیف میں والدہ اور والد دونوں مشترک ہوتے ہیں اسلئے تین درجات میں والدہ کو مقدم رکھا۔

باب منه

سوال ہوا ''ای الاعمال افضل'' جواب دیا وقت پر نماز پڑھنا پھر سوال ہوا ''ثم ماذا'' آپ ﷺ نے فرمایا ''برالوالدین'' اس کے بعد فرمایا الجہاد فی سبیل اللہ۔ بعض روایات میں انفاق فی سبیل اللہ کو مقدم کیا بعض میں حج کو افضل کہا اور کبھی ہجرت اور صوم کو بھی افضل کہا ہے تو اسمیں تعارض ہوگیا۔

تعارض کو اس طرح دفع کیا گیا کہ یہ مختلف جوابات افراد کے اعتبار سے دیئے ہیں جس میں جسکی کمی ہوا سکے لئے اسی چیز کو افضل کہا۔ یا یہ زمانے کے اعتبار سے ہے کہ جہاد کا زمانہ ہو تو وہ افضل ہوگا اگر انفاق کی ضرورت ہو تو وہ افضل ہوگا۔ یا افضلیت اضافت کے اعتبار سے ہے کہ سب سے افضل جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے اعتبار سے ہے اور حقوق العباد میں والدین کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ

باب ماجاء من الفضل فی رضاء الوالدین

یہاں رضائے والدین کا ذکر ہے کہ والدین کی خوشنودی کتنی ضروری ہے اور اس پر کتنے امور موقوف ہیں پہلی روایت میں ہے کہ ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا کہ میری والدہ بیوی کی طلاق کا حکم دیتی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ والد ابواب الجنۃ میں درمیانہ دروازہ ہے یعنی بہتر ہے (یہاں تو والد کا ذکر ہے تو والدہ بطریق اولیٰ ہے) فرمایا یہ جنت کا دروازہ ہے اب آپ کی مرضی ہے چاہے اس باب کی حفاظت کریں یا اس کو ضائع کردیں، ابودرداء نے سمجھایا کہ والدہ کی نافرمانی نہ کریں ورنہ جنت سے محروم ہوجاؤ گے۔ تو پہلے آدمی انکے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے اگر ایسا حال آجائے کہ والدین مجبور کریں تو پھر انکی بات پر عمل بھی کریں اس لئے ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ طلاق دیدیں والدین کی نافرمانی نہ کریں کیونکہ بیوی پھر مل سکتی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ رب تعالیٰ کی رضا والد کی رضا میں ہے [illegible] تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے، تو اسلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ﴿ان اشکرلی ولو الدیک﴾ تو والدین کی اطا[illegible]عت اصل میں اللہ کے امر کی اطاعت مطلوب ہے اور والدین کی نافرمانی اصل میں اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے جو خطرناک چیز ہے۔

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

عقوق عق سے ہے بمعنی نافرمانی یہ لفظ بر کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے عقوق الوالدین بہت بڑا گناہ ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اکبرالکبائر بیان نہ کروں؟ صحابہ کرام نے فرمایا جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اشراک باللہ کیونکہ اللہ کا حق مقدم ہے اس کے بعد فرمایا کہ ''عقوق الوالدین'' کیونکہ حقوق العباد میں والدین کا حق مقدم ہے اس کے بعد فرمایا کہ ''شھادۃ الزور یا قول الزور''۔ گناہ کبیرہ وصغیرہ میں علماء کا اختلاف ہے ① گناہ جو بھی ہو سب کبائر ہے ② بعض کے ہاں افراد واشخاص کے اعتبار سے اس کی تقسیم ہوتی ہے جیسے مشہور ہے حسنات الابرار سیئات المقربین جس طرح حضور ﷺ کے معمولی لغزشوں کو بہت بڑا قرار دیا لیکن وہ گناہ نہیں ③ جن گناہوں کیلئے قرآن وحدیث میں وعید ذکر کی گئی ہے وہ کبیرہ ہے اور جس کیلئے وعید مذکور نہیں ہو صغیرہ ہے ④ کبیرہ وہ ہے جن کیلئے شریعت میں حد مقرر ہے جن کے حد مقرر نہیں وہ صغیرہ ہیں ⑤ صغیرہ وکبیرہ امور اضافیہ میں سے ہیں ایک گناہ مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے مگر ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہوتا ہے، اور گناہ مؤمن کیلئے اتنا بڑا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے دب رہا ہے اور فاسق اور بدعمل بڑے گناہ کو یوں سمجھتے ہیں جیسے اس پر مکھی بیٹھ گئی ہے، ''شھادۃ الزور'' اشراک باللہ یا عقوق الوالدین کا اثر متعدی نہیں لیکن شھادۃ الزور کا اثر معتدی ہے اس سے قبیلوں میں دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے حضور اقدس ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ لفظ کہتے رہے یہاں تک کہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہمیں رحم آیا کہ انکو تکلیف ہوگئی اسلئے خاموش ہو جاتے تو اچھا ہوتا تا کہ حضور اقدس ﷺ کو تکلیف نہ ہو، ''یسب ابا الرجل'' سب اور شتم ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتے ہیں، سب عام ہے اور شتم خاص ہے، سب کا اطلاق لعن، طعن، اور شتم پر ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی بر الخالة

حقوق کا ذکر تھا یہاں والدین کے بعد خالہ کا ذکر ہے، کیونکہ خالہ بھی ماں کی طرح ہے ''وفی الحدیث قصة طویلة'' قصہ یہ کہ صلح حدیبیہ کے اندر مختلف شرائط رکھی گئی تھیں، حضور اقدس ﷺ آئندہ سال عمرۃ القضاء کیلئے گئے واپس آنے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی نے کہا چچا جان ہمیں ساتھ لے جائیں، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں اس کا حقدار ہوں زید نے کہا کہ میں حقدار ہوں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں حقدار ہوں کیونکہ اسکی خالہ میرے گھر میں ہے آپ ﷺ نے ان کیلئے فیصلہ کیا جنکے گھر میں انکی خالہ ہے اور فرمایا ''الخالة بمنزلة الام'' حدیث میں آگے فرمایا ''انی اصبت ذنبا عظیما'' جو گناہ اللہ کی نافرمانی ہو متقی لوگ اس کو بڑا خیال کرتے تھے وہ گناہ چھوٹا ہو مگر یہ آدمی بڑا سمجھ رہا تھا اس لئے توبہ کرنے آیا، یا واقعی بڑا گناہ تھا مگر گناہ حقوق کے زمرے کا تھا کہ اس سے کسی کی حق تلفی ہوگئی تھی اس لئے توبہ کی صورت یہ تھی کہ کسی کے ساتھ احسان کرے تو وحی سے معلوم ہوا تھا کہ اس آدمی کو گناہ ختم کرنے میں احسان کرنا چاہیے تا کہ اس سے کوتاہی آئندہ نہ ہو۔

باب ماجاء فی حق الوالدین

اولاد والدین کے احسانات کا بدلہ ادا نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ ان کو مملوک پائیں اور خرید کر آزاد کردیں ① جمہور کے ہاں ان پر ملک نہ آئے گی خریدتے ہی آزاد ہوگا ② ابن حزم اور دوسرے بعض حضرات کہتے ہیں کہ خریدنے سے والد آزاد نہ ہوگا جب تک کہ آزاد نہ کرے دلیل یہ جملہ ہے ''فیعتقه'' جمہور یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ بیان کیلئے ہے نہ کہ آزادی کیلئے اور آزادی کی نیت سے ہی خریدنا چاہیے۔

باب ماجاء فی قطعیة الرحم

''رحم'' سے عام مراد ہے یعنی تمام رشتہ داروں سے صلہ رحمی کس طرح ادا ہوگی؟ تو کبھی عیادت سے اور اسی طرح دعا کرنے سے اور مالی حقوق پورا کرنے سے صلہ رحمی ادا ہوگی، صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے جو خیر ممکن ہو وہ رشتہ داروں سے کریں اور ہر تکلیف سے ان کو بچانے کی کوشش کریں یہ ہے صلہ رحمی۔

باب ماجاء فی النفقة علی البنات

بچیوں پر خرچ کرنا اور انکی اچھی تربیت کرنا اس پر جو اجر ملے گا اس کا ذکر ہے، اس پر ترمذی نے کئی روایات کو جمع کیا ہے کسی کی پرورش میں دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور انکی حقوق ادا کرے جو اس پر واجب ہے اور ساتھ مزید احسان بھی کریں اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی سے اللہ سے ڈرتا ہے ایسے شخص کیلئے جنت کی خوشخبری دی گئی ''من ابتلیٰ بشیٔ'' ① بچیاں خود ابتلاء کی چیز ہیں کیونکہ عرب لوگ لڑکیوں کو عار سمجھتے تھے اور لڑکیوں کے پیدائش سے بہت پریشان رہتے تھے اور اس کو بوجھ سمجھتے تھے اس لئے بچیوں کا وجود ہی ابتلاء اور آزمائش ہے ② بچیوں کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے اور انکے کچھ اعمال ایسے ہیں جس سے والدین کو دکھ ہوتا ہے ایسا آدمی جو ایسے آزمائش میں پڑ جائے اور اس پر صبر کرے اس کیلئے جنت کی خوشخبری ہے، ''فلم تجد عندی شیئا غیر تمرة'' اشکال: دوسری جگہ ہے کہ میں نے تین دانے دیئے اس نے ایک ایک کر کے بچیوں کو دیا انہوں نے دوبارہ مانگا تو ایک کو دونوں میں تقسیم کیا جبکہ یہاں ایک کھجور کا ذکر ہے۔

جواب نمبر ❶: یہ الگ واقعہ ہے۔

جواب نمبر ❷: پہلے ایک ہی ملا پھر مزید دو دانے آگئے وہ بھی دیئے تو ایک راوی نے سب کو ذکر کیا اور دوسرے راوی نے صرف پہلی کو ذکر کیا۔

باب ماجاء فی رحمة الولد الیتیم و کفالته

آپ ﷺ نے فرمایا جو یتیم کو پرورش میں لے لے اور اس کو کھلاتا پلاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ یقینی طور پر اس کو جنت میں داخل کرے گا بشرطیکہ ایسا گناہ نہ کرے جو معاف ہونے کے قابل نہ ہو جیسے شرک و کفر وغیرہ، بعض نے کہا کہ ''الا ذنبا لایغفر'' میں حقوق العباد کو بھی شامل کیا ہے ایک حدیث میں ہے کہ میں جنت کا دروازہ کھولنے کی کوشش کروں گا تو عورت مجھ سے سبقت کی کوشش کرے گی میں پوچھوں گا تو بتایا جائے گا کہ یہ یتیموں کی پرورش کرتی تھیں، یہاں معیت سے دخول میں معیت مراد ہے بعض نے کہا کہ جنت میں مراد ہے، باقی درجات میں فرق ہوا جس طرح انگلیوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ باقی یہ معیت اسلئے ہے کہ جس طرح نبی کو اس قوم کی طرف بھیجا جو بالکل جاہل تھی اسی طرح یتیم بھی اپنے امور کو پورا نہیں کر سکتا ہے تو اس کی کفالت کرنے والے کو حضور ﷺ کی معیت نصیب ہوگی۔

باب ماجاء فی رحمة الصبیان

''صبیان'' ولد سے بڑے ہوتے ہیں اس لئے ان کو الگ ذکر کیا اس باب میں مختلف روایات ہیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ بوڑھے آدمی آئے قوم نے جگہ دینے میں دیر کر دی آپ ﷺ نے فرمایا وہ ہم میں سے نہیں جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا احترام نہیں کرتا، دوسری روایت میں بھی یہی مضمون ہے اور تیسری روایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اسمیں دو الفاظ زیادہ ہیں یعنی ''لم یأمر بالمعروف وینہ عن المنکر'' ''اب لیس منا کا کیا معنی ہے؟ اسمیں اہل علم کا اختلاف ہے ① ہمارے طریقے اور ادب پر نہیں

یہ مراد نہیں کہ مسلمان ہی نہیں ② سفیان ثوری کہتے ہیں کہ لیس منا ظاہر پر ہے تاویل کی ضرورت نہیں تو معنی ہوا "لیس من المسلمین" اسمیں زجر زیادہ ہے اسلئے ظاہر پر رکھنا زیادہ بہتر ہے تاکہ ترغیب ہو بڑا چھوٹے پر رحم کرے اپنی اولاد کی طرح اور چھوٹے کو حکم ہے کہ بڑوں کا ادب واحترام کریں تو اسلام نے ہر ایک کی حقوق کا لحاظ کیا ہے ان حقوق کا فقدان آج کل کے معاشرے کی بگاڑ کا سبب ہے۔

باب ماجاء فی رحمة الناس

پہلے رحمت خاصہ کا ذکر تھا اب رحمت عامہ کا ذکر ہے کہ ہر زندہ چیز پر رحم کرے اس پر ثواب ملے گا جس طرح احادیث میں ہے کہ بدچلن عورت کی مغفرت کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے ہوئی اور ایک عورت بلی پر ظلم کرنے کی وجہ سے آگ میں چلی گئی تو اس سے معلوم ہوا کہ تمام انسانوں اور حیوانوں پر بھی رحم کرنا چاہئے ظلم ہر چیز پر حرام اور ممنوع ہے دین اسلام رحمت ہی رحمت ہے "لاتنزع الرحمة الامن شقی" ہر آدمی کے قلب میں مہربانی ہوتی ہے سوائے شقی القلب کے کہ اس کے دل سے ہر چیز نکال دی جاتی ہے کیونکہ رحمت رقت القلب کی وجہ سے ہوتی ہے اور رقت القلب علامت ہے ایمان کی اور جس میں رقت قلب نہ ہو اسمیں ایمان نہ ہوگا اور ایمان کا نہ ہونا علامت ہے بدبختی کا۔ "یرحمک من فی السماء" اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ مراد ہیں یا یہ عام ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بھی رحم کریں گے اور فرشتے بھی آسمانوں میں دعا کریں گے، "شجنة" درخت کی جڑیں جب آپس میں مل جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ رحم رحمٰن سے ماخوذ ہے جس طرح جڑیں الگ ہوتی ہیں مگر تنا میں یکجا ہو جاتی ہیں۔

باب ماجاء فی النصیحة

"الدین النصیحہ" دین تمام ہے نصیحت کا "نصیحہ" کا معنی ہے کسی کیلئے خاص کر دینا عرب میں ہر اس خیر کو کہتے ہیں جو آدمی منصوح لہٗ کیلئے دل میں لکھتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ دین تو خیر خواہی کا نام ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کیلئے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ صحیح ہو اسکی صفات پر ایمان لائے اور اس کے احکام کی پابندی کریں کتاب کی نصیحت یہ ہے کہ اس کو پڑھے اور اس پر ایمان لائے سمجھے اور عمل کریں بعض روایات میں نبی کریم ﷺ کا ذکر بھی ہے کہ ان پر ایمان لائے اور ان کو خاتم النبیین سمجھے۔ "ولائمة المسلمین" خلیفہ کی خیر خواہی یہ ہے کہ اسکی اطاعت کریں اس سے بغاوت نہ کریں البتہ لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق "عامتھم" عام مؤمنین کی خیر خواہی مراد ہے انکے مصالح کا خیال رکھنا اور انکی دینی ودنیاوی حقوق ادا کرنا، دوسری روایت میں ہے کہ میں نے بیعت کی کہ نماز ادا کروں گا اور زکوٰۃ دونگا یہ دوام العبادات ہیں باقی عبادات ان پر قیاس ہوں گی کیونکہ نماز عبادت بدنی اور زکوٰۃ عبادت مالی ہے تو عبادت بدنی اور مالی دونوں کو جمع کر دیا اور بیعت کی کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا اس پر انہوں نے عمل کیا کہ انکے خادم نے تین سو کا گھوڑا خریدا لیکن انہوں نے ۸۰۰ روپے دیئے اور کہا کہ میں نے مسلمان کی خیر خواہی کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے بیعت کی ہے اس لئے اس معاہدے کو توڑ نہیں سکتا۔

باب ماجاء فی شفقة المسلم علی السملم

ابواب البر میں پہلے خاص حقوق کا ذکر تھا پھر عام مسلمانوں کا یہاں بھی اسی ضمن میں عام حقوق کا ذکر ہے کہ مؤمن کی دل میں عام مسلمان کیلئے شفقت ہونی چاہئے، اس لئے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے کہ جس طرح بھائی بھائی کو دھوکا نہیں دیتا نہ اس کو رسوا کرتا ہے اور نہ اپنے بھائی پر جھوٹ بولتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کیلئے ہونا چاہئے مسلمان تب دوسرے مسلمان کا بھائی ہے جب اسمیں اسلام ہو جب اسمیں اسلام ہو تو اس کا خون مال اور عزت محفوظ ہو جائے گی اسلئے دوسرا مسلمان بھائی اسکی چیزوں سے تعارض

نہیں کریگا۔ "عرضہ" اسکی اپنی عزت مراد ہے اسی طرح اسکے اصول وفروع کی عزت بھی اسکی عزت میں داخل ہے اس لئے ان تمام کی عزت مسلمان پر لازم ہے اب انکی بے عزتی کرنا سب مسلمانوں پر حرام ہے۔ "التقویٰ ھھنا" یہاں دل کیطرف اشارہ کیا کہ تقویٰ کا محل دل ہے اور دل کے حالات سے مطلع ہونا ناممکن ہے اس لئے ظاہری احوال کو دیکھو اگر ظاہر میں مسلمان ہے تو وہ محفوظ ہے، ایک روایت میں ہے کہ مؤمن مؤمن کیلئے بمنزلہ آئینہ کے ہے جس طرح آئینہ سامنے رکھ کر چہرے کی میل داغ کو دیکھ کر زائل کرتے ہیں تو بھائی کے عیب دیکھو تو اس کو سمجھاؤ اس کے عیب کو دفع کرو لیکن کسی کے سامنے نہیں تا کہ اسکی رسوائی ہو اور آئینہ کی صفت یہ ہے کہ وہ عیب کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا اور دوسری صفت یہ ہے کہ جتنا داغ ہوگا اتنا ہی دکھائے گا، اسی طرح بھائی کا جتنا عیب ہو اتنا ہی اسکو بتاؤ اپنی طرف سے ملاوٹ کر کے نہ بیان کرو، اور جو ظاہری برائی ہو اسی کو دور کرو مگر اسکے عیوب کے تجسس میں نہ پڑ جاؤ۔

باب ماجاء فی الستر علی المسلمین

جو مسلمان کی دنیا کی مصیبت ختم کرے اللہ تبارک وتعالیٰ اسکی آخرت کی مشقت دور کرے گا جس نے تنگ دست پر آسانی کی مثلاً مقروض سے مطالبے میں نرمی کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں آسانی فرمائے گا اور اسی طرح کسی کو گناہ کرتا ہوا دیکھ لیا اور اس کو چھپکے سے سمجھایا اور کسی کو نہیں بتایا اس پر پردہ ڈالا تو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر پردہ ڈالیں گے اور اس کو رسوا نہ کرے گا۔ اسی طرح کسی کے ساتھ تعاون کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ عیب سے اسکی حفاظت فرمائے گا۔

باب ماجاء فی الذب عن المسلم

مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچائے اسکی بے عزتی کرے دوسرا مسلمان اسکی طرف سے دفاع کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن اس سے آگ کو دور کر دے گا۔

باب ماجاء فی کراھیة الھجر المسلم

"ہجران" بمعنی ترک کے ہے کہ بھائی سے بات نہ کرنا اس کی مدد نہ کرنا یہ ناپسندیدہ عمل ہے اس پر وعید آئی ہے اور فرمایا جو سب سے پہلے سلام کرے تو وہ بہترین آدمی ہے اس لئے تین دن سے زیادہ ہجران جائز نہیں۔ تین دن تک جائز ہے یا نہیں تو اسمیں مسئلہ یہ ہے کہ اگر چہ یہ بھی صحیح نہیں لیکن انسان کمزور ہے اس کی طبیعت میں غصہ ہے تو اسکی شریعت نے مہلت دی ہے کہ تین دن میں غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد بھی بات نہ کرنا حرام ہے لیکن اگر دین کی وجہ سے آپ نے متارکت کی ہے تو یہ جائز ہے۔

اشکال: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عبداللہ بن زبیر سے بات بند کی تھی اور ابن عمر نے بیٹے سے بات بند کی گی،

جواب: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سلام کرتی تھیں لیکن صرف آنے کی اجازت نہ دی تھی مگر یہ کمزور ہے کہ کیونکہ جب اجازت آنے کی نہیں تو متارکت تو ہوئی اسلئے اصل جواب یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بطور زجر کے ایسا کیا تھا جس طرح حضور اکرم ﷺ نے تبوک کے موقع پر تین آدمیوں سے کیا تھا جو تبوک سے رہ گئے تھے اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی بطور زجر کے کیا تھا۔

باب ماجاء فی مواساة الاخ

"مواساۃ" خیر خواہی کو کہتے ہیں کہ ہجرت کے بعد حضور نے مہاجر اور انصار کے درمیان عہد مواخات قائم کیا تھا تا کہ آپس میں تعلق پیدا ہو جائے اور مہاجرین کو ٹھکانا بھی مل جائے یہ بڑا مشکل کام ہے کہ کوئی باہر سے آئے اب یہ آدمی اپنی برادری والوں کو چھوڑ کر باہر کے آدمی کو سب

کچھ میں شریک کردیں یہ بڑا مشکل کام ہے، لیکن انصار نے حقیقی بھائیوں سے بڑھکر انکی مدد کی یہاں تک کہ جن کی دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو طلاق دیکر مسلمان بھائی سے شادی کرادی جیسے مافی الباب والی حدیث سے معلوم ہوا یہ بہت بڑی قربانی ہے یہاں بھی سعد بن ربیع نے پیشکش کی لیکن عبدالرحمٰن بن عوف نے جواب دیا کہ اللہ تمہیں برکت دیں ہم نے اسلئے ہجرت نہیں کی بلکہ مجھے بازار بتائیں اور پھر کام وغیرہ کرکے پنیر وغیرہ ولاتے تھے ''نواۃ'' اگر منصوب ہوتو فعل محذوف ہوگا اصدقھا نواۃ یا مرفوع ہوتو مبتداء کی خبر ہوگی، اب اس کی مقدار میں اختلاف ہے بعض کے ہاں اس کا وزن ربع دینار بنتا ہے بعض کے ہاں نصف اوقیہ کا ربع ہے بعض کے ہاں (۵) درھم کیونکہ اوقیہ ۴۰ درھم کا ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الغیبة

اب ان امور کا ذکر ہے جو بر سے مانع ہیں کیونکہ تخلیہ کیلئے تخلیہ ضروری ہے اسلئے غیبت کو ابواب البر میں ذکر کیا حدیث میں اس کی تعریف یہ کی کہ تمھارا بھائی موجود نہیں تو آپ اس کو اس کی ان صفات سے بیان نہ کریں جن کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ اب اسمیں عموم ہے کہ یہ ذکر قلم سے یا زبان سے یا اشاروں سے عیب جوئی کرے یا اس کی نقل اتاری جائے یہ تمام چیزیں جن سے ان کو تکلیف ہو یہ غیبت میں داخل ہیں اور آجکل اسمیں بہت زیادہ لوگ ملوث ہیں۔ اور اگر کسی آدمی میں فسق و بدعت یا کذب ہو جس کی وجہ سے دین کا نقصان ہو اور لوگوں کی گمراہی کا خطرہ ہو تو پھر اس کا بیان کرنا ضروری ہے وہ غیبت میں داخل نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی الحسد

حسد یہ کہ دل میں تمنا کرے کہ فلاں آدمی سے نعمت زائل ہوجائے اور مجھے مل جائے اس تمنا کا نام حسد ہے اور ایک غبطہ ہے کہ آدمی یہ تمنا کریں کہ جو نعمت فلاں کو ملی مجھے بھی مل جائے۔ حسد حرام ہے یہ نیکیوں کو بالکل ختم کردیتا ہے لیکن اگر دل میں خیال آئے تو یہ گناہ نہیں، اور اگر اس پر عمل کردیا اور اس کے خلاف کام شروع کرے تو یہ بغاوت بھی ہے اور گناہ بھی اور اگر اس پر عمل کا پکا ارادہ کرلیا تو یہ حسد ہے جو گناہ ہے۔

باب ماجاء فی التباغض

آپس کے بغض کی مذمت کی جارہی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان ناامید ہوگیا ہے کہ نمازی انکی عبادت کریں لیکن شیطان انکے درمیان بغض وحسد پیدا کرے گا اور ان کو لڑائے گا۔ شیطان کا بڑا حملہ یہ ہوتا ہے کہ کافر بنادیں لیکن موحد ہو مصلی ہو تو ان سے شرک نہیں کراسکتا تو انکے درمیان ہلاکت کیلئے دوسرا حملہ یہ کرتا ہے کہ ان کو لڑاتا ہے انمیں بغض وحسد پیدا کرتا ہے بعض روایات میں ہے ''من جزیرۃ العرب'' کہ عرب میں بتوں کی عبادت ہو اس سے وہ ناامید ہوگیا ''مصلون'' سے مراد مسلمون ہے لیکن نماز اسلام کی نشانی ہے اور اہم رکن ہے اسلئے اس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اب خود نفس شیطان کی عبادت کوئی نہیں کرتا مگر یہ سبب ہے اسلئے اسکی طرف نسبت کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا معجزہ ہے کہ پیشن گوئی دی کہ عرب میں کفر وشرک وارتداد نہیں ہوگا۔ اشکال حضور ﷺ کے وصال کے بعد لوگ مرتد ہوئے تھے؟

جواب نمبر ❶: مراد یہ ہے کہ کوئی چیز ہو بھی جائے مگر اسکے لئے قرار و بقاء نہ ہوگی اور ارتداد کا فتنہ بھی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جلدی ختم کردیا تھا۔

جواب نمبر ❷: نماز پڑھے اور کفر وشرک بھی کرے یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

جواب نمبر ❸: یعبدہ سے بت پرستی مراد ہے کہ بت پرستی عرب میں کوئی نہیں کرے گا اب ارتداد وغیرہ کی صورت جو بھی ہوتی اسمیں بت پرستی نہیں ہوئی۔

باب ماجاء فی اصلاح ذات البین

''کذب'' سے کیا مراد ہے ① حقیقی کذب اور جھوٹ مراد ہے کہ ان تین حالات میں حقیقۃ جھوٹ بولنا جائز ہے عورت کو خوش کرنے کیلئے بول سکتا ہے مگر حقوق ضائع نہ کریں کہ حقوق دینے میں جھوٹ بولنے لگ جائے کیونکہ اس سے حق تلفی ہوگی ② کذب سے توریہ مراد ہے کذب تو ہر حال میں ناجائز ہے توریہ کا مطلب یہ ہے کہ ذوجھتین لفظ استعمال کرے کہ خود کی نیت اور ہو اور مخاطب اس سے دوسرا رخ سمجھے جیسے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات میں ہیں۔

باب ماجاء فی الغش

''من ضار'' اس سے مالی ضرر مراد ہے ''ومن شاق'' اس سے ضرر نفسی مراد ہے ''ضار مؤمنا'' ظاہری ضرر ''مکر بہ'' اس سے خفیہ ضرر مراد ہے۔

باب ماجاء فی حق الجوار

پہلے وہ حقوق بیان کئے جو بغیر واسطے کہ تھے اب بالواسطہ حقوق کا ذکر ہے کہ واسطے کی وجہ سے کسی کا حق لازم ہوگیا جیسے کہ پڑوسی کہ پہلے اس کا حق تم پر نہ تھا مگر جوار کی وجہ سے حق لازم ہوگیا، پڑوسی مسلمان ہو یا کافر چھوٹا ہو یا بڑا رشتہ دار ہو یا غیر ہو سب کو جوار کا حکم شامل ہے پھر پڑوس اقرب فالاقرب کا اعتبار ہے ① مسلمان پڑوسی رشتہ دار ② مسلمان پڑوسی ③ کافر رشتہ دار ہو ④ یا نفس کافر پڑوسی ہو۔

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

ابواب البر میں سے ایک باب ہے اسکا تعلق بھی ان حقوق سے ہے جو حقوق بالواسطہ ہیں، بعض روایات میں ہے خولکم جو تمہارے احوال درست کرے مطلب اس کا ہے خادم کہ یہ تمہارے بھائی ہیں تمہارے ذمہ جو کام ہیں اور احوال ہیں ان کو یہ کر لیتے ہیں، اور اسلام ایک نعمت ہے مگر انہوں نے اس نعمت سے انکار کیا تو اسکی سزا یہ ملی کہ جعلهم الله فتية تحت ايدكم کہ ان کو غلام بنا دیا۔ ''اخوانکم'' دین کے اعتبار سے بھائی کہا اور اگر مسلمان نہ ہوں تو نوع انسانی کی بناء پر بھائی کہا ''فتیہ'' یہ لفظ غلام کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے قرآن میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے میں ہے ﴿قال لفتاه﴾ بعض نسخوں میں ''قنیۃ'' بمعنی غلام فرمایا جو خود کھاتے پیتے ہو ان کو بھی کھلاؤ پلاؤ اور جو خود پہنتے ہو ان کو بھی پہناؤ، لیکن اگر خود بخیل ہے اور کھاتا پیتا نہیں ہے نہ اچھا لباس استعمال کرتا ہے یا تقویٰ کی وجہ سے کرے تو غلام کو ایسا نہ کرے بلکہ انکو اچھا کھلائے اور پہنائے، اسی طرح طاقت سے زیادہ کام کی تکلیف نہ دو اگر اسکی طاقت سے زیادہ ہو تو ساتھ میں مدد بھی کرو دوسری روایت میں ہے کہ جنت میں سیئی الملکۃ نہیں جائے گا یا ابتداء نہیں جائے گا یا اس ظلم کو حلال سمجھے تو کافر ہوگیا اسلئے نہ جائے گا۔ ''سيئى الملكة'' بمعنی غلام سے ظلم کرنا ''حسن الملکۃ'' غلام کے ساتھ احسان کرنا۔

باب النهی عن ضرب الخدام وشتمهم

''نبی التوبۃ'' یہ حضور اقدس ﷺ کی صفت ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ استغفار بہت کیا کرتے تھے یا انکی وجہ سے امت کی توبہ قبول ہوتی ہے، ایک نسخہ میں والرحمۃ بھی ہے کہ اگر خادم پر کوئی تہمت لگائے اور غلط ہو تو آقا کو دنیا میں حد قذف نہ ہوگا کیونکہ غلام محض نہیں اسلئے آقا دنیا میں بچ گیا لیکن آخرت میں عذاب سے بچ نہیں سکتا اسلئے قیامت کو سزا ملے گی۔

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

ایک آدمی نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ غلام کو کتنا معاف کروں آپ خاموش ہوگئے، آپ ﷺ کی خاموشی کی دو وجہ ہیں ① خاموش اسلئے ہوئے کہ سوال نامناسب تھا کہ بھائی جتنا درگزر کر سکو کرو ② وحی کا انتظار کر رہے تھے اسلئے دوسری مرتبہ فرمایا ۷۰ مرتبہ معاف کرو سبعین کا عدد کثرت کیلئے آتا ہے عدد متعین نہیں ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی ادب الولد

بچے کی دینی تربیت ایک صاع کے صدقے سے بہتر ہے بعض روایات میں ہیں ''لان یؤدب الرجل ولدہ ادبا واحدا'' کہ ایک ادب سکھلا دے یہ صاع کے صدقے سے بہتر ہے اسکی کئی وجوہات ہیں ① ادب الولد ضروری ہے اس کے ترک پر عذاب ہوگا لیکن صدقہ نہ کرنے پر عذاب نہیں ② ولد کو ادب سکھانا یہ دائمی رہتا ہے جبکہ صاع کا صدقے پر ثواب تو مل گیا لیکن وہ دائمی نہیں ③ صدقے کا علم نہیں کہ محل میں لگا بھی ہے کہ نہیں جبکہ ولد کا یقین ہے کہ وہ مقام اور محل پر لگ گیا۔

باب ماجاء فی صنائع المعروف

صنائع صنعہ سے ہے بمعنی صدقے کا ذریعہ، کوئی ایک کام نہیں بلکہ کئی سارے امور انجام صدقہ کا ذریعہ بن جاتے ہیں ان امور کا اس باب میں ذکر ہے کہ اپنے بھائی جو دین کے اعتبار سے ہے اگر اسکے ساتھ مالی تعاون نہیں کر سکتے تو کم از کم وہ آپ کے سامنے آئے اور آپ خندہ پیشانی سے ملے تو یہ بھی صدقہ ہے اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ بھی صدقہ ہے کسی کو اپنا پانی دیدینا یہ بھی صدقہ ہے اور صدقہ کے برابر ثواب ملے گا۔

باب ماجاء فی المنحة

''منحۃ'' بمعنی عطیہ کہ کوئی اس کو بطور قرضہ عطیہ دیدے یا دودھ کا جانور دیدیا تو جو چیز بھی ہدیہ کرے وہ منحہ ہے اس کیساتھ قید ہوگی مثلاً منحۃ الدراستہ داخلے کے بعد سیٹ مل جائے اسی طرح منحۃ الحلیب یا منحۃ الدراھم قرض دینا ''ھدیٰ زقاقا'' راستہ بتایا، بعض نے ھدیٰ ہدیہ سے لیا ہے کہ ضرورت مندوں کو بطور ہدیہ راستہ اور گلی دے دینا، مگر مصنف فرماتے ہیں کہ گلی کی طرف راستہ بتانا مراد ہے تو یہ اراءۃ الطریق کے معنی میں ہے ہدیہ کے معنی میں نہیں۔

باب ماجاء ان المجالس بالامانة

کوئی آدمی بات کرے اور یہ نہ بتائے کہ یہ امانت ہے کسی کو نہ بتانا بلکہ صرف بات کرتے وقت ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی آدمی سن نہ لے تو یہ بھی امانت کے حکم میں ہے اب سننے والے کیلئے اس کا بیان کرنا جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔

باب ماجاء فی السخاء

سخی و بخل اضداد ہیں ''الجاھل السخی'' جاہل سے مراد وہ ہے جو فرائض پر عمل کرے لیکن نوافل وغیرہ نہیں پڑھتا ہے اور ''عابد'' سے مراد وہ ہے جو فرائض کے ساتھ نوافل بھی پڑھتا ہے تو عابد بخیل سے سخی جاہل بہتر ہے ''حب الدنیا رأس کل خطیئۃ'' اور بخیل کے دل میں بھی دنیا کی محبت ہے۔

باب ماجاء فی البخل

پہلے سخاء کے فضائل بیان کئے اور سخاء کی وجہ سے جو آثار اور برکات وغیرہ مرتب ہوتے ہیں وہ بتائے اب اسکی ضد بخل اور بخیل کی مذمت کو بیان کرر ہے ہیں، خصلتان موصوف ہے اور لاتجتمعان صفت ہے دونوں مل کر مبتداء اور البخل اسکی خبر ہے بعض کے ہاں خصلتان خبر مقدم اور البخل مبتداء مؤخر ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک وقت میں مؤمن میں یہ دونوں صفات اکٹھی نہیں پائی جاتی یا ایک ہوگی تو دوسری نہ ہوگی مگر واضح مطلب یہ ہے کہ یہ صفات دائمی مؤمن میں نہیں رہتی۔

''خب'' خداع فساد پھیلا'' ولا بخیل'' واجبات وغیرہ ادانہ کرنا'' ولامنان'' مال یا صدقہ دیکر احسان جتلانا'' یامن'' بمعنی قطع کے ہے کہ یہ قطع رحمی کرتا ہے رشتہ داری نہیں جوڑتا'' لا یدخل الجنۃ'' ① اس سے مراد دخول اول ہے کہ سزا ملنے کے بعد تطہیر ہو جائے گی پھر داخل ہوگا ② یا مطلب یہ ہے کہ مذموم صفات کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا یہ مذموم صفات نکال دی جائیں گی پھر داخل ہوگا اسلئے فرمایا ﴿ونزعنا مافی صدورہم من غل﴾ ③ یا مطلب یہ ہے کہ فساد بین الناس کو اگر کوئی حلال سمجھے یا دوسری مذموم صفات جو کہ حرام ہے اس کو جائز سمجھے تو کافر ہو جائے گا اور کافر جنت میں نہیں جائے گا۔'' المؤمن غر کریم'' کریم علت ہے غر کی کہ مؤمن دھوکا کھا جاتا ہے اسلئے نہیں کہ بے وقوف ہے بلکہ شرافت اور حیاء کی وجہ سے دھوکا دیا جاتا ہے'' الفاجر'' فجر سے ہے بمعنی شق پھاڑنا اور فاجر بھی دین کے پردے کو پھاڑ دیتا ہے اسلئے اسکو فاجر کہتے ہیں کہ یہ گنہگار دھوکہ باز اور جھگڑالو ہے'' لئیم'' بمعنی کمینگی اور یہ اپنی لئامت کی وجہ سے دھوکا دیتا ہے۔

اشکال: ایک روایت میں ہے کہ المؤمن کیس اور لا یلدغ المؤمن فی جحر مرتین تو آپس میں تضاد آ گیا۔

جواب: پہلے وہ اعتماد کرتا ہے شرافت کی وجہ سے لیکن جب دوسرا اس کو دھوکا دیدے تو دوسری مرتبہ ہوشیار ہو جاتا ہے اسلئے فرمایا المؤمن کیس الخ۔

باب ماجاء فی النفقة علی الاھل

نفقہ علی اہل واجب ہے تو لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس کا ثواب نہیں ملے گا تو اس وہم کو دور کیا کہ اہل پر نفقہ کرنا اور اس واجب کو ادا کرنا یہ بھی صدقہ ہے اسی طرح اولاد پر خرچ کرنا جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ بہتر دینار ہے اسی طرح وہ دینار جو جہاد میں سواری یا ساتھیوں پر خرچ کردے کیونکہ اس دینار کی وجہ سے جہاد میں مدد ملتی ہے اور اس کے ساتھیوں کو فائدہ ہوتا ہے اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے پیش قدمی کرینگے، اس روایت میں عیال کو مقدم کیا کیونکہ سواری تیار کرنا اور جہاد میں دینا یہ تو واضح ہے کہ اس پر ثواب ملے گا مگر بچوں کو کھلائے اس پر اس کا دل مطمئن نہیں اس لئے اس کو مقدم کیا کہ اس پر تو زیادہ ملے گا کیونکہ یہ واجب کی ادائیگی ہے۔

باب ماجاء فی الضیافة وغایة الضیافة کم ھو

جو اللہ تبارک وتعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے وہ مہمان کی عزت کرے اور اس کے عطیہ اور تحفہ کا اہتمام کرے۔'' جائزتہ'' منصوب بنزع الخافض ہے، ای بجائزتہ۔ اب ضیافت کا حکم کیا ہے؟ تو جمہور ائمہ کے ہاں سنن مؤکدہ میں سے ہے، ان دیہاتوں میں جہاں ٹھہرنے کا انتظام نہ ہو لیکن شہروں میں اس کی ضرورت نہیں۔ امام اسحق، احمد، شوکانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضیافت واجب ہے دلیل یہ ہے الضیافة حق اور کہا کہ وما کان بعد ذالک فھو صدقة تو معلوم ہوا تین دن واجب ہے اور اس کے بعد نفلی ثواب ملتا رہے گا۔ جمہور کہتے ہیں واجب نہیں صرف تاکید ہے کہ مہمان نوازی کرو۔'' جائزۃ'' اس سے پہلا دن مراد ہے کہ اس میں خوب مہمانی کرے دوسرے دو دن میں جو خود کھائے وہی مہمان کو کھلائے اس کے بعد اتنا دے کہ وہ دوسری آبادی یا پڑاؤ تک پہنچ جائے اور وہاں تک کھاتا رہے، یہ تین دن کے بعد کا جائزہ ہے۔

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

اس باب میں بیواؤں اور یتیموں پر خرچ کرنے کے فضائل بیان ہوئے ہیں، ''ارملة'' وہ آدمی جس کا نان نفقہ ختم ہو جائے پھر اس کا شمار ان عورتوں پر ہوا جن کا شوہر نہیں یا شادی نہیں ہوئی ہو یا شوہر فوت ہو گیا ہو تو اس میں لغوی معنی کا اعتبار ہے کہ جس کا شوہر نہیں وہ فقیر کی مانند ہے، اب ان کیلئے اور مساکین کیلئے کمانے والے آدمی کو مجاہد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے، حدیث میں جب عام طور پر فضیلت بڑھانا مقصد ہو تو جہاد سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ بہت اونچا عمل ہے اور اعلاء کلمة اللہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ تو ایک آدمی ارملة اور مساکین پر بغیر کسی مقصد کے خرچ کرتا ہے تو اس کو بھی جہاد کا ثواب ملے گا جس طرح جہاد میں نفس کو دبانا ہے اسی طرح بغیر کسی غرض کے مال خرچ کرنا یہ بھی نفس کو دبانا ہے اس لئے اس کو جہاد کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح رات کو عبادت اور دن کو روزہ رکھنا یہ بھی مشکل کام ہے تو اسی طرح انفاق بھی مشکل کام ہے تو ان لوگوں پر خرچ کرنے والے کو صائم النھار اور قائم اللیل کا ثواب ملتا ہے۔

باب ماجاء فی طلاقة الوجه وحسن البشر

''کل معروف'' ہر وہ قول اور فعل جس کا حسن عقل اور عندالشرع حسن ہو ایسے کام اور قول کو معروف کہتے ہیں، تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اہل ثروت کیلئے صدقہ نہیں کہ مال خرچ کرو تو صدقہ ہے بلکہ اگر اچھی بات کرو اچھے کام کرو بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو اسی طرح کسی کو پیاس لگی ہو اس کو پانی پلا دو یہ سارے معروف اور صدقہ ہیں۔

باب ماجاء فی الصدق والکذب

''علیکم بالصدق'' ای الزموا۔ الصدق سچائی کو لازم پکڑیں کیونکہ صدق جب بالدوام موجود ہو تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ صدق اسکی نیکی کی طرف رہنمائی کرے گا۔ ''بر'' کہتے ہیں التوسع فی امور الخیر، ہر خیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ''صدیق'' کہتے ہیں کہ ہمیشہ صدق کے ساتھ متصف ہو جھوٹ سے اپنے آپ کو بچائے کیونکہ کذب گناہوں کی رہنمائی کرتا ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتے ہیں جھوٹا آدمی اللہ کے ہاں کذاب لکھا جاتا ہے۔

احادیث میں ہے کہ کوئی آدمی جھوٹ بولے تو اس کے قلب پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے یہ گناہ کا اثر ہوتا ہے اگر توبہ نہ کرے اور مزید گناہ کرتا رہے تو اس کا دل پورا سیاہ ہو جاتا ہے جس سے اس پر مہر جباریت لگ جاتی ہے ''میلا'' اکثر میل استعمال ہوتا ہے مراد ① میل ہے ② بعض نے کہا ثلث الفرسخ مراد ہے ③ بعض نے کہا مد البصر کو میل کہا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی اللعنة

''لعنت''، بمعنی بُعْد عن الرحمة، کہ اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا نہ کرے، بددعا کیلئے لعن صریح لفظ ہے اسی طرح کنایۃً بھی بددعا نہ کرے جیسے غضب وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا۔ تو مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے چاہے زندہ ہو یا مردہ ہو لیکن عام کفار یا وہ خاص کفار جو کفر پر مرے ہیں ان پر لعنت کرنا جائز ہے اور مسلمان اگرچہ فاسق وفاجر ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یزید مسلمان تھا اس لئے اس پر لعنت کرنا جائز نہیں امام غزالی اور ابن تیمیہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر لعنت جائز نہیں کیونکہ وہ بالاتفاق مسلمان تھا اگرچہ فاسق تھا۔ ''البذی'' فحش فی القول ① تو یہ تخصیص بعد التعمیم ہے کیونکہ فحش عام ہے چاہے قول سے ہو یا فعل سے ② بعض نے کہا کہ البذی تفسیر ہے فحش کی کیونکہ فحش قول اور فعل دونوں کو شامل تھا لیکن بذی لا کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس سے قول مراد ہے کہ مسلمان

فحش گوئی نہیں کرتا ہے۔

"فانها مامورة" ① ہوا مامور ہے اس لئے اس پر لعنت نہ بھیجو ② ہوا کو حکم تھا کہ تمہیں تکلیف دے اس لئے وہ مامور ہے اس کو برا بھلا مت کہو۔

باب ماجاء فی تعلیم النسب

"النسب" اس کا مفرد نسبۃ ہے بمعنی وہ رشتہ جو اصول اور فروع کو ملائے، ترجمۃ الباب کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اصول وفروع کا رشتہ معلوم ہونا چاہئے نسب معلوم ہوگا تو رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے میں آسانی ہوگی، صلہ رحمی ایسی چیز ہے کہ اس کا ثمرہ دنیا میں مل جاتا ہے ① لوگ اس سے محبت کریں گے ② صلہ رحمی مالداری کا ذریعہ ہے۔ ③ اللہ ان کو نیک اولاد دے گا اور اولاد نیک اعمال کریں گے جو اس کیلئے صدقہ جاریہ ہوگا۔

باب ماجاء فی الشتم

سب وشتم ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، عام طور پر شتم کا اطلاق گالی اور سب کا اطلاق عیب جوئی پر ہوتا ہے۔ "المستبان" مستب کا تثنیہ ہے دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہے، جو کچھ ان دونوں نے کہا تو اس کا گناہ آغاز کرنے والے پر ہوگا جب تک کہ مظلوم تجاوز نہ کرے یعنی ایک گالی کے بدلے دو گالیاں دے یا گالی کے ساتھ مارا بھی تو جو زیادتی کی اس کا گناہ مظلوم پر ہی ہوگا۔ دوسری روایت میں ہے کہ مردوں کی عیب جوئی نہ کرو اسمیں انکا نقصان نہ ہوگا بلکہ اس سے انکے زندہ رشتہ داروں کو تکلیف ہوگی یہاں مردوں سے مراد مسلمان مردے ہیں ورنہ بڑے بڑے کفار پر لعنت کرنا انکی عیب جوئی کرنا جائز ہے جنکے عیب بیان کرنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے لیکن عام کفار مراد ہیں اگر ان کی عیب جوئی کرنے سے انکے مسلمان رشتہ داروں کو تکلیف ہوتی ہو تو پھر عیب جوئی نہیں کرنی چاہئے۔ جیسے ایک انصاری نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کی عیب جوئی کی تو ان کو غصہ آیا انہوں نے تھپڑ مارا اس پر انصار لڑائی کیلئے تیار ہوگئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اور فرمایا کہ ہمارے مردوں کو برا بھلا کہہ کر ہمیں تکلیف نہ پہنچاؤ عباس ہم میں سے ہے اور میں عباس سے ہوں یعنی رشتہ دار ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کی عیب جوئی اللہ کی نافرمانی اور اس کے ساتھ قتال کرنا کفر ہے ① کیونکہ حلال سمجھے گا تو کافر ہوجائے گا ② لیکن حرام سمجھ کر قتل کرے گا تو اسکا یہ عمل مفضی الی الکفر ہوسکتا ہے کہ جب اتنا بڑا گناہ کرسکتا ہے تو آہستہ آہستہ کفر تک پہنچ جائے گا ③ یا مطلب یہ ہے کہ یہ عمل مسلمان کا نہیں بلکہ کافروں کا عمل ہے۔

باب ماجاء فی قول المعروف

جنت میں بالاخانے ہیں جن کے اندر کا حصہ باہر سے اور باہر کا حصہ اندر سے نظر آتا ہے اعرابی نے کہا یہ کس کے لئے ہیں جواب دیا ان کے لئے ہے جس نے اچھی باتیں کیں اور روایت میں ہے، الآن الکلام، کہ نرم بات کرے مسکینوں کو کھلائے ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں اور رات کو تہجد پڑھیں جب کہ دوسرے لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔

باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح

"نعم ما" یہ ما نکرہ ہے بمعنی شئی کے کہ بہتر ہے چیز جو کسی کے لئے ہو یعنی غلام جس کی دو صفات ہوں اللہ کی اطاعت کرے اور آقا کا

حق ادا کرے؟ نعم، میں چار لغات ہیں ① نَعَمْ ② نِعَمْ ③ نَعِمَّ ④ نِعِمَّ۔ ''قال کعب'' اس سے کعب احبار مراد ہیں یہ مخضرمی تھے طبقہ ثانیہ میں سے ہیں، صدق اللہ ورسولہ، اشکال، اس کا ربط کیا ہے جواب کعب کے پاس یہ حدیث بیان ہوئی تو انہوں نے یہ جملہ کہا کیونکہ تقویٰ یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت کرے اور آقا کے حقوق ادا کرے اس میں حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کا ذکر ہے: کثبان۔ ٹیلہ ریت کا جو چھوٹے پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ ''اراہ قال یوم القیامۃ'' یہ راوی کی بات ہے کہ میرے خیال میں حضور اقدس ﷺ نے قیامت کے دن کے بارے میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ تین لوگ مشک کے ٹیلوں پر قیامت کے دن ہوں گے ① مملوک جو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اپنے آقا کے حقوق ادا کرے ② امام کہ لوگ اس سے راضی ہوں یعنی اس کے دین کی وجہ سے راضی ہوں لیکن وہ دیندار ہے لوگ ناسمجھ ہیں اس وجہ سے وہ اس سے ناراض ہیں یہ ناراضگی اس کے خلاف نہیں لیکن اگر امام بدعتی وغیرہ ہو اس وجہ سے لوگ ناراض ہوں وہ اس سے خارج ہوگا۔ ③ مؤذن جو پانچ دفعہ اذان دیتا ہو۔

باب ماجاء في ظن السوء

برے گمان سے بچنے کا حکم ہے فرمایا ایاکم والظن۔ نفس کو ظن سے دور رکھیں یہاں مطلقاً ظن ذکر ہے مگر ظن سے مراد ظن السوء بالمسلمین ہے مطلق مراد نہیں مطلب یہ ہے کہ بدگمان سے بچو کیونکہ یہ دل میں بدگمانی رکھے گا تو رفتہ رفتہ اس کا اظہار لوگوں کے سامنے کرنے لگتا ہے حالانکہ جو بدگمانی کر رہا ہے وہ اسمیں نہیں تو یہ بدگمانی جھوٹی بات ہے ظن دو قسم کا ہے ① جو ظن گناہ ہے وہ یہ کہ آدمی کے بارے میں بدگمانی کرے پھر اس پر عمل درآمد کرے کہ اس کا اظہار کردے یہ گناہ ہے ② وہ ظن جو گناہ نہیں وہ یہ کہ بدگمانی کرے مگر صرف خیالات کے درجے میں ہو اظہار نہ کرے یہ گناہ نہیں کیونکہ خیالات شیطان ڈال ہی دیتا ہے سوء ظن کا بڑا درجہ اللہ کے ساتھ بدگمانی ہے کہ کبھی اس کی الوہیت کا انکار کرتا ہے یا مانتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میرے ضروریات وحاجات اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ بھی لوگ پورے کر سکتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی الوہیت کو گویا اس نے تقسیم کردیا گویا اس کا خیال ہے کہ ایک الٰہ کافی نہیں بلکہ باقی بزرگ بھی الوہیت میں شریک ہیں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شرک کی ابتداء اسی سے ہوئی کہ لوگوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بادشاہت کو لوگوں کے بادشاہتوں پر قیاس کیا کہ وسائط کا ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوء ظن ہے کہ وہ سمجھے میں گناہ کرتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ سزا نہیں دیتے اس لئے میرا عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کو پسند ہوگا۔ اس کے بعد سوء ظن جو مکروہ چیز ہے وہ مسلمان کے ساتھ سوء ظن ہے۔

باب ماجاء في المزاح

مزاح دو قسم پر ہے ایک خوش طبعی کے لئے کبھی کبھار مزاح کرنا یہ صحیح ہے دوسرا مزاح وہ جو ذکر اللہ سے مانع ہو اسی سے دل میں قساوت قلبی پیدا ہوتی ہے یہ ممنوع ہے۔ یا اباعمیر ما فعل النغیر فقہی مسئلہ۔ شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں مکہ ومدینہ کا حرم ایک طرح ہے اسمیں صید جائز نہیں لیکن احناف کہتے ہیں مکہ ومدینہ کی حرمت تو ہے لیکن حرمت میں فرق ہے مکہ کا صید جائز نہیں مگر مدینہ کا صید جائز ہے دلیل یہی روایت ہے اس روایت سے ۶۰ سے زائد مسائل مستنبط کئے گئے ہیں جن کو ابن حجر نے نقل کیا ہے اور اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کیا ہے۔ یاذا الاذنین۔ ① یہ صرف بطور مزاح کہا۔ ② زیادہ سنتے تھے ③ اطاعت مراد ہے۔

باب ماجاء في المراء

''المراء الجدال'' لڑنے جھگڑنے کی ممانعت ذکر کرتے ہیں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا

کہ جس نے جھوٹ چھوڑ دیا اور جھوٹ باطل چیز ہے تو ایسے آدمی کے لئے جنت کے کنارے مکان بنایا جائے گا کہتے ہیں کہ کذب ہے ہی باطل اس لئے ہر قسم کے جھوٹ کا ترک مراد ہے بعض نے کہا کہ کذب سے خاص مراد ہے یعنی کذب فی المراء کہ جھگڑے کے وقت جھوٹ نہ بولے کیونکہ اس حالت میں لوگ زیادہ جھوٹ بولتے ہیں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں مگر کوئی اس حال میں بھی جھوٹ نہ بولے اس کے لئے خوشخبری ذکر کی ہے۔ ربض مثلاً مدرسے کا احاطہ ہے تو اس احاطے سے باہر مدرسے کے اردگرد یہ ربض ہے یہاں باہر مراد نہیں ہے بلکہ جنت کے اندر مراد ہے کہ جنت کے اندر کنارے پر بنایا جائے گا درجے کے اعتبار سے یہ ادنیٰ جنت ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا مگر لڑائی کرتا ہے اس کا بیان ہوا دوسری بات بتا رہے ہیں کہ کوئی جھوٹ کے ساتھ جھگڑا چھوڑ دے اور اس پر پختہ ارادہ کرے تو اس کے لئے درمیان جنت میں مکان بنایا جائے گا اور اگر وہ جھوٹ جھگڑے کے ترک کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے اچھے اخلاق اپنائے تو اس کے لئے اعلیٰ جنت میں مکان بنایا جائے گا کیونکہ اس کا درجہ اونچا ہے تو جگہ بھی اعلیٰ ملے گی۔ علماء کہتے ہیں کہ اخلاق اچھے بنانا فعل اختیاری ہے اس میں شک نہیں کہ بعض دفعہ کچھ چیزیں فطری ہوتی ہیں مگر کچھ اختیاری بھی ہوتی ہیں تو اخلاق بھی اختیار سے اچھا کر سکتا ہے کہ وہ اچھے لوگوں کو دیکھے اور ان جیسے اخلاق بنائے ان کی مجالس میں بیٹھے تو بہتر اثرات مرتب ہوں گے دوسری روایت میں ہے کہ اگرچہ آپ کا گناہ اور نہ ہو تو جھگڑا کافی ہے یعنی یہ گناہ کی چیز ہے۔ تیسری روایت میں ہے کہ بھائی سے مت جھگڑو (جھگڑے کا ادنیٰ یہ ہے کہ آپ کسی کے کام میں عیوب نکالیں اس سے جدال کا آغاز ہو جاتا ہے البتہ اگر شرعی نقصان کسی میں ہو تو اس کو علیحدگی میں سمجھا دو اور اگر ایسی دینی کمزوری ہو کہ لوگوں کے سامنے بیان نہ کرو تو ان کو شر پہنچے گا تو پھر عیوب بیان کر سکتا ہے) مزاح مت کرو۔

مزاح دو قسم کا ہے ① خوش طبعی کی حد تک یہ جائز ہے ② زیادہ کثرت سے مزاح یہ درست نہیں کیونکہ یہ قساوت قلبی کا باعث بن جاتا ہے اسی طرح دوسرے کی ھتک کے لئے مزاح کرنا بھی ناجائز ہے اور ایسا وعدہ نہ کریں کہ آپ بعد میں اس کو پورا نہ کر سکیں وعدہ کرتے وقت خیال ہو کہ پورا نہ کروں گا تو یہ نفاق کی علامت ہے دوسرا یہ ہے کہ وعدہ جس میں اندیشہ ہو کہ اس کو پورا نہیں کر سکوں گا ایسا وعدہ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ تیسرا یہ ہے کہ وعدہ پورا کرنے کی طاقت بھی ہو اور ارادہ بھی ہو پھر وعدہ خلافی ہو جائے یہ ایفاء عہد ہے، جمہور اور امام شافعی رَحِمَهُ اللهُ تَعَالىٰ کے ہاں واجب نہیں لیکن وعدہ خلافی مکروہ ہے بعض کے ہاں ایسے وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر پورا نہ کر سکا تو وہ تارک واجب ہوگا۔

باب ماجاء في الادارات

''بئس ابن العشيرة'' یہ برے قبیلے والا ہے یعنی منافق ہے یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ مجلس میں حضور ﷺ نے بتایا تاکہ لوگ اس کی شر سے محفوظ رہیں اس کے بعد وہ مرتد بھی ہو گیا تھا۔ ایک ہے مدارات دوسرا ہے مداهنة۔ مدارات کہتے ہیں عبذل الدنيا لمصلحة الدين او الدنيا او لكليهما۔ مال خرچ کریں تاکہ دنیا یا دین کی مصلحت حاصل ہو۔ اور مداهنة کہتے ہیں بذل الدين لمصلحة الدنيا۔

باب ماجاء في الكبر

کبر کہتے ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اس کا تعلق دل سے ہوتا ہے کہ دل میں اپنے آپ کو بڑا سمجھے لیکن اگر اس بڑھائی کا اظہار کرے تو تکبر ہے۔ ایک کبر وہ ہے کہ اچھی صفات کے اجتماع کی وجہ سے اس میں آجائے جیسے اللہ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ کو متکبر کہا گیا ہے لیکن وہ صفات نہ ہوں مگر ان صفات کو تکلفاً اپنے اندر پیدا کرے یہ کبر ہے جو مذموم ہے۔

عن عبداللہ۔ عبداللہ جب مطلق مذکور ہوتو ابن مسعود مراد ہوتے ہیں۔ فرمایا جس کے دل میں رائی کے دانے کے مقدار میں کبر ہو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اشکال۔ تکبر کفر تو نہیں کہ جنت میں نہ جائے پھر لا یدخل الجنۃ کا کیا مطلب ہے؟

جواب ① کبر سے کبر عن الحق وعن الایمان مراد ہے جو کہ کفر ہے اس لئے جنت میں نہ جائے گا ② کبر کی صفت موجود ہو اس کے ساتھ جنت میں نہ جائے گا بلکہ یہ بری صفات نکال دی جائیں گی لیکن ان دو تاویلوں کا اس مقام سے بعد ہے کیونکہ یہاں تکبر عن الخلق کا ذکر ہے اس کی شناعت بیان کرنا مقصود ہے اس لئے اس کا صحیح ③ جواب یہ ہے کہ تکبر کی سزا اگر دی جائے تو اس کا اصل بدلہ یہ ہے کہ جنت میں بالکل نہ جائے گا مگر اللہ یہ بدلہ فضل کی وجہ سے نہ دیں گے۔ ④ دخول اولیٰ کے ساتھ داخل نہ ہوا بلکہ سزا ملے گی تو یہ وعید ہے۔ جس کے دل میں دانے کے برابر ایمان ہو وہ جہنم میں نہ جائے گا۔ اشکال۔ معاصی کی وجہ سے سزا تو ملے گی۔ جواب مراد یہ ہے کہ کفار کی طرح دائمی دخول نہ ہوگا بلکہ اگر گیا بھی تو نکال دیا جائے گا۔ فقال رجل انہ یعجبنی ان یکون ثوبی حسناً۔ یہ حدیث جب بیان ہوئی تو ایک آدمی نے پوچھا کہ مجھے یہ پسند ہے کہ کپڑے جوتے خوبصورت ہوں تو زینت حاصل کرنا تکبر کی علامت ہے اس لئے تکبر اچھے کپڑے وغیرہ پہننے کا نام ہے تو یہ مجھ میں بھی ہے مگر آپ ﷺ نے جواب دیا کہ تکبر اس چیز کا نام نہیں یہ تو جمال ہے اور اللہ جمال کو پسند فرماتے ہیں لیکن تکبر یہ ہے کہ لکن الکبر سے مراد لکن ذالکبر تکبر والا آدمی وہ ہے جو حق سے انکار کرے اسے رد کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ دوسری روایت میں ہے ان اللہ جمیل۔ اللہ جمیل صفات والا ہے فاعل کے معنی میں ہے کہ خالق جمال ہے ویحب الجمال۔ اور جمال کو پسند کرتا ہے تو اچھے لباس کا ہونا یہ اللہ کی نعمت کا اظہار ہے جو مطلوب ہے۔

باب ماجاء فی حسن الخلق

اچھے اخلاق کیا ہیں اور حسن خلق والے ان کا مرتبہ کیا ہے؟ اس کا ذکر ہے فرمایا کوئی چیز مؤمن کے ترازو میں وزنی نہیں اچھے اخلاق سے کیونکہ حسن خلق حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کا ذریعہ ہے اس لئے یہ بہت بڑا وزنی عمل ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ناپسند کرتے ہیں اس کو جس میں قولاً وفعلاً فحش موجود ہے۔ البذی جو بدزبان ہے یہ تخصیص بعد التعمیم ہے اب جو چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کو پسند ہے وزن اسی کا ہوتا ہے اور ان میں زیادہ وزنی عمل حسن خلق ہے۔ دوسری روایت میں ہے سوال ہوا حضور اقدس ﷺ سے کہ لوگ زیادہ جنت میں کن اعمال کی وجہ سے جاتے ہیں آپ ﷺ نے جواب دیا ایک تو تقویٰ ہے کیونکہ تقویٰ ملاک الحسنات ہے تمام حسنات کمانے کا بنیاد تقویٰ ہے اسی کی وجہ سے حقوق ادا کرتا ہے دوسری چیز حسن خلق ہے کہ اخلاق اچھے ہوں لوگوں کے ساتھ معاملہ اچھا ہو پھر سوال ہوا جہنم میں زیادہ لے جانے والی چیزوں کا۔ تو جواب دیا کہ، منہ اور، فرج، فم سے زبان مراد ہے یا عام ہے کیونکہ فم کا استعمال غلط ہو تو جہنم میں جائے گا یہ تقویٰ کے مقابل ہے کیونکہ اس سے بہت سے اقوال وافعال صادر ہوتے ہیں جو جہنم میں جانے کا باعث ہیں دوسرا فرج ہے یہ بڑی شہوت ہے اس کو جو قابو کرے وہ صدیقین میں داخل ہو جاتا ہے اس کو جو قابو نہ کر سکے وہ ہلاک ہو جاتا ہے حسن خلق کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی خیر کو لوگوں سے نہ روکے۔

باب ماجاء فی الاحسان والعفو الخ

ایک آدمی نے سوال کیا نبی کریم ﷺ سے کہ ایک آدمی ہے جب ان کے ہاں میں جاتا ہوں تو وہ ہماری خاطر تواضع نہیں کرتے کیا جب وہ ہمارے ہاں آئے تو میں اس کی سلوک کا بدلہ دوں کہ اس کی مہمانی نہ کروں آپ ﷺ نے جواب دیا کہ نہیں ایسا نہ کریں بلکہ اس کی مہمانی کریں یہ احسان کا تقاضا ہے اور اچھے اخلاق کا تقاضا ہے آپ ﷺ نے میرے پھٹے پرانے کپڑے دیکھے تو انہوں

نے سوال کیا آپ کے پاس مال ہے میں نے کہا کہ اللہ نے ہر مال میں سے کچھ دیا ہے مثلاً ابل، غنم ان دو کا ذکر کیا کیونکہ اس وقت یہ سب سے بڑے مال تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر آپ پر اس نعمت کے آثار ہونے چاہئیں دوسرے روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''امعہ'' نہ کہو، یہ رجل کی صفت آئی ہے ای رجل امعہ۔ امعہ کا معنی ہے ''ان یکون مع کل ناعق'' کہ ہر آواز کے ساتھ ہے تو مطلب یہ ہے کہ ہر آواز کے ساتھ نہ دیں بلکہ حق و باطل کو پہچانیں اور اپنی رائے میں پختگی پیدا کریں بالکل اندھی تقلید نہ کریں اپنے عقیدے کو قرآن وسنت کے مطابق بنائیں نبی ﷺ کے طریقے کے مطابق عمل کریں آپ لوگوں کے پیچھے نہ چلیں بلکہ لوگ آپ کے پیچھے چلیں۔ آج کل یہی معاملہ ہے اپنے مفاد کی خاطر جہاں سے بلاوا آئے لوگ قبول کر لیتے ہیں سیاسی وفاداریاں تبدیل کر لیتے ہیں۔ فرمایا نہ کہو کہ وہ احسان کریں ہم بھی کریں گے وہ ظلم کریں ہم بھی ظلم کریں گے یہ امعہ کا معنی ہے اگر چہ امعہ کی باقی صورتیں بھی ہیں جیسے اوپر بیان ہوا کہ تم اپنے نفسوں کو تیار کرو اس بات کے لئے کہ لوگ احسان کریں آپ بھی کریں اور لوگ برائی کریں آپ ظلم نہ کریں حد سے تجاوز نہ کریں۔

باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان

جس نے مریض کی عیادت کی ''اوزار اخالہ'' ای اخالہ فی الدین ''فی اللہ'' ای وجہ اللہ۔ ایسے شخص کو فرشتے دعا دیتے ہیں آپ نے اچھا کہا اللہ آپ کو بہتر کر دے آپ کا یہ چلنا جنت کی طرف ہے اس کو اللہ اچھا کرے اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو وہاں جنت میں ٹھکانہ دے یہ خبر کے الفاظ ہیں مگر مراد دعا ہے۔

باب ماجاء فی الحیاء

حیاء صفت ہے جو قبیح چیزوں سے مانع ہے اور اس کے ذمے جس کا حق ہے اس کے حق میں تقصیر نہیں کرتا بلکہ حق ادا کرتا ہے۔ ایک روایت میں ہے الحیاء کلہ خیر کہ جس میں حیاء ہے وہ ہمیشہ خیر کے کام کرے گا۔ اشکال کبھی حیاء کی وجہ سے انسان حق بیان نہیں کر سکتا جب کہ حدیث میں ہے الحیاء کلہ خیر جواب یہ حیاء نہیں بلکہ بزدلی ہے حق بیان کرنا چاہئے حکمت سے جو نہ کر سکے یہ اس کی کمزوری ہے۔

باب ماجاء فی التأمین والعجلۃ الخ

''عجلۃ'' جلد سازی ''التانی'' اس کی ضد ہے یعنی ترک العجلۃ۔ ''السمت الحسن'' سمت بمعنی السلوک والطریق یعنی بہترین راستہ کہ اخلاق اچھے ہوں اور سیرۃ بھی۔ ''التودۃ'' بعض نسخوں میں ہمزہ اور دال مخفف ہیں تا مشدد ہے یعنی ترک العجلۃ۔ الاقتصاد۔ میانہ روی جس میں افراط وتفریط نہ ہو فرماتے ہیں کہ نبوت کے اجزاء میں سے یہ صفات چوبیسواں حصہ ہیں بعض نے لکھا ہے کہ ہر ایک صفت ان میں سے نبوت کا چوبیسواں حصہ ہے دلیل اس پر دوسری روایت ہے جس میں ہے کہ السمت خمس وسبعون جزء من النبوۃ۔ یہاں، ۷۵، ۲۴ یہ عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے کہ یہ صفات بڑی اجزاء ہیں نبوت کی۔ نبوت اکتسابی نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو منتخب کرلے اس لئے خصال مراد ہیں کہ جن میں یہ صفات ہوں ان میں نبوت کی خصلتیں آ جاتی ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اس کو قرب حاصل ہوتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ اشج عبد القیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تم میں دو خصلتیں ہیں جن کی وجہ سے

اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں پسند کرتا ہے بردباری اور صبر وثبات۔ کیونکہ یہ وفد کے بعد آپ ﷺ سے ملے خوب آرام سے کپڑے سفر کے بدل کر کے آئے تھے۔الاناۃ من اللہ العجلۃ من الشیطان معلوم ہوا امور میں جلد بازی شیطانی وسوسہ ہے البتہ اس سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت والے ہیں بلکہ دنیاوی معاملات ہوں اور اس کے فوت ہونے کا خطرہ نہ ہو اس میں عجلۃ شیطان کی طرف سے ہے البتہ طاعۃ اللہ کی طرف عجلۃ مقصود ہے جیسے فرمایا عجلت الیک رب لترضی ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ اسراع مطلوب ہے جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ امور خیر میں جلدی کرے اور عجلۃ مذموم ہے کیونکہ دونوں میں فرق ہے عجلۃ کہتے ہیں بغیر سمجھ کر دوڑے یہ دینی ودنیاوی دونوں امور میں مطلوب نہیں جب کہ اسراع کہتے ہیں سوچ سمجھ کر عقل مندی کے ساتھ کسی چیز کے کرنے میں جلدی کرنا یہ مطلوب ہے دنیاوی امور میں ہو یا دینی امور میں۔

باب ماجاء فی الرفق

جس کو اس کا حصہ دیا گیا نرمی کا یعنی اس کی طبیعت عادات میں نرمی ہو تو اس کو خیر میں اس کا حصہ ملا اور جو رفق کے حصے سے محروم ہوا وہ خیر کے حصے سے محروم رہا کیونکہ رفق ایسی صفت ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا وآخرت دونوں کو حاصل کر سکتا ہے جب کہ رفق نہ ہو تو نہ دنیا میں نہ آخرت میں خیر حاصل کر سکتا ہے رفق میں کسب کی ضرورت ہے۔

باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ

یہاں ہے کہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی دوسری جگہ ہے کہ ۹ سال خدمت کی تو بظاہر تعارض ہے۔ جواب حضور ﷺ مدینہ میں دس سال تک رہے جب ہجرت کر کے آئے تو چند ماہ بعد انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی والدہ حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئیں تو جنہوں نے ۹ سال کہا انہوں نے ان چند ماہ کو ذکر نہیں کیا اور جنہوں نے دس سال کہا انہوں نے ان کسور کو مستقل سال شمار کیا،اف،اس میں لغات ہیں اُفٌ، اُفاً، اُفَ، اُفِّ، اُفِ، اُفُ، اُف، وَلَا لِشَئيٍ تَرَكْتُهُ لِمَ تَرَكْتَهُ، اس میں حضور ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کا ذکر ہے کہ خادم اتنے عرصہ خدمت کرے تو کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے دوسرا اس میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی فضیلت ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں ایسا کام نہیں کیا جس سے حضور ﷺ کو دکھ ہوا ہو۔ ''خزاً'' ریشم باریک، حریراً، موٹا ریشم۔

باب حسن العهد

جو زمانہ قریب گزرا ہے اسکی یادداشت ہونی چاہئے۔ ماغرت۔ غیر سے ہے بمعنی الحمیۃ الجاھلیۃ۔ چونکہ یہ ضرائر (سوکنیں) تھیں اس لئے بلند صفات کے باوجود انسانی طبیعت کی وجہ سے یہ باتیں آجاتی تھیں اس لئے فرمایا کہ مجھے خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بہت غیرت آتی تھی حالانکہ میں نے ان کا زمانہ نہیں پایا مگر غیرت اس لئے آتی کہ حضور اقدس ﷺ ہمیشہ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

بلند اخلاق کے بارے میں باب ہے کہ معالی اخلاق کس کو کہتے ہیں۔ حدیث۔ دنیا میں سب سے زیادہ مجھے محبوب اور قیامت میں مجھ سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور مجھے سب سے زیادہ مبغوض دنیا میں اور قیامت میں مجھ سے زیادہ دور باعتبار مرتبہ کے وہ لوگ ہیں جو الثرثارون، المتشدقون، المتفیھقون ہوں، ''الثرثرۃ'' کثرۃ الکلام المتشدقون المتوسعون فی الکلام، فحش کلام کرنا، منہ بھر کر بولنا، المتفیھقون بمعنی التکبر اصل معنی ہے کہ وہ اپنی باتیں بیان کریں تو دوسروں پر فخر کریں کہ ہم جیسے فصیح

بولنے والا کوئی نہیں اس لئے لازمی معنی متکبر کیا۔ لیکن اگر کسی کو فصیح کلام پر قدرت ہو وہ بیان کرے بغیر تکلف اور تکبر کے پھر وہ ناجائز نہیں۔

باب ماجاء فی اللعن

یہ تکرار ہے پہلے بھی باب گزر چکا ہے بہتر یہ تھا کہ اس باب کی روایات بھی پہلے باب باب ماجاء فی اللعنة میں ذکر کر دیتے تو بظاہر تکرار ہے اگر چہ یہاں ترجمۃ الباب میں اللعن کا لفظ بڑھایا مگر پھر بھی تکرار ہے۔ لعنت۔ کہتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے رحمت سے دوری کو کافر کیلئے لعنت اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے، مؤمن کے لئے ہو تو فی الجملہ اس میں بھی دوری ہے اور یہ بددعا ہے۔

باب ماجاء فی کثرة الغضب

کثرۃ الغضب ممنوع ہے اس کی مذمت کی جارہی ہے کثرۃ غضب لاکر اشارہ کیا کہ تھوڑا بہت غصہ آہی جاتا ہے اس سے بچنا مشکل ہے لیکن کثرۃ غضب سے پرہیز کرسکتا ہے اس لئے اس کی مذمت کی آدمی آیا کہا کہ دین کے احکام مختصر اُسنائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا لاتغضب مطلب ① جس میں غصہ پایا جائے کثرت کے ساتھ وہ دین ودنیا دونوں کی نعمتوں برکتوں سے محروم ہو جاتا ہے دنیا میں بھی معاملہ کرنے تو غصے کی وجہ سے کام خراب ہو جاتا ہے دین کے اندر بھی نقصان ہوتا ہے کہ حقوق اللہ میں کثرۃ غضب سے کوتاہی ہو جاتی ہے اس لئے لاتغضب کہا یہ جامع جملہ ہے اس پر عمل کی وجہ سے دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی ھے ② حضور پاک ﷺ اکثر سائل کے حال کے مطابق جواب دیتے تھے اس آدمی کے اندر غصہ بہت تھا اس لئے آپ ﷺ نے علی اسلوب الحکیم کے فرمایا ''لاتغضب'' کہ آپ بھی احکام کو پوچھنے سے پہلے غصہ چھوڑ دو۔ ومن کظم غیظاً۔ ایک آدمی میں غصہ ہے مگر مد مقابل سے انتقام نہیں لے سکتا تو یہ ظاہر ہے ڈر سے غصہ پی لے گا لیکن اگر اس میں انتقام کی قدرت ہو اس کے باوجود بھی غصہ کو اللہ کی رضا کے لئے دبائے یہ بڑا مشکل کام ہے قرآن میں اس کے تین درجے بتائے ① کاظمین الغیظ ② والعافین عن الناس کہ غصہ پی لینے کے بعد اس کو معاف بھی کردے ③ تیسرا اعلیٰ درجے یہ ہے کہ اس کو بطور احسان کچھ دے بھی دے؟

باب ماجاء فی اجلال الکبیر

یہاں سند میں ابوالرجال ہے اور آخر میں بھی ابوالرجال ہے یہ نسخے کی غلطی ہے صحیح مصری نسخے ہیں ان میں آخر میں ہے ابوالرحال اور شروع میں ہے ابوالرجال۔

باب ماجاء فی المتهاجرین

''تھاجر'' بمعنی متارکۃ کہ ہر ایک نے دوسرے کو چھوڑ دیا اس سے کنارہ کشی کی ان کے بارے میں ھے کہ جب تک صلح نہ کریں جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ یہاں تھاجر جو ممنوع ہے یہ وہ ہے جو دنیاوی امور کی وجہ سے اختلاف آیا ہو لیکن دین کی وجہ سے تھاجر ممنوع نہیں کہ کوئی کسی بدعتی سے تھاجر کرے یہ گناہ نہیں!

باب ماجاء فی الصبر

صبر کی تلقین کی جارہی ہے۔ انصار میں سے کچھ نے حاجت ظاہر کی آپ نے دے دیا پھر دوبارہ آئے آپ نے دے دیا آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جو چیز ہوتی ہے تم کو دے دیتا ہوں جو مستغنی ہو سوال نہ کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو مستغنی کر دے گا جس نے اپنے نفس کو ناجائز اشیاء سے روک کر مصائب پر صبر کیا گناہوں سے صبر کیا اللہ کی اطاعت میں، اللہ تبارک وتعالیٰ

اس کو اس کی توفیق دیں گے، جو عفت اختیار کرے سوال کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو عفیف بنا دیتے ہیں۔

باب ماجاء فی النمام

"قتات رقت الحدیث" اپنی طرف سے باتیں بنائے مراد چغلخور ہے یعنی نمام۔ لا یدخل الجنۃ کا مطلب یہ ہے کہ دخول اولی کے ساتھ نہ جائے گا یا یہ مسلمانوں کا کام نہیں کہ جاسوسی کرے یا مطلب اس سے تمام لوگوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں نقصان ہوتا ہے اس لئے کثرت سے کرے اسکو زجر ہے اسی طرح حلال سمجھے تو کافر ہے۔

باب ماجاء فی العی

"العی" بکسر العین بمعنی قلۃ الکلام حدیث میں ہے من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ کہ ضرورت کے بغیر نہیں بولنا چاہئے۔ فرمایا حیاء تمام معاملات میں اور اسی طرح قلت کلام یہ دو صفات ایمان کی شاخوں میں سے دو شاخیں ہیں کیونکہ یہ عمل خیر ہیں اور ہر عمل کا اصل منشاء و بنیاد ایمان ہے ایمان ہی کی وجہ سے حیاء کرتا ہے زیادہ اور فحش باتوں سے ڈرتا ہے یہ ایمان کا تقاضا ہے اور فحش فی الکلام اور ضرورت سے زیادہ بولنا یہ ایسے مذموم صفات ہیں کہ یہ نفاق کی علامتیں ہیں کیونکہ جس کی زبان قابو میں نہ ہو وہ جھوٹ بولتا ہے اسی طرح اس کی باتیں خلاف وعدہ باتیں ہوتی ہیں اور یہ منافق کی علامتیں ہیں اسی طرح فحش کلام بھی منافق کی نشانی ہے کیونکہ اذا خاصم فجر۔

باب ماجاء ان من البیان سحراً

یہاں دو آدمیوں کا واقعہ ہے ایک عمرو بن مہیم تھا دوسرا زبرقان تھا نبی ﷺ کی مجلس میں بیٹھے بڑی بڑی باتیں کیں زبرقان نے کہا عمرو میری صفات جانتا ہے۔ مگر بیان نہیں کرتا اس نے پہلے اس کی صفات بیان کیں پھر مذمت کی اور کہا میں دونوں طرح بولتا ہوں کوئی راضی کرے میں مدح کرتا ہوں اگر ناراض کرے تو مذمت کرتا ہوں اس کا لوگوں پر اثر ہوا تو آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

باب ماجاء فی التواضع

کوئی صدقہ کرے اس سے بظاہر کمی ہوتی ہے مگر حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں برکت پیدا کر دیتے ہیں اس کو بڑھا دیتے ہیں دنیا میں بھی آخرت میں بھی اگر انفاق نہ ہو تو مال میں برکت نہیں ہوتی اگرچہ کثیر مال ہی کیوں نہ ہو آگے فرمایا اللہ کسی کو عفو کی وجہ سے نہیں بڑھاتے مگر عزت یعنی آپ کسی کو معاف کر دیں تو اس سے آپ کی عزت میں اضافہ ہو گا اس کے بدلے میں ذلت کبھی نہیں ملے گی۔ کوئی آدمی تواضع نہ کرے مگر اللہ ہی کے لئے مگر اللہ اس کو بلند کر دیتے ہیں۔ تواضع کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے درجہ سے کم سمجھے اور یہ تواضع دکھلاوے کے لئے نہ ہو صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو تو اللہ اس کی عزت اور بڑھا دیں گے۔

باب ماجاء فی الظلم

ظلم کی مذمت اور اس کے انجام کے بارے میں ہے۔ ظلم قیامت کے دن اندھیرے بن جائیں گے کچھ نہ دیکھ سکے گا اندھیرے میں ہو گا جب کہ مؤمنوں کو نور ملے گا۔ یا ظلمات بمعنی شدائد وعذاب ہے کہ قیامت کے دن ظلم کے بدلے میں شدائد اور عذاب ہوں گے تو ایک ظلم کئی مصائب کی صورت میں آئے گا اولیٰ معنی واضح ہے کیونکہ دنیا میں اس کے دل میں نور نہ تھا اس لئے ظلم کرتا تھا اس لئے آخرت میں بھی نور نہ ملے گا اندھیرے میں رہے گا۔

باب ماجاء فی ترک العیب

عیب دو قسم کا ہے ایک عیب طعام کے اندر قدرتی طور پر ہے کہ طعام کئی ہیں بعض اعلیٰ قسم کی صفات والے ہیں مگر بعض میں صفات کم ہیں تو اس میں کسی قسم کے عیب نہ نکالتے تھے جس درجے کامل گیا اس کو کھالیتے تھے۔ ۲ دوسرا عیب تیار کرنے والے نے پیدا کر دیا مثلاً کبھی نمک زیادہ کر دیا کبھی کم اس قسم کے عیب مراد نہیں اس کی ممانعت نہیں کیونکہ وہ عیب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نہیں اس لئے بیان کر سکتے ہیں بعض نے کہا کہ ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی میں بھی عیب نہ نکالتے تھے بشرطیکہ قابل استعمال ہو۔

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

آپ ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا اے لوگوں جو بظاہر مسلمان ہیں مگر ایمان دل میں داخل نہیں ہوا مراد منافق ہیں ان کو فرمایا کہ مسلمانوں کو اذیت نہ دو۔ ''ما اعظمک'' تعجب کے صیغے ہیں کہ تمہاری کتنی بڑی عظمت ہے مگر مؤمن کا مرتبہ تم سے زیادہ ہے۔

باب ماجاء فی التجارب

الا ذو عثرۃ۔ یعنی حلیم نہیں ہوسکتا ہے مگر عثرت کہتے ہیں لغزش کو کہ اس سے بار بار لغزش ہو دوسرا اس کو معاف کر دے تو اس میں صبر آجائے گا اب اس کو کسی سے تکلیف پہنچی تو یہ بھی معاف کرے گا۔ لاحکیم اس کے کام میں احکام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ بار بار تجربہ نہ کرے۔

باب ماجاء فی المتتبع بمالم یعطه

کوئی آدمی کہے کہ فلاں نے مجھے یہ چیز دی حالانکہ اس نے نہ دی ہو یہ متتبع بمالم یعطہ ہے اسکی مثال دی اس سے جس نے دو چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے ہوں کیونکہ اس نے دو جھوٹ بولے ایک تو یہ بتایا کہ فلاں کے ساتھ میرا تعلق ہے دوسرا اس نے مجھے یہ چیز دی۔ شان ورود بعض لوگ تھے جو قمیص پہنیں لیکن آستین کے ساتھ نیچے دوسرا کپڑا لگائے تاکہ دو قمیص معلوم ہوں بعض نے کہا عورت نے حضور ﷺ سے کہا کہ میں سوکن کو جلانے کے لئے یہ کہوں کہ شوہر مجھے یہ سب کچھ دیتا ہے آپ ﷺ نے منع کیا۔ بعض نے کہا کہ بعض لوگ سچے مشہور تھے دوسرے لوگوں نے انکا لباس پہن لیا تاکہ مجلس والے سچا سمجھیں اور معاملہ کریں۔

ابواب الطب

عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء فی الحمیة

روحانی طور پر انسان کو اعمال خیر سے علاج ملتا ہے یعنی روحانی بیماریوں کا علاج اعمال خیر ہیں اسی طرح جسمانی بیماریوں کے لئے شریعت نے علاج بتایا ہے یہ اس مذہب کا کمال ہے کہ اس میں تمام روحانی وجسمانی بیماریوں کے علاج موجود ہیں اس میں کسی کے احتجاج کی ضرورت نہیں لیکن اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے آج کل کی طب تجربے پر مبنی ہے اس میں آج دوا بناتے ہیں اس کے فوائد بتاتے ہیں مگر کل جب دوسری تحقیق سے دوائی تجویز کرتے ہیں تو پہلے ثمرات ذکر کرتے ہیں جب کہ شریعت نے جو دوائیں بتائیں یہ وحی سے تھیں اس لئے اس میں تحقیق کے بعد کوئی تبدیلی کا سوال نہیں۔ ''الحمیة'' پرہیز اصل میں آدمی جب تجلی چاہتا ہے تو اس کے لئے پہلی تخلی لازمی ہے۔ باب ماجاء فی الحمیة لایا کہ جس چیز سے اس کی طبیعت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اس سے پرہیز کرے یہ بھی علاج ہے دلیل آنے والا واقعہ ہے۔ ''دوال معلقة'' کھجور کے خوشے لٹکائے ہوئے تھے۔ ''فانک ناقہ'' ای قریب العہد کہ بیماری ختم ہوئی ہو مگر اس کے آثار باقی ہوں ''سلقا'' چقندر دوسری روایت میں ہے کہ اللہ جس سے محبت کرے تو دنیا کو اس سے دور رکھتا ہے اس کی دنیا سے حفاظت کرتا ہے دنیا کی لذات سے بچاتا ہے جس طرح کوئی استسقاء بطن کی بیماری میں مبتلا ہو تو آپ اس کو پانی سے بچا کر رکھتے ہیں اگر وہ پی لے تو پیٹ پھول جائے گا جس سے ہلاک ہو جائے گا۔ اسی طرح دنیا کی محبت ہلاکت ہی ہلاکت ہے اس لئے اللہ اپنے محبوب بندے کو دنیا سے دور رکھتا ہے اس لئے انکی زندگی کفاف سے گزرتی ہے دنیا کے تنعمات میں نہیں پڑتا اور یہ قانون ہے کہ کوئی جتنا دنیا سے دور ہو اس میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی الدواء والحث علیه

دیہاتی نبی ﷺ کے پاس آئے کہا کیا ہم علاج کرا سکتے ہیں؟ کیا یہ توکل کے خلاف تو نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دوائی کریں اللہ نے کوئی بیماری مقرر کی نہیں مگر اس کے لئے علاج بھی مقرر کیا یا فرمایا شفاء مقرر کی تو دوا کا استعمال توکل کے خلاف نہیں البتہ ایک بیماری ایسی ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں وہ بیماری بڑھاپا ہے ایک روایت میں السام ہے یعنی موت۔ ''ھرم'' آخری بیماری ہے یہ موت کے آثار ہیں اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ علاج سنت ہے توکل کے خلاف نہیں اس سے ان متصوفین کی تردید ہوتی ہے جو علاج کو توکل کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں ولایت کا درجہ تب حاصل ہوگا جب تمام مصائب برداشت کر سکیں مگر یہ غلط ہے حضور ﷺ نے خود دوائی استعمال کی ہے اس لئے ظاہری اسباب اختیار کر کے نتیجہ اللہ کے حوالے کر دے۔

باب ماجاء مایطعم المریض

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے اہل کو جب بخار ہوتا تھا تو آپ ﷺ ''حسا'' بنانے کا حکم دیتے تھے یعنی حریرة (آٹا، پانی، گھی، اور چینی سے تیار کرتے ہیں) نرم ہوتا ہے اس کو گھونٹ گھونٹ کر استعمال کرتے ہیں۔ ''لیرتوا'' جس کے دل میں غم ہو یہ

اس کا غم دور کرتا ہے اس کا دل جڑ جاتا ہے کبھی نمکین اور کبھی میٹھا ہوتا ہے اور بیمار کے دل سے بیماری دور ہوتی جس طرح عورتیں چہرے کو پانی سے دھولیں تو میل پانی سے دور ہوتی ہے اسی طرح اس کے استعمال سے بیماری دور ہو جاتی ہے۔ "لاتکرھو امرضاکم الخ فان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ یطعمھم ویسقیھم" ① اللہ کی طرف سے غذا ملتی ہے ② ایسی صفت پیدا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

باب ماجاء فی الحبة السوداء الخ

"فان فیھا شفاء من کل داء" یہ عموم پر محمول ہے یا نہیں بعض نے لکھا ہے کہ بعض بیماریاں جو رطوبت یا یبوست سے ہوان کے لئے علاج ہے دوسروں کے لئے نہیں اطباء نے لکھا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک دانہ ہر چیز کے لئے علاج ہو جائے کیونکہ مزاج میں جو اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اس کے اسباب الگ ہوتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ سب کے لئے دوا ہو مگر حدیث کا ظاہر اس پر دال ہے کہ یہ تمام امراض کے لئے مفید ہے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قدرت سے بعید نہیں البتہ استعمال میں تجربہ ہونا چاہئے کہ الگ کھایا جائے یا مرکب کر کے اسی طرح چبا کر کھائے یا پیس کر کھائے یا ناک میں رکھے۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

ابواب الطب میں لا کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابوال ابل سے علاج کرنا جائز ہے اس سے معلوم ہوا کہ نجس وحرام چیز سے علاج جائز ہے جب اور کوئی علاج نہ ہو کیونکہ ابوال ابل نجس ہے مگر آپ ﷺ نے علاج کی اجازت دی یہ آپ ﷺ کو بطور وحی معلوم ہو گیا تھا اس حدیث میں کئی مسائل ہیں۔

① التداوی بالحرم۔ ② ابوال مایوکل لحمہ ③ مماثلت فی القصاص۔

یہاں پر پہلا مسئلہ یہ ہے یہاں عرینہ کا ذکر ہے بعض نے ساتھ عکل کا بھی ذکر کیا ہے بعض میں ہے کل آٹھ آدمی تھے تو چار عرینہ کے تھے تین عکل کے تھے اور ایک کسی اور قوم کا تھا یہ جب بیمار ہوئے تو حضور ﷺ نے ابوال ابل پینے کا حکم دیا اس سے استدلال بعض نے کیا ہے کہ بول مایوکل لحمہ طاہر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بطور تداوی اجازت دی ہے اور حالت اضطراری تھی اضطراری حالت میں بعض حرام چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: تداوی بالحرام جائز ہے یا نہیں اسی طرح حضور ﷺ نے بول کے پینے کا حکم دیا تھا یا نہیں تو فرماتے ہیں حضور ﷺ نے شرب کا حکم دیا کیونکہ آپ ﷺ کو شفاء بذریعہ وحی معلوم ہو گئی تھی اور اگر اور کوئی علاج نہ ہو تو پھر تداوی بالحرام جائز ہے کیونکہ یہ حالت اضطراری ہوتی ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضور ﷺ نے شرب الباں کا حکم دیا تھا ابوال کا استعمال انہوں نے خود شروع کیا باقی حدیث میں ابوال کا فعل محذوف ہے ای اشربوا من البانھا واستشفوا من ابوالھا اور یہ عفتھا طبنا وماء باردا کے قبیل سے ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ شرب ابوال کا حکم دیا یہ ابتداء میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اور الباں کے پینے کا اب بھی حکم ہے کیونکہ یہ جو درخت کھاتا ہے ان سے قدرتی طور پر ان کے دودھ میں اثر پڑتا ہے جس میں اس بیماری کی دواء اور علاج پایا جاتا ہے۔

باب من قتل نفسه بسم اوغیره

آدمی کسی چیز سے خودکشی کر لے تو قیامت کو جہنم میں ہمیشہ اسی طرح اپنے آپ کو قتل کرتا رہے گا کیونکہ زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت

ہےاس نے اسکی ناقدری کی گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی تقدیر پر راضی نہ تھا اس لئے جلدی مرنے کا ارادہ کیا۔ایک روایت میں ہے من قتل نفسه بحديدةٍ جاء يوم القيامة وحديدته في يده يتوجأ بها بطنه في نار جهنم خالداً مخلداً ابداً دوسری روایت میں ہے من قتل نفسه بسم عذب في نار جهنم اس میں خالداً مخلداً ابداً ذکر نہیں۔ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ اصح ہے کیونکہ مسلمان دائمی جہنمی نہ ہوگا۔مسئلہ خالداً مخلداً ابداً جہاں آئے مؤمن کے بارے میں تو اس کی تاویل کی جاتی ہے کیونکہ موحد کی سزا دائمی جہنم نہیں بلکہ تطہیر کے لئے جہنم میں جائے گا پھر نکالا جائے گا کیونکہ خودکشی کفر نہیں معصیت ہے ① امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ترجیح کا قول اختیار کیا ہے کہ جس میں خالداً مخلداً ہے یہ راویوں نے بطور زیادتی ذکر کیا ہے۔② دوسری توجیہ یہ ہے کہ خودکشی جائز سمجھے تو دائمی جہنمی ہوگا ③ تیسری توجیہ یہ ہے کہ خالداً مخلداً ابداً سے دوام مراد نہیں بلکہ مکث طویل مراد ہے ④ بعض نے توجیہ کی ہے کہ بطور زجر ہے جس طرح قرآن میں قتل کی سزا دائمی جہنم بطور زجر ہے ⑤ بعض نے کہا اس کی سزا اصلی یہی ہے کہ دائمی جہنمی ہو لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کرم کی وجہ سے یہ سزا ہمیشہ نہ دیں گے بلکہ ان کو سزا دے کر نکالیں گے۔

"الدواء الخبيث" ① دواء خبیث سے زہر مراد ہے کہ اس سے تداوی نہ کرے اس کی کئی انواع ہیں ایک یہ ہے کہ اس کے کھانے میں یقینی ہلاکت ہے ② یقینی معلوم ہو کہ کم استعمال نقصان دہ نہیں زیادہ نقصان دہ ہے ③ غالب گمان یہ ہو کہ نقصان نہ دے گی مگر نقصان کا اندیشہ پھر بھی ہو، ہر صورت کا الگ حکم ہے مگر عموم میں حکم ممانعت ہے ④ دواء خبیث سے نجس اور حرام چیزیں مراد ہیں جیسے خمر، پیشاب پاخانہ، وغیرہ ان کا استعمال بطور علاج ممنوع ہے یہ عمومی اعتبار سے ہے بعض نے ابوال ابل کو مستثنیٰ کیا ہے۔

باب ماجاء في كراهية التداوي بالسكر

معلوم ہوا حرام چیزوں سے علاج حرام ہے اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا خمر دواء نہیں بلکہ بیماری ہے اس لئے جمہور کے ہاں اس کا استعمال جائز نہیں صرف حالت اضطرار میں بقدر ضرورت استعمال کی اجازت ہے ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس امت پر جو چیزیں حرام ہوئیں وہ سب خبائث تھیں ورنہ طیب تمام چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کے لئے حلال رکھی ہیں خمر ام الخبائث ہے اگر اس میں کچھ بھی فائدہ ہوتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو حرام نہ فرماتے۔

باب ماجاء في السعوط

سعوط کہتے ہیں ناک کے ذریعے سے دوائی ڈالنا۔طریقہ یہ ہے کہ کندھے کے نیچے تکیہ رکھ کر لٹایا جائے تاکہ سر لٹک جائے پھر ناک میں دوائی ڈالو جو دماغ تک جائے گی۔اللدود، الوجود بعض نے کہا دونوں میں فرق نہیں مگر محدثین نے فرق بتایا ہے۔"لدود" وہ دوائی جو بذریعہ چمچ منہ کی اندر ایک جانب ڈالی جائے وجود یا وجور وہ دوائی جو منہ کے درمیان ڈالی جائے۔"الحجامة" سینگ لگا کر خون نکالنا عرب میں اس کا استعمال بہت زیادہ تھا کیونکہ وہاں گرمی ہے اس سے خون میں رقت وسیلان پیدا ہوتا ہے جس سے جسم پر اثر پڑتا ہے اس لئے اس خون کو نکال دیا جاتا ہے۔"المشی" وہ دوائی جو اسہال کے لئے استعمال کی جاتی ہے تو اس کی وجہ سے آدمی بار بار چل کر بیت الخلاء جاتا ہے۔"الاثمد" خاص قسم کا پتھر ہے اصفہان میں زیادہ ہوتا ہے بلاد عرب میں بھی پایا جاتا ہے یہ بطور سرمہ استعمال ہوتا ہے اس سے نظر تیز ہوتی ہے دوسرا بال پیدا ہوتے ہیں۔فلما اشتكى رسول الله ﷺ لده اصحابه رضوان الله عليهم آپ ﷺ کی جب بیماری بڑھ گئی تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوائی پیش کی آپ ﷺ نے انکار کر دیا مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سمجھ کر کہ بیماری زیادہ ہے نیم بے ہوشی کی حالت میں چمچے کے ساتھ دوائی پلائی آپ ﷺ کو جب افاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا چونکہ انہوں نے میرے حکم کی

خلاف ورزی کی ہے اس لئے جزا بالمثل کے طور پر ان کو بھی دواء پلائی جائے جنہوں نے نبی ﷺ کو پلائی تھی صرف عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہیں پلائی گئی کیونکہ (۱) اس وقت موجود نہ تھے (۲) انہوں نے دواء پلانے والوں کی مدد نہیں کی (۳) حضور ﷺ کے چچا تھے اس لئے اکراماً نہیں پلائی۔

باب ماجاء فی کراھیة الکی الخ

''الکی'' بمعنی گرم چیز سے بدن جلانا داغ لگانا۔ بعض نے تعذب بالنار کی وجہ سے مکروہ کہا ہے دوسری روایت میں داغ لگانے کی رخصت معلوم ہوتی ہے قال فابتلینا حضور ﷺ نے منع کیا مگر ہم بیمار تھے اس لئے نہی کے باوجود داغ لگائے تو اس علاج سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسرے باب میں رخصت کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے سعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو داغ لگایا کیونکہ ان کے جسم میں شوکہ بیماری تھی یعنی ان کا جسم سرخ ہو گیا تھا اس بیماری سے معلوم ہوا جائز ہے اس لئے نبی ﷺ نے داغ لگایا اب یا نبی ﷺ نے خود لگایا یا حکم دیا کسی اور کو اور حکم آپ ﷺ کا تھا اس لئے ان کی طرف نسبت کی، تو یہ دو قسم کی روایت ہیں بعض میں داغ نہ لگانے والوں کی مدح کی ہے کہ جو نہیں لگاتے وہ ان ستر ہزار میں ہوں گے جو بغیر حساب کی جنت میں جائیں گے۔ پہلی روایات میں جو نہیں ہے وہ اس لئے کہ ان کو بواسیر کی بیماری تھی آپ ﷺ نے منع کیا کہ یہ علاج اس بیماری کا نہیں اسلیئے نہ لگاؤ مگر انہوں نے داغ لگایا تو نقصان ہوا۔ بعض نے کہا پہلی روایت میں نہی مکروہ تنزیہی کے لئے ہے اور دوسری روایت میں جواز ہے باقی داغ نہ لگانے والوں کی مدح کی کیونکہ داغ نہ لگانا بہتر ہے تو اولیٰ پر عمل کی وجہ سے مدح کی بعض نے کہا کہ کراہیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعذیب بالنار ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ جائز نہیں اس لئے بہتر ہے اور کوئی علاج تلاش کرو لیکن اور علاج نہ ہو تو جواز موجود ہے۔

باب ماجاء فی الحجامة

سنگی کے ذریعے خون نکالنے کا بیان ہے ''الاخدعین'' یہ گردن کی دائیں بائیں طرف دو رگیں ہیں ان سے خون نکالا جائے تو سر کی تمام بیماریوں کا علاج ہے اور ذقن کے نیچے سے نکالنا یہ جملہ بیماریوں کا علاج ہے یہ علاج بھی جائز ہے اس پر اجرت لینی بھی جائز ہے اور کب ہونا چاہئے تو بعض روایات میں ہے روزے کی حالت میں کیا بعض میں ہے رات کو کیا تو وقت مقرر نہیں اسی طرح تاریخ میں بھی تو دن متعین نہیں جب بھی ضرورت پڑ جائے علاج کیا جائے گا لیکن یہاں ۱۷، ۱۹، ۲۱، تاریخ کو متعین کیا ہے کیونکہ بعض فلاسفہ اور ابن سینا وغیرہ کہتے ہیں کہ ابتدائی ماہ میں خون میں ہیجان ہوتا ہے اصلی خون اوپر ہوتا ہے اور بیکار خون نیچے ہوتا ہے۔ تو حجامت سے اصلی خون نکل جائے گا اور آخری دنوں میں بالکل سکون ہوتا ہے جب کہ درمیانی عشرے میں درمیانی حالت میں ہوتا ہے اور بے کار خون اوپر ہوتا ہے اصلی خون نیچے آتا ہے۔

باب ماجاء فی التداوی با الحناء

(۱) کان شأن کے معنی میں ہے کہ ماشأن یکون لرسول اللہ ﷺ ''نکبہ'' ایسا زخم جو کانٹے یا پتھر سے پیدا ہو ''قرح'' وہ زخم جو تلوار سے لگا یا ہو یا پھوڑے وغیرہ سے ''الحناء'' مہندی اس میں برودۃ ہے زخم میں حرارت ہوتی ہے تو زخم کی گرمی کو اس کی برودۃ سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حساء کی فضیلت میں لوگوں نے بہت روایات سنائی ہیں لیکن ان میں صحیح کوئی بھی نہیں یہ ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت بھی ضعیف ہے بعض نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں عورت آئی انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا آپ ﷺ نے ہاتھ دیکھے فرمایا مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا اس کو تبدیل کرنا چاہئے جب کہ حضور ﷺ نے عورتوں کے ہاتھ کو کبھی مس نہیں کیا اس لئے یہ روایت موضوع ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ الرقیۃ

''رقیۃ'' جھاڑنا۔دم کرنا۔اس میں دوباب ہیں پہلے باب میں کراہت مذکور ہے کہ جس نے داغ سے علاج کیا یا جھاڑ سے یادم کیا تو وہ توکل سے بری ہے مطلب یہ ہے کہ جس آدمی نے رقیہ کیا یا داغ لگوائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ انہیں چیزوں پر اعتماد کرے وہ بری من التوکل ہے جب کہ کوئی صرف بطور علاج کے ایسا کرے اور صحت کی امید اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہو تو یہ توکل کے منافی نہیں۔

باب ماجاء فی الرخصۃ

اس باب سے جواز معلوم ہوتا ہے''الحمۃ'' عقرب کی سوئی جس سے ڈستا ہے ② عام مراد ہے تمام حشرات جو کاٹتے ہیں اور ان میں زہر موجود ہے''العین'' نظر بد''النملۃ'' وہ بیماری جس سے بدن سرخ ہو جائے اور دونوں پہلوؤں میں زخم پیدا ہو جاتے ہیں تو ان بیماریوں کے لئے بطور علاج کے جھاڑ دم کرا سکتا ہے ''لارقیۃ الامن عین او حمۃ'' یہاں حصر معلوم ہے اور لا لا یجوز کے معنی نہیں بلکہ مطلب ہے لا اولیٰ وانفع من عین وحمۃ یعنی جتنا جھاڑ پھونک ان دو چیزوں میں انفع ہے کسی اور چیز میں نہیں اہل علم نے لکھا ہے کہ پہلے باب میں کراہیۃ مذکور ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ رقیۃ دو قسم کا ہے ① جو عربی الفاظ میں نہ ہو اور اللہ کی اسماء وصفات پر مشتمل نہ ہوں یا اسکا صرف رقیہ پر اعتماد ہو اللہ تبارک وتعالیٰ پر نہ ہو یہ رقیہ ممنوع ہے یا غیر اللہ سے استمداد ہو یہ بھی ناجائز ہے۔② وہ رقیہ جو عربی الفاظ میں ہو اللہ کے اسماء وصفات پر مشتمل ہو غیر اللہ سے استمداد نہ ہو اس صورت میں جائز ہے جیسے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کو سنایا کہ ان سے ہم دم کرتے ہیں آپ ﷺ نے سنا فرمایا اس میں شرکیہ الفاظ نہیں اس لئے یہ جائز ہے۔

باب ماجاء فی الرقیۃ من العین

''ہامۃ'' کہتے اس زہریلے چیز کو جس کا زہر قاتل ہو''سام'' کہتے ہیں مکھی وغیرہ کو جو زہر قاتل نہ ہوں بعض نے یہ فرق کیا ہے کہ ہامۃ عام ہے کہ وہ زہر قاتل ہو یا نہ ہو سام خاص ہے کہ جو زہر قاتل نہ ہو''عین لامۃ'' لامہ کہتے اس بیماری کو جس سے فوراً آدمی گر جاتا ہے تو عین اس بیماری کا باعث بنتی ہے۔

باب ماجاء العین حق والغسل لھا

لاشی فی الھام ① عرب میں زعم تھا کہ میت کی روح دوبارہ دنیا میں آتی ہے چمگادڑ کی شکل میں پھرتا ہے ② مقتول کی روح بدلہ لینے تک اس پرندے کی شکل میں آتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ اعتقاد باطل ہے ③ عرب کا عقیدہ تھا کہ چمگادڑ جس گھر میں داخل ہو ان کے لئے موت کی خبر ہے یا قریبی رشتہ دار مرے گا اس کی تردید کی۔اذا استغسلتم الخ بات یہ ہوئی کہ ایک دفعہ سہل بن حنیف گر گئے آپ ﷺ نے پوچھا کس پر تمہیں شک ہے انہوں نے کہا عامر بن ربیعہ پر آپ ﷺ نے ان کو کہا آپ نے برکت کی دعا کیوں نہیں کی اور ماشاء اللہ کیوں نہیں کہا پھر فرمایا کہ اعضاء وضو اور ماتحت الازار دھو کر پانی اسپر ڈالا جائے اور برتن الٹا چھوڑا جائے یہ علاج کیا وہ صحیح ہو گئے باقی عین کا اثر یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کیا اس پر ہمارا ایمان ہے۔

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

جھاڑنے اور دم کرنا معوذات سے اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں اس کا ذکر ہے۔اس باب میں جو واقعہ ہے یہ ابوسعید

خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے انہوں نے ہی دم کیا تھا "فلدغ" اللدغ و اللسع بمعنی ڈسنا بعض نے کہا لدغ عقرب کے ساتھ خاص ہے اور لسع عام ہے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ رات کو پیش آیا تھا۔ دوسری سند کے ساتھ دوبارہ واقعہ نقل کیا ہے ان میں کچھ تعارض ہے ایک روایت میں ہے کہ ہم سریہ میں گئے تھے ایک جگہ آدمی باندھا ہوا تھا ان لوگوں نے کہا کہ علاج کیا لیکن کچھ نہ ہوا پھر انہوں نے جھاڑ دیا ایک واقعہ میں ہے کہ ایک آدمی تھا وہ بے ہوش تھا یہاں تفصیل ہے کہ اس کو عقرب نے ڈسا تھا اور جس میں ہے کہ آدمی باندھا ہوا تھا وہ مجنون تھا وہ حضرت علاقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے وہ الگ ہے اور یہ ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ الگ ہے ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت میں ۷ دفعہ فاتحہ کا ذکر ہے جب کہ دوسرے واقعہ میں ہے کہ ۳ دن تک صبح وشام دم کرتا تھا اور آخر میں تھوکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ جھاڑنا کلام اللہ سے جائز ہے ابن قیم نے لکھا ہے کہ انسان کی بات کا اثر ہوتا ہے تو کلام اللہ کا یقیناً اثر ہوگا اور سب سے زیادہ ہوگا اور شفاء انشاء اللہ حاصل ہوگی خصوصاً سورۃ فاتحہ جوام القرآن ہے اس میں قرآن کے سارے مضامین موجود ہیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات امم سابقہ کا ذکر، توحید، رسالت، معاد، مانگنے کا طریقہ سب مذکور ہیں اس کا نام بھی سورۃ شفاء ہے اس میں شفاء موجود ہے مگر لوگوں کے اعتقاد میں کمزوری ہوگئی ہے۔

اختلافی مسئلہ: اخذ الاجرۃ علی التعویذ بالاتفاق جائز ہے گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس پر قیاس جائز نہیں کیونکہ جھاڑنا فرض یا واجب نہیں بلکہ مباح ہے اور اس سے مقصود شفاء علاج ہے عبادت مقصود نہیں۔ اب تعلیم قرآن پر اجرت جائز ہے یا نہیں تو شوافع کے ہاں جائز ہے دلیل یہ روایت ہے کہ انہوں نے فاتحہ پڑھی اور اجرت لی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ وصاحبین کے ہاں اجرت علی تعلیم القران ناجائز ہے کیونکہ تعلیم القران عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں احناف کہتے ہیں تعلیم القران پر اجرت لینا اس حدیث سے ثابت نہیں کیونکہ اس میں بطور علاج ہے اس پر ہمارے ہاں بھی اجرت لینا جائز ہے امام صاحب نے وعید والی روایات کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیا تھا یہ کمال تقویٰ تھا اس وقت علم دین کا دور تھا لیکن ان کو علم نہ تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ بے دین ہوں گے اسلامی تعلیم کو عار سمجھتے ہوں گے جب مادیت کا غلبہ ہو گیا لوگوں میں کمزوری پیدا ہوگئی اس لئے ضرورت کی وجہ سے اجرت کا لینا اس کے جواز پر احناف نے بھی فتویٰ دیدیا ہے "الحی" قبیلہ اس کے درجات تھے بڑا قبیلہ الشعب کہلاتا ہے پھر القبیلہ ثم العمارۃ البطن ثم الفخذ ثم الفصیلۃ ۔حی کا لفظ بطور عموم کے سب پر ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الرقی والادویة

رقیہ اور ادویہ کے استعمال کے بارے میں کسی نے سوال کیا کہ دوائیاں، دم، یا بچاؤ کے اسباب سے کیا اللہ کی قضائے قدر کے فیصلے رد ہو سکتے ہیں؟ تو جواب دیا کہ یہ بھی تقدیر میں لکھا ہے کہ یہ تحفظ کے اسباب اختیار کریں تو تحفظ ہوگا۔

باب ماجاء فی الکماۃ والعجوۃ

"کماۃ" نبات لاورق لھا ولا ساق لھا زمین سے پیدا ہوتا ہے چھتری نما ہوتا ہے اسکی کئی انواع واقسام ہیں فرمایا اس میں شفاء ہے خصوصاً آنکھ کے لئے مفید ہے۔ "العجوۃ" مدینہ کی مشہور تمرات میں خاص تمر ہے اس کے درخت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے یہ بہت کم ملتے ہیں بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ "العجوۃ من الجنۃ" جنت میں ایسی کھجوریں ہوگی یعنی اس کی مشابہ ہوں گی ظاہری صورت میں اگر چہ اس کا ذائقہ اس سے بہت ہوگا فرمایا عجوۃ زہر سے شفاء ہے "الکماۃ من المن" من ترنجبین جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اتارا تھا بعض نے کہا یہ عسل تھا تو مطلب یہ ہے کہ جس طرح من اترتا تھا اس

میں انسانی کسب کا دخل نہ تھا اسی طرح یہ کماۃ بھی بغیر کسی بیج ڈالنے سے نکلتا ہے اس میں انسانی کسب کا دخل نہیں۔ ابن العربی نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل پر جومن اترتا تھا وہ کئی اقسام کا تھا ان میں سے ایک کماۃ بھی تھا اس لئے فرمایا کماۃ من میں سے ہے۔ ''وماء ھا شفاء للعین'' کمال بن عبداللہ محدث ہیں انہوں نے نابینا لونڈی کا علاج کیا تھا وہ ٹھیک ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہ معوذات یا علاج کے طریقوں میں تاثیر ہے لیکن یقین وتوکل کی ضرورت ہے۔ ''الکماء جبدی الارض ''کماۃ زمین کی چیچک ہے یعنی جس طرح جسم پر پھوڑے نکلیں تو یہ فضلات الجسد ہیں اسی کماۃ بھی فضلات الارض ہے دوسرا کماۃ کی اوپر چھتری دور سے لگتی ہے کہ اس میں سوراخ ہیں اسی طرح چیچک سے بھی داغ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ ان میں سوراخ ہیں۔

باب ماجاء فی اجر الکاھن

کاہن کہانت کا کام کرتا ہے غیب کا دعویٰ کرتا ہے بظاہر اس کے پاس لوگ علاج معالجے کے لئے جاتے ہیں اب ان کو مزدوری دینی جائز ہے یا نہیں ان کے پاس جانا جائز ہے یا نہیں ''حلوان الکاھن'' وہ اجرت جو کاہن کو دی جاتی ہے اس کی نبی ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے کاہن کے پاس جانا ممنوع ہے جوان کی تصدیق کرے وہ کافر ہے اس لئے اس کی اجرت بھی حرام ہے۔

باب ماجاء فی کراھیۃ التعلیق

اس میں تعلیق کی کراہیت ہے تعلیق کہتے ہیں گلے ہاتھ یا پاؤں میں بطور علاج کسی چیز کو لٹکا لینا۔ ''بہ حمرۃ'' حمرۃ بیماری ہے طاعون کی ایک قسم ہے اور مہلک ہے جسم سرخ ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ بطور علاج تعلیق کرلیں انہوں نے کہا الموت اقرب من ذالک پھر نبی ﷺ نے فرمایا جس نے بطور حفاظت کسی چیز کو گلے میں لٹکایا تو وہ اسی کے حوالے کردیا جاتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ختم ہوجاتی ہے۔

اختلاف: بعض روایات جس طرح موجودہ روایت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ختم ہوجاتی ہے اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام کو شرک شمار کیا ہے عبداللہ بن عمرو سے منقول ہے کہ اعوذ بکلمات اللہ التامات الخ بچوں کے گلے میں ڈالتے جو یاد نہ کرسکتے تھے اس روایات کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہوا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ہاں صحیح ہے، باقی صحابہ کے ہاں یہ معمول نہ تھا اور اس تعلیق کو پسند نہ کرتے تھے اسے توکل کے خلاف سمجھتے تھے۔ چونکہ صحابہ میں اس کا رواج نہ تھا اس لئے بہتر یہ ہے کہ تعلیقات نہ کرے البتہ معوذات سے دم کرنا چاہئے دوسرا قول بعض اہل علم کا ہے وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت حسن ہے اس لئے ضرورت کے تحت لکھ کر لٹکا سکتا ہے بعض اہل علم نے کہا کہ مطلقاً ممنوع ہے بعض نے ان روایات میں تطبیق دی ہے کہ غیر اللہ سے استمداد ہو شرکیہ الفاظ ہوں، انکو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شرک کہا ہے۔ لیکن جو جائز کلمات ہیں ان کو ضرورت کے مطابق استعمال کرسکتا ہے جس طرح عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے جواز ملتا ہے۔

باب ماجاء فی تبرید الحمیٰ بالماء

بخار کی تپش کا علاج پانی کے ذریعے سے کیا جائے اس میں کئی روایات نقل کی ہیں فرمایا بخار جہنم کی تپش اور اس کے آگ کی گرمی ہے یعنی جہنم کے جوش کا حصہ ہے اس لئے اس کو پانی سے ٹھنڈا کرلیں بعض روایات میں ہے کہ بخار اور اسکی تپش یہ مؤمن کا حصہ ہے جہنم میں سے۔ اس کو دیکھا جائے تو مذکورہ مافی الباب کی روایت اپنے ظاہر پر ہوگی یا مطلب یہ ہے کہ گرمی کا اصل مرکز جہنم

ہے اور عذاب کی صورت میں گرمی جہاں ظاہر ہو یہ جہنم کا حصہ ہے گرمی ہونے کے اعتبار سے ورنہ یہ مراد نہیں کہ بالکل اسی کا جزء ہے بلکہ گرمی کی وجہ سے جہنم کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ ابراد الظہر میں حدیث نقل کی ہے کہ جہنم دو سانس لیتا ہے جب باہر کی طرف لیتا ہے تو گرمی کے آثار باہر آجاتے ہیں اور جب اندر کی طرف لیتا ہے تو گرمی ساری اندر لے جاتا ہے اس لئے گرمی کی نسبت جہنم کی طرف کی جاتی ہے۔ ''فابردوھا'' بکسر الراء والضمہ دوسری روایت میں بخار سے بچنے کے لئے دعا بتلائی گئی ہے کہ بخار ہو یا درد ہو تو یہ دم کریں۔ **بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرق نعار** ''نعار'' وہ آواز جو خون کے جوش سے پیدا ہو اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ ''ومن شر حر النار'' گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ بخار کے تمام انواع کے لئے یہ علاج ہے البتہ کہیں نقصان پیدا ہو جائے پانی سے تو اور کسی بیماری کا اثر ہوگا ورنہ بخار کا علاج حدیث میں پانی ہی ہے۔ انور شاہ'' فرماتے ہیں کہ یہ علاج خاص بخار کا ہے ہر بخار کا علاج نہیں، نبی ﷺ کا جب ارشاد ہے تو اس میں شک کی گنجائش نہیں بعض اطباء ان جیسی احادیث سمجھ نہیں سکتے تو ان کا انکار کر دیتے ہیں اور بعض مسلمان نبی ﷺ کا ارشاد سمجھ نہیں سکتے اور بخار کا علاج پانی سے ہی ہے اور آج بھی ڈاکٹر تیز بخار ہو تو تمام اعضاء پر برف وغیرہ رکھ کر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ بعض روایات میں غسل کا بھی حکم ہے کہ بخار ہو تو نہر جاری میں غسل کریں ۷ دن کے بعد بخار بالکل نہ رہے گا اس لئے جواب یہ دیا جائے گا کہ بخار کی کئی انواع ہیں بعض وہ ہیں جو گرمی سے ہو اس کا علاج یہ حدیث میں ہے ورنہ ہر بخار کا علاج یہ نہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ خاص علاقے کے لوگوں کے لئے یہ علاج ہے جہاں بہت گرمی ہوتی ہے، یا خاص افراد کے لئے یہ حکم تھا اور حضور ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا جیسے کہ ایک علاقے کے لوگوں کو پیشاب کرتے وقت شرقوا وغربوا کا حکم دیا اب ہم مغرب کی طرف منہ کریں تو عین قبلہ کی طرف منہ ہوگا اس لئے یہ خاص علاقے کے لوگوں کے لئے حکم ہے دوسرا یہ عام اطباء کا قانون ہے کہ دوائی دیتا ہے دوسرے دن وہ دوائی تبدیل کر دیتا ہے یہ اس لئے کہ پہلے دن خاص بیماری تھی دوسرے دن دوسری بیماری ساتھ لگ گئی اس لئے پہلی دوائی نقصان دہ ہو سکتی ہے اس لئے دوا بدل دیتے ہیں جو دونوں بیماریوں کے لئے مفید ہو اسی طرح یہاں ہے کہ بخار کا علاج پانی ہے مگر ساتھ دوسری چیز بھی مل جائے اور آپ پانی ڈالیں تو زیادہ نقصان ہوگا تو طبیعت اور حالات کے اعتبار سے علاج میں فرق آتا رہتا ہے۔

باب ماجاء فی الغیلة

''غیلۃ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ عورت دودھ پلاتی ہو اس مدت میں جماع غیلہ ہے بعض کہتے ہیں حمل کی حالت میں جماع غیلہ ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ بچے کو نقصان پہنچاتے ہیں یہ لوگوں کا عقیدہ تھا لیکن نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایسی بات نہیں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا عرب کے لوگ کہتے تھے کہ اس کے آثار یہ ہوتے ہیں کہ بچہ میدان جنگ میں گھوڑے سے گر جاتا تھا اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر کسی کی قسمت میں یہ لکھا ہو تو یہ ایک فطری اثر ہوتا ہے مگر لوگ کسی اور چیز کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

باب ماجاء فی دواء ذات الجنب

''ذات الجنب'' دو قسم کا ہے ① حقیقی، کہ آدمی کے جسم کی پسلیوں کے نیچے زخم اور ورم پیدا ہو جہاں زخم ہو وہاں درد ہوتا ہے کبھی ایک پہلو میں کبھی دونوں میں ② ذات الجنب غیر حقیقی، پسلیوں کے نیچے پردے یا آنتڑیوں میں ارباح (بادی درد) پیدا ہو جائے۔ یہاں پہلی قسم مراد ہے اس کا علاج بتایا۔ نبی ﷺ تعریف فرماتے تھے اس علاج کی کہ زیتون کا تیل اور ورس (یہ نباتات میں سے ہے) کو رگڑ کر زیتون میں

ملاتے ہیں پھر اس جگہ لگایا جاتا ہے یا دونوں کو ملا کر پلایا جائے تو یہ دونوں علاج ہیں ذات الجنب کے لئے دوسری روایت میں دوسرا علاج بتایا ہے کہ عود ھندی اور زیتون کے تیل کو ملا کر اس بیماری کا علاج کریں۔

باب

اس میں روایت جو نقل کی اس میں ہے کہ نبی ﷺ آئے مجھے شدید درد تھا کہ مجھے اس سے ہلاکت کا خطرہ تھا حضور ﷺ نے فرمایا دائیں ہاتھ سے جہاں پر درد ہے اس جگہ سات دفعہ مس کر کے یہ دعا پڑھیں اعوذ بعزة الله وقدرته وسلطانه من شرما اجد فرماتے ہیں کہ اس سے میں بالکل صحیح ہو گیا ظاہر ہے حضور ﷺ کا یہ علاج بذریعہ وحی تھا اس لئے اس کا تعلق یقین سے ہے محض تجربہ نہیں۔

باب ماجاء فی السناء

سناء کا باب باندھا ہے آگے سناء اور شبرم دونوں کا ذکر ہے نبی ﷺ نے عورت سے پوچھا کہ کونسی چیز کے استعمال سے اسہال کو پیدا کرتی ہو؟ انہوں نے کہا شبرم استعمال کرتی ہوں۔ شبرم درخت کا چھلکا ہوتا ہے اس کو رگڑ کر استعمال کرتے ہیں بعض نے کہا یہ چنے کی مقدار دانے ہیں ان کو پکا کر ان کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں یہ سیاہ دانہ ہے اور سیاہ دانہ مسہل ہے یہ بہت سخت گرم ہوتا ہے پیٹ کو چالو کرتا ہے "حارہ" گرم "جار" چالو کرتا ہے پیٹ کو دوسرا پہلے لفظ کی تاکید ہے شبرم میں نقصان کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے ہلاکت کا باعث بھی بن جاتا ہے اس لئے نبی ﷺ نے اس علاج کو پسند نہیں فرمایا اور پھر علاج بتایا کہ سناء کے ذریعے پیٹ کی صفائی کرو یعنی اسہال کے لئے سناء کو استعمال کرو۔

باب ماجاء فی العسل

شہد کی صفات قرآن میں بھی ہیں کہ فیہ شفاء للناس ایک آدمی نے نبی ﷺ سے فرمایا بھائی کے پیٹ میں درد ہے آپ ﷺ نے فرمایا عسل پلاؤ پلایا تو مزید چالو ہو گیا دو دفعہ ایسا ہوا تو تیسری مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بذریعہ وحی معلوم ہوا ہے کہ اس کا علاج عسل ہی ہے اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بات سچ ہے تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے یعنی اس میں اور کوئی فساد ہے پھر اس نے پلایا تو وہ صحیح ہو گیا۔ عسل کے بارے میں لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ گرم ہے اور اسہال بھی گرم چیز سے آتا ہے مگر ان کی یہ بات غلط ہے کیونکہ حالات کبھی تبدیل ہوتے ہیں کبھی کسی بیماری پر دوائی دی جاتی ہے تاکہ اندر کی صفائی ہو جائے فاسد مادہ نکل جائے یہاں آدمی کا فاسد مادہ نکلا تو وہ صحیح ہو گیا اگر اس کو پانی میں ملا دیا جائے تو برودۃ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

باب

نبی ﷺ نے فرمایا کوئی مریض جس پر موت کے آثار نہ ہوں اس کی کوئی عیادت کرے اور سات دفعہ یہ کلمات کہے اسأل الله العظیم رب العلمین ان یشفیک جب سات دفعہ یہ کہے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی دعا قبول کر کے شفاء دے دیتے ہیں یہ بھی روحانی علاج ہے۔

باب

اگر کسی کو بخار ہو (جو کہ آگ کا ٹکڑا ہے اس کو پانی سے بجھائے) یہ آدمی نہر جاری جہاں سے آتا ہے اسکی طرف رخ کر کے اس میں

اتر جائے پانی ڈالے اور یہ دعا کہے بسم اللہ اللھم اشف عبدک وصدق رسولک یہ کام طلوع سے پہلے کرے تین دفعہ کرے اور ۳ دن کرے اس میں نہ ہوتو ۵ دن یا ۷ یا ۹ دن تک کرتا رہے۔

باب

زخم کا علاج بتایا کہ نبی ﷺ کے زخم کے لئے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پانی لایا فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دھویا پھر چٹائی کو جلا کر اس پر راکھ ڈالی تو خون ختم ہوگیا۔

باب

جب مریض کی عیادت کے لئے جاؤ تو اس کو زندگی میں طمع دو کہ تم ٹھیک ہو رہے ہو اس کے لئے صحت کی دعا کریں یہ نفس خاطر ہے ورنہ قضاء قدر میں فرق نہیں آتا۔

ابواب الفرائض

عن رسول اللہ ﷺ

فرائض میں میراث کا ذکر ہوتا ہے جو حقوق العباد ہیں پہلے ابواب الطب کا ذکر تھا اسکی آخری روایت میں تھا کہ کوئی مرض الموت میں بھی مبتلا ہو تو اس کو تسلی دوا گرچہ اس سے اس کی زندگی میں اضافہ نہ ہوگا مگر اس کو تسلی ہوگی اب اس کا علاج نہ ہوا اور وہ مر گیا تو اس کی مال سے اس کا تصوف ختم ہوجاتا ہے اور لوگوں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہوجاتے ہیں اس لئے ان میں مال تقسیم ہوجاتا ہے۔ ''فرض'' بمعنی قطع ان حقوق کو کہتے ہیں جو قرآن میں صراحۃً موجود ہیں میراث کی آیات میں ہے لیکن پھر ذوی الفروض کے علاوہ عصبات ذوی الارحام وغیرہ کو جو حصص ملتے ہیں ان پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی من ترک مالا

کسی نے مال چھوڑا اور مر گیا تو وہ اس کے ورثاء کو ملے گا اور کسی نے ایسی چیز چھوڑی جس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے تو اس کی ذمہ داری میری طرف ہے یعنی مثلاً بیوی یا بچوں کے لئے مال نہیں چھوڑا تو ان پر خرچ کرنا میرا ذمہ ہے اس باب سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ مال رہ جائے تو وہ ورثاء کا ہوگا۔

باب ماجاء فی تعلیم الفرائض

علم فرائض کی تعلیم کی ترغیب دی جاتی ہے اور علم فرائض کی بڑی اہمیت ہے اس لئے اس کو سیکھنا چاہئے تعلیم الفرائض ① فرائض سے علم میراث مراد ہے ② وہ تمام فرائض مراد ہیں جن کا انسان مکلف ہے اور ''والقرآن'' یہ اس کے لئے بیان ہے کہ وہ فرائض قرآن ہی میں ہیں اس صورت میں پورا دین مراد ہوگا لیکن اگر فرائض سے علم میراث مراد ہو تو میراث کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر کیا اسی لئے دوسری جگہ فرمایا کہ دو آدمی کسی زمانہ میں میراث میں جھگڑا کریں گے تو کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ہوگا دوسری روایت میں اس کو نصف العلم کہا تو یہاں بھی تقسیم کی کہ تعلموا الفرائض والقرآن کہ آپ کا علم علم میراث ہے اور قرآن کا علم آدھا علم ہے اس لئے یہ پہلا والا معنی مراد

لینا بہتر ہے۔ قرآن نے ۶ حصے بتائے ہیں جو فرائض ہیں۔ نصف، سدس، ربع، ثمن، ثلث، ثلثان اور یہ حصے جن اصحاب فرائض کے ہیں وہ اصحاب بارہ ہیں۔ مذکورہ حدیث کی سند میں اضطراب ہے بعض اس کو مسانید ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اور بعض مسانید ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں شمار کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی میراث البنات

قرآن میں پہلے للذکر مثل حظ الانثیین ذکر ہے پھر بنات کی میراث کا ذکر ہے اصل میں میراث ان کو دی جاتی ہے جو کمزور ہوں اپنا حق نہ مانگ سکیں جن کو زمانہ جاہلیت میں دبایا گیا ہو سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ احد میں شہید ہوئے ان کی بیوی دو بیٹیاں لے کر آئی کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعد شہید ہو گئے ان کی دو بیٹیاں ہیں ان کا مال چچا نے لے لیا ہے اور بغیر مال کے نکاح نہیں ہو سکتا اس لئے سارا بوجھ مجھ پر ہے میں پورا نہیں کر سکتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صبر کرو اللہ تبارک وتعالیٰ حکم نازل فرمائیں گے جب حکم اترا تو ان کے چچا کو بتایا کہ ثلثین لڑکیوں کو دو ثمن مال ماں کو دو باقی تمہارا ہو گا۔

باب ماجاء فی میراث بنت الابن

بیٹی اور پوتی ہو ان کو کس طرح میراث ملے گی کہ کل تین وارث ہیں بیٹی، بہن، اور پوتی تو یہ سارے عصبہ ہیں اصحاب الفرائض میں سے کوئی نہیں تو ابو موسیٰ اور سلیمان بن ربیعہ نے کہا بیٹی کو نصف بہن کو باقی ملے گا پھر ان کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجا انہوں نے کہا ان دو کا فیصلہ کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا پھر فیصلہ کیا کہ بیٹی کو آدھا ملے گا سدس پوتی کا ہے تکملۃ الثلثین اور بہن کو باقی ملے گا۔

باب ماجاء فی میراث الاخوۃ من الاب والام

اعیانی بھائی مقدم ہیں علاتی پر اسی مسئلے کا ذکر ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تلاوت قرآن میں وصیت مقدم ہے پھر قرضہ ہے جب کہ ادا کرنے میں پہلے دین دیا جاتا ہے پھر وصیت پر عمل ہوتا ہے لیکن تلاوت میں مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بغیر کسی عوض کی ہوتی ہے اس کا مطالبہ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا اس لئے اس کو مقدم کیا مسئلہ یہ ہے کہ اعیانی بھائی موجود ہوں تو علاتی کو نہ ملے گا۔

باب میراث البنین مع البنات

ابواب المیراث میں ذوی الفروض کو مقدم کیا ہے یہاں بھی اصحاب فروض کا ذکر ہے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں بیمار تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے آئے میں نے کہا اولاد میں مال کیسے تقسیم کروں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا تو یہ آیت اتری ﴿یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین﴾ پہلے گزرا ہے کہ سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو بیٹیوں کی شان میں یہ آیات اتری اور یہاں ہے کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال کے جواب میں آیت اتری ہے۔ اسی طرح یہاں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اولاد کے درمیان میراث کی تقسیم کا ذکر کیا جب کہ آگے والے باب میں بہنوں کا ذکر ہے اور صحیحین میں بھی اخوات کا ذکر ہے صحیح یہی ہے کیونکہ اولاد تھی ہی نہیں یہ کلالۃ تھے یوصیکم اللہ میں بھی کلالۃ کے حکم کی طرف اشارہ ہے دوسری جگہ ﴿قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ﴾ اس پر اشکال ہوا کہ یہ الگ کیوں ذکر کیا۔ جواب یوصیکم اللہ میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں علاتی وعینی بہن بھائی کا ذکر ہے باقی پہلا اشکال کہ یہ آیت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد کے بارے میں اتری یا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال کے جواب میں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف واقعات کے بارے میں کبھی ایک آیت اترتی ہے۔

باب ماجاء فی میراث الاخوات

جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے آئے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے ہوشی کی حالت میں تھے۔غشیان اوراغماء ہم معنی ہیں بعض نے کہاغشیان میں کم بے ہوشی ہوتی ہے اغماء میں زیادہ ہوتی ہے دوسرا غشیان کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے اغماء کے کئی اسباب ہیں یہاں تین اشیاء ہیں ① اغماءاس میں عقل مغلوب ہوجاتا ہے ② جنون میں مسلوب العقل ہوتا ہے۔③ نینداس میں ستور العقل ہوجاتا ہے۔"فصب علیہ من وضوئہ" اس کے دومطلب ہیں ① لوٹے میں بچاہواپانی ڈالا ② صحیح تر یہ ہے کہ وضوء کا مستعمل پانی کسی چیز میں جمع کیا گیااس کوان پرڈالا گیا۔یا تو مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ ان کے بیٹے نہیں تھے۔کیونکہ بہت سے واقعات ہوئے توسب نے کہا کہ یہ ہمارے بارے میں اتری ہے جیسا کہ سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا اصل کلالۃ کی میراث مطلب ہے۔

الکلالۃ وہ آدمی جس کے اصول وفروع نہ ہو باقی بہن بھائی ہوں کلالۃ بمعنی طرفین "کل علے الرجل" ای احیط علیہ الطرفین اوراس کے دونوں طرف کااحاطہ(اولاداورزوالدین) یہ ختم ہوجاتا ہے یاجب اصول وفروع نہیں تو باقی ورثاء نے اس کااحاطہ کرلیا۔

باب ماجاء فی میراث العصبۃ

ذوی الفروض کے بعدعصبہ کاذکر ہے یعنی وہ حصہ جوفرض کے علاوہ مل جاتا ہے اس میں الاقرب فالاقرب کے اعتبار سے ہے ان کوحجب کہا جاتا پھرایک حجب نقصان ہے جیسے بھائیوں کی وجہ سے والدہ کاحصہ کم ہوجاتا ہے دوسرا حجب حرمان ہے کہ اقرب ہوتو ابعدکو بالکل نہ ملے گا۔

باب ماجاء فی میراث الجد

ایک آدمی آیانبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ پوتے کی میراث میں مجھے کیا ملے گانبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاسدس ملتا ہے پھردوبارہ بلایا فرمایا آپ کے لئے دوبارہ سدس ہے پھردوبارہ بلاکرفرمایا کہ دوسرا سدس حق سے زیادہ دیا ہے تو پہلاسدس اس کاحصہ مفروضہ تھا دوسرا عصبہ ہونے کاملانبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ بلاکردیا تاکہ اس کوکوئی فرض نہ سمجھے اس لئے الگ بلاکرکہا یہ بطورتعصب دیا۔

باب ماجاء فی میراث الجدۃ

اس میں دوروایات ہیں واقعہ ایک ہی ہے عورت آئی کہا پوتا یانواسامرگیا ہے تومیراث کیا ملے گی۔تو مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سدس دیا تھااورمحمد بن مسلمۃ نے بھی تصدیق کی اب پہلے دادی ہوتو دوبارہ نانی آئی یا پہلی نانی تھی دوبارہ دادی آئی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیاعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم دونوں اکٹھی آتی یا تمہارا علم ہوتا توتم پرتقسیم ہوتالیکن وہ تم سے پہلے آگئی اس لئے وہ لے گئی اب کچھ باقی نہیں رہا۔کیونکہ جدۃ ایک ہوگی ان کاحصہ سدس ہوگا نانی ہو یادادی ہومیت کی ماں کی وجہ سے ان کو کچھ نہ ملے گا۔میت کاباپ ہوتو نانی کوملتا ہے دادی کونہیں ملے گا۔

باب ماجاء فی میراث الجدۃ مع ابنھا

جدات کوکتنا ملے گا یعنی جب پوتا مرجائے اورمیت کاباپ بھی ہے اورجدۃ بھی توجدۃ کومیراث ملے گی یا نہیں؟ ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسی جدہ جس کابیٹا بھی ہواس کاپوتامرجائے اس کوحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سدس دیا تھا۔مگر یہ ضعیف روایت ہے۔ اس مسئلے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی اختلاف تھا جمہورصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اورفقہاء کے نزدیک باپ کے ہوتے ہوئے میت کی دادی

کو میراث نہیں ملتی۔ کیونکہ گزر چکا ہے کہ باپ ہو دادی کو نہیں ملے گا اور ماں ہو تو نانی اور دادی دونوں کو نہ ملے گا باقی اس حدیث میں میراث کا ذکر نہیں بلکہ یہ بطور طعم اور نفل کے دیا۔

باب ماجاء فی میراث الخال

کسی کا نہ ذوی الفروض اور نہ عصبہ میں سے کوئی ہو تو پھر ذوی الارحام کو ملے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے خط ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا اس میں تھا اللہ تبارک وتعالیٰ اور رسول اس کا مولیٰ ہیں جس کا مولیٰ نہ ہو اور اگر بھانجوں کا وارث کوئی نہ ہو تو ماموں کو میراث ملتی ہے۔ دوسری روایت میں تفصیل ہے میں مولیٰ ہوں جس کا مولیٰ نہیں ''انا مولیٰ من لا مولیٰ لہ'' اس کی میراث مجھے ملے گی اور اس کی تمام ذمہ داریاں قرض وغیرہ میں ادا کروں گا، اس کے غلام قید میں ہوں میں چھوڑاؤں گا۔

اشکال: انبیاء نہ وارث بنتے ہیں نہ مورث۔ جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا وارث نہ ہو اس کا میں وارث ہوں یعنی اس کا مال بیت المال میں جمع کروں گا اور خود غرباء میں خرچ کروں گا اور اس کے ذمہ قرض ہو تو میں اپنی طرف سے ادا کروں گا حدیث کا دوسرا حصہ ہے ''الخال وارث من لا وارث لہ'' ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو قول نقل کئے ہیں اکثر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں دوسرے ورثاء نہ ہوں ماموں وارث ہوگا مراد ذوی الارحام کہ ذوی الفروض اور عصبہ نہ ہوں تو ذوی الارحام وارث ہوں گے یہ جمہور فقہاء کا مسلک ہے دلیل مذکورہ حدیث ہے فی الباب کی۔ ② ﴿للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن﴾ یہاں نساء ور جال عام ہے عصبہ ہوں یا ذوی الفروض یا ذوی الارحام ③ ﴿واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض﴾ دوسرا قول زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ عصبہ اور ذوی الفروض نہ ہو تو ذوی الارحام کو نہ ملے گا بلکہ بیت المال میں رکھا جائے گا اور ضرورت کے مطابق خرچ کیا جائے گا دلیل حدیث ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے میں نے سوال کیا کہ اجازت دیں کہ خال، خالہ اور عمہ کو وارث بنائیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی فرمائی کہ ان کو وارث نہ بنائیں۔ جواب جمہور نے دیا ہے کہ یہ مرفوع نہیں مرسل ہے اور دوسری مرفوع احادیث کے مقابلے میں مرسل قابل استدلال نہیں ابن العربی نے جواب دیا ہے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ خال سے مراد وہ خال جو عصبہ بھی ہو مطلقاً خال مراد نہیں۔ ② خال سے بادشاہ مراد ہے کہ مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مراد ہے کہ یہ خال عصبہ ہو یا خال سے سلطان مراد ہے ان کو ملے گا مگر یہ تاویل بعید ہے ابن العربی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ نے جو دلائل دیئے وہ عام ہیں روایات سے مخصوص چیزوں پر استدلال صحیح نہیں۔ جواب قرآن میں اکثر عمومی روایات سے خصوصی واقعات پر استدلال موجود ہے۔

باب ماجاء فی الذی یموت ولیس له وارث

کوئی آدمی ایسا ہو جس کا وارث نہ ہو اس کا مال ہو تو اس کو کیا کریں گے نبی کریم ﷺ کا غلام تھا جو گر کر مر گیا کھجور کی ٹہنی سے تو نبی ﷺ نے فرمایا اس کے ورثاء تلاش کرو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس کا وارث نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی میراث فلاں قریہ کے بعض لوگوں کو دے دیں ایک جگہ ہے فلاں بستی میں فلاں آدمی کو دے دیں یہ بطور تصدق تھا کیونکہ اس کا وارث نہیں تھا اس لئے اس کا مال بیت المال میں جمع ہوتا تھا اور بیت المال مصلحت دیکھ کر خرچ کرتا ہے اس لئے حضور ﷺ نے خرچ کیا مصلحت کو دیکھ کر۔

باب فی میراث المولیٰ الاسفل

کسی کو کسی نے آزاد کیا ہو یعنی معتق کو دے دی اصل حق بیت المال کا ہے بیت المال جس کو دے دے مصلحت سمجھ کر یہاں بھی اس غلام کی ضرورت تھی اس وجہ سے اس کو دیا ورنہ اس لئے نہ دیا تھا کہ میراث اس کا حق ہے۔

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر

اب تک ان کا ذکر تھا میراث جن کا حق تھا اب یہاں سے موانع ارث کا ذکر ہے کہ کبھی رشتہ داری کے باوجود میراث نہیں ملتا ہے سوانع ارث احناف کے ہاں چار ہیں ① رق ② قتل ③ اختلاف دین ④ اختلاف دار، یعنی ایک غلام ہے دوسرا آزاد اگرچہ بھائی ہوں ایک دوسرے کی میراث نہ لیں گے اسی طرح وارث نے قتل کردیا مورث کو تو وارث قاتل کو میراث نہ ملے گی اسی طرح ایک دارالاسلام میں ہے دوسرا دارالکفر میں ہے ان کو بھی ایک دوسرے کی میراث نہ ملے گی اسی طرح ایک مسلمان ہے دوسرا کافر یہ بھی ایک دوسرے کے وارث نہ بنیں گے یہی آخری اس باب میں مذکور ہے اس مسئلے پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان سے مسلمان کافر سے میراث نہیں لے سکتا دوسرا مرتد بھی بالاجماع مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا تیسری صورت اختلافی ہے کہ مسلمان مرتد کی میراث لے سکتا ہے یا نہیں شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ و مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں لے سکتا امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ اور اسحٰق فرماتے ہیں لے سکتا ہے احناف کہتے ہیں یہ میراث اس مال میں لے گا جو حالت اسلام میں کمایا تھا لیکن زمانہ ارتداد والا مال اس کو نہ ملے گی۔ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل مافی الباب کی روایت ہے کہ ”لایتوارث اهل الملتین“ احناف رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ضعیف کہا ہے اہل ملتین سے کیا مراد ہے تو فرماتے ہیں اس سے اسلام اور کفر مراد ہے اور کفر ملۃ واحدۃ ہیں اسی لئے یہود عیسائیوں کا میراث لے سکتے ہیں بعض نے کہا کہ اختلاف ملت عام ہے اس لئے یہودی عیسائی سے بھی میراث نہیں لے سکتے۔

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

قاتل نے جس کو قتل کیا ہے اس کی میراث نہیں لے سکتا قاتل مطلقاً ہے قتل عمد ہو یا قتل خطاء بعض نے قتل عمد کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن جمہور جواب دیتے ہیں حدیث میں القاتل ہے جو مطلق ہے دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاء قتل سے بھی میراث نہ ملے گی جس طرح ماں کو بیٹے نے خطاء قتل کیا اس کو میراث نہ دی تھی اسی طرح دو عورتیں لڑیں ایک کو شوہر نے مارا اس کو میراث سے محروم کیا گیا اس لئے خطاء قتل سے بھی میراث سے محروم ہوگا۔

باب ماجاء فی میراث المرأة من دية زوجها

جس طرح باقی میراث میں زوج کے مال میں سے بیوی کو حصہ ملتا ہے اسی طرح اس کا زوج قتل کیا گیا خطاء تو اس کی دیت سے بیوی کو حصہ ملے گا الدیۃ علی العاقلۃ دیت قاتل کے خاندان پر ہے پھر وہ مقتول کی دیت ورثاء کو ملے گی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فیصلہ کیا کہ اس مال سے زوجہ کو نہ ملے گا لیکن ضحاک بن سفیان نے اس پر نکیر کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھا کہ اشیم جنابی کی بیوی کو اس کے شوہر کی دیت میں سے حصہ ملے گا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلے اس حدیث کا علم نہ تھا جب علم ہوا تو اس کو قانون بنادیا کہ بیوی کو حصہ ملے گا اگر اولاد نہ ہو تو ربع اولاد ہو تو ثمن ملے گا۔

باب ماجاء ان المیراث للورثة والعقل للعصبة

صحیح نسخہ علی العصبۃ ہے بنولحیان کی ایک عورت حاملہ تھی اس کو دوسری عورت نے مارا اس کا بچہ گر گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جانیہ عورت پر غرہ لازم کیا کہ غلام یا لونڈی آزاد کرے پھر زخمی عورت بھی مرگئی یہ قتل خطاء ہے تو جانیہ پر دیت بھی لازم ہوگئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیت جانیہ عورت کی طرف سے اس کے رشتہ دار خاندان والے دیں گے اور وہ دیت مقتول عورت کے ورثاء میں تقسیم ہوگی حدیث

کے الفاظ میں اشکال ہے فرمایا المرأة التی قضیٰ علیها بغرة توفیت کہ جانیہ عورت مرگئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ جانیہ کی میراث شوہر کو ملے گی اور اس پر جو دیت تھی یہ برادری والے دیں گے تو یہ ضمائر جانیہ کی طرف راجع ہو گئے مگر خرابی یہ آئی کہ مجنیہ علیها عورت کا حق بیان کرنا مقصود ہے وہ یہاں سے معلوم نہیں ہوتا اس لئے علی بمعنی لام کے ہے کہ ان المرأة التی قضیٰ لها بغرة توفیت کہ جس کے حق میں فیصلہ ہوا کہ اس کو غرہ دو پھر جس کو غرہ ملا تھا (مجنیة علیها) یہ مرگئی اب یہ دوسرا نقصان ہوا کہ مرگئی تو نبی ﷺ نے فیصلہ کیا کہ اس میں اس مقتولہ کی میراث ورثاء (زوج اور اولاد) کے لئے ہے وان عقلها یہ ضمیر مقتولہ کی طرف نہیں بلکہ قاتلہ کی طرف ہے اس لئے اس میں انتشار الضمائر ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل

ایک آدمی کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تو ان دو کے درمیان جو عقد موالات ہوا ہے اس وجہ سے اس کی میراث دوسرے کو ملے گی یا نہیں؟ تو حدیث میں ہے کہ اس کو میراث ملے گی۔ هو اولیٰ الناس بمحیاه ومماته۔ یہاں میراث کا ذکر نہیں ① اس لئے جمہور کے ہاں اس کی میراث اس کو نہ ملے گی ② امام صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں معاہدہ کریں اسلام کے بعد کہ ہماری میراث ایک دوسرے کو ملے گی اس صورت میں میراث ملے گی لیکن بغیر عقد کے صرف اسلام کی وجہ سے میراث نہ ملے گی۔ ③ بعض کے ہاں فقط اسلام لانے کی وجہ سے اسلام لانے والے کی میراث اس کو ملے گی جس کے ہاتھ پر اسلام لایا دلیل حدیث کا مذکورہ ٹکڑا ہے۔ جواب یہاں میراث کا ذکر نہیں بلکہ مدد کا ذکر ہے کہ یہ زیادہ لائق ہے اس اعتبار سے کہ اس کی مدد کرے اور مرنے کے بعد تجہیز و تکفین وہی کرے جس کے ہاتھ پر اس نے اسلام لایا کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی کے ہاتھ سے اس کو ہدایت دی ہے دوسرا یہ روایت ضعیف ہے۔ دوسری روایت ہے ان الولاء لمن اعتق یہ جمہور کی دلیل ہے کہ ولائے عتاقہ کی وجہ سے میراث مل سکتی ہے اور کسی موالات سے نہیں مل سکتی یہ روایت صحیحین کی ہے اس کو ترجیح ہوگی۔ دوسری روایت ہے کہ کسی نے زنا کیا تو بچہ ولد الزنا ہوگا اس کو والد کی میراث نہ ملے گی البتہ ماں کی میراث مل سکتی ہے۔

باب من یرث الولاء

ولاء کس کو ملے گا مراد ولاء عتاقہ ہے کہ مال ملتا ہے وہی ولاء کا بھی مالک ہوگا دوسری روایت میں یہ مسئلہ بھی ہے اور ساتھ وارث کا مسئلہ بھی ہے کہ عورت کو ۳ میراث مل جاتے ہیں ایک اس کے معتق (آزاد کردہ غلام) کی میراث ہے دوسرا وہ لقطہ جس کو اس نے اٹھایا پرورش کی اس کا وارث کوئی نہ آیا تیسرا وہ بچہ جس کا شوہر نے انکار کیا پھر لعان ہوا تو بچہ ماں کو مل جائے گا اس لئے یہ مرگیا تو عورت کو اس کا مال ملے گا۔

ابواب الوصایا

عن رسول اللہ ﷺ

وصیۃ کی جمع ہے اس کا اطلاق فعل موصی پر بھی ہوتا ہے ایصاء کے معنی میں بھی آتا ہے وصیت وہ عمل ہے جس کی اضافت مابعد الموت کے ہوتی ہے بعض نے کہا اوصیۃ بمعنی اوصلۃ کے ہے کیونکہ یہ فعل بھی اس کے ساتھ موت کے بعد ملتا ہے ایک عام وصایا ہیں جو ایک دوسرے کو خیر خواہی کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ مراد نہیں اگر چہ حدیث کے عموم میں وہ بھی آجاتے ہیں۔

باب ماجاء فی الوصیة بالثلث

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے زہری کے شاگردوں میں سفیان بن عیینہ نقل کرتے ہیں مرضت عام الفتح۔ زہری کے باقی شاگرد حجۃ الوداع کے ساتھ جوڑتے ہیں اس لئے محدثین کہتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ کو وہم ہوا ہے کیونکہ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے بعض نے تطبیق دی ہے کہ یہ واقعہ دو دفعہ پیش ہوا تھا عام الفتح میں بیمار ہوئے تو نبی ﷺ کو بتایا تھا کہ میرا اصحاب الفروض میں کوئی وراث نہیں جب کہ حجۃ الوداع میں جب بیمار ہوئے تو کہا میری صرف ایک بیٹی ہے اور کوئی وارث نہیں ''فالشطر'' منصوب ہو تو اوصی الشطر کے تحت داخل ہوگا اگر الشطر ہو تو بمالی کے تحت ہوگا ای اوصی بالشطر۔ اگر مرفوع ہو تو ترکیب ہوگی الشطر کاف قال الثلث اس میں مذکورہ تین وجہیں جائز ہیں۔ والثلث کثیر یہاں صرف رفع ہی ہوگا ''یتکففون'' ای یمدون اکفهم امام الناس۔ کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ لعلک ان تخلف حتی ینتفع بک اقوام یہاں لعلک تحقیق کے لئے ہے کہ آپ یقیناً میرے بعد زندہ رہیں گے یہ پیشن گوئی تھی جو پوری ہوئی فرمایا تمہاری وجہ سے اقوام کو نفع ہوگا چنانچہ عراق انہوں نے فتح کیا۔ لکن البائس کہ ضرر والا تو سعد بن خولہ ہے اس میں دو قول ہیں۔ ① سعد بن خولہ نے ہجرت ہی نہ کی تھی۔ ② ہجرت کی تھی مگر واپس مکہ چلے گئے تھے وہاں ہی فوت ہوئے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثلث تک وصیت کرنا جائز ہے یہ جمہور کا مسلک ہے شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ثلث سے کچھ کم وصیت کرے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا والثلث کثیر مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ برکت کے اعتبار سے فرمایا کہ یہ بہت ہے تمہارے لئے صدقہ جاریہ کا اسکا بہت ثواب ملے گا امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ورثاء غریب ہوں تو ثلث سے کم وصیت کرے اگر ورثاء مالدار ہوں تو ثلث تک وصیت کرسکتا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ عورت یا مرد ۶۰ سال تک نیک اعمال کریں مگر وصیت میں ضرر سے کام لیں کہ ثلث سے زائد وصیت کریں یا کسی کو بغیر وجہ کے محروم کردیں تو آگ میں داخل ہوں گے۔

باب ماجاء فی الحث علی الوصیت

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مناسب نہیں تھے کہ کسی مسلمان کے لئے کہ وہ دو راتیں گزارتا ہو اور اس کے پاس ایسی چیز ہو جس کی وصیت کی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کی وصیت اس کے پاس لکھی ہونی چاہئے۔ ''ماحق'' بعض کے ہاں بمعنی لایجوز کے ہے ان کے ہاں وصیت واجب ہے لیکن جمہور رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ماحق لاینا سب اولا ینبغی کے معنی میں ہے تو پھر جائز ہوگا اس لئے جمہور کے ہاں وصیت کا لکھنا مستحب ہے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو لکھتے وقت دو گواہ بھی بنادے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو۔ باقی اگر کسی کو وصیت کرنا چاہے تو ثلث تک کردے تاکہ ثواب ملتا رہے۔

باب ماجاء ان النبي ﷺ لم يوص

طلحہ نے ابن ابی اوفیٰ سے سوال کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے وصیت کی تھی، انہوں نے کہا نہیں طلحہ بن مصرف نے کہا کہ پھر کیسے وصیت لکھنی چاہئے۔انہوں نے جواب دیا نبی اکرم ﷺ نے کتاب اللہ کی وصیت کی۔اس سوال کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں کہ مال کی وصیت کی ہے۔جیسے شیعوں نے مشہور کیا ہے۔انہوں نے جواب دیا آپ ﷺ نے کوئی وصیت نہیں کی۔پھر اس نے سوال کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے وصیت کی ترغیب دی۔خود وصیت کیوں نہیں کی۔جواب دیا کہ قرآن کی وصیت مراد ہے کہ اس کی حفاظت مراد ہے اور قرآن میں پورا دین ہے تو پورے دین کی وصیت ہوگئی۔تو ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس وصیت کی نفی کی وہ مال کی وصیت یا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وصیت کی نفی کی باقی وہ وصیت جو کی کہ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لشکر کے ساتھ بھیجو۔ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھائیں۔اسی طرح نماز کی وصیت کی۔اس کی نفی مقصود نہ تھی۔

باب ماجاء لا وصیت لوارث

پہلے وصیت کی اہمیت ومقدار بیان کی۔اب وصیت کے باقی احکام کا ذکر ہے کہ کس کے لئے وصیت جائز ہے کس کے لئے جائز نہیں تو فرماتے ہیں کہ پہلے لوگ اولاد والدین وغیرہ کے لئے بھی وصیت کی اجازت تھی۔پھر اولاد کا حصہ مقرر ہوا تو ان کے لئے وصیت ممنوع ہوگئی۔والدین کے لئے جائز رہا۔جب آیات اتریں تو جن کا حصہ میراث میں مقرر ہے ان کے لئے وصیت کا جواز منسوخ ہوگیا۔حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر انسان کو جو اس کا حق بنتا ہے وہ اس کو دیا ہے۔اس لئے وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔بچہ فراش کے لئے ہے۔فراش فرش سے ہے۔یہاں عورت مراد ہے کہ بچہ اس کے پاس رہے گا۔اب اگر یہ کسی کی بیوی ہو تو زوج کی طرف لڑکا منسوب ہوگا۔اگر کسی کی بیوی نہ ہو تو عورت ہی کے پاس رہے گا۔"وللعاھر الحجر" (1) محصن زانی ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا۔یا محصن نہ ہو تو معنی ہوگا کہ زانی کے لئے رسوائی اور ذلت ہے باقی آخرت میں ان کا حساب اللہ پر ہے۔وہ سزا دے یا معاف کردے یہ احناف کی دلیل ہے کہ حدود مکفرات نہیں باقی جہاں یہ آیا ہے کہ آخرت میں سزا نہ ملے یہ محمول ہے توبہ پر کہ توبہ کرے اللہ معاف کردیں گے۔فرمایا کسی نے والد کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کی یا آقا نے آزاد کیا ان کے درمیان موالات ہے۔لیکن یہ اس کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کی طرف نسبت کرتا ہے کہ فلاں نے آزاد کیا ہے تو اس پر قیامت تک اللہ کی لعنت برستی رہے گی۔"العاریۃ مؤداۃ" کسی نے عاریت پر کوئی چیز لی تو اس کو واپس کرنا ہوگا۔اب وہ چیز ہلاک ہو تو ضمان ہے یا نہیں تو شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر ضمان آئے گا کہ قیمت ادا کرے۔احناف و مالکیہ کے ہاں ضمان نہیں کیونکہ عاریت بطور امانت کے ہے اور امانت میں ضمان نہیں آتا۔"المنحۃ مردودۃ" منحہ کہتے ہیں کہ مثلاً بکری دی کہ اس کا دودھ جب تک ہے استعمال کرتے رہیں۔تو جب دودھ ختم ہوگیا تو بکری کا واپس کرنا لازم ہے۔اگر ہلاک ہوجائے تو بالاتفاق ضمان آئے گا۔اسماعیل بن عیاش راوی کے بارے میں بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے یں کہ بہ نسبت بقیۃ کے ثقہ ہے۔جبکہ ابو اسحٰق کہتے ہیں کہ اسماعیل بن عیاش سے بالکل روایت نقل نہ کرو چاہے وہ ثقات سے نقل کرے یا غیر ثقات سے۔جبکہ بقیۃ کے بارے میں کہا ہے کہ ثقات سے نقل کرے تو اسکی روایت لو مگر غیر ثقات سے لے تو اس کی روایت نہ لو۔مسئلہ گزر چکا ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔لیکن اگر ورثاء سارے دینا چاہیں، کسی ایک کو جس کے بارے میں میت نے وصیت کی ہے تو جمہور کے ہاں جائز ہے۔کیونکہ شریعت نے ورثاء کے حق کی وجہ سے ایک وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی۔مگر وہ خود اپنا حق ساقط کریں تو جائز ہے مگر اہل ظواہر کے ہاں یہ وصیت جائز نہیں، کیونکہ یہاں یہ وصیت شریعت کی رو سے حرام ہے۔اس لئے ورثاء کے ہونے کا اعتبار نہیں۔

باب ماجاء يبدء بالدين قبل الوصية

اب قرآن میں پہلے وصیت کا ذکر ہے۔ پھر دین کا۔ لیکن حقیقت میں دین مقدم ہے۔ وصیت کو قرآن میں اہمیت کی وجہ سے مقدم کیا ہے۔ دوسرا اس کا کوئی مطالب نہیں ہوتا اس لئے لوگ کوتاہی کرتے ہیں۔ مگر دین کا مطالب موجود ہوتا ہے اس لئے اس میں کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔

باب ماجاء فى الرجل يتصدق اويعتق عند الموت

ابی حبیبہ الکائی نے ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ میرے بھائی نے وصیت کی ہے مجھے کہ میں اس کا مال خرچ کروں تو اب اس کا مصرف بتائیں۔ اس کا جواب ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا کہ مجھ سے اگر فتویٰ طلب کرتے ہو تو میرے نزدیک مجاہدین سے بڑھ کر اس کا کوئی مصرف نہیں۔ لیکن اس نے عندالموت وصیت کی تھی۔ اس لئے فرمایا کہ زیادہ ثواب اس میں نہیں، یہ ایسے ہے جیسے کسی کا پیٹ بھر جائے تو کہے اب فلاں کو دے دو۔ صحیح ثواب تو اس میں ہے کہ خالی پیٹ ہو پھر خرچ کرے۔

باب .

بریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو موالی نے مکاتبہ بنایا تھا۔ مال کتابت ان کے پاس نہ تھا۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ جاؤ اپنی خاندان والوں سے پوچھ لیں کہ مال میں دوں گی۔ مگر ولاء میری ہوگی۔ مگر اس کے خاندان نے کہا کہ نہیں ولاء ہم لیں گے۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ لے کر آزاد کر دیں اور ولاء اس کو ملتی ہے جو آزاد کرے۔ یہ شرعی حکم ہے اس لئے آپ کو ملے گی۔ اس سے بعض نے ۶۰۰ تک مسائل مستنبط کئے ہیں۔

ابواب الولاء والهبة

عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

ولاء سے ولاء عتاقہ مراد ہے کہ کسی نے غلام آزاد کیا تو اس آزاد کردہ کی ولاء کس کو ملے گا اسی طرح ھبہ کوئی کرے تو رجوع کر سکے گا یا نہیں اس کا بیان ہے۔

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

اس میں مسئلہ یہ ہے کہ ولاء معتق کی معتق کو ملے گی یہ اجماعی مسئلہ ہے اس باب میں جو روایت ہے یہ واقعہ گزر چکا ہے قبل باب میں۔ باب النھی عن بیع الولاء وھبتہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ معتق کی ولاء معتق کو ملے گی اب یہ اس ولاء کو نہ ھبہ کر سکتا ہے نہ فروخت کر سکتا ہے یہ جمہور کا مسلک ہے کیونکہ ولاء نسب کی طرح ہے اور نسب کا ھبہ یا بیع جائز نہیں اسی طرح ولاء کا ھبہ اور بیع بھی جائز نہیں۔ بعض اہل علم کے ہاں ولاء کی بیع وھبہ جائز ہے نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے مدافعت کی ہے کہ شاید ان تک یہ حدیث نہ پہنچی ہوگی ورنہ یہ روایت صحیح ہے اگرچہ عبداللہ بن دینار اس روایت میں متفرد ہیں لیکن یہ ثقہ ہیں اس لئے ان کا تفرد حدیث کی حجت پر اثر نہیں ڈالتا۔ عبداللہ بن دینار سے روایت ۳۵ طرق سے ثابت ہے آگے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابن دینار ہی نقل کرتے ہیں بلکہ جس نے نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے یہ ان کا وہم ہے۔

باب ماجاء فی من تولیٰ غیر موالیه

المدینة حرم مابین عیرالی ثور ۔عیر پہاڑ ہے ثور بھی پہاڑ ہے عبید بن سلام کہتے کہ ثور مدینہ کا کوئی پہاڑ نہیں اس لئے احد لفظ تھا راوی نے غلطی سے ثور کہا مگر محققین کہتے ہیں کہا احد کے دامن میں ایک پہاڑ ہے زیادہ بڑا نہیں اس کا نام ثور ہے اس لئے یہاں راوی کا وہم نہیں۔ اشکال مدینہ بھی مکہ کی طرح حرم ہے یا فرق ہے۔ جواب آئمہ ثلاثہ کے ہاں یہ بعینہ مکہ کی طرح حرم ہے احناف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدینہ کو تعظیم کی وجہ سے حرم کہا ورنہ مکہ والی قیودات نہیں احناف رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل یا ابا عمیر مافعل النغیر تو پرندہ پکڑا جب کہ مکہ کا شکار پکڑنا ممنوع ہے دوسرا اس کا گھاس درخت کاٹنے کی بھی اجازت تھی۔ ''من احدث فیہا'' جس نے مدینہ میں بدعت ایجاد کی ایسا کام کیا جو دین سے نہ تھا خیر القرون سے اس کا ثبوت نہ تھا لیکن وہ دین سمجھ کر کرے یا کسی نے بدعتی کو ٹھکانہ دیا یا ''اٰوای محدثا'' کہ بدعت کو جگہ دی مثلاً رو کا نہیں بدعت سے تو گویا اس نے بدعت کو ٹھکانا دیا ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہے فرشتوں کی اور لوگوں کی کیونکہ وہ اسلام کا مرکز ہے وہاں بدعت ہوئی تو پورے عالم اسلام میں عام ہو جائے گا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا المدینۃ کا الکیر تو مدینہ میں بدعتیوں کو اللہ رہنے ہی نہیں دیتے بلکہ ان کو نکال دیا جاتا ہے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حفاظت ہے لایقبل الله منه یوم القیامة صرفاً ولا عدلاً اسکی نفل وفرض قبول نہ ہوگی یعنی کوئی عبادت قبول نہ ہوئی جس نے نسب بدلا وہ ملعون ہے کہ نسب جو کہ نعمت ہے اس کو چھپاتا ہے دوسرے کی نسبت کرتا ہے یا کسی نے آزاد کیا مگر یہ اس کا احسان بھلا کر دوسرے کی طرف نسبت کرے یہ بھی معلون ہے۔ یسعیٰ بها ادناهم ای یتولی بها ادناهم یعنی مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں اس لئے کسی نے امان دیا اگرچہ وہ ادنیٰ ہے مگر اعلیٰ اس کا پابند ہوگا یا ایک نے امان دیا تو پوری جماعت اس کی پابند ہوگی۔

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

ایک آدمی آیا دل کی شکایت ظاہر کی میری بیوی کو سیاہ بچہ ہوا ہے ہمارے رنگ کے ساتھ جوڑ نہیں تو یہ بات ظاہر نہیں کہ یہ قذف نہیں بلکہ مسئلہ طلب کر رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر اس کے اس وہم کی وضاحت کی ''اورق'' سیاہ رنگ بھی اس میں ہو اور دوسرے رنگ بھی ہوں جیسے کبوتر وغیرہ ''لعل عرقا نزعها'' اونٹوں میں اوپر کسی اونٹ کا ایسا رنگ ہوگا تو وہ رنگ اس کی آئی ہوگی اس وجہ سے اونٹ اورق پیدا ہوئے۔

باب ماجاء فی القافة

رنگ اور ظاہری اعضاء کو دیکھ کر معلوم کرنا قافہ ہے یہ علم قافہ ہے ایک مہارت ہے جس کی وجہ سے لوگ معلوم کر لیتے ہیں یہ کس خاندان کا ہے۔ ''مجززاً'' ایک آدمی تھا جو قافہ میں مشہور تھا یہ خاندان اس میں مشہور تھا اس لئے ان کی بات لوگ بہت مانتے تھے۔ اسامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیاہ رنگ کے تھے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یعنی اسامۃ کے والد بالکل سفید تھے اس لئے لوگوں کو شک تھا اور مجزز نے پاؤں دیکھ کر کہا کہ یہ باپ بیٹا ہیں اس کی بات لوگ مانتے تھے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے کہ لوگوں کا شک دور ہو گیا۔ جمہور کہتے ہیں کہ قافہ سے نسب ثابت ہوتا ہے دلیل یہ روایت ہے مگر احناف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں نسب اس سے ثابت نہیں ہوتا نسب کا تعلق شریعت سے باقی حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شرعاً ثابت تھا قافہ کی وجہ سے ثابت نہ ہوا یہ تو صرف لوگوں کی تسلی کے لئے تھا۔

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الھدیة

نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو۔ ''تھادوا'' امر ہے۔ ہدیہ کا فائدہ یہ ہے کہ یہ سینے کے بغض اور حسد و کینہ کو دور کر دیتا ہے یعنی کسی سے ناراضگی ہو دل میں تو اسکو ہدیہ دو تو یہ ناراضگی ختم ہو جائے گی۔ کوئی پڑوس دوسری پڑوس کے لئے حقیر نہ سمجھے جو ہدیہ بھی دے سکے اگر چہ سوائے بغیر گوشت کے ہڈی ہو یعنی یہ مبالغہ ہے کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں صرف کھر ہے وہ بھی دے دیں یہ بھی ہدیہ ہے تو معمولی سے معمولی چیز ہو اس کو بھی ہدیہ دے دیں ① تو یہ حکم دینے والی عورت کو ہے کہ کسی چیز کو معمولی نہ سمجھو بلکہ اگر چہ کم ہے اس کا ہدیہ کر دو اس سے محبت بڑھے گی اور قلیل کا دینا آسان بھی ہے ہر ایک دے سکتا ہے ② یہ حکم اس کو ہے جس کو ہدیہ دیا جائے کہ تمہیں بطور ہدیہ کوئی چیز دی جائے اس کو حقیر نہ سمجھو کہ یہ تو کم ہے کیونکہ دینے والی کی اتنی ہی طاقت تھی اس سے زیادہ کی گنجائش اسکے پاس نہیں اس لئے اس کے ہدیہ کو خوشی سے قبول کریں تا کہ محبت پیدا ہو ③ لینے والے دینے والے دونوں کو عام ہے کہ نہ دینے والی حقیر سمجھے نہ لینے والی۔

باب ماجاء فی کراھیة الرجوع فی الھبة

کسی کو ھبہ کیا اب اس کو واپس کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ عمل ہے نبی اکرم ﷺ نے ایسے شخص کی مثال پیش کی کہ ھبہ سے رجوع ایسا ہے جس طرح کتا کسی چیز کو کھالے جب اس کا پیٹ بھر جائے تو قئی کرلے پھر جب پیٹ خالی ہوا تو اس قئی کو چاٹ لیتا ہے تو یہ عمل نہایت ہی مکروہ ہے اسی طرح رجوع کرنا ھبہ سے یہ بھی مکروہ فعل ہے دوسری روایت میں استثناء ہے کہ والد بیٹے کو ھبہ دے پھر واپس کرسکتا ہے کیونکہ بیٹے کا مال بھی والد ہی کا ہے کیونکہ انت و مالک لابیک۔

اختلاف احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی بھی ھبہ سے رجوع مطلقاً جائز نہیں بلکہ حرام ہے ان کے والد کا رجوع بھی جائز نہیں ① شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں والد کے علاوہ دوسرے آدمی رجوع نہیں کرسکتے بلکہ ان کا رجوع حرام ہے لیکن والد رجوع کرسکتا ہے ② مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ والدہ کچھ دے دے اس کو رجوع کا حق نہیں والد دے وہ رجوع کرسکتا ہے بعض نے بالعکس نقل کیا ہے کہ والد رجوع نہیں کرسکتا والدہ کرسکتی ہے ③ احناف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر چہ فعل مکروہ ہے مگر واہب کو ضرورت ہو تو وہ واپس کرسکتا ہے کیونکہ دلیل میں جو مثال پیش کی اس میں حرمت کی دلیل نہیں بلکہ مکروہ ہونے کو بتایا ہے کیونکہ کتا مکلف نہیں امام صاحب کے ہاں چند چیزوں میں رجوع جائز نہیں ① ذی رحم محرم کو ھبہ دیا اس کو واپس نہیں کرسکتا اس میں قطع رحم ہوگا ② والد نے ولد صغیر کو دیا اس سے واپس نہیں کرسکتا ③ بڑے لڑکے کو دے وہ قبضہ کرلے پھر بھی والد رجوع نہیں کرسکتا۔

ابواب القدر

عن رسول اللہ ﷺ

''القدر'' بفتح الدال و سکون الدال دونوں طرح استعمال ہوتا ہے قدر سر اللہ ہے جو اللہ نے نبی ﷺ کو بتایا نہ کسی فرشتے کو بتایا قدر پر ایمان ضروری ہے اس کا معنی یہ ہے کہ آدمی کا عقیدہ ہو کہ خیر و شر سب اللہ نے پیدا کئے مگر خیر کو پسند کرتے ہیں شر کو ناپسند کرتے ہیں سب کچھ اللہ کے فیصلے سے ہوتا ہے ایک جماعت اللہ نے اپنے فضل و مہربانی سے جنت کے لئے پیدا کی اور ایک فرقہ جہنم کے لئے پیدا کیا یہ

اس کے انصاف کے تحت ہے تقدیر دو قسم کا ہے ① مبرم ② معلق۔ مبرم وہ ہے جس کا اٹل فیصلہ اللہ کے پاس ہے۔ معلق کا معنی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں یہ مبرم ہے مگر فرشتوں کی نظر میں معلق ہے مثلاً والدین سے اچھا کرے گا تو یہ فیصلہ ہوگا اچھائی نہ ہو تو یہ فیصلہ ہوگا۔ قدر کے بارے میں بحث ممنوع ہے پہلا باب اسی مقصد کے لئے باندھا ہے کہ بحث نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس میں بحث سے یا انسان جبری بن جائے گا اور یا تقدیر کا انکار کر دیں گے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے سوال کیا قدر کے بارے میں کہ بین لنا فی القدر شیئاً علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا طریق مظلم لاتسلکہ اس نے دوبارہ سوال کیا انہوں نے جواب دیا بحر عمیق لا تردہ۔ اس میں نہ کو دیں یہ گہرا سمندر ہے پھر اس نے سوال کیا انہوں نے جواب دیا سر اللہ خفیہ علیک فلاتفتشہ ابن العربی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قدر کے بارے میں پریشان تھا میں نے تحقیق کیا اللہ نے دل میں بات ڈال دی خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جو اس میں تحقیق کرے گا وہ نقصان اٹھائے گا اس میں فائدہ نہیں اس لئے اس میں بحث نہیں کرنی چاہئے۔

باب

اس میں احتجاج آدم علی موسیٰ کا ذکر ہے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حجت میں غلبہ پانا موسی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس واقعہ کا ذکر ہے دونوں نے اس مسئلے میں حجت بازی کی اب یہ حجت کہاں ہوئی؟

جواب ①: دنیا میں ہوا مگر یہ صحیح نہیں۔

جواب ②: قیامت میں اللہ سے موسی علیہ الصلوٰۃ والسلام پوچھیں گے کہ ہمارے باپ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کہاں ہیں جنہوں نے گمراہ کیا اللہ تبارک وتعالیٰ بتائیں گے وہاں مکالمہ ہوگا تو یہ قیامت کے دن ہوگا۔

جواب ③: عالم ارواح میں ہوا تھا۔ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت ہے کہ جہاں ان کی خلقت کا ذکر ہے وہاں موجود ہے کہ اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہاتھ کا لفظ متشابہات میں سے ہے پیدا اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے ہوئے مگر آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شرافت ہے کہ فرمایا خلقت اللہ بیدہ اب ید سے جو بھی مراد ہو مگر آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شرافت کا اس میں اظہار ہے۔

اغواء غلطی اور خطاء کے لئے بھی آتا ہے کہ لوگوں کو غلط راہ پر ڈالا یا مطلب ہے ان کو گمراہ کیا۔ اشکال آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو گمراہ نہیں کیا۔ جواب اگرچہ اللہ کا فیصلہ تھا دنیا میں آئیں گے مگر بظاہر نہی کے باوجود دانے کا کھانا جنت سے نکل جانے کا سبب بنا۔ اگر جنت میں ہوتے سب نیک ہوتے مگر جب دنیا میں آئے تو دو فریق ہو گئے۔ آدھے جنت میں آدھے جہنم میں۔ تو سبب بننے کی وجہ سے ان کی طرف نسبت کی۔ یہاں ہے قبل ان یخلق السموات والارض۔ دوسری جگہ ہے قبل خلقی اربعین سنة تو بظاہر تعارض ہے۔ جواب پہلے سے لکھا جا چکا تھا مگر فرشتوں کو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق سے چالیس سال پہلے بتایا۔ یہاں آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تقدیر سے حجت پکڑی۔ کیونکہ ان کی لغزش معاف ہو گئی تھی لیکن کوئی گناہ پر مصر بھی ہو اور کہے کہ تقدیر میں ایسا لکھا ہے یہ صحیح نہیں۔

باب ماجاء فی الشقاء والسعادة

یہ دونوں ضد ہیں شقی بمعنی کمینہ اور بد بخت سعید بمعنی نیک بخت پہلے بتایا کہ قدر میں بحث نہ کرو اس پر بحث کرنے کی وعید فرمائی کہ بحث کرو تو انجام ہلاکت ہوگا اسی طرح یہاں بھی سوچو تو انجام ہلاکت ہوگا باقی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک طبقہ جنت ایک طبقہ جہنم کے لئے بنایا ہے یہ کیوں بنایا اسی کی حکمت ہے یہ سب کچھ پہلے سے ہو چکا ہے کہ فلاں جنتی ہے فلاں جہنمی ہے تو تمام ہونے والے واقعات کا پہلے سے فیصلہ ہو گیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا علم کسی کو نہیں دیا جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے علم نہیں دیا تو اس میں خوض کی ضرورت نہیں بلکہ جس طرح

بھی ہو اس پر ایمان لایا جائے وہ خالق و مالک ہے وہ اپنی مخلوق میں جو تصرف کرے کرسکتا ہے وہ کسی کو فضل سے جنت میں داخل کرے تو اس پر قادر ہے اور کسی کو عدل سے آگ میں ڈال دے یہ بھی کرسکتا ہے اس لئے اس پر اعتراض نہیں کیونکہ لایسئل عما یفعل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا کہ ہم جو اعمال کرتے ہیں یہ نیا پیدا ہے یعنی اب علم میں آئے گا کرنے کے بعد یا یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ پہلے سے طے ہو چکا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے ہر ایک کے لئے آسان کیا جائے گا جس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے جن کو سعید پیدا کیا ہے وہ سعادت والے کام کریں گے جو شقی پیدا کئے ہوں گے شقاوت والے کام کریں گے حاصل یہ ہے کہ جس منتہاء کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اس کے لئے اسی منتہاء کے اعمال آسان کردیئے جاتے ہیں۔ وھو ینکث فی الارض نکث بمعنی زمین میں لکڑی مارنا بعض روایت میں مخصرۃ کا لفظ ہے کہ چھوٹی لاٹھی تھی اس سے زمین کریدر ہے تھے کیونکہ جب آدمی سوچ رہا ہو تو ایسا کرتا ہے "کتب مقعدہ من النار" ایک روایت میں ہے ہر آدمی کے لئے دو مقاعد ہیں ایک جنت میں ایک جہنم میں اور بعض روایات میں ہے کہ جنتی کو اس کا جہنم کا ٹھکانہ دیکھایا جائے گا کہ جنت کے اعمال نہ کرتے تو یہ جگہ ملتی جہنمی کو جنت میں اس کا ٹھکانہ بتایا جائے گا کہ نیک عمل کرتے تو اس میں جاتے۔ تو اگرچہ دو ٹھکانے ہوں گے مگر منتھی ایک ہی پر ہوگی؟

باب ماجاء ان الاعمال بالخواتیم

اعمال کا مدار خاتمے پر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی خلقت کے ادوار کا ذکر کیا کہ ۴۰ دن تک نطفہ بطن میں رہتا ہے بعض کہتے ہیں کہ رحم میں اس طرح رہتا ہے اور خمیرہ کی شکل بن جاتا ہے مگر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تشریح کی ہے کہ نطفہ جب رحم میں جاتا ہے تو جسم میں اڑ جاتا ہے یہاں تک کہ ہر بال کے نیچے تک پہنچ جاتا ہے پھر اس کو ۴۰ دن میں دوبارہ جمع کیا جاتا ہے اور وہ خون کی شکل بن جاتا ہے پھر مضغہ بن جاتا ہے پھر اللہ تبارک وتعالیٰ مضغہ میں نقشہ بنا کر فرشتے کو بھیجتے ہیں وہ روح پھونک دیتا ہے چار باتیں فرشتے کو کہی جاتی ہیں ① رزق ② زندگی ③ اس کا عمل کیا ہوگا ④ شقی ہوگا سعید ہوگا فرمایا کہ کوئی آدمی اہل جنت کے اعمال کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان زراع کی مقدار رہ جاتی ہے مگر شقی لکھا گیا ہے اس لئے آخر میں جہنم کے اعمال کرتا ہے تو آگ میں چلا جاتا ہے دوسرا برے اعمال کرتا ہے مگر سعید لکھا گیا ہے تو آخر میں نیک عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے جنت میں جاتا ہے۔

باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ

حدیث کے متن میں کل مولود یولد علی الملۃ اور ترجمۃ الباب میں علی الفطرۃ ہے اور فطرۃ کے معنی میں اختلاف ہے راجح یہ ہے کہ اسلام مراد ہے کیونکہ حدیث میں الملۃ کا ذکر ہے یعنی ملت اسلامیہ۔ تو ہر بچہ ملت اسلام پر پیدا کیا جاتا ہے مگر والدین جس طرف ڈالتے ہیں اسی طرف جاتے ہیں لیکن جو بچے زمانہ جاہلیت میں مر گئے تو سوال ھیکہ ان کا کیا ہوگا کیونکہ وہ تو نابالغ تھے اس کا جواب دیا کہ اللہ کو پتہ ہے کہ یہ کیا اعمال کریں گے ان کا عمل کیا ہوگا اطفال المشرکین میں تین قول ہیں ① اولا د والدین کے تابع ہے ② توقف ہوگا جس طرح حدیث میں ہے کہ اللہ اعلم بما کانوا عالمین. ③ بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ و محققین کا قول یہ ہے کہ یہ اہل جنت میں سے ہوں گے کیونکہ ان کا اپنا گناہ نہیں والدین کیوجہ سے جہنم میں نہ جائیں گے کیونکہ ولا تزروا وازرۃ وزر اخری.

باب ماجاء لایرد القدر الا الدعاء

ترجمۃ الباب میں قدر کا ذکر ہے حدیث میں قضاء کا ذکر ہے معلوم ہوا قضاء وقدر ایک چیز ہے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قضاء وقدر کو دعا کے علاوہ کوئی چیز رد نہیں کرسکتی۔ اشکال گزر چکا ہے کہ سب کچھ لکھا جا چکا ہے تو دعاء سے قدر کس طرح رد ہوتی ہے جواب قضاء مبرم تو اٹل

فیصلہ ہے اس میں تبدیلی نہیں آئی دوسری قضاء معلق ہے یہ اللہ کے علم میں تو مبرم ہے لیکن ہماری اور فرشتوں کے علم میں معلق ہے تو فرشتوں کے علم میں گویا قضاء میں تبدیلی آ گئی۔ تو دعا سے کسی چیز کا رد ہونا یہ بھی من قدر اللہ ہے جس طرح بیمار کو دوا کھلائی تو بظاہر معلوم ہوا کہ دوا نے مرنے سے بچا دیا لیکن حقیقت میں یہ بھی من قدر اللہ ہے کہ یہ دوا استعمال کرے گا بیماری سے نجات ملے گی اسی طرح یہاں بھی تقدیر میں تھا کہ دعا کرے گا یہ ملے گا تو یہ بھی تقدیر میں سے ہے تو دعا مؤثر ہے مشکل کام ہو آسان ہو اللہ سے دعا کرنی چاہے دعا کے آداب ہیں کہ پہلے حمد ہو پھر درود ہو اپنی حیثیت کے مطابق مانگو اور تعجیل نہ کرو حدیث میں اس کی تشریح یہ کی ہے کہ ہے کہ آدمی کہے بس دعاء قبول نہیں ہوتی ایسے آدمی کی دعا پھر قبول نہ ہوگی اس لئے تعجیل نہیں کرنی چاہئے کیونکہ دعا کا کبھی جلدی ثمرہ ملتا ہے کبھی دیر سے ملتا ہے اور کبھی آخرت میں بدلہ ملتا ہے۔

دوسری بات بتائی کہ نیکی عمر میں اضافہ کر دیتی ہے یہ بھی اللہ کی علم میں ہے مثلاً ۶۰ سال مقرر ہے لیکن فرشتوں کے اعتبار سے مثلاً ۴۰ سال لکھی تھی کہ نیکی کرے احسان کرے تو عمر ساٹھ سال ہوگی تو جب نیکی کی تو گویا فرشتوں کے سامنے ۲۰ سال عمر بڑھ گئی یا زیادتی عمر کا مطلب یہ ہے کہ ان کا وقت ضائع نہ ہوگا کیونکہ یہ حقیقی ہے اس لئے عمر تو نہیں بڑھتی مگر اس کے اوقات ضائع نہیں ہوئے تو عمر میں برکت ہو جاتی ہے کہ جو آدمی ۳۰ سال میں کام کرے یہ ۱۰ سال میں کر جائے گا کیونکہ اس کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

فهل تخاف علینا ہم ایمان لے آئے ہیں اس کے بعد بھی آپ ہمارے مرتد ہونے سے ڈرتے ہیں آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں اشکال حضور ﷺ اپنے لئے دعا کرتے تھے اس میں یہ اشارہ نہیں کہ امت پر خطرے کا ذکر ہے تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی طرف کس طرح نسبت کی کہ ہمارے بارے میں ڈرتے ہیں۔ جواب نبی ﷺ معصوم تھے ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کا دل پھر جائے بلکہ ان کی دعا امت کے لئے تعلیم ہے کہ ان پر جو خطرہ ہے اس سے بچنے کے لئے دعا کریں تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ ہیں اس لئے ہمارے تعلیم کے لئے دعا کر رہے ہیں اس لئے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی طرف نسبت کی۔ باقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے اصابع کا ذکر متشابہات میں سے ہے سلف اس کو مفوض الی اللہ تبارک وتعالیٰ کرتے ہیں کہ جو بھی مراد ہو ہمارا اس پر ایمان ہے باقی اس کی کیفیت مجہول ہے۔ غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ صرف اصابع میں تاویل کرتے تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں نہیں احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اصابع میں بھی تاویل نہیں کرتے تھے احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ایک دن آئے ان کا بیٹا یہ حدیث پڑھا رہا تھا اس نے انگلیوں سے اشارہ کیا احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے کہ ایسا کیوں کیا اس سے بعض نے سمجھا کہ وہ اصابع میں تاویل کرتے تھے جب کہ ایسا نہیں وہ تو بیٹے کی کیفیت بیان کرنے سے ناراض ہوئے تھے۔

باب ماجاء ان اللہ کتب کتابا لاهل الجنة واهل النار

نبی ﷺ نکلے ان کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں ① ایک قول یہ ہے کہ دو مخصوص کتابیں تھیں مگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشاہدے اور نظر میں نہیں آ رہے تھے اس لئے فرمایا کہ معلوم ہے میرے ہاتھ میں کیا ہے ② دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بطور تمثیل تھا نبی ﷺ دیکھ رہے تھے۔ احمل علی آخرهم آخر میں مجموعی مقدار لکھی ہے کہ کل اتنے ہیں۔ ''سددوا'' ای فی الامور کہ امور میں میانہ روی اختیار کریں۔ ''وقاربوا'' ای الی اللہ کہ اللہ کا قرب حاصل کریں ''فنبذهما'' ہاتھ جھاڑے کہ سب کچھ ہو گیا۔

باب ماجاء لاعدوی ولاهامة ولاصفر

زمانہ جاہلیت کے اوہام کو دور کیا جا رہا ہے جیسے ان کا عقیدہ تھا عدوی کا معنی یہ ہے کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لگ جاتی ہے ہامہ کا عقیدہ یہ تھا کہ ① چمگاڈر جس گھر میں آ جائے تو یہ موت کی خبر دیتا ہے ② یا نحوست کی علامت ہے ③ یا مقتول کی روح بدلہ لینے تک

اسیر ندے کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ میت کی ہڈیاں ھامہ پرندہ کی شکل میں آتی ہیں۔ نبی ﷺ نے ان عقائد کی تردید کی۔ صفر ① بعض نے کہا کہ یہ پیٹ کی بیماری ہے ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بیماری لگ جائے تو مرجائے گا۔ ② یا یہ سانپ ہے جو پیٹ میں ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ سانپ پیدا ہو تو آدمی مرجاتا ہے۔ ③ تیسرا بیماری ہے کہتے تھے کہ دوسرے کو لگ جائے گی ④ یا مطلب یہ ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ صفر کے مہینے میں نحوست ہے تو اس کی تردید کی ⑤ یا یہ لوگ محرم کی حرمت صفر کو دے دیتے تھے اس کی تردید کی "البعیرا جرب الحشفة ندبنه" ای ندخله فی الدین کہ ہم اس کو باڑے میں داخل کرتے ہیں صحیح مصری نسخے ہیں ان میں ہے بذنبہ کہ اونٹ دم ہلاتا ہے اس سے دوسرے کے حشفے پر یہ بیماری لگ جاتی ہے یہ نسخے زیادہ صحیح ہیں کیونکہ ندبنہ کا معنی باڑا کرنا یہ لغت میں نہیں ملتا ہے۔

باب ماجاء فی الایمان با القدر خیره وشره

کسی آدمی کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ قدر پر ایمان نہ لائے کہ خیر وشر اللہ کی طرف سے ہے اور اس نے پہلے سے اس کو مقرر کیا ہے اب اس کا عقیدہ ہونا چاہئے کہ جب اس کو تکلیف پہنچی تو یہ ٹل نہیں سکتی اور اگر اس کو تکلیف نہ پہنچی تو اس میں اس کی کوئی چالاکی نہیں بلکہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کی طرف سے یہ مصیبت پہنچی ہی نہیں تھی البتہ اسباب اختیار کرنا اس کے منافی نہیں کیونکہ اسباب بھی من قدر اللہ ہیں، شهادة ان لا اله الا الله ۔شہادۃ کا لفظ لایا اس کا ایک ① مطلب یہ ہے کہ دل سے گواہی دے ② دوسرا مطلب یہ ہے کہ لفظ شہادت بھی مطلوب ہے یہ بھی جز ہے اس لئے اشهدان لا اله الا الله کہے "لم یکذب فی الاسلام" کذب فی الاسلام کی قید لائی کیونکہ ان کا اسلام لانا بہت پہلے تھا گویا مطلب یہ ہوا کہ جھوٹ نہیں بولا۔

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ماکتب لها

جہاں اللہ نے موت کی جگہ لکھی ہے وہ آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے اور وہاں مرتا ہے وماتدری نفس بای ارض تموت تو یہ مغیبات خمسہ میں سے ہے جہاں موت لکھی ہو اور یہ دوسری جگہ ہو تو اللہ اس کے دل میں حاجت ڈال دیتے ہیں کہ فلاں جگہ جانا ہے تو اصل میں موت کے لئے جارہا ہے وہاں پہنچ جائے تو موت واقع ہوجاتی ہے۔

باب ماجاء لاترد الرقی والدواء من قدر الله شیئا

اس میں حدیث نقل کی ہے یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے وہاں ان کے شیخ ابن ابی عمر تھا یہاں سعید بن عبدالرحمٰن ہے وہاں عبدابی خزامۃ عن ابیہ ہے یہاں عن ابن ابی خزامۃ ہے وہاں سئلت ہے یہاں سائل رجل ہے تو ممکن ہے پہلے کسی اور نے سوال کیا ہو پھر خود انہوں نے سوال کردیا باقی وہاں ابی خزامہ ہے یہاں ابن ابی خزامۃ ہے تو کہتے ہیں صحیح اول ہے یہاں ابن کا لفظ زائدہ ہے وہاں ترجمۃ الباب ابواب الطب کے مناسب لایا اور یہاں یہاں کے ابواب کی مناسبت سے باب قائم کیا ہے یہ فقاہت ہے کہ ایک روایت سے کئی مسائل مستنبط کئے جائیں۔

باب ماجاء فی القدریة

فرقہ قدریہ کے بارے میں باب باندھا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں دو قسم کے لوگ ہیں جن کو اسلام میں کوئی حصہ نہیں اسلام سے خارج ہیں ① مرجئیہ ② قدریہ۔ مرجئیہ وہ فرقہ ہے جو اعمال کو کچھ نہیں سمجھتے یہی جبریہ ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں کہ تقدیر ہے اس کا کوئی اختیار نہیں اس لئے اس سے سوال نہ ہوگا ان کا مقولہ ہے لایضر مع الایمان معصیة کما لا تنفع مع الکفر طاعة۔ قدریہ وہ ہے جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں کہ تقدیر کوئی نہیں انسان اپنے عمل اعمال کا خالق ہے انسان خود کرتا ہے پہلے سے

کوئی نہیں لکھا گیا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فرقہ مبتدعہ کا حکم کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے اہل علم نے کوشش کی ہے کہ ان پر اسلام کا نام رہے مگر وہ فرقے جن کے عقائد شرکیہ ہیں وہ اسلام سے خارج ہیں جیسے روافض ان کا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ دوسری ایمانیات پر۔ ان کا دین خود ساختہ ہے ان کے کئی فرقے ہیں۔

باب

''مثل ابن آدم ''ای خلق ابن آدم'' کہ ابن آدم کی تصویر بنائی تو مصائب کو اس کے ساتھ پیدا کیا جو مصائب اس کی موت کا سبب ہیں یہ انسان سے دور نہ ہوں گے اگر یہ موت کے اسباب سے بچ جائے تو بڑھاپے میں پڑ جاتا ہے اور بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں بڑھاپے کا انجام موت کے علاوہ کچھ نہیں تو دنیا میں کسی نے رہنا نہیں بعض نے پڑھا ہے، مَثَل ابن آدم ای صفۃ کہ انسان کی صفت و حالت یہ ہے کہ اس کو اللہ نے پیدا کیا تو اس کے ساتھ ۹۹ مہلکات بھی پیدا کئے قانون ہے کہ البرایا اصحاب البلاء کہ مخلوق خصوصاً نیک لوگوں کے ساتھ مصائب لازم ہیں اس لئے ان پر صبر کرے وہ کامیاب ہے۔

باب ماجاء فی الرضاء با القضاء

اللہ کی طرف سے جو فیصلے ہے اس پر رضا مند ہونا چاہئے یہ صبر والوں کو حاصل ہوتا ہے کہ صبر کرنے والے رضا مند ہوتے ہیں ورنہ یہ بڑا مشکل وقت ہوتا ہے صدمے کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہے الصبر عند الاولی آدمی کی بدبختی ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے مشورہ یعنی استخارہ چھوڑ دے۔ بلکہ استخارہ مباح امور میں کرنا چاہئے استخارے میں خواب دیکھنا لازمی نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ بہتری دیکھیں تو اس کام کو دل میں ڈال دیتے ہیں اسباب آسان کر دیتے ہیں۔

باب

اس میں قدر کے اثبات کے لئے دلائل نقل کئے ہیں۔ ''**یکون فی امتی خسف**'' **خسف** کہتے ہیں جیسے زلزلے سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں اور مسخ سے یا مسخ القلب مراد ہے یہ تو عام ہے یا شکل کا مسخ مراد ہے ایسا بھی ہوسکتا ہے ''قذف'' اللہ تبارک وتعالیٰ پتھر برسائیں یہ بھی ممکن ہے یہ تینوں عذاب تقدیر کے منکروں کے لئے ہوگا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کہا اگر بدعت کرتا ہے تو سلام نہ کہنا کیونکہ اس سے لوگ دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ شائد یہ بھی نیک ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی گویا اس نے دین کے گرانے میں اس کی مدد کی ''وما ھو کائن الی الابد'' ابد کی انتہاء نہیں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم وسیع ہے اس کی انتہاء نہیں اس لئے شارحین کہتے ہیں کہ ابد سے قیامت مراد ہے۔

ابواب الفتن

عن رسول اللہ ﷺ

فتنہ کا معنی امام راغب نے کیا ہے کہ فتنہ کہتے ہیں محنت کو پھر جہاں اس کا استعمال ہوتا ہے وہاں الگ معنی کیا ہے۔ فتنہ بمعنی ادخال الذھب فی النار اسمیں بھی محنت کا معنی موجود ہوتا ہے اسی مناسبت سے فتنہ کا لفظ امتحان کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ فتنہ کا استعمال خیر و شر دونوں میں ہوتا ہے۔ مگر شر میں زیادہ ہوتا ہے۔ فتنہ عذاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے ذوقوا فتنتکم۔ اسی میں آگ

میں ڈالنا ادخال المجرمین فی النار کے معنی اس میں موجود ہیں۔ دوسرے اہل لغت نے اس کا اصل معنی اختیار کیا ہے۔ دوسرے کے معنی میں کسی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو کہ اللہ نے ان کو فتنے میں ڈالا ہے اس میں حکمت ہوگی جہاں انسان کی طرف نسبت ہو۔ جیسے الفتنہ اشد من القتل تو فتنہ عام استعمال کیا جاتا ہے۔

باب ماجاء لایحل دم امرئی مسلم الا باحدیٰ الثلاث

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن اوپر سے متوجہ ہوئے اور سمجھایا "یوم الدار" سے وہ محاصرے کا دن مراد ہے جب ان کو باہر جانے سے روک دیا تھا۔ عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ انہوں نے سازش کی کہ مسلمانوں سے اپنی جزیرۃ العرب سے جلاوطنی کا بدلہ لیں۔ اس نے منافقت سے اسلام کا اظہار کیا۔ پھر اس نے اختلاف پیدا کرنے کے لئے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ پھر کہنے لگا کہ آپ کے حقوق ضائع ہو رہے ہیں۔ میں حقوق دلوانے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس غرض سے اس نے لوگوں کو جمع کیا۔ مصر کے لوگ اس کے ہمنوا ہوئے۔ حج کے موسم میں اس نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مطالبہ کیا کہ مصر کا گورنر تبدیل کریں ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ظلم کی وضاحت کریں۔ مگر چونکہ ان کے پاس دلیل نہ تھی اس لئے ثابت نہ کر سکے۔ وہاں سے مدینہ گئے۔ وہاں دوبارہ مطالبہ کیا کہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گورنر بنائیں۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا ہی کر دیا اور دوسرے گورنر کی معزولی کا خط لکھا۔ دوسرے دن انہوں نے خط پکڑا۔ اس لئے سارے اہل فتنہ واپس آ گئے اور خط عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے گورنر کے نام تھا کہ محمد بن ابی بکر کو جاتے ہی قتل کرو۔ انہوں نے کہا نہ میں نے لکھا ہے نہ میرے علم میں ہے۔ انہوں نے کہا اس آدمی کو ہمارے حوالے کریں۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ مروان نے اگر ایسا کیا ہے تو گواہ پیش کریں۔ انہوں نے کہا نہیں یا مروان کو ہمارے حوالے کریں یا پھر ہم نہیں جائیں گے تو انہوں نے محاصرہ کر لیا۔ یہ سازش پہلے سے بنائی تھی۔ خط میں تھا فاقبلوہ انہوں نے با کا لفظ کاٹ کر اوپر دو نقطے لگا دیئے کہ فاقتلوہ تو پہلے ان کا منصوبہ تھا اس لئے تمام شہروں کے ہل فتنہ جمع ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت مانگی کہ لڑائی کریں مگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت نہیں دی۔ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے درخواست کی میں فوج لے کر آتا ہوں۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسیوں کو باہر کے لوگوں سے تنگ نہیں کرنا چاہتا ہوں اس لئے انہوں نے اجازت نہ دی۔ پھر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا محاصرہ زیادہ ہوا تو انہوں نے اوپر سے فرمایا کہ قتل کے تین اسباب ہیں۔

❶ قتل نفس بغیر حق۔ ❷ زنا بعد الاحصان۔ ❸ ارتداد بعد الاسلام اور میں نے ان میں سے کوئی بھی نہیں کیا تو مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟ مگر انہوں نے نہیں مانا۔ پانی بند کر دیا۔ مسجد میں جانا بند کر دیا۔ بعد میں شہید کر دیا۔ مگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اقدام نہیں کیا کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق فتنہ ہوگا جو ختم نہ ہوگا۔ اس لئے اس کا سبب میں نہیں بننا چاہتا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شہادت کی بشارت بھی دی تھی۔ اس روایت میں قتل کے تین اسباب ذکر کئے ہیں۔ قتل کے دوسرے بھی اسباب ہیں۔ مثلاً کوئی حملہ کر دے تو دفاع کے لئے قتل جائز ہے یا کوئی مال چھین لے، اس کے ساتھ بھی لڑائی کر سکتا ہے۔ بعض نے دس ذکر کئے ہیں تو یہاں تین بتائے۔ فرماتے ہیں کہ تمام اسباب کی رجعت ان تین صورتوں کی طرف سے ہے اس لئے صرف ان تین کو ذکر کر دیا۔ دوسرا یہ تین اسباب عام ہیں، زیادہ پیش آتے ہیں۔

باب ماجاء فی تحریم الدماء والاموال

انسانی خون کے بہانے کی حرمت اور اموال کو نقصان پہنچانے کی حرمت یہاں ذکر ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کا خلاصہ سنایا۔ لیکن محدثین جہاں جو حصہ مناسب ہو وہ ذکر کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی اس خطبے کا بعض حصہ مذکور ہے۔ حجۃ

الوداع جیم کے کسرے اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔ اسی طرح الوداع تو دیع سے ہے بمعنی رخصت کرنا اور نبی ﷺ کا بھی آخری حج تھا۔ یا اس میں آپ ﷺ نے وفود کو اطراف عالم میں بھیجا۔ الوداع میں بھی واؤ کا کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔ یوم الحج الا کبر۔ اب یہ کونسا دن تھا اس میں اقوال ہیں۔ ① عرفہ کا دن تھا کیونکہ الحج العرفۃ۔ ② یہ یوم النحر تھا۔ بعض روایات میں یوم العید ہے۔ اس کو اکبر اس لئے کہا کیونکہ اکثر ارکان حج رمی، حلق، نحر، اور طواف زیارت اسی دن ادا ہوتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کو اکبر کہا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس وقت کی اس حج میں شریک تھے اس لئے اس کو حج اکبر کہا۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ تقریباً اکثر علاقوں کے لوگ اس میں آئے تھے۔ باقی یہ کہنا کہ عرفہ کا دن جمعہ کو ہو وہ حج اکبر ہے یہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ فعل کسی نے اختیار نہیں کیا۔ الالایجنی جان الاعلی نفسه کہ جانی کی جنایت کا وبال اس کے اپنے نفس پر ہے۔ باپ اور بیٹے میں کتنا تعلق ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود والد کے جنایت کا بیٹے اور بیٹے کا وبال والد پر نہ ہوگا بلکہ اس کے نفس پر ہوگا، کیونکہ ﴿ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ﴾ "الا وان الشیطن قد ایس ان یعبد" شیطان مایوس ہوگیا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اب شیطان کی کوئی عبادت نہیں کرتا بلکہ کل مایعبد من دون اللّٰہ۔ یعنی غیر اللہ کی عبادت کی تعبیر کی شیطان کی عبادت کے ساتھ اس میں شرک قبر پرستی سب کچھ داخل ہے۔ اشکال ارض حجاز میں مرتد بھی ہوئے تھے۔ ① جواب کفر اس میں داخل نہیں مراد یہ ہے کہ بت پرستی نہ ہوگی۔ ② جواب مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہوگا کہ نماز بھی پڑھیں اور کفر بھی کریں۔ صحیح جواب یہ ہے کہ کفر ایسا نہ ہوگا کہ اس کو اقتدار مل جائے بلکہ جلدی ایسے کفر وشرک کے فتنوں کی سرکوبی ہوگی۔ فیھا تُحقِرُوْن دوسرا اعراب ہے تُحَقِّرُوْن مراد کفر وشرک سے نیچے کے اعمال ہے جیسے قتل، خیانت، جھوٹ وغیرہ۔ اس میں مسلمان کو ڈال رہا ہے۔ کیونکہ کفار کو اس درجے تک پہنچا دیا ہے کہ ان کو چھوٹے کاموں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن مسلمان چونکہ کفر نہیں کرتا اس لئے چھوٹی چیزوں سے حملے کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ چور وہاں جاتا ہے جہاں کچھ ہو۔ خالی گھر میں اس کو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

"روعه" ای فزعه بمعنی ڈرانا۔ پہلے قتل اور مالی نقصان دینے کی حرمت بتائی۔ اب فرماتے ہیں کہ وہ چیزیں تو ہیں ہی حرام لیکن ویسے مسلمان کو ڈرانا بھی جائز نہیں۔ "لاعباً جاداً" مذاق سے لے لیا۔ پھر اپنے پاس روک لیا۔ اس کو واپس نہ کریں یہ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس سے اذیت ہوگی۔

باب ماجاء فی اشارۃ الرجل علی اخیه بالسلاح

کسی کو مارنے کا ارادہ نہیں صرف اسلحہ سے اس کی طرف اشارہ کرے یہ عمل معمولی ہے۔ مگر گناہ کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ اخیه کہا یہ اخوۃ اسلامی مراد ہے کہ مسلمان بھائی پر اسلحہ اٹھانا باعث لعنت ہے تو اسی طرح حقیقی بھائی پر اسلحہ اٹھانا گناہ ہے اور باعث لعنت کام ہے۔ کیونکہ یہ بڑے فتنے کو پیدا کرسکتا ہے تو سدً اللذ رائع یہ وعید سنائی۔

باب فی النھی عن تعاطی السیف مسلولاً

تلوار کسی کو میان سے نکال کر پکڑوانا یا اس سے لینا اس سے منع کیا۔ یہ احتیاط کے ابواب سے ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ لینے والا زخمی ہو جائے۔ پھر آپس میں لڑائی اور فتنہ پیدا ہو جائے تو نہی تنزیہی ہے سدً اللذ رائع لیکن فتنے کا قوی اندیشہ ہو پھر تو تحریمی ہوگی۔

باب من صلى ... فهو في ذمة الله

جس نے صبح کی نماز جماعت سے ادا کی وہ اللہ کی حفاظت اور ضمانت میں ہے۔ ویسے حفظ وامان اللہ ہی کا ہے مگر اللہ نے بعض امور کو ظاہری سبب بنایا ہے تو وعدہ ہے بندے کی طرف سے کہ صبح ... ز جماعت سے ترک نہ کرو۔ اللہ کی طرف سے وعدہ ہے کہ وہ امان میں رکھے گا۔ فرمایا خبردار اللہ تم سے اپنے ذمے کا مطالبہ نہ کر۔ ... ں طرف جو ذمہ داری سونپ دی ہے یعنی صبح کی نماز ادا کرنا اس کو پورا نہ کریں تو اللہ اپنے حفظ وامان کو تم سے اٹھانہ لیں تو امان ے وعدے کا ذمہ تم سے اٹھانہ لیں۔ اس لئے فجر کی نماز قضا نہ کریں۔

باب في لزوم الجماعة

جماعت سے نہ نکلے، جماعت کے اندر رہے۔ جماعت میں رہنے کے فوائد اور اس سے نکلنے کے مضرات بیان فرمائے ہیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جابیہ مقام پر (دمشق کا شہر ہے) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبے میں فرمایا کہ نبی ﷺ اسی طرح کھڑے ہوئے ہمارے درمیان، پھر فرمایا میں اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصیت کرتا ہوں کہ ان کے طرز کو لازم پکڑیں۔ ان کے خلاف کام نہ کریں۔ صحابہ کے بعد تابعین کا جو قرن ہے ان کی بھی مخالفت نہ کریں۔ پھر اتباع تابعین کے قرن کو بھی لازم پکڑیں۔ یہ خیر القرون تھے۔ ان میں اجتماعی کام سنت کے خلاف نہ ہوگا اس لئے اس جماعت کو لازم پکڑیں۔ پھر اس کے بعد جھوٹ شائع ہو جائے گا اعمال میں بھی اقوال میں بھی یہاں تک آدمی خود جھوٹی قسم اٹھائے گا جب کہ اس سے اس معاملے میں مقابلہ نہ کیا جائے گا مگر وہ از خود قسم اٹھائے گا ایک آدمی خود کو گواہ بنائے گا جب کہ اس کو گواہ نہ بنایا جائے گا بلکہ خود کہے کہ میں گواہ ہوں۔ تو شہادۃ زور کیلئے اپنے آپ کو پیش کریں گے، کوئی اجنبیہ کے ساتھ الگ نہ ہو کیونکہ ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ وہ دونوں کو گناہ پر ابھارتا ہے۔ تم پر جماعت المسلمین لازم ہے الجماعت سے کیا مراد ہے ① جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہے۔ ② جماعت المسلمین مراد ہے وہ تمام مسلمان ایک خلیفہ پر متفق ہیں تو آپ بھی اس خلیفہ کو مان لیں اور اس کے تحت زندگی گزاریں یہ امیر منتخب کرنا مسلمانوں پر لازم ہے اور جس خلیفہ پر مسلمان متفق ہوں اس جماعت سے خروج گناہ اور بغاوت ہے۔ لیکن خلیفہ نہ ہو مسلمانوں کی متفرق جماعتیں ہوں پھر کوئی جماعت لازم نہیں بلکہ حدیث میں ان سے بھاگنے کا حکم ہے۔ آگے دوسرے جگہ فرمایا کہ امت محمد ﷺ تم کو گمراہی پر جمع نہ کرے گا ① مراد اس سے صحابہ کی جماعت ہے ② یا خیر القران کی جماعت ہے ③ یا جماعت المجتہدین مراد ہے۔ اللہ کی مدد جماعت کے اوپر ہوتی ہے۔ من شذشذالى النار ۔ دوسرا فعل معلوم ومجہول دونوں طرح منقول ہے۔ الى النار بھی آیا ہے في النار بھی آیا ہے۔

باب ماجاء في نزول العذاب اذالم يغير المنكر

ان چیزوں کا ذکر جاری ہے جو سبب فتنہ ہے اب تغیر منکر کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی فتنہ کا باعث ہے اور نزول عذاب کا ذریعہ ہے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدشہ ہوا کہ شاید لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی کریں گے اور دلیل میں علیکم انفسکم الآیۃ پیش کریں گے اس لئے انہوں نے فرمایا کہ آیت میں کوئی اجازت نہیں بلکہ آیت میں حکم ہے کہ اگر آپ نے ذمہ داری پوری کر لی اب گناہ سے بچ جائیں گے مگر ذمہ داری پوری نہ کی تو بچ نہ سکیں۔ ... لیل میں حدیث پیش کی جب ظلم کرنے والے کو نہ روکا تو ممکن ہے عذاب آجائے تو یہ عذاب عام ہوگا ظالم کے ساتھ نہ روکنے والے بھی پھنس ... ئیں گے۔ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اذا اہتدیتم کا صرف یہ مطلب نہیں کہ تم خود ہدایت پر ہو بلکہ اس میں عموم ہے کہ اذا ادیتم ما علیکم من الواجبات کہ تم پر جو ذمہ داری ہے اس کو پورا کر لو

اس کے بعد تمہیں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ "فلم یاخذوا علی یدیه" اس کا مطلب یہ ہے کہ طاقت ہو پھر نہ روکے تو عذاب میں واقع ہو سکتا ہے لیکن کوئی ظالم کی مدد بھی کرے اس کا تعاون کرے اس کو بطریق اولیٰ عذاب ہوگا کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ﴿تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ بعض مفسرین نے حدیث نقل کی ہے کہ قیامت کے دن جب مجرموں کو جمع کیا جائے گا تو اس کو بھی جمع کیا جائے جس نے ظالم کو قلم دیا جس نے اس کی قلم مین سیاہی ڈالی پھر سب کو لوہے کی تابوت میں بند کر کے جہنم میں ڈال دیا جائے گا تو ظلم کا معمولی شعبے میں ساتھ دینا بھی باعث عذاب ہے۔

باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنكر

دو باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کرتے رہو گے اگر یہ اختیار نہ کیا اس کو چھوڑ دیا تو دوسرا امر لازم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تم پر عذاب مسلط کر دیں گے۔ دوسری روایت میں ہے قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ آپ خلیفہ کو قتل نہ کر دیں کیونکہ خلیفہ کا قتل باعث فتنہ ہے اور علامات قیامت میں سے ہے اور ایک دوسرے کو تلواروں سے مارنے نہ لگو اور دنیا کے بڑے بدترین لوگ نہ ہوں تو اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی یہ سب کچھ آج ہو گیا ہے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا گیا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد سے جنگیں شروع ہیں اور آج کل حکومت بھی ان کو ملی ہے جو بدترین لوگ ہیں جو جتنا بے حیائی میں مشہور ہو وہ بڑا بن جاتا ہے تو ان چیزوں کا ہونا باعث فتنہ ہے اس لئے ابواب الفتن میں لایا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک آدمی بیت اللہ میں پناہ لے گا اس کو پکڑنے کے لئے فوج آئے گی جب وہ بیداء جگہ پر پہنچ جائیں تو دھنس جائیں گے ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بات سنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے فرمایا کہ بعض ایسے ہوں گے جن کو زبردستی لایا گیا ہوگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کو دونوں میں فرق ہوگا ان کی ان کی نیات پر اٹھایا جائے گا اس حدیث کا باب سے ربط یہ ہے کہ یہ سارے فتنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کی وجہ سے پیدا ہوں گے اس لئے ان احادیث کو باب ماجاء فی الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں لایا یا اس میں تنبیہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اشراف کا کام ہے جب کہ دنیا کی حکومت اس کی عیش وعشرت اشرار کے لئے ہے۔

باب ماجاء فی تغیر المنكر باليد او باللسان او بالقلب

منکر کو جب دیکھے تو پہلے ہاتھ سے روکے یہ نہ کر سکے تو زبان سے روکے اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ تینوں بھی جمع ہو سکتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ منکر عضو فاسد ہے اگر فاسد حصہ جسم میں ہو جب تک اس کو کاٹ نہ دو پورا جسم پریشان ہوتا ہے معاشرہ بھی جسم واحد کی طرح ہے اب معاشرے میں منکر کرنے والے مفسد لوگ ہو اور معاشرے والے ان کو نہ روکیں تو معاشرے میں فساد وبگاڑ پیدا ہو جائے گا اس لئے ان کا ختم کرنا ضروری ہے مسنون طریقہ یہ ہے کہ عید کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔ مروان وغیرہ کا زمانہ آیا انہوں نے لوگوں پر ظلم کیا ان کو ناپسند کرنے لگے اب لوگوں نے ان کے خطبے سننے چھوڑ دیئے۔ مروان کو جب علم ہوا کہ نماز کے بعد لوگ چلے جاتے ہیں خطبہ نہیں سنتے تو مروان نے عید کا خطبہ نماز سے پہلے دینا شروع کر دیا تاکہ لوگ جانہ سکیں سن کر جائیں اس پر ایک شخص نے اعتراض کیا اور کہا "خالفت السنة" آپ کا فعل سنت کے خلاف ہے یہ بہت بڑی بات ہے کہ بادشاہ کے سامنے حق بات کہے اس لئے ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس نے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا کہ ظالم جابر کے سامنے حق بیان کیا پھر انہوں نے حدیث بیان کی۔ "فقال یا فلان ترک ماهنا کلب" وہ زمانہ نہیں رہا اس لئے پرانی باتیں یہاں نہیں چلتیں۔ من رأی منکرا کہ جو سامنے عیب دیکھو اس سے اس کو روکو ویسے اسکے دوسرے عیوب کی تلاش میں نہ پڑو کیونکہ مسلمان مسلمان کے لئے آئینہ ہے اور آئینہ ظاہری جسم کے داغ

بتاتا ہے پوشیدہ چیزیں نہیں بتاتا اس لئے تم بھی ظاہری کو دیکھو خفیہ عیوب میں مت پڑو۔ "ومن لم یستطع فبقلبہ" کہ خصال ایمان میں سے کمزور خصلت ہے یا شعب ایمان میں سے کمزور شعبہ ہے۔ یا یہ آدمی کمزور ہے کیونکہ صرف اسی کی طاقت رکھتا ہے۔

باب منه

"مداهنة" کہتے ہیں بذل الدین لصلاح الدنیا "مروت" بذل الدنیا للدین اوالدنیا۔ مداھن سے مراد وہ ہے جو امر بالمعروف کو چھوڑ دے۔

باب افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان

جہاد فی سبیل اللہ افضل عمل ہے کہ دشمن سے لڑا جائے لیکن اس سے بھی افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہے کیونکہ دشمن سے جہاد کرے وہاں فتح اور شکست دونوں کا احتمال ہے مال غنیمت بھی مل سکتی ہے اور شہید بھی ہوسکتا ہے اور دشمن کا ان پر تسلط بھی نہیں مگر جابر بادشاہ تم پر مسلط ہے تم اس کی طاقت کے نیچے ہو اس کو حق بات کہنا یہاں تکلیف کا ملنا یقینی ہے اس لئے یہ افضل ہے۔

باب سوال النبی ﷺ ثلاثا فی امته

نبی ﷺ نے خصوصی طور پر امت کے لئے تین دعائیں کیں دو قبول ہوئیں ایک نامنظور ہوئی پہلی یہ تھی کہ اس امت پر قحط سالی نہ آئے دوسری یہ تھی کہ ایسا دشمن مسلط نہ کریں جو بالکل ان کو ختم کردے تیسری دعا جو قبول نہ ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں اس کا یہاں ذکر ہے آگے اس حدیث کا ذکر ہے جس میں آپ ﷺ کی پیشن گوئی ہے آپ ﷺ کو تمام زمین سامنے دکھائی گئی جو مسلمان کے ملک میں داخل ہوگی فتح ہوکر۔ "فروی" ای جمع کہ پوری زمین جمع کرکے اللہ نے اس کی مشرق ومغرب دکھائی۔ منھا بیان کے لئے یا تبعیض کے لئے ہے ① بعض کے ہاں بیانیہ ہے وضاحت کے لئے کہ سب زمین دکھائی جو مسلمانوں کے ماتحت ہوگی یا پوری ماتحت ہوگی۔ یا اکثر زمین مسلمانوں کا ملک ہوگا اور باقی جو بچ گیا وہ مسلمانوں کے ماتحت ہی ہوگا۔ اب خلافت کے دور میں مسلمانوں کی حکومت پوری دنیا پر نہ تھی ممکن ہے بعد میں کوئی موقع آجائے کہ پوری زمین ارض الاسلام ہو ② من تبعیض کے لئے ہے کہ وہ زمین جہاں تک مسلمانوں کی حکومت پہنچے گی وہ جگہ نبی ﷺ کو دکھائی گئی کیونکہ اس وقت لوگ یہ محال سمجھتے تھے کہ قیصر وکسریٰ بھی مسلمانوں سے مغلوب ہوجائیں اس لئے نبی ﷺ نے پیشن گوئی دی جس کے اس وقت اسباب نہ تھے۔ "اعطیت الکنزین الاحمر والابیض" کسریٰ کی حکومت کا سکہ دینار تھا تو یہ اشارہ ہے کہ کسریٰ کا خزانہ ملے گا قیصر کا سکہ چاندی کا تھا تو ان کو بتایا گیا کہ قیصر کا خزانہ بھی ملے گا "فیستبیح" ای یستاصل کہ بیخ کنی کردے۔ "بیضتھم" ① سے مراد قوت اور طاقت ہے اصل معنی ہے وسط الدار لیکن قوت مراد ہے کہ ان کی قوت کو ختم نہ کردے ② یا بیضۃ الدجاجۃ مراد ہے کیونکہ بیضہ جب ٹوٹ جائے تو بیک وقت خراب ہوجاتا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کی قوت کو بیک وقت ختم نہ کردے۔ ③ یا مراد بیضۃ الحدید (خود) ہے۔ انسان ظاہری اسباب کرتا ہے اور زیادہ تر سر چھپاتا ہے جب خود توڑ لیا جائے اور سر بھی محفوظ نہ ہو تو یہ مغلوبیت کی نشانی ہوتی ہے۔

باب ماجاء فی الرجل یکون فی الفتنة

آپ ﷺ نے ایک فتنہ ذکر فرمایا اس میں اتنا مبالغہ کیا کہ ہم سمجھے کہ عنقریب واقع ہونے والا ہے میں نے پوچھا کہ اس فتنے میں بہتر آدمی کون ہوگا آپ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی جو اپنے مویشی میں ہو "ماشیہ" کا اطلاق گائے بھینس پر ہوتا ہے زیادہ تر بھیڑ بکریوں پر ہوتا

ہے اس کے حقوق بھی ادا کرتا ہو یعنی زکوٰۃ ادا کرے اور رب کی عبادت کرتا ہو کیونکہ شہر میں رہے گا تو فتنے میں مبتلا ہوگا اس لئے دیہات میں چلا جائے تو فتنوں سے بچ جائے گا۔

دوسرا وہ آدمی جس نے گھوڑے کو تیار کر کے رکھا ہو اس پر سوار ہو کر سرحد پر پہرہ دیتا ہو دشمن کو ڈراتا ہو اور دشمن اس کو ڈراتے ہوں۔ دوسری روایت میں ہے کہ عرب میں فتنہ ہوگا اس میں مقتول جہنم میں ہوں گے اس میں بات کرنا تلوار سے خطرناک ہوگا بعض نے کہا اس سے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لڑائی مراد ہے لیکن یہاں دونوں طرف صحابی تھے اس لئے قتلاھا فی النار کا مطلب کیا ہوا؟ بعض کہتے ہیں کہ منافقین ان کو لڑاتے تھے دونوں میں اجتہادی غلطی تھی دونوں حق پر تھے کوئی بھی دنیا کا طالب نہ تھا اس لئے قتلاھا فی النار (۱) سے لڑانے والے یہودی مراد ہیں کہ ان میں جو مقتول ہوئے وہ جہنم میں ہوں گے ورنہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں صرف اجتہادی خطا تھی دونوں فریق حق پر تھے اسی لئے بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالکل شریک نہیں ہوئے اگر حق صرف ایک طرف ہوتا تو صحابہ سارے اسی طرف ہوتے اور حق کا ساتھ دیتے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خون سے جس طرح ہماری تلواریں محفوظ ہیں کیونکہ اس وقت ہم موجود ہی نہ تھے اسی طرح اپنی زبانوں کو بھی ان کے خلاف بولنے سے بچانا چاہئے۔

باب ماجاء فی رفع الامانة

رفع الامانۃ علامات قیامت میں سے ہے اور علامات قیامت فتن میں سے ہیں۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت مروی ہے یہ صاحب امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے ان سے زیادہ تر فتن اور قیامت سے متعلق روایات منقول ہیں فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو احادیث بیان کیں ایک دیکھ لی دوسری کا انتظار ہے پہلی نزول امانت کے بارے میں ہے کہ امانت نازل ہوگئی لوگوں کی جڑوں میں۔ ''جذر'' یعنی اصل۔ امانت سے کیا مراد ہے ① قرآن میں جو موجود ہے کہ ﴿انا عرضنا الامانة علی السموات والارض﴾ تو عام مراد ہے۔ ② ایمان مراد ہے ③ وہ مخفی امور ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھا ہے جس کا انسان کو امین بنایا گیا ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد سب میں ہے۔ جنہوں نے ایمان سے تعبیر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تفصیل قرآن وسنت میں موجود جنہوں نے عام مراد لیا تو قرآن وسنت اس کا بیان ہے۔ دوسری حدیث بیان کی رفع امانت کے بارے میں چونکہ امانت دل پر نازل ہوئی تھی دل نزول امانت سے منور ہوگیا تھا اب امانت اٹھتی گئی تو نورانیت اٹھتی گئی اور اندھیرا پھیلتا گیا اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال پیش کی کہ آدمی سوجائے گا تو اس کے دل سے (ایمان) کو اٹھا دیا جائے گا تو اس کا اثر باقی رہ جائے گا۔ ① ''مثل الوکت'' وہ نشانی جو کسی چیز میں پیدا ہو جائے جیسے کپڑے پر من غیر لونہ نشان پڑ جائے۔ مجل سے مراد وہ پختہ نشان ہیں جو کام کرنے والوں کے ہاتھوں میں پڑ جاتے ہیں۔ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ② کہ وکت اثر ہے کسی چیز کا جو کام کرنے سے پیدا ہو یعنی جگہ سخت ہو مگر نظر نہ آئے مجل سے وہ اثر مراد ہے جو باہر نکل کر نظر آئے اس کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی کہ آگ کی چنگاری جب کسی جگہ لگ جائے وہاں فوراً اثر پیدا ہو جاتا ہے وہاں پانی پڑ جاتا ہے۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ آدمی بیدار ہو تو واضح تغیر محسوس کرے گا کہ دل کی نورانیت ختم ہوگئی ہوگی۔ اس کو وکت سے تعبیر کیا لیکن جب مزید نورانیت کم ہو تو س کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے اسکو نورانیت کے ختم ہونے کا زیادہ احساس ہوا ہے اس کو مجل سے تعبیر کیا پھر فرمایا لوگ صبح کریں گے آپس میں معاملہ کریں گے تو کوئی دوسرے تک امانت پہنچانے والا ہوگا بلکہ کہا جائے گا فلاں قبیلے میں فلاں آدمی امین ہے لوگ کہیں گے فلاں آدمی کیا ہی مضبوط ہے طاقت میں کتنا ہی اچھا بولنے والا ہے اور کتنا ہی عقل مند ہے جب کہ اس کے دل میں بالکل ایمان نہ ہوگا۔

حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت وہ تھا کہ امانت کا لحاظ کیا جاتا تھا اس لئے میں جس سے چاہتا بیع کرتا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہوتا اپنے اسلام کی وجہ سے مجھے دھوکا نہ دے گا اگر یہودی یا نصرانی ہوتو اس کا حاکم مجھے میرا حق پہنچا دے گا۔ لیکن آج ایسا زمانہ ہے کہ فلاں فلاں کے علاوہ سے بیع نہیں کرتا حذیفہ ۳۶ھ کے زمانے تک رہے یہ خیر القرون کا زمانہ تھا اس کے باوجود بعض لوگ ایسے تھے جو صحیح معاملہ نہیں کرتے تھے تو آج کیا حال ہے؟

باب لترکبن سنن من کان قبلکم

نبی ﷺ حنین کی طرف جا رہے تھے وہاں درخت تھا مشرکین اس کی تعظیم کرتے تھے وہاں اسلحہ رکھتے اردگرد کودتے تھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ ہمارے لئے بھی ذات الانواط بنائیں۔ ''انواط'' نوط کی جمع ہے بمعنی علامت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو دریافت کیا اس لئے کہ ان کے علم میں نہ تھا کہ یہ مشرک اس کی تعظیم وعبادت بھی کرتے ہیں مگر نبی ﷺ کو معلوم تھا اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایسا ہے جیسے قوم موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا تھا کہ اجعل لنا الٰہ کمالهم الٰه. فرمایا تم بھی ان کے کام اپناؤ گے یہاں تک کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہے تو اس امت میں بھی یہ کام ہوگا۔

باب ماجاء فی کلام السباع

یہ بھی علامات قیامت میں سے ہے اس لئے اس کو ابواب الفتن میں لایا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات یقینی ہے قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ درندے باتیں نہ کریں ''سباع'' سے عام مراد ہے جانور سباع ہوں یا پرندے سباع ہوں اور ''الانس'' سے عام مراد ہے مسلمان ہو یا کافر ''عذبة سوطه'' اس کے عصا کی ایک جانب اس سے بات کرے گی اسی طرح تسماں بات کرے گا اس کا ران اس کو بتادے گا کہ آپ کی گھر والی نے آپ کے بعد کیا کیا جب یہ باتیں ظاہر ہوں گی تو قیامت قائم ہوگی اس کے علاوہ بھی احادیث میں نشانیاں موجود ہیں۔

باب ماجاء فی انشقاق القمر

نبی ﷺ کے زمانے میں چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں سے جنہوں نے اس معجزے کا مطالبہ کیا تھا کہ اب تم میرے نبوت کے گواہ بن جاؤ بعض جگہ میں باب باندھا ہے مستقل کہ مشرکین کا سوال نبی ﷺ سے انشقاق قمر کے بارے میں یعنی باب ماجاء فی سوال المشرکین فی انشقاق القمر کے بارے میں یعنی باب ماجاء فی سوال المشرکین فی انشقاق القمر کے نام بھی لکھی ہیں۔ اب سوال اس لئے کیا کہ ان کے ہاں یہ مشہور تھا کہ سحر زمین پر چلتا ہے آسمان پر نہیں چلتا اب اگر چاند کے دو ٹکڑے کیے تو ساحر نہ ہوگا نبی ہوگا آپ ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی تو جبل حراء جو منیٰ کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب ہے اس کے اردگرد دو ٹکڑے آئے دونوں جانب پہاڑ کے روشن ہوئے پھر مشرکین نے اطراف میں وفود بھیجے کہ تم نے بھی دیکھا یا نہیں سب نے تصدیق کی کہ ہم نے دیکھا ہے۔ اب یہاں انشقاق قمر واقع ہوگا یا ہو چکا ہے بعض کے ہاں قرب قیامت میں ہوگا لیکن جمہور کہتے ہیں یہ ہو چکا ہے اس حدیث میں وہی انشقاق مراد ہے جو نبوت کے پانچویں یا نویں سال ہوا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ہو گیا ہوتا تو تواریخ میں ہوتا جب کہ تواریخ میں نہیں ملتا۔ جواب یہ رات کا واقعہ ہے اور رات کو لوگ دیر تک نہیں بیٹھتے اگر بیٹھ بھی جائیں تو کمروں میں ہوتے تھے اور دوسرا وہ قصہ گویوں میں مشغول رہتے تھے آسمان کی طرف کون دیکھتا ہے اس لئے سب کا یہ دیکھنا کوئی مانع نہیں جنہوں نے دیکھا انہوں نے بتادیا اس لئے تاریخ کا نقل نہ کرنا اس کے ہونے سے مانع نہیں ہے کیونکہ رات کو بڑے بڑے واقعات ہو جاتے ہیں مگر بعض کو علم بھی نہیں ہوتا۔

باب ماجاء فی الخسف

خسف علامات قیامت میں سے ہے اس کی مناسبت سے اور نشانیاں بھی بیان کی ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جب تک دس علامات نہ دیکھو تو قیامت قائم نہ ہوگی۔ ① طلوع الشمس مغرب سے ② یاجوج وماجوج ③ دابہ نکلے گا۔ ④ تین خسف ہوں گے ایک مشرق میں ⑤ ایک خسف مغرب میں ⑥ ایک خسف جزیرۃ العرب پر ⑦ عدن سے آگ نکلے گی لوگوں کے پیچھے بھاگے گی جہاں لوگ قیلولہ کریں گے یا رات گزاریں گے یہ بھی ساتھ ہوگی باقی ترتیب ان علامات میں کیا ہے تو اس میں اختلاف ہے ① بعض نے کہا پہلے خسف پھر طلوع الشمس پھر یاجوج وماجوج ② بعض نے یاجوج وماجوج کو مقدم کیا ہے ③ بعض نے دابہ کو مقدم کیا ہے ④ بعض نے توقف اختیار کیا ہے کہ معلوم نہیں پہلے کون سی ہوگی۔ ''دابہ'' جو مذکور ہے اس کے بارے میں ہے کہ بہت لمبا ہوگا اس کی گردن اتنی لمبی ہوگی کہ مشرق والے مغرب والے دونوں دیکھیں گے چہرہ آدمی کی طرح ہوگا چار پاؤں ہوں گے؟ سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انگوٹھی اور موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عصا اس کے پاس ہوگا پوری زمین پر چلے گا باقی تین خسف کا ذکر ہے تو بعض نے کہا یہ ہو چکا ہے ایک غرناطہ میں ہوا ۲۰۲ اور ۲۰۳ کے درمیان اس میں تیرہ شہر اتر گئے پھر مغرب میں ہوا مگر صحیح یہ ہے کہ اب واقع ہوں گے جو ہو چکے ہیں وہ الگ ہیں یہاں علامات کا ذکر ہے اس لئے بعد میں ہوگا۔ یہاں ہے عدن سے آگ نکلے گی جب کہ دوسری جگہ ہے آگ حجاز سے نکلے گی اس لئے تطبیق دی جاتی ہے کہ ابتداء عدن سے ہوگی ظہور حجاز سے ہوگا بعض نے کہا دو مرتبہ نکلے گی۔ دخان بعض نے کہا یہ ہو چکا ہے جب سات سال قحط مشرکین پر آئی تھی بعض نے کہا بعد میں ہوگا تطبیق یہ ہے کہ مشرکین کو بھوک کی وجہ سے کھیئۃ الدخان معلوم ہوتے تھے ورنہ دھواں نہ تھا دھواں بعد میں نکلے گا۔ ''امارتح'' ① یہ الگ ہوگی یاجوج وماجوج کو ختم کرنے کے لئے جو ہوگی وہ الگ ہوگی ② یہ وہی ریح ہوگی جو یاجوج ماجوج پر مسلط ہوگی۔ حتی یغزو جیش: ایک آدمی پناہ لے گا بیت اللہ میں لوگ اس کو مارنے آئیں گے تو بیداء میں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو دھنسا دیں گے یا یہ بیت اللہ کو گرانے کے لئے آئیں گے تو دھنس جائیں گے بعض نے کہا گرا کر واپس جائیں گے تو دھنس جائیں گے صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ بعض تو زور سے پکڑ کر لائے گئے ہوں گے آپ ﷺ نے فرمایا آخرت میں نیت کے اعتبار سے حشر ہوگا۔

باب ماجاء فی طلوع الشمس

یہ بھی قیامت کی علامات میں سے ہے بعض قیامت کی علامتیں ایسی ہیں کہ ان کے آنے کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا طلوع الشمس من المغرب بھی انہیں علامات میں سے ہے کہ اس کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی۔ ''وذالک مستقرلھا'' یہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت ہے ورنہ عام قرأت ﴿والشمس تجری لمستقرلھا﴾ ہے:

سورج کا مستقر کیا ہے اس میں اقوال ہیں۔ ① جمہور کا قول یہ ہے کہ اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے وہاں یہ اجازت کے بعد سجدہ کرتا ہے پھر چل پڑتا ہے اور مطلع سے طلوع کا ہوتا ہے لیکن جب اس کو اجازت نہ ملے گی سجدے کی یہ وہاں سے ہی واپس آئے گا طلوع مغرب سے کرے گا نصف النہار تک آئے گا پھر مغرب کی طرف چلا جائے گا۔ ② بعض کہتے ہیں مستقر الشمس سے سب سے طویل دن مراد ہے وہاں پہنچ کر پھر کمی شروع ہو جاتی ہے۔ ③ جس دن سورج کو اللہ ختم ہونے کا حکم دیں گے وہ مستقر ہے۔ لیکن جب حدیث میں موجود ہے کہ تحت العرش ہے تو دوسری تاویلات کی ضرورت نہیں باقی استقرار کا طریقہ اور سجدے کا طریقہ کیسا ہے یہ صرف اللہ جانتا ہے ہمیں اس کی کیفیت معلوم نہیں بس ہم اس پر ایمان کے مکلف ہیں۔ باقی دوسری جگہ ہے فی عین حمیۃ اور یہاں ہے یہ تحت العرش جاتا ہے۔ جواب۔ ممکن ہے فی عین حمیۃ عرش کے بالکل بزیر میں نیچے ہو اس لئے کوئی تضاد نہیں۔

باب ماجاء فی خروج یا جوج وماجوج

''استقیط رسول اللہ ﷺ''۔اشکال دوسری جگہ ہے دخل رسول اللہ ﷺ اور یہاں استقیط ہے تو بظاہر تضاد ہے جواب پہلے جاگے ہوں گے پھر گھر میں داخل ہوئے ہوں گے''وعقد عشرا''شہادت کی انگلی اور ابہام کو ملا کر حلقہ بنائے تو دس کا عدد مراد ہوتا ہے مراد یہ ہے کہ ابھی اتنا سوراخ ہو گیا ہے اب آہستہ آہستہ بڑھتا جائے گا۔اشکال''ویل للعرب من شر''اس شر سے کیا مراد ہے۔جواب ① شر سے فتنہ مراد ہے جو شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت قائم ہوا اور آج تک ختم نہیں ہوا جواب ② یا جوج و ماجوج کا فتنہ مراد ہے۔اشکال عرب کی تخصیص کا کیا مطلب ہے۔جواب اس وقت مخاطب عرب تھے اس لئے ان کا نام لیا یا اصل تھے اور عجم بالتبع داخل تھے۔یا جوج ماجوج طبرانی نے لکھا ہے کہ یہ دو امتیں ہیں ہر ایک کے چار لاکھ آدمی ہیں ان میں سے کوئی بھی نہ مرے گا جب تک کہ اس کی ایک ہزار اولاد جوان نہ ہو جائے اس روایت کو بعض نے ضعیف بعض نے موضوع کہا ہے مگر بعض پہلوؤں کی دوسری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے بعض حضرات نے کہا کہ وہ اتنے زیادہ ہیں کہ تمام انسان وجنات انکے دسواں حصہ ہیں یا جوج ماجوج ۹ حصے ہیں بعض نے کہا کہ یہ ۲۲ قبیلے ہیں ۲۱ پہلے دیوار میں بند ہیں ایک قبیلہ باہر ہے ترکی میں بعض نے کہا کہ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تین بیٹے تھے ① سام یہ ابو العرب تھے ② حام یہ سوڈان والوں کے والد تھے ③ یافث یا جوج ماجوج اور ترکی ان کی اولاد ہیں۔بعض نے کہا یا جوج ماجوج بھی آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں بغیر حواء علیہا الصلوٰۃ والسلام کے۔مگر اس کی تردید کی گئی ہے۔بعض نے لکھا ہے کہ ان میں لمبا تین یا چار گز ہیں۔بعض نے کہا کہ ان کا لمبا تین بالشت ہوگا جب یہ نکلیں گے تو پانی خشک ہو جائیں گے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور حضرت مہدی کے پاس ہوں گے ان کے پاس کچھ نہ ہوگا وہ دعا کریں گے اللہ تبارک وتعالیٰ یا جوج ماجوج کو ہلاک کر دے گا اس طرح کہ ان میں کیڑا پیدا ہو جائے گا پھر ان کے مرنے سے بدبو پیدا ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ بارش بھیجیں گے جس سے بدبو ختم ہوگی۔

باب ماجاء فی صفة المارقة

مارقہ خوارج کا ایک فرقہ ہے ان کی صفت کا ذکر ہے''خیر البریۃ''یعنی قرآن کو دلیل میں پیش کریں گے جیسے یہ کہتے تھے ان الحکم الا اللہ۔''یخرج فی اخر الزمان''اشکال یہ فرقہ پہلے ہی نکل آیا تھا آخر الزمان کا کیا مطلب۔جواب ① فی آخر الزمان سے مراد ہے آخر عہد خلافۃ الراشدۃ کہ خلافت راشدہ کے آخری ایام میں پیدا ہوں گے چنانچہ یہ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے پہلے یہ شیعان علی تھے پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے نکلے تھے اور حرورہ میں پناہ لی اور کہا ہم کسی کے حکم کو نہیں مانتے صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی بات مانتے ہیں کیونکہ ان الحکم الا اللہ۔ان میں سے تین آدمیوں نے کہا کہ ہم کس کو قتل کریں گے ایک نے کہا میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دوسرے نے کہا میں عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تیسرے نے کہا میں معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کروں گا ان میں ایک علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل میں کامیاب ہوا دوسرے دو کامیاب نہ ہو سکے۔

باب ماجاء فی الاثرة

''اثر''اپنے آپ کو کسی کام کے ساتھ خاص کرنا، کسی کو ترجیح دینا بغیر مرجح کے۔انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا آپ نے فلاں کو منصب دے دیا ہے مجھے نہیں دیا۔نبی ﷺ نے فرمایا آپ میرے بعد یہ ترجیح دیکھتے رہیں گے میرے زمانے میں یہ نہ ہوگا کیونکہ میں بغیر اہلیت کے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا حق والے کو حق ملے گا۔لیکن میرے بعد ترجیح ہوگی جو اہل ہوگا اس کو حق

نہ ملے گا نا اہل کو ملے گا تو اس میں آپ کی حق تلفی ہوگی تو آپ بغاوت نہ کریں بس صبر کریں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں نے دوسرے کو منصب جو دیا یہ اس لئے نہیں کہ اس کو تم پر ترجیح دی بلکہ وہ اس کا اہل اور حقدار تھا اس لئے اس کو دیا تم اس کے اہل اور حقدار نہ تھے اس لئے آپ کو نہ دیا لیکن میرے بعد کے زمانے میں حق دار کو حق نہ ملے گا بلکہ نا اہل کو منصب دیا جائے گا اس لئے تم صبر کرو مگر بغاوت نہ کرو اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگتے رہو۔ لیکن جب تک ان سے کفر بواح نہ دیکھو ان کی اطاعت سے خروج نہ کرو۔

باب ما اخبر النبی ﷺ بماھو کائن الی یوم القیامة

نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ عصر کی نماز جلدی پڑھائی اور خطبہ دیا اور قیامت تک کے ہونے والے امور کو بیان کر دیا۔ اس خطبے میں یہ بھی فرمایا کہ دنیا میں ظاہری رونق ہے اور ذائقہ ہے اس سے بڑھ کر دنیا نہیں۔ "**ولا غدرة اعظم من غدرة امام عامة**"۔ کہ سب سے بڑا غدر یہ ہے کہ امام غدر کرے لوگوں پر زبردستی مسلط ہو جائے لوگوں پر ظلم کرے یہ بڑا غدر ہے جتنا غدر کرے گا اتنا بڑا جھنڈا اس کی دبر میں گاڑھ دیا جائے گا اور اس کو لے کر پھرے گا یہ غدر کی علامت ہوگی اور ایک قسم کی رسوائی ہوگی دنیا کی نسبت قیامت کے آنے تک جو عدت ہے یہ ایسے ہے جیسے دن کی بنسبت مغرب تک کا وقت باقی ہے یعنی زیادہ گزر گیا ہے تھوڑا رہ گیا ہے اسی طرح دنیا بھی زیادہ گزر گئی ہے کم رہ گئی ہے مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب ہے۔

باب ماجاء فی اهل الشام

اس میں علامت قیامت ہیں اس لئے اس کو یہاں ذکر کر دیا ورنہ یہ قبائل کے فضائل میں حدیث آئے گی۔ "اذا فسد اہل الشام" جب اہل شام میں بگاڑ پیدا ہو جائے پھر تمہارے لئے کوئی خیر نہیں کہ تم پھر شام میں ٹھہریں شام چونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سرزمین ہے اس کے بارے میں۔ "بارکنا حولہ" اس میں ظاہری برکات بھی ہیں اور باطنی بھی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مسکن رہا ہے اس میں قبلہ اولیٰ بھی ہے۔ اکثر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آئے ہیں اور اکثر وہاں پر دفن ہیں حشر ونشر وہاں ہی ہوگا اب ایسی بابرکت جگہ میں بگاڑ آ جائے تو وہاں رہنے میں کوئی خیر نہیں کوئی فائدہ نہیں احادیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا کہ فتن میں کہاں جائیں آپ ﷺ نے شام کی طرف اشارہ کیا یہ تب ہے جب وہاں بگاڑ نہ ہو لیکن بگاڑ آ جائے پھر وہاں فائدہ نہیں جیسے آج وہاں بگاڑ ہے آج شام کا حافظ الاسد نوسیریہ فرقے کا ہے جو بدترین فرق شیعہ میں سے ہے شام جو تقسیم ہو گیا ہے اس میں شیاطین حکمران مسلط ہیں بلکہ تمام عرب ممالک کے حکمران اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ "لاتزال طائفۃ" ایک طائفہ ہمیشہ منصور رہے گا ان کی کوئی مدد چھوڑ دے اس سے ان کو نقصان نہ ہوگا یہ طائفہ قیامت تک رہے گا یہ طائفہ منصورہ کسی کے ساتھ خاص نہیں کہ وہ محدثین ہی میں ہو بلکہ مجاہدین، مبلغین، محدثین اور فقہاء اور تمام دین کے کام کرنے والوں میں سے ہوں گے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کام کے لئے جس کو تیار کر دے یہ اسی کا کام ہے اس لئے طائفہ منصورہ کسی خاص جماعت میں نہیں ہوگا۔

باب لاترجعوا بعدی کفارًا الخ

میرے بعد یعنی میرے وفات کے بعد یا میرے اس وقوف کے بعد کفر کے طرف واپس نہ لوٹیں کہ ایک دوسرے کو قتل کریں "لاترجعوا بعدی کفاراً" کا معنی یہ ہے کہ میرے بعد تم کفار والا عمل نہ کرو کہ ایک دوسرے کو مارو کیونکہ ایک دوسرے کو مارنا کفار کا عمل ہے یا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد ایک دوسرے کے قتل کو حلال نہ سمجھیں کہ کافر ہو جائیں۔

باب ماجاء تكون فتنة القاعد فيها خير من القائم

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک فتنہ ہوگا اس میں جو بیٹھا رہا یہ بہتر ہوگا اس سے جو فتنے میں کھڑا ہے یا مطلب ہے کہ جو کنارہ کش ہے وہ بہتر ہے اس سے جو فتنے کو دیکھنے کے لئے کھڑا ہے اور جو کھڑا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو فتنے کی طرف چل کر جا رہا ہے اور جو چل رہا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو فتنے کی طرف دوڑ رہا ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ اگر اہل فتنہ مجھے قتل کرنے آئیں تو میں کیا کروں آپ ﷺ نے جواب دیا آپ فتنہ سے دور رہیں اور ابن آدم ہابیل کی طرح ہوں کہ اس نے کہ ﴿ما انا بباسط يدى اليك لاقتلك﴾۔ کیونکہ یہ فتنہ مسلمانوں کے درمیان میں تھے اس میں اجتہادی خطاء تھی دونوں اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اب معلوم نہیں کہ کون حق پر ہے اس صورت میں فتنہ کا سبب نہ بنیں لیکن اگر معلوم ہو کہ فلاں حق پر ہے پھر اس کا ساتھ دو قرآن پر عمل کرنے کے لئے کہ حتیٰ تفئی الیٰ امر اللہ۔

باب ماجاء ستكون فتنة كقطع الليل المظلم

نیک اعمال کریں قبل اس کے کہ فتنہ آجائے جو اندھیری رات میں گہری بادل کی طرح ہوگا اسمیں بہت جلدی تبدیلی ہوگی آدمی دین کو معمولی پیسوں سے دنیا کے بدلے میں فروخت کردے گا۔ ''یارب کاسیۃ'' یہاں منادی محذوف ہے یعنی للمسلين رب كاسية۔

باب ماجاء في الهرج

''ہرج'' بمعنی فتنہ حدیث میں اس کا معنی قتل سے کیا ہے ظاہر قتل ایک بہت بڑا فتنہ ہے نبی ﷺ نے فرمایا کہ آپ کے بعد ایسا وقت آئے گا کہ علم اٹھالیا جائے گا اور قتل عام ہو جائے گا آج کل یہ دونوں موجود ہیں جوں جوں قرب قیامت ہو رہا ہے ان چیزوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور مزید اضافہ ہوتا رہے گا کیونکہ یہ نبی ﷺ کی پیشن گوئی ہے اور وہ اصدق القائلین ہیں اس لئے یہ چیزیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ دوسری روایت میں ہے قتل وقتال کے زمانے میں اپنے آپ کو بچانا ایسا ثواب ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنے کا ثواب ہے کیونکہ فساد کے زمانے میں لوگ عبادات میں مشغول ہو جاتے ہیں اس لئے اس موقع پر عبادت کی فضیلت بیان کی گئی۔

باب ماجاء في اتخاذ السيف من خشب

فتنے کے زمانے میں قتل سے دور رہنے کو تعبیر اس سے کیا کہ لکڑی کی تلوار بنالو۔ یعنی ایسے فتنوں سے دور رہو روایت میں ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا غدیسۃ کے والد اھبان بن صیفی کو کہ آپ میرے ساتھ نکلیں کیونکہ میں حق بجانب ہوں تو ان سے میرے والد نے کہا کہ میرے دوست اور آپ کے چچازاد بھائی نے وصیت کی تھی کہ لوگ جب اختلاف کریں تو لکڑی سے تلوار بنالو یعنی الگ تھلگ ہو جائیں۔

باب ماجاء في اشراط الساعة

قیامت کی علامات میں سے ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا اور جہل زیادہ ہو جائے گا زنا عام ہو جائے گا شراب عام پیا جائے گا عورتیں زیادہ ہو جائیں گی مرد کم ہو جائیں گے یہاں تک کہ ۵۰ عورتوں کا ایک نگران ہوگا۔ یکثر النساء سے کیا مراد ہے ① بعض نے کہا جہاد عام ہوگا اس میں مرد مارے جائیں گے۔ ② بعض نے کہا لڑائی جھگڑے زیادہ ہوں گے مرد مارے جائیں گے۔ ③ مگر صحیح یہ ہے کہ قیامت کی علامات ہے کہ عورتوں کی پیدائش زیادہ ہوگی۔ ''حتیٰ یکون الخمسین'' ۵۰ کی تعداد متعین نہیں کیونکہ بعض روایات میں اربعین کا ذکر بھی ہے اسلئے عدد سے کثرت مراد ہے متعین عدد مراد نہیں: ''مامن عام الا والذى بعده شر منه'' ۔اب ہر سال تبدیلی اس طرح

آئی فتح الباری میں ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مجرم کی سزا پگڑی اتارنا تھی بعد میں مزید سزا بڑھ گئی پھر آہستہ آہستہ کوڑوں تک سزا پہنچی اور حجاج بن یوسف نے کہا کہ کوڑے کیا سزا ہیں اس لئے اس نے قتل کرنا شروع کر دیا اس لئے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لوگوں نے شکایت کی انہوں نے کہ کہ اس کے بعد اور بھی ایسے برے لوگ آئے جائیں گے۔ اشکال حجاج بن یوسف کے بعد عمر بن عبدالعزیز آئے وہ تو بہتر تھے؟ جواب ① مسلسل سخت زمانہ ہوتا تو لوگ تنگ آجاتے اس لئے سانس لینے کا موقع دیا: جواب ② یہ حکم مجموع من حیث المجوع ہے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ اکیلے اچھے تھے لیکن ان کے علاوہ کے لوگ حجاج کے زمانے کے لوگوں سے بدتر تھے: جواب ③ خیر القرون کا زمانہ مراد ہے جس میں علم کا دور دورہ تھا اور یہ علم کا دور حجاج کے زمانے میں تھا جب کہ علم کے اعتبار سے عمر بن عبدالعزیز کا دور بدترین تھا۔ حجاج بن یوسف کے زمانے کی بنسبت۔

باب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میری امت میں ۱۵ باتیں آجائیں گی تو ان پر عذاب نازل ہوگا وہ عذاب کے مستحق ہو جائیں گے کسی نے ۱۵ اشیاء کو دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اذا کان المغنم دولا" یعنی قوت اور طاقت جن کے پاس ہے وہ دوسروں کے حقوق چھینتے رہیں گے اور ایک ہی قوم کے درمیان وہ مال گھومتا رہے گا۔ ② امانت میں لوگ اس طرح خیانت کو حلال سمجھیں گے جیسے مال غنیمت ہے ③ زکوۃ کو لوگ ٹیکس اور تاوان سمجھیں گے۔ ④ آدمی بیوی کی اطاعت کرے گا اس کی بات مانے گا۔ ⑤ دوست سے احسان کرے گا اور باپ کی حق تلفی اور نافرمانی کرے گا اس کو دور کرے گا۔ ⑥ مساجد میں آوازیں بلند ہونا شروع جائیں گی یہ آج کل عام ہے خصوصاً بدعتیوں کی مساجد میں عام ہے۔ ⑦ قوم کا لیڈر سب سے رذیل ترین آدمی ہوگا جیسے آج کل ہے کہ آج کل کے حکمرانوں میں ہر قسم کی ذلت و رسوائی پائی جاتی ہے۔ ⑧ آدمی کی عزت اس کے ڈر کی وجہ سے کی جائے گی تا کہ اس کا اکرام کر کے اس کی شر سے بچ جاؤ۔ ⑨ شراب عام ہوگا۔ ⑩ مرد بغیر ضرورت کے ریشم استعمال کریں گے۔ ⑪ لوگ باجے گانے والی عورتیں ان کو لوگ گھروں میں رکھیں گے۔ فخری طور پر ⑫ آخری زمانہ میں کچھ آئیں گے وہ پہلے والوں پر لعنت کریں گے جیسے روافض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں بعض شیعہ نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نعوذ باللہ مرتد کہا بعض نے طواغیت کہا۔ اور آج تو گالیوں میں مزید ترقی ہو رہی ہے اسی طرح جماعت المسلمین میں ان کے علاوہ کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ جب یہ چیزیں ظاہر ہو جائیں تو لوگ عذاب کا انتظار کریں کہ گرم ہوا آئے یا حسف ہوگا یا مسخ ہو جائے گا۔ دوسری روایت میں ہے۔ ⑬ تیرھویں چیز ہے کہ ① دینی علم دین کے لئے نہ ہوگی بلکہ کسب و معاش کے لئے ہوگی۔ ② دینی تعلیم کے بجائے دنیاوی تعلیم حاصل کریں گے دینی تعلیم حاصل نہ کریں گے۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت انا والساعۃ کھاتین

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرب قیامت کے متعلق دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا کہ میرے اور قیامت کے دن اتنا فرق ہے جتنا سبابہ اور وسطی میں فرق ہے بعض نے کہا اتصال کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان انگلیوں کے درمیان تیسرا خلل نہیں اسی طرح میرے بعد قیامت آئے گی درمیان میں اور کوئی نبی نہ آئے گا۔

باب ماجاء فی قتال الترک

"نعالھم الشعر" جن کے جوتے اور چپل اون کے ہوں گے یہ ان کی علامت ہوگی یا یہ کنایہ ہے طول شعر سے کہ بڑے بڑے بال ہوں گے کہ پاؤں تک پہنچے گے۔ "المجان" ان کے چہرے گول ہوں گے۔ "المطرقۃ" کوٹے ہوئے گوشت سے بھرے ہوئے۔

باب ماجاء اذا ذهب کسریٰ فلا کسریٰ بعده

نبی اکرم ﷺ کی پیشن گوئی ہے کہ کسریٰ جب ختم ہوجائے گا تو کسریٰ لقب کا کوئی حکمران نہ آئے گا اور ایسا ہی ہوا کہ کسریٰ کی حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہوئی تو اس لقب کا کوئی بادشاہ نہیں آیا شام وفارس کے بادشاہ کو کسریٰ اور روم، عراق وغیرہ کے بادشاہ کو قیصر کہتے تھے اس وقت کی یہ بڑی حکومتیں تھیں۔ انہوں نے دنیا کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح جب قیصر ہلاک ہوجائے تو اس لقب کا کوئی آدمی نہ آئے گا خدا کی قسم ان دونوں بادشاہوں کے خزانے اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں خرچ کئے جائیں گے یہ باوجود عدم استطاعت کی ایسی پیشن گوئی بظاہر بالکل محال ہے کہ اسباب کے نہ ہوتے ہوئے اتنی سپر طاقتوں کو کس طرح شکست دیں گے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی سے بتایا تھا اس لئے یہ بات ہوئی کہ ان کو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے شکست ہوئی اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور اس کے بعد ان القاب والے بادشاہ نہیں آئے۔ اشکال فارسیوں اور رومیوں کی حکومت کچھ تو باقی رہ گئی تھی۔ جواب ① یہ ہے کہ جیسی حکومت اب ہے ایسی نہ رہے گی کسریٰ کی بالکل حکومت ختم ہوئی اور قیصر کی بھی عراق سے ختم ہوگئی ② اس کے بعد اس لقب کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا تو حکومتیں مراد نہیں بلکہ مراد ہے کہ قیصر وکسریٰ نہ رہیں گے۔

باب لاتقوم الساعة حتیٰ تخرج نار من قبل الحجاز

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موت یا اس کے سمندر کی طرف سے آگ آئے گی یہ لوگوں کو حشر کی طرف جمع کرے گی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا ہم کیا کریں فرمایا تم شام چلے جاؤ کیونکہ وہاں حشر ونشر قائم ہوگا۔

اشکال۔ باب میں حجاز سے آگ کا ذکر ہے جب کہ حدیث میں حضرموت سے آگ کا ذکر ہے۔ جواب ① وفی الباب عن فلان ان میں جو روایات ہیں ان میں حجاز کا ذکر ہے۔ جواب ② بعض جگہ یمن بھی ہے اور یمن اور حضرموت حجاز کی جہت میں ہیں تو یمن سے چل کر حضرموت سے گزر کر حجاز پہنچے گی تو کوئی تضاد نہیں راویوں میں اختلاف باعتبار ابتداء اور انتہاء کے ہے۔

باب لاتقوم الساعة حتیٰ یخرج کذابون

قیامت سے پہلے کذاب نکلیں گے پھر قیامت قائم ہوگی یہ تقریباً ۳۰ ہوں گے ہر ایک ان میں سے نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا روایات میں زیادہ تر ۳۰ کا ذکر آتا ہے بعض میں سبعون کا ذکر ہے وہاں کثرت مراد ہے کہ نبوت کے دعویٰ کرنے والے کثیر ہوں گے جن کا لوگوں کو علم ہوجائے گا وہ تیس ۳۰ کے قریب ہوں گے اور جن کا علم لوگوں کو نہ ہو وہ تو کثیر ہوں گے لیکن جن کے متبع لوگ ہوں گے وہ ۳۰ ہوں گے۔

باب ماجاء فی ثقیف کذاب ومبیر

ثقیف قبیلہ میں ایک کذاب پیدا ہوگا ایک ہلاک کرنے والا ظالم پیدا ہوگا کذاب کہتے ہیں مختار بن ابی عبید تھا پہلے یہ علم وفضل میں مشہور ہوا تھا ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے واسطہ تھا پھر جدا ہوگیا اور اپنی امارت کا مطالبہ کیا اس کے باطن میں ایسے عقائد تھے کہ ان کو ظاہر نہیں کرتا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ باطن کھلتا گیا اور جھوٹ اور باطل عقائد سے یہ مشہور ہوگیا۔ مبیر حجاج ابن یوسف تھا اس نے بغیر جرم وگناہ کے ایک لاکھ ۳۰ ہزار کے قریب لوگوں کو قتل کیا۔

باب ماجاء فی القرن الثالث

قرن ثالث دوسری میں راوی نے شک کیا ہے اس لئے اس نام سے باب باندھا ورنہ تینوں قرون کا ذکر موجود ہے فرمایا بہترین میرا زمانہ ہے نبی ﷺ اور صحابہ کا دور تھا ۱۲۰ھ تک یہ دور رہا۔ ابوطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے آخر میں فوت ہوئے اور ایک روایت میں وہ ۱۲۰ھ کو فوت ہوئے تو قرن اول ختم ہوگیا دوسرا دور تابعی حضرات کا تھا تقریباً ۱۸۰ھ تک جاری رہا آخری تابعی تقریباً ۱۸۰ھ میں وفات پائے ہیں: اور قرن ثالث اتباع تابعین کا ہے یہ تقریباً ۲۲۰ھ میں ختم ہوگیا بعض نے کہا ۲۳۰ھ میں یہ دور ختم ہوا ایک روایت میں ہے ۲۵۰ھ تک اصل میں اختلاف ہے کہ آخری اتباع تابعین کب وفات پائے اس میں یہ مختلف اقوال ہیں ۲۲۰، ۲۳۰، ۲۵۰ مشہور ۲۲۰ ہے: فرمایا اس کے بعد لوگ پیدا ہوں گے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی کوشش کریں گے مال میں عزت میں اور ہر چیز میں بڑا بننے کی کوشش کریں گے یا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے میں توسع کریں گے تاکہ موٹے ہو جائیں تو دنیا کی چیزوں میں بڑھنے کی کوشش کریں گے اسی طرح جھوٹی گواہیاں دیں گے" ولا اعلم اذکر الثالث ام لا" یہاں راوی نے شک کے ساتھ نقل کیا ہے مگر دوسری صحیح روایات میں بغیر شک کے ہے۔ "ویحبون السمن "، یعنی اپنے بدن کو موٹا کرنے کے لئے اور اپنے نفس کے لئے کوشش کرتے ہیں اور مختلف قسم کے کھانے کھائیں گے صرف اپنے جسم کو موٹا کرنے کے لئے نماز نہیں پڑھیں گے لیکن صبح سویرے چہل قدمی کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی الخلفاء

نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد بارہ امیر ہوں گے پھر کوئی بات کی مگر جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ سمجھ سکے انہوں نے دوسرے سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ سارے قریش سے ہوں گے اس میں اختلاف ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خلفاء اربعہ اور عمر بن عبدالعزیز اور ان کے بعد عادل خلفاء آئیں یا آچکے ہیں وہ مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ توصیف کے لئے نہیں ہے ہاں مدح نہیں بلکہ مراد ہے کہ اس وقت تک حکومت باقی رہے گی تو یہ بنوامیہ کے خلفاء ہوں گے جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد گزرے تھے۔ لیکن جمہور کے ہاں وہ خلفاء مراد ہیں جن پر سب لوگ متفق تھے یعنی خلفاء اربعہ (۵) معاویہ، (۶) یزید، (۷) عبدالملک بن مروان پھر اس کے چار بیٹے، (۸) ولید، (۹) سلمان، (۱۰) یزید، (۱۱) ہشام ابن ولید، اور عمر بن عبدالعزیز ان کے زمانے میں مسلمان آپس میں متفق تھے سب نے ان کے خلافت پر اجماع کیا تھا ان کے بعد یزید ابن الولید وغیرہ آئے مگر ان کی حکومت قائم نہ رہ سکی آپس میں لڑتے رہے یہاں تک کہ بنو عباس خلفاء بنے اور مروانیوں نے مغرب کی جانب اپنی حکومت بنالی تو بعد میں اتفاق نہ ہو سکا متفقہ دور صرف ان بارہ خلفاء کا تھا تو نبی ﷺ کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی شیعہ کہتے ہیں اس سے ہمارے بارہ امام مراد ہیں نمبر ۱۱ ہو گئے ہیں ایک باقی رہ گیا ہے جو چھپا ہوا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بیک وقت بارہ آدمی امیر منتخب ہوں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایسے بارہ امیر جس پر تمام مسلمان متفق ہوں گے۔

باب ماجاء فی الخلافۃ

خلافت علی منہاج النبوۃ کا یہاں ذکر ہے نبی ﷺ نے فرمایا، ۳۰، سال تک خلافت رہے گی یعنی جو علی منہاج النبوۃ ہو پھر بادشاہت ہوگی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت ۲ سال چند ماہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دس سال ۶ ماہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت تقریباً ۱۳ سال تھی اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریباً ۶ سال تھی تو کل تیس ۳۰ سال بنتی ہے حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ۶ ماہ ملا کر۔ "قال کذبوا بنو

الزرقاء" زرقاء ان کی خاندان کی بڑی دادی ہے فرمایا یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ بنوامیہ اگر اپنے آپ خلیفہ کہیں تو یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ نہ تھی۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خلافت میں کوئی معاہدہ نہیں کیا یعنی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وصیت نہ کی تھی بلکہ یہ شیعہ جھوٹ بولتے ہیں۔

باب ماجاء ان الخلفاء من قریش

یہاں حق کا ذکر ہے کہ خلافت قریش کا حق ہے کوئی قریش قیامت تک ہو وہ خلافت کا زیادہ حق دار ہے۔ کسی نے عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ قریش فسق وفجور ومعاصی سے رک جائیں اگر رکتے نہیں تو اللہ یہ خلافت کا امر کسی اور کو دے دے گا جو اچھا نیک ہوگا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم جھوٹ بولتے ہو نبی ﷺ نے فرمایا قریش ولاۃ ہیں خلفاء ان میں رہیں گے یعنی اہل الرائے مسلمانوں کے امیر منتخب کریں تو قریش ہی کو کریں گے اگر کوئی زبردستی حکومت لے لے یہ الگ بات ہے ورنہ حق دار قریش ہی ہیں یہ جھگڑا ختم کرنے کے لئے کہا ورنہ ہر آدمی کہے گا کہ ہمارا آدمی ہونا چاہئے تو لڑائی ہوگی اس لئے ایک قبیلہ متعین کر دیا۔ "لا یذھب اللیل والنھار" رات دن ختم ہوگی یعنی قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ موالی سے جہجاہ نامی بادشاہ بنے گا یہ قیامت کی علامت ہے حق تو قریش کا تھا مگر یہ زبردستی بنے گا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ ہوسکتا ہے عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد یہ اترے۔ اشکال یہاں ہے "قریش ولاۃ الناس فی الخیر والشر" جب کہ نبی ﷺ نے کبھی اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کبھی زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنایا ایک جگہ فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو بات مانو اگرچہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اور وہ ہو بھی ناقص الخلقۃ۔ جواب یہ والی اعظم قریش سے ہوگا لیکن والی اپنے ماتحت کسی کو منتخب کرلے یہ مراد نہیں یہ ہوسکتا ہے ایک جگہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ بناؤ تو عبیدہ بن جراح کو بناؤں گا وہ نہ تھے تو کہا معاذ بن جبل کو بناؤں گا جب کہ یہ قریش نہ تھے۔ جواب ② حق قریش کا ہے اس پر اجماع ہے لیکن پہلے اختلاف تھا اجماع اس بات کے بعد منعقد ہوا تھا بعض نے کہا کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے بدل گئی ہوگی۔ جواب ③ عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت بیان کرنا مقصد تھا۔

باب ماجاء فی آئمة المضلین

میں اپنے امت پر مضل آئمہ سے ڈرتا ہوں۔ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے جیسے آج کل ہم پر مسلط ہیں لیکن ایک جماعت قیامت تک قائم علی الحق ہوگی جو ان کی گمراہیاں واضح کرتی رہے گی۔

باب ماجاء فی المهدی

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا دنیا اس وقت تک قائم رہے گی یہاں تک کہ ایک عربی جو اہل بیت سے ہوگا اس کا نام میرے نام کی طرح ہوگا وہ بادشاہ بنے گا ایک روایت میں ہے اس کی والد کا نام میرے والد کی طرح ہوگا یہ سات سال تک رہے گا اور قرب قیامت میں نکلے گا۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان روایات میں صحیح ہے ورنہ کل ۵۰ مرفوع ۲۰ آثار اس کے بارے میں منقول ہیں اس لئے اہل سنت کا اجماع ہے کہ مہدی آئیں گے اہل بیت میں سے ہوں گے جب مسلمان کمزور ہوں گے فسق وفجور عام ہوگا تو مسلمانوں کی مدد کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اتاریں گے عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بعد میں آئیں گے اور مہدی کی اقتداء میں نماز ادا کرین گے۔

باب ماجاء فی نزول عیسیٰ بن مریم

عیسیٰ کا نزول ہونا قریب ہے فیصلہ کرنے والے ہوں گے عدل کے ساتھ صلیب کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کردیں گے کیونکہ اس وقت کافر کوئی نہ ہوگا مال زیادہ ہو جائے گا کہ لینے والا بھی کوئی نہ ہوگا یہ علامات قیامت میں سے ہے یہ مہدی کے بعد آئیں گے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اس لئے بعد میں طبعی موت آئے گی اس لئے یہ آنے کی حکمت ہے دوسری ان کے نزول کی حکمت عیسائیوں کی تکذیب ہے کہ سولی پر نہیں چڑھائے گئے بلکہ زندہ ہیں۔

باب ماجاء فی الدجال

فتنہ دجال کا ذکر ہے خروج دجال علامات قیامت میں سے ہے مختلف روایات نقل کی ہیں پہلی روایات میں ہے کہ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دجال کے فتنے سے قوم کو ڈرایا تھا اگرچہ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ڈرایا تھا مگر چونکہ باقی انبیاء نے شدت سے ڈرایا تھا اس لئے نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام نہیں لیا بلکہ فرمایا کہ ان کے بعد کے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے ڈرایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی تم کو ڈراتا ہوں پھر اس کے اوصاف بتائے اور فرمایا شاید اس کو وہ لوگ دیکھ لیں جو میرے صحابہ ہیں یا وہ مسلمان دیکھ لیں جن کو حدیث پہنچی ہوگی یہ قیامت تک سماع احادیث کا سلسلہ جاری رہے گا تو جب بھی آیا احادیث سننے والے ہوں گے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا ہمارے دل کیسے ہوں گے فرمایا آپ کے دل آج کی طرح ہوں گے بلکہ اس سے بھی بہتر ہوں گے اور مومن اس فتنے سے متاثر نہ ہوگا۔
''سأقول فیہ قولا'' میں اسکے اوصاف میں ایسی بات ذکر کروں گا جو دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے نہیں بتائی ① کہ تم جانتے ہو وہ اعور ہے جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اعور نہیں کیونکہ اعور ہونا عیب ہے جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عیوب سے پاک ہے۔
''تعلمون انہ لن یریٰ'' ایک مرتبہ اس فتنے سے ڈرایا ② کہ تم کو شک نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کہے گا کہ میں رب ہوں جب کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں کوئی بھی رب کو نہیں دیکھ سکتا اس لئے اس کی بات غلط ہوگی رب ہوتا تو دنیا میں نظر کہاں آتا اس لئے وہ جھوٹا ہے رب نہیں۔ ③ تیسری علامت یہ ہے کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا کافر بعض احادیث میں ہے لکھا گیا ہوگا۔ ک، ف، ر۔ یہ لکھا ہو صرف وہ شخص پڑھے گا جو اس کے دجل کو جانتا ہوگا لیکن کافر لوگ نہ پڑھ سکیں گے صرف مؤمن پڑھ سکیں گے اگرچہ وہ اُمی ہی کیوں نہ ہو مگر پڑھ لے گا۔
اعتراض دجال کا اتنا بڑا فتنہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی امتوں کو ڈرایا تو اس کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں ہے؟ دوسرا انبیاء نے کس طرح امتوں کو ڈرایا جب کہ یہ قرب قیامت میں ہوگا۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علم میں نہ تھا کہ کس زمانے میں آئے گا صرف یہ اللہ نے بتایا تھا کہ یہ آدمی آئے گا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پہلے نہ بتایا گیا تھا کہ کب آئے گا بلکہ بعد میں بتایا گیا کہ قیامت کے قریب آئے گا۔ باقی رہا پہلا اعتراض اس کا جواب ① یہ ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے ﴿یوم یأتی بعض آیات ربک﴾ کتاب التفسیر میں ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ آیات طلوع الشمس نزول عیسیٰ اور خروج دجال ہیں مگر تصریح پھر بھی نہیں۔ جواب ② قرآن میں ہے ﴿ان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ﴾ اس میں عیسیٰ کے آنے کا ذکر ہے اسی طرح فرمایا انہ لعلم للساعۃ کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کی علامت ہیں اب جہاں مسیح الہدیٰ کا ذکر ہے تو ان کا مقابل مسیح الدجال کا ذکر ضمناً آگیا کیونکہ دونوں میں تقابل ہے جواب نمبر ۳ دو قسم کے فتنے ہیں ایک وہ ہیں جو آئیں گے اور بعض پہلے واقع ہو چکے ہیں قرآن میں ان کا ذکر ہے جو ہو چکے ہیں مگر یہ صحیح نہیں یاجوج ماجوج بعد میں آئیں گے جب کہ قرآن میں ذکر ہے۔ یا جواب ③ یہ ہے کہ

دجال کو حقارت کیوجہ سے نہیں لایا مگری صحیح نہیں کیونکہ شیطان یا جوج ماجوج بھی حقیر ہیں مگران کا ذکر لایا ہے جواب ④ ﴿لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس﴾ یہاں سے دجال مراد ہے۔

باب ماجاء من این یخرج الدجال

دجال کا بڑا فتنہ ہے اس کی ابتداء کہاں سے ہوگی اس کا ذکر ہے کہ مشرق سے نکلے گا خراسان کے ملاقے سے گویا عراق اور ماوراء النہر کا سارا علاقہ مراد ہے کیونکہ یہ علاقہ خراسان کہلاتا ہے بعض روایات میں اصفہان کا ذکر ہے بعض میں ہے کہ ۷۰ ہزار یہودی اس کے ساتھ ہوں گے فرماتے ہیں تعارض نہیں کیونکہ نکلے گا خراسان سے اور اس کے فتنے کا ظہور دوسری جگہوں میں ہوگا۔ ''یتبعہ اقوام'' اس کے پیچھے ایسی قوم چلے گی جس کے چہرے گول ہوں گے بھرے ہوئے جیسے چین کے لوگ عن ابی بکر بن الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال حدثنا یہ حدثنا قال کے لئے تاکید ہے یا معنی ہے اور باتیں بھی کیں ان میں سے یہ بات بھی بیان کی۔

باب ماجاء فی علامات خروج الدجال الخ

کچھ علامتیں ظاہر ہوں گی جن سے معلوم ہوگا کہ دجال کا خروج اب قریب ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جنگ عظیم ہوگی دنیا پر اس میں قسطنطنیہ فتح ہوگا اور پھر دجال نکلے گا یہ تینوں چیزیں سات ماہ میں ہوں گی بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح السنۃ میں لکھا ہے سات سال کا ذکر ہے تطبیق یہ ہے کہ قوی روایت کو لیں گے اور قوی ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ والی ہے بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو ذکر کی ہے وہ ضعیف ہے اس لئے تعارض نہیں کیونکہ تعارض تب ہوتا جب دونوں ایک مرتبے کی ہوں۔ قسطنطنیہ دو دفعہ فتح ہو چکا ہے ۵۰ھ میں پھر ۸۰۰ھ میں اور پھر قرب قیامت میں فتح کیا جائے گا بعض نے کہا یہ دو شہر ہیں یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا دوسرا قرب قیامت میں فتح ہوگا مگر صحیح یہ ہے کہ ایک شہر ہے۔

باب ماجاء فی فتنة الدجال

''فخفض فیہ ورفع'' دجال کے معاملے کو معمولی بیان کیا، وَرَفّع اور قصے کو بڑے انداز میں بھی بیان کیا مگر تحقیر بیان کی۔ ② آواز کو پست کیا پھر بلند کیا۔ بعید العزی ابن قطن یہ یہودی تھا دجال اسکے مشابہ ہوگا یا زمانہ جاہلیت میں ایک مشرک تھا دجال اس کے مشابہ ہوگا۔

''فلیقر افواتح سورۃ اصحاب الکھف'' جس طرح اصحاب کہف کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتنے سے بچایا اسی طرح یہ آیت پڑھنے سے آپ کو بھی اللہ فتنے سے بچائیں گے ''کیعاسیب النحل'' اصل میں النحل الیعاسیب جس طرح شہد کی مکھیاں اپنی سردار کے پیچھے چلیں گے۔

اتنا بڑا فتنہ ہے کہ اس سے بہت عجیب خرق العادۃ کام سرزد ہوں گے ''یضحک'' اس کے فعل پر ہنستا ہوگا کہ مجھے اسلام سے پھیر نہیں سکتے تمہارا مجھ پر اثر نہیں چل سکتا۔ اب یہ آدمی کون ہوگا جس کو دجال دو ٹکڑے کرے گا تو کہتے ہیں۔ ① کہ اصحاب کہف میں سے کوئی جوان ہوگا۔ ② بعض کہتے کہ حضر علیہ السلام ہوں گے مگر اس کی کوئی صحیح سند نہیں اس لئے کوئی بھی جوان ہوسکتا ہے جو مضبوط ایمان والا ہوگا۔ ''مھر ودتین'' دو چادریں ہوں گی زعفران کے رنگ کی، بعض نے کہا کہ مہر ود ایک پودا ہے زعفرانی رنگ کا۔

''اذھبط عیسیٰ بشرقی دمشق عند المنارة'' یہاں یہ ہے جب کہ بعض جگہ ہے اردن میں اتریں گے بعض میں ہے معسکر المسلمین میں اتریں گے۔ بعض میں ہے بیت المقدس میں اتریں گے تو تعارض ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کا معسکر بھی ہے۔ جن روایات میں اردن آیا ہے تو یہ پورا علاقہ اردن ہے، دمشق کا مشرقی حصہ کہا تو بیت المقدس بھی مشرقی دمشق میں ہے۔ ''عند لمنارۃ البیضاء'' کہتے ہیں بیت المقدس سے دور ایک منارہ ہے، بعض نے کہا ہے بنایا جائے گا جس پر اتریں گے۔

"لایجد ریح نفسه" عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سانس جہاں تک پہنچے گی اس سے کفار مرجائیں گے اور ان کی سانس کی ہوا وہاں تک پہنچے گی جہاں تک نظر پہنچتی ہے تو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ تھا کہ مردے زندہ کرتے تھے اب یہ معجزہ دیا جائے گا کہ ان کی سانس سے زندہ مرجائیں گے دجال ان کو باب لد پر ملے گا وہی دجال کو قتل کریں گے۔ "قد انزلت عبادلی" ای اظہرت کیونکہ وہ دنیا میں موجود ہیں اس لئے انزال سے ان کا ظاہر کرنا مراد ہے۔ "یوسل اللہ علیہم النغف" نغف ایک کیڑا ہے یہ جانوروں کی گردن میں پیدا ہوتا ہے تو یاجوج ماجوج کی گردن میں کیڑا پیدا ہوگا جس سے سارے مرجائیں گے۔ "فقتلها کا الزلفة" شیشے کی طرح بنا دے گی۔

باب ماجاء فی صفة الدجال

یعنی اس کی الوہیت میں شبہ نہیں ہونا چاہئے یہ الٰہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ اعور ہوگا جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر عیب سے پاک ہیں۔ اعور عینہ الیمنی، دوسری جگہ یسریٰ کا ذکر ہے تو یہ تعارض ہے؟ جواب عین یمنیٰ بالکل کانی ہوگی اور بائیں آنکھ بھی عیب دار ہوگی۔

باب ماجاء فی ان الدجال لایدخل المدینة

دجال کا فتنہ حرمین کے علاوہ ہر جگہ ہوگا حرمین کی حفاظت اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے فرمائیں گے اس کا یہاں ذکر ہے کہ مدینہ کے قریب احد کے پیچھے آجائے گا بعض روایات میں ہے جرف تک آجائے گا کہ دجال لشکر کے ساتھ مدینہ کے حدود میں ان اطراف تک آجائیں گے فرشتے کو دیکھیں گے جو صفات کرتے ہوگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے اس شہر میں طاعون اور دجال، داخل نہ ہوں گے۔ ان شاء اللہ بعض نے کہا کہ یہ تعلیق کے لئے ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ محض تبرک کے لئے ہے دوسری روایت اہل یمن کی فضیلت کا ذکر ہے کہ ایمان یمن ہی کا ہے اہل یمن سے کیا مراد ہے اس میں اقوال ہیں ① اس سے اہل مکہ مراد ہیں کیونکہ تہامہ کو اہل یمن ہی کہا جاتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی محنت مکہ ہی میں کی۔ ② اہل حرمین مراد ہیں تبوک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور حرمین کی طرف اشارہ کیا تھا ③ انصار مراد ہیں کیونکہ انصار اصل میں یمن کے رہنے والے تھے پھر ہجرت کر کے مدینہ آگئے، لیکن بعض روایت میں تصریح ہے کہ انصار اور مہاجرین سے کہا "جاءکم اہل یمن" تو اہل یمن سے خاص یمن کے لوگ مراد ہیں اہل حرمین یا انصار مراد نہیں "والکفر من قبل المشرق"، بعض جگہ ہے راس الکفر من قبل المشرق۔ مراد عرق خراسان اور روس کے علاقے ہیں ہم بھی مشرقی حصے میں رہتے ہیں فرمایا کہ فتنے (جیسے یاجوج ماجوج وغیرہ) یہاں ہی سے اٹھیں گے۔ بعض نے کہا یہ خاص مجوسیوں کی حکومت کی طرف اشارہ ہے جو فارس میں تھے اور مجوسیوں کا کفر بدترین ہے تو یا فتنے کا ذکر ہے یا کفر کا ذکر ہے۔

"والسکینة لاهل الغنم"، عجز بکریوں والوں میں ہے ان میں تکبر نہیں ہوتا فخر ریاء اور تکبر آوازیں نکالنے والوں میں ہے جو گھوڑے اور اونٹوں کو پالنے والے ہیں اصل میں ماحول کا اثر ہوتا ہے اغنام کمزور حیوان ہے اس لئے اس کے پالنے والے میں بھی عجز ہوتا ہے اونٹ میں غرور، تکبر اور دشمنی ہے۔ اسی طرح گھوڑا بھی قوی ہے اس میں بھی غرور ہوتا ہے تو ان کے پالنے والوں میں بھی یہ فخر پیدا ہوجاتا ہے۔

دجال جب احد کے پیچھے آجائے گا (مدینہ سے شمال کی جانب میں احد موجود ہے) تو ملائکہ اسکو شام کی طرف پھیر دیں گے وہاں عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کو قتل کریں گے باب لد میں جیسے دوسرے باب میں موجود ہے۔

باب ماجاء فی ذکر ابن صیاد

ابن صیاد بعض نے ابن صائد کہا ہے یہ مدینہ میں یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا اس میں بہت اشتباہ تھا کہ دجال ہے یا نہیں کیونکہ

صفات اس کی دجال والی تھیں اور وحی بھی نہ اتری تھی اس لئے بہت اشتباہ تھا مگر بعد میں معلوم ہو گیا کہ یہ بھی دجال من الدجاجلة ہے مگر وہ دجال موعود نہیں اس کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں اختلاف رہا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حلفیہ طور پر کہتے تھے کہ یہ دجال ہے کیونکہ اس کی صفات اور افعال بالکل دجال والے تھے بعض کہتے تھے کہ دجال موعود نہیں کیونکہ مدینہ میں رہتا ہے اس کی اولاد بھی ہے لیکن بعد میں جب معاملہ واضح ہو گیا کہ یہ دجال موعود نہیں پھر اختلاف نہیں رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کہا کہ تو۔ گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا رسول ہوں، کہنے لگا آپ امیوں کے رسول ہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ میں نبی ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور تم رسول نہیں اس لئے تم پر ایمان نہیں لاتا۔ پہلی روایت میں ہے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سفر میں تھا وہ کہتے ہیں کہ میں ڈر رہا تھا لیکن اس نے کہا کہ میری اولاد ہے میں مدینہ میں رہتا ہوں مکہ جا رہا ہوں تو ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیال ہوا کہ یہ دجال نہیں پھر جب یہ کہنے لگا کہ میں دجال، اسکے والد کو سب کو جانتا ہوں تو انہوں نے سمجھا شاید وہی دجال ہے تو شروع میں اشتباہ تھا مگر اس کو پھر بھی قتل نہیں کیا کیونکہ ایسے تو یہ اس وقت نابالغ تھا دوسرا اس سے معاہدہ کیا تھا کہ اکٹھے شہر کا دفاع کریں گے تیسرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر دجال نہ ہو تو قتل کرنے کا کیا فائدہ اور اگر دجال ہو تو ہمیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کو قتل کریں گے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صیاد مسلمان ہے مثلاً حج، عمرہ کرنا جہاد میں شرکت کرنا اور دوسری جانب دوسری باتیں تھیں کہ یہ غیب کے دعوے کرتا تھا اس لئے اس کے بارے میں پہلے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

باقی ابن صیاد نے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں میری اولاد ہے مکہ مدینہ بھی جاتا ہوں، جب کہ دجال ایسا نہیں ہوگا لیکن اگر دجال یہی ہوتا پھر بھی تعارض نہ تھا کیونکہ جب اس کا فتنہ ظاہر نہ ہو اس وقت مکہ اور مدینہ جا سکتا ہے لیکن جب فتنہ ظاہر ہو جائے تو اس وقت عقیم بھی ہوگا کفر بھی ظاہر ہو جائے گا اور مکہ مدینہ بھی نہ جا سکے گا لیکن ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی ظاہری باتوں سے متاثر ہوئے اور کہا کہ شاید اس کے بارے میں باتیں غلط مشہور ہیں۔

"وھو الدخ" جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تلفظ کیا تو اس کے شیطان نے تھوڑا سن لیا اور اس کو بتا دیا اور کاہنوں کے شیطان ایسا کرتے ہیں کہ ایک بات کہیں سچی ہوتی ہے باقی جھوٹ ہوتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دفع ہو جاؤ تمہاری قدر اور تمہارا معاملہ آگے نہ بڑھے گا تمہیں ترقی حاصل نہ ہوگی۔

"تنام عيناه ولا ينامه قلبه" یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی ہے مگر اس وجہ سے کہ ان کا دل ہمہ وقت فکر آخرت میں مشغول رہتا تھا جب کہ دجال ہمیشہ شر کے کاموں میں سوچتا ہو گا فتنوں کو سوچتا ہو گا اس لئے اس کے بارے میں بھی ہے تنام عيناه ولا ينامه قلبه۔ لیکن یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے۔

باب ماعلى الارض

آج کے دن جتنے نفوس ہیں اور جتنے انسان زندہ ہیں یہ سو سال کے اندر اندر ختم ہو جائیں گے یعنی یہ قرن ختم ہو جائے گا، "فوھل الناس" لوگوں کو غلطی ہوگئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے وہ سمجھے کہ شاید سو سال بعد قیامت آجائے گی۔ جب کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ سو سال بعد یہ قرن ختم ہو جائے گا بعض نے دہل کا معنی کیا ہے فظع کہ لوگ ڈر گئے کہ اب تو قیامت قریب آگئی۔

"علی ظھر الارض" کہا اس سے فرشتے اور عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مستثنیٰ کر دیا کیونکہ وہ زمین پر نہیں اسی طرح شیطان کو بھی مستثنیٰ کر دیا

کیونکہ اس کا تخت پانی پر ہوتا ہے۔ اس لئے صرف زمین پر رہنے والے مراد ہیں اور یہ بات نبی کریم ﷺ کی پوری ہوئی کیونکہ ابو طفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ آخری صحابی ہیں جو ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے تھے اور نبی کریم ﷺ نے آخری ایام زندگی میں یہ فرمایا تھا تو ابو طفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی سو سال ہی کے اندر فوت ہو گئے۔ اب اس قول کے تحت دوسرے بعض کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور جب نبی کریم ﷺ نے یہ قول فرمایا اس وقت وہ سمندر میں تھے۔

باقی نبی کریم ﷺ کی ملاقات حضرت خضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت نہیں البتہ ایک روایت ملتی ہے کہ آدمی مسجد میں باتیں کر رہا تھا آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا اور کہا کہ اس سے کہو میرے لئے مغفرت کی دعا کرو اس نے جا کر بتایا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ تو افضل الانبیاء ہیں اور مغفور ہیں۔ پھر اس آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ خضر تھے۔ اسی طرح دوسری ضعیف روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ جا رہے تھے ان کے خادم نے دیکھ لیا اور پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا خضر ہیں کیا تم نے بھی دیکھ لیا پھر تو تم نیک آدمی ہو۔ اگر یہ ملاقات ثابت ہو بھی جائے تو یہ اس حدیث کے خلاف نہیں کیونکہ یہ بھی سو سال کے اندر کی بات ہے۔ ابن العربی اور بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے تو جزم سے کہا ہے کہ خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ نہیں ہیں۔ دوسرا قرآن میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ لیا ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے کہ تم نبی کریم ﷺ کی مدد کرو گے اس پر ایمان لاؤ گے اب اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور نبی ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے جب کہ ایسا کہیں ثابت نہیں۔

دوسرا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بدر میں دعا کی کہ اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا اگر حضرت خضر زندہ ہوتے تو یہ کس طرح فرمایا کہ تیری عبادت والا کوئی نہ رہے گا اسی طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ صبر کرتے تو اور بہت عجائبات سامنے آتے اب اگر وہ زندہ ہوں تو حضور ﷺ ان کو بلا لیتے۔

باب ماجاء فی النھر عن سب الریاح

جب طوفانی ہوائیں چلتی ہیں تو اس میں جو پھنس جائے تو وہ گالیاں دیتے ہیں یا فصل تباہ ہو جائے تو پھر بھی برا بھلا کہتے ہیں تو اس سے منع کیا گیا اور بتایا کہ برا بھلا نہ کہیں کیونکہ ''فانھا مامورۃ'' اس لئے دعا پڑھا کریں **اللّٰھم انا نسئلک من خیر ھذہ الریح وخیر ما فیھا وخیر ما امرت بہ ونعوذبک من شر ھذہ الریح وشر ما فیھا وشر ما امرت بہ۔**

باب

تمیم داری عیسائی تھے ۹ھ کو مسلمان ہوئے انہوں نے اپنا سفر کا واقعہ نبی کریم ﷺ کو بیان کیا آپ ﷺ نے اس کی توثیق کی اس لئے یہ مرفوع روایت ہے۔

''فاذاھم بدابۃ لباسۃ'' لباسہ کثیر اللباس جس نے بہت کپڑے پہنے ہوں یہاں مراد ہے التباس میں ڈالنے والا یا التباس اس میں بہت پایا جاتا تھا ''ناشرۃ شعرھا'' بال پھیلے ہوئے تھے اس روایت میں اختصار ہے دوسری میں ہے کہ ہم سے اس نے پوچھا کون ہو کہاں سے آئے ہو انہوں نے کہا ہم عرب ہیں موجیں لے آئیں اس نے کہا اچھا عرب ہو تو بتاؤ زغر کے چشمے کے بارے میں یہ شام کا چشمہ ہے ''تدفق'' پانی پھینک دے پھر آگے مزید سوالات اس نے کئے ''حتی کاد'' عبارت محذوف ہے ای کادان یتخلص قریب تھا کہ وہ زنجیروں سے باہر نکل آتا۔ یہ روایت صحیح مسلم میں بھی ہے، اس سے معلوم ہوا دجال زندہ ہے کسی جزیرے میں موجود ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہے تو یہ موجود ہے صرف اس کا ظہور قرب قیامت میں ہوگا۔

باب و کیف یذل نفسه

ایک تو خدا کی طرف سے مصیبت آجائے وہ تو صبر کی چیز ہے اس پر صبر کرنا چاہئے مگر خود اپنے آپ کو مصیب پر پیش کر دینا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔

باب من سکن البادیة جفا

جو دیہات میں رہتے ہیں ان میں مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے سختی ہوتی ہے بعض نے جہالت کا معنی کیا ہے کہ جو دیہات میں رہتے ہیں ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہاں علم کا میدان نہیں ہوتا علم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سختی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے میل جول نہیں ہوتا کہ آپس میں انس ہو جب کہ شہروں میں ایک دوسرے سے انس ہوتا ہے لیکن آج کل اس کا الٹ ہے کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو نہیں جانتا انس بالکل نہیں رہا کیونکہ شہروں میں علم اب ختم ہو گیا ہے البتہ شہر کے لوگوں میں مزاج کے اعتبار سے اب بھی نرمی پائی جاتی ہے۔ جو ہمیشہ شکار کے پیچھے لگتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے اللہ کے دین اور احکام سے۔ اور جو آدمی بادشاہ کے دروازے پر جاتا ہے وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ دربار میں جانے والے یا ان کے ہاں میں ہاں ملائیں گے تو دین کے اعتبار سے فتنے میں پڑ گئے اور اگر ان کی غلط باتوں کی تردید کریں تو وہ ان کو تکلیف پہنچائیں گے یہ دنیا کے اعتبار سے فتنے میں ڈالا جائے گا ہاں کوئی صرف حق سنانے کے لئے جائے یہ تو افضل جہاد۔

باب

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صاحب سرّ رسول اللہ ﷺ تھے ان سے منقول ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ فتنے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد کس کو یاد ہے؟ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا مجھے یاد ہے فرمایا آدمی فتنے میں واقع ہوا اہل و عیال، مال، اور پڑوسیوں کے فتنے میں تو یہ آدمی جب نماز پڑھے صدقہ کرے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میرا مراد وہ فتنہ ہے جو اس طرح موج والا ہو جیسے سمندر کی لہر ہو۔ حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا آپ اور اس فتنے کے درمیان بند دروازہ ہے اس لئے آپ محفوظ ہیں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ پھر قیامت تک بند نہ ہوگا کیونکہ ٹوٹا ہوا نہ ہوتا بند ہو جاتا مگر ٹوٹے ہوئے کا بند کرنا مشکل ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ باب مغلق عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے آپ فتنوں کے لئے دروازہ تھے آپ کی شہادت دروازے کا توڑنا تھا جب شہید ہوئے تو فتنوں میں مسلمان مبتلا رہے اور اب بھی مبتلا ہیں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی اور جنگیں بھی شروع ہوں گئی۔

"فتنته الرجل فی اھله وماله" اہل و مال میں فتنہ کیا ہے؟

تو فرماتے ہیں کہ اہل میں یہ کہ اولاد کے حقوق ہیں کمی بیشی کرے یا اولاد کی محبت غالب آجائے کہ حقوق اللہ میں کوتاہی ہو جائے اولاد کی محبت کی وجہ سے حلال و حرام میں فرق نہ کرے مال کے اندر فتنہ یہ ہے کہ مال کے کمانے میں بھی احتیاط نہ کرے اور اس کے حقوق بھی ادا نہ کرے جار میں فتنہ یہ ہے کہ ان کے حقوق ادا نہ کرے ان کی حق تلفی کرے یا پڑوسی برے ہیں جس کی وجہ سے آپ تکلیف میں مبتلا ہیں۔

باب

جو ظالم حکمرانوں کے پاس جا کر ان کے جھوٹ کی تصدیق کریں ان کی مدد کریں تو اس پر نبی کریم ﷺ نے سخت وعید فرمائی ہے کہ وہ ہم سے نہیں اگر کافر ہو تو مطلب یہ ہے کہ ہماری امت میں سے ہی نہیں اگر مسلمان ہو تو مطلب ہوگا کہ ہمارے طریقے پر نہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ دین پر عمل میں اتنی مشقت ہوگی جتنی انگارے کے اٹھانے میں جیسے آج کل ہوتا ہے۔

باب

بہتر وہ ہیں جن سے خیر کی امید ہو لوگ ان کی شر سے محفوظ ہوں اور بدتر وہ ہیں جن سے خیر کی امید نہ ہو اور ان کی شر سے محفوظ نہ ہوں۔

باب

''المطیطاء'' یا المطیطیاء۔ یہ تصغیر کا صیغہ ہے کہ اکڑ کر چلنا، یعنی میری امت نے چلنے میں اکڑنا شروع کیا ناز تبختر سے چلنا شروع کیا اور روم وفارس کے بادشاہوں کی اولاد انکی خدمت کرنے لگیں جب یہ حالات آجائیں تو بدترین لوگ نیک لوگوں پر مسلط ہو جائیں گے چنانچہ یہ پیشن گوئی پوری ہوئی جب فتوحات ہوئی تو فارس اور روم کے لوگ خادم ہوئے لوگوں نے تکبیر سے چلنا شروع کیا تقویٰ ختم ہو گیا اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلین لوگوں پر مسلط ہو گئے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب کسریٰ ہلاک ہوا آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ بیٹی بادشاہ بن گئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جنہوں نے اپنے معاملات عورت کے حوالے کر دیئے ابو بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری حفاظت فرمائی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بصرہ آئیں مجھے یہ حدیث یاد آئی اس لئے میں نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قیادت کو اچھا نہیں سمجھا ان کا ساتھ نہیں دیا۔ کسریٰ کی ہلاکت کا واقعہ یہ تھا کہ اس کے بیٹے نے اس کے قتل کا پروگرام بنادیا والد کو علم ہو گیا اس نے محفوظ خزانے میں زہر کی دوائی پر لکھا الدواء نافع للجماع جب بیٹے نے باپ کو قتل کیا اور جب اس کو یہ دوائی ملی تو اس نے کھالی تو ۶، ماہ کے اندر یہ مر گیا اس نے دوسرے بھائیوں کو بھی قتل کر دیا تھا اس لئے صرف اس کی بہن رہ گئی لوگوں نے سوچا کہ بادشاہت اس خاندان سے نہ نکلے اس لئے اس لڑکی کو بادشاہ بنادیا اس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس روایت کی روشنی میں کوئی ملک بھی ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا جب ان کے معاملات عورت کے پاس ہو ابو بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بصرہ جانے کے بعد بیان کیا جب کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قیادت کا کوئی مسئلہ نہ تھا نہ سربراہی کا مسئلہ تھا وہ تھی بھی تمام امت کی ماں اس کے باوجود بظاہر قیادت کی وجہ سے یہ حدیث بیان کی تو آج کل کیسے یہ جائز ہو سکتا ہے۔

تیسری روایت میں ہے کہ خیار امراء اور شرار امراء کے بارے میں نہ بتاؤ پھر ان کا ذکر کیا کہ بدترین وہ ہیں جو آپ سے نفرت کریں اور تم ان سے نفرت کرو اچھے وہ امراء ہیں جن کو تم پسند کرو وہ تم کو پسند کریں۔

چوتھی روایت ہے کہ تمہارے آئمہ ہوں گے ان کی بعض اچھی باتیں ہوں گی بعض بری اب ان کی بری باتوں کو جس نے برا جانا اور نکیر بھی کی وہ ذمہ داری سے بری ہو گئے اور جنہوں نے صرف ناپسند کیا وہ بچ گیا اور جو ان کے پیچھے چلا تو وہ ان کے ساتھ شریک ہوگا۔

ماصلوا سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی بڑی علامات پائی جائیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً صحیح ثابت ہے کہ عورت کے مشورے میں برکت نہیں دوسرے بعض نے مرفوعاً بھی نقل کیا ہے جب کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مشورہ کیا تو تعارض ہے تو فرماتے ہیں کہ عورت اگر دیندار اور صاحب فراست ہو تو اس سے مشورہ کر لینا چاہئے، بعض نے کہا کہ کوئی نہ ہو تو عورت سے مشورہ کرلے مگر اس کے خلاف کرے کیونکہ خیر اس کے مشورے کے خلاف میں ہے۔

باب خیر القرون میں خیر ہی خیر تھی اس لئے اس میں کمزوری ہوتی کہ دین کے دسویں حصے کو چھوڑنا بھی باعث ہلاکت تھا لیکن بعد میں شر کا دور آگیا اس لئے اس وقت دسویں حصے پر عمل کرنا بھی باعث نجات ہوگا۔

ابواب الرؤیا

عن رسول الله ﷺ

فتن میں علامات قیامت بیان کیں ان ابواب میں بھی بعض غیب کے امور کی علامات کا ذکر ہے کیونکہ خواب سے ایک غیبی خبر حاصل ہوتی ہے۔

باب ان رؤیا المؤمن

جب زمانہ قریب ہو جائے اس سے کیا مراد ہے اس میں اقوال ہیں۔ ① قرب قیامت مراد ہے جب چیز کم ہو جائے تو اس کی تعبیر قرب سے کی جائے جیسے تقاربت الابل اونٹ کم ہو جائیں اسی طرح اقترب الزمان کا مطلب ہے کہ زمانہ کم ہو جائے گا تو وقت قیامت قریب ہو جائے گی۔ ② اس سے استواء اللیل والنہار مراد ہے کہ وہ موسم جس میں دن اور رات بالکل برابر ہوں رات کے آخری حصے میں ان ایام میں جو خواب نظر آئے وہ بالکل سچا ہوگا ③ وہ علامات مراد ہیں جو قیامت کی نبی اکرم ﷺ نے بیان کیں مثلاً سال مہینہ کی طرح مہینہ ہفتہ اور ہفتہ دن کی طرح ہوگا تو علامات قیامت جب ظاہر ہوں تو زمانہ بالکل قریب ہو جائے گا بہت جلدی گزرے گا تو تقارب الزمان سے یہ مراد ہے اس زمانے میں سچے خواب ہوں گے زیادہ سچے خواب والے وہ ہوں گے جو باتوں میں سچے ہوں گے۔

ورؤیا المؤمن جزء ستة واربعین جزاءً من النبوة اس روایت میں چھیالیسواں جزء کا ذکر ہے بعض میں چالیس بعض روایات میں پینتالیس کا ذکر ہے، بعض میں پچیسواں جزء شمار کیا ہے بعض میں خمسون بعض میں سبعین بعض میں خمس وسبعین بعض میں ست وسبعون کا ذکر ہے یہ تو تعارض ہے گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح جمع کیا ہے کہ دیکھنے والے کی نسبت سے فرق ہے کہ جو جتنا نیک ہوگا اسی نسبت سے اس کا خواب نبوت کے اجزاء کے اعتبار سے قریب ہوگا جو جتنا کم نیک ہوگا اتنا ہی اس کا خواب نبوت کے اجزاء کے اعتبار سے بعید ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ ترجیح قائم کریں گے اور صحیح باب کی روایت ہے جس میں چھیالیسواں جزء مراد لیا ہے۔

اشکال نبوت ختم ہوگئی ہے کیا جو خواب دیکھے اس کو نبوت کی خبر مل گئی؟ جواب خصلت مراد ہے یہ نہیں کہ اس میں نبوت کی جزء آگئی بلکہ یہ مراد ہے کہ اس میں نبوت کی صفات میں سے ایک صفت آجاتی ہے باقی اگر نبی خواب دیکھے تو اس کی خواب حقیقۃً نبوت کی جزء ہوگی۔ باقی یہ کہ نبوت کا جزء کیسے ہے تو فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی عمر ۶۳ سال ہے، ۴۰ سال کے بعد نبوت ملی نبوت کی عمر ۲۳ سال تھی، نبوت سے ۶ ماہ پہلے خواب دیکھتے تھے اور ۶ ماہ کی نسبت ۲۳ سالوں کی طرف ہے کہ وہ تو چھیالیسواں حصہ بنتا ہے تو وہ ۶ ماہ مراد ہیں جن میں نبوت سے پہلے خواب دیکھتے تھے اور ۶ ماہ ۲۳ سال کی نسبت یہ چھیالیسواں حصہ ہے۔ اس لئے کہا کہ خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے بعض حضرات نے حضور اقدس ﷺ کی عمر میں کسر کو شمار نہیں کیا ۶۰ سال عمر لگائی تو اس اعتبار سے ۶ ماہ چالیسواں حصہ بنتا ہے اس لئے انہوں نے چالیسواں حصہ مراد لیا اور جنہوں نے مکمل عمر نبوت جو کہ ۲۳ سال چند ماہ ہے اس پوری کا حساب لگایا انہوں نے پینتالیسواں حصہ کہا۔ "احب القید" بیڑیوں کو پسند کرتا ہوں کیونکہ یہ ثبات فی الدین ہے وہ گناہوں سے محفوظ ہے اور گلے کے طوق کو ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ جہنمیوں کی سزا ہے۔

باب ذہبت النبوۃ وبقیت المبشرات

اس باب میں تفصیل سے اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے "براھا المسلم" مسلمان خود دیکھے "او تری" دوسرا آدمی اس کے متعلق دیکھے۔

باب ماجاء فی قول النبی ﷺ من رأنی فی المنام فقدر أنی

حدیث کے الفاظ سے ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے صحیح دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا یعنی اس کو میری شکل میں آنے کی قدرت نہیں یہ نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہے یہ روایت بخاری میں بھی ہے ان روایات سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا جاسکتا ہے اس میں کوئی بعد نہیں۔

من رأنی فی المنام فقد رأنی. یعنی جس نے مجھے دیکھا خواب میں اس نے مجھے دیکھا صحیح صورت میں یا مطلب یہ ہے کہ جس صورت میں میرا انتقال ہوگا اس مکمل حلیے کے مطابق دیکھا فقدرأنی حقا اس نے مجھے صحیح صورت میں دیکھا یہاں پہلا معنی عام ہے دوسرا خاص ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ کسی نے نبی ﷺ کو اور حلیے میں دیکھا دوسرے نے دوسرے حلیے میں دیکھا اس کو حلیے میں فرق معلوم ہوا تو اس کی اپنی کمزوری کی دلیل ہے دوسرا اشکال یہ ہے کہ ایک وقت میں کئی لوگ مختلف علاقوں میں دیکھتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی ہر جگہ دیکھا جاسکے۔جواب انسان جب آج کل مختلف جگہوں پر کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے جیسے، ٹی وی میں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے دکھانا کیا مشکل ہے اب اگر کسی نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کسی کو حرام کا حکم دے رہے ہیں، تو یہ دیکھنے والے کی کمزوری کی وجہ سے ہے باقی قرآن وحدیث میں موجود ہیں اس لئے خواب حجت نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے فان الشیطان لایتمثل بی دنیا میں بھی شیطان کسی نبی کی صورت میں نہیں آسکتا باقی ہر شکل اختیار کرسکتا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نبی کی شکل میں آجائے تو لوگوں کو اشتبا ہو جائے گا اسی طرح خواب میں بھی نہیں آسکتا۔

باب اذا رأی فی المنام مایکرہ مایصنع

"الرؤیا" سچے خواب۔ سچے خواب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہیں اور تخیلات فاسدہ شیطان کی طرف سے ہیں اب کسی کو اضغات احلام نظر آئے تو وہ تین دفعہ بائیں جانب تھوکے اور تین دفعہ تعوذ پڑھے باقی دائیں جانب برکت کے لئے ہے بائیں جانب تھوکے تاکہ شیطان ذلیل ورسوا ہو دوسری روایت میں دو رکعت پڑھنے کا بھی ذکر ہے۔

باب ماجاء فی تعبیر الرؤیا

خواب عدم استقرار میں ایسا ہے جیسے پرندے کے پاؤں پر، اور پرندے کے پاؤں پر کچھ ٹھہرتا نہیں مگر یہ گرتا نہیں جب تک کہ بیان نہ کردے جب بیان کردیا اس نے جو تعبیر بھی دی تو یہ خواب گر جائے گا اور تعبیر تک پہنچ جائے گا اس لئے خواب بیان کرنا ہو تو عقل مند ہوشیار یا دوست کے سامنے بیان کرو۔

باب

خواب تین قسم پر ہے ① سچے خواب ② انسان کو تخیلات آئیں اس کی وجہ سے وہ چیز خواب میں آجائے۔(۳) ڈراؤنے خواب جو شیطان کی طرف سے ہیں اب کوئی شیطانی خواب دیکھے تو نماز پڑھے۔

باب ماجاء فی الذی یکذب فی حمله

جو آدمی جھوٹے خواب بیان کرتا ہے ان کے لئے سزا کا یہاں پر ذکر ہے کہ قیامت کے دن اس کو مکلف کیا جائے گا کہ آپ جو کے دو دانوں کو آپس میں باندھ دیں گرہ دے دیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکے گا لیکن یہ عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جھوٹ ویسے بھی گناہ ہے عام گفتگو میں جھوٹ پر وعیدیں مذکور ہیں مثلاً لعنت وغیرہ لیکن خواب میں جھوٹی بات بیان کرنے پر آخرت میں ایک خصوصی سزا ملے گی کہ ان سے کہا جائے گا کہ جو کے دو دانوں کو آپس میں گرہ دو یہ تکلیف مالا یطاق ہے یہ سزا اس لئے ہوگی کہ خواب نبوت کی جزء ہے اور جس طرح وحی من عند اللہ ہوتی ہے خواب بھی من عند اللہ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے تنبیہ کی جاتی ہے اب اس جھوٹے نے جھوٹی بات کی نسبت اللہ کی طرف کی یہ افتراء علی اللہ ہے اور خواب کا آنا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے خود آدمی کچھ بھی کرے اللہ تبارک وتعالیٰ نہ چاہیں تو خواب نہیں آسکتا جب اس نے جھوٹا خواب سنایا گویا بتایا کہ میں لانے کی طاقت رکھتا ہوں جب کہ خواب اس کے اختیار میں نہ تھا اس لئے اس کو تکلیف مالا یطاق دی جائے گی۔

باب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سویا ہوا تھا کہ مجھے دودھ کا پیالہ دیا گیا میں نے لے لیا اور جو بچ گیا وہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعبیر پوچھی تو بتایا کہ اس سے علم مراد ہے دودھ کی تعبیر علم سے کی گئی کیونکہ دودھ میں بہت فوائد ہیں اس سے جسم کے نشو ونما اور بقاء ہے بچہ پیدا ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لئے بطور غذاء دودھ کا انتظام کرتے ہیں تو یہ مفید غذا ہے اسی طرح علم بھی اس سے انسان کے روح، ایمان اور اعمال کی حفاظت ہوتی ہے تو علم کے فوائد بھی بہت زیادہ ہیں اس لئے لبن کی تعبیر علم سے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح دودھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطور دلیل کے اپنی وحدانیت پر اس کو ذکر کیا ہے کہ ایک طرف خون دوسری طرف گوبر ہے دودھ درمیان میں ہے مگر اس میں نہ خون کا رنگ ہے نہ گوبر کی بدبو ہے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت سے ہے اسی طرح جہل اور انسان کی دوسری ظلمات اور مذموم صفات کے درمیان اللہ تبارک وتعالیٰ ایک نورانیت والی چیز پیدا کرتا ہے جو کہ علم ہے۔

باب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ لوگ مجھ پر پیش کئے جاتے تھے ان پر قمیصیں تھیں کچھ قمیص ثدین کچھ اس سے اسفل تھیں اس کے دو معانی ہیں ① ثدین سے بھی کم تھیں ② ثدین کے نیچے تھیں یعنی اس سے لمبی تھیں اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لایا گیا اور وہ قمیص کو کھینچ رہے تھے اور اس کی تاویل دین سے کی جس طرح لباس انسان کی حفاظت کا ذریعہ ہے گرمی سے سردی سے اسی طرح دین بھی آگ اور جہنم سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔ جب آدمی قمیص کو کھینچے تو اس کے آثار باقی رہ جاتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دینداری کے آثار بھی دنیا میں باقی رہیں گے۔

باب ماجاء فی رؤیا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المیزان والدلو

اس باب میں بہت سے خوابوں کا ذکر ہے اور اس کی تعبیروں کو بیان کیا ہے ایک یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کسی نے خواب دیکھا ہے ایک نے کہا میں نے دیکھا کہ ترازو اتارا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تولا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاری ہو گئے پھر عمر اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان تول قائم کیا تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھاری ہو گئے پھر عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو

تولا گیا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھاری ہو گئے پھر میزان اٹھالیا گیا اس سے نبی کریم ﷺ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آ گئے کیونکہ اس سے انحطاط ظاہر ہورہا تھا اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک خلافت مستقل تھی اس لئے ان تک تولا گیا مگر بعد میں مستقل خلافت کسی کی نہ تھی فتنوں کا دروازہ کھل گیا اس لئے میزان اٹھالیا گیا: "فقال رأیت الناس" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ جمع تھے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یا دو ڈول نکالے ان میں کمزوری نظر آئی ۔یغفر اللہ لہ میں کمزوری کی طرف اشارہ نہیں بلکہ ان کی اجل کے قرب کی طرف اشارہ ہے،اس لئے فرمایا واللہ یغفر لہ باقی یہ ان کی کوئی کمزوری نہ تھی فتنوں کا ذکر ہے کہ فتنے بہت زیادہ بڑھ جائیں گے چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے بڑا فتنہ ارتداد کا تھا جس کی انہوں نے سرکوبی کی تو یہ کمزوری حالات کے اعتبار سے تھی کے اتنے فتنے بیک وقت آ جائیں گے اور ایسا ہوا بھی کہ بعض موتد ہو گئے بعض نے زکوۃ سے انکار کر دیا۔بعض نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا فرمایا اینقص دین و انا حی پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا انہوں نے ڈول نکالا وہ بڑا تھا میں نے ان جیسا قوی نہیں دیکھا کہ اس جیسا کام کر سکے انہوں نے مویشیوں کو پانی پلایا یہاں تک کہ وہ اپنے باڑوں میں واپس چلے گئے تو یہ وسعت کی طرف اشارہ ہے "اصبت بعضاً و اخطأت بعضاً" اب وہ بعض خطاء کیا ہے ① تو اس میں صحیح قول یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے نہیں بتایا تو اس کی کھوج میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے ② بعض نے تاویل کی ہے کہ انہوں نے عسل سے قرآن مراد لیا جب کہ اس سے قرآن وسنت مراد ہے لیکن یہ کمزور ہے کیونکہ قرآن کا ذکر کیا سنت کا ذکر خود آ گیا ③ بعض نے جواب دیا کہ انہوں نے خطاء کی کہ نبی اکرم ﷺ کے ہوتے ہوئے تعبیر بتائی مگر یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجازت لی ④ بعض نے جواب دیا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعبیر دی کہ جس کے لئے کاٹی گئی تھی وہ چڑھ گئے جب کہ صحیح یہ تھا کہ وہ رسی ان کے بعد والوں کے لئے مل گئی تھی مگر یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہاں الفاظ موجود ہیں کہ ثم یوصل الخ۔اس لئے صحیح اول بات ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں جس کو حضور اقدس ﷺ نے مبہم چھوڑ دیا۔

ابواب الشہادات

عن رسول اللہ ﷺ

"شہادات" یہ جمع ہے شہادۃ کی بمعنی گواہی یہاں مراد وہ شہادتیں جو حق گواہان ہوں تو دوسری طرف ان گواہیوں کا ذکر ہوگا جو جھوٹی گواہیاں ہیں سچی گواہی دینے والے کے لئے فضیلت ہے اور جھوٹی گواہی دینے والے کے لئے وعید کا ذکر ہے پہلے سچے گواہوں کی فضیلت بیان کی۔ الذی یأتی بشھادتہ قبل ان یسألھا الخ اس کی مختلف توجیہات ہیں ① کسی کے پاس کسی کا حق ہے مگر صاحب حق کو اس کا علم نہیں یہ آ کر بتاتا ہے کہ آپ کا حق فلاں کے پاس ہے میں گواہ ہوں تو اس نے اس کے حق کو زندہ کیا اس لئے یہ خیر الشھداء میں سے ہے۔ ② شہادۃ الحسبہ مراد ہے جیسے طلاق عتاق، نکاح، وغیرہ ان امور کے اندر گواہی دیتا ہے بغیر پوچھے۔ ③ سرعت مراد ہے کہ جب گواہی دینے کا مطالبہ کیا جائے تو فوراً گواہی دیتا ہے جیسا کہ بغیر طلب کے دے دیا جیسے کہا جاتا ہے الجواد یعطی قبل سوالہ۔"لاتجوز شھادۃ خائن" ① خائن سے وہ خائن مراد لیا ہے جو امانتوں میں خیانت کرے تو خاص مراد ہے۔ ② عام مراد ہے کہ خیانت حقوق اللہ میں کرے یا حقوق العباد میں کرے۔ "ولا مجلو دحداً" جن کو بطور حد کے کوڑے لگائے گئے ہوں جیسے حد قذف جس کو لگے اس کی گواہی قبول نہیں اگر یہ توبہ کر لے تو شوافع اور دوسرا اہل علم کے ہاں اس کی گواہی توبہ کے بعد قبول ہوگی مگر امام صاحب کے ہاں کبھی قبول نہ ہوگی کیونکہ ﴿ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدًا﴾ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ جب اس کی زبان ہر ایک پر

تہمت لگاتی ہے تو اس کی سزا یہ تھی کہ کاٹا جائے مگر کاٹنے کا حکم نہیں دیا اس لئے کاٹنے کے بجائے اس کی زبان بند کرنے کے لئے اس کی گواہی مردود ہوگئی اس لئے اس کی گواہی کبھی قبول نہ ہوگی۔ ولاذی غمر لاخته بعض نسخوں میں لاخیم ہے اور مصری نسخوں میں ہے لاحنه کہ دشمنی کی وجہ سے کسی ذی غمر کی گواہی بقبول نہیں۔ ''ولا مجرب شهادة'' تجربے سے ثابت ہوا کہ اس کی گواہی جھوٹی ہے۔

''ولا قانع اهل البيت'' کہ اس کی تمام سرگرمیاں انہیں کے پاس بند ہوں انہیں کے لئے وقف ہوں کیونکہ اس میں تہمت ہے۔ ''ولاظنين'' نہ وہ جو متہم ہو ولاء میں یا نسب میں یعنی ولاء یا نسب کی نسبت دوسرے کی طرف کرتا ہو والد کی والد کے لئے اور والد کی ولد کے لئے جمہور کے ہاں معتبر نہیں مگر شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہ عدل ہوں تو قبول ہے مگر جمہور کہتے ہیں کہ عدل تب ہے جب تہمت نہ ہو جہاں تہمت ہو وہاں عدل نہیں ہوتا اس لئے یہاں بھی تہمت ہے جس کی وجہ سے ان کی گواہی قبول نہیں ''ولا يجوز شهادة صاحب حنة'' امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ اگر دشمن کی گواہی دشمن کے حق میں ہو تو جائز ہے اور مقبول ہوگی، اگر دشمن کے خلاف ہو تو مقبول نہ ہوگی۔

ابواب الزہد

عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

زہد بمعنی بے رغبتی، دنیا کے تعلق کو دل سے نکالنا۔ ''الزاهد'' التارک للدنیا ''مغبون'' نعمتان کی صفت ہے اور الصحة الخ اس کی خبر ہے یا نعمتان خبر ہے فرمایا دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ نقصان میں پڑ جاتے ہیں وہ نعمتیں ہیں صحت اور فرصت یہ دو چیزیں اکثر جمع نہیں ہوتی اگر جمع بھی ہو جائیں تو یہ آدمی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا آج کل کرتے کرتے وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ فیعمل بهن اویعلم۔ یہ او بمعنی واو کے ہے عمل بھی کرے اور دوسروں کو بھی عمل کرائے۔ بعض نے کہا یہ او تنویع کے لئے ہے بعض نے کہا یہ او ترقی کے لئے ہے۔ یعمل بھن کو مقدم کیا کہ اصل علم عمل کے لئے سیکھا جاتا ہے اس لئے فرمایا عمل بھی کریں دوسروں کو بھی پہنچائیں۔ ''اتق المحارم'' حرام سے بچیں تو زیادہ عبادت گزار ہوں گے کیونکہ جو حرام سے بچے گا وہ بطریق اولیٰ فرائض کا اہتمام کرے گا باطن پاک ہو حرام سے بچے یہ تخلیہ ہے اس لئے اس کے بعد مرحلہ تحلیہ کا ہوگا جو عبادت ہے ''وارض بما قسم الله لک'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو تمہیں تقسیم کر کے دیا ہے اس پر راضی رہیں آپ سب سے بڑی غنی ہوں گے کیونکہ غناء کا تعلق مال سے نہیں بلکہ دل سے ہے جب دل غنی ہو تو معمولی چیز پر قناعت کرے گا اور اس کو کافی سمجھے گا کسی نے بزرگ سے پوچھا کہ کیمیا کیا ہے اس نے کہا کہ اللہ کے دیئے ہوئے پر قناعت اور صبر کریں اس سے دل مطمئن ہو جائے گا اور جب صبر کرے گا اللہ کے دیئے ہوئے پر تو شکر ادا کرے گا اس لئے یہ بہترین کیمیا ہے۔ ''واحسن الی جارک'' آپ کے ایمان کی نشانی ہوگی پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرنا۔ کیونکہ پڑوسیوں سے بہت اذیتیں ملتی ہیں مگر اس کے باوجود اس پر احسان کریں یہ ایمان کی علامت ہوگی۔ ''احب للناس'' لوگوں کے لئے وہ پسند کریں جو تمہیں پسند ہو تو آپ مسلمان ہوں گے آپ میں ظاہری انقیاد پایا جائے گا ولاتکثر الضحک زیادہ نہیں ہنسیں کیونکہ کثرت ضحک دل کو مردہ بنا دیتا ہے ایمان کی طاقت کم ہو جاتی ہے آخرت سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی المبادرة بالعمل

نیک اعمال کریں ان سات باتوں کے آنے سے پہلے کیونکہ سات باتیں آجائیں تو آپ اعمال نہ کر سکیں گے وہ سات باتیں یہ ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو سب کچھ دیا مگر آپ شکر نہیں کرتے بلکہ اس فقر کا انتظار کرتے ہیں جو سب کچھ بھلا دے یا مالداری کا انتظار

کرتے ہیں جس کی وجہ سے آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کا باغی ہو جائے یا اس بیماری کا انتظار کر رہے ہیں جو مفسد ہو بگاڑ پیدا کرنے والی ہے یا آپ جوان ہیں اعمال نہیں کرتے بلکہ ایسے بڑھاپے کا انتظار کرتے ہیں جو عقل خراب کر دے یا موت کا انتظار کرتے ہیں جو جلدی آجائے، یا دجال کے منتظر ہیں جب کہ دجال فتنہ ہے، یا آپ قیامت کے منتظر ہیں قیامت تو دہشت والی اور کڑوی چیز ہے ان سات باتوں سے پہلے عمل کریں۔

باب ماجاء فی ذکر الموت

''ہاذم'' یا ھادم، زیادہ کریں ذکر اس چیز کا جو لذتوں کو ہاذم اور قاطع ہے کیونکہ موت کے حالات آجائیں یا موت کی یاد آجائے تو اس سے تمام لذتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہادم کا معنی ہے کہ تمام لذتوں کو گرا دیتا ہے۔

باب

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے تو اتنے روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی ان سے سوال ہوا کہ جنت جہنم کے ذکر سے نہیں روتے قبر سے کیوں روتے ہو فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر آخرت کے منازل میں پہلی منزل ہے یہاں آسانی ہو بعد کے منازل آسان ہوں گے اور اگر یہیں سختی ہوئی تو بعد کے منازل اس سے بھی سخت ہوں گے۔ اشکال۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو ویسے بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے پھر کیوں اتنے روتے تھے؟ جواب ① کبھی کبھی جنت کی بشارت ہوتے ہوئے بھی قبر کا خوف رہتا ہے کہیں اس میں سختی نہ ہو جائے جس طرح سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تنگ ہو رہی تھی جواب ② اس موقع پر بشارت ان کو بھول جاتی تھی۔

باب من احب لقاء اللہ تبارک وتعالیٰ

جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملاقات پسند کرتے ہیں آخرت کی تیاری کرتے ہیں اور آخرت کی فکر میں رہتے ہیں ایسے لوگوں کی ملاقات کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ پسند کرتا ہے جس کو آخرت کی فکر نہ ہو آخرت کی تیاری نہ ہو تو اس کو موت ناپسند لگتی ہے اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔

باب ماجاء فی انذاز النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جب یہ آیت ﴿وانذر عشیرتک الاقربین﴾ نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اوپر عمل کرتے ہوئے بطور امتثال امر کے خاندان والوں کو ڈرایا کہ میرے ساتھ تعلق کا ہونا نہیں بچا سکتا جس طرح لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیویاں ہلاک ہوئیں کیونکہ باعث نجات ایمان تھا جو ان کے پاس نہ تھا اس لئے ہلاک ہوئیں۔ ان قرآن کے واقعات نے یہود ونصریٰ کی تردید کی جو کہتے تھے ہمیں عذاب نہ ہوگا کیونکہ وہ کہتے تھے ﴿نحن ابناء اللّٰہ واحباءہ﴾ تو یہ اس پر رد کیا واقعات سے کہ نسب کام نہیں دے سکتا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں سے کہا کہ آپ ایمان اور عمل کی تیاری کریں جو بچاؤ کا ذریعہ ہے ورنہ میرا رشتہ دار ہونا نجات کے لئے کافی نہیں۔

''سلونی من مالی ماشئتم'' جو میرے بس میں ہے وہ میں کروں گا تو مال مراد نہیں یا مال بھی مراد ہو سکتا ہے تو مال کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ سخی آدمی کے لئے مال نہ بھی ہو وہ کہتا ہے کہ جتنا مجھ سے ہو سکا تمہاری مالی مدد کروں گا۔ اشکال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت جو کریں گے۔ جواب۔ شفاعت اجازت کے ساتھ ہوگی اور جس کی شفاعت کی جائے اس کی بھی اجازت مل جائے گی پھر شفاعت ہوگی بغیر اجازت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اشکال: فی الباب عن ابی ھریرۃ وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا جب کہ ابتدائے زمانہ میں نہ

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے نہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ جواب ① یہ حکم دو دفعہ نازل ہوا تھا مکہ میں بھی خاندان کو ڈرایا مدینہ میں بھی ان حضرات کو ڈرایا۔ جواب ② یہ مراسیل صحابہ سے ہے اور مرسل صحابہ مقبول ہے کیونکہ الصحابة کلهم عدول.

باب ماجاء فی فضل البکاء الخ

جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ڈر سے روئے وہ جہنم میں نہ جائے گا کیونکہ اس کا رونا اور ڈرنا دلیل ہے کہ اس نے ایمان اور عمل صالح کو اپنایا ہوگا اس لئے جہنم میں نہ جائے گا۔ یا دخول ابد مراد ہے۔

باب ماجاء فی قول النبی ﷺ الخ

میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ دکھاتے ہیں، میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ ''اطت السمآء'' اط یاط بمعنی آواز نکالنا جب کجاوے میں وزن زیادہ ہو تو چلتے وقت اس کی آواز نکلتی ہے، تو فرمایا آسمان آواز نکالتا ہے اور اس کو حق ہے کہ آواز نکالے اس میں چار انگلی کی مقدار بھی فرشتوں سے خالی نہیں وہ جگہ جگہ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں، آسمان کی آواز ان کے ثقل کی وجہ سے ہے مجھے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی سے بتایا ہے وہ تم کو معلوم ہو جائے تو ہنسنا چھوڑ دو عورتوں سے لذت حاصل نہ کر کے جنگلوں میں نکل جاتے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کاش کے درخت ہوتا اور مجھے کاٹ دیا جاتا تا کہ حساب وکتاب سے بچ جاتا یہ بہت سے صحابہ سے منقول ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا ہے اس وجہ سے وہ یہ تمنا کرتے تھے۔

باب ماجاء من تکلم بالکلمة

ایک آدمی لوگوں کو ہنسانے کے لئے بات کرے اور اس کو معمولی سمجھے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اتنی بڑی گناہ کے اعتبار سے ہے کہ ستر ۷۰ سال جہنم میں سزا ہوگی دوسری روایت میں وضاحت ہے کہ جو جھوٹی باتیں کر کے لوگوں کو ہنسائے اس کے لئے ہلاکت ہے۔

باب

ایک صحابی فوت ہوئے ایک نے کہا البشر بالجنۃ کہ یہ تو جنتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا آپ کو کیا خبر ممکن ہے اس نے غیر ضروری بات کی ہو جو عند اللہ جرم ہو یا ایسی چیز میں بخل کیا ہو جس سے اس کو مالی نقصان نہ پڑتا اس بخل کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے ناراض ہو گیا ہو تو اس کو جنت نہ بھیجے اس لئے تمہیں کیا خبر اس لئے یقینی حکم نہیں لگانا چاہئے۔

''ترکہ مالا یعنیہ'' مالا یعنیہ سے مراد وہ باتیں ہیں کہ اس کو نہ کرے تو کوئی نقصان نہ ہو لایعنی باتیں جو کرتا ہے اس کی زبان اکثر جھوٹ اور دوسری بری باتوں میں لگ جاتی ہے اس لئے ایسی باتوں سے روکا۔

باب ماجاء فی قلة الکلام

کوئی آدمی بات کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا والی بات ہوگی اس کا گمان نہ تھا کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں قیمتی ہوگی بلکہ وہ معمولی سمجھتا تھا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت تک رضا مندی اس کے لئے لکھ دے گا اور ایک آدمی بات کرتا ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی ہو مگر وہ اس کو بڑا نہ سمجھتا تھا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اتنی بڑی ہے کہ قیامت تک ناراضگی لکھ دے گا اس لئے زیادہ باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

باب ماجاء فی هوان الدنیا علی اللّٰہ

دنیا کی مذمت کے ابواب جاری ہیں اس سلسلے میں یہ بھی ایک باب ہے روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں دنیا کی کوئی حیثیت ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ تک پانی بھی نہ پلاتا کیونکہ جس کی حیثیت ہو اللہ تبارک وتعالیٰ دشمنوں کو وہ چیز نہیں دیتا لیکن چونکہ دنیا اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناپسند ہے اس لئے ان کو زیادہ مل جاتی ہے جو لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناپسند ہیں یہ نہیں کہ جس کو دنیا زیادہ ملی ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی محبوب ہے۔ ''السخلۃ'' بکری یا بھیڑ کا مردار بچہ جس کو گھر والے پھینک دیتے ہیں نبی اکرم ﷺ اس کے پاس کھڑے ہوئے فرمایا کہ کیا تم دیکھتے ہو کہ یہ اپنے مالکوں کے ہاں ذلیل تھا اس لئے پھینک دیا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں ذلت وحقارت سے پھینک دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہاں زیادہ ذلیل ہے بنسبت اس بچے کی اس کے اہل پر یعنی جتنا مالک کے ہاں یہ بچہ ذلیل ہے دنیا اس سے بھی زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں ذلیل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا (دنیا ملعون ہے) یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ سے دور ہے۔ اور دنیا والے بھی ملعون ہیں۔ اس کی رحمت سے دور ہیں۔ سوائے ذکر اللہ کے اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ یا اس کے ذکر سے محبت کرتے ہیں۔ ''او'' اوتنویع کے لئے ہے، بعض نے کہا او کے معنی میں ہے یہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے دور نہیں ہیں بلکہ اس کی رحمت کے مستحق ہیں۔

باب ماجاء ان الدنیا سجن المؤمن الخ

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے جیسے جیل میں آدمی ہو جتنے دن وہاں رہے وہ اس جیل کے داروغے کے تابع ہے جو وہ حکم دے اس پر یہ عمل کرے گا آزادی سے نہ جا سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے نہ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح مؤمن کی بھی چوبیس گھنٹے کی زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کے تابع ہوتی ہے ان کے حکم کے خلاف نہیں کرتا تو یہ پابندی کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی صعوبت کی ہے اس لئے تکلیف سے زندگی گزارتا ہے ہر وقت مصائب میں مبتلا رہتا ہے یہ دنیا کافر کی جنت ہے اس کی زندگی آزاد ہے وہ اپنے آپ کو کسی حکم کا پابند نہیں سمجھتا دنیا میں جو کچھ ملے اس کا وہی ہے باقی بعد کی زندگی ہمیشہ عذاب کی ہے تو اس کی نسبت سے دنیا جنت ہے۔

باب ماجاء مثل الدنیا مثل اربعة نفر

آپ ﷺ نے فرمایا تین خصلتوں پر قسم اٹھاتا ہوں ① کبھی صدقات سے مال کم نہیں ہوتا کیونکہ قرآن میں ہے۔ ﴿یمحق اللہ الربا ویرب الصدقات﴾ ② کسی پر ظلم نہیں کیا گیا کہ اس نے ظلم پر صبر کر لیا ہو مگر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرتے ہیں تو مظلوم جب ظلم پر صبر کرے تو وہ ذلیل نہ ہوگا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی عزت بڑھائیں گے ③ کوئی آدمی سوال کا دروازہ کھولے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر فقر کے دروازے کو کھولتا ہے ایسے آدمی کی ضرورت کبھی پوری نہ ہوگی ہمیشہ مانگتا رہے گا البتہ اگر کوئی ضرورت کی بناء پر مانگے تو الگ بات ہے۔ لیکن جو عادت بنالے وہ ہمیشہ فقر میں مبتلا رہے گا اس کی حاجت بڑھ جائے گی اور کبھی پوری نہ ہوگی۔

باب ماجاء فی هم الدنیا وحبها

جس پر تکلیف آجائے بھوک وقحط سالی آجائے اس نے اپنی حاجت کو لوگوں پر پیش کیا کہ اس کو پورا کرو تو اس کی ضرورت پوری نہ ہوگی اس کا فاقہ ختم نہ ہوگا۔ لیکن جس پر تکلیف آجائے فقر وفاقہ آجائے اور وہ حاجت اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش کردے تو قریب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو فوری رزق دے دیں یا موت آجائے تو ضرورت پوری ہوجائے گی اور جنت میں چلا جائے گا یا ''اجل'' سے

مراد یہ ہے کہ مستقبل میں مال دے دے۔ ''یشترک'' جس میں تکلیف ہے جس نے بے آرام کردیا ہے۔ ''واجدنی الیوم قد جمعت'' فرماتے ہیں کہ جو دنیا انہوں نے جمع کی تھی وہ ۳۰ دینار تھے اور ایک پیالہ تھا اس میں کھاتے بھی تھے آٹا بھی گوندتے تھے مگر پھر بھی اس پر روتے کہ ہم نے دنیا جمع کرلی۔ ''لاتتخذو الضیعة'' ضیعہ سے مراد جائیداد ہے زمین ہو یا کارخانہ ہو۔

باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن

ایک آدمی نے کہا کہ بہترین آدمی کون ہے آپ ﷺ نے فرمایا جس کی عمر زیادہ ہو اور اعمال بہتر اور اچھے ہوں دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ برا آدمی وہ ہے جس کی عمر زیادہ ہو اور اعمال برے ہوں۔ کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو آدمی کرتا ہے اس کی سزا ملتی ہے کچھ گناہ ایسے ہیں کہ گناہ بالفعل نہیں کررہا مگر اس گناہ کے کام کرنے کی کوشش بھی کررہا ہے پکا ارادہ بھی کیا ہے یہ بالفعل گناہ کرنے والے کے برابر ہوگا۔

باب ماجاء فی اعمار هذه الامة الخ

میری امت کی عمریں ۶۰، اور ۷۰ کے درمیان ہیں یہ عموم کے اعتبار سے فرمایا۔

باب ماجاء في تقارب الزمن الخ

تقارب الزمان کی حدیث میں تفصیل موجود ہے کہ وقت بہت تیز گزرے گا کہ ایک گھنٹہ ماچس لگانے کے برابر ہوگا۔

باب ماجاء فی قصر الامل

آپ ﷺ نے فرمایا دنیا میں مسافر کی طرح رہو۔ ''او'' ترقی کے لئے ہے غریب اور مسافر کہیں ٹھہرتا ہے تو کچھ جگہ بناتا ہے لیکن عابر سبیل جگہ نہیں بناتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھہرنا نہیں اس لئے جگہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

''اذا اصبحت'' جب صبح ہو جائے تو شام کی باتیں نہ کریں کہ شام کو یہ کام کروں گا کبھی بھی موت آسکتی ہے اس لئے اعمال میں مصروف ہیں۔ ''وہذا اجلہ'' اور یہ گردن کے ساتھ اس کی موت ہے اس کی انتظار میں ہے مگر اس کی امیدیں بہت دور دور کی ہیں۔ ''نعالج خصاً'' ہم چھپر صحیح کررہے تھے۔ ما اریٰ الامر الاعجل۔ یعنی معاملہ اس سے پہلے نظر آتا ہے کہ یہ باقی رہے اور آدمی مر جائے۔

باب ماجاء ان فتنة هذه الامة المال

ہر امت کے لئے فتنہ تھا اور میری امت کا فتنہ مال ہے پہلے لوگوں میں جو دین تھا وہ اسی مال کی وجہ سے ختم ہوا دین و آخرت کی تمام اعمال اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے باقی نہیں رہے بلکہ سب کچھ دنیا کے لئے ہوگا۔

باب ماجاء لو كان لابن آدم واديان من المال لابتغىٰ ثالثًا

انسان کی فطرت میں لالچ ہے اس کی لالچ کا بیان ہے فرمایا کہ اگر ابن آدم کے لئے سونے سے بھری ہوئی وادی ہو اس کے باوجود وہ چاہے گا کہ اس کے لئے دو ہوں جب دو مل جائیں تو تیسری طلب کرے گا اس کی حرص ختم نہ ہوگی سوائے اس کے کہ مٹی اس کے منہ کو بھر دے یعنی مر جائے اور مٹی میں دفن ہو جائے مطلب یہ ہوا کہ غنیٰ اصل میں صبر وقناعت کا نام ہے ورنہ مال سے آدمی غنی نہیں ہوتا۔

یتوب اللہ الخ جس کی لالچ ختم ہو جائے وہ توبہ کرلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اس پر مہربانی کرے گا۔

باب ماجاء قلب الشيخ شاب الخ

بوڑھا آدمی دو چیزوں کے اعتبار سے جوان بن جاتا ہے ایک وہ چاہتا ہے کہ لمبی زندگی مل جائے کافی عمر گذار چکا ہے مگر مزید عمر کی حرص بڑھ جاتی ہے دوسری چیز جس کے اعتبار سے جوان بن جاتا ہے وہ مال کی لالچ ہے یہ چیزیں اس میں شدت سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ آدمی کی عمر جتنی بڑھتی جائے یہ دو خصلتیں۔ اس میں بڑھتی جاتی ہیں۔

باب ماجاء فی الزهد فی الدنيا الخ

دنیا سے بے رغبتی سے کیا مراد ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ ''زہادۃ فی الدنیا'' سے صبر و قناعت مراد ہے۔ اس باب میں کئی روایات نقل کی ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا دنیا سے زہاد کا معنی یہ نہیں کہ حلال و طیب چیزیں اپنے اوپر حرام کردے اور نہ مال ضائع کرنے کا نام زہادۃ ہے اس میں بہت سے جاہل مبتلا ہو جاتے ہیں وہ زہد لوگوں کے سامنے اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ ہم تو بزرگ ہیں فلاں چیز نہیں کھاتے وہ ہمارے زہد کے خلاف ہے۔ فرمایا زہد یہ ہے کہ جو آپ کے پاس ہوا اس پر آپ زیادہ اعتماد نہیں کرتے بہ نسبت اس کے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے خزانے میں ہے اور آپ تکلیف اور ابتلاء جو آپ کو پہنچی آپ اس کے اجر میں اس طرح رغبت رکھتے ہیں ① کہ آپ کہیں اچھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے مصیبت ڈال دی کیونکہ مجھے اس پر ثواب ملے گا کسی مصیبت کی دعا کرنا تو جائز نہیں مگر مصیبت آجائے تو اس پر ثواب ملے گا جب صبر کرے ② بعض نے اس کا معنی کیا ہے کہ اس کو رغبت اور شوق ہو کہ یہ مصیبت اور رہنی چاہئے تاکہ ثواب ملتا رہے۔ ''سربہ'' بمعنی گھر کہ کسی نے گھر میں امن سے صبح کی اور جسم سے بھی عافیت میں ہے اور ایک دن کی روزی بھی اس کے پاس ہے تو گویا اس نے پوری دنیا جمع کی کیونکہ دنیا صرف اتنی ہی ہے کہ امن سے رہے صحت بھی ہو اور رزق بھی ہو اور اس کے پاس یہ چیزیں ہیں اس لئے اس نے دنیا جمع کرلی۔

باب ماجاء فی الكفاف والصبر عليه

میرے اولیاء میں سب سے زیادہ غبطہ کا لائق وہ مؤمن ہے جو کم حال والا ہے یعنی ہر اعتبار سے یعنی مال، تعلقات کے اعتبار سے کم حال والا ہے۔ ''غامضا فی الناس'' مشہور نہیں بلکہ چھپا ہوا ہے اور لوگ اس کی طرف انگلیاں نہیں اٹھاتے کیونکہ مشہور نہیں اس کی زندگی کفاف والی ہے اور اس پر اس نے صبر بھی کیا ہے پھر آپ ﷺ نے ہاتھ جھاڑے (کم ثابت کرنے کے لئے کہ اس کی اوپر رونے والے کم ہیں اس کی میراث بھی کم ہے۔ بطحاء ریتلی زمین۔ ایک روایت میں ہے کہ جس نے ظاہر اور باطن کے اعتبار سے ایمان لایا اور اس کو بطور کفاف رزق دیا گیا اور اس پر وہ قناعت اور صبر کرے۔

باب ماجاء فی فضل الفقر

ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟ پھر اس نے دو مرتبہ اور کہا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں آپ نے فرمایا اگر واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو تیار کر فقر کے لئے اپنی حفاظت کا آلہ کہ فقر سے بچنے کا انتظام کرلیں فقر اس انسان کو اتنی جلدی آجاتا ہے جتنا سیلاب اوپر سے نیچے تیزی سے آتا ہے کیونکہ انبیاء اشد البلایاء تھے تو ان کے قریب لوگ بھی اشد البلایاء ہوتے ہیں۔ ''تفاجا'' اصل میں اس کپڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے اوپر زین کے نیچے ڈالی جاتی ہے مراد بچاؤ کی چیز ہے۔

باب ماجاء ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنيائهم

ایک روایت میں ہے کہ فقراء مہاجرین، ۵۰۰، سال پہلے اغنیاء سے جنت میں داخل ہوں گے یہ فقر کی فضیلت ہے اب ایک فقیر صابر ہے دوسرا غنی شاکر ہے اس میں سے کون سا افضل ہے اس میں اختلاف ہے مگر ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حدیث سے فقیر صابر کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اشکال بعض روایات میں ۵۰۰ سال کا ذکر ہے بعض میں ۴۰ سال کا ذکر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے اللہ نے چالیس سال بتایا پھر ۵۰۰ سال بتایا بعض نے کہا یہ باعتبار افراد کے ہے کہ بعض افراد جو کہ مہاجرین اولین تھے اور اعلیٰ درجے کے تھے وہ تو ۵۰۰ سال پہلے داخل ہوں گے جو ان سے درجے میں کچھ کم ہیں وہ ۴۰ سال پہلے داخل ہوں گے۔

باب ماجاء فی معیشة النبی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دنیا کی مذمت کی زہد فی الدنیا کا ذکر کیا یہ آج کل کے واعظین کی طرح نہ تھے کہ دنیا کی مذمت کرتے ہیں مگر خود لوگوں سے زیادہ دنیا کے پیچھے دوڑتے ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا اور زہد کو ہمیشہ اختیار کیا جس کا یہاں ذکر ہے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں پیٹ بھر کر کھاتی ہوں تو رو لیتی ہوں مسروق نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ حالت یاد آجاتی ہے جس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی روٹی، کھجور یا لحم دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر نہیں کھایا اس لئے آج فراوانی ہوگئی ہے تو جب میں پیٹ بھر کر کھاتی ہوں تو وہ وقت یاد آجاتا ہے اس لئے روتی ہوں دوسری روایت میں ہے کہ دو دن مسلسل جو کی روٹی نہیں کھائی۔ تیسری روایت میں ہے کہ تین دن تک گندم کی روٹی نہیں کھائی تو یہ کوئی تضاد نہیں احوال مختلف ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک نے اپنے علم کی بناء پر کہہ دیا۔ یبیت اللیالی المتتابعة طاویا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل کئی راتوں تک مسلسل خالی پیٹ رہتے تھے تو طاویاً کا معنی ہے خالی پیٹ "قوتا" کہ جس میں اسراف نہ ہو تو دعا کی کہ آل محمد کے رزق کو قوت بنا دے کہ اس میں کفاف ہو جائے دوسرے کا احتیاج نہ رہے اور اسراف بھی نہ ہو۔ لایدخر شیئا لغد.

اشکال۔ دوسری جگہ ہے کہ ازواج کو سال بھر کا خرچہ اکٹھا دیا جاتا تھا۔ جواب یہ تعارض نہیں کیونکہ ازواج تو سال کا خرچہ جمع کرتی تھیں لیکن خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے دوسرے دن کا بھی خرچہ ذخیرہ نہیں کیا۔

باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی زہد و تقویٰ کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی بھی ایسی پرورش کی تھی ان کی بھی زہد کی زندگی تھی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں پہلا آدمی ہوں جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں خون بہایا ہے پہلا آدمی ہوں جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں تیر پھینکا ہے ایک مرتبہ غصہ میں آگئے تھے اس لئے یہ الفاظ کہتے ہیں کہ آپ مجھے ادب سکھلاتے ہیں جب کہ میں نے ایسے ایسے کام کئے ہیں۔ سب پہلے سات آدمیوں کا سریہ بھیجا گیا تھا سعد اس میں شریک تھے فرماتے ہیں کہ ہم غزوہ کے لئے جاتے تو کھانے کے لئے درختوں کے پتے کیکر کی پھلی ہی ملتی تھی ہماری حالت ایسی ہوگئی کہ جس طرح بھیڑ بکریاں مینگنی کرتی ہیں ہمارا بھی یہ حال ہوگیا۔ "واصبحت بنو اسد" شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اعتراض کئے اور خلیفہ کو شکایت پہنچائی کہ صحیح طور پر نماز ادا نہیں کر سکتے اس لئے فرمایا کہ دین کیلئے ہم نے کام کیا اب یہ لوگ ہمیں دین سکھلاتے ہیں اور دین کے بارے میں ڈانٹتے ہیں اگر اب تک مجھے نماز نہیں آتی تو میں انتہائی خسارے میں پڑ گیا اس میں میری ذلت ہوگی اور میرے اعمال تو پھر تباہ

ہوگئے کہ آج تک نماز صحیح نہ کرسکا اور بچے آج کل کے مجھ سکھلا رہے ہیں۔ ''اصحبت بنواسد'' باقی بعض نے کہا ہے کہ بنواسد سے مراد زبیر بن العوام مراد ہیں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ مراد نہیں یہ مراد لینا غلط ہے صحیح یہ ہے کہ وہ بنواسد بن خزیمۃ بن مدرکہ تھے۔ ''کان اذا صلی بالناس یخیر رجال'' یہ لوگ اصحاب صفہ تھے بھوک کی وجہ سے نماز میں گر جاتے تھے اور وجہ اس کی یہ ہے دین کے ساتھ مصائب لازم ہیں اس وجہ تکالیف آتی ہیں مگر اس پر جو ثواب ملتا ہے اس کی انتہا ہی نہیں اسی لئے آپ ﷺ نے اصحاب صفہ کو تسلی دی کہ اس کے بدلے میں تمہیں کیا ملے گا اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو تم پسند کرو کہ مزید فاقہ آجائے تو اچھا ہے کیونکہ تم اللہ کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہو اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ بہترین بدلہ دین گے ''یستعذب لنا الماء''۔ میٹھا پانی لانے گئے ہیں۔ ''یزعبھا'' بڑا مشکیزہ جو ان پر بھاری تھا۔

''عناقا'' بکری کا بچہ۔ ''جدیا'' بھیڑ کا بچہ۔ ''ماانت بابالغ'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''ستوص به خیراً'' اس تک نہیں پہنچ سکتے اس لئے آزاد کر دیں۔

باب ماجاء ان الغنیٰ غنیٰ النفس

''العرض'' عرض بمعنی دنیا و مافیہا ہے اگر بسکون الراہو یعنی العرض تو معنی ہوگا سامان نقود کے علاوہ۔ غنیٰ دنیا اور اس کی مال ومتاع کا نام نہیں بلکہ جس کے دل میں استغناء آجائے بس غنیٰ یہی ہے جس کو استغناء دل کا حاصل ہو اور صبر و شکر اور قناعت پیدا ہو جائے تو اس کی زندگی اطمینان سے گزرے گی کیونکہ یہ رضاء ہے اللہ کی قضاء کے اوپر یہ آدمی عزت سے زندگی گزارے گا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے گا لیکن جس کے دل میں استغناء نہ ہو اگرچہ کثیر مال ہو۔ وہ مزید کی حرص کریں گے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے اور ذلیل رہیں گے۔

باب ماجاء فی اخذ المال

''خضرۃ'' سبزہ جو زمین پر ہوتا ہے جس طرح انسان کو پسند ہے کہ وہ ایسی سرسبز جگہ پر رہے اسی طرح مال کو بھی انسان پسند کرتا ہے ''حلوۃ'' لذیذ ہے یعنی دنیا کی ظاہری رونق بھی ہے اور لذیذ بھی ہے جس میں یہ دو صفات ہوں انسان اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے فرمایا جس نے دنیا کو حق کی بنیاد پر لے لیا اپنا حصہ حاصل کر لیا بغیر طمع ولالچ کے تو اللہ اس میں برکت ڈال دیتے ہیں۔ ''متخوض'' دنیا میں گھیرنے والا، تو فرمایا بہت سے ایسے ہیں جو دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں دل کی خواہشات پوری کرنے کے لئے مال کمایا بھی اللہ کے حکم اور نبی ﷺ کے طریقے کے خلاف اور استعمال بھی ناجائز کیا یا اللہ نے مال دیا اور نبی ﷺ نے اس کو دیا مگر اس نے استعمال ناجائز کیا تو آخرت میں صرف جہنم ہی ہوگا اس لئے احتیاط کرنی چاہیئے۔

باب

ایسا آدمی جو صرف دنیا کا بندہ ہے ایسا آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے دور رہتا ہے دوسری روایت میں ہے کہ دو بھیڑیئے بھوکے ہوں ان کو بکریوں میں چھوڑ دو یہ بکریوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا وہ آدمی اپنے دین کو نقصان پہنچاتا ہے جو مال کا حریص بن کر اور عزت نفس اور تکبر کی بناء پر پہنچاتا ہے۔

باب

آپ ﷺ چٹائی پر سوئے ہوئے تھے اس کے آثار نظر آرہے تھے ہم نے کہا اگر ہم آپ کے لئے بچھونا بنائیں تا کہ آپ لیٹ لیا

کریں آپ ﷺ نے فرمایا دنیا سے میرا کیا تعلق میری مثال اس شخص کی ہے جو سوار ہو کر آئے درخت کے سائے میں کچھ ٹھہرے پھر چلا جائے تو مجھے دنیا کی ضرورت نہیں۔

باب

آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس کی تابعداری کرتا ہے تو دیکھو کہ دوست کیسا ہے نیک ہے تو اس کا اثر پڑے گا اور فاسق وفاجر ہو تو اس کا اثر تم پر بھی پڑے گا۔

باب

جنازے کے ساتھ تین چیزیں ہوتی ہیں مال، اہل وعیال، اور عمل، ان میں سے مال اور اہل واپس آجاتے ہیں عمل ساتھ رہتا ہے تو اسی کی تیاری کرو۔

باب ماجاء في كراهية كثرة الأكل

زیادہ کھانے کی مذمت کا بیان ہے کہ نہیں بھرا کسی آدمی نے برتن کو جو بدترین ہو پیٹ سے بلکہ چند لقمے جس سے کمر سیدھی ہو یہ کافی ہے لیکن اگر زیادہ کھانا بھی ہو تو ایک پیٹ کا حصہ پانی کے لئے ایک روٹی کے لئے اور ایک سانس کے لئے رکھے اور تقسیم کرے اس میں خیال رہتا ہے کہ خود کم کھایا تو جو بچ جائے گا یہ اس کو دے گا جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

باب ماجاء في الرياء والسمعة

کوئی آدمی عمل کو ریاء اور دکھلاوے کے لئے کرتا ہے اس پر نبی ﷺ نے جو وعیدیں ذکر کی ہیں ان کا ذکر ہے اس سلسلے میں حدیث لائی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو آدمی اپنے عمل کو دوسروں کے سامنے دکھلانے کیلئے کرتا ہے یعنی نیک عمل اس لئے کرتا ہے کہ لوگ دیکھ لیں تو وہ مقصد حاصل ہو جائے گا اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کو دیکھا دے گا اور جو آدمی لوگوں کو سنانے کے لئے پڑھتا ہے اللہ اس کی اس بات کو لوگوں کو سنا دے گا لوگ اس کی بات سن لیں گے۔ یا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں یہ آدمی نیک اعمال کو اس مقصد کے لئے کرتا ہے تو آخرت میں اس کی سزا دیکھ لے گا اللہ اس کو سزا دیں گے۔ ''**ان شفيان الاصبحي**'' یہ صحابی نہیں تابعی ہے صحابیت کا شرف اس کو حاصل نہیں ہوا یہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جلاد تھا یہ مدینہ میں آیا آدمی کو دیکھا سب لوگ اس کے اردگرد جمع تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ''ثم نشغ ابو ہریرۃ'' آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

فيقول الله للقاري ۔ کروڑوں میں چند لوگ ہوتے ہیں جو دین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے جس نعمت کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو منتخب کیا اس لئے اس نعمت کا سوال کریں گے کہ اس نعمت سے کیا نفع اٹھایا اس کا کتنا حق ادا کیا۔

باب

''جب'' بمعنی کنواں، تو فرمایا کہ جب الحزن سے پناہ مانگیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جہنم اس وادی سے سو مرتبہ دن میں پناہ مانگتی ہے یہ ان قراء کے لئے ہے جو دکھلاوے کیلئے پڑھتے ہیں۔

باب

ایک آدمی نیک کام پوشیدہ طریقے سے کرتا ہے اور جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ عمل کسی کو معلوم ہو گیا ہے اس لئے وہ خوش ہو جاتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو دو اجر ہیں ایک چھپانے کا پھر جب یہ بات مشہور ہوگئی تو اس کا بھی ثواب ملے گا مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ دین دار ہے لوگوں کو دکھلاوہ نہیں کرتا لیکن اس کی نیکی کے آثار ظاہر ہو گئے اگر اس پر خوش ہو تو یہ ممنوع نہیں لیکن اگر اس لیئے اعمال کرے اور اس پر خوش ہو کہ لوگ اسکی عزت کرے تو یہ ریاء ہے، بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ بات مشہور ہو تو یہ خوش ہو کہ لوگ میری اقتداء کریں گے اور اس کا اجر مجھے بھی ملے یہ سنت اس نے زندہ کی جو بھی اس پر عمل کرے گا اس کو بھی ثواب ملے گا۔

باب المرء مع من احب

جو آدمی جس شخص کو پسند کرے اسکے طریقے کو اپنائے اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا اگر کوئی نبی سے محبت کرے اور ان کے طریقوں کو اپنائے تو یہ قیامت کو انہیں کے ساتھ ہوں گے اور جس کو کسی اور کے ساتھ محبت ہو اس کے طریقے کو اپنائے تو اسی کے ساتھ ہوگا۔

باب ماجاء فی حسن الظن باللّٰہ تعالیٰ

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندے کے ساتھ میرا معاملہ اس کے یقین کے مطابق ہوتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے پکارے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بندے نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر یقین بنالیا اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا ہی معاملہ کریں گے کیونکہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس لئے جس طرح کا یقین ہوگا اسی طرح کا معاملہ بھی کریں گے جو پتھروں سے مانگتے ہیں وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ دیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ساتھ معاملہ ایسا کرتا ہے کہ پتھر کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ دے دیتا ہے کوئی آدمی اپنے رزق میں خود تنگی پیدا کرے کہ خرچ نہ کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا ہی کریں گے کہ رزق تنگ کر دیں گے لیکن کوئی بخل نہ کرے وسعت وفراخی سے خرچ کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی ایسا ہی معاملہ کریں گے۔ حدیث میں واقعہ ہے کہ ایک آدمی میراثی تھا اس سے کماتا تھا نبی اکرم ﷺ نے کہا یہ چھوڑ دو کہنے لگا اس پر میرا گزارہ چلتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا تم نے حلا ذرائع استعمال کیوں نہیں کئے تو اس نے بھی جو ذرائع استعمال کئے تھے اسی سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو دیا۔ اگر حلال ذرائع استعمال کرتا تو وہاں سے ملتا۔

باب ماجاء فی البر والاثم

بر کے معانی احادیث میں کئی استعمال ہوئے ہیں مثلاً طاعت، عبادت خوف، حسن الخلق مع المخلوق وغیرہ۔ اس باب میں حدیث لائے اس میں ہے کہ ایک آدمی نے بر کا سوال کیا تو آپ نے مخاطب کے احوال کو دیکھ کر جواب دیا اس آدمی میں حسن خلق کی کمی تھی اس لئے کہا کہ برا چھے اخلاق کا نام ہے یا مختلف اوقات کے اعتبار سے اس کا مصداق حسن خلق بتادیا ورنہ ہر نیک عمل کو کہا جاتا ہے اور گناہ یہ ہے کہ دل میں یہ کھٹکا رہے کہ کوئی دیکھ نہ لے اور اس کے کرنے میں اطمینان قلب نہ ہو۔

باب ماجاء فی الحب فی اللّٰہ

اللہ فرماتے ہیں کہ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں میرے جلال کی وجہ سے ان کے لئے نور کے ممبر ہوں گے کہ انبیاء شہداء اس پر غبطہ کریں گے اس سے ایسے آدمی کا انبیاء شہداء سے افضل ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ یہاں حقیقت میں غبطہ مراد نہیں بلکہ ان کے مرتبے

کے بلند ہونے کو مؤکد کرنا مقصود ہے۔"فاجتمعا علی ذالک وتفرقا"محبت کی تو اللہ کی وجہ سے اگر ان میں تفریق ہوئی تو وہ بھی صرف اللہ کے لئے اپنی ذاتی مقاصد کی وجہ سے نہ ہو یا مطلب یہ ہے کہ جب اکٹھے ہوتے ہیں تو اللہ کے دین کی خاطر اور اگر مجلس ختم کریں تو وہ بھی اللہ ہی کے دین کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے اٹھیں۔

باب ماجاء فی اعلام الحب

اللہ کی رضا کے لئے کسی سے تعلق ہو تو اس کو بتادے تا کہ وہ بھی محبت کرے۔

باب ماجاء فی کراھیة المدحة والمداحین

تعریف میں مبالغہ ویسے بھی صحیح نہیں مگر کسی کی تعریف اس کے سامنے کرنا یہ باعث فتنہ ہے اس کا ذکر ہے کہ ایک آدمی نے امیر کے سامنے اس کی تعریف کی تو مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مٹی لی اس کے منہ پر ڈالی دی اور فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ ایسی تعریف کرنے والوں کے منہ پر مٹی ڈالیں سامنے کی تعریف شریعت میں ممنوع ہے کیونکہ جس کی تعریف کرو گے وہ خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے اس میں غرور آجاتا ہے اور جو تعریف کرتا ہے یہ کبھی ایسی صفات بیان کرے گا جو اس میں نہ ہوں تو یہ جھوٹ ہوگا دوسرا سامنے کی تعریف اس کی خوشنودی کے لئے ہوتی ہے دل میں محبت نہیں ہوتی اس لئے یہ نفاق ہے کہ سامنے تعریف کر رہا ہے بعد میں برائی بیان کرے گا۔ تیسرا ظلم بھی ہے کیونکہ یہ اس کو ابھارے گا وہ ظلم کرے گا تو مداح بھی اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ چوتھا اس میں اس مداح کی اپنی ذلت ہے۔ فجعل یحثوفی وجهه التراب۔ اس کا معنی مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظاہری معنی لیا اس لئے مٹی ڈالی بعض اہل علم کہتے ہیں کہ وہ تعریف کرتا ہے پیسوں کے لئے اور دنیا حقیر ہے مٹی کی طرح اب تم پیسے نہ دو تو تمہاری برائی بیان کرے گا اس لئے اس کا منہ بند کرنے کے لئے پیسے دے دو۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ آپ کی خاشامد کرے تو اس کی تصویب نہ کرو بلکہ اس کو ذلیل کردو اس کو اس طرح سمجھاؤ کہ وہ شرمندہ ہو جائے۔

باب ماجاء فی صحة المؤمن

آپ کامل مؤمن کو ساتھی بنائیں کیونکہ اس سے آپ میں بھی ثبات پیدا ہوگا اور فرمایا تمہارا کھانا سوائے نیک کے نہ کھائے یعنی دعوت متقیوں کے علاوہ کسی کی نہ کریں البتہ کوئی مضطر ہو تو اس کو کھلائیں اگر چہ وہ فاسق ہو لیکن یہاں مراد ہے کہ آپ دعوت متقیوں کی ہی کریں کیونکہ وہ کھانا کھا کر عبادت کرے گا تو آپ کو ثواب ملے گا اور اگر فاسق کھائے وہ ظلم کرے گا تقویت آپ کے کھانے سے اس کو ملی اس لئے آپ بھی ظلم میں شریک ہوں گے۔

باب فی الصبر علی البلاء

آزمائش اور ابتلاء انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام پر زیادہ آتی تھیں اور پھر ان پر جوان کے امثل ہوں اگر دنیا میں ابتلاء آئے اس سے اس کو عبرت حاصل ہو تو یہ اس کے لئے باعث رحمت ہے کہ اب آخرت میں سزا سے معافی ہو جائے گی کیونکہ سزا جب دنیا میں ملی تو وہ سمجھے گا گناہ کی وجہ سے ملی تو توبہ کرلے گا اور اگر کسی کو دنیا میں سزا ملی وہ عبرت حاصل نہیں کرتا مزید سرکشی کرتا ہے تو یہ اس کے لئے باعث عذاب ہے کیونکہ وہ گناہ کرتا رہے گا اور معافی نہیں مانگے گا اس لئے پھر آخرت میں سزا ملے گی۔

"ان عظم الجزاء مع عظم البداء" اس کو عظم الجزاء مع عظم البداء بھی پڑھا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ جتنی آزمائش بڑی ہوگی اس کا بدلہ بھی اتنا ہی بڑا ملے گا۔

باب ماجاء فی ذهاب البصر

یہ بھی آزمائش ہی میں سے ہے "کریمیته" دوسرے روایات میں ہے "حبیبته" مراد آنکھیں ہیں یہ کریم بھی ہوتی ہیں اور محبوب بھی تو فرمایا کہ کوئی مؤمن ہو اس کی آنکھیں ختم ہوجائیں وہ اس پر صبر کرے تو اس کے لئے جنت ہے۔ دنیا کی لذت عارضی ہیں جب کے جنت ابدی ہے تو اللہ اس فانی نعمت کے بدلے میں ابدی نعمت یعنی جنت عطا کریں گے۔ آخرت میں جب اہل بلاء کو بدلہ ملے گا لوگ تمنا کریں گے کہ کاش ہم پر سخت سے سخت ابتلاء آتی ہمارے گوشت کو کاٹا جاتا تو اچھا تھا تاکہ ہمیں یہاں ثواب ملتا "یختلون الدنیا بالدین" دین کے ساتھ دنیا کمائیں گے دنیاداروں کے سامنے سادہ لباس پہنیں گے تاکہ لوگ متاثر ہوں مگر ان کے دل دین کے لئے بھیڑیوں سے بھی سخت ہوں گے۔

باب ماجاء فی حفظ اللسان

وہ اعضاء جن کی وجہ سے انسان ہلاک بھی ہوسکتا ہے اور ان کیوجہ سے دنیا وآخرت کی سعادت بھی حاصل کرسکتا ہے ان میں سے زبان بھی ہے اس کا ذکر ہے۔ "املک علیک لسانک" زبان کو قابو میں رکھیں اور آپ کے گھر میں آپ کی گنجائش ہو یعنی اپنی حیثیت کے مطابق کام کریں اور اپنی غلطی پر روئیں یہ نجات ہے دوسری روایت ہے تکفیر اللسان تمام اعضاء زبان کے سامنے اطاعت اور فرمانبرداری اور انقیاد حاصل کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم آپ سے وابستہ ہیں تم سیدھی رہو ہم بھی سیدھے رہیں گے آپ میں نقصان آگیا تو ہم بھی سارے ہلاک ہوجائیں گے۔ تیسری جگہ ہے کہ جس نے دو چیزوں کی ضمانت دی اس کو میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں زبان اور شرمگاہ کیونکہ نفسی خواہشات ساری شرمگاہ سے ہوتی ہیں اور تمام اچھی اور بری باتیں زبان سے سرزد ہوتی ہیں اس لئے ان کو جائز استعمال کیا تو ضرور جنت ملے گی۔

باب

عہد مواخات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں کیا تھا تو سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان مواخات کی سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام درداء کو دیکھا پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا تمہارا بھائی اس نے دنیا کی زینت چھوڑ دی ہے اب عورت بھی دنیا کی نعمتوں میں سے ہے اس لئے یہ حالت ہے اب سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کھانا لایا، سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تم بھی کھاؤ اس نے کہا میں صائم ہوں انہوں نے کہا تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا پھر انہوں نے سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا سو جاؤ میں نماز پڑھوں گا انہوں نے کہا تم بھی سو جاؤ تو وہ بھی سو گئے پھر صبح اٹھے اور نماز ادا کی پھر سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے تمہارے رب کا تم پر حق ہے تمہاری اہل کا تم پر حق ہے اس لئے ہر حق والے کو حق دو۔ کیونکہ دین اسلام میں رہبانیت نہیں جس طرح احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ جہاد کے لئے جارہے تھے ایک جگہ خوبصورت غار تھی اس میں پانی بھی تھا اس نے اجازت مانگی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ یہاں بیٹھ کر عبادت کروں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا اور فرمایا میدان جہاد کی صف میں ایک ساعت کھڑا ہونا ۶۰ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

باب

معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خط لکھا کہ مختصر اور جامع وصیت لکھیں۔ انہوں نے حدیث لکھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضامندی کرتا ہے اور اس میں لوگوں کی ناراضگیاں پیدا ہو جائیں گی مگر کوئی اللہ کی رضا حاصل کرے لوگ بے شک ناراض ہوں تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جائے گا لوگوں کی مشقت سے یعنی لوگوں کی ناراضگیوں کی پرواہ نہ ہوگی جو کام دوسرے اس کا کرتے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ خود کرا دیں گے لیکن کوئی لوگوں کی رضا کو تلاش کرے اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناراض کر کے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات توڑے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ختم ہو جائے گی اللہ تبارک وتعالیٰ کا تعلق ختم ہو جائے گا اب لوگوں کے حوالے ہو جائے گا اور لوگ اپنے لئے خیر و شر کے مالک نہیں تو اس کو کیا نفع دیں گے نتیجۃً ذلیل ورسوا ہوگا۔

ابواب صفة القيٰمة

ابواب الزہد کے بعد قیامت کے ابواب کو لائے مناسبت یہ ہے کہ زہد میں جو اعمال بتائے تو فرماتے ہیں کہ یہ اعمال کہاں کام آئیں گے تو جواب دیا کہ قیامت میں کام آئیں گے۔

باب ماجاء فی شان الحساب والقصاص

قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ ہر آدمی سے کلام فرمائیں گے مراد مومنین ہیں تو فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس بندے کے درمیان ترجمان نہ ہوگا (ترجمان کہتے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرے) فرماتے ہیں دائیں بائیں اعمال ہوں گے جو اس نے کئے اور آگے آگ ہوگی اس لئے جہنم سے اپنے آپ کو جس طرح بچا سکتے ہیں بچائیں اگر اور طاقت نہ ہو تو ایک کھجور صدقہ کر کے بھی آگ سے بچ سکتے ہیں۔ اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ نے جو صفات اپنے لئے ثابت کیں ہیں یا نبی ﷺ سے ثابت ہیں ان تمام صفات اور اسماء پر ایمان لاتے ہیں مانتے ہیں البتہ اس کی کیفیت مجہول ہے اس کا ہم سوال نہیں کرتے پھر متقدمین اہل السنۃ کا مسلک یہ ہے کہ بغیر تاویل کے ایمان لائیں گے جیسے ید "وجہ" اللہ کے سامنے باتیں کرنا اور استواء وغیرہ ان کا معنی ظاہر کریں گے البتہ کیفیت ہمیں معلوم نہیں اس لئے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا الاستواء معلوم والکیفیة مجهول والسوال عنه بدعة۔ دوسرا مسلک جہمیہ کا ہے یہ تمام اسماء وصفات کے منکر ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں صفات کے لئے موصوف ہوگا تعدد صفات تعدد موصوف چاہے گا تو الٰہ کا متعدد ہونا لازم آئے گا اس لیئے جہمیہ کے ہاں کلام کی صفت بھی اللہ کے لیئے ثابت نہیں اس لیئے وکیل نے کہا کہ اہل خراسان میں چونکہ جہمیہ زیادہ ہیں اس لئے ان کو وہاں جا کر یہ حدیث سنانی چاہئے۔ تیسرا مذہب معتزلہ کا ہے یہ اسماء کو مانتے ہیں مگر صفات کو نہیں مانتے مگر احادیث سے ان کی تردید ہوتی ہے بلکہ احادیث سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء اور صفات کا اثبات ہوتا ہے۔ دوسری روایت ہے کہ بندے سے پانچ سوال ہوں گے۔ ① عمر کہاں خرچ کی ② جوانی کہاں ختم کی ③ مال کس طرح کمایا تھا حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے اور ④ مال خرچ کہاں کیا۔ ⑤ اور علم پر کتنا عمل کیا۔

باب

سورج ایک میل کی مقدار پر ہوگا بعض میں دو میل کا ذکر ہے اب میل سے کیا مراد ہے سلائی مراد ہے یا مسافت مراد ہے جو فرسخ کی مقدار ہوتا ہے صحیح یہ ہے کہ مسافت والا میل مراد ہے قیامت میں خرق العادت کام بہت ہوتے ہیں یہ بھی خرق عادت کام ہوگا کہ سارے ایک جگہ کھڑے ہوں گے سورج سب کے قریب ہوگا مگر بعض منہ تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے بعض ایڑھیوں تک ڈوبے ہوں گے بعض نے کہا کہ بعض زمین اونچی کی جائے گی بعض اوپر اگر یہ مراد لیں تو یہ بھی خرق عادت ہی ہے۔

باب ماجاء فی شان الحشر

"حفاۃ" بغیر چپل کے۔ "عراۃ" بغیر کپڑوں کے۔ "غرلا" بغیر ختنے کے اس کا ایک مطلب بعض نے ظاہری مراد لیا ہے کہ پیدائشی ننگے ہوں گے بعض نے کہا کہ اٹھتے وقت ساتھ ہوگا مگر بعد میں گر جائے گا اور ننگے ہو جائیں گے تو سب سے پہلے ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کو کپڑے پہنائیں جائیں گے "فیقول اصحابی" بعض نے کہا اس سے منافقین مراد ہیں بعض نے کہا کہ وہ مراد ہیں جو مرتد ہو گئے تھے تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے میں۔ بعض نے کہا کہ اس سے عام اہل بدعت مراد ہیں۔

باب ماجاء فی العرض

عرض الناس علی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین عرضات میں لوگوں کو اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا پہلے عرض میں جدال ہوگا یعنی لوگ کہیں گے ہم نے شرک نہیں کیا کفر نہیں کیا اور ہمارے پاس نبی نہیں آیا اور یا نبی نے احکام نہیں پہنچائے اس کے بعد جب انسان کے اعضاء گواہی دیں گے تو اس وقت عرضہ ثانیہ میں یہ لوگ معذرت کریں گے کہ یہ عذر تھا یہ عذر تھا پھر تیسرا عرض ہوگا جب اعمال نامے پیش ہوں گے کامیاب لوگوں کو دائیں ہاتھ اور بد بخت کو بائیں ہاتھ میں ملے گا۔

باب منه

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ساتھ حساب وکتاب میں جھگڑا شروع ہوا تفتیش شروع ہوئی تو وہ ہلاک ہوگیا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کہ آیت میں تو ہے کہ ﴿فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حساباً یسیراً ﴾ تو یہ تعارض ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن میں جو مذکور ہے وہ عرض اعمال ہے وہاں نقاش نہیں نقاش تو ان سے ہوگا جس کو بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا ان سے نقاش ہوگا لیکن دائیں ہاتھ والے کامیاب ہوں گے اب ان کے ساتھ نقاش نہ ہوگا اس لئے تعارض نہیں،

باب منه

قیامت کے دن ابن آدم کو لایا جائے گا گویا کہ وہ بھیڑ کا چھوٹا بچہ ہے یعنی حقیر شکل میں ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے کہیں گے کہ میں نے نعمتیں دیں ہر قسم کی تو آپ نے کیا کیا وہ کہے گا اس کو دنیا میں جمع کیا بڑھایا آپ کے دیئے ہوئے سے زیادہ چھوڑ آیا ہوں اجازت دیں لے آؤں اللہ تبارک وتعالیٰ کہے گے آگے کیا بھیجا وہ پھر پہلی بات کرے گا کہ دنیا میں بھیج دو مال لے آؤں یہ ایسا شخص نکلا کہ اپنے ساتھ کوئی خیر نہیں لایا آخرت کی کچھ تیاری نہیں کی اس لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ "ترأس" رئیس القوم یعنی سردار۔ "تربع" جاہلیت کے زمانے میں قانون تھا کہ سربراہ کو تمام مال کا ربع ملے گا عبدالملک بن مروان مدینہ آیا پوچھا کوئی صحابی ہے کہا گیا ایک ہے ان کو بلایا پوچھا کہ ہم موت کو ناپسند کیوں کرتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ دنیا میں بنگلہ بناؤ اب تمہیں کوئی نکال کر جنگل میں بھیج دے تو تم کب خوش ہوگے، اب ہم نے بھی دنیا کو آباد کیا آخرت کی تیاری نہیں کی دوسرا سوال کیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کس طرح پیش ہوں گے جواب دیا کہ مؤمن کو اس طرح پیش کیا جائے گا جس طرح بچوں اور اہل سے دور آدمی سفر سے لوٹتا ہے تو کتنا خوش ہوتا ہے اور کافر اور فاسق کو اس طرح پیش کیا جائے گا جس طرح بھاگا ہوا غلام اس کو کھینچ کر مالک کے پاس لایا جائے سزا کے لئے۔

باب ماجاء فی الصور

صور کیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت کی کہ صور ایک سینگ ہے اس میں اسرافیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پھونکیں گے۔ کیف انعم۔ کیسے خوش ہوں یا میری حالت کیسے اچھی ہو جب کہ فرشتے نے صور منہ کے ساتھ لگایا ہوا ہے اور اجازت ملنے کے لئے کان لگائے ہوئے بیٹھا ہے کہ کب اجازت ملے پھونک دوں۔

باب ماجاء فی شان الصراط

صراط جو پل ہے جس سے سب نے گذرنا ہے۔ ان منکم الا واردھا اس کا ذکر ہے کہ اس سے گزرنے والوں کا شعار کیا ہوگا تو فرمایا کہ سب یہ آواز بلند کریں گے۔ رب سلم سلم۔ بعض میں ہے لا الٰہ الا اللّٰہ۔ بعض میں ہے یا اللّٰہ لا الٰہ الا اللّٰہ پڑھیں گے۔ تو تطبیق یہ ہے کہ عام امتیں رب سلم سلم کہیں گے اور امت محمدیہ ﷺ یا اللّٰہ لا الٰہ الا اللّٰہ پڑھیں گے۔ "فاطلبنی عند الحوض" یہاں حدیث میں ہے کہ پہلے صراط ہے پھر میزان پھر حوض ہے۔ بعض نے کہا پہلے حوض ہے پھر صراط پھر میزان۔ تو بعض نے تطبیق دی ہے کہ ایک حوض کی جگہ صراط سے پہلے ہوگی ایک صراط کے بعد ہوگی بعض نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ صراط کے بعد حوض ہوگا۔

باب ماجاء فی الشفاعة

یہاں شفاعت کبریٰ کا ذکر ہے شفاعت میدان قیامت میں مختلف ہوں گے اس لئے یہ شفاعت کبریٰ ہے جو نبی اکرم ﷺ کی خصوصیت ہے اہل سنت کے ہاں بالاجماع شفاعت ہوگی اور ظاہر ہے کہ شفاعت مجرموں کی ہوگی جس طرح دوسری جگہ ہے شفاعتی لاہل الکبائر شفاعت کے لئے قرآن نے دو شرطیں لگائی ہیں ① شفاعت کرنے والے کو اذن مل جائے ② جس کی سفارش کریں گے ان کے لئے بھی شفاعت تب ہوگی جب اللہ اجازت دیں۔ باقی قرآن میں بعض جگہ شفاعت کی نفی آئی ہے اس لئے معتزلہ اور خوارج شفاعت کے منکر ہیں۔ کیونکہ قرآن میں ہے کہ ان کے لئے شفیع نہ ہوگا حمیم نہ ہوگا۔ مگر اہل سنت کہتے ہیں قیامت کے دن شفاعت ہوگی مگر مؤمنین کی جہاں شفاعت کی نفی کی ہے وہ شفاعت جبری ہے کہ زبردستی کوئی شفاعت نہیں کرا سکتا اسی طرح کافروں سے شفاعت کی نفی ہے کہ کافروں کے لئے شفاعت قبول نہ ہوگا نہ ان کا کوئی شفیع ہوگا یہ شفاعت مؤمنین کے لیئے ہوگی مگر قیامت میں لیکن دنیا میں شفاعت نہیں کہ کوئی مصیبت میں گرفتار ہو اور کوئی سفارش کر کے چھوڑا لے بلکہ دنیا کی مصیبت سے بچنے کے لئے طریقہ اللہ نے دوسرا بتایا ہے کہ آدمی دعا کرے اللہ کے اسماء وصفات کو وسیلہ بنا کر اللہ سے مانگے۔ آخرت میں چند جگہوں پر شفاعت نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے ایک مذکورہ باب میں موجود ہے یعنی شفاعت کبریٰ۔ دوسرا وہ شفاعت جو نبی کریم ﷺ کریں گے یہ اس وقت ہوگی جب اللہ بغیر حساب کتاب کے بعض امت کو نبی ﷺ کی شفاعت سے جنت میں بھیجیں گے۔ تیسری شفاعت عام ہوگی ان کے لئے جن پر جہنم لازم ہو چکا ہوگا یہ نبی ﷺ بھی شفاعت کریں گے اور اولیاء اور صلحاء بھی۔ چوتھی شفاعت ان کے لئے ہوگی جو جہنم میں کچھ سزا کاٹ چکے ہوں گے۔ پانچویں شفاعت رفع درجات کے لئے ہوگی تو قیامت میں یہ پانچ جگہ شفاعت ہوگی۔ اول رسل الیٰ اھل الارض الخ ۔ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بھی نبی تھے مگر نوح کو پہلا رسول اس لئے کہا کہ ان کی قوم سے شرک شروع ہوئی تھی آپ پہلے رسول تھے جن کو مشرک قوم میں بھیجا گیا تھا۔

باب منه

شفاعت ہر ایک کے لئے ہوگی جو مشرک نہ ہوں لیکن مشرک کی شفاعت نہ ہوگی اسی باب میں اس شفاعت کا ذکر ہے جو نبی اکرم

ﷺ کی خصوصیت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شفاعت سے کئی لوگ بغیر حساب وکتاب کے جنت میں جائیں گے۔ قلت من هذا قالوا ابن ابی الجذعاء یہاں ابن ابی الجذعاء اس کا جواب نہیں کہ یہ آدمی سفارش کرے گا بلکہ فقال جل منهم سمعت رسول اللہ ﷺ الخ میں رجل سے مراد ابن ابی الجذعاء ہے باقی یہ آدمی جو شفاعت کرے گا یہ کون ہوگا بعض نے کہا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے بعض نے کہا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے مبہم چھوڑا ہے تو اس کو ابہام پر ہی رہنے دیا جائے۔

باب ماجاء فی صفة الحوض

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میری حوض میں لوٹے ہوں گے آسمان کے ستاروں کی طرح یعنی اتنے زیادہ ہوں گے کہ جتنے آسمان کے ستارے زیادہ ہیں تو لوٹوں کی کثرت سے حوض پر آنے والوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت دوسری روایت میں ہے کہ ہر نبی کا حوض ہوگا ہر نبی اس پر فخر کریں گے کہ ہمارے حوض پر آنے والے زیادہ ہیں اور مجھے امید ہے کہ زیادہ آنے والے میرے حوض پر ہوں گے۔ ''الاباریق'' ابریق کی جمع ہے ایک کوزہ ہوتا ہے یہ وہ لوٹا ہے جس میں ٹونٹی ہو مگر ابریق وہ لوٹا ہے جس کی ٹونٹی نہ ہو بلکہ جگ کی طرح ہوں۔

باب ماجاء فی صفة اوانی الحوض

اگر چہ حدیث میں اور چیزوں کا بھی ذکر ہے مگر ترمذی چونکہ فقیہ بھی ہیں اس لئے یہ ایک حدیث سے کئی مسائل کا استنباط کرتے ہیں اس لئے یہاں فقط اوانی پر باب باندھا۔ ''البرید'' اصل میں فارسی لفظ تھا۔ (دم بریدہ) دم کٹا اور جس اونٹ پر ڈاک کو لے کر جاتے تھے اس کا بھی دم کاٹ دیتے تھے اس لئے اسی اونٹ پر بھی برید کا اطلاق ہونے لگا یہ بہت تیز رفتار ہوتا ہے ہر آدمی اس پر سوار نہیں ہوسکتا اسی لئے ابی سلام الحبشی نے اس تکلیف کی امیر کو شکایت کی کہ مجھے بہت مشقت ہوئی۔

''ان تشافهنی'' چاہتا تھا کہ تم سے بالمشافہ سنوں۔ پھر ابی سلام نے حدیث عمر بن عبدالعزیز کو سنائی کہ حوض کی لمبائی عدن سے عمان تک کی مقدار میں ہوگی۔ ''رؤسا الدنس'' ایک تو یہ ہے کہ عادت ہو کسی کی سر نہ دھونے کی کنگی نہ کرنے کی تیل نہ لگانے کی مگر یہ لوگ دین کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اس لئے ان کو ان چیزوں کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ ''ولا یفتح لهم السدد'' ان کے لئے بند دروازے نہیں کھلتے یعنی وہ ملنا چاہیں تو ان کو کوئی نہیں ملتا اس لئے دروازے بند رہتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں نے متنعمات سے نکاح کیا ہے کیونکہ ان کی بیوی عبدالملک کی بیٹی فاطمہ تھی اس کے والد، دادا، چار بھائی اور شوہر سب خلیفہ تھے بنت الخلیفة جدها خلیفة زوج الخلیفة اخت الخلائف یہ اس کی خصوصیت تھی اس لئے اس جیسی متنعمہ کون ہوگی۔ اشکال۔ ایک روایت میں ہے میرا حوض عدن سے عمان تک ہوگا دوسری میں ہے عمان سے ایلیہ تک ہے بعض میں کوفہ سے حجر تک ہے۔ بعض میں تین دن کی مسافت تک کا ذکر کیا ہے تو یہ تعارض ہے۔ جواب ① آپ ﷺ جہاں جس شہر میں گئے ان لوگوں کو بتایا تو ان لوگوں کے اعتبار سے ان شہروں کے نام لئے جواب ② ان شہروں میں جو مسافت بنتی ہے بعض میں ۳ دن بعض میں مہینہ بعض میں ڈیڑھ مہینہ بنتا ہے یہ اصل میں چلنے والے کے اعتبار سے کہا بعض آہستہ چلتے ہیں بعض برید پر جاتے ہیں جواب ③ اس کی مسافت کا بڑا ہونا بتایا باقی سمجھانے کے لئے ان شہروں کے نام لئے ورنہ کثرت مسافت مراد ہے۔ جواب نمبر ④ پہلے وحی میں کم بتایا تھا پھر بعد میں بذریعہ وحی زیادہ بتادیا اور بعض صحابہ نے پہلے والی وحی بتائی کیونکہ ان کو دوسری کا علم نہ ہوسکا بعض نے دوسری مرتبہ سنا اسی کو بیان کردیا اس لئے اختلاف ہوگیا۔

باب

پہلی روایت میں اسراء کا ذکر ہے "ولم یفسر لهم" نبی ﷺ نے صحابہ کو بتایا نہیں کہ وہ ستر ہزار کون ہوں گے بعض صحابہ نے کہا وہ ہم ہیں بعض نے کہا وہ مراد ہیں جو پہلے ہی حالت اسلام میں ہوں فقال سبقک بها عکاشة صرف سد اللباب فرمایا کیونکہ پھر تیسرا اٹھتا وہ کہتا میرے لئے دعا کرو دوسرے اٹھیں گے وہ کہیں گے ہمارے لئے دعا کرو بعض نے کہا ہے کہ عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب دعا کرنے کی درخواست کی وہ قبولیت کا وقت تھا اس لئے اس کے لئے دعا قبول ہوگئی لیکن دوسرے آدمی نے جب دعا کی درخواست کی وہ وقت قبولیت کا نہ تھا۔ "من خاف ادلج" جو دشمن سے ڈرتا ہے تو صبح سویرے چلتا ہے اس لئے مامون نکل جاتا ہے اسی طرح مؤمن بھی اعمال حسن کرے تو مشقتوں سے بچ جائے گا مگر سستی کرے تو نقصان اٹھائے گا۔"

متقی انسان اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ایسی باتیں نہ چھوڑے جن میں حرج نہیں یعنی خلاف اولی باتوں کو چھوڑے کیونکہ یہ خلاف اولی باتیں جب نہ کرے گا تو گناہ کی باتوں سے بھی بچ جائے گا تقویٰ کے کئی درجات ہیں ادنیٰ یہ ہے کہ کفر وشرک سے بچ جائے دوسرا یہ ہے کہ حرام سے بچے تیسرا درجہ یہ ہے کہ خلاف اولیٰ باتوں سے بھی بچ جائے یہ اعلیٰ درجہ ہے تقویٰ کا۔ دوسری روایت میں ہے وہ کیفیت جو میری مجلس میں ہے وہ باہر نہیں رہتی مجلس سے آدمی اٹھ جائے تو وہ آثار باقی نہیں رہتے لیکن اگر کسی میں نبی اکرم ﷺ کی تاثیر باہر بھی باقی رہے تو فرشتے دھوپ میں ان پر سایہ کرتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ فرشتے ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ "ان لکل شی شرة" ہر چیز کی منتہاء ہے اور حرص ہے اور ہر چیز جس نے کمال حاصل کرلیا اس میں تنزل ہے دینی امور ہوں یا دنیاوی امور ہوں اب اگر کام کرنے والے نے انصاف سے کام لیا تو اسی سے خیر کی توقع کرو لیکن اگر اس کی طرف لوگ انگلیاں اٹھائیں کہ فلاں تو کسی درجے پر پہنچ گیا اس سے خیر کی امید نہ کرو یعنی مطلب یہ ہے کہ اب اس میں تنزل شروع ہوگا "الا من عصمه الله" ہاں اللہ بچالیں تو دوسری بات ہے۔ "جاء ت الواجفة" سے نفخہ اولیٰ اور "نتبعها الرادفه" سے نفخہ ثانیہ مراد ہے۔ اذا دفن العبد الفاجر او الکافر یہاں او تنویع کے لئے نہیں بلکہ شک کے لئے ہے کیونکہ مؤمن کے مقابلے میں کافر ہی کا ذکر ہوتا ہے فاسق کا اکثر ذکر نہیں کیا جاتا تاکہ وہ ڈرتا رہے۔

باب

"سمل" بمعنی پرانا کپڑا۔ "قطیفة" بمعنی چادر۔ "وسادة" بمعنی تکیہ لیکن یہاں بمعنی گدا کے ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اس کو نیچے بچھا کر اس پر لیٹتے تھے۔ "لیف" چھلکے یا پتے۔ ایک روایت میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ہمارے پاس "جو" تھے ہم اس سے کھاتے رہے کافی عرصے تک ایک مرتبہ اس کو تولا تو وہ فوراً ختم ہوگیا، تو تولنے سے برکت ختم ہوگئی۔

اشکال: دوسری حدیث میں ہے کہ تولنے میں برکت ہے تو تعارض ہے۔ جواب: بیع وشراء کے وقت تولنے میں برکت ہے اور گھر میں استعمال کی چیزوں کو تولنا برکت ختم ہونے کا ذریعہ ہے خرج النبی ﷺ هارباً من مکة ومعه بلال۔ یہ ہجرت کا واقعہ نہیں کیونکہ ہجرت کے دن نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے اس لئے اور کوئی سفر ہوگا ہوسکتا ہے طائف کا سفر ہو اور طائف میں زید بن حارثہ ساتھ تھے تو ممکن ہے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ساتھ ہوں یا کسی اور قبیلے کی طرف سفر کیا ہو۔ "فجوت" بمعنی کاٹنا۔ "یوم شات" سرد دن۔ "معطونا" بمعنی بدبو سے جس چمڑے کے بال گر جائیں۔ ① فاکلنا منه ثمانیة عشر فخر منه بخوص النخل، کھجور کے پتوں سے سی لیا۔ "بکرة" لکڑی کو اندر سے خالی کر کے اس میں جانوروں کو پانی پلایا جاتا ہے۔ "ثلمة" سوراخ۔ "مرقوعة بفرو" پوستین

کی پیوند لگی ہوئی تھی۔ ''تجشار جل'' ڈکار آئے۔ آدمی کو آپ ﷺ نے فرمایا ان کو روک دیں پھر فرمایا کہ دنیا میں جو زیادہ کھاتے ہیں تو قیامت میں زیادہ بھوکے ہوں گے یہ سزا ہوگی اور ڈکار بھی تب آتا ہے جب خوب پیٹ بھرا ہوا ہو۔ ''الا التراب'' اس سے مکان بنانا مراد ہے کہ جو مال مٹی میں لگ جائے اس کا ثواب نہ ملے گا۔ لم یر مقدماً و کبتیه بین یدی الخ ① ایک مطلب یہ ہے کہ خود دوسرے آدمیوں کو پیچھے کر کے آگے نہ بیٹھتے تھے۔ ② دوسرا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے سامنے گھٹنے کھڑے کر کے نہ بیٹھتے تھے کیونکہ یہ اداب مجلس کے خلاف ہے۔ ''نارالانیار'' انیار نار کی جمع ہے اصل میں واو کے ساتھ ہونا چاہئے یعنی انوار مگر چونکہ اس میں نور کے ساتھ مشابہت آتی تھی معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ نور کی جمع ہے یا نار کی اس لئے فرق کرنے کے لئے انیار جمع لائی جاتی ہے۔ ورطبکم و یابسکم۔ رطب سے مراد وہ مخلوق ہے جو پانی میں رہتی ہو۔ یابس اس سے وہ مخلوق مراد ہے جو خشکی میں رہتی ہو۔ نانقص ذالک من ملکی جناح بعوضةٍ۔ مچھر کے پر کے برابر بھی میری بادشاہت میں کمی نہیں آئے گی مراد یہ ہے کہ کچھ کمی بھی نہیں آتی جناح بعوضۃ کی مثال صرف سمجھانے کے لئے ہے۔ ''اجفل'' دوڑنا۔ ''استنبت'' ظاہر ہونا ''واجد'' جس کو طلب کروں اس کو پالیتا ہوں۔ ''ماجد'' مجید سے ہے بمعنی بزرگی والا۔ عذابی کلامی۔ یعنی عذاب کا آنا بھی میرے امر سے ہے اور امر دیتا ہوں تو عذاب آجاتا ہے۔

باب

''من صمت نجا'' یعنی وہ بے ہودہ اور بے کار باتیں نہیں کرتا تو یہ کامیابی ہے کیونکہ جتنی باتیں زیادہ کرے گا اور باتیں بھی لایعنی ہوں تو اس پر مواخذہ ہوگا۔

باب

کوئی آپ کا مخالف ہے مگر وہ مسلمان ہے اور مصیبت میں مبتلا ہو گیا تو اس پر آپ خوش نہ ہوں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو معاف کر دیں گے تمہیں مبتلا کر دیں گے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر قادر ہیں۔

باب ما احب انی حکیت احدًا

حکی یحکی بمعنی نقل اتارنا یہ بہت بڑا گناہ ہے ایک حکی یحکی ہے دوسری حاکی یحا کی محاکاۃ بعض نے ان میں فرق کیا ہے کہ مجرد سے بمعنی مطلقاً نقل وہ اچھی چیز میں ہو یا بری میں ہو اور مفاعلہ سے ہو تو شر کے اندر استعمال ہوتا ہے۔

باب

ایک آدمی جو مسلمان سے ملتا ہے امر بالمعروف نہی عن المنکر کرتا ہے ان کی تکلیف برداشت کرتا ہے یہ آدمی بہتر ہے اس سے جو کنارہ کش رہتا ہو دوسری روایت میں ہے کہ دوسرے کے ساتھ دشمنی حسد اور کینہ یہ دین کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح بالوں کو مونڈ دیا جائے۔

باب

بغی اور قطع رحمی ایسے گناہ ہیں کہ ان کا کرنے والا دنیا میں بھی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ البغی اس سے کیا مراد ہے۔ ① ظلم مراد ہے کہ ظلم کی سزا آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ ② خلیفہ اور حکومت وقت سے بغاوت مراد ہے کہ دین داروں اور اصحاب الرائے نے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیا اور اس خلیفہ سے کفر بواح صادر نہ ہو تو اس کی بغاوت بھی

گناہ کا کام ہے اور دنیا میں سزا ملتی ہے۔ ''قطعیۃ الرحم'' یہ والدین کے ساتھ برے سلوک کو شامل ہے کہ والدین کے ساتھ جتنا برا سلوک کرے گا اس کو دنیا میں سزا ملے گی کہ اس کی اولاد اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گی والدین کے بعد عام رشتہ داروں سے قطع رحمی بھی اس میں داخل ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک آدمی دین کے اعتبار سے مافوق والے کو دیکھے اور مزید کوشش کرے ماتحت والے کو نہ دیکھے کہ یہ بات یہ نہیں جانتا میں جانتا ہوں۔ کیونکہ جب یہ بات سوچے گا تو اپنے کو بڑا سمجھے گا اور مزید علم حاصل نہ کر سکے گا لیکن اگر اوپر والوں کو دیکھے گا تو مزید علم حاصل کرے گا اور کوشش کرے گا کہ فلاں کے مرتبے تک پہنچ جاؤں اور وہ آدمی دنیا کے اعتبار سے اپنے سے کم تر کو دیکھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو ان کم والوں کی نسبت سے زیادہ نعمتیں دی ہیں اس لئے جب اس کو دیکھے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد بیان کرے گا شکر کرے گا لیکن اگر اوپر والے کو دیکھے تو ان نعمتوں کے حصول کی کوشش کرے گا اور ملے گا وہی جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے لکھا ہے مزید نہیں مل سکتا تو نہ نعمت مل سکے گی نہ شکر کر سکے گا اس لئے دنیا کے اعتبار سے کم تر لوگوں کو دیکھنا چاہئے ایسے آدمی کو صابر اور شاکر لکھ دیا جاتا ہے۔

باب

''حنظلۃ الاسیدی'' نبی اکرم ﷺ کے کاتب تھے وحی کو لکھا کرتے تھے۔ عافسنا الا زواج۔ بیوی بچوں کی خدمت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ان سے کھیل کود کرتے ہیں یعنی لاعبنا الا زواج۔ ''ساعۃ ساعۃ'' یا تو یہ منصوب ہے ظرفیت کیوجہ سے کہ تذکرہ کا ایک وقت ہے لعب کا ایک وقت ہے اس لئے حالات مختلف ہوتے ہیں یا مرفوع ہے کہ لنا ساعۃ وللہ مساعۃ۔

اعقلھا واتوکل او اطلقھا واتوکل۔ کہ اسباب اختیار کر کے توکل کروں یا بغیر اسباب کے توکل کروں اس لئے فرمایا کہ سواری کو باندھوں پھر توکل کروں یا کھلی چھوڑ دوں پھر توکل کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ باندھو پھر توکل کرو۔ یعنی اسباب اختیار کریں پھر نتیجہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے کر دیں۔ ''لایعدل بالرعۃ'' رعۃ بمعنی تقویٰ اور ورع ہو تو مطلب یہ ہے کہ ورع اور تقویٰ کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا۔

ابواب صفۃ الجنۃ

عن رسول اللہ ﷺ

جنت وجہنم دونوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کیا ہے دونوں موجود ہیں ہر اچھی کام کی نسبت بالائی کی طرف ہوتی ہے اس لئے جنت بھی اوپر ہے بعض نے کہا کہ چوتھے آسمان میں ہے بعض نے کہا کہ عرش کے نیچے ساتویں آسمان کے اوپر ہے اسی طرح جہنم بھی موجود ہے۔ اب کہاں ہے تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے کہا یہودی کہتا ہے کہ جہنم سمندر کے نیچے ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا شاید سچ کہتا ہو تو یہ یا اس کی تصدیق کر دی یا اس لئے فرمایا کہ جہنم کی نسبت سفل کی طرف ہوتی ہے ان ابواب کے اندر جنت کی صفات ذکر ہوں گی۔

باب ماجاء فی صفۃ شجر الجنۃ

تیز رفتاری سے چلنے والا سوار جنت کے درخت کے نیچے سو سال چلے تو اس کو قطع نہ کر سکے گا۔ اشکال۔ ظل سے کیا مراد ہے؟ جواب ① ظل سے نعمتیں مراد ہیں۔ ② ظل سے مسافت مراد ہے کہ اتنے بڑے درخت ہوں گے کہ بالفرض اگر ان کا سایہ ہو تو سو سال تک اس کا سایہ سوار قطع نہ کر سکے گا دوسری روایت میں ہے کہ جنت کے درختوں کی ٹہنیاں اور تنے سونے کی ہوگی۔

باب ماجاء فی صفة الجنة و نعیمها

"ولو لم تذنبوا" ۔اگر تم گناہ نہ کرو اور فرشتوں کی طرح ہو جاؤ تو اللہ تبارک وتعالیٰ دوسرے لوگوں کو لے آئیں گے جو گناہ کریں گے پھر توبہ کریں گے تو اللہ معاف کرے گا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہاں گناہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی بلکہ اللہ کا غفار ہونا بیان کیا جا رہا ہے دوسرا اس میں توبہ کی ترغیب کا بیان ہے کہ انسان سے خطاء ہو جاتی ہے تو بیان کیا کہ اگر خطاء ہو جائے تو توبہ کرو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمادیں گے۔ مما خلق الخلق ملاطها ۔وہ مصالحہ جو دو اینٹوں کو جوڑنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ من یدخلها ینعم ۔جو اس میں داخل ہو جائے وہ تروتازگی میں ہوگا تکلیف میں نہ ہوگا۔ الامام العادل ۔اس کے ساتھ دعوہ کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح صائم کے ساتھ بھی دعوہ کا ذکر نہیں کیا، جب کہ مظلوم کے ساتھ دعوہ کا ذکر کیا کیونکہ مظلوم ہمیشہ بددعا ہی کرتا ہے اور مظلوم عام ہے نیک ہو یا نہ ہو اللہ اس کی دعا قبول کرتے ہیں۔

باب ماجاء فی صفة غرف الجنة

غرف۔غرفۃ کی جمع ہے بمعنی بالا خانہ یہ ایسے شفاف ہوں گے کہ اندر کا حصہ باہر سے اور باہر کا حصہ اندر سے نظر آئے گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ دو جنت خالص چاندی اور دو خالص سونے کی ہوں گی۔ اشکال: دوسری روایت میں ہے کہ ایک اینٹ سونے کی ایک چاندی کی ہوگی تو تعارض ہے۔ جواب تعارض نہیں کیونکہ باہر کی دیوار میں ایک اینٹ سونے کی ایک چاندی کی ہوگی مگر جنت کے اندر جو کچھ ہوگا اس میں سے بعض خالص سونے کی جنت ہوگی بعض چاندی کی۔

باب ماجاء فی صفة درجات الجنة

جنت کے اندر سو درجے ہیں ہر ایک درجے کے درمیان سو سال کی مسافت کے برابر فرق ہے، یہ سو درجات ادنیٰ مؤمن کے لئے ہوں گے اس سے زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو درجہ دینا چاہئیں تو دیں گے سب سے اوپر والا اور اوسط (یعنی عمدہ اور اعلیٰ) فردوس ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک ادنیٰ مؤمن کے لئے سو درجے ہوں گے ایک درجہ اتنا ہوگا کہ پوری دنیا اس میں سما جائے گی تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے۔

باب ماجاء فی صفة نساء اهل الجنة

جنت کا ذکر ہے اس کے اندر جو نعمتیں ملیں گی ان کا بھی ذکر کیا اور عورتیں بھی انہیں نعمتوں میں سے ہیں اس لئے ان کا بیان ذکر کر رہے ہیں روایت نقل کی ہے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ جنت کی عورت کی اوصاف یہ ہیں کہ ان کے رنگ کی صفات اس طرح ہوں گی کہ ان کی پنڈلیوں کی چمک اور خوبصورتی ۷۰ جوڑوں سے نظر آئے گی کپڑے مانع نہ ہوں گے یہاں تک کہ ان کی پنڈلیوں کا گودہ بھی نظر آئے گا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی سفیدی میں یاقوت سے اور صفائی میں مرجان سے تشبیہ دی ہے یاقوت ایسا پتھر ہے کہ اس کو صاف کر دیا جائے اور درمیان سے دھاگا گزارو تو دھاگا نظر آئے گا۔ "لکل رجل منهم زوجتان" یہاں روایات میں دو بیویوں کا ذکر ہے جب کہ عام روایات میں ہے کہ ادنیٰ مؤمن کو ۷۲ حور عین ملیں گی تو بظاہر تعارض ہے۔ جواب ① ۷۲ ہوں گی جو حور عین کے نام سے مشہور ہیں اور دو مزید ہوں گی جن کی یہ صفات ہیں جو یہاں مذکور ہیں جب کہ دوسری ۷۲ کی خوبصورتی اتنی زیادہ نہ ہوگی۔ جواب ② ۔یہاں عورتوں سے نساء دنیا مراد ہیں کہ دنیا کی عورتیں اللہ تبارک وتعالیٰ دو دیں گے جن کی حور عین

۷۲ ہوں گی۔ جواب ③ کل ۷۲ ہیں ان بہتر میں سے دو ۲ عورتیں بہت خوبصورت ہوں گی اس لئے ان کا الگ ذکر کیا۔ جواب ④ ادنیٰ جنتی کو کم از کم دو ملیں گی زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اس لئے یہاں دو یہ اقل کا ذکر ہے۔

باب ماجاء فی صفة جماع اهل الجنة

جنت میں مؤمن کو اتنی اتنی جماع کی طاقت دی جائے گی اب، کذا کذا سے ① تعداد نساء مراد ہے کہ اتنی عورتوں سے جماع کی طاقت ہوگی۔ ② یا مرات سے کنایہ ہے کہ ایک رات میں اتنی دفعہ جماع کر سکے گا۔ کسی نے سوال کیا کہ اس کی کسی کو طاقت ہوگی آپ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کو جنت میں سو آدمیوں کی طاقت دی جائے گی۔

باب ماجاء فی صفة اهل الجنة

فرماتے ہیں کہ پہلا گروہ جو جنت میں جائے گا یہ چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گے۔ "لایبصقون" منہ کا پانی جو باہر پھینکا جائے کہ منہ کے اندر ہی ہو تو اس کو ریق کہتے ہیں لیکن باہر پھینک دے اس کو بصاق، بساق اور بزاق کہتے ہیں۔ "لایمخطون" یعنی ناک سے پانی نہ آئے گا۔

"ولایتغوطون" پیشاب پاخانہ نہ آئے گا۔ "امشاطهم من الذهب" ایک جنت میں ہر چیز سونے کی ہوگی۔

"والفضة" اور دوسری جنت چاندی کی ہوگی اس میں ہر چیز چاندی کی ہوگی تو الگ الگ جنت ہوں گے دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی جنت میں سونے چاندی دونوں کی مشترکہ چیزیں ہوں گی۔ "مجامرھم" مجمر کی جمع ہے بمعنی وہ لکڑی جس میں عود جلائی جائے۔ اَلُوَّہ۔ عود ہندی کی لکڑی اشکال: یہاں ہے کہ مجامرهم الالوة۔ کہ خوشبو عود ھندی ہوگی جب کہ اس کو آگ سے جلایا جاتا ہے جب کہ جنت میں آگ نہ ہوگی۔

جواب۔ بغیر آگ کے دھواں نکلے گا اور خوشبو آئے گی یا اللہ تبارک وتعالیٰ صرف اس کے جلانے کے لئے آگ پیدا کر دیں گے۔ اشکال یہاں ہے رشحهم المسک کہ پسینہ مشک کی طرح ہوگا تو عود کے جلانے کا کیا فائدہ؟ جواب: کثرت نعم کا بیان کرنا مقصود ہے کہ ہر قسم کی نعمت ہوگی دوسری روایت میں ہے کہ اگر جنت کی خوشبو ناخن کی مقدار دنیا میں ظاہر ہو جائے تو خوشبودار ہو جائے آسمان وزمین کے اطراف۔ اگر جنت کا آدمی ظاہر ہو جائے اور اپنے کنگن کو ظاہر کر دے دنیا میں تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے سورج کی روشنائی ختم ہو جائے جس طرح سورج کی وجہ سے ستاروں کی روشنی دب جاتی ہے۔

باب ماجاء فی صفة ثیاب اهل الجنة

اہل جنت اجرد ہوں گے یعنی بدن پر بال نہ ہوں گے امرد ہوں گے کہ کچھ مونچھ کے بال ظاہر ہوں داڑھی نہ نکلی ہو آنکھوں میں سرمہ ہوگا ان کی جوانی ختم نہ ہوگی اور ان کے کپڑے پرانے نہ ہوں گے۔ "وفرش مرفوعة" کا کیا مطلب ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ وہاں فرش جو لگائے جائیں گے وہ اتنے بلند ہوں گے کہ جتنا زمین سے آسمان تک یعنی ۵۰۰ سال تک کی مسافت کے برابر بعض نے کہا ہے ان کے جو درجات ہوں گے تو دو درجوں کے درمیان ۵۰۰ سال کی مسافت کے برابر فرق ہوگا۔

باب ماجاء فی صفة ثمار الجنة

فراش المذہب اس کی تتلیاں سونے کی ہوں گی اور اس کے پھل مٹکوں کی طرح ہوں گے۔

باب ماجاء فی صفة طیر الجنة

جنت کی اندر جو نعمتیں ملیں گی ان کا تذکرہ جاری ہے یہاں طیر الجنۃ کا ذکر ہے کسی نے سوال کیا کہ کوثر کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہر ہے جس کا پانی دودھ سے سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا اس میں پرندے ہوں گے جن کی گردنیں اونٹ کی گردن کی طرح ہوں گی۔ ''اکلتھا'' یہ اکل کی جمع ہے بمعنی کھانے والے یا یہ لفظ ہے اکلتھا پھر یہ اکلۃ کی جمع ہوگی۔

باب ماجاء فی صفة خیل الجنة

کسی کو جنت میں گھوڑوں کی خواہش ہو تو یہ نعمت بھی وہاں ملے گی۔ ''فلا تشاء'' ای فلا تشاء شیئاً الایکون امامک کہ کوئی نہیں چاہئیں گے مگر وہ تمہیں ملے گا بعض نسخوں میں آخری لفظ حیث شئت کے بجائے الافعلت ہے کہ آپ ایسا گھوڑا نہ چاہیں گے مگر آپ کو وہ مل جائیگا۔

باب ماجاء فی سن اهل الجنة

جرد اجرد کی جمع ہے اور مرد امرد کی جمع ہے جس پر بال نہ ہوں گے نئے نئے جوان ہوں گے داڑھی نہ ہوگی اور تیس ۳۰ سال یا تینتیس ۳۳ سال کی عمر کے ہوں گے۔

باب ماجاء فی کم صف اهل الجنة

پہلی روایت میں ہے کہ کل جنت میں ۱۲۰ صفیں ہوں گی ان ان میں سے ۸۰ صفیں اسی امت کی اور ۴۰ دوسری امتوں کے ہوں گے تو اس امت کے لوگ دو ثلث ہوں گے جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ جنت میں آدھے اس امت کے اہل جنت سے ہوں گے اور آدھے باقی امت کے ہوں گے اور فرمایا تمہاری نسبت کفار کے مقابلے میں اتنی ہے کہ سفید بال سیاہ بیل میں ہو تو یہ تعارض ہے۔ یہاں آدھے کا ذکر ہے پہلے میں دو ثلث کا ذکر تھا؟

جواب ❶: اسی صف تعداد کے اعتبار سے اہل جنت کا نصف ہے اگر چہ صفیں زیادہ ہوں گی۔

جواب ❷: پہلے آپ ﷺ کو وحی ربع کی کی گئی پھر ثلث کی پھر نصف کی یہاں تک دوسری روایت میں ہے پھر مزید وحی سے اضافہ کر کے دو ثلث کر دیا تو پہلے آپ ﷺ نے نصف بتایا بعد میں دو ثلث بتایا اس لئے تعارض نہیں۔

باب ماجاء فی صفة ابواب الجنة

جنت کا اتنا بڑا دروازہ ہوگا کہ تیز رفتار شہسوار تین تک اس کے فاصلے کو طے کرے گا ثلاثا سے یا تین دن اور تین راتیں مراد ہیں یا تین سال مراد ہیں اتنا بڑا دروازہ ہوگا اس کے باوجود گزرتے وقت اتنی بھیڑ ہوگی کہ قریب ہے کہ کندھے نکل جائیں۔

باب ماجاء فی سوق الجنة

الاحاضرہ اللّٰہ الخ یعنی ہر آدمی سے بالمشافہ کلام کریں گے۔

''فیروعہ مایری علیہ'' جب کم درجے والا بڑے درجے والے آدمی کے لباس کو دیکھے گا تو یہ مرعوب ہو جائے گا اور اس لباس کی خواہش کرے گا تو اللہ وہی لباس دے دیں گے تاکہ غمگین نہ ہو۔

دوسری روایت میں ہے کہ جنت کے بازار میں تصویریں ہوں گی جو اس کو پسند آئے اس کی شکل اس کی طرح ہو جائے گی۔

باب ماجاء فی رؤیة الرب تبارک وتعالیٰ

جنت کی نعمتوں میں سب سے اہم نعمت رؤیہ باری تعالیٰ ہے اہل السنۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ جنت میں رؤیا باری تعالیٰ نصیب ہوگی قرآن میں ہے کہ ﴿للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ﴾ زیادۃ سے رؤیت باری تعالیٰ مراد ہے۔ اب وہ رؤیت کیسی ہوگی اس کی کیفیت مجہول ہے معتزلہ اور خوارج اس کا انکار کرتے ہیں ان کے ہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھنا مستبعد اور مستحیل ہے دلیل ان کی یہ ہے کہ ﴿لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار﴾ اسی طرح دوسری جگہ ہے۔ ولن ترانی۔ اہل سنت پہلی آیت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لاتدرکہ الابصار سے احاطہ ہے کہ ان آنکھوں سے آدمی اس کی قدرت کا احاطہ نہیں کرسکتا دوسری آیت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دنیا کی آنکھوں میں طاقت نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھ سکیں لیکن آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں قوت پیدا کردیں گے۔ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے جو صفات ثابت کی ہیں یا نبی اکرم ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ثابت کی ہیں ہم اس کو مانتے ہیں اس پر ایمان لاتے ہیں نہ اس کی تعلیل کرتے ہیں یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو صفات سے معطل کردیں جیسے معتزلہ کا مذہب ہے کہ یہ صفات اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے نہیں مانتے۔ ہم تاویل بھی نہیں کرتے۔ جس طرح بعض لوگ تاویل کرتے ہیں البتہ بعض حضرات نے ضرورت کی بناء پر تاویل کی ہے ورنہ اکثر تاویل نہیں کی جاتی بلکہ بغیر تاویل کے مانتے ہیں مخلوق میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو جاننے والے نبی اکرم ﷺ ہیں جب نبی اکرم ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے صفت کو ثابت کیا ہم اس کو مانیں گے البتہ اس کی کیفیت نبی اکرم ﷺ نے نہیں بتائی تو ہم اپنی طرف سے کیفیت نہیں بتاسکتے اور نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اہل سنت کے ہاں کسی کے ساتھ تشبیہ دینی جائز ہے جس طرح بعض مشبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تشبیہ دیتے ہیں کہ یدہ کیدنا وساقہ کساقنا الخ۔ تو اہل سنت جس طرح باقی صفات کو مانتے ہیں اسی طرح رؤیت باری تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں البتہ کیفیت کو نہیں جانتے۔

لَاتَضَامُوْن۔ ضیم سے ہے بمعنی ظلم کہ ان کے دیکھنے میں کوئی ظلم نہ ہوگا یا مشدد ہے کہ لاتضامُّوْن. بمعنی مشقت کہ ان کے دیکھنے میں بھیڑ اور مشقت نہ ہوگی۔

باب ماجاء فی خلود اھل الجنة واھل النار

پہلی روایت میں ہے کہ جن لوگوں نے جنکی دنیا میں عبادت کی ان معبودوں کے ساتھ وہ عابدین الگ الگ گروہ بن جائیں گے جس طرح قرآن میں ہے کہ۔ وامتازوا الیوم ایھا المجرمون۔ لیکن یہاں معبودان سے وہ مراد ہیں جنہوں نے اپنی عبادت کا حکم دیا یا اس پر راضی ہوئے لیکن وہ بزرگ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کی عبادت کی گئی اور ان کو علم نہ تھا اور نہ اس پر راضی تھے وہ ان مجرموں کے ساتھ نہ ہوں گے۔ وقولھم علیہ سلم سلم۔ بعض روایات میں ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سلم سلم فرمائیں گے بعض نے کہا کہ یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ وہ کہیں گے تو فرماتے ہیں کہ ہر نبی کی امت انکے ساتھ ہوں گی اور ان کی علامت سلم سلم ہوگی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی امت کے لئے سلم سلم سے دعا کریں گے۔ ''قالت قط'' یہ قَط قَطٌّ قِط تینوں لغات کے ساتھ ہے یعنی ''حسب'' کہ کافی ہے۔

باب ماجاء حفت الجنة بالمکارة

''حفت الشی'' ای احبط یہ کہ کوئی چیز کسی پر ایسی حاوی ہوجائے کہ اس کو چھپادے مطلب یہ ہے کہ جنت کو جن اعمال نے چھپایا ہے اور جن اعمال نے جنت کا احاطہ کیا ہوا ہے وہ تمام مکارہ ہیں۔ مکارہ سے وہ امور مراد ہیں جو مشکل اور گران ہوں تو یہ گران اور

ثقیل کام جنت کے اردگرد ہیں یہ فی نفسہ ثقیل نہیں مگر نفس ان کو ثقیل سمجھتا ہے جس طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد یہ ایسے اعمال ہیں کہ نفس پر بھاری گزرتے ہیں یہی جنت کے اردگرد ہیں لیکن جہنم کی اردگرد ناجائز چیزیں ہیں تو جہنم میں وہ جائے گا جو خواہشات کو پورا کرے ناجائز طریقے سے۔

باب ماجاء فی احتجاج الجنة والنار

یدخلنی الضعفاء یعنی میرے اندر وہ داخل ہوں گے جو لوگوں کی نظروں میں کمزور اور غریب ہوں گے اگر چہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں وہ بہت بڑے ہیں مگر معاشرے میں ان کو کمزور سمجھا جاتا ہے جبر اور تکبر وغرور اس کے لئے جو تکبر کرے گا ظلم وزیادتی کرے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

باب ماجاء مالأدنٰی اهل الجنة

ادنیٰ جنتی کے ۸۰ ہزار خادم اور ۷۲ زوجات ہوں گی۔ التیجان۔ تاج المؤمن اذا اشتهی الولد۔ وہاں اولاد ہوگی یا نہیں تو بعض نے کہا جماع ہوگا اولاد نہ ہوگی اور نہ اس کی خواہش ہوگی بعض نے کہا کہ چاہے تو بچہ ہوگا مگر وہ چاہے گا ہی نہیں بعض نے کہا کہ اولاد بھی ہوگی۔

باب ماجاء فی صفة انهار الجنة

تین بڑے دریا ہوں گے ایک دودھ کا ایک شراب کا ایک شہد کا پھر ان سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی جائیں گی جو جنتیوں کے باغات میں جائیں گی۔ ثلاثة علٰی کثبان المسک۔ کثبان۔ کثیب کی جمع ہے بمعنی تودہ اور ٹیلا۔

ابواب صفة الجهنم

عن رسول اللہ ﷺ

جہاں جنت کا ذکر ہوتا ہے وہاں جہنم اور جہنمیوں کا ذکر بھی ہوتا ہے اس لئے ابواب الجنۃ کے بعد جہنم کے ابواب قائم کئے ہیں۔

باب ماجاء فی صفة النار

قیامت کے میدان میں لوگوں کو ڈرانے کے۔ لئے لایا جائے گا جہنم کو چاروں طرف سے ۷۰ لگام لگائے جائیں گے اور ہر لگام کو کھینچنے کے لئے ۷۰ ہزار فرشتے مقرر ہوں گے۔

باب ماجاء فی صفة قعر جهنم

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بہت بڑی چٹان کو جہنم کے کنارے سے گرادیا جائے تو ۷۰ سال گرتا رہے گا مگر اس کے تہہ میں نہیں پہنچے گا۔

باب ماجاء فی عظم اهل النار

جہنم والوں کی شکلیں بدل جائیں گی وہ موٹے ہو جائیں گے اس موٹاپے کا یہاں ذکر ہے کہ اس کی ایک داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی اور اس کا ران بیضاء پہاڑ کی طرح بڑا ہوگا اس کے بیٹھنے کی جگہ یعنی اس کا مقعد تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا۔ دوسری روایت میں

ہے کہ کافر کی زبان اتنی بڑی ہوگی کہ ایک یا دو فرسخ کی مقدار اس کو کھینچتا رہے گا لوگ اس پر چلیں گے ایک روایت میں ہے کہ اس کا چمڑہ ۴۲ ذراع تک موٹا ہو جائے گا۔

باب ماجاء فی صفة شراب اهل النار

اہل نار کو کیا پلایا جائے گا اس کا ذکر ہے قرآن میں آیا ہے۔ کالمھل اس کی تفسیر نبی اکرم ﷺ نے کی کہ تیل گرم کیا جائے اس کے نیچے تلچھٹ رہ جاتا ہے تو ایسا پانی پلایا جائے گا جب منہ کے قریب کرے گا تو منہ کا چمڑا گر جائے گا۔ ''من ماء صدید'' وہ پیپ ہے جو اہل جہنم کی زخموں سے نکلے گا۔ ''لسرادق النار'' سرادق سے پردے چار دیواری اور احاطہ مراد ہے کہ وہ پردے جنہوں نے جہنم کا احاطہ کیا ہوگا وہ چار ہوں گے ان میں سے ایک پردے کی موٹائی چالیس سال کی مسافت تک ہوگی اور چاروں پردے آگ کے ہوں گے۔

''من الزقوم'' درخت مراد ہے جو جہنم میں ہوگا یہ اہل جہنم کی خوراک ہوگی۔ اور یہ ایسا بدبودار ہوگا کہ اگر دنیا میں اس کا قطرہ ڈال دیا جائے تو تمام دنیا کی چیزیں خراب ہو جائیں۔ ان احوال کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے بچاؤ کے طریقے اختیار کئے جائیں اور آخرت میں کسی کا یہ عذر نہ ہو کہ اتنے شدائد کا ہمیں علم نہ تھا۔

باب ماجاء فی صفة طعام اهل النار

جہنم والوں کو بھوک کے عذاب میں بھی مبتلا کیا جائے گا یہ لوگ دعائیں کریں گے کہ طعام مل جائے تو ان کو ضریع ملے گا یہ کانٹے دار پودا ہے کڑوا بھی ہوتا ہے تو ایسی چیز ان کے سامنے رکھی جائے گی کہ کھاؤ اس سے نہ بھوک ختم ہوگی نہ کوئی جسمانی فائدہ ہوگا۔ ''بطعام ذی غصة'' وہ جب کھائیں گے تو گلے میں پھنس جائیں گے پھر یہ کہیں گے دنیا میں کھانا پھنس جائے تو پانی سے اتر جاتا تھا اس لئے پانی مانگتے ہیں تو جب گرم پانی لوہے کے آنکڑوں کے ساتھ ان کے قریب کیا جائے گا جس کی وجہ سے ان کے چہرے جل جائیں گے۔

باب ماجاء ان للنار نفسین الخ

اس باب میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک یہ کہ جہنم دو سانس لیتا ہے دوسرا ان کا ذکر ہے جو مسلمان کسی وجہ سے جہنم میں چلا گیا اس کو نکالا جائے گا۔ ''اشتکت النار'' ① یہ شکایت لسان قال سے ہے اور ''اکل بعضی بعضاً'' بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ **فعجل لها نفسین** ۔ یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ ② یہ شکایت لسان حال ہے اور اکل بعضی بعضاً یہ کنایہ ہے ازدحام سے اور **فجعل لها نفسین** ۔ اس سے مایخرج من النار مراد ہے۔ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر جمہور کہتے ہیں کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے اس کے بات کرنے یا ایک دوسرے کو کھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر چیز کو زبان دی جیسے دوسری جگہ ہے کہ ﴿**وان من شئ الایسبح بحمده ولکن لاتفقهون تسبیحهم**﴾۔ اسی طرح فرمایا ﴿**یا جبال اوبی معه**﴾ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے اشارے سے پتھر جمع ہوئے ہیں انہوں نے باتیں کی ہیں۔ ''نفس'' جوف میں جو ہوا ہے اس کو باہر نکالنا باہر کی ہوا اندر لانا اور سانس لیتے وقت بھی اندر کی ہوا باہر نکلتی ہے اور باہر سے اندر آتی ہے۔

باب ماجاء ان اکثر اهل النار النساء

اکثر اهلها الفقراء الخ فقراء کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ اس میں ان کے لئے تسلی ہے کہ دنیا میں اگر مال نہ ہو تو آخرت میں جنت ملی گی دوسرا دین پر عمل کی فرصت جتنی فقراء کو ملتی ہے اتنی مالداروں کو نہیں ملتی کیونکہ مالدار اکثر دنیاوی کاموں میں مشغول رہتے ہیں لیکن یہ

اکثری حکم ہے ورنہ اگر دیندار مالدار ہوں تو وہ بھی جنت میں جائیں گے ان کے جنت میں جانے کی نفی مقصود نہیں۔

اکثر اھلھا النسآء۔ عورتیں زیادہ جہنم میں ہوں گی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح دوسری روایت میں ہے کہ یکفرن العشیر کہ ناشکری کرتی ہیں دوسرا یہ ناقصات العقل ہوتی ہیں اس لئے گناہ کی طرف جلدی مائل ہو جاتی ہیں۔

باب

''عتل'' سخت طبیعت والا۔ ''جواظ'' بعض نے کہا جو حرام مال کھا کر موٹا ہو جائے بعض نے کہا جو چھوٹے قد والا ہو اور اس کا پیٹ بڑا ہو مراد وہ ہے جو تکبر سے چلے۔

ابواب الایمان

عن رسول اللہ ﷺ

جہنم کے ذکر کے بعد ان اسباب کا ذکر ہے جو جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں ان میں اصح سبب ایمان ہے اس لئے ایمان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ایمان اور اسلام۔ اگر ایک ساتھ ذکر ہوں تو ایمان سے تصدیق اور اسلام سے اعمال مراد ہوتے ہیں اگر اکیلا کوئی استعمال ہو تو ایک معنیٰ میں ہوتے ہیں باقی ایمان مرکب ہے یا بسیط اس اختلاف کا مآل ایک ہی بنتا ہے صرف لفظی اختلاف ہے اور اپنے زمانے کے اعتبار سے فرق تھا کیونکہ احناف کے زمانے میں معتزلہ اور خوارج تھے یہ عمل نہ کرنے والے کو کافر کہتے تھے تو احناف نے کہا کہ ایمان فقط تصدیق کا نام ہے اور شوافع کے زمانے میں مرجیہ تھے جو اعمال کو بالکل نہ مانتے تھے کہتے تھے اس کی ضرورت نہیں اس لئے شوافع نے کہا کہ ایمان مرکب ہے اجزاء ثلاثہ سے مگر اختلاف کا مآل ایک ہی ہے کیونکہ اعمال کی ضرورت اور اہمیت پر سب متفق ہیں اور اس پر بھی متفق ہیں کہ کوئی اعمال چھوڑ دے تو کافر نہ ہوگا البتہ معتزلہ اور خوارج ایمان کو مرکب مانتے ہیں اس لئے اگر کوئی اعمال نہ کرے تو معتزلہ کے ہاں اسلام سے نکل جائے گا اور خوارج کے ہاں کافر ہو جائے گا اور مرجیہ کہتے ہیں کہ اعمال کی بالکل ضرورت نہیں فقط تصدیق قلبی کافی ہے اور کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان فقط نطق کا نام ہے کہ اقرار باللسان کافی ہے۔

باب ماجاء امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ

اس باب کی دوسری روایت میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا واقعہ ہے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شروع میں شرح صدر نہ تھا کہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں صرف زکوٰۃ سے انکار کرتے ہیں اور اس میں بھی تاویل کرتے ہیں کہ خذ من اموالھم صدقۃ۔ تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ زکوٰۃ کے دینے کا حکم صرف نبی اکرم ﷺ کو تھا اب نہیں۔ اس لئے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لڑنے نہیں دیتے تھے مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نہیں میں ضرور لڑوں گا وجہ اس کی یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللّٰہ تو پورے دین کا نام ہے۔

باب ماجاء امرت ان اقاتل الناس الخ

اس باب میں قتال کا ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگ موحد نہ ہو جائیں تو اس وقت تک لڑتا رہوں۔ اس باب میں جو حدیث ذکر کی ہے اس میں گویا پورا دین آ جاتا ہے یعنی توحید، شہادتین کا اقرار نماز یعنی اعمال سب کو حدیث جامع ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس نے ان امور میں سے ایک امر کا بھی انکار کیا تو ان کے خلاف قتال ہوگا اگرچہ وہ مسلمان ہوں اس لئے فقہاء نے لکھا ہے

کہ اگر لوگ اذان نہ دینے پر اتفاق کرلیں تو ان کے خلاف قتال کیا جائے گا کیونکہ اذان شعائر اسلام میں سے ہے۔

باب ماجاء بنی الاسلام علی خمس

بعض نے کہا کہ ''علی'' بمعنی من کے ہے کہ اسلام کے بناء پانچ چیزوں سے ہے۔

باب ماجاء فی وصف جبریل للنبی ﷺ

معبد جہنی شخص تھا اس نے بصرہ میں یہ بات پھیلائی کہ قدر کوئی بھی نہیں معاملات پہلے سے اللہ کے علم میں نہیں ہوتے بلکہ جب کام ہوجائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں آتا ہے اس کو حجاج نے قتل کردیا تھا۔ ''فاکتنفته'' ہم نے ان کو گھیر لیا ان تلد الامة ربتها ① لونڈیاں زیادہ ہوجائیں گی۔ ② نافرمانی عام ہوجائے گی کہ بیٹی ماں کو لونڈی سمجھے گی یہ آج کل بالکل واضح ہے۔ ③ بعض نے کہا کہ ام ولد کی بیع عام ہوجائے گی۔ اور بھی کئی توجیہات کی گئی ہیں فلقینی النبی ﷺ بعد ذالک بثلاث الخ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تین دن بعد بتایا کہ جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔

اشکال: بعض روایات میں ہے کہ جب وہ نکل گئے تو آدمی بھیجا کہ دیکھ کر آؤ جب وہ آدمی آیا کہا باہر کوئی بھی نہیں تو اسی وقت بتادیا کہ جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے تو بظاہر تعارض ہے کیونکہ یہاں تین دن کا ذکر ہے۔

جواب: عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت گھر چلے گئے تھے دوسرے صحابہ کو اسی وقت بتادیا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تین دن بعد آئے ان کو بتادیا یا دوسری مشغولیت کی وجہ سے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جلدی بتا نہ سکے تین دن بعد بات سامنے آگئی تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتادیا۔

باب ماجاء فی اضافة الفرائض الی الایمان

اگر شهادة ان لا اله الا الله الخ کو ایک بات مان لیا جائے تو نماز وغیرہ اس کے اجزاء ہوں گے یہ ایک بات ہوگی اور خمس الغنیمة دوسری چیز ہوگی باقی دوسری دو کا راوی نے ذکر نہیں کیا اور اگر لا اله الا الله ایک ہوا قامة صلاة دوسرا ہو تو بعض روایات میں پانچ چیزیں بن جاتی ہیں اس لئے پھر جواب یہ ہوگا کہ اصل چار چیزوں کا وعدہ کیا تھا مگر چونکہ مجاہد تھے اسلئے ان کو اس مسئلے کی ضرورت پیش آسکتی تھی اس لئے فائدے کے لئے اس کا بھی ذکر کردیا۔

باب ماجاء فی استکمال الایمان وزیادته ونقصانه

آخری روایت میں ہے کہ الایمان بضع وسبعون بابًا.

اشکال: بعض روایت میں ہے بضع وستون بعض میں ہے اربعة وستون بابًا تو یہ تعارض ہے۔

جواب ❶ بضع وسبعون بابًا والی روایت کثرت سے ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی۔

❷ پہلے کم تھا پھر وحی کے ذریعے سے زیادہ کردیا گیا اس لیئے تعارض نہیں اور ویسے بھی عدد اقل اکثر کے منافی نہیں۔ کیونکہ اکثر کے اندر اقل بھی موجود ہے۔

باب ماجاء فی ترک الصلاة

تارکین نماز کے لئے نبی اکرم ﷺ نے مختلف وعیدیں بیان فرمائی ہیں مگر یہاں جو وعید ہے یہ بہت سخت ہے کہ ایمان اور کفر کے

درمیان حائل نماز ہے اور حائل جب ہٹایا جائے تو کفر میں داخل ہو جائے گا بعض نے معنی کیا ہے سرحد سے کہ کفر اور اسلام کے درمیان سرحد نماز ہے جب نماز ادا نہ کی تو وہ سرحد ہٹ جائے گی وہ کفر کے قریب ہو جائے گی۔ **العهد الذی بیننا وبینهم الخ** یہاں منافق مراد ہیں کہ ہمارے اور منافقین کے درمیان عہد نماز ہے۔ **کان اصحاب النبی ﷺ لا یرون شیئا من الاعمال الخ** ۔کیونکہ اسی وقت اسلام کی نشانی ہی نماز تھی جو بھی مسلمان ہوتا تھا وہ نماز ادا کرتا تھا جو نماز نہ پڑھتا تھا اس کے بارے میں معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مسلمان نہیں اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ترک نماز کو کفر سمجھتے تھے اس باب کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک صلاۃ کفر ہے جب کہ دوسرے ابواب کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک صلاۃ کفر نہیں ان اختلاف روایات کی وجہ سے ائمہ میں اختلاف ہوا احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک روایت یہ ہے کہ عمداً نماز چھوڑ دی تو کافر ہو جائے گا مگر جمہور کے ہاں کافر نہ ہوگا بلکہ سزا دی جائے گی۔اب وہ سزا کیا ہے اس میں اختلاف ہے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قتل کر دیا جائے گا اور احناف کے ہاں قید کیا جائے گا جب تک کہ توبہ نہ کرے لیکن اگر نماز کی فرضیت کا منکر ہوا تو وہ بالاتفاق کافر ہوگا۔ احمد رحمہ اللہ تعالیٰ ان ظاہری احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جمہور کی دلیل قرآن مجید ہے کہ ﴿فان اللہ لایغفران یشرک به ویغفر مادون ذالک لمن یشاء﴾ اسی طرح بعض احادیث ہیں جن میں ترک صلاۃ کو گناہ کہا ہے مگر کفر نہیں کہا، باقی جمہور ان روایات کا جواب دیتے ہیں کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے اقوال تشدیداً تھے تا کہ لوگ ڈر جائیں یا مراد یہ ہے کہ تمہارا عمل کافروں جیسا عمل ہے۔ کہ نماز نہ پڑھنا کافروں کا عمل ہے اور تم نماز نہ پڑھ کر کافروں والا کام کیوں کرتے ہو۔

یا یہاں کفر کا قرب ہونا مراد ہے کہ نماز ادا نہ کی تو کفر کی سرحد تک پہنچ جائے گا اور جب چراگاہ کے قریب جاؤ تو اس میں واقع ہونے کا خطرہ رہتا ہے اسی طرح یہاں بھی جب کفر کی سرحد کے قریب گیا تو ممکن ہے کہ کفر میں داخل ہو جائے۔ باقی اس کی سزا مالکیہ وشوافع رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قتل ہے دلیل وہ روایات ہیں جن میں حکم ہے کہ **امرت ان اقاتل الناس الخ** کہ تمام اسلام پر عمل نہ کریں تو میں قتال کروں گا لیکن احناف فرماتے ہیں کہ حدیث میں قتل کے تین اسباب ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ترک صلاۃ نہیں ہے۔

باب

"ذاق" ایمان کی ایک حلاوت ہے ایک ذائقہ ہے، یہ ان کو محسوس ہوتا ہے جو اس حلاوت کے اہل ہوں جس طرح ایک آدمی چیزوں کے ذائقے کا احساس تب کرے گا جب وہ صحت مند ہو صفراوی بیماری کا شکار نہ ہو اسی طرح ایمان کا مزہ وہ چکھ سکے گا جس میں یہ صفات ہوں مگر جس میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ حلاوت کیسے محسوس کرے گا وہ صفات یہ ہیں۔ ① وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہو اس کا عقیدہ بن گیا کہ رب صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ ② زندگی گزارنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ صرف اسلام ہو وہ اسلام ہی پر کفایت کرے۔ ③ نبی اکرم ﷺ کی سنت کو مقصود زندگی بنایا ان کی رہنمائی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ان تینوں صفات والا ایمان کا مزہ چکھ سکتا ہے لیکن کسی کا عقیدہ ہی کمزور ہو یا عقیدہ صحیح ہو مگر اعمال ہی نہیں کرتا اسلام کو اختیار نہیں کرتا یا اعمال بھی کرے مگر نبی اکرم ﷺ کے طریقے کے مطابق نہیں کرتا تو یہ ایمان کی حلاوت نہیں چکھ سکتا۔ **بعد اذا نقذہ اللہ الخ** پہلے سے کافر تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام کی دولت دے کر آگ سے بچایا یا شروع سے کفر سے بچا کر آگ سے بچایا۔

باب لایزنی الزانی وهو مؤمن

جو زنا کرتا ہے وہ مؤمن نہیں کیونکہ اگر مؤمن ہوتا تو یہ فعل شنیع نہ کرتا۔ جب اس نے یہ فعل کیا تو اس کا ایمان کمزور ہے یا بالکل نہیں تو اس نے یہ کافروں والا کام کیا۔

اہل سنت کے ہاں مرتکب کبیرہ کافر نہیں جب کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن نہیں اہل سنت اس کی تاویل کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہیں جن میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر نہیں اس لئے پہلی روایت میں تاویل کریں گے تاکہ تعارض نہ رہے۔ ① زجر پر مبنی ہے ② کامل ایمان کی نفی ہے ③ یہ کام مؤمنوں والا نہیں کافروں والا کام ہے ④ ایمان اور گناہ جمع نہیں ہو سکتے ایمان کا آدمی سے تعلق ہوتا ہے جب وہ گناہ کرتا ہے تو وہ ایمان نکل کر ظلہ کی طرح ہو جاتا ہے جب وہ گناہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ ایمان واپس لوٹ آتا ہے۔

باب ماجاء ان الاسلام بدأ غریبًا الخ

ابتداً اسلام چند آدمیوں میں تھا تمام لوگوں میں نہ تھا تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مسلمانوں کے خاص خاص جگہوں پر چند افراد میں پایا جائے گا عام لوگ اسلام کو بالکل نہ جانیں گے جس طرح آج کل ہے کیونکہ اسلام نماز روزے کا نام نہیں بلکہ پورا ضابطہ حیات کا نام ہے اور مکمل اسلام کسی کے اندر موجود ہو ایسے بہت کم آدمی ہوں گے۔

باب ماجاء فی علامة المنافق

نفاق کہتے ہیں جس کا ظاہر اور باطن مختلف ہو پھر نفاق دو قسم پر ہے۔ ① نفاق اعتقادی یعنی بظاہر اپنے کو مسلمان ظاہر کرے مگر حقیقت میں کافر ہو یہ نفاق اب کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے بتایا جاتا تھا اور آج کل وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ② نفاق عملی کہ عقیدہ تو صحیح ہے مگر اعمال منافقوں والے ہیں مثلاً وعدہ خلافی کرنا گالیاں دینا جھوٹ بولنا وغیرہ یہ اعمال منافقوں کے ہیں مسلمان کے شایان شان نہیں یہاں باب میں جس نفاق کا ذکر ہے اس سے نفاق عملی ہے۔ اشکال پہلی روایت میں تین علامت ذکر کیں اور دوسری میں چار کا ذکر ہے تو بظاہر تعارض ہے۔ جواب ①۔ پہلے نبی اکرم ﷺ کو تین علامات بتائی گئی تھیں پھر چار بتادی گئیں۔ جواب ② اصل علامات چار ہیں مگر راویوں سے ایک رہ گئی۔ جواب نمبر ③ پہلی روایت میں حصر نہیں کہ تین ہی ہیں پھر اس کا چار والی سے تعارض آ جائے بلکہ پہلی میں بغیر حصر کے تین ذکر کی اس لئے دوسری روایت میں ایک کا اضافہ کر دیا تو کوئی تعارض نہیں۔

باب ماجاء اسباب المسلم فسوق

قتال المسلم (اخاہ) کفر۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کام کافروں والا ہے ② بطور تغلیظ قتل مسلم کو کفر کہا ③ حلال سمجھے مسلمان بھائی کے قتل کو تو کافر ہو جائے گا۔

باب ماجاء فی من یموت وھو یشھدان لا الٰہ الا اللّٰہ

جو کلمہ توحید پڑھے تو جہنم اس پر حرام ہے یا ابتداءً اللہ جہنم میں نہ ڈالیں اور یا دوام مراد ہے کہ دائمی جہنم میں نہ رہے گا اور ابتداءً معاصی کی وجہ سے سزا ملے گی پھر سزا کاٹ کر چلے جائیں گے جنت کے اندر اس وقت کفار آرزو کریں گے کاش ہم مسلمان ہوتے تو ہم بھی جنت میں چلے جاتے۔

ابواب العلم

عن رسول الله ﷺ

باب اذا اراد الله بعبد خيرًا الخ

''فقہ'' بمعنی فہم فقہ یعنی اس کی سمجھ میں علم میں آ گیا فقہ مراد تینوں سے علم میں مہارت مراد ہے بعض نے کہا اس سے خاص فقہی علوم مراد ہیں بعض نے کہا اس سے تمام علوم مراد ہیں جن کا تعلق دین سے ہے حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا کہ فقہاء کون ہیں انہوں نے فرمایا فقیہ کہتے ہیں الزاهد فی الدنیا و الراغب فی الآخرة کو۔

یفقه فی الدین ۔کا مطلب یہ ہوا کہ دین میں مہارت دے دیتا ہے اور دین میں مہارت بھی زهد فی الدنیا اور آخرت میں رغبت کا ذریعہ بنتا ہے۔علم حقیقی وہی ہے جو انسان بنائے اگر علم انسان کو حلال حرام میں تمیز نہ کرائے اور وہ آدمی علم کے مقتضا پر عمل نہ کرے وہ علم نہیں ہنر ہے اور کمانے کا ذریعہ ہے اور کاروبار کا ذریعہ ہے۔

باب ماجاء فی کتمان العلم

الجم یوم القیامة الخ یہ جزاء بالمثل ہے کیونکہ اس سے جب علم کی بات پوچھی گئی تو اس نے سکوت اختیار کیا منہ بند رکھا گویا کہ لگام ڈالی گئی تھی اس لئے اس کے بدلے میں آخرت میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

باب ماجاء فی من طلب بعلمه الدنیا

لیجاری به العلماء یعنی علماء سے مناظرے اور مجادلے کے لئے علم حاصل کرے اور بے وقوفوں سے جھگڑے کے لئے علم حاصل کرے یا اس لئے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں یعنی وہ شہرت کے لئے حاصل کرنا چاہے تو اللہ اس کو آگ میں داخل کریں گے۔
''فلیتبوأ'' امر بمعنی خبر ہے یا امر تہدید کے لئے یا تحکم کے لئے ہے۔

باب ماجاء فی من روی حدیثا وهو یری انه کذب

یری انه کذب ای یظن یا یری ای یعلم انه کذب فهو احد الکاذبین ۔یہ تثنیہ کے صیغے کے ساتھ بھی ہے کہ ایک جھوٹا بنانے والا ہے اور دوسرا یہ بیان کرنے والا یا جمع کا صیغہ ہے کہ جھوٹوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

باب مانهی عنه ان یقال عند حدیث الخ

اس باب کی احادیث میں منکرین حدیث کی مذمت ہے ان سے بچنے کا حکم ہے کیونکہ یہ لوگ اکثر ملحد ہوتے ہیں اس لئے کہ جب حدیث کا انکار کریں تو قرآن کی تشریح اپنی رائے سے کریں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔قرآن کی حفاظت کا وعدہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا ہے اور حدیث قرآن کی تشریح اور تفسیر ہے اس لئے حدیث کی بھی حفاظت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے قرآن کی حفاظت یہ لوگ بھی مانتے ہیں کیونکہ قرآن میں ہے ﴿انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون﴾ اب ہم پوچھتے ہیں کہ یہ آیت تم تک کس طرح پہنچی وہ کہتے

ہیں کہ نبی ﷺ نے صحابہ کو بتائی انہوں نے تابعین کو بتائی انہوں نے اتباع تابعین کو بتائی اور لوگ سارے ثقہ تھے تو ہم کہتے ہیں کہ اسی طریق سے یہ آیت پہنچی تو آپ نے مان لی اور اسی طریق سے حدیث پہنچی ہے اس کو کیوں نہیں مانتے کیا حدیث کے نقل کرتے وقت یہی ثقہ لوگ غیر ثقہ ہو گئے منکرین حدیث صرف تین نمازوں کے قائل ہیں اور صرف دو دو رکعات پڑھتے ہیں پڑھنے کا طریقہ بھی مختلف ہے اور بھی دین کو بگاڑتے ہیں اس لئے سارے کے سارے کافر ہیں کیونکہ نصوص کے منکر ہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة کتابة العلم

ابتدائی زمانہ قرآن کا دور تھا تو حدیث کے لکھنے سے منع کیا گیا تا کہ حدیث قرآن کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے لیکن جب یہ خطرہ نہ رہا تو آپ ﷺ نے لکھنے کی اجازت دے دی تھی اس لئے کئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صحیفے مشہور ہیں لیکن اس وقت لوگ زیادہ تر زبانی یاد کرنے کا اہتمام کرتے تھے ان کے حافظے بھی قوی تھے اس لئے حدیث کو زیادہ نہیں لکھا گیا تھا لیکن بعد میں جب بعض لوگوں نے تعصب کی بناء پر احادیث گھڑنی شروع کر دیں تو لکھنے کا اہتمام کیا گیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے رجال پیدا کئے جنہوں نے حدیث کی حفاظت کی اور غلط احادیث کو صحیح احادیث سے جدا کیا۔

باب ماجاء فی الحدیث الخ

"بلغوا عنی"۔اس کے دو مطلب ہیں۔ ① سند متصل کے ساتھ مجھ سے نقل کریں۔ ② بعینہ میرے الفاظ کو پہنچائیں اور یہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں کہ سند بھی متصل ہو اور الفاظ بھی وہی ہوں اگر الفاظ یاد نہیں تو ترجمہ کرلے۔"ولو آیۃ" ① قرآن کی آیت مراد ہے کہ چھوٹی سی آیت ہو اس کو بھی بیان کرو ② آیت عام ہے حدیث کا ٹکڑا یا قرآن کا ٹکڑا ہو۔حدثوا عن بنی اسرائیل الخ وہ احکامات وعبادات جو منسوخ ہو چکے ہیں نبی اسرائیل سے وہ نقل نہ کریں لیکن قصص وواقعات نقل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ قصص عقلاً ونقلاً جھوٹے نہ ہوں۔

باب الاخذ بالسنة واجتناب البدعة

سنت نبی اکرم ﷺ سے منقول طریقے کو کہا جاتا ہے اور بدعت اس کی ضد ہے یعنی ایسا طریقہ دین میں ایجاد کیا جائے اور اس کی اصل نہ ہو۔بدعت لغت میں ہر نئی ایجاد شدہ چیز کو کہا جاتا ہے اس لئے بہت سے امور دینیہ کو بھی بدعت لغوی معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے جیسے تراویح کے بارے میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے "نعمت البدعة هذه" اب تراویح کی اصل موجود تھی مگر جماعت کے ساتھ خاص ہیئت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے نہیں پڑھی۔پڑھی۔شرعی اور اصطلاحی معنی کے اعتبار سے بدعت حسنہ کوئی چیز نہیں عبادت میں چار چیزیں ہوتی ہیں۔ ① کمیت ومقدار یہ شارع سے منقول ہوتی ہے، جیسے فجر کی نماز کتنی رکعت ہے۔ ② اس کی کیفیت کیا ہے یہ شارع سے منقول ہے۔ ③ اس کے لئے وقت مقرر کرنا یہ بھی شارع کی طرف سے ہے اس میں کمی زیادتی نہیں کر سکتے۔ ④ مکان کی تعیین یہ بھی شارع کی طرف سے ہے کہ عبادت کا ثواب کون سی جگہ زیادہ ملے گا مثلاً بیت اللہ میں ثواب زیادہ ملتا ہے یہ شارع نے بتایا ہے کہ اگر کسی عبادت میں یہ چاروں چیزیں شارع سے منقول ہوں اسی طرح ادا کی جائے تو یہ سنت کے مطابق ہوگی لیکن ان چار چیزوں میں سے کوئی چیز شارع کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہو آپ خود بنائیں اس صورت میں اس چیز کے کرنے میں گناہ ہوگا مثلاً فجر کی دو رکعات شارع نے بتائی ہیں مگر آپ ایک رکعت یا تین پڑھتے ہیں اس پر گناہ ہوگا۔

باب ماجاء فی عالم المدینة

''عالم المدینۃ'' سے کیا مراد ہے اس میں کئی اقوال ہیں۔ ① اس کا مصداق امام دار الھجرۃ امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں ② دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں یہ انتہائی متقی تھے بعد میں نابینا بھی ہو گئے تھے ③ قرب قیامت کا زمانہ مراد ہے اس وقت اسلام مدینہ میں پناہ لے گا مسلمان اور علماء مدینہ ہی میں ہوں گے یہ اسلام کی غربت کا زمانہ ہوگا۔

باب ماجاء فی فضل الفقهه علی العبادة

اس میں حدیث نقل کی ہے کہ فقیہ شیطان پر بھاری ہے ہزار عابد سے کیونکہ جو فقیہ ہوتا ہے وہ عمل کرتا ہے تو علم کے مطابق کرتا ہے اسی لئے فرماتے ہیں کہ ایک مسئلے کا سیکھنا ہزار نوافل سے بہتر ہے کیونکہ آدمی جب مسئلہ سیکھتا ہے وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے اس کا نفع حاصل ہوتا ہے جب کہ عابد کی عبادت کا نفع صرف اسی تک محدود رہتا ہے۔ وان الملائکه لتضع اجنحتها الخ ۔اس سے کیا مراد ہے تو ظاہری معنی یہی ہے کہ حقیقۃً وہ پاؤں کے نیچے زمین پر اپنے پر بچھاتے ہیں بعض نے کہا اعزاز واکرام مراد ہے بعض نے کہا کہ اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمتیں لے کر سایہ کئے ہوتے ہیں بعض نے واقعہ لکھا ہے کہ یہ حدیث معتزلی نے سنی تو کہا کہ میں زور سے چلوں گا تا کہ ان کے پر ٹوٹ جائیں تو گویا اس نے حدیث کے ساتھ تمسخر کیا اور زور زور سے چلنے لگا تو اس کے پاؤں کٹ گئے۔

ابواب الاستیذان والآداب

عن رسول الله ﷺ

کسی کے پاس جانے کے لئے اجازت طلب کرنی چاہئے ان ابواب میں اس کا ذکر ہے اور ساتھ دوسرے آداب بھی ذکر کئے ہیں۔

باب ماذکر فی فضل السلام

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ایک آدمی نے کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے لئے تیس نیکیاں ہیں اب یہ تین الفاظ تو احادیث سے ثابت ہیں اور اتفاقی ہیں اس کے آگے بھی الفاظ ہیں یا نہیں کسی حدیث سے اس سے زیادہ الفاظ نہیں ملتے البتہ بعض ضعیف روایات میں ومغفرتہ، اور بعض میں ورضوانہ کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور فضائل اعمال میں ضعیف حدیث بھی چل جاتی ہے سلام ایک جامع دعا ہے۔

باب ماجاء فی ان الاستیذان ثلاث

''قال عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ثلاث'' عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین دفعہ جو اجازت نہ دی اس کی وجہ یہ ہے کہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر تھے ان کے متعلق کسی نے شکایت کی تھی کہ ان کے پاس کوئی آئے اجازت نہیں دیتے دروازے پر لوگ کھڑے رہتے ہیں تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا تا کہ ان کو معلوم ہو کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض نے حکمت یہ لکھی ہے کہ خود عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تادیب دینا چاہتے تھے بعض نے کہا ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یاد نہ رہا تھا اس لئے بینہ مانگا۔

باب كيف رد السلام

سلام ڈالنا سنت ہے مگر اس کا جواب واجب ہے اسی طرح کسی غائب پر سلام بھیجے تو مخاطب کو بھی جواب دینا چاہئے اور جس نے سلام بھیجا ہے اس کو بھی جواب دینا چاہئے اس طرح کہے وعلیک وعلیہ السلام اسی طرح غائب آدمی کی طرف سلام بھیجا تو اس آدمی کو سلام پہنچانا چاہئے یہ امانت ہے قال لها ان جبريل يقرئک السلام الخ باقی عورت پر سلام ڈالنا جائز ہے یا نہیں تو اگر عورتوں کی جماعت ہو اور فتنہ کا خطرہ نہ ہو تو سلام ڈالنا جائز ہے اگر فتنہ کا خطرہ ہو یا ایک عورت ہو تو سلام نہیں ڈالنا چاہئے لیکن اگر بوڑھی عورت ہو جہاں فتنے کا خطرہ نہیں تو سلام ڈالنا جائز ہے۔

باب ماجاء في كراهية التسليم على الذمي

غیر مسلم پر سلام ڈالنا جائز نہیں البتہ اگر وہ سلام کریں تو جواب میں وعلیکم ہوسکتا ہے۔

باب ماجاء في السلام على مجلس الخ

ایسی مجلس ہو جس میں مسلم غیر مسلم سب ہوں تو سلام ڈال سکتے ہیں کیونکہ مقصود مسلمان ہوں گے اسی طرح کسی مجلس میں اہل حق، اہل بدعت اور اہل تشیع سارے بیٹھے ہوں تو سلام ڈالنا جائز ہے کیونکہ مقصود اہل حق ہوں گے جس طرح کسی مجلس میں دوست اور دشمن سارے بیٹھے ہیں آپ سلام دوست پر ڈالنا چاہتے ہیں اگر چہ وہاں دشمن بھی ہے مگر آپ کا مقصد دوست ہے دشمن نہیں۔

باب ماجاء في كراهية طروق الرجل الخ

کوئی آدمی کافی مدت کے بعد گھر میں آئے اور گھر والوں کو آنے کی اطلاع نہ ہو تو رات کو نہیں آنا چاہئے کیونکہ اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے ممکن ہے وہ دشمن سمجھ کر مار دے یا آپ خلاف طبع بات دیکھیں تو دل کے اعتبار سے نقصان ہو اس لئے رات کو نہیں آنا چاہئے لیکن اگر اطلاع ہو جائے اور گھر والے منتظر ہوں تو رات کو آسکتا ہے۔

باب ماجاء في تتريب الكتاب

تتریب سے کیا مراد ہے ① اس کو ویسے ہی مٹی میں ڈال دے اللہ تبارک وتعالیٰ پر اعتماد کرے وہ پہنچ جائے گا ② خط پر معمولی مٹی ڈالیں تا کہ سیاہی خشک ہو جائے اور حروف مٹ نہ جائیں ③ تتریب سے تواضع مراد ہے کہ خط میں تواضع اختیار کریں ایسی باتیں لکھیں جس میں تواضع ہو اور غرور وتکبر سے دور ہو اس وجہ سے اسکا آدمی پر اچھا اثر پڑے گا۔ بعض حضرات نے دوسرے والے معنی کو پسند کیا ہے لیکن پہلا والا معنی کوئی راجح معنی نہیں لگتا کہ مٹی میں ڈال دو خود مل جائے گا۔

باب ضع القلم على اذنك الخ

❶ مراد یہ ہے کہ ہاتھ میں قلم رکھے تو جلدی جلدی لکھے گا تو سوچ نہ سکے گا اور زمین پر رکھ دے تو غفلت کا خطرہ ہے اس لئے کان کے پاس رکھے تا کہ خوب سوچ لے پھر لکھے۔

❷ قلم کسی اور جگہ رکھے گا تو بھول جائے گا اس لئے پاس رکھے تا کہ جلدی مل جائے تکلیف نہ ہو۔

باب ماجاء فی کراهیة یقول علیک السلام مبتدئًا

آپ ﷺ نے فرمایا کہ علیک السلام تو مردوں کا سلام ہے یعنی زمانہ جاہلیت میں مردوں پر اس طرح سلام ڈالا جاتا تھا ورنہ اسلامی طریقہ مردوں اور زندوں دونوں پر السلام علیکم کہنے کا ہے اور جمع کا صیغہ لانا چاہئے کیونکہ دعاؤں میں جمع کا صیغہ زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی المصافحة

مصافحہ۔ صفحہ سے ہے کہ ایک ہاتھ کا صفحہ دوسرے ہاتھ کے صفحے سے ملایا جاتا ہے مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی آیا ہے دو ہاتھ سے بھی البتہ دایاں ہاتھ استعمال کرنا ضروری ہے۔

باب ماجاء فی المعانقة والقبلة

معانقہ سنت ہے جب سفر سے کوئی آدمی آجائے دوسرا مصافحہ ہے یہ اسلام کا تکملہ ہے باقی حدیث میں ہے کہ فقام الیہ رسول اللہ ﷺ عریانًا اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ننگے تھے بلکہ عام طور پر آدمی گھر میں ہو تو یا ٹوپی اتار لیتا ہے یا قمیص اتار لیتا ہے لیکن باہر سے کوئی آئے تو آدمی سر پر ٹوپی رکھتا ہے کپڑے صحیح کر لیتا ہے لیکن حضور ﷺ کو زید بن حارثہ کے آنے کی اتنی خوشی ہوئی کہ اوپر کی چادر بھی بھول گئے اور ایسے ہی بغیر چادر کے استقبال کیا تو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے استقبال کے لئے اس طرح بغیر چادر کے میں نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

باب ماجاء فی قبلة الید والرجل

یہود آئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ۹ معجزات کا سوال کیا آپ نے فرمایا لاتشرکوا باللہ الخ آپ نے معجزات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جواب ① آپ نے قرآن کی آیات کی تلاوت کر کے ۹ معجزات بتا دیئے اس کے بعد ان چیزوں کی وصیت کی کہ شرک وغیرہ نہ کرو الخ لیکن راوی نے اختصاراً ان آیات کو ذکر نہیں کیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے معجزات کا سوال نہ کیا تھا بلکہ ان امور کا سوال کیا تھا جن کا تعلق اوامر و نواہی سے ہے اس کا آپ ﷺ نے جواب دیا باقی مسئلہ تقبیل ید کا ہے اس میں اختلاف ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکروہ ہے مگر جمہور کے ہاں تقبیل جائز ہے مثلاً اولاد یا کوئی بزرگ ہو ان کو چومنا درست ہے البتہ اس میں انحناء نہیں ہونا چاہئے۔

باب ماجاء فی کراهیة ان یقام الرجل الخ

"کان الرجل یقوم لابن عمر" قربات کی جو مجالس ہیں اس میں جو پہلے آئے وہی زیادہ حق دار ہے اس لئے دوسرے کے لئے جگہ نہ چھوڑے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر یہ اپنی جگہ دوسرے کے لئے چھوڑ دے تو اس کے لئے جائز ہے باقی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں بیٹھتے تھے یہ کمال تورع کی وجہ سے تھا دوسرا اس میں احتمال تھا کہ کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ میں نہ اٹھا تو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ناراض ہوں گے اس لئے وہ نہ بیٹھتے تھے کیونکہ اگر کسی کے سامنے کوئی نہ اٹھے اور وہ آنے والا ناراض ہو پھر اس کے لئے اٹھنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی کراهیة القعود وسط الحلقة

حلقے کے درمیان میں بیٹھنے سے اس کی توجہ ہٹ جائے گی۔

باب ماجاء فی کراھیة قیام الرجل للرجل

کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مکروہ ہے اہل علم کا اختلاف ہے بعض حضرات جیسے نووی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی دینی شرافت کی وجہ سے اس کے اکرام کے لئے کھڑے ہوسکتے ہیں دلیل یہ دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا قوموا السید کم اسی طرح کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توبہ قبول ہوئی وہ مسجد میں آئے تو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً کھڑے ہوگئے اسی طرح فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی اکرم ﷺ کے پاس آتیں تو نبی اکرم ﷺ کھڑے ہوجاتے بوسہ دیتے اور ساتھ بیٹھاتے۔ ابن الحاج نے المدخل میں لکھا ہے کہ کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مکروہ ہے دلیل مذکورہ باب کی احادیث نقل کی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اکرام کے لئے کوئی اٹھتا نہ تھا جب کہ آپ ﷺ سے بڑھ کر کون ہے؟ ابن الحاج نے نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ادلہ کے جوابات دیئے ہیں معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے ان کے اتارنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اٹھنے کا حکم دیا دوسرا طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کعب کی تعظیم کے لئے نہ اٹھے تھے بلکہ مبارک باد کے لئے اٹھے تھے اور مبارک باد کے لئے اٹھنا جائز ہے اسی طرح فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے نبی اکرم ﷺ استقبال کے لئے کھڑے ہوتے تھے اسی لئے ان کو ساتھ بیٹھاتے تھے اسی طرح مجلس میں حلقہ ہو تو نبی اکرم ﷺ سے اٹھنا ثابت ہے کیونکہ نبی ﷺ کے رضاعی باپ آئے ان کو چادر میں جگہ دی اٹھے نہیں پھر رضاعی ماں آئی دوسری طرف چادر پر بیٹھایا اٹھے نہیں پھر رضاعی بھائی آئے آپ ﷺ اٹھ گئے اس سے نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے استدلال کیا ہے مگر ابن الحاج نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ تعظیم کے لئے اٹھنا نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو رضاعی باپ اور ماں بھائی سے زیادہ تعظیم کے حق دار تھے مگر ان کے لئے نہیں اٹھے معلوم ہوا کہ یہ ان کو جگہ دینے کے لئے اٹھے کیونکہ اٹھتے نہیں تو اس کو جگہ ہی نہ ملتی۔

بعض نے تفصیل ذکر کی ہے اگر متکبر آئے کہ اس کے سامنے نہ اٹھے تو اس کو وہ ناپسند کرے اور سزا دے ایسے شخص کے لئے اٹھنا نا جائز ہے دوسری صورت یہ ہے کہ آنے والا دل میں اٹھنے کی خواہش نہ کرے لیکن لوگ تعظیم کے لئے انھیں یہ جائز ہے اور اگر کسی کے استقبال کے لئے اٹھے تو یہ مباح ہے بعض نے مستحب بھی لکھا ہے۔

باب ماجاء فی توقیت تقلیم الأظفار واخذ الشارب

شارب کے اندر اختلاف ہے استرے سے صاف کرنا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز نہیں بلکہ مثلہ ہے جب کہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ وامام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جائز ہے بعض نے کہا کہ قص الشارب ہونا چاہئے کہ مونچھیں اس طرح کاٹے کہ اوپر والا ہونٹ کچھ سامنے ہوجائے بعض نے کہا مبالغہ کرے کہ مونچھوں کو قینچی سے کاٹے اور جتنا کاٹ سکتا ہے کاٹے۔

"تقلیم الاظفار" اس میں کوئی ترتیب وارد نہیں ہوئی جس طرح کاٹنا چاہے کاٹ سکتا ہے نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترتیب نقل کی ہے ممکن ہے ان کے پاس کوئی نص موجود ہو۔ باقی ان چیزوں کو ہفتے میں کاٹے لیکن اگر دیر ہوجائے تو چالیس دن تک گناہ نہ ہوگا مگر چالیس دن کے بعد بھی نہ کاٹے تو گناہ ہوگا۔

باب ماجاء فی اعفاء اللحیة الخ

داڑھی کے بارے میں اکثر امر کے صیغے ہیں اس لئے جمہور کے ہاں داڑھی رکھنا واجب ہے اس کا بڑھانا ضروری ہے اب داڑھی

کہاں تک بڑھانی چاہئے؟ جمہور سے اس کی کوئی تحدید منقول نہیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے کاٹنا ثابت نہیں باقی ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مافی الباب میں جو احادیث نقل کی ہیں وہ ضعیف ہیں ان کا کوئی اصل نہیں البتہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حج یا عمرے کے لئے جاتے تو داڑھی پکڑتے جو قبضہ سے زیادہ ہوتی اس کو کاٹتے اس لئے قبضہ سے زیادہ ہو تو کاٹ سکتا ہے مگر اس سے کم کرنا حرام ہے بعض نے کہا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر حج اور عمرے کرتے تھے ان سے منقول ہے کہ ہزار عمرے انہوں نے کئے اور ساٹھ (۶۰) حج کیے تھے اس لئے قرآن میں محلقین اور مقصرین دونوں کا ذکر آیا ہے اس لئے وہ سر کا حلق کرتے تھے اور داڑھی کا قبضہ تک قصر کرتے تھے بہر حال قبضہ تک جواز ہے مگر اس سے کم کرنا جائز نہیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی اتخاذ الانماط

"انماط" نمط کی جمع ہے ① بمعنی باریک پردے جو دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکائے جاتے ہیں ② بستروں پر جو کور ہوتا ہے یا چادر ڈالی جاتی ہے وہ مراد ہے ③ باریک قسم کے بستر جس کے کنارے بنے ہوئے ہوں۔ حدیث سے انماط کا جواز معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ۔۔ ہوتی تو نبی اکرم ﷺ منع فرمادیتے۔

باب ماجاء ان الفخذ عورة

جمہور کے ہاں فخذ عورت ہے اس کا ڈھانپنا ضروری ہے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ یہ عورت نہیں اسی طرح احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی بھی ایک غیر مشہور روایت اس کے عورت نہ ہونے کی ہے، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا قول جمہور کی طرح ہے۔

باب ماجاء فی کراھیة لبس العصفر للرجال

معصفر سے مراد زعفرانی رنگ ہے جو سرخ ہوتا ہے اس کا پہننا ممنوع ہے اس سے عورتوں سے مشابہت آتی ہے لیکن اگر بہت ہلکا سرخ ہو کہ جلدی اتر جائے یا سرخ لکیریں ہوں پھر جائز ہوگا۔ "المیثرة" ① ریشہ یا اون کا گدا ② قیمتی چمڑا مراد ہے ③ بعض نے کہا کہ یہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے اس لئے اس سے ممانعت وارد ہوئی۔ "ابرار المقسم" کسی نے اگر قسم اٹھائی کہ یہ کام کروں گا تو اس کا تعاون کرو اور اگر یہ قسم اٹھائے کہ تم یہ کام کرو گے تو تم وہ کام کرلو تاکہ وہ بری ہو جائے قسم سے۔

باب ماجاء فی الثوب الاصفر

"اسمال ملیتین" دو پرانی چادریں "قد نفضتا" اس کا رنگ اتر گیا تھا تو اگر تیز رنگ نہ ہو تو جائز ہے لیکن تیز رنگ ہو تو پھر ممنوع ہوگا عورتوں سے مشابہت کی وجہ سے۔

باب ماجاء فی الشوم

"شوم" بمعنی نحوست ضد الیمن اشکال دوسری روایت میں ہے کہ شوم نہیں ہے کیونکہ لاطیرة فی الاسلام۔ جواب شوم کے اثبات کی روایت منسوخ ہیں۔ ① حقیقةً شوم نہیں بلکہ شوم فی المرأة سے مراد بد اخلاق ہونا، بانجھ ہونا اور شوہر کی اطاعت نہ کرنا ہے۔ اور دار کا شوم یہ ہے کہ اس کے پڑوسی برے ہوں گھر تنگ ہو۔ اور دابہ کا شوم یہ ہے کہ وہ سواری سرکش ہو جواب ② یہاں بالفرض ہے کہ کسی میں شوم نہیں اگر ہوتا تو ان تین چیزوں میں ہوتا۔